مغل ہندوستان
کا
طریق زراعت
عرفان حبیب
قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نئی دہلی

مغل ہندوستان کا طریق زراعت

(1556 — 1707)

عرفان حبیب

مترجم

جمال محمد صدیقی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل

حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔I، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066

Mughal Hindustan Ka Tareeqe Zaraat
By : Irfan Habeeb

سنہ اشاعت :

پہلا اڈیشن : 1977

دوسرا اڈیشن : 1999 تعداد 1100

قیمت : -/119

سلسلۂ مطبوعات : 832

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک ـ I، آر ـ کے ـ پورم، نئی دہلی ـ 110066

طابع : نہی کمپیوٹرس، جامع مسجد، دہلی ـ

پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہن انسانی کی نشو و نما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظر ثانی کے وقت خامی دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائریکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

عرض مترجم

ان اوراق میں پروفیسر عرفان حبیب کی معروف تاریخی تصنیف 'مغل ہندوستان کا طریق زراعت' کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ بلند پایہ مورخین نے جامعیت و استناد کے لحاظ سے اپنے موضوع پر اب تک شائع شدہ تصانیف کے مقابلہ میں اس کی فوقیت کا جس طرح اعتراف کیا ہے' اس کا شدید تقاضہ تھا کہ اس گرانقدر تصنیف کو اردو زبان میں منتقل کیا جائے جو اب 'ترقی اردو بورڈ' کے اردو ترجموں کے منصوبہ کے تحت پورا ہو رہا ہے۔ سطور ذیل میں اس کتاب کے موضوعات کا ایک مجمل تعارف اس غرض و غایت سے پیش کیا جا رہا ہے کہ قارئین کو تفصیلی مطالعہ میں سہولت ہو اور کتاب کے مسائل اور مواد کا ایک مرتب خاکہ ذہن میں پہلے سے موجود رہے۔

شاہان مغلیہ کی شوکت و شان' جاہ و جلال' افواج کی کثرت' دربار کی عظمت اور ان کی عمارات و باغات کی رونق اور اس نوعیت کی دیگر تفصیلات پر حاوی تاریخی تصانیف کی کوئی کمی نہیں' مگر اس دور میں عوامی زندگی کے تفصیلی حالات پر جن کی غالب اکثریت کسانوں پر مشتمل تھی بہت کم لکھا گیا تھا۔ یہ کتاب جس کا موضوع 'اصلاً کسان ہی ہے' اس کمی کو بدرجۂ اتم پوری کرتی ہے۔ کتاب میں مصنف نے جس دور کو مغلوں کا "کلاسیکی" دور قرار دیا ہے اس کی زمانی تحدید اس طرح ہوتی ہے کہ وہ اکبر کی تخت نشینی (1556ء) سے شروع ہو کر اورنگزیب کی وفات (1707ء) پر ختم ہوتا ہے۔ پہلے دو باب زراعتی پیداوار و تجارت اور اس کے بعد کے دو باب کسان کی زندگی کے

تفصیلی حالات اور اس کے اپنی زمین سے رشتہ کی نوعیت اور دیہی برادری کی تنظیم پر صرف کیے گئے ہیں۔ ان ابتدائی چار ابواب کے پس منظر میں مصنف نے اپنی تحقیق کے اصل موضوع یعنی زمیندار، مالگزاری زمین، جاگیرات و عطیات کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ اس ضمن میں 'دیہی برادری' 'زمیندار اور مالگزاری زمین' کے ابواب خاص طور پر بیش بہا معلومات کے مخزن ہیں۔ مورلینڈ اور اس کے بعد کے چند مورخین نے ان موضوعات پر اپنی تحقیق کو جس مقام پر چھوڑا تھا، آخر الذکر چار ابواب میں مصنف نے اس کے آگے کی منازل طے کی ہیں۔ ان ابواب میں مصنف نے اس دور میں زمین کے حق ملکیت پر ایک مدلل اور پُر مغز بحث کے ساتھ ساتھ بعض مالی اصطلاحات کی نئی تعبیریں بھی پیش کی ہیں، مثلاً 'نسق' 'تقسیمات ملک'، 'مابانہ تناسب'، 'جاگیر' 'عطیات معاش'، وغیرہ معلوم ہے کہ یہ اصطلاحات عرصہ سے مورخین کے درمیان متنازعہ فیہ رہی ہیں اور ان میں سے بعض کا صحیح مفہوم تو ابھی قریبی زمانہ تک واضح نہ ہو سکا تھا۔ مصنف نے اپنی تحقیقات کی روشنی میں ان کی جو تعبیریں پیش کی ہیں وہ جامع ہونے کے علاوہ اپنے مواقع استعمال سے مناسبت بھی رکھتی ہیں۔ کتاب کے آخری باب میں جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں، ان سے بعض حلقوں میں اختلاف کیا گیا ہے لیکن اس مسئلہ پر بحث مترجم کے حدود کار سے باہر ہے۔ کتاب کے خاتمہ پر تین ضمیمے، پیمائش زمین، اوزان اور سکوں کے متعلق اور چوتھا محاصل اور جمع کے شماریات پر مبنی ہے۔ آخر میں تفصیلی اور موضوع وار کتابیات کا حصہ ہے۔ تشخیص کے مختلف طریقوں، اصطلاحات مال کی تعبیرات اور تشخیص کے مختلف عناصر (ضمیمہ جات 1 تا 3) کے بیان میں ہم مصنف کی تحقیقی کاوش کو نقطۂ کمال پر دیکھتے ہیں۔ کتاب میں متن کا حصہ نصف سے بھی تھوڑا کم ہے بیشتر مواد جو ہمعصر روایتی مآخذ کے علاوہ برطانوی، فرانسیسی، ولندیزی اور پرتگیزی مورخین اور سیاحوں کی متعدد تصانیف اور سرگذشتوں اور سرکاری تحریروں سے ماخوذ ہے، فٹ نوٹ میں دیا گیا ہے۔ مواد کی اس ترتیب سے مصنف کے دلائل کا تسلسل اور اصل دھارا پوری تیز رفتاری سے آگے بڑھتا رہتا ہے اور اس میں رخنہ نہیں پڑتا۔ فٹ نوٹ میں جو کثیر تاریخی مواد فراہم کیا گیا ہے وہ مصنف کے اپنے دعووں کی سند کے علاوہ، موضوعات متعلقہ پر آنے والے محققین کے لیے استفادہ کا بیش بہا سامان بھی فراہم کرتا ہے اور یہ اس قدر جامع اور مختلف النوع ہے کہ خود ایک مستقل تصنیف کا درجہ رکھتا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے مجموعی طور پر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ مصنف نے ابتدائی مآخذ کے متن کے استعمال میں انتہائی احتیاط برتی

ہے اور بعض بعض مقامات پر تو انہیں بجنسہ قبول بھی نہیں کیا ہے، بلکہ ان میں سے بعض کے متن کو جانچا اور پرکھا ہے اور جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی ان کا متعدد نسخوں سے باہمی موازنہ کرنے کی بعد ان کی صحت بھی کی ہے، مثلاً آئین اکبری کے بلاکمین کے معیاری نسخہ میں آئین دوازدہ صوبہ، کے شماریات کے تحت ایک اہم فروگذاشت کی نشاندہی کی گئی ہے (ترجمہ صفحہ 100) جو آئین اکبری کے شماریات کو غلط طور پر پیش کیے جانے کا سبب بنی۔ دور اکبری پر تو ہمعصر فارسی مآخذ میں بیشتر کے انگریزی ترجمے اور ان کے مطبوعہ نسخے ملتے ہیں جن سے استفادہ کرنا نسبتاً آسان ہے، مگر اس کے بعد کے تقریباً صد سالہ دور (1605ء - 1707ء) کے لیے مصنف کو غیر مطبوعہ مخطوطات سے رجوع کرنا پڑا جو شکستہ فارسی میں قلم بند ہیں۔ ان کا پڑھنا، سمجھنا اور ان سے استفادہ کرنا بجائے خود ایک فنی اور مستقل نوعیت کے کام کا درجہ رکھتا ہے۔ مصنف کی تحقیقات کی بنیاد، اصلاً یہی فارسی مخطوطات ہیں۔ عام ابتدائی اور ثانوی مآخذ جو استعمال میں لائے گئے ہیں، وہ ان کے علاوہ ہیں۔ اس سلسلہ میں نسبتاً زیادہ سہل الحصول تاریخی مواد کے علاوہ، نئی شہادتوں کی تلاش اور چھان بین پر بھی انتہائی عرق ریزی کی گئی ہے۔

یہ ایک حقیقت کا اعتراف ہے کہ اگر ہمارے فاضل استاد اور اس کتاب کے مصنف کی پُر شفقت ہمت افزائی اور موصوف کے بیش قیمت اوقات کے استعمال کا اذنِ عام ہمارے شاملِ حال نہ ہوتا تو یہ ترجمہ آپ کے ہاتھوں تک نہ پہونچتا۔ مفہوم جہاں جہاں غیر واضح معلوم ہوا، موصوف ہماری رہبری فرماتے رہے اور بمصداق "تصنیف را مصنف نیکو بد آند" موصوف سے حاصل کردہ اشارات ہی کو میں ترجمہ کا اصل سرمایہ تصور کرتا ہوں۔ ترجمہ کے سلسلہ میں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ڈاکٹر انصار اللہ صاحب، کامرس کے ڈاکٹر نجم الحسن صاحب، معاشیات کے ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب اور جغرافیہ کے ڈاکٹر محمد انس صاحب سے بھی مفید مشورے رہے۔ ان حضرات کا بھی شکریہ واجب ہے۔

ترجمہ کی گوناگوں دشواریوں کے باوجود، اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ اردو ترجمہ خواہ زبان و بیان کے اعتبار سے اصل کا ہم پلہ نہ ہو سکے، لیکن مصنف کے مفہوم اور مقصود سے انحراف نہ ہو اور اس کا منشا بہرحال محفوظ رہے۔ مجھے اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیابی ہوئی اس کا فیصلہ قارئین کو کرنا ہے۔ اس کام میں لفظی ترجمہ سے بچتے ہوئے، مفہوم کی اصل روح

کو عام فہم زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اصل کتاب کے ص 35 - 431 پر جو اضافے اور تصحیحات درج ہیں ان کا ترجمہ یکجا شکل میں پیش کرنے کے بجائے، انہیں منتشر کرکے ان کے ترجمہ کو اپنی اپنی جگہوں پر درج کردینا زیادہ مفید معلوم ہوا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا ہے۔ کتاب میں جن مآخذ کے اقتباسات کے حوالے آئے ہیں، ان کے ترجمے بیشتر اصل مآخذ سے کیے گئے ہیں خصوصاً طویل اقتباسات کے بورڈ کی ہدایت کے مطابق 'فٹ نوٹ' اور کتابیات میں فارسی مآخذ کے نام، فارسی رسم الخط میں اور یورپی مآخذ کے نام انگریزی رسم الخط میں لکھے گئے ہیں۔

پورے اہتمام اور احتیاط کے باوجود، اگر ترجمہ میں کچھ خامیاں پائی جائیں اور مذکورہ بالا حالات میں، ایسا ناممکن بھی نہیں تو اس کی ذمہ داری قدرتی طور پر مترجم ہی پر عائد ہوتی ہے اور اس کی جانب سے اس سلسلہ میں تمام مفید علمی اور ہمدردانہ مشوروں کا بطیب خاطر خیر مقدم ہوگا۔

جمال محمد صدیقی

علی گڑھ، جون 1973ء

اپنے والد پروفیسر محمد حبیب

کے نام

پیش لفظ

زیرِ نظر تصنیف 1958ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں میرے پیش کردہ تحقیقی مقالہ کا ایک شدہ شدہ اور نظرِ ثانی کیا ہوا نسخہ ہے۔ آکسفورڈ جانے کے قبل مجھ سے علیگڑھ شعبۂ تاریخ کے تحقیقی منصوبہ کے تحت اس موضوع پر کام کرنے کو کہا گیا تھا۔ تحقیقی مقالہ پیش کیے جانے کے بعد میں نے اس میں جو اضافے کیے، وہ ان مزید تاریخی آخذ اور مصادر کے مطالعہ ہیں جس کا موقع مجھے اس تحقیقی منصوبہ کے تحت فراہم کردہ سہولیتوں کی وجہ سے حاصل ہوا۔ نظرِ ثانی کے دوران میں نے کتاب کے ابواب 4، 5 اور 6 کو از سرِ نو تحریر کیا ہے۔

اس تصنیف کے حدود کی محض ایک مختصر سی وضاحت ضروری ہو گی۔ عنوان کتاب میں 'زرعی نظام' کے الفاظ کی شمولیت سے میرا مقصد اس امر پر زور دینا ہے کہ اس تصنیف کو صرف مالگذاری زمین کے نظم ونسق ہی تک محدود نہیں رکھا گیا ہے، حالانکہ یہ بجائے خود ایک اہم موضوع ہے، بلکہ اس میں ساتھ ساتھ اس دور کی زرعی معیشت اور سماجی ڈھانچہ پر بھی بحث کی گئی ہے۔ 'مغلیہ ہندوستان' کے الفاظ مطالعہ کے جغرافیائی حدود کا تعین کرتے ہیں۔ ماورائے سندھ، مغلوں کے مقبوضات (صوبجات کابل اور بعض اوقات قندھار پر مشتمل) اور بیجاپور وگولکنڈہ کی سلطنتیں (جو 1686ء اور 1687ء تک مملکت میں شامل نہ کی گئی تھیں) ان حدود سے خارج ہیں۔ بہ الفاظ دیگر، اس مطالعہ کے زیرِ بحث خطے شمالی ہندوستان اور دہ

علاقے جنھیں میں نے 'مغلیہ دکن' کا نام دیا ہے یعنی سلطنت خاندیش، احمد نگر و بیدر (جن پر 36 یا بہرحال 1687ء تک قبضہ ہوا) ہیں۔ کتاب کے عنوان میں سنین یعنی 1556ء اور 1707 کی شمولیت جن میں سے پہلا اکبر کا سن جلوس اور دوسرا اورنگزیب کا سال وفات ہے، ہمارے مطالعہ کو حکومت مغلیہ کے 'کلاسیکی' دور تک محدود کرتی ہے۔ لیکن یہاں یہ بتانا چنداں ضروری نہیں کہ ہمیں ان دو (زمانی) جہتوں کو ان کے لفظی مفہوم کا پابند نہ تصور کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے اوائل سولھویں اور اٹھارھویں صدیوں کی شہادتوں کو پوری آزادی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

میں نے اس موضوع پر اس یقین کے ساتھ قلم اٹھایا ہے کہ اوّل تو زرعی تاریخ کے مسائل کی وضاحت اس دور کی عمومی بالخصوص سیاسی تاریخ کے سمجھنے میں ہماری معاون ثابت ہوگی اور دوسرے یہ کہ اس موضوع پر ہماری اب تک کی معلومات میں، زیادہ معروف تاریخی تصانیف اور یورپی مآخذ کے علاوہ اس دور کے فارسی مخطوطات کے ذخائر، مثلاً ہمعصر نظم و نسق سے متعلق تحریروں، مکاتیب، انتظامی اور حسابات کے ضوابط ناموں اور ان سے نسبتاً کم معروف وقائع کی بنیاد پر بے حد اضافہ کی گنجائش پائی جاتی ہے۔ اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ہرچند کہ ان مآخذ کے اپنے ذاتی مطالعہ کی بناء پر مجھے ڈبلو۔ ایچ مورلینڈ اور ڈاکٹر پی۔ سرن کے نقطۂ نگاہ سے بہت سے مقامات پر اختلاف رہا ہے۔ تاہم اس دور کی معیشت اور نظم و نسق پر ان کی تصانیف سے جنھیں اولیت کا شرف حاصل ہے، استفادہ کیے بغیر، میرے لیے مذکورہ بالا مواد کو کام میں لانا تقریباً ناممکن ہوتا۔

اپنے جن استادوں اور دوستوں کے تعاون اور مشوروں سے میں مستفید ہوا ہوں ان کی عنایات کا اعتراف بھی میں اپنا خوشگوار فریضہ تصور کرتا ہوں۔ اکسفورڈ یونیورسٹی میں اپنے (تحقیقی کام کے) نگراں ڈاکٹر سی، کولن ڈیویس (Dr.C.Collin Davies) کا تہِ دل سے شکرگزار ہوں کہ موصوف نے صحت بیان اور دستاویزی شواہد کو بہ احتیاط قلمبند کرنے کی تاکید کے ساتھ مجھے اپنے ذاتی نقطۂ نگاہ کے پیش کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع عنایت فرمایا۔ موصوف نے جس سوجھ بوجھ اور غور و فکر کے ساتھ میرے کام کی جانچ کی ہے میں اسے فراموش نہیں کرسکتا۔ پروفیسر شیخ عبدالرشید، سابق صدر شعبۂ تاریخ علیگڑھ نے مجھے پہلی بار اس موضوع سے متعارف کرایا تھا اور میری تحقیقات کے دوران موصوف میری

برابر ہمت افزائی فرماتے رہے۔ پروفیسر رشید نے ازراہِ کرم ٹائپ کیے ہوئے مسودہ کو اوّل سے آخر تک ملاحظہ کرنے کا بعد اس کے متن میں متعدد ترمیمات کا مشورہ دیا۔ موصوف نے یو۔پی سنٹرل رکارڈ آفس، الہ آباد کے جن فارسی دستاویزات کی فوٹو اور نقلیں ان کے پاس موجود تھیں وہ بھی سب کی سب مجھے عاریۃً مرحمت فرمائیں۔

پروفیسر سیّد نورالحسن نے جن کے شاگرد ہونے کا مجھے فخر حاصل ہے، کتاب کی اشاعت کی طیاری کے سلسلہ میں میری رہنمائی اور امداد فرمائی۔ علیگڑھ کے شعبۂ تاریخ میں اپنے رفقا کار کے ساتھ کام کرنا میرے لیے مسرت اور حوصلہ کا ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ ان حضرات نے متعلقہ موضوعات پر اپنی معلومات سے مجھ کو استفادہ کا موقع عطا کیا۔ میں اپنے دوست اور ساتھی ڈاکٹر محمد اطہر علی کا جنہوں نے کتاب کی طباعت کے سلسلہ میں کشادہ دلی کے ساتھ میری مدد فرمائی، خصوصی طور پر شکر گذار ہوں۔ میرے اور دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر پی۔ آر۔ گورور کے درمیان جو فی الوقت، مغلوں کے مالگذاری زمین کے نظام پر اپنی مبسوط تصنیف کی تحریر میں مصروف ہیں، تبادلۂ خیال میرے لیے بے مدکار آمد ثابت ہوا۔ انگلینڈ میں اپنے تحقیقی کام کے تین سالہ قیام کے دوران مجھے اور میری بیوی کو مس دفونا کین اور ڈاکٹر بریجیٹ کین نے جن کرم فرمائیوں اور شفقتوں سے نوازا، ان کی یاد احسانمندی اور مسرت کے جذبات کے ساتھ میرے دل میں ہمیشہ باقی رہے گی۔

آخر میں، میں اپنی بیوی کا منت گذار ہوں کہ انہوں نے کتاب کی پوری ٹائپ کی ہوئی عبارت کی تصحیح اور بعض معاشیاتی اصطلاحوں اور تصوّرات کی وضاحت میں میری مدد کی۔ پھر بھی کتاب میں جو خامیاں رہ گئی ہوں، ان کا میرے معاونین میں سے کوئی بھی ہرگز ذمہ دار نہیں۔

میں بوڈلین لائبریری، (اکسفورڈ) برٹش میوزیم (لندن) سنٹرل رکارڈ آفس (یو۔پی) (الہ آباد)، انڈیا آفس لائبریری (لندن)، انڈیا انسٹی ٹیوٹ لائبریری (اکسفورڈ) جان رائی لینڈس لائبریری (مین چسٹر) مولانا آزاد لائبریری (علیگڈھ)، ریسرچ لائبریری شعبۂ تاریخ (علیگڈھ) اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی (لندن) کے عہدہ داروں، اور کارکنوں کا ممنون کرم ہوں کہ انھوں نے مجھے اپنے یہاں کے تاریخی ذخائر کے استعمال کرنے کا موقع بہم پہونچایا اور اڈنبرا یونیورسٹی کے لائبریری منتظمین کا بھی کہ انہوں نے بوڈلین (لائبریری) کو میرے استعمال کے لیے اپنے بعض مخطوطات فراہم کیے۔

جی۔ ایس پریس مدراس کے کارکنان کا ان کے دوستانہ تعاون اور پر احتیاط طباعت کے لیے بھی شکریہ مجھ پر واجب ہے۔

مزید یہ کہ، میں پروفیسر سید نورالحسن، مسٹر مونس رضا اور بیگم خورشید نورالحسن کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی تحقیق پر مبنی 1605 کی مملکت مغلیہ کا نقشہ اس کتاب میں شامل کرنے کی مجھے اجازت مرحمت فرمائی۔

عرفان حبیب

علی گڑھ۔ اگست 1962ء

موضوعات

باب اوّل

زراعتی پیداوار

فصل — ۱ — رقبۂ کاشت

ہندوستان کے وسیع میدانوں، وادیوں، اور پہاڑی ڈھلانوں پر زراعت کے وسیع رقبے ہندوستانی کسان کی اس سخت جدوجہد کا نتیجہ ہیں جو وہ قدرت کو مسخر کرنے کے لیے ہزارہا سال سے کرتا آرہا ہے۔ اس کی کدال اور ہل کی زد میں آکر جنگل و بیابان پامال ہوتے پنپے اور پھر پامال ہوتے اور الٹ پھیر کا یہ لامتناہی چکر اسی طور پر چلتا رہا۔ چنانچہ ہندوستانی تاریخ کے ہر دور میں مخصوص سیاسی اور فوجی حدود کے پہلو بہ پہلو، جنگلوں اور ریگزاروں کی مخصوص حدیں بھی ملتی ہیں۔ ہندوستانی تاریخ کے کسی بھی پہلو کے مطالعہ کے لیے، انسانی قلمرو اور قدرت کے درمیان اس حد بندی کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ چونکہ اس سے مزروعہ علاقے کی حد بندی متعین ہوتی آئی ہے، لہٰذا یہ ہمیشہ ملک کے مختلف حصوں میں آبادی کی افزائش کی نشاندہی کا بھی ذریعہ بنی۔ اسی طرح ہم اس حد بندی کو ایک مخصوص طریقۂ پیداوار اور معاشی تنظیم کے وجود سے بھی متعلق کرسکتے ہیں۔ کدالی کھیتی، کاشت بہ نقل مکانی اور کاشت بہ استقرار مکانی، یہ سب پیداواری تکنیک میں ارتقا کے مختلف تاریخی مراحل تھے جن کا تعین بیشتر اس امر سے ہوتا تھا کہ کس قدر قابل کاشت زمین الگ الگ دور میں تازہ آبادکاری کے لیے دستیاب ہوسکتی تھی

اس لیے مغلیہ ہندوستان کے زرعی نظام کے متعلق ہمارے مطالعہ کا آغاز اس جائزہ سے ہونا چاہیے کہ اس دور میں مزروعہ اراضی کا رقبہ کس قدر تھا۔ اس مسئلہ پر ہمعصروں کے

عمومی اندازے کے بیانات، بدقسمتی سے ہمارے لیے کچھ زیادہ معاون ثابت نہیں ہوتے کیونکہ یہ یا تو مبہم ہیں یا مبالغہ آمیز اور اکثر بے ربط بھی[1]۔ ہمارے آخذ میں، مملکت کے مخصوص علاقوں میں مزروعات کے متعلق کہیں کہیں اطلاعات ملتی ہیں اور یہ غالباً زیادہ معتبر ہیں لیکن ان میں اہم ترین اس دور کے پیمائش شدہ رقبوں اور مواضعات کی تعداد کے اب تک محفوظ شماریاتی اندراجات ہیں اور ہم انہیں اپنے جائزہ کی بنیاد قرار دے سکتے ہیں۔

ابوالفضل کی تصنیف 'آئین اکبری' کے اس باب میں جس کا عنوان 'آئین دوازدہ صوبہ' ہے، علاوہ بنگال ٹھٹھہ اور کشمیر، ہندوستان کے تمام شمالی صوبوں کے رقبوں کے مفصل اعداد و شمار موجود ہیں۔ یہ اعداد و شمار اکبر کے دور حکومت کے چالیسویں سال یعنی 1595-6ء سے متعلق ہیں۔ ہر صوبہ کی پیمائش شدہ زمین (زمین پیمودہ) کے رقبہ کا بیگھوں میں شمار دیا گیا ہے۔ اسکے بعد جدولوں میں اراضی کے خانہ کے تحت ہر سرکار (صوبہ کی علاقائی تقسیم) کے لیے ایک اندراج

---

[1] دور اکبری کے تین مورخ یک زبان کہتے ہیں کہ اس کی مملکت کی تمام زمین قابل کاشت تھی (عارف قندھاری ص 41 طبقات اکبری 3 ص 545 و آئین اکبری 2 ص 6،5) سوجان رائے (ص 11) جو سترھویں صدی کے اواخر کا ایک مصنف ہے زیادہ احتیاط کے ساتھ کہتا ہے کہ ہندوستان کی "بیشتر زمین" قابل زراعت تھی لیکن معتمد خاں اپنے اکبر کی وفات پر مملکت کے احوال کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ "داناؤں کے قول کے مطابق" مجموعی رقبہ کا صرف ایک تہائی جزو قابل کاشت تصور کیا جانا چاہیے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس بنا پر وہ قابل کاشت رقبہ کا تخمینہ بھی لگاتا ہے۔ اگر وہ یہ زحمت گوارا نہ کرتا تو بہتر تھا کیونکہ وہ پہلے تو مجموعی رقبہ کا تعین اس مفروضہ پر شروع کرتا ہے کہ پوری مملکت ایک مستطیل شکل میں ہے اور مملکت کے بعید ترین مقامات کے درمیانی فاصلے اس مستطیل کے ضلعے ہیں۔ اس طریقہ پر رقبہ کا حساب لگانے میں اس کی ایک مزید غلطی یہ ہے کہ وہ ایک کروہ کو بجائے پانچ ہزار گز کے بارہ ہزار گز کے مساوی قرار دیتا ہے (اقبال نامہ۔ ج 2 ادر 1834، ورق 231 ب)

جو رقبہ دراصل مزروعہ ہے اس کے متعلق اکبر کے انتظامی ضابطے کے مقاصد کی صراحت کے سلسلہ میں نظام الدین احمد 1575ء میں لکھتا ہے کہ "ہندوستان کے وسیع آباد علاقہ کا بیشتر جزو غیر مزروعہ تھا" (طبقات اکبری ج 2 ص 300) جبکہ چندر بھان کا شاہجہاں کے آخری زمانہ میں قول ہے کہ ہندوستان کا بیشتر قابل زراعت رقبہ واقعۃً زیر کاشت تھا (چار چمن Add 63 68 ورق 32 الف)

دیا گیا ہے[1]۔ اس کے بعد سرکار کے ہر محال یا پرگنہ کے لیے علیٰحدہ علیٰحدہ اعداد دیے گئے ہیں۔ آئین اکبری کے یہ وقیع اندراجات مغلیہ دور میں بے نظیر رہے لیکن شماریات کی نسبتاً ایک اجمالی ترتیب اورنگ زیب کے دورِ حکومت کے اواخر میں بھی عمل میں آئی۔ ان میں سے ایک جدول میں جو دو یا تین مخطوطات میں ابھی تک محفوظ ہے ہر صوبہ کے رقبہ کے شماریات کے ساتھ ساتھ مواضعات کو 'بیمودہ' اور 'غیر بیمودہ' زمروں میں تقسیم کرکے ان کی تعداد پیش کی گئی ہے[2]۔ رائے چترمن کی کتاب موسومہ 'چہار گلشن'، مصنفہ 1759-60ء میں ہر سرکار کے مواضعات و رقبہ کے متعلق علیٰحدہ علیٰحدہ اطلاعات فراہم کی گئی ہیں[3]۔ چونکہ اس تصنیف کے اعداد و شمار مذکورہ بالا شماریات میں مندرج صوبوں کے اعداد سے اکثر و بیشتر قریبی مطابقت رکھتے ہیں، لہٰذا یہ امر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت 'چہار گلشن' میں ان ہی اعداد و شمار کی نقل کر دی گئی ہے جو عہد عالمگیری کے اواخر میں یا اس کے فوراً بعد مرتب کیے گئے تھے۔

---

[1] آئین دوازدہ صوبہ، موجودلاتِ اعداد و شمار، آئین اکبری مرتبہ بلاکمین میں ج ۱ ص 386 تا 395 پر درج ہیں اور ص 386 پر اعداد و شمار کا سال دیا ہوا ہے۔ آئین اکبری مرتبہ بلاکمین کو ان اعداد و شمار کے سلسلے میں استعمال کرتے وقت دو باتیں یاد رکھنی چاہئے۔ اول یہ کہ اس نے اعداد و شمار کے جدول کو اپنی اصلی حالت میں نقل نہیں کیا ہے اور خانوں کو مع ان کی سرخیوں کے بالکل حذف کر دیا ہے۔ اس طور پر اس کے نسخہ میں بیگھوں کے اعداد ہر سرکار، اور پرگنہ کے بالمقابل ملتے ہیں اور اس کی کوئی صراحت نہیں ہے یہ اعداد کس چیز سے متعلق ہیں۔ دوم یہ کہ منجملہ متعدد مخطوطات کے جن کی بنیاد پر اس نے اپنا نسخہ مرتب کیا ہے اس کے پاس صرف ایک اچھا نسخہ تھا۔ بقیہ مخطوطات کی غلطیوں کی تقلید کے علاوہ اس کی نقل کی ہوئی گنتیوں میں بھی کتابت کی غلطیاں ہیں۔ اس لیے میں نے اس کے اعداد و شمار کے پورے متن کا آئین اکبری کے دو قدیم ترین اور بہترین قلمی نسخوں Add 7652 اور Add 6552 سے موازنہ کیا ہے۔ اس موازنہ کے نتیجہ میں جو تصحیحات لازم آئیں انھیں اس کتاب میں اکثر بغیر کسی تشریح کے اختیار کیا گیا ہے سوائے ان صورتوں میں کہ تبدیلی اتنی بڑی رہی ہو کہ اس کی وضاحت ضروری ہو جائے۔

[2] یہ تحریر دو قلمی نسخوں Bodl. Fraser 86 ورق 57 ب - 60 ب اور Edinburgh 224 اوراق ۱-ب ۳ ب و 8 الف تا 11 میں محفوظ ہے۔ ان سے اعداد اخذ کر کے Or 1286 اوراق 310 ب؛ 343 الف میں نقل کیے گئے ہیں۔ (باقی صفحۂ آئندہ پر)

آئین اکبری میں رقبہ کے اعداد 'بیگھۂ الٰہی' میں ہیں جبکہ اس کے بعد کے اعداد و شمار کا بیگھہ غالباً 'بیگھہ دفتری' ہے جو بیگھۂ الٰہی کا دو تہائی تھا اور جس کا استعمال عہد شاہجہانی سے شروع ہوا۔ زیر نظر کتاب کے ضمیمۂ الف، میں جو سندیں جمع کی گئی ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ ایک بیگھۂ الٰہی 59ء ایکڑ یعنی عملاً ایک ایکڑ کے $\frac{3}{5}$ حصہ کے مساوی ہوتا تھا

دور مغلیہ اور زمانۂ حال کے رقبوں کے اعداد و شمار کو اس طرح رقبہ کی ایک مشترک اکائی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے لیکن صحیح موازنہ اس وقت تک ممکن نہ ہوگا جب تک ہمیں کسی حد تک یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ مغلیہ شماریات میں مندرج 'اراضی پیمودہ' سے کیا مراد تھی۔ حکومت مغلیہ زمین کی پیمائش بنیادی طور پر تشخیص مالگزاری کے مقصد سے کراتی تھی۔ لیکن جیسا کہ آگے چل کر باب ششم میں ہم دیکھیں گے کہ زمین کی پیمائش کی بنیاد پر مالگزاری کی تشخیص کا یہ طریقہ ہر زمین پر ہر جگہ رائج نہ تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ عہد عالمگیری کے شماریات میں بمقابلہ آئین اکبری کے زمانے کے شماریات کے کل کار قبہ میں کافی اضافہ ملتا ہے اور پھر بھی اول الذکر دور کے شماریات میں تمام صوبوں میں مواضعات کی کثیر تعداد 'غیر پیمودہ' دکھائی گئی ہے۔ اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ نہ تو آئین اکبری کے زمانہ میں اور نہ اس زمانہ میں جب ان اعداد و شمار کی ترتیب عمل میں آئی تھی، کسی بھی صوبہ کی کل زیر مالگزاری آراضی کی مکمل پیمائش ہوئی تھی۔ بہ الفاظ دیگر، دونوں اعداد و شمار نامکمل ہیں۔ صرف بعد کے اعداد و شمار میں دیئے ہوئے 'پیمودہ' اور 'غیر پیمودہ' مواضعات کے باہمی تناسب سے ہی اس بات کا تھوڑا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایسی زمین کا مجموعی رقبہ کیا رہا ہوگا جو اس وقت

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

یہ اعداد و شمار جو قلمی نسخوں کے موازنہ کے بعد مرتب کئے گئے ہیں صفحہ چار (۴) پر ایک جدول کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں

3ـ 'چہار گلشن' غیر مطبوعہ ہے لیکن سرکار نے اپنی تصنیف 'India of Aurangzeb' میں اس کے اس حصہ کا جو جغرافیہ اور شماریات سے متعلق ہے ترجمہ کیا ہے .Elliot Bodl 366. مندرج فہرست مخطوطات میں (موازنہ بہ STORY نمبر 631) قدیم ترین ہی نہیں بلکہ شاید سب سے زیادہ مستند بھی ہے کیونکہ وہ اس کے بعد کے تبدیل شدہ نسخوں کی نہیں بلکہ خود اصل کی نقل ہے۔ اس کی عبارت کو عام طور پر اس کتاب میں سرکار کی مذکورہ تصنیف کی عبارت پر ترجیح دی گئی ہے کیونکہ مترجم خود اس بات کا معترف ہے کہ اس کی عبارت کی بنیاد ایک ناقص قلمی نسخہ پر ہے اور اس کے اس حصہ میں جس میں اعداد و شمار درج ہیں بہت سی فروگذاشت رہ گئی ہیں۔

کے معیار کے مطابق ناپی جا سکتی تھی۔[1]

مغلیہ دور میں پیمائش شدہ آراضی کی نوعیت کے متعلق مورلینڈ کا خیال ہے کہ ہمیں اسے جدید شماریات کی رُو سے کل زیرِ فصل رقبہ قرار دینا چاہیے۔[2] یقیناً مغلیہ آراضی پیمودہ میں کل زیر فصل شامل ہوتی تھی۔ لیکن غالباً یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ایسی آراضی کے حدود میں وہ تمام زمین شامل ہوتی تھی جس پر تخم ریزی کی گئی ہو کیونکہ اس ضمن میں وہ زمین بھی شامل کی جاتی تھیں جن کو 'نابود' کہتے تھے، یعنی وہ زمین جس پر تخم ریزی تو ہوئی ہو مگر فصل کامیاب نہ ہوسکی ہو۔[3] ایسا

---

[1] ایسا صرف صوبوں ہی کے بارے میں ممکن ہے۔ 'چہار گلشن' میں سرکاروں کے رقبہ اور مواضعات کے اعداد و شمار فراہم نہیں کیے گئے ہیں بلکہ ان کے صرف مواضعات کی مجموعی تعداد بلا اس صراحت کے کہ ان میں سے کتنے پیمائش شدہ تھے' دی گئی ہے۔ لیکن اکثر منفرد سرکاروں میں ایسے محالوں کی تعداد جن میں ایک بھی موضع یا ان کے شماریات رقبہ نہیں ملتے' درج ہیں۔
Journal cf U.P. Historical Society, V.II1919 f. P. 1, pp. 1-39
میں مورلینڈ نے صوبۂ متحدہ اگرہ و اودھ کے مغربی و مشرقی اضلاع کے متعلق آئینِ اکبری کے شماریات کا دورِ حاضر کے زیرِ فصل رقبوں کے شماریات سے بڑی عرق ریزی کے بعد موازنہ کرکے جو نتائج اخذ کیے ہیں اور جن میں اس نے شمالی ہندوستان کے دیگر حصوں کے متعلق ایک سرسری طور پر اپنی تصنیف 'India at the Death of Akbar,' pp. 20-22 میں درج کیا ہے' ان میں اچھی خاصی ترمیم محض اس وجہ سے کرنی ہوگی کہ یہ نتائج اس مفروضہ پر قائم کیے گئے ہیں کہ آئینِ اکبری کے شماریات میں وہ تمام رقبہ شامل ہے جو اس وقت زیرِ کاشت تھا۔ اگر کسی علاقہ کے رقبہ کا شمار زیادہ نہیں دکھایا گیا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ علاقہ کاشتکاری میں پسماندہ تھا۔ کم از کم یہ صورت بھی اتنا ہی ممکن ہے کہ مزروعہ رقبہ کی پیمائش ہی نہ کی گئی ہو۔

[2] Journal of U.P. Historical Society, V.II (1919) P. I. pp. 3 & 17 سال کے ہر موسم کی فصل جس قدر زمین پر اگائی گئی ہو ان سب زمینوں کی میزان کرنے سے کل زیرِ فصل رقبہ حاصل ہو جاتا ہے اور اس مجموعہ سے وہ رقبہ جس پر ایک سے زائد بار فصل اگائی گئی ہو گھٹا دینے سے خالص رقبہ زیرِ فصل نکل آتا ہے۔

[3] مزروعہ زمین کی پیمائش کے لیے عہدِ اکبری کے ستائیسویں سال ٹوڈرمل کے مرتبہ ضابطے ملاحظہ ہوں۔" یہ معلوم ہے کہ خالصہ کے پرگنوں میں (مندرجہ) رقبہ (اراضی) ہر سال کم ہوتا جاتا ہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ 23 پر)

عہد عالمگیری کے مواضع اور رقبہ کے شماریات

صوبہ	مواضعات کی مجموعی تعداد	غیر پیمودہ مواضعات	پیمودہ مواضعات	پیمائش شدہ رقبہ (دفتری) بیگھوں میں
پوری مملکت بیجاپور اور حیدرآباد کے علاوہ	401567	201564	(2.... 5)	295742337
بنگال				
اوڑیسہ	112788	111250	1536	334775
بہار	56376	24056	26768	595579
الہ آباد	47607	2262	31340	12763156
اودھ	(52691)	18849	45346	19707785
آگرہ	30160	2677	33842	19027308
دہلی	45088	1576	27303	40100551
لاہور	27761	3192	43512	60142375
ملتان	(9256)	4559	24569	24319376
ٹھٹھہ	1324	1324	4697	4454203
کابل	1316	1316		
کشمیر	5352	5352		
اجمیر	7905	2873		
گجرات	10370	6446	5032	17409684
مالوہ	17678	11742	3924	12749374
خاندیش	6339	3507	6936	12984638
برار	10878	157	2632	8859325
اورنگ آباد	8263	718	20018115	10741
بیدر			7545	25473295
	4526	1007	3519	7906193

نوٹ:۔ اس جدول کے اعداد Fraser 86 اوراق 57 ب۔ 60 ب اور Edinburgh اوراق اب 3 ب 8 الف۔ 11 ب سے ماخوذ ہیں۔ اختلافات کی صورت میں Qr 1286 وراق۔31 ب 343 الف اور چہار گلشن Elliot, Bodl 366 کی مدد سے اصل اعداد قائم کئے گئے ہیں
قلمی نسخوں میں دی ہوئی میزان کا غیر پیمودہ اور پیمودہ مواضعات کے مجموعی شمار سے موازنہ کرکے مواضعات کے اعداد کی صحت کو فرداً فرداً جانچا جاسکتا ہے۔ چونکہ تقریباً تمام اختلافات بالکل بدیہی طور پر قلمی نسخوں میں نقل کی غلطی یا رقم کی تحریر میں بے قاعدگی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں، لہٰذا ان کی تفصیلات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ مواضعات کے اعداد عموماً حتمی تصور کئے جاسکتے ہیں اور جہاں تک رقبہ کے اعداد کا تعلق ہے آخری پانچ ہندسوں میں اختلاف کی گنجائش رکھنی چاہئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ پیمائش کا کام صرف ایسی زمینوں تک ہی محدود نہ رکھا جاتا تھا جس پر واقعی کھیتی کی گئی ہو بلکہ اس عمل کے دائرہ میں وہ زمینیں بھی آجاتی تھیں جو قابل کاشت تصور کی جاتی تھیں[1] چنانچہ عہد عالمگیری میں یہ شکایت مستقل سننے میں آتی ہے کہ مقامی افسران جو اعداد و شمار بھیجتے تھے وہ قابل کاشت زمینوں کے متعلق ہوا کرتی تھیں اور علیحدہ طور پر ایسی زمینوں کے متعلق نہیں جو واقعتہً زیر کاشت ہوں[2] کچھ ناقابل کاشت زمینیں مثلاً وہ جن پر آبادی، تالاب، نالے اور جنگل ہوں وہ بھی پیمائش میں آجاتی تھیں[3]

(باقی حاشیہ صفحہ 21)

(اس لئے) مزروعہ زمین کی جب ایک بار پیمائش کر لی گئی ہو تو پھر (پیمائش شدہ رقبہ میں) ہر سال اضافہ کر کے ایک جزوی نسق قائم کر دینا چاہئے۔" (اکبر نامہ ج 3 ص 380، Add 247، 27 ورق 331 ب) نابود کی شمولیت کے لئے آئین اکبری ج ا ص 288 پر ملاحظہ ہو آئین بنگہی۔

یہ بتا دینا ضروری ہے کہ دور حاضر کے زیادہ قریبی زمانہ کے شماریات میں جو اعداد دیئے گئے ہیں وہ زیر فصل رقبہ کے نہیں بلکہ زیر تخم رقبہ کے ہیں۔

[1] قابل زراعت زمین کی پیمائش، دستور العمل عالمگیری کے ورق 36 ب پر موازنہ و معاملہ کے مسودہ میں اور سہیل (برار) کے مواضعات و پرگنہ کے سن 1682 - 83ء (مطابق 1090 فصلی) سے متعلق ایک محفوظ کاغذات میں ملتی ہے جس کا بیان و تجزیہ وائی۔کے۔دیش پانڈے نے کیا ہے۔ کاروائی Indian Historical Records Comuission 1929 pp.84-86 اس سلسلہ میں وہ اعداد بھی ملاحظہ ہوں جو مرآۃ ج ا ص 25 پر ٹوڈرمل کے گجرات کی پیمائش سے منسوب کیے جاتے ہیں جن میں مزروعہ زمین کا نہیں بلکہ قابل کاشت زمین کا رقبہ درج ہے۔

[2] فرمان عالمگیری بنام راسک داس کروڑی اور نگارنامہ منشی ورق 99 الف اور Bodl اوراق 74 ب 75 الف مطبوعہ 77 میں مندرج پروانہ۔

[3] ناقابل کاشت زمین کی وہ قسمیں جن کا اوپر متن میں ذکر آیا ہے، دستور العمل عالمگیری، ورق 36 ب پر بانات کی زمین کے اضافہ کے ساتھ درج ہیں۔ باغات کی زمین کو علیحدہ کرنے کے بعد رقبہ جسے ناقابل کاشت قرار دیا گیا ہے کل پیمائش شدہ رقبہ کا 4.1 فیصدی ہوتا ہے۔ اس کے باوجود سہیل پرگنہ کے کاغذات میں ناقابل کاشت زمین کو کل کا ایک چوتھائی دکھایا گیا ہے لیکن اس کا زیادہ تر حصہ (505 میں 430 بیگھے) چراگاہ کا تھا) (کاروائی Indian Historical Records Commission 1929 pp.84-85

(باقی صفحہ آئندہ پر)

لیکن ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ اس نوعیت کی پیمائش مواضعات اور آبادیوں کے نزدیک تک محدود رہتی ہوگی اور بڑے جنگلوں اور بیابانوں کو اس میں شامل نہ کیا جاتا تھا۔ اس لیے یہ رقبہ معمولاً پیمائش شدہ رقبہ کا بہت ہی مختصر جز در رہا ہوگا۔

لہٰذا مغلیہ کاغذات میں مندرج پیمودہ آراضی اجمالی طور پر دور حاضر کے شماریات کے ان تین زمروں کی زمینوں کے مترادف ہے۔ رقبہ جس پر فصل کھڑی (یا جس پر تخم ریزی ہوئی) ہو، حالیہ پرتی اور پرتی کے علاوہ دیگر قابل زراعت ویرانے۔ ظاہر ہے کہ جہاں ایسی زمین جس پر واقعۃً فصل آگی ہو صحیح طور پر متعین کی جا سکتی ہے، وہاں اصطلاح 'قابل زراعت' کے متعدد مفہوم ہو سکتے ہیں اور یہ بتانا مشکل ہے کہ دور مغلیہ اور دور حاضر کے مرتبین شماریات نے اس مفہوم کو متعین کرنے کے لیے کوئی یکساں معیار قائم کیا تھا یا نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان دونوں ادوار میں کوئی بھی یکساں معیار قائم کیا گیا۔[1] پھر بھی یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ مغلیہ اور برطانوی دونوں ادوار کے مقامی افسروں کا یہی رجحان رہا ہوگا کہ صرف ایسے ویرانوں کو قابل کاشت قرار دیں جو بحالت موجودہ کسی زیر کاشت زمین سے متصل واقع ہوں نہ کہ وہ ویرانے جو اپنے اندر قابل زراعت بنائے جانے کی صلاحیت رکھتے ہوں یعنی شلاً ایسے ویرانے جو بڑے بڑے جنگلوں کو کاٹ چھانٹ کر

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ممکن ہے چراگاہ کی زمین واقعۃً ناقابل کاشت نہ رہی ہو لیکن وہ اس زمرہ میں اس لیے شامل کر لی گئی ہو کہ وہ بیرونی مداخلت محفوظ تھی۔ یہ تخمینہ مستند طور پر لگایا گیا ہے کہ چراگاہ کی زمینیں موجودہ شماریات کے قابل کاشت ویرانوں کا تین چوتھائی اور ایسے ویرانوں کا جو کاشت کے لیے دستیاب نہ ہوں صرف ایک چوتھائی حصہ ہیں

Royal Commission of Agriculture in India, Report, p.177 مرآۃ ا، ص25 میں زمین پیمودہ کے 'ناقابل کاشت جزو' کو جو "آبادی، وجنگل" وغیرہ پر مشتمل تھا کل پیمائش شدہ رقبہ کا تقریباً ایک تہائی دکھایا گیا ہے۔ یہ بات صاف نہیں ہے کہ اس میں چراگاہ کی زمین شامل تھی یا نہیں۔ اگر یہ اس میں شامل نہ تھی تو پھر ویرانوں کے اتنے بڑے وسیع رقبوں کو پیمائش کرنے کا کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا۔

[1] Royal Commission on India, Report - pp. 604 & 605 میں بتایا گیا ہے کہ دور حاضر کے اعداد و شمار میں 'قابل کاشت ویرانے'، اور 'زمین جو کاشت کے لیے دستیاب نہ ہو سکیں' انکی دو علیحدہ علیحدہ زمروں میں تقسیم بالکل من مانی ہے اور کبھی کبھی قابل کاشت ویرانوں میں وہ زمین بھی شامل ہوتی ہے جو در حقیقت قابل کاشت نہ ہو۔

صاف کیے جانے کے بعد یا کسی بعید مقام سے نہروں کو ان کے پاس پہنچا دیئے جانے کے بعد قابل زراعت ہوسکیں۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ عام طور پر قابل کاشت ویرانے جو اس طور پر متعین کیے جائیں (یعنی جو فی الحال کسی مزروعہ زمین کے متصلاً واقع ہوں۔ مترجم) ان کے رقبے اور اس زمین کے رقبہ میں جو واقعتہً زیر کاشت ہو معمولاً ایک معین تناسب موجود ہوگا۔ اگر یہ نقطۂ نظر تسلیم کر لیا جائے تو پھر مغلیہ دور کے پیمائش شدہ رقبہ کے شماریات کا دور حاضر کے قابل کاشت رقبہ کے شماریات سے موازنہ کرنا مفید ہوگا کیونکہ ایسا کرنے سے درمیانی مدت میں کاشت کے رقبہ میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان کا ایک سرسری اندازہ لگایا جا سکے گا۔

دونوں ادوار کے اعداد و شمار میں دیئے ہوئے مواضعات کی تعداد کے باہمی تقابل میں کسی الجھن کے پیدا ہونے کا خطرہ نسبتاً بہت کم پایا جاتا ہے۔ مواضعات معمولاً مری اور نمایاں اکائیاں ہوتے ہیں اس لیے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ان کا ہمیشہ صحیح شمار کیا جا سکتا ہے[1] تاہم بہ اعتبار آبادی در رقبہ ایک مقام اور دوسرے مقام کے مواضعات کی اوسط جسامت میں فرق ہو سکتا تھا۔ لیکن ہمارے لیے ان میں ایک صدی اور دوسری صدی میں جو فرق ہوتا تھا وہ زیادہ اہم ہے۔ لہٰذا صرف مواضعات کے اعداد و شمار کے باہمی تقابل سے ہمیں مغلیہ دور کے مزروعہ رقبہ کا تخمینہ لگانے میں براہ راست کوئی مدد نہ مل سکے گی۔ البتہ ان اعداد کا دوسری معلومات، خصوصاً رقبہ کے اعداد و شمار کے ساتھ ملا کر مطالعہ ہمارے لیے تائیدی وقعت کا حامل ہو سکتا ہے۔

دور مغلیہ اور دور حاضر کے شماریات کے کسی بھی تقابلی مطالعہ کے لیے ضروری ہے کہ سلطنت مغلیہ کی علاقائی اکائیوں کے حدود صحیح طور پر متعین کیے جائیں۔ آئین اکبری میں گنگا کی وادی کے صوبوں کے تحت محالوں کی جو فہرست درج ہے ان کے جائے وقوع کے متعلق مفصل تحقیقات اس وقت موجود ہیں[2] لیکن سلطنت مغلیہ کے بقیہ حصوں کے صوبوں اور سرکاروں کے حدود کا تعین

---

[1] یہ کہنا کہ مواضعات ہمیشہ نمایاں اکائیاں ہوتے تھے، غالباً پورے ہندوستان کے لیے درست نہ ہوگا، مثلاً ممکن ہے بنگال ایک استثنا ہو۔ دور حاضر کی مردم شماریوں میں بھی مواضعات بالگزاری اور واقعتہً موجود مواضعات میں فرق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن ان میں جو اعداد ملتے ہیں وہ آخر الذکر ہی کے متعلق ہیں۔

[2] مغلیہ صوبجات دہلی، آگرہ، الہ آباد و اودھ کے ان حصوں کے لیے جو برطانوی شمالی مغربی صوبہ (بہ استثنا اودھ) میں واقع تھے، ملاحظہ ہو Elliot, 'Memoirs Memoirs & " (باقی صفحہ آئندہ پر)

بہت ہی سرسری طور پر اور بعض صوبوں میں محض عارضی طور پر کیا جا سکتا ہے جو آئین اکبری میں مندرجہ فہرست کے زیادہ معروف اور بہ سہولت قابل شناخت مقامات کی بنیاد پر ممکن ہے۔[1] صوبجات دکن میں حدود کے تعین کے سلسلہ میں اٹھارہویں صدی کی تصنیف موسومہ دستور العمل شاہنشہی[2] سے بھی مدد لی گئی ہے کیونکہ اس میں اس علاقہ کے محالوں کی فہرست دی ہوئی ہے جو مملکت میں آئین اکبری کے مابعد زمانہ میں شامل کئے گئے۔

واضح رہے کہ مغلیہ مملکت کی علاقائی تقسیموں کے حدود مستقل طور پر ایک سے نہیں رہے ان حدود میں متعدد اہم تبدیلیاں ہمارے علم میں ہیں جو بمقابلہ شمالی ہندوستان کے دکن میں

(باقی حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

o. of the North Western Provinces,' ed. —

Beams, ii, pp. 82- 146 & 203-6 — مع نقشہ بالمقابل ص 203

اودھ کے لیے J. Beames, 'On the Geography of India in the Region of Akbar,' Part i, JASB, L III (1884), pp. 215-32

بہار کے لئے Ibid, Part ii, JASB, L IV (1885), pp. 162-82 مع نقشہ

بنگال کے لئے Blochmann, Contribution to the Geography & History of Bengal (Muhammadan Period)', Part I, JASB, XIII (1873) pp. 209-310; J. Beames, ' Notes on Akbars', JRAS, 1896 pp. 83-136

اوڑیسہ کے لئے J. Beames in JRAS, 1896 pp. 743 — 65 مع نقشہ اور Man Mohan Chakravarti in JASB, N.S., XII, pp. 29-56

[1] پنجاب کے Dr. I. R. Khan's Historical Geography of the Punjab and Sind, Muslim University Journal, ii, No. 1, JAN, 1934 pp. 31-55

مفید ہے حالانکہ یہ تصنیف مکمل نہ ہو سکی اور نہ وہ نقشے ہی چھپ سکے جن کا اس میں ذکر آیا ہے۔

اکبری مملکت کے تمام صوبوں کے نقشوں کا ایک سلسلہ اب علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں زیر نگرانی پروفیسر سید نور الحسن اور مسٹر مونس رضا تیار کیا گیا ہے۔ ان نقشوں میں آئین اکبری میں مندرج محالوں کی فہرست کی بنیاد پر صوبوں اور سرکاروں کے حدود دکھائے گئے ہیں۔ امید کہ یہ نقشے ایک اٹلس کی شکل میں جلد چھپ سکیں گے۔

[2] Add. 22831 میں مواضعات اور مالگذاری کے شماریات محال وار دیئے گئے ہیں۔ اس میں انتظامی تاریخ کے بھی چند ایسے حوالے ملتے ہیں جو کسی اور ماخذ میں آسانی سے نہیں ملتے۔

زیادہ پیش آئیں کیونکہ وہ علاقہ فوجی اقدامات کا مستقل جولاں گاہ بنا ہوا تھا اور مملکت میں تھوڑا تھوڑا کرکے شامل کیا گیا[1] خاص طور پر عہد عالمگیری کے شماریات سے رجوع کرتے وقت ہمیں ان تبدیلیوں کو ضرور یاد رکھنا چاہیے۔

ہر چند کہ مملکت مغلیہ کی علاقائی تقسیموں کی بالکل صحیح حد بندی کے لئے ہمیں اس وقت کا انتظار کرنا ہوگا جب اس دور کے تمام یا بیشتر محالوں یا پرگنوں کے حدود نقشوں پر متعین ہو جائیں، پھر بھی ہم غلطی کی گنجائش کو علاقوں کے صرف ان بڑے بڑے ٹکڑوں کو اپنے پیش نظر رکھ کر جن کی

---

[1] حسب ذیل تبدیلیاں خاص طور پر ذہن نشین رکھی جائیں:

قیاس ہے کہ میر جملہ کی آسام کی مہم کے بعد کامروپ کی سرکار بنگال میں شامل کی گئی (موازنہ بہ چہار گلشن ورق 53 الف و سرکار صفحہ 133) شائستہ خاں کی 1666ء میں چٹگانوں (چٹاگانگ) کی فتح کے بعد تحریری اندراجات میں کوئی فرق نہیں ہوا کیونکہ (بحیثیت ایک سرکار کے) چٹگانوں کا اندراج "آئین اکبری" میں پہلے ہی سے مملکت کے ایک جزو کے طور پر چلا آرہا تھا۔ اڑیسہ جس کا اندراج آئین اکبری میں بحیثیت بنگال کی ایک سرکار (حقیقتاً ایک تحتی صوبہ) کے ہے، عہد شاہجہانی کے مالی کاغذات میں، مجالس السلاطین، ورق 14 الف 15 ب کی تحریر کے بعد سے بحیثیت ایک جداگانہ صوبہ کے ملنا شروع ہوتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرکار جونپور تھوڑے عرصہ کے لیے الہ آباد سے کاٹ کر صوبہ بہار میں ملادی گئی تھی (ملاحظہ ہو ایضاً Selected Documents of Shahjahan's Region p.:112 لیکن تقریباً 1659 میں اسے دوبارہ صوبہ الہ آباد میں شامل کر لیا گیا۔ (موازنہ بہ دستور العمل عالمگیری، ورق 114 الف)

تیجارہ اور نارنول کی سرکاریں، صوبہ آگرہ سے، صوبہ دہلی کو عہد شاہجہانی کے اختتام کے قبل ہی منتقل کر دی گئی تھیں (ایضاً ورق 109 الف و ب، چہار گلشن، ورق 30 ب، اور Sarkar, pp. 125, 126)

ٹھٹھہ کی سرکار (یا تحتی صوبہ) مجالس السلاطین کی تحریر کے وقت تک صوبۂ ملتان میں شامل تھی لیکن اوڑیسہ کی طرح یہ بھی بعد کی تحریروں میں بطور ایک جداگانہ صوبہ کے ملتی ہے۔ لیکن اس کی ایک سابقہ سرکار سیوستان، ملتان ہی میں رہی (موازنہ بہ دستور العمل عالمگیری، ورق 110 ب- 111 الف، چہار گلشن، ورق 44 الف و ب اور Sarkar, PP. 130-131

معلوم ہوتا ہے کہ شروع ہی سے صرف کاغذی اندراجات کی حد تک کشمیر کابل کی ایک سرکار یا تحتی صوبہ تھا لیکن، مجالس السلاطین کے شماریات مال اپنی نوعیت کی آخری تحریر ہے جس میں کشمیر، کابل کے ایک تتمہ کے طور پر دیا گیا ہے۔ آئین اکبری کی تصنیف کے وقت سرکار سروہی، صوبۂ اجمیر میں شامل تھی لیکن یہ ایک (باقی صفحہ آئندہ پر)

نسبتاً زیادہ صحیح طور پر حد بندی کی جا سکتی ہے کافی کم کر سکتے ہیں۔ اس طور پر زیادہ صورتوں میں ایسی ترتیب قائم کی جا سکتی ہے کہ ایسے دو بڑے ٹکڑوں کے درمیان مشتبہ علاقوں کا رقبہ بمقابلہ اس رقبہ کے جو ان میں سے ہر ایک کا قطعی طور پر معلوم ہے بالکل نا قابل لحاظ ہو جائے۔ اس طریقۂ کار سے بھی اگرچہ فی الوقت مغلوں کے صوبجات لاہور اور ملتان کے درمیان صحیح حد بندی تو ضرور مشکل ہوگی لیکن ان علاقوں کے حدود جو پورے صوبۂ لاہور اور صوبۂ ملتان کی سرکار ملتان اور دیپال پور میں شامل تھے اچھی خاصی صحت کے ساتھ متعین کئے جا سکیں گے۔ واضح رہے کہ یہ بھی ایک استثنائی صورت ہوگی کیونکہ بیشتر مغلیہ صوبوں اور ان کی سرکاروں کے اکثر مجموعوں کو جدا جدا منفرد ٹکڑے تصور کر کے نقشہ پر ان کے حدود بغیر کسی سنگین غلطی کے خطرہ کے متعین کئے جا سکتے ہیں

ہم دورِ حاضر کے شماریات کے متعلق یہ مطالبہ کرنے میں کہ وہ مفصل اور نیز مکمل ہوں حق بجانب ہوں گے۔ حالانکہ ضلعوں سے چھوٹی علاقائی تقسیموں کے متعلق زرعی شماریات اور مردم شماری کے

(باقی حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

نامعلوم زمانہ میں جس بلہ ڈونگر پور اور سروہی سرکاروں میں منقسم ہو کر گجرات کو منتقل کر دی گئی (موازنہ بہ مرآۃ ضمیمہ 225-226)

شاہجہاں نے اپنے عہد حکومت کے آٹھویں برس، مالوہ سے اس کے وہ تمام علاقے جو دریائے نربدا کے جنوب میں واقع تھے یعنی بیجا گڈھ اور نندربر کی سرکاریں اور ہنڈیا کے بیشتر محالوں کو خاندیش منتقل کئے جانے کا حکم صادر کیا تھا (لاہوری ج احصہ (2) ص 62، 63 صادق خاں Or 174، اوراق 60 الف۔ 61 الف Or 1671 اوراق 33 ب 34 الف۔ دستور العمل شاہنشہی، اوراق 29 الف 32 الف 34 ب) اور بگلانہ کو 1638ء میں فتح ہو جانے کے بعد تھوڑے ہی عرصہ تک بطور ایک جداگانہ اکائی (ملک) تصور کیا گیا لیکن 1658ء میں یا اس کے لگ بھگ اسے بطور ایک سرکار کے خاندیش میں شامل کر دیا گیا (صادق خاں Or 174 اوراق 60 ب۔61 الف 87 ب 88 الف Or 1671 اوراق 33 ب۔ 34 الف 48 الف۔ دستور العمل شاہنشہی ورق 29 ب) شاہجہاں نے غالباً اپنے عہد حکومت کے آٹھویں سال سرکار تلنگانہ کو برار سے نکال کر ایک علیحدہ صوبہ بنایا (لاہوری ج (1) (2) ص 62، 63، 205 لیکن اس کے دورِ حکومت کے ختم ہوتے ہوتے اسے بیدر میں جو حال ہی میں فتح ہوا تھا شامل کر کے بیدر کو ایک نئے صوبہ کی حیثیت دی گئی (دستور العمل شاہنشہی ورق 80 الف)

شمالی کونکن یا کال کونکن نظام الملکی کو بیجا پور میں احمد نگر کی آخری فتح کے بعد شامل کیا گیا لیکن اسے بظاہر 1657ء میں اورنگ زیب کی بیجا پور کے خلاف مہم کے بعد صوبۂ اورنگ آباد سے ملحق کیا گیا (ایضاً ورق 77 ب 78 الف وعمل صالح ج 3، ص 262۔ 263

گوشوارے بھی شائع ہو چکے ہیں[1]۔ لیکن چونکہ اس وقت ہمارے پیش نظر صرف بڑے علاقے ہیں، لہٰذا ضلعوں کے سالانہ زرعی اعداد و شمار کے سلسلوں کو کافی تصور کیا گیا[2]۔ پس مواضعات کے لیے مردم شماری کی رپورٹوں میں مندرج ضلع وار شماریات مصرف میں لائے گئے ہیں۔ ہندوستانی ریاستوں کے متعلق خصوصاً ابتدائی برسوں کے زراعت اور مردم شماری دونوں ہی کے اعداد و شمار اکثر ناکمل ہیں، اس لیے ان کے متعلق بعد کے برسوں یا امپریل گیزیٹر کے اعداد و شمار سے معلومات حاصل کئے گئے ہیں۔ واضح رہے کہ معمولاً ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ موجودہ صدی کے اوائل کی قریبی مدت کے شماریات کو استعمال کیا جائے[3]۔ کچھ تو ایسا اس لئے کیا گیا ہے کہ اس نوعیت کے تقابلی مطالعوں کے پیشرو مورلینڈ نے اسی مدت کے اعداد سے کام لیا ہے اور کچھ اس یقین کے تحت کہ چونکہ یہ وہ مدت تھی جبکہ ہندوستان برطانوی حکومت کے معاشی اثرات کو اپنی غیر مخلوط شکل میں محسوس کر رہا تھا۔ لہٰذا سابقہ حکومتوں کے بہترین ایام کے حالات سے تقابل کے لئے یہ بہت ہی موزوں ہوگی۔

ہمارے علاقائی جائزہ کی ابتدا کے لئے بنگال سب سے زیادہ موزوں رہے گا کیونکہ یہ سلطنت کا بعید ترین مشرقی صوبہ تھا۔ اس صوبہ کے اعداد و شمار رقبہ، آئین اکبری میں نہیں پائے جاتے اور دور عالمگیری کے اندراجات میں اس کے مواضعات کی ایک بہت ہی مختصر تعداد بطور "نمود" دکھائی گئی ہے۔ دور عالمگیری میں[4] بہ استثنا کا مروپ اس صوبہ میں 109923 مواضعات اور 1881ء میں اسی علاقہ میں 116153 مواضعات تھے۔ ان ایام کے گوشواروں سے یہ بات قطعی طور پر

---

[1] اگر کوئی شخص کسی مخصوص سال کے شماریات سے دلچسپی نہ رکھتا ہو تو ان اطلاعات کے لیے ڈسٹرکٹ گیزیٹیرس، بہترین ماخذ ثابت ہوں گے۔

[2] حکومت ہند کے صیغۂ مال و زراعت (اور اس کے جانشین محکمہ جات) کے جاری کئے ہوئے 'The Agricultural Statistics of India' جو غیر معین وقفوں پر طبع ہوتے ہیں۔

[3] زرعی اعداد و شمار جو استعمال میں لائے گئے ہیں وہ بیشتر سنوات 1899-1900ء 1909-10ء و 1920-21ء اور سنوات 1881ء 1891ء اور 1901ء کی مردم شماری کے ہیں۔ بعد کے گوشوارے اسی صورت میں استعمال کئے گئے ہیں جب اس کے قبل کے نامکمل یا سہل الحصول نہ تھے۔

[4] صوبہ میں مواضعات کی مجموعی تعداد کو اندراجات دور عالمگیری اور چہار گلشن دونوں متفقہ طور پر 112788 بیان کرتے ہیں۔ اس تعداد سے سرکار کامروپ کے لیے جس کے حدود غیر متعین ہیں، چہار گلشن کے مخطوطہ Bodl ورق 53 الف کی بنیاد پر اعداد قائم کئے گئے ہیں۔

واضح ہوتی ہے کہ صوبہ کا بیشتر علاقہ آباد تھا۔[1] آئین اکبری میں مندرج محالوں کی فہرست کی جانچ کے بعد بلاکمین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دور مغلیہ میں اس کے دنوں (1873ء) کی طرح کاشت کا سلسلہ سندربن کے ڈیلٹائی علاقہ تک پھیلا ہوا تھا۔[2] دور مطالعہ کے بیشتر ایام میں ڈیلٹائے سندربن کے مشرقی علاقے موگھ قزاقوں[3] کو سفاکانہ غارتگری کا شکار اور غیر آباد رہے۔ ضلع باقر گنج (بیکر گنج) میں وسیع پیمانہ پر دوبارہ آبادکاری کا سلسلہ 1665ء میں اراکان[4] کی کامیاب مہم کے بعد ہی شروع ہو سکا، حالانکہ جزیرۂ سندیپ کو ایک باغی[5] سردار پہلے ہی آباد کر چکا تھا۔ بمقابلہ حال کے اس وقت مزید مشرق کی طرف جنگلات کا سلسلہ غالباً زیادہ وسیع تھا۔ موگھوں[6] کے دور میں علاقۂ چٹگانوں (چٹاگانگ) بہت گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا تھا، اس لئے مغلوں کے تحت اس علاقہ کے جنگلوں میں بازیابی کا کام بہت مختصر پیمانہ ہی پر ہو سکتا تھا۔[7] اٹھارہویں صدی تک ضلع سلہٹ میں گھنے جنگل موجود رہے[8] اور ممکن ہے کہ بھوال یا مدھوپور کے جنگل نسبتاً زیادہ وسیع رہے ہوں[9]

بدقسمتی سے اڑیسہ کے متعلق وثوق کے ساتھ کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ اس دور میں اس کے صحیح حدود اربعہ متعین نہیں کئے جا سکتے اور اس کے متعلق دور حاضر کے مطبوعہ شماریات بھی یا تو نامکمل ہیں یا اس کی کثیر التعداد چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے بارے میں وہ کافی مفصل نہیں ہیں

دور عالمگیری کے شماریات میں بہار کا رقبہ پیمودہ دیا گیا ہے۔ اس رقبہ کو اگر بیگھۂ دفتری سے بیگھۂ الٰہی میں تحویل کیا جائے تو یہ آئین اکبری میں مندرجہ رقبہ کے تین گنے سے زائد ہوتا ہے۔

---

1. Manrique, Vol. 11, 123 & Bernier, 202 & 441-42
2. JASB, XLII, 1873, PP. 227, 228, 231-2
3. فتیہ عبدیہ اوراق 122 ب، 123 ب 164 الف۔ ب، 173 ب Master, 11,66' Bernier, 175
4. JASB, XLII, 1973, PP. 228, 229, 232
5. فتیہ عبدیہ اوراق 142 الف۔ ب 143 / ب، 144 الف 150 الف
6. ایضاً ورق 164 الف۔ ب۔
7. JRAS, 1896, P. 127
8. آئین اکبری ا۔ 391 اور JRAS, 1896, P. 131
9. یہ جنگل سرکار بزوہہ میں واقع تھا۔ آئین اکبری ا۔ 390 اور JRAS, 1896, P. 127

لیکن باوجودیکہ پیمودہ مواضعات کی تعداد کل مواضعات کی تعداد کے نصف سے زائد دکھائی گئی ہے، پھر بھی دورِ عالمگیری کا رقبہ 1899 - 190ء میں مندرج کل قابلِ زراعت رقبہ کا بقدر ایک چہارم ہی ہوتا ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ مغلوں نے پیمائش کے عمل کو صرف دریائے گنگا کے کنارے کے تنگ اور گنجان آباد علاقہ کے مواضعات تک محدود رکھا ہو اور یہ مواضعات بمقابلہ اس علاقہ کے باہر کے مواضعات کے جسامت میں چھوٹے رہے ہوں۔ لیکن پھر بھی رقبہ میں جو فرق رہ جاتا ہے وہ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس صوبہ کے مواضعات کی دی ہوئی تعداد عملاً وہی ہے جو 1881ء کی مردم شماری میں ملتی ہے۔ 'چہار گلشن' کے اندراجات سے پتہ چلتا ہے کہ یہی حال ان چار سرکاروں کا بھی تھا جو کلیتہً دریائے گنگا کے شمال میں واقع تھے، اگرچہ مونگیر جو بہ سمت مشرق اس صوبہ کی آخری سرکار تھی اور جس کا علاقہ گنگا کے پار ترائی کے علاقہ تک پھیلا ہوا تھا کے مواضعات کی تعداد نسبتاً بہت کم ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ تصور نہ کرنا چاہیئے کہ اس حصہ میں ترائی کے جنگلوں کا مکمل غلبہ رہا ہوگا۔ آئینِ اکبری میں مندرج کچھ محال نیپال کے اندر بالکل دامنِ کوہ میں واقع تھے جبکہ زیادہ جنوب میں واقع وسیع رقبوں کا کہیں ذکر نہیں ملتا اور ایسے رقبے ان دنوں بظاہر جنگل تھے۔ اس وقت کے بیابانوں کا کافی رقبہ صاف کر دیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کے صاف کئے ہوئے کچھ علاقے اب پھر جنگل بن چکے ہیں[1]۔

بہار کے مغرب میں الہ آباد اور اودھ کے دو صوبے واقع تھے۔ اول الذکر میں دریائے گنگا کے دونوں جانب کے وسیع علاقے جو جنوب میں گھیں گھنڈ اور بندیل کھنڈ کے اندر دور تک پھیلے ہوئے تھے اور دریائے گنگا اور جمنا کے دوآبہ کے زیریں اور نیز دریائے گنگا اور گھاگرہ کے دوآبہ کے علاقے شامل تھے۔ صوبہ اودھ اس کے شمال میں دریائے گنڈک تک بہ سمت مشرق اور دریائے گنگا تک بہ سمت مغرب پھیلا ہوا تھا۔ آئینِ اکبری کے دورِ تصنیف میں ان دونوں صوبوں کے زیرِ کاشت رقبہ کا ایک بہت ہی مختصر حصہ پیمائش شدہ تھا[2]۔ لیکن بظاہر اگلی صدی میں پیمائش

---

[1] موازنہ بہ Beames, JASB, LIV, P.177 سرکار چمپارن کا محال سمرانوں نیپال کے اندر تک پھیلا ہوا تھا اور اس کے دارالسلطنت کے کھنڈرات "گنجان جنگلوں" میں موجود ہیں۔ برخلاف اس کے بتیا کا نواحی علاقہ زیادہ قریبی زمانہ کا صاف کیا ہوا بتایا جاتا ہے۔

[2] یہ آئینِ اکبری کے ان اندراجات سے واضح ہوتا ہے جس میں الہ آباد کا مزروعہ رقبہ (باقی صفحہ آئندہ پر)

کا دائرہ عمل کافی وسیع ہوگیا۔ دورِ عالمگیری کے شماریات سے واضح ہوتا ہے کہ صوبۂ الہ آباد کے خلاً سبھی مواضعات زیرِ پیمائش آچکے تھے۔ اس وقت اس صوبہ کا رقبۂ زیرِ پیمائش 1909-10ء کے قابل کاشت رقبہ کا تقریباً نصف تھا اور صوبۂ اودھ کے مواضعات میں ایک تہائی سے کافی زیادہ غیر پیمائش شدہ تھے اور پیمائش شدہ رقبہ 1909-10ء کے رقبہ کا تقریباً دو بٹہ پانچ تھا۔

دورِ مغلیہ میں ان دونوں صوبوں کے مواضعات کے دیئے ہوئے اعداد، 1881ء کی مردم شماری میں مندرج اعداد سے بہت زیادہ تھے۔ یہ اضافہ الہ آباد کی تعداد میں بقدر ایک تہائی اور صوبۂ اودھ میں بقدر ایک نصف ملتا ہے۔ لیکن سرکار گورکھپور کے مواضعات کی تعداد تقریباً وہی تھی جو اس علاقہ کی مردم شماری مذکور میں درج ہے، یعنی سرکار گورکھپور کے مواضعات کو اودھ کے دیگر حصوں کی طرح موجودہ زمانہ کی مردم شماری کے بالمقابل عددی فوقیت حاصل نہ تھی۔[1] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سرکار غالباً کاشتکاری میں زیادہ پسماندہ تھی۔ یہی نہیں، بلکہ صوبہ دار اودھ نے تو عہد عالمگیری کے سینتالیسویں برس اس علاقہ کو "بالکل ویران" بتایا ہے۔[2] اس سرکار کا بیشتر حصہ ترائی پر ضرور مشتمل رہا ہوگا۔ ٹیورنیسر کے ایک بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہر گورکھپور کا تمام تر شمالی حصہ جنگل تھا۔[3] ہمارے علم میں بھی ہے کہ اس علاقہ میں گذشتہ صدی کے اوائل تک یہاں پرانے جنگلات کا تسلط قائم رہا۔ پھر انہیں صاف کرکے زمین کو مصرف میں

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

تقریباً 40 لاکھ بیگھہ اور اودھ کا ایک کروڑ بیگھہ سے قدرے زائد بیان کیا گیا ہے، جبکہ دورِ عالمگیری کے اندراجات کے مطابق یہ اعداد رقبہ کی ایک مشترک اکائی میں تحویل کئے جانے کے بعد ایک کروڑ 31 لاکھ بیگھہ اور ایک کروڑ 27 لاکھ بیگھہ ہوتے ہیں اور دورِ عالمگیری تک اودھ کے ایک تہائی سے زائد مواضعات کی پیمائش نہیں ہوئی تھی۔

اس لیے مورلینڈ کی یہ ایک بدیہی غلطی ہے کہ وہ آئین اکبری میں مندرج رقبہ کو مجموعی رقبۂ زیرِ فصل تصور کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ دریائے گھاگرہ اور گنگا کے دوآبہ کے رقبۂ زیرِ کاشت میں اس وقت سے پانچ گنا اور علاقہ ماورائے گھاگرہ میں سترہ گنا بلکہ ممکن ہے چالیس گنا اضافہ ہوا ہو۔ Journal, U.P. Historical Society, ii (1919), P. 18 ff

[1] سرکار گورکھپور کے مواضعات کی تعداد چہار گلشن ورق 59 الف پر درج ہے Sarkar, P.137 میں اس سرکار کے اعداد لکھنؤ کے اعداد سے بدل دیئے گئے ہیں۔ چہار گلشن میں گورکھپور کے تحت کوئی رقبہ درج نہیں ہے۔

[2] اخبارات $\frac{47}{320}$ سرکار گورکھپور کا نیا نام معظم آباد گورکھپور یا صرف معظم آباد رکھا جا چکا تھا۔

[3] Javernier ii, P. 205

لانے کا ایک عام عمل شروع ہوا۔[1] اس وقت جنوب میں دریائے گھاگرہ کے اس پار جنوب میں ٹونس ندی کے کنارے کنارے ضلع اعظم گڑھ کے مشرقی حصہ میں ایک گھنا جنگل تھا جس کے اب کوئی آثار نہیں ملتے[2] لیکن یہ خیال کہ اس جنگل کا سلسلہ آگے بڑھ کر جونپور اور الہ آباد کے درمیان تک پھیلا ہوا تھا ہمارے ماخذ کے متعلق ایک غلط فہمی کی بنا پر ہے کیونکہ دیگر ذرائع سے معلوم ہے کہ حقیقتاً ایسا نہ ہو سکتا تھا۔[3]

---

[1] مفتی غلام حضرت اپنی فارسی تصنیف 'کوائف ضلع گورکھپور' میں جو 1810ء میں یا اس کے قبل لکھی گئی تھی۔ بیان کرتے ہیں کہ شہر گورکھپور دو سمتوں پر جنگلوں سے گھرا ہوا تھا اور پر گنہ جات 'آنولہ' (تیمیم مابعد)، 'بانسی' حلبٹ بستی' دنگھرا اور گورکھپور کے بعض ٹپوں کے علاقے بہ سبب کسانوں کی کمی یا جنگلوں کی موجودگی یا جنگلی ہاتھیوں کی یورش کے بالکل ویران اور غیر آباد ہیں" (4540 ورق 1 الف) لیکن وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مالگذاری کی کم شرحوں کے نفاذ نے گرد و نواح کے کاشتکاروں کو اس علاقہ کی طرف مائل کرنا شروع کر دیا تھا (اوراق 9 ب و 10 الف) واضح رہے کہ اس وقت کے ضلع گورکھپور میں موجودہ اضلاع بستی و گونڈہ بھی شامل تھے۔ (اضافہ مابعد)؛ اودھ، الہ آباد اور جزو آگرہ کے Rennel کا نقشہ مجریہ 30 جنوری 1780ء (جو اس کے بنگال کے اٹلس' 1781ء میں بطور نقشہ نمبر 5 کے طبع ہوا ہے) اس علاقہ میں ترائی کے جنگل کی بڑی وسعت کے متعلق ہمارے جملہ ماخذ کی فراہم کردہ شہادتوں کی تائید کرتا ہے۔ اس نقشہ میں گورکھپور اور دریائے گنڈک کے تمام درمیانی علاقے (بہ استثنا چھوٹی گنڈک کے نچلے حصہ کے دونوں کناروں پر جنگلوں سے صاف کیے ہوئے علاقہ کے) کو جنگل کے تحت دکھایا گیا ہے۔ گورکھپور کے جنوب میں دریائے راپتی کے دونوں کناروں پر دوبارہ ایک چھوٹا جنگل ملتا ہے۔ گورکھپور کے شمال مغرب میں بانسی جنگل سے گھرا ہوا تھا اور دریائے راپتی کے ٹھیک جنوب میں بلرامپور کے نیچے وسیع جنگل تھا اور اس کے اور ترائی کے جنگل کے درمیان ایک صاف کیا ہوا علاقہ تھا۔

[2] اکبرنامہ 3 ص 266-67۔ اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرد آرندی یعنی چھوٹی سرجو یا مشرقی ٹونس کے جنوبی کنارے پر محمد آباد اور مئو کے درمیان جنگل واقع تھا۔ (اضافہ مابعد) Rennel کے نقشہ مذکورہ بالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1780ء تک یہ جنگل ختم ہو چکا تھا، حالانکہ گورکھپور کے جنوب کا چھوٹا جنگل اس وقت بھی گھاگرہ سے اعظم گڑھ کے قریب کہیں ملتا تھا۔

[3] اپنے سفر کے مختلف راستوں کے تذکرہ کے سلسلہ میں Finch کا یہ بیان جنگلوں کے متعلق ایک ابتدائی سند کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "پس آگرہ تا جونپور اس راستہ سے (یعنی براہ لکھنؤ و اجودھیا) وہاں سے (اس راستہ سے آگرہ واپس ہوتے ہوئے) الہ باس تک 40 کوس تک سب ایک (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

صوبۂ آگرہ وسطی دوآبہ اور دریائے جمنا کے داہنے طرف کے علاقہ کے ایک بڑے حصہ پر دریائے چمبل کے بسمت شمال اور جنوب دونوں طرف واقع ہے مشتمل تھا دورِ عالمگیری میں اس کے تقریباً تمام مواضعات پیمائش شدہ تھے' حالانکہ (تیجارہ اور نارنول کو جو صوبۂ دہلی کو منتقل کر دئے گئے علیحدہ کرکے) اس کا تحریری رقبہ اسی قدر تھا جو آئین اکبری میں درج ہے[1] یہ رقبہ 1909-10ء کے کاغذات

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

جنگل کے درمیان ہے"۔ (Early Travels 171) اس بیان کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جونپور اور الہ آباد کے درمیان ۱۱۰ کوس کا فاصلہ تھا جس میں سے ۳۰ کوس جنگل کا علاقہ تھا Finsb De Laet, 65 کے سفرنامہ کی نقل کرتے وقت اسے اس طور پر پڑھا ہے لیکن 'Early Travels' کے مرتب اور مورلینڈ نے اس بیان کا یہ مفہوم لیا ہے کہ جونپور کا آگرہ تک براہ الہ آباد فاصلہ 110 کوس تھا اور اس فاصلہ کا وہ جزو جو جونپور اور الآباد کے درمیان واقع تھا ۳۰ کوس تھا۔ متن کے بموجب یہ مفہوم معقول نہیں معلوم ہوتا۔ بہرحال کسی بھی مفہوم کے تحت 110 کوس کا فاصلہ ناقابل یقین طور پر غلط تخمینہ پر مبنی ہوگا۔ جونپور اور الہ آباد کے لیے فاصلہ کا یہ تخمینہ بہت زیادہ ہے اور جونپور اور آگرہ کے درمیان کے لیے یہ "بیحد کم تخمینہ" ہوگا۔ اس صورت میں صرف ایک ہی مفہوم ممکن ہے وہ یہ کہ قوسین کے اندر کا یہ فقرہ "اس راستہ سے آگرہ واپس ہوتے ہوئے" اگلے راستہ کی وضاحت نہ کرتا ہو بلکہ اس مفہوم کو ادا کرنے کا یہ ایک مختصر طریقہ ہو کہ ہم کو مذکورہ راستہ سے آگرہ واپس ہونا چاہیے تاکہ وہاں سے سفر کی نئی راہ پر روانگی ہو سکے۔ پس الفاظ "وہاں سے" کا تعلق آگرہ سے ہوگا اور 110 کوس آگرہ اور الہ آباد کا درمیانی فاصلہ ہوگا جو یقیناً ایک معقول تخمینہ ہے۔ اس مفہوم کے تحت پھر 30 کوس کا جنگل اسی راستہ پر کہیں واقع ہوگا۔ غالباً جن گھاٹیوں اور بنجر علاقہ سے بھوگنی پور اور فتحپور کے درمیان کا مستقل راستہ گذرتا ہے ان کے متعلق یہ ایک مبالغہ آمیز بیان ہے۔ (Mundy, 89, 92)

منڈی کی شہادت سے واضح ہوتا ہے کہ الہ آباد اور جونپور کے درمیانی راستہ میں مسلسل جنگل نہ ہو سکتے تھے۔ وہ (ص 110) اس راستہ کی تعریف اور اس کے دونوں جانب کسی بیابانی علاقہ کی موجودگی کا ذکر نہیں کرتا بلکہ اس بات پر اسے افسوس ہے کہ الہ آباد سے پٹنہ جاتے وقت اس نے [illegible] راستہ جو دریائے گنگا کے جنوب سے گزرتا ہے اختیار کیا۔

[1] یاد رہے کہ سرکار آگرہ کے متعلق بلاکمین کے اعداد غلط ہیں Add. 7652 کے مطابق اس تعداد کو اکانوے لاکھ ہونا چاہیے، نہ کہ نو کروڑ دس لاکھ بیگھے۔ آئین اکبری میں سرکار کا عدد اس کے پرگنوں کی مجموعی تعداد سے تقریباً چودہ لاکھ کم ہے Sarkar, 126-7 (چہار گلشن) میں مورخ سرکار آگرہ کے لیے (باقی حاشیہ آئندہ پر)

میں مندرج اسی علاقہ کے قابل زراعت رقبہ کے تقریباً پانچ بٹہ چھ حصہ کے مساوی ہے۔ اس طور پر مورلینڈ نے آئین اکبری کے اعداد و شمار کا وسطی دوآبہ کے زیر فصل رقبہ کے موجودہ اعداد و شمار سے باہمی موازنہ کرنے کے بعد جو نتائج اخذ کئے ہیں ان کا اطلاق عملاً پورے صوبۂ آگرہ پر ہوتا ہے[1] کاغذات عالمگیری میں اس صوبہ کے مواضعات کی تعداد اس تعداد سے جو 1881ء اور اس کے بعد کی مردم شماریوں میں درج ہے تقریباً ایک تہائی زیادہ ہے[2]

ان شماریات سے یہ مجموعی شکل سامنے آتی ہے کہ اس صوبہ کی تقریباً تمام زمین مصرف میں لائی جا چکی تھی۔ اس کی تصدیق پلسارٹ کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ آگرہ کے علاقہ میں ایندھن اور درختوں کی انتہائی کمیابی تھی[3] اس وقت کی تحریروں میں دریائے جمنا کے نواح میں ایک ویران خطہ کی موجودگی کے حوالے ملتے ہیں جہاں اس وقت شیر کا شکار ہو سکتا تھا[4] اور جہاں پہنچکر باغی کسان پناہ تلاش کیا کرتے تھے[5] اس علاقہ سے مراد پہاڑیوں کی وہ مشہور گھاٹیاں ہیں جو غالباً آج بھی اسی وقت کی طرح ویران ہیں۔

صوبۂ دہلی تین نمایاں جغرافیائی اکائیوں پر مشتمل تھا یعنی وہ علاقہ جو اب روہیلکھنڈ کے نام سے موسوم ہے، دوآبہ کا بالائی حصہ اور ہریانہ کا علاقہ۔ عہد عالمگیری تک اس صوبہ کے تقریباً کل مواضعات زیر پیمائش لائے جا چکے تھے اور (بشمول تیجارہ اور نارنول) اس صوبہ کے رقبہ میں آئین اکبری کے اعداد سے ایک تہائی کا اضافہ بھی ہو چکا تھا اور علاوہ اس کے کل رقبہ 1909-10ء کے کاغذات میں مندرج قابل زراعت رقبہ کے تقریباً چار بٹہ پانچ حصہ کے مساوی تھا۔ ساتھ ساتھ

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

دو کروڑ بڑھتا ہے، جبکہ Bodl ورق 39 الف میں اس کی تعداد صرف ایک کروڑ درج ہے اور موخرالذکر بیشک صحیح ہے۔ سرکار نے گوالیار اور کول کے اعداد کو بھی آپس میں تبدیل کر دیا ہے۔

[1] Jour. U.P. Hist. Soc., 11 (1919), P. 19.

[2] بعد کی مردم شماریوں کے اعداد صرف اس صورت میں کیے گئے ہیں جب 1881ء کی مردم شماری میں دیسی ریاستوں کے متعلق کافی تفصیلات نہ مل سکیں۔

[3] Pelsaert 48

[4] تزک جہانگیری 279 لاہوری 1-2، 5

[5] تزک جہانگیری 375 - 6

دورِ عالمگیری کے کاغذات میں مندرج مواضعات کی تعداد 1881ء کی مردم شماری کے اعداد سے تقریباً بقدر نصف زائد تھی۔ 'چہار گلشن' کے مطابق حالاتِ حاضرہ سے موازنہ کی صورت میں دوآبہ اور روہیلکھنڈ کے مابین اس نوعیت کا کوئی خاص فرق نہیں ملتا جیسا کہ مورلینڈ نے اپنے آئین اکبری کے اعداد و شمار کے جائزہ کے سلسلہ میں اشارہ کیا ہے[1]۔ ہمعصر تصانیف میں کچھ ایسے اشارات ضرور ملتے ہیں جن کی مدد سے ہم شمال میں جنگلات کے تخمینی حدود کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ سرکار بدایوں کا محال گولہ جو موجودہ ضلع شاہجہانپور کے ایک بہت بڑے علاقہ پر مشتمل تھا اور اس کا سلسلہ کھیری تک چلا گیا تھا' آئین اکبری کی تصنیف کے دنوں میں تقریباً کلیتہً غیر پیمائش شدہ تھا لیکن 1119 فصلی یا تقریباً 1711ء تک اس محال میں دس ٹپے اور 1484 مواضعات شامل ہو گئے تھے[2]۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ یہ علاقہ پہلے مقامی سرداروں کے قبضہ میں رہا ہو اور اسے ان سے چھین کر اب مملکت مغلیہ کے باضابطہ زیر انتظام لایا گیا ہو[3]۔ لیکن ساتھ ہی اس اضافہ کا یہ سبب بھی ہو سکتا ہے کہ اس علاقہ کے جنگلات کو صاف کر کے زیر کاشت لایا گیا ہو۔ بہر حال اس کا جو بھی سبب ہو' بعد کے کاغذات میں اس محال کے مستقل مواضعات کی کثرت تعداد دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا

1۔ مورلینڈ نے دوآبہ میں تو رقبہ زیر فصل میں معمولی اضافہ پایا تھا لیکن بدایوں وغیرہ کے متعلق اس کا خیال ہے کہ اضافہ بقدر نصف اور بریلی کے متعلق دوگنا اور ضلع بجنور کے ایک حصہ میں تقریباً دوگنا ہوا۔ (Journal U.P. Hist.Soc.11 (1919) PP. 18-19) بدایوں اور بریلی کے موجودہ اضلاع سرکار بدایوں میں واقع تھے۔ 'چہار گلشن' میں مندرج سرکار بدایوں کا رقبہ آئین اکبری میں اس کے مندرج رقبہ کا (مشترک اکائیوں میں تبدیل کرنے کے بعد) دوگنا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ جس اضافہ کو مورلینڈ فرض کرتا ہے وہ کلیتہً سترہویں صدی میں واقع ہوا یا جیسا کہ زیادہ قرین قیاس ہے ایسی صورت ہوئی کہ دورِ آئین اکبری میں کل رقبہ زیر کاشت کی پیمائش نہ ہوئی ہو۔ سرکار بدایوں اور دہلی کی دیگر سرکاروں کے لیے صرف 'چہار گلشن' کے مخطوط .Bodl اوراق 35 الف۔ 36 الف سے استفادہ کرنا چاہیے۔ (Sarkar (PP-124-26 کے اعداد ناقص ہیں اور ان کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔

2۔ 'Qanungo Papers' جن کا Elliot, Memoirs & c. 11, PP 167 8 میں حوالہ آیا ہے

3۔ دورِ شاہجہانی میں ضلع یا علاقہ گولا اور کانٹ (شاہجہانپور) میں ایک زمیندار اور مقامی جاگیر داروں کے درمیان جنگ کا حوالہ صادق خاں۔ Or. 174 ورق 183 ب و Or 1671 ورق 90 الف پر ملتا ہے

جا سکتا ہے کہ دور زیر مطالعہ کے زیر اختتام تک اس محال میں جنگلات کو زیر کاشت لانے کا کام تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔[3-الف] اس کے مزید شمال مغرب میں معلوم ہوتا ہے کہ آنولہ کے چاروں طرف جنگلات کا ایک حلقہ تھا۔[1] جو اب تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔[2] اس دور میں علاقہ رام پور کے جنگلات بظاہر اچھی طرح صاف کیے جا چکے تھے۔[3] لیکن ضلع نینی تال کے میدانوں میں اٹھارہویں صدی کے اوائل تک گھنے جنگل موجود رہے۔[4] برخلاف اس کے دادی دون میں "آباد مواضعات اور محالات" اور

3- الف (اضافۂ ما بعد) Rennel کے بنگال کے اٹلس میں اودھ اور الہ آباد کے 1780ء کے نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہجہانپور کے نواحی علاقے اس وقت تک بخوبی صاف کیے جا چکے تھے جبکہ دریائے گومتی اور اس کے معاون دریائی کے بالائی حصے کے کنارے کے علاقے جنگل ہی رہے۔

1- Elliot, op. cit., ii P. 150 میں مندرج بدایونی کا حوالہ۔ میں اصل نسخہ میں بیان کا پتہ نہ چلا سکا کیونکہ ایلیٹ نے جس مخطوطہ کو استعمال کیا ہے اس کے صفحات کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ بقول ایلیٹ 'یہ لکھتے وقت کہ آنولہ کے ہر چہار سمت 24 کروہ تک جنگل تھے بدایونی بیحد مبالغہ سے کام لیتا ہے۔ آئین اکبری میں آنولہ اور اس کے گردو پیش کے محالوں کا جو رقبۂ پیمودہ درج ہے اس سے بھی اس خیال کی کہ اس علاقہ میں ایک بڑا جنگل موجود تھا تائید نہیں ہوتی۔

2- بہرحال یہ جنگل اب بھی برائے نام موجود ہے کیونکہ پرگنہ آنولہ کا حلقہ موسوم آنولہ جنگل کے نام سے موسوم ہے جہاں اب بھی ڈھاک کے بڑے جنگل ہیں (Moreland "Agricultural Conditions of the United Provinces & Distincts - Notes on Dareilly, p. 5)

3- Elliot, op. cit. ii, P. 138

4- Elliot op. cit. ii, PP. 150-51 کاشی پور اور رودر پور کے اطراف اور ان کے پرلے طرف کے علاقوں کے متعلق اس دور کے دو سیاحوں یار محمد اور Tieffenthaler کی شہادت کا حوالہ دیا ہے۔ یاد رہے کہ جب ایلیٹ یہ بیان کرتا ہے کہ مسلمانوں کی تاریخوں میں "امروہہ، لکھنؤ اور آنولہ کے آگے کے تمام علاقوں کو ایک ایسا ریگستان (کذا) کہا گیا ہے جس کے اندر شاہی افواج گھسنے سے خائف تھیں" تو اس کے ذہن میں صرف سلاطین دہلی کا دور رہا ہوگا۔ ایلیٹ ہی کے نقشہ پر ایک نظر ڈالنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دور آئین اکبری تک یہ حدود بخوبی توڑے جا چکے تھے۔ مورلینڈ نے یہ تسلیم کیا ہے کہ بعض ترمیمات کے ساتھ اس بیان کا اطلاق مغلیہ دور پر بھی ہوتا ہے۔ (Jour. U.P. Hist. Soc.; ii, 1910, P. 20)

تھوڑی بہت کسانوں کی آبادیاں اس وقت بھی موجود تھیں[1]

گزشتہ صدی کی آخری دہائیوں تک دوآبہ اور ہریانہ دونوں ہی علاقوں میں نہروں سے آبپاشی کا کام بڑھ چکا تھا اور 1909-10ء تک دوآبہ کے بالائی علاقہ میں خالص زیر فصل رقبہ کے ایک بٹہ پانچ حصہ پر اور ہریانہ کے علاقہ میں تقریباً ایک بٹہ دس حصہ پر ذریعہ نہر آبپاشی کا انتظام مکمل ہو چکا تھا۔ مگر نہروں کے سلسلہ سے کاشتکاری کی توسیع کے مقابلہ میں خشک سالی کے نقصانات سے فصل کی حفاظت اور ترقی زیادہ ہوئی[2] اس علاقہ کے رقبۂ کاشت میں نہروں کی موجودگی کے باوجود کسی خاص اضافہ کے نہ ہونے کا یہ سبب ہو سکتا ہے۔ اور باوجودیکہ اب منصوبہ بھاکڑہ ننگل کی تدریجی تکمیل سے اسے ایک بہت بڑے علاقہ میں بہتر کاشتکاری کے امکانات پیدا ہو رہے ہیں، پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ علاقہ ہریانہ کا ایک کثیر رقبہ محض پانی کی قلت کے باعث بیکار پڑا ہے[3]

حقیقتاً مزید مغرب کی طرف دریائے سندھ کے میدانی علاقوں میں نہروں کے موجودہ سلسلہ نے ایک بنیادی تبدیلی پیدا کی ہے۔ یہاں مغلوں کا صوبۂ لاہور، پنجاب جیسا کہ اس کا صحیح جغرافیائی مفہوم تھا، کے شمالی حصوں پر مشتمل واقع تھا۔ آئین اکبری کے دور تصنیف میں صوبۂ ملتان، پنجاب کے حصوں میں دریائے سندھ کے ڈیلٹائی علاقہ تک پھیلا ہوا تھا لیکن اس دور کے بعد یہ صرف سہوان کے زیریں علاقہ تک محدود رہ گیا۔ صوبۂ لاہور کے پیمائش شدہ رقبہ میں آئین اکبری اور دور عالمگیری کے شماریات کے درمیان کسی قابل لحاظ فرق کا پتہ نہیں چلتا، جبکہ مواضعات کی مجموعی تعداد کے نو بٹہ دس حصہ کی پیمائش شدہ دکھایا گیا ہے۔ صوبۂ ملتان کی سرکار ملتان اور بھکر میں مواضعات کی پیمائش کا دستور بظاہر ترک کر دیا گیا تھا لیکن عہد زیر مطالعہ کے بعد کے برسوں میں سرکار دیپالپور کے تقریباً تمام مواضعات زیر پیمائش آ چکے تھے[4] صوبۂ لاہور

---

[1] وارث الف، ورق 49 الف و ب، اوراق 142 ب 143 ب

[2] موازنہ بہ، Royal Commission Indian Agriculture Report, P. 325

[3] Thereriot, P. 68 دہلی کے بارے میں کہتا ہے کہ "اگر غفلت نہ برتی جائے تو آس پاس زمین اچھی ہے مگر بہت سے حصوں میں غفلت برتی جا رہی ہے۔

[4] یہ نتیجہ دور عالمگیری کے شماریات میں صوبجاتی میزان اور چہار گلشن، ورق 144 الف۔ ب اور سرکار ص 130 میں مندرج اعداد صوبہ سرکار کے باہمی موازنہ پر مبنی ہے۔

اور سرکار دیپالپور کو یکجا کرنے پر ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا مندرج رقبہ 09-1910ء میں زمین اضلاع اور ریاستوں کے قابل زراعت رقبہ کے نصف سے بھی کم تھا۔ ہم تک سترہویں صدی کے دورِ آخر کے ایک مورخ کی محفوظ کی ہوئی یہ دلچسپ روایت پہونچی ہے کہ منگولوں کے متواتر حملوں کی وجہ سے پنجاب شدید بربادی اور ویرانی سے دوچار ہوا اور اس کی دوبارہ بحالی کا سلسلہ لودیوں کے عہد میں اس وقت سے شروع ہوا جب مثلاً ویرانوں اور جنگلوں کو صاف کرکے دوآبہ بالائی علاقہ میں بٹیالہ کی آبادی کی بنیاد ڈالی گئی[1] با وجودیکہ اس صوبہ میں دورِ مغلیہ میں غیر معمولی امن وامان قائم رہا[2] تاہم یہ ناممکنات سے نہیں ہے کہ سابقہ دور کی تباہ کاریوں کے اثرات کافی حد تک اس دور میں بھی پائے جاتے رہے ہوں۔ مزید براں، دیگر بے قابو دریاؤں میں طغیانی کی وجہ سے وقتی تباہ کاری کے علاوہ دریائے بیاس اور ستلج نے دیپالپور کے ایک وسیع علاقہ کو ویرانہ وجنگل میں تبدیل کر دیا تھا جو لکھی جنگل کے نام سے موسوم تھا۔[3] نہروں کی وجہ سے دورِ مغلیہ کے مقابلہ میں جس حد تک تبدیلیاں ہوئیں اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ برطانوی "پنجاب" کے وہ اضلاع اور ریاستیں جو مغلیہ صوبۂ لاہور و ملتان میں واقع تھیں، ان میں جس قدر زمین سرکاری نہروں سے سیراب ہوئی ہے وہ 1907-10ء میں خالص زیرِ فصل زمین کا ایک تہائی سے زائد ہے اور اس کا کل زیرِ فصل زمین میں تناسب اس سے بھی زائد رہا ہوگا۔ مگر اس سے یہ ہرگز نہ تصور کرنا چاہیے کہ زمین کا ہر ایکڑ جو اب نہروں سے سیراب ہو رہا ہے وہ پہلے جبکہ یہ نہریں نہ تھیں زیرِ کاشت نہ رہا ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ نہروں نے پرانے سیلابی نالوں اور انسان کی بنائی ہوئی نہروں کی جگہ لے لی ہے اور پشتوں کی وجہ سے پرانے نالے اور نہریں بند ہوگئی ہیں۔ مگر دورِ حاضر کی نہروں ہی نے لکھی جنگل اور اس قسم کے دیگر ویرانوں کے وجود کو بھی ختم کیا اور بحیثیت مجموعی، موجودہ نہروں کی وجہ سے اس علاقہ کی کاشتکاری میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے۔

---

[1] سوجان رائے، 66-7

[2] ایضاً 68 میں جہاں یہ درست ہے کہ مغلوں کے کابل پر قبضہ میں پنجاب کی خوشحالی کا راز پوشیدہ تھا وہاں اس بات پر زور دیا گیا ہے۔

[3] ایضاً 63۔ Manucci, 11, PP. 457-8 اور ص 457 پر اس کے مترجم کی یادداشت

کاشتکاری میں اس اضافہ کے باوجود، دورِ عالمگیری کے شماریات میں صوبۂ لاہور اور سرکار ملتان اور دیبلپور کے مواضعات کی مجموعی تعداد 1881ء کی مردم شماری میں انھیں علاقوں کی تعداد سے ایک نصف سے قدرے زائد تھی[1]

ٹھٹھہ کلیتہً غیر پیمائش شدہ تھا اور دورِ مغلیہ میں اس صوبہ کی جو معلومات ملتی ہیں وہ صرف اس کے مواضعات کی تعداد کے متعلق ہیں۔ پنجاب اور شمالی ہندوستان کے دیگر حصّوں کے برخلاف اس صوبہ و سرکار بھکر و سیوستان کے مواضعات کی جو تعداد دی گئی ہے وہ 1881ء میں سندھ کی تعداد کی صرف دو تہائی تھی[2] حالانکہ اول الذکر میں شامل علاقہ نسبتاً بہت زیادہ تھا تنہا ان اعداد سے یہ نتیجہ لازمی طور پر اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ دورِ مغلیہ میں یہ علاقہ غیر معمولی طور پر ویران رہا ہوگا۔ جیسا کہ آگے ذکر آئے گا اس علاقہ میں سیلابی نالے اور نہریں تو پہلے بھی موجود تھیں، تاہم اس حقیقت سے کہ 1909-10ء میں دورِ حاضر کی سرکاری نہروں نے سندھ کے خالص زیرِ تخم رقبہ کا تقریباً تین چوتھائی حصہ سیراب ہوتا تھا، صحیح صورتِ حال خود بخود واضح ہو جاتی ہے

دورِ مغلیہ میں سندھ کی طرح، کشمیر کی بھی پیمائش نہ ہوئی تھی۔ اس دور کے اندراجات میں اسکے مواضعات کی تعداد اس کے نظیری اضلاع کی 1901ء کی مردم شماری کی تعداد کے تقریباً مساوی تھی۔ فی الحال، صوبۂ اجمیر کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اوّل تو جہاں دورِ مغلیہ میں اس صوبہ کے رقبۂ و مواضعات کے شماریات بالکل ہی نامکمل ہیں، وہاں دورِ حاضر کے جو زرعی اندراجات ملتے ہیں[3] وہ بھی اس کے کل رقبہ کے محض ایک جزو ہی سے متعلق ہیں۔

صوبۂ گجرات میں پیمائش کی بنیاد پر مالگذاری کی تشخیص کے رواج کو اکبر کے جانشینوں کے عہد میں کم از کم جزوی طور پر تبدیل کر دیا گیا تھا۔[4] لہٰذا اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ دور

---

[1] دونوں سرکاروں کے لیے 'چہار گلشن' (ورق 44، الف۔ب۔ سرکار 130) کے اعداد استعمال کیے گئے ہیں

[2] بشمول خیرپور جس کے لیے امپیریل گیزیٹیئر (برائے خیرپور) کو بطور ماخذ کے استعمال کیا گیا ہے۔

[3] صرف آئینِ اکبری اور چہار گلشن ہی سے نہیں بلکہ ایک مفصل یادداشت سے بھی ایسا ظاہر ہوتا ہے جس میں (متعدد صورتوں میں) ہر محال کی مالگذاری اور مواضعات کے اعداد درج ہیں (رائیل ایشیاٹک سوسائٹی۔ لندن۔ فارسی مخطوطہ 173)

[4] مرآۃ (1) 217 - 18 ، 263

عالمگیری میں منجملہ 10370 کے 6446 مواضعات غیر پیمائش شدہ تھے اور تحریری رقبہ دورِ آئین کے بالمقابل تقریباً نصف تھا۔ ان شماریات کے علاوہ مرآۃ احمدی' میں اس صوبہ کے پیمائش شدہ رقبہ کا گوشوارہ موجود ہے[1] جو ٹوڈرمل کی پیمائش پر مبنی بتایا جاتا ہے۔ لیکن اس گوشوارہ میں مندرج اعداد کی میزان اور دورِ عالمگیری اور 'چہار گلشن' کے اندراجات میں بیحد مطابقت پائی جاتی ہے اور ایک کو چھوڑ کر باقی تمام غیر پیمائش شدہ سرکاروں کی تفصیلات 'چہار گلشن' کے مطابق ہیں۔ ایسی صورت میں اس شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ مرآۃ احمدی میں مندرج گوشوارہ ٹوڈرمل کی پیمائش پر مبنی نہ تھا بلکہ اس کے اعداد حقیقتاً دورِ عالمگیری کے کاغذات سے ماخوذ تھے۔

مرآۃ احمدی کے ضمیمہ میں مالگزاری اور مواضعات کے مفصل شماریات محال وار درج ہیں جو بیحد بیش قیمت ہیں اور ساتھ ساتھ یہ 'چہار گلشن' میں مندرج سرکاروں کے اعداد سے اجمالی طور پر مطابقت بھی رکھتے ہیں یہاں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ سورٹھ[2] نہ تو آئین اکبری اور نہ اس کے بعد کے اندراجات رقبہ میں شامل تھا بلکہ دورِ عالمگیری کے کاغذات میں اس کے پیمائش شدہ مواضعات کی تعداد باقی علاقہ کے مواضعات کی مجموعی تعداد کا نصف تھی۔ لہٰذا یہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ دورِ آئین اکبری میں جبکہ اس صوبہ کا رقبہ بعد کے دور میں دیے ہوئے رقبہ کا دوگنا دکھایا گیا تھا اس کے شاہی زیر انتظام علاقہ کے تقریباً تمام مواضعات زیر پیمائش آچکے تھے جب ہم آئین اکبری میں مندرج رقبہ کا دورِ حاضر میں اسی علاقہ کے قابل زراعت رقبہ سے موازنہ کرتے ہیں[3] تو ہمیں آخر الذکر میں جو اضافہ ملتا ہے وہ بہت ہی مختصر ہے۔ لیکن مرآۃ کی اطلاع کے بموجب زیر پیمائش رقبہ کا تقریباً ایک تہائی حصہ واقعتاً ناقابل کاشت تھا۔ مالگزاری کے

---

[1] ایضاً (ا) 25

[2] یہ بعد میں سورٹھ اور اسلام نگر کی سرکاروں میں تقسیم کیا گیا۔

[3] یہ عام طور پر 1920-21ء کے شماریات سے ماخوذ ہیں لیکن کھمبات اور ریوا کھنٹا کے لئے اعداد و شمار متعلقہ امپیریل گیزیٹیر سے ماخوذ ہیں جو 1903-4ء سے متعلق ہیں۔ سابر کنٹھا کے نئے ضلع کے لیے 1949-50ء کے اعداد سے رجوع کرنا ہوگا کیونکہ اس کے پیشتر کے اعداد موجود نہ تھے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ ضلع ریوا کنٹھا کے بیشتر محال آئین اکبری کی فہرست میں نہیں ملتے اور مرآۃ میں واضح طور پر محالات راج پیپلا، بریا اور لونا واڑہ وغیرہ کو ایسے باجگزار علاقے بتایا گیا ہے جن کا انتظامی کاغذات سے کوئی تعلق نہ تھا۔

نقطۂ نگاہ سے غیر ضروری طور پر پیمائش شدہ زمینوں کے زیادہ تناسب کی توجیہ ناممکن تو نہیں ہے[1]
مگر پھر بھی مذکورہ اطلاع کو بالکل ہی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یہ صحیح ہے کہ 1881ء میں مواضعات
کی تعداد بمقابلہ دور مغلیہ کی تعداد کے بہت تھوڑی ہی زیادہ تھی[2] لیکن ایک ولندیزی مشاہد
نے 1629ء یعنی اگلی وبائی کے بڑے قحط کے قبل کے متعلق لکھتے ہوئے واضح کیا ہے کہ "زمین کے
دسویں حصہ پر بھی کاشت نہیں ہوتی" اور اس لیے ہر شخص کو کاشت کے لئے موقع کی زمین مل جاتی
تھی[3] یہ بیان ایک صریح مبالغہ ہے[4] لیکن اگر اس میں ذرا بھی صداقت تصور کی جائے تو اس کا
یہ مطلب ہوگا کہ اس وقت دور حاضر کے بمقابلہ جبکہ عملاً کل زمین مصرف میں ہے حالات بہت مختلف

---

[1] جیسا کہ ایک سابقہ فٹ نوٹ میں بتایا گیا ہے، اس زمرہ میں چراگاہ کی زمین بھی شامل ہو سکتی ہے۔

[2] دور عالمگیری کے شماریات اور 'چہار گلشن' میں مواضعات کی مجموعی تعداد 10370 درج ہے۔ مرآۃ (1)
25 میں مندرجہ میزان 10465 $\frac{1}{2}$ اور اس میں محالوں کے تحت مندرج اعداد (ایضاً ضمیمہ ص 188 اور
صفحات ابعد) کو جوڑنے پر میزان 11563 آتی ہے لیکن اس میں کثیر تعداد ایسے مواضعات کی شامل ہے
جنہیں واضح طور پر ویران بتایا گیا ہے۔ کچھ ریوا کنٹھا اور سورت کی ریاستوں کو چھوڑ کر گجرات اور کاٹھیاواڑ
کے متعلق 1881ء کی مردم شماری کے اندراجات میں 12,545 مواضعات درج ہیں۔ یہاں یہ ذکر کیا جا سکتا
ہے کہ جن علاقوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے ان کے علاوہ بھی مرآۃ میں کاٹھیاواڑ اور سرکار پٹن کے بعض محالوں کے
مواضعات کے اعداد و شمار نہیں ملتے Commissariat, Mondelsler P.28 میں صوبا احمد آباد کے
صدود میں 25 بڑے شہر اور 3000 مواضعات شامل تھے؛ لیکن اس میں سرکار کی جگہ غلط طور پر 'صوبا' لکھا گیا
ہے Geleynssen نے اس کے دس برس قبل (1629ء) لکھا ہے کہ احمد آباد کے تحت بڑے مرکزی
مواضعات یا چھوٹے شہر اور ان کے تحت 2898 قریئے تھے۔ وغیرہ (JIH, IV, PP. 78 9) ان اعداد
کا سرکار احمد آباد کے متعلق مرآۃ کے اعداد سے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس طور پر ہیں، 25 پرگنے مع
مواضعات جن کی میزان 3497 ہے جن میں سے 404 یا تو حکومت کے زیر انتظام نہ تھے یا کھنڈر تھے۔
'چہار گلشن' مخطوطہ Bodl ورق 64 الف میں اس سرکار کے 28 محالات اور مواضعات کی مجموعی تعداد 2880
درج ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ ان ماخذ کے اعداد میں اس قدر یکسانیت پائی جاتی ہے Geleynsen حوالہ
سابقہ ص 78 بروده کے تحت "210 مواضعات بیان کرتا ہے مرآۃ میں پرگنہ کے تحت 226 مواضعات اور سرکار کے
تحت 348 (335 مندرجہ چہار گلشن۔ ایضاً) درج ہیں۔

[3] گیلنس Geleynssen ترجمہ مور لینڈ جی آئی ایچ (4) ص 79

[4] موازنہ بہ مور لینڈ ایگریرین سسٹم (Moreland, Agranian System) ص 129

رہے ہوں گے۔ گجرات وہ صوبہ تھا جس کا تذکرہ غیر ملکی سیاحوں نے سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن ان کے تذکروں میں مذکورہ بیان کی نہ تو تصدیق ملتی ہے اور نہ تردید[1] لہذا جو شہادتیں ہمارے پاس ہیں وہ بیشتر غیر فیصلہ کن اور متضاد ہیں۔ حالانکہ فی الجملہ ان شہادتوں کے رجحان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت بمقابلہ دور حاضر کے زیر کاشت رقبہ کافی کم تھا، لیکن مرآۃ احمدی کی اس تجویز کو کہ یہ کمی بقدر پوری ایک تہائی تھی، ایک اختلافی مسئلہ کے طور پر چھوڑ دینا ہوگا۔ مزید برآں یہ ہوسکتا ہے کہ دونوں زمانہ کے بعد کی مدت میں گجرات کے ایسے حصوں میں جو اس دور کے شماریات کے دائرہ سے باہر تھے مثلاً راج پیپلا کے گرد و نواح کا علاقہ جہاں زیر مطالعہ عہد میں جنگلی ہاتھی گھوما کرتے تھے،[2] زمین کو مصرف میں لانے کا کچھ کام ہوا ہو۔

گو کہ شاہجہاں نے دریائے نربدا کے جنوب کے اچھے خاصے علاقہ کو مالوہ سے خاندیش منتقل کر دیا تھا، پھر بھی کاغذات عالمگیری میں مالوہ کا پیمائش شدہ رقبہ آئین اکبری کے اعداد کے دوگنے سے بھی زائد درج ہے، حالانکہ اس کے صرف ایک تہائی مواضعات کی پیمائش ہوئی تھی۔ (چند چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو چھوڑ کر جن کے متعلق اعداد و شمار موجود ہیں) مالوہ کے تخفیف شدہ صوبہ کے علاقوں کا دور حاضر (20-1920ء - 21ء) کے اندراجات میں قابل زراعت رقبہ دور عالمگیری کے رقبہ کا تقریباً تین گنا دکھایا گیا ہے۔ لیکن اس بات کے علاوہ کہ دور عالمگیری کے اندراجات میں اس کے صرف تہائی مواضعات کا رقبہ درج ہے، یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ دور حاضر کے اعداد کا دو بٹہ پانچ حصہ قابل زراعت ویرانوں پر مشتمل ہے جن کے متعلق غالباً مغلوں کے اندراجات اس قدر مکمل نہیں رہے ہوں گے جس قدر کہ موجودہ اندراجات۔ 1891ء و 1901ء کی مردم شماریوں کے مطابق اس صوبہ کے مواضعات کی تعداد بمقابلہ دور مغلیہ کے اندراجات کے واضح طور پر زیادہ ہے مگر اسے بہت زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔[3] ان اشاروں سے ظاہر ہے کہ اس علاقہ کی کاشتکاری میں

---

[1] منڈی 264 واقعی میں یہ کہتا ہے کہ "آگرہ ہی سے 1000 احمد داوار (احمد آباد) کے دلازوں تک ایک ریگستان، بنجر اور چوروں کا علاقہ ہے۔" لیکن غالباً مقصد یہ نہیں ہے کہ یہ الفاظ اپنے لفظی معنوں میں لیے جائیں۔ اس نے مہتا سے قبل ہی میدانی علاقہ جس میں جنگلات تھے دیکھا (ایضاً) اور وہ اس مقام اور احمد آباد کے درمیان ویرانے کے وجود کا کوئی حوالہ نہیں دیتا۔

[2] لاہوری۔ ا۔ 331 و مرآۃ ا۔ 14۔

[3] دور عالمگیری کے شماریات میں صوبہ کے مواضعات کی تعداد 18678 ہے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

زیادہ اضافہ کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ علاقہ مالوہ کو پہلے ہی سے مغلوں کے زمانہ میں اپنی زرخیزی اور غیر مختتم افراط کے لیے ایک مسلمہ شہرت حاصل تھی[1]۔

خاندیش کے متعلق بھی شاید اسی قسم کے نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ آئین اکبری میں اس صوبہ اور دوسرے دکنی صوبوں کے آراضی پیمودہ کے اعداد و شمار نہیں ملتے لیکن اعداد و شمار عالمگیری سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت خاندیش کے منجملہ کل 63.39 مواضعات کے 28 32 پیمائش شدہ تھے 1891ء اور 1901ء کی مردم شماری کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کے مواضعات کی تعداد تقریباً وہی رہی جو دور مغلیہ میں تھی، جبکہ 1920 - 21ء کی رپورٹ کے مطابق قابل زراعت رقبہ دور عالمگیری کے پیمائش شدہ رقبہ کا جو اس کے نصف سے کم مواضعات پر مشتمل تھا ڈھائی گنا ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس صوبہ کے رقبۂ کاشت میں کوئی قابل لحاظ توسیع نہ ہوئی اور اس کی تصدیق دیگر مستند شواہد سے بھی ہوتی ہے جن کے مطابق اس صوبہ میں اس وقت معقول کاشتکاری ہوا کرتی تھی اور اس کی تقریباً تمام زمین مصرف میں تھی[2]۔

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)

لیکن اس تعداد سے سرکار گڈھہ کے 759 مواضعات کو کم کر دینا چاہیے (ملاحظہ ہو چہار گلشن اوراق 67 ب-68 الف و سرکار 142) کیونکہ اس کے حدود متعین نہیں کیے جا سکتے۔ اعداد مردم شماری 1891ء (جو برطانوی ضلعوں کے لیے استعمال میں لائے گئے ہیں) اور 1901ء (جو دیسی ریاستوں کے لیے استعمال میں لائے گئے ہیں) کے گوشواروں میں بقیہ علاقہ کے ان اضلاع کے لیے جو کلیتہً مغلیہ صوبہ میں واقع تھے، مواضعات کی تعداد 500 ر 19ء اور ان علاقوں کے مواضعات کی تعداد جو اس میں صرف جزوی طور پر شامل تھے۔ 2 609 درج ہے۔

[1] آئین اکبری (1) 455 اور Mundy 54 -57 خصوصاً 57 Javnier 1-47 مالوہ کی شہرت ابھی زمانۂ حال تک شمالی ہندوستان کے کسانوں کے ذہن میں باقی تھی (ملاحظہ ہو کرک۔ دی نارتھ ویسٹرن پراونسز آف انڈیا۔ لندن (Crooke 'The North Western Provinces of India, London) 1897 ص 171 ایلیٹ میمایرس 2 Elliot, Memoirs & & c. 315

[2] ایسی زمین جو غیر مزروعہ ہو بالکل نہیں بچی اور اس کے بہت سے مواضعات چھوٹے موٹے شہر معلوم ہوتے ہیں۔" (آئین اکبری۔ 1۔ 474) و نیز Jitch مطبوعہ رائلی (Ryloy) ص 95 (باقی صفحہ آئندہ پر)

دور عالمگیری میں برار کے تقریباً تمام مواضعات زیر پیمائش آچکے تھے۔ لیکن باوجودیکہ
کی مردم شماری کے اعداد کے مطابق مواضعات کی تعداد میں تقریباً کوئی تبدیلی نہ ہوئی
مگر 20-1919 - 21ء میں قابل کاشت رقبہ میں اضافہ، مغلیہ رقبہ پیمودہ کے اعداد کے اگر تقریباً برابر
نہیں تو دو تہائی سے زیادہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ، یہاں کی کاشتکاری میں معقول توسیع ہوئی ہے اور
ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ یہ توسیع زیادہ تر وسطی ہندوستان کے بڑے جنگل کو کاٹ کر عمل میں
آئی ہوگی جو ان دنوں اس صوبہ کے مشرقی حصہ میں بہت گھنے تھے[1]

دور مغلیہ کے شماریات میں صوبۂ اورنگ آباد کے مواضعات کی تعداد 1910ء میں مندرج
تعداد کے تقریباً برابر ہے[2] پیمائش شدہ مواضعات کی تعداد کل کے نو بٹہ دس حصہ سے زائد تھی
لیکن پیمائش شدہ رقبہ 20 19 - 21ء کے اندراجات کے قابل کاشت رقبہ کا تقریباً صرف دو تہائی
تھا اس کا قریبی صوبہ بیدر بہت چھوٹا تھا اور جب تک اس کے صحیح حدود اربعہ متعین نہ ہو جائیں
اس کے اعداد و شمار کے تقابلی جائزہ میں غلطیوں کی بڑی گنجائش رہ جائے گی۔

کاغذات مغلیہ میں صوبہ جات بیجاپور اور حیدر آباد کے رقبہ یا مواضعات کی تعداد کے متعلق
کوئی اندراجات نہیں ملتے۔

قارئین کو مغلیہ اعداد و شمار کے اس قدر تفصیلی جائزہ کا مطالعہ زحمت طلب تو محسوس ہوا ہوگا
لیکن اس جائزہ سے ایک یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ چند معمولی خامیوں کو چھوڑ کر بحیثیت مجموعی

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

موڑ اور لی ٹریولس (Early Trands) 16' تھیونیور (Themonot 101 - Javenie72 /-42
Hemucel (2) 429 دلکشا ورق 7 الف۔ واحد اختلافی بیان رو (Roe 68) کا ہے جس کے
مطابق "سورت سے برہانپور تک کا تمام علاقہ اس وقت او ر بنجر تھا۔ بقول ابو الفضل پرانے وقتوں میں
بیشتر علاقہ ویران تھا اور چودھویں صدی کے آخری زمانہ میں مقامی خاندان سلاطین کے، ن ملک راجی
کے زیر پرستی وسیع پیمانہ پر آبادکاری کا کام شروع ہوا (آئین اکبری۔ ا۔ ص 475

[1] موازنہ بہ آئین اکبری۔ ا۔ ص 477 8

[2] شماریات عالمگیری میں مندرج مواضعات کی تعداد یعنی 63,82 کو تسلیم کیا گیا ہے۔ بہار گلشن ورق
74 ب اور سرکار 151 صرف 593 بتاتے ہیں۔ سرکار 152 میں منفرد سرکاروں کے اعداد کی میزان غلط
ہے جس کا خاص سبب یہ ہے کہ اس نے پر بینڈا کے لیے 597 کے بجائے غلطی سے 5599 پڑھا ہے۔

یہ اعداد و شمار بعد مرتبوط طور پر ترتیب دینے گئے ہیں اور ان کے متعلق جو تائیدی شہادتیں ملتی ہیں وہ ناقابل لحاظ نہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں یہ حق پہونچتا ہے کہ ان اعداد و شمار کے دورِ حاضر کے اعداد و شمار سے موازنہ کرنے کے بعد جو مجموعی نتائج برآمد ہوں، ہم ان پر کافی حد تک اعتماد کریں پس اس تفصیلی جائزہ سے یہ امر مسلّم معلوم ہوتا ہے کہ دورِ مغلیہ کے بعد سے ہر جگہ کاشتکاری میں توسیع ہوئی ہے۔ اگرچہ کہیں کم اور کہیں زیادہ۔ یہ توسیع تین علاقوں میں سب سے زیادہ نمایاں یعنی تقریباً سو فیصدی ہے۔ پہلا علاقہ الہ آباد، اودھ، بہار اور غالباً بنگال کے ایک حصہ پر مشتمل ہے یہاں اس توسیع کا واضح سبب پہاڑ کے دامن میں جنگلات یعنی ترائی کے خطوں کی بازیابی ہے دوسرا علاقہ برار کا ہے جہاں توسیع وسطی ہندوستان کے طویل و عریض جنگلوں کی صفائی کے نتیجہ میں واقع ہوئی ہے اور آخری علاقہ دریائے سندھ کی وادی کا ہے جہاں توسیع کا تقریباً تمام تر سبب دورِ حاضر کی نہروں کا سلسلہ ہے۔ ان علاقوں کے علاوہ کاشتکاری میں جو توسیع ہوئی وہ بقدر ایک نصف سے لے کر ایک تہائی یا ایک چوتھائی تک ہے۔ اس توسیع کا سبب جنگلوں کی صفائی نہیں بلکہ کمتر درجہ کی زمین اور چراگاہوں کا زیر کاشت لایا جانا ہے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

یہ مسئلہ کہ زمین کی اوسط پیداوار پہلے زمانہ میں نسبتاً زیادہ تھی یا نہیں کسی درجہ میں متنازعہ فیہ رہا ہے۔ یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اگر کھاد ڈالنے کے مروّجہ عمل یا اس کی غیر موجودگی میں کوئی فرق نہیں ہوا ہے تو دو وجوہ سے اوسط پیداوار میں کمی واقع ہو سکتی ہے۔ اوّل یہ کہ اب ایسے کمتر درجہ کی زمینوں پر تخم ریزی شروع ہو گئی ہے جن پر پہلے کاشتکاری غیر نفع بخش تھی۔ دوسرے یہ کہ جنگلات کو صاف کر کے انھیں اب مسلسل استعمال میں لایا جا رہا ہے۔ ایسی زمینیں ابتداً تو بہت زرخیز ہوتی ہیں، لیکن بعد میں ان کی زرخیزی بالکل ختم ہو کر وہ معمولی زمینوں کے مثل ہو جاتی ہیں[1]۔ اگر شماریات کا ہمارا تقابلی جائزہ لائق وثوق تصور کیا جائے تو جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں پہلی صورت تقریباً ہر جگہ کارفرما رہی ہے اور کمتر درجہ کی زمینیں جو اس دور کے بعد سے زیر کاشت زمینوں کا عموماً ایک تہائی اور بعض حصّوں میں بقدر نصف کے ہیں۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ بعض صوبوں میں پہلے جنگلات بمقابلہ اس وقت کے بہت زیادہ تھے اور بہار کے اعداد و شمار سے ہمیں اس معمول کی

---

[1] رائیل کمیشن آن ایگریکلچر رپورٹ (Royal Commission on Agriculture Report) 75

موجودگی کا علم ہوتا ہے کہ جنگلات کو صاف کر کے اولاً جن زمینوں پر کاشت کی گئی تھی جب انکی توانائی بالکل ختم ہو گئی تو پھر کسی دوسرے مقام پر نئے جنگلات کو صاف کر کے نئی زمینوں کو زیر کاشت لایا گیا۔ یہ صورت حال، غالباً ترائی کے تمام جنگلوں کے متعلق رہی ہوگی۔ گورکھپور میں تو یہ صورت حال پچھلی صدی کے اوائل میں قطعی طور پر تھی[1] مگر جیسے جیسے جنگلات کم ہوتے گئے یہ معمول بھی ختم ہو گیا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ مذکورہ علاقوں میں واقعتاً زیر کاشت زمینوں کی زرخیزی کے اوسط میں بمقابلہ دیگر علاقوں کے زیادہ کمی واقع ہوئی ہوگی[2]۔ مثلاً ابوالفضل کا سرکار چپارن (بہار) کی زمین کی زرخیزی کے متعلق یہ بیان کہ اس علاقہ میں وال ماش (ارد) بغیر زمین کی جتائی یا کسی خاص دیکھ بھال کے پیدا ہوتی تھی، ہمارے لیے قابل توجہ ہے[3]۔ صرف دریائے سندھ کے میدانوں اور کسی حد تک دوآبہ کے علاقوں میں صورت حال اس سے مختلف ہے جہاں نہروں کی وجہ سے اعلیٰ قسم کی زمینوں کو زیر کاشت لاکر ان کا بہتر استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن اگر مملکت مغلیہ کے رقبہ کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ کاشتکاری کے طریقوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے تو پھر دور حاضر کے بوئے ہوتے اوسط ایکڑ کی پیداوار اتنی نہیں ہو سکتی جتنی دور مغلیہ میں تھی۔

---

[1] مفتی غلام حضرت، چکلہ گورکھپور کے متعلق جس کے حدود میں پہلے ضلع گورکھپور کے علاوہ ضلع بستی اور ضلع گونڈہ کا بیشتر حصہ شامل تھا لکھتے ہیں "جنگل کی زمین کی افراط کی وجہ سے یہاں کے معمولات میں ہے کہ نئی بنجر (پہلے نہ کاشت کی ہوئی) زمین پر بلا کسی زحمت کے کاشت کی جا سکتی ہے اور جو زمین بہت زرخیز ہوتی ہے اسے تین سال کی مدت تک زیر کاشت رکھا جاتا ہے جس کے بعد اس کی پیداوار اپنی انتہا کو پہنچ کر اس کی طاقت کم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ پھر لوگ اسے چھوڑ کر اس کے بجائے کسی دوسری بنجر زمین کی کاشت شروع کر دیتے ہیں۔ چونکہ گورکھپور کی زمین اس قدر نفع بخش نہیں جس قدر چکلہ اعظم گڑھ کی اور یہاں کی پیداوار (کاشت شروع کرنے کے) تین یا چار سال کے اندر اندر گھٹنے لگتی ہے (I.O.، ورق 10 الف)

[2] موازنہ ہو مورلینڈ India & c. of Akbar ص 117 جنگلات کی صفائی کے اوسط پیداوار پر اثرات کے متعلق مورلینڈ کی رائے اس سے بالکل مختلف ہے جو یہاں پیش کی گئی ہے۔

[3] آئین اکبری۔ ا۔ ص 417 وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ترائی کے علاقہ کی بنجر زمینیں دوسرے مقامات کی بہترین قسم کی زمینوں (پولج) سے بھی زیادہ زرخیز ہوتی ہے اور جس کا مال اسے 'پولج' کے ہم حیثیت قرار دیتے ہیں (ایضاً ص 297)

اس فصل میں دورِ مغلیہ کے مواضعات کے اعداد و شمار کا بھی بار بار ذکر آیا ہے۔ ان اعداد کے دورِ حاضر کے اعداد سے تقابل کے بعد جو حیرت انگیز صورت حال سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ شمالی ہندوستان کے صوبۂ الہ آباد و اودھ سے لے کر صوبۂ لاہور و ملتان تک باہم ایک دوسرے سے پیوستہ علاقوں میں مواضعات کی تعداد بمقابلہ پچھلی صدی کی آخری دہائی کے علی التقریب بقدرِ نصف زیادہ تھی۔ برخلاف اس کے صوبہ جات بنگال، و بہار اور شمالی میدان کے جنوب میں واقع صوبوں یعنی گجرات، مالوہ اور صوبۂ دکن کے مواضعات کی تعداد، دورِ حاضر کی مردم شماریوں کے اندراجات سے تھوڑا کم یا قریب قریب ان کے برابر ہے۔ اس دور میں شمالی ہندوستان میں مواضعات کی تعداد کی زیادتی کا سبب معلوم کرنا آسان نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ اٹھارہویں صدی میں مواضعات کی مجموعی تعداد گھٹی ہو جبکہ ایک طرف تو ان کی ویرانی عمل میں آئی اور دوسری طرف بخیالِ حفاظت چھوٹے چھوٹے مواضعات کو چھوڑ کر بڑے بڑے مواضعات میں سکونت اختیار کی گئی[1] یا پھر آگے چل کر جب ویرانوں اور چراگاہوں کے حلقے جو ایک موضع کو دوسرے موضع سے جدا کرتے تھے زیرِ کاشت لائے گئے تو ممکن ہے کچھ اس قسم کا رجحان پیدا ہو گیا ہو کہ ایک موضع اپنی جداگانہ انفرادیت کو دوسرے میں ضم کر دے۔ بہر حال، غالباً یہ سب صرف قیاس آرائی ہی ہو سکتی ہے۔ مگر باوجود اس کے یہ ہمارے لیے ایک مفید طلب حقیقت ہے کہ عہدِ مغلیہ میں نہ یہ کہ صرف کاشتکاری کی وسعت اس وقت کے مقابلہ میں بہت کم تھی بلکہ مواضعات کی تعداد نسبتاً بہت زیادہ تھی۔ لہٰذا یہ اوسطاً اس وقت کے مواضعات کے مقابلہ میں بہت چھوٹے رہے ہونگے

فصل ۲ کاشتکاری اور آبپاشی کے ذرائع

اگرچہ جدید سائنسی زراعت کے نمایاں کارناموں کے پس منظر میں دیکھا جائے تو ہندوستان کسان کے اَن گھڑ آلات سے زیادہ دقیانوسی کسی چیز کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ مگر آج سے تین سو سال قبل کے ماحول میں ان آلات پر نکتہ چینی کا کوئی محل نہ تھا۔ حالانکہ اس وقت ہندوستانی

---

[1] Crooke, 'The North Western Provinces of India. صفحہ ۔ میں بیان کیا گیا ہے کہ صوبہ کے مغربی حصہ میں مواضعات "چھوٹے قلعوں کے مانند معلوم ہوتے ہیں اور یہ "حملوں اور غارتگری کی روایات کے جبکہ سکھ اور مرہٹے ملک کو لوٹ رہے تھے" ایک یادگار ہیں۔

ہلوں میں گھوڑے نہیں بلکہ بیل جوتے جاتے تھے جو اہل یورپ کے لیے کوئی اجنبی چیز نہ تھے۔ ٹیری
(Terry) نے اسے اس قسم کا 'بیرون کا ہل' بیان کیا ہے جیسا کہ انگلستان میں مستعمل تھا۔[1] فرایر
(Feryer) نے جس کا مشاہدہ ساحلی علاقوں تک محدود تھا بتایا ہے کہ "کومبیوں (کمبیوں) کا
زمین کی جوتائی اور غلہ کی مالش کا طریقہ دیگر اقوام کے طریقہ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔" وہ ہندوستانی
ہل میں بجز اس کے کوئی اور انوکھاپن نہیں پاتا کہ "لوہے کی کمیابی کے باعث اس کے پھر میں لوہا نہیں
بلکہ اس کے بجائے ایک سخت قسم کی لکڑی لگی ہوتی ہے جو ان کی نرم زمینوں کو بہ سہولت الٹ دیتی
ہے۔"[2] لیکن یہ بیان صرف ساحلی پٹیوں کے متعلق درست ہو سکتا تھا۔ لوہے کے دانتے اندرون ملک
زیادہ خشک اور سخت مٹی کے لیے ناگزیر تھے اور یہ بظاہر زمانہ قدیم سے یہاں زیر استعمال تھے۔[3]
یہ درست ہے کہ عہد زیر مطالعہ میں لوہا "کمیاب" تھا، لیکن، پھر بھی ہندوستان میں اس کے کانوں
کی کھدائی اور مصنوعات کا کام وسیع پیمانہ پر رائج ہو چکا تھا اور اس وقت اس کی بمقدار گندم
قیمت، 1914 میں مروجہ قیمت کے تین گنے سے زائد نہ تھی۔[4] مگر چونکہ ہندوستانی ہلوں میں لوہے کا

---

[1] ٹیری کا 'ارلی ٹریولیس (Early Travels) میں بیان Oxford English Dictionary
جلد 4 ایف ص 403 سی 404 بی میں مندرج اس کی تعریف کے مطابق اس میں پہیئے نہ ہوتے تھے۔ بقول مورلینڈ (انڈیا
ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر India at the Death of Akbar ص 160 نوٹ اس میں مٹی کو برابر کرنے
والا تختہ بھی نہ ہوتا تھا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ زمین کو الٹنے اور گہرا کھودنے والا بیشتر ہندوستانی زمینوں
کے لیے موزوں نہ تھا۔ (موازنہ ہو Royal Commission on Indian Agriculture کی
رپورٹ ص 110۔ 112)

[2] Tryer 2 _ 108

[3] چنانچہ منوسمرتی ۱۰۔ ۸۴ میں زراعت کی اس بنا پر مذمت کی گئی ہے کہ "چوبی (آلات) جن کے نوک
لوہے کے ہوں" زمین اور اس کے اندر کی مخلوق کے لیے ضرر رساں ہیں (دی انسٹیٹیوٹس آف منو ترجمہ
بوہلر The Institutes of Manu, tr. Buhler ص 420 - 2')

[4] یہ بیان مورلینڈ کی 'India & c. of Akbar' پر مبنی ہے جس میں ص 147 - 9 پر صنعت و
حرفت کے متعلق اور ص 150 - 51 پر لوہے کی قیمت کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ مورلینڈ، آئین اکبری میں
مندرج گیہوں کی قیمت کا حوالہ دیتا ہے جو 3 دام فی سیر تھی (آئین اکبری۔ ا ص 143 (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر

کا استعمال بقدر قلیل تھا، لہٰذا اس مد پر خرچ بہت زیادہ نہ ہوتا رہا ہوگا۔[1]

علاوہ بریں، اس امر کی شہادت موجود ہے کہ بعض حیثیت سے اس وقت کے ہندوستان کے زراعتی طریقے اس دور کے معیار کی روسے دقیانوسی نہ تھے۔[2] ڈرل (Drill) کی مدد سے تخم ریزی اور ڈبلنگ (Dibbling) کے طریقہ پر بوائی ہندوستان کا ایک پرانا اور عام معمول تھا۔[3] گو کہ ہڈی کی کھاد عام استعمال میں نہ تھی لیکن اندازہ ملتا ہے کہ مچھلی کو بطور کھاد استعمال کئے جانے کی غیر معمولی نافعیت کو تسلیم کیا جاتا تھا کیونکہ گجرات میں گنے کی کاشت میں مچھلی کا استعمال ہمارے علم میں آیا ہے۔[4]

ہندوستانی زراعت کی نمایاں خصوصیت جس سے ہمعصر مشاہدین متاثر ہوئے، ایک سال میں دو، اور اکثر علاقوں میں تین فصلوں کی کاشت تھی۔[5] پس باری باری سے مختلف

---

[1] (باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) 1633ء میں بمقام صورت انگریزی لوہے کی قیمت اس سے کم یعنی ایک مقامی من کے لئے 3 ½ محمودی یا ایک اکبری سیر کے لیے 2⅓ یا 2 ⅔ دام تھی (انگلش فیکٹریز ریکارڈز۔ 1633-38، ص 235-299)

[1] مختلف مقامات پر ہلوں میں مستعمل لوہے کے دانتوں کی مختلف شکلوں کا تذکرہ، این۔ جی۔ مکرجی کی Hand Book of Indian Agriculture Calcutta' 1915۔ ص 92-3 میں ملتا ہے

[2] Elliot, Memoirs, & c. 2، ص 341-2

[3] موازنہ ہو Elliot حوالہ سابقہ۔ دیلکر رپورٹ Voelcker, Report 223 کے مطابق "دیسی ڈرل جس سے تخم ریزی ہوتی ہے" حیرت انگیز طور پر کارآمد ہے جس میں کسی چیز کی کمی نہیں"۔ امان اللہ حسینی کی غالباً اوائل سترھویں صدی کی تصنیف "رسالۂ زراعت" میں ڈبلنگ کے طریقۂ تخم ریزی کا روئی کی کاشت کے سلسلہ میں ذکر آیا ہے: "بعض مقامات پر ایک نوکیلی کھونٹی (میخ) زمین کے اندر ٹھونس دی جاتی ہے اور پھر چھید میں بیج رکھ کر اسے مٹی سے ڈھانک دیتے ہیں۔ اس طور پر فصل بہتر ہوتی ہے" (702 4، ورق 30 ب)

[4] تھیونو (Thevenot) 36-7

[5] آئین اکبری 2۔ ص 5، 6 (ہندوستان کے متعلق)، 1۔ 389 (بنگال)، 513 (صوبۂ دہلی)، جے زیویئر ترجمہ ہوسٹن (J.Xavier, tr. Hosten, JASB, N.S. 121 (خطۂ آگرہ)، پلسارٹ Pelsaert 49 (خطۂ آگرہ)، باوری (Bowrey) 121 (ساحل اوڑیسہ)، وسوجان رائے 11 (ہندوستان)

فصلوں کی کاشت کا طریقہ قدرت کا ایک عطیہ تھا اور یہ بات تجربہ بتاتا تھا کہ کس زمین پر کن فصلوں کا جوڑ نفع بخش ہوگا[1] لہٰذا اس کے اصول عہد مغلیہ کی تحریروں میں وضاحت کے ساتھ نہیں ملتے۔ اس کا غالبًا یہ سبب رہا ہوگا کہ یہ روزمرہ کی ایک ایسی عام بات تصور کی جاتی تھی جسے قلمبند کرنا ضروری نہیں خیال کیا گیا۔ لیکن یہ اصول کہ بعض فصلیں زمین کی زرخیزی اور ترقی میں اضافہ کا باعث ہو سکتی تھیں وضاحت کے ساتھ تحریروں میں بیان کیا گیا ہے[2]

کھیتوں کی ظاہری صورت عملاً اس وقت بھی ویسی ہی تھی جیسی فی زمانہ۔ اس قسم کی جھاڑیاں نہ تھیں جو یورپی سیاحوں کو "حدبندی" کے اس اضافہ پذیر طریقہ کی یاد دلائے جو ان کے براعظم میں رائج تھا[3] صرف گجرات میں کھیتوں کی حفاظت کے خیال سے خاردار جھاڑیاں ضرور لگائی جاتی تھیں اور اس کے متعلق ہمارے ماخذ کا بیان ہے کہ وہاں کی ایک مقامی خصوصیت تھی[4]

ہندوستانی زراعت کا یہ ایک اہم پہلو رہا ہے کہ یہاں قدرتی بارش کی کمی کو آبپاشی کے مصنوعی ذرایع سے پورا کیا جاتا ہے اور اس مقصد کے لیے خصوصی طور پر کنویں، تالاب اور نہریں تعمیر کی جاتی تھیں۔

دریائے گنگا کے بالائی میدانوں اور دکن کے کچھ حصوں میں بھی کنویں لازمی طور پر آبپاشی کا اہم ترین ذریعہ تھے۔ ہمارے ماخذ اس دور میں بجز نل کنوؤں (ٹیوب ویل) کے پانی نکالنے کے تقریبًا تمام موجودہ طریقوں کے استعمال کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے دریائے جہلم کے بہ سمت مشرق لاہور، دیبلپور اور سرہند کے علاقوں میں ارہٹ یا رہٹ جس کی ترتیب اور ترکیب بہت پیچیدہ تھی رائج تھا۔ انگریز اسے "پرشین وہیل" (چرخ فارسی) کہتے ہیں

1۔ باری باری سے فصل اگانے کے متعلق ہندوستانی کاشتکار کی واقفیت کی تعریف کے لئے ملاحظہ ہو

M.R.G. Elliot, Memoirs & c ار 6-233 (21, Cooleker's Report,

2۔ چنانچہ امان اللہ حسینی باقلہ کے دانوں (Taba Sativa) اور مصری دانوں (باقلائے مصری یا ترمس) کو زرخیز بنانے والی خصوصیات کا حامل تصور کرتا ہے (I.O. 4702 اوراق 2 الف و ب، الف) اور جھیٹمر (Tunas ،) کے متعلق یہ فیصلہ ہے کہ یہ شور زمین کی زرخیزی کو بڑھاتا ہے (ورق 30 الف)

3۔ "ان کی زمینوں کو جب تک وہ آبادیوں کے قریب نہ ہوں گھیرا نہیں جاتا"، 'Early Travels.' Terry ص 298

4۔ آئین اکبری (1) ص 485، تزک جہانگیری ص 205، Fryer 3 ص 130، مرآۃ 1 ص 14

اور یہ بابر کو ایک انوکھی چیز معلوم ہوئی تھی[1]۔ آگرہ کے قرب و جوار اور مزید مشرق میں چرس یا چمڑے کی بنی ہوئی بالٹی (موٹ) جسے جتے ہوئے بیل پانی کے اندر سے باہر نکالتے تھے سب سے زیادہ استعمال میں تھی[2]۔ فرایئر ہندوستان کے اپنے عام تذکرہ میں اس کے علاوہ 'ڈھینکلی' کا بھی ذکر کرتا ہے جس سے لیور (Lever) کے اصول پر کام لیا جاتا تھا اور یہ عام طور پر ان مقامات پر مستعمل ہے جہاں پانی کی سطح زمین سے قریب ہو[3]۔ ان دنوں کم از کم بعض علاقوں میں سیلانی قسم کے پیشہ ور کنواں کھودنے والے ہوا کرتے تھے[4]۔ ان کا کام خصوصًا ایسی صورت میں کہ کھدائی ریگستان تھاڑ کے ایسے ریتلی زمین میں زیادہ گہرائی تک ہو بہت پر خطر تصور کیا جاتا تھا[5]۔

ابوالفضل کے مختلف صوبوں کے احوال مندرجہ آئین اکبری کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ چونکہ فصلوں کا انحصار بیشتر بارش کے پانی پر تھا اور کنوئیں صرف جزوی طور پر استعمال جاتے جاتے تھے[6] لہٰذا اس نے آبپاشی کے ذکر کو فضول تصور کیا ہے۔ پس مخصوص خطوں میں آبپاشی

---

[1] بابرنامہ 1 صفحہ 388 ، 2 صفحہ 386 کے مترجم ایس۔ اے۔ بیورج (S.A. Beveridge) نے اپنے ترجمہ میں بعد والی عبارت سے الفاظ 'and Sirhind' کو حذف کر دیا ہے' حالانکہ یہ الفاظ اسکے شائع کردہ ترکی زبان کے حیدرآبادی مخطوطہ ورق 273 ب اور نیز عبدالرحیم خانخاناں کے فارسی ترجمہ .Or 3714 ورق 376 ب میں ملتے ہیں بابر نے رہٹ کے استعمال کے جو جغرافیائی حدود بیان کئے ہیں وہ زمانۂ حال کے حدود کے بیحد مشابہ ہیں (موازنہ بہ Elliot, Memoirs & c 2 صفحہ 202) پنجاب میں ایک خاص قسم کے رہٹ کا بیان سوجان رائے صفحہ 79 پر بھی ملتا ہے۔

[2] بابرنامہ' ترجمہ بیورج 2 صفحہ 487 شاہی وقائع نگار اسے ایک محنت طلب اور گندہ طریقہ بتاتا ہے۔

[3] Tryer 2 صفحہ 94

[4] ایسا بدایونی (2) صفحہ 243 میں مندرج ایک سانحہ کے بیان سے سرکار آگرہ کے مقام بساور پر واقع ہوا ظاہر ہوتا ہے۔

[5] موازنہ بہ فیضی سرہندی' اوراق 58 ب ، 59 ب۔

[6] سوجان رائے (صفحہ 11) کے ہندوستان کے بیان کے مطابق حالانکہ بعض حصوں میں کاشتکاری کا انحصار کنووں پر ہے اور بعض خطوں میں زمین کی آبپاشی سیلابی پانی سے بھی ہوتی ہے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کی اس شکل کی موجودگی کے متعلق اس کی خاموشی پر ہمیں حیرت نہ ہونا چاہیے[1] اس کے بیان میں دلچسپ بات یہ ہے کہ صوبۂ لاہور کے بیشتر حصّہ میں کنوؤں کی آبپاشی سے کاشت کا کام ہوتا تھا[2] اسکے بعد اسی صوبہ کا رہنے والا ایک مؤرخ بھی اس کے بیان کی تائید کرتا ہے[3] اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بمقابلہ دورِ حاضر کے اس وقت پنجاب کے بالائی علاقہ میں کنوؤں کی بیحد اہمیت رہی ہو گی۔ یہ بھی اسی قدر قرین قیاس ہے کہ بہت سے علاقوں میں خصوصاً دریائے گنگا و جمنا کے وسطی دوآبہ میں پانی کی قدرتی نکاس میں نہروں کی خلل اندازی کی وجہ سے کنوؤں کی تعداد میں بھاری کمی واقع ہوئی[4]

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

تاہم بیشتر زمین 'لالی' بہ معنی 'بارانی' (یعنی بارش پر منحصر) ہے۔ (مرتب نے غلطی سے 'لالی' کو 'الہی' پڑھا ہے لیکن ملاحظہ ہو مخطوطات جدا سے) 11 ب۔ 12 الف اور (بی) 11 الف۔ ب) موازنہ بہ نیز بارنا ر، ترجمہ ہوئے
2 صفحہ 498 (ابوالفضل کے کنوؤں سے آبپاشی کی اہمیت کو نظر انداز کرنے کی مثال اس کے صوبۂ دہلی کے متعلق اس بیان سے واضح ہوتی ہے جس میں وہ صرف اس قدر کہتا ہے کہ "زیادہ زمین سیلابی پانی سے سیراب ہوتی ہے" (آئین اکبری۔ ا تصحیح مابعد صفحہ 513) برخلاف اس کے سوجان رائے 39۔ کا اس صوبہ کے متعلق بیان ہے کہ یہاں کاشتکاری "بارش اور سیلاب کے پانی پر اور بعض مقامات پر کنوؤں پر منحصر ہے"

[1] بہرحال' اودھ کے حالات کے لیے موازنہ بہ مورلینڈ کی India & c. of Akbar 121

[2] آئین اکبری۔ ا صفحہ 538

[3] سوجان رائے۔ 79 (مخطوطہ (بی) ورق 72 ب الف' (سی) ورق 44 الف بھی ملاحظہ ہو۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ فصل خریف (بالخصوص متن میں 'خریف اور ربیع' لکھا ہوا ہے لیکن مخطوطات سے اس کی تائید نہیں ہوتی) خاص طور پر بارش پر منحصر تھی۔ موازنہ بہ منوچی (Manucci) 2 صفحہ 186 بھی جس نے لاہور کے اطراف میں "بہ افراط کنوئیں" دیکھے تھے۔

[4] نہریں' کنوؤں پر دو طرح سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ اولاً نہروں نے زمین کے نیچے کے پانی سے خود استفادہ کیا ہے یا ان سے بہت سے علاقوں کو محروم کر دیا ہے جس کے نتیجہ میں زمین کے نیچے کے پانی کی سطح گر گئی۔ مورلینڈ نے اپنی تصنیف Agricultural Conditions' of the United Provinces and Districts' میں یادداشت بابتہ علی گڈھ (صفحہ 3) متھرا (صفحہ 2) آگرہ (صفحہ 1) اور مین پوری (صفحہ 2) میں اس کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں دوسرے نہروں نے بہت سے علاقوں خصوصاً ریتیلے خطوں میں کچی مٹی کی نمی کو جذب کر لینے "کی وجہ سے کنوؤں کی بغلی دیواروں کو گرا دیا اور بغیر کسی سہارے کے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

آثاری باقیات وسطی ہندوستان اور دکن میں آبپاشی کے تالابوں کی غیر معمولی قدامت پر شاہد ہیں[1]۔ ٹیورنیر، علاقہ گولکنڈہ کو تالابوں سے "بھرا ہوا" بتاتا ہے۔ ان تالابوں کو ایسے پشتے باندھ کر بناتے تھے جو بعض اوقات، "نصف فرسخ تک لمبے ہوا کرتے۔ مقصد یہ ہوتا تھا کہ برسات کے بعد کھیتوں میں استعمال کے لیے پانی کو اس کے قدرتی نشیب میں ذخیرہ کر کے محفوظ کر لیا جائے[2]۔" بیدر کا کمٹھانہ تالاب بہت بڑا تھا جو اس کے شمال میں ایک پشتہ باندھ کر تیار کیا گیا تھا۔ اس کی مثال "حقیقی طور پر" دریائے "دجلہ" سے دی جا سکتی ہے جس نے اطراف کے کاشتکاروں کو بارش کے پانی سے بالکل بے نیاز کر دیا تھا[3]۔ عہد شاہجہانی کے اواخر میں مغلیہ حکام نے خاندیش اور برار کے علاقہ پائین گھاٹ کے کاشتکاروں کو 40 سے لے کر 50 ہزار روپیہ تک بند یا پشتوں کی تعمیر کے لئے دیے جانے کی تجویز کی تھی[4]۔ بہ سمت شمال علاقہ میواڑ میں اودے ساگر کا مشہور تالاب جس کا محیط 16 کروہ تھا دور مغلیہ ہی کی یادگار ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ تالاب گرد و پیش کے علاقہ میں گیہوں کی

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

گہری کھودائی کو ناقابل عمل بنا دیا" دمین پوری، ڈسٹرکٹ گیزیٹیر، الہ آباد 1910، ص 53 موازنہ بہ
60 Koelsker, Report

یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دور مغلیہ میں اس علاقہ کے بیشتر کاشتکار آج کل کی طرح آبپاشی کے لئے صرف کچے یعنی بغیر اینٹ کے کنوؤں کا مقدور رکھتے تھے۔ چنانچہ پلسارٹ 48 آگرہ کے نواحی علاقہ میں موسم ربیع میں کنوؤں کی سالانہ تعمیر کا ذکر کرتا ہے کیونکہ کچے کنویں بارش کے پانی کو شاذ ہی برداشت کر پاتے تھے۔

[1] تاریخی نقطۂ نگاہ سے ایسی دو دلچسپ ترین مثالیں یہ ہیں۔ اوّل سدرشن جھیل دگرنر، کاٹھیاوار) جو عہد چندرگپت میں ایک پشتہ کو باندھ کر تیار کرائی گئی اور اشوک کے عہد میں "آبپاشی کی بہترین سہولیت" کی غرض سے اس میں نالیاں نکالی گئیں۔ د بھوجپور، مالوہ کا بہت بڑا پانی کا ذخیرہ جسے اگیارہویں صدی میں بھوج نے تعمیر کرایا (ملاحظہ ہو این شاستری ایڈیشن 'Comprehensive History'
Kosambi, Introduction to the History اور 2-284 (2) of India.
(280-281 of Indian History

[2] Tavernier ا، ص 1-101

[3] آثر عالمگیری ص 9-306

[4] ادب عالمگیری ورق 83 الف۔ رقعات عالمگیر ص 134

کاشت میں معاون تھا۔[1]

ہر سال موسمی طور پر دریا کا پانی چڑھ کر کھیتوں میں بھر جانے کی صورت میں (بشرطیکہ زمین کی تحتی مٹی کی ایک تہہ اوپر رہ گئی ہو) آبپاشی اور زمین کو زرخیز بنانے کا دوگونہ عمل بالکل قدرتی طور پر ایک ساتھ انجام پاتا ہے۔ لیکن اب غالباً نہروں یا ریلوے کی ضروریات کے تحت یا سیلاب کی روک تھام کی غرض سے پشتے بنا کر دریاؤں کو قابو میں لانے کی وجہ سے ایسے رقبہ میں کمی ہو گئی ہے جو اس طور پر پہلے سیراب ہوا کرتے تھے۔ ابوالفضل، اودھ میں ایسی زمینوں کا خاص طور پر جو دریائے سرو (سرجو) اور گھاگرہ سے سیراب ہوتی تھیں[2] اور ان زمینوں کا بھی جو سرکار سنبھل (بالائی روہیلکھنڈ) میں طغیانی کاشت کار ہوا کرتی تھیں ذکر کرتا ہے۔[3] لیکن زمینیں جو سندھ اور اس کی معاون دریاؤں سے متاثر ہوتی ہیں وہ موجودہ حالات کے مقابلہ میں سب سے زیادہ تضاد کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ موسمی طغیانی کا دریائی پانی سوکھی اور پیاسی زمین پر داخل ہونے کے وقت تقریباً بے قابو ہوا کرتا تھا اور اس کے پھیلاؤ کا بہترین اندازہ دریاؤں کے راستہ میں وقتاً فوقتاً ان حیرت انگیز تبدیلیوں سے کیا جا سکتا ہے جو دور زیر مطالعہ میں وسیع پیمانہ پر رونما ہوا کرتی تھیں۔ آئین اکبری کے دور تصنیف میں مثلاً دریائے بیاس اور ستلج اپنے موجودہ مقام اتصال پر یا اس کے قریب ہی

---

[1] آئین اکبری (۱)، ص 509 16 کروہ تقریباً 40 میل کے برابر ہوگا۔ ملاحظہ ہو ٹوڈ، اینلس اینڈ اینٹی کوائیز آف راجستھان Tool.'Annals & Autionities of Rajasthan] لندن 1914 جلد اص 619 جس میں پشتہ کی غیر معمولی کلال اور استحکام جیسا کہ بلاشک و شبہ بارہ میل محیط پر پھیلے ہوئے پانی کو بند کرنے کے لیے ضروری تھا ذکر آتا ہے۔

[2] آئین اکبری۔ ۱۔ ص 433 و نیز ص 303 یہ بات قابل ذکر ہے کہ دریائے سرجو جو اب گھاگرہ سے ضلع کھیری کے جنوبی مشرقی گوشہ پر ملتی ہے، دور آئین اکبری میں بہرائچ سے آگے بڑھ کر اجودھیا کی آبادی سے صرف بفاصلہ ایک کروہ دوسری دریا میں ملتی تھی (ایضاً 433 - 436) اس طور پر اس کا میدانوں میں بہاؤ بمقابلہ اس وقت کے بہت زیادہ تھا۔ یہ پرانی شاخ نقشوں میں اب بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ جیرٹ کے ترجمہ (Jarret tr.) 2 مطبوعہ سرکارہ ص 182) سے شدید مغالطہ پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس نے دریائی سئی کو سرو یا سرجو سے غلط ملط کر دیا ہے۔

[3] آئین اکبری (۱) ص 303 عمومی طور پر دہلی کے لیے ملاحظہ ہو ایضاً۔ ۱۔ ص 513

ایک دوسرے سے ملنے کے بعد فیروز پور کے نیچے دو شاخوں میں تقسیم ہو گئی تھیں۔ اوپری شاخ بیاس ہی کہلاتی رہی اور زیریں شاخ جو عملاً موجودہ دریائے ستلج کے بجرا کے مماثل تھی ستلج کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ دونوں شاخیں، 200 میل سے زائد ایک دوسرے سے تقریباً 30 میل کے فاصلہ پر رواں رہنے کے بعد غالباً دریائے (ترمیم مابعد) چناب اور ستلج کے موجودہ سنگم پر ایک دوسرے سے دوبارہ ملیں[1] دور عالمگیری میں کسی وقت دریائے بیاس نے اپنے سابقہ بجرا کو چھوڑ دیا۔ پھر بھی اس کی دو حصوں میں تقسیم عمل میں آئی مگر بمقابلہ پہلے کے بہت زیادہ نیچے کی طرف ہٹ کر[2] اور یہ تقسیم تھوڑے ہی فاصلہ تک قائم رہی۔ اس تبدیلی نے اس علاقہ کے بڑے حصہ کو

---

[1] آئین اکبری۔ ا صفحہ 549 اس دُشاخی تقسیم اور ان کے بہاؤ کے راستہ کی اس امر سے تصدیق ہوتی ہے کہ آئین اکبری میں دیبلپور، پاک پٹن، کھرور اور دینا پور کے ایسی آبادیوں کے جاتے وقوع کو بیتھ اور جالندھر کے دوآبہ (صوبہ ملتان) میں بتایا گیا ہے (ملاحظہ ہو عبادالرحمٰن خاں، مسلم یونیورسٹی جرنل 2 نمبر ایک، صفحہ 34-36) سروے کے نقشوں میں دریائے بیاس کے سابقہ بجرا (جو نقشہ پر بھی اسی نام سے موسوم کیے گئے ہیں) ایک دوسرے سے قریب بہتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ صوبۂ ملتان کے بیتھ اور جالندھر کے دوآبہ کے پرگنوں کا میں نے تفصیلی جائزہ مسٹر مونس رضا کی معیت میں کیا ہے۔ اس جائزہ سے پتہ چلا کہ دونوں شاخوں میں سے غالباً شمالی شاخ وہ ہے جو آئین اکبری کی تحریر کے وقت دریائے بیاس کا راستہ تھا۔ ان دونوں جدا ہونے والی شاخوں کے بیاس اور ستلج کے ناموں سے موسوم ہونے کی حقیقت کو صرف اس امر سے اخذ نہیں کیا گیا ہے کہ ابوالفضل نے ان کے درمیانی علاقہ کے لیے 'بیتھ' کا لفظ استعمال کیا ہے بلکہ ملتان کے قریب مسف شکن خاں کے دارا شکوہ کے تعاقب کی روئیداد سے بھی براہ راست ایسا ہی ثابت ہوتا ہے۔ اس نے ملتان سے اوچھ کو کوچ کرتے ہوئے پہلے دریائے بیاس کو اور پھر دو منزل کی مسافت طے کرنے کے بعد ستلج کو عبور کیا تھا (عالمگیر نامہ 271-2) (اضافہ مابعد) ابوالفضل نے آئین اکبری صفحہ 537 پر "بیتھ جالندھر" کی ہجے اختیار کی ہے لیکن آئین کے جدولات میں 'بیت جالندھر' کی ہجے درج ہے۔

[2] عالمگیر نامہ کی اس عبارت سے جس کا پچھلے فٹ نوٹ میں حوالہ آیا ہے ظاہر ہوتا ہے کہ 1659ء تک دریائے بیاس نے اپنا بجرا نہیں چھوڑا تھا لیکن سوجان رائے نے 1695ء میں تحریر کرتے ہوئے اس دُشاخی تقسیم کا مقام دیبلپور سے بہت نیچے متعین کیا ہے اور وہ لکھتا ہے کہ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

جو پہلے بیاس کی شاخ سے سیراب ہوا کرتا تھا لازمی طور پر تباہ کیا ہوگا۔ اسی طور پر سترھویں صدی کے دوران دریائے چناب اور جہلم کے سنگم کا مقام 28 میل سے زائد اوپر کی طرف منتقل ہوا[1]۔ دریائے پنج ند نا پید ہوگئی اور دریائے چناب تنہا اور دریائے بیاس و ستلج متحدہ طور پر علیحدہ علیحدہ دریائے سندھ میں اوچھ کے مقام کے قریب شامل ہوئیں[2]۔ چونکہ دریائے سندھ کے راستہ میں مسلسل تغیر ہوتا رہا ہے اس لئے اس کے ساحلی مواضعات میں جھونپڑیوں کو لکڑی اور پھوس کی بنانا پڑا[3]۔

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

شمالی شاخ جو بیاس کے نام سے موسوم تھی تھوڑی سافت طے کرنے کے بعد "جو چند فرسخ (کوروہ) سے زائد نہ تھی" دوبارہ دریائے ستلج میں شامل ہوگئی۔ سوجان رائے۔ 78 مسلم یونیورسٹی جرنل (3) نمبر ایک ص 38-41

چہار گلشن Bodl. ورق 108 الف پر مندرج احوال سفر ملتان تا بھکر سے ظاہر ہوتا ہے کہ راستہ میں پہلے بیاس، اس کے بعد اس کی ایک شاخ کو عبور کرنا ہوتا تھا۔ شجاعت پور کے اس کے شمالی کنارہ پر واقع ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاخ اس وقت دریائے ستلج کے موجودہ مجرا پر بہتی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آئین اکبری کے دنوں کی حالت اٹھارھویں صدی کے وسط تک دوبارہ بحال ہوگئی تھی بلکہ اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ سترھویں صدی میں تحریر کیا ہوا سفر نامہ غالباً چہار گلشن میں نقل کر دیا گیا۔

سوجان رائے۔ 63 کے اس قول کے مطابق کہ موسم سیلاب میں اس دریا کا عرض چند فرسخ رہ جاتا تھا جس کی وجہ سے سرکار دیبل پور میں نکھی کا بڑا جنگل وجود میں آیا تھا، دریائے بیاس کی خشک شاخیں غالباً سیلاب کے دنوں میں رواں ہو جاتی تھیں۔ دریائے بیاس ستلج نے جو متعدد شاخیں نکلی ہیں ان کے لئے رینل (Rennel) کے نقشہ کو بھی جو فرینکلن 'ہسٹری آف دی رین آف شاہ عالم' (History of the Reign of Shah Aulum) لندن 1798ء کے سرورق پر نقل ہے ملاحظہ کیا جائے۔

[1] آئین اکبری کی تحریر کے وقت مقام القعال شور کوٹ کے نیچے واقع تھا جو اس وقت دریائے جہنٹ کے دوآبہ میں تھا (آئین اکبری ج۔ ا۔ ص 347 ـ 49) لیکن سوجان رائے۔ 78 اس کے جائے وقوع کو جھنگ سیالن کے قریب کہتا ہے یعنی اس مقام پر یا اس کے قریب جہاں یہ ان دنوں واقع ہے۔

[2] ایسا آئین اکبری ج۔ ا ص 549 سوجان رائے ص 78 اور رینل کے نقشہ مذکورہ سے واضح ہوتا ہے۔ دریائے پنج ند اس وقت دریائے سندھ سے مٹھن کوٹ کے قریب ملتی ہے۔

[3] آئین اکبری ج۔ ا ص 558 ٹیمبرک (Tembrick) اپنے مقالہ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

نرم سیلابی مٹی میں دریاؤں کا اپنا مجرا تبدیل کرتے رہنے کے باعث تمام میدانوں میں متروکہ نالے بکھرے ہوئے پائے جاتے ہیں جو موسم طغیانی میں جب ان کے جدی دریاؤں کا پانی ان میں گھس آتا ہے رواں ہوجاتے ہیں۔ باوجودیکہ یہاں بھی دور حاضر کے پشتوں نے ان نالوں میں سے بیشتر کے دہانوں کو بند کردیا ہے، تاہم ایسے ظاہری آثار اب بھی پائے جاتے ہیں جس سے اس گمان کو تقویت پہونچتی ہے کہ دور مغلیہ میں اس نوعیت کی قدرتی نہروں کی تعداد اچھی خاصی رہی ہوگی۔[1] عام طور پر انکے ہموار راستوں کی وجہ سے ان قدرتی نہروں اور خالصتاً انسان کی بنائی نہروں کے درمیان امتیاز قائم کیا جاسکتا ہے لیکن انسانی کوششیں ان کو گہرا کرنے یا گاد سے صاف کرنے پر اتنی بار صرف ہوئی ہیں کہ کم از کم بعض صورتوں میں ان میں امتیاز کرنا دشوار ہوجاتا ہے۔[2] جائزہ مندرجہ ذیل میں مذکورہ دونوں اقسام کی نہروں کے متعلق خواہ وہ پہلے سے جاری تھیں یا دور زیر مطالعہ میں کھودی گئی تھیں شہادتیں فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دکن میں دریاؤں یا ندیوں سے چھوٹی چھوٹی نہروں کے نکالنے کا دستور پانی کا ذخیرہ جمع کرنے کے عمل قدیم تھا۔ مثلاً ہمارے علم میں آیا ہے کہ "بگلانہ میں لوگوں نے کاشتکاری کی ضرورت کے تحت دریاؤں سے کاٹ کر ہزاروں نہریں ہر قصبہ و گاؤں تک پہنچائی ہیں"[3] جن کا انتظام غالباً پھر کے امداد باہمی کے اصول پر ہوتا تھا اور یہ نظم اس علاقہ میں اس وقت بھی برقرار ہے۔[4]

(باقی حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

۰ آرلی کینال ایڈمنسٹریشن ان سندھ (Early Canal Administration in Sind) جرنل آف سندھ ہسٹوریکل سوسائٹی (1937) حصہ ا، صفحہ 15 و 16 میں اس امر پر زور دیتا ہے کہ "دریاؤں سے حفاظت کے لیے پشتوں کی ایک مسلسل قطار تعمیر ہوجانے کی وجہ سے ایسے رقبہ میں جس پر ہر سال سیلابی پانی چڑھ آیا کرتا تھا معتدبہ کمی واقع ہوئی ہے" اور اس کا خیال ہے کہ "ماقبل تاریخ ایام سے اٹھارہویں صدی تک سندھ کی بیشتر زراعت 'بوسی' قسم کی تھی یعنی فصل ربیع جن کی کاشت ایسی زمین پر کی جاتی جو دریائے سندھ کے پانی کے گھٹنے کے بعد موسمی سیلاب کے پانی سے قدرتی طور پر بھر جاتی ہے۔"

[1] موازنہ بہ Lambrick حوالہ سابقہ ص 16، [2] اس کی وضاحت فیروز شاہ کے اپنی مغربی جمنا کی نہر کو ہانسی اور حصار تک پہونچانے کے سلسلہ میں پرانی دریاؤں کی شاخوں کے استعمال سے فراہم ہوتی ہے (ملاحظہ ہو ذیل میں)، [3] صادق خاں، .Or 174 ورق 60 ب - 61 ب - 1671 ورق 34 الف

[4] Royal Commission on Indian Agriculture Report 125

لیکن دراصل بہت بڑی نہریں شمالی ہندوستان میں کھودی گئی تھیں۔ ایک روایت کی رو سے مشرقی جمنا کی نہر کی پرانی گذرگاہ عہد شاہجہانی میں کھودی گئی تھی مگر ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ یہ واقعتہً اٹھارھویں صدی کے اوائل کی تعمیر ہے[1] دریائے جمنا کے دوسرے سمت فیروز شاہ کی مشہور نہر رواں تھی[2] دور اکبری میں اس کی مرمت پہلے شہاب الدین خاں نے اور اس کے بعد نورالدین محمد ترخاں نے کرایا۔[3] آئین اکبری کے دور تصنیف میں بظاہر یہ نہر ہانسی کے آگے تک پانی لے جا کر بالآخر

---

[1] موازنہ بہ سہارنپور ڈسٹرکٹ گیزیٹیر 1909 ، ص 58 - 60 اس کا مصنف اس کا امکان ظاہر کرتا ہے کہ یہ نہر عہد محمد شاہی میں مکمل ہوئی ۔ یقیناً اس نہر کا دورِ شاہجہانی کی تاریخی تصانیف میں کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ یہ روایت کہ یہ علی مردان خاں کی تعمیر کردہ ہے ویسی ہی بے بنیاد ہے جیسی یہ روایت کہ نہر بہشت اسی امیر کی تعمیر کی ہوئی ہے

[2] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ کی نہر دریائے جمنا سے ضلع انبالہ مقام تجے والا سے نکل کر دریائے جمنا کے ایک پرانے نالے کے مجرا سے گذرتی ہوئی اندری تک آتی ہے (کرنال ڈسٹرکٹ گیزیٹیر 1918 اے ، جلد ص 3 و 4) پھر سفیدون سے تھوڑا آگے بڑھ کر یہ دریائے چٹنگ کے ایک پرانے نالہ میں داخل ہوئی جس نے اسے ہانسی ، حصار اور اس کے آگے تک پہنچایا (ملاحظہ ہو JASB. 1892, P. 420 امپریئل گیزیٹیر 1908 جلد 10 ص 186) یہ نالہ جیسا کہ بعض اوقات خیال کیا جاتا ہے سب سے پہلے فیروز شاہ نے نہیں کھدوایا تھا بلکہ صدیوں قبل تک یہ دریائے چٹنگ کو ہانسی کے آگے تک پہونچاتا تھا۔ چاچ نامہ ، جو ابتدائً آٹھویں صدی میں لکھا گیا تھا کہ تیرھویں صدی کے فارسی ترجمہ میں " دریائے ہسی (ہانسی) کا واضح حوالہ موجود ہے۔ (چاچ نامہ مطبوعہ پروفیسر داؤد پوتا ص 51)

[3] بقول وارث (راے): ورق 401 الف (بی) ورق 16 ب (صالح ، ج 3 ص 29) دور اکبری تک نہریں گاد سے بھر گئی تھیں اور شہاب الدین خاں نے اپنی دہلی کی صوبیداری کے زمانہ میں (یعنی اوائل عہد اکبری کے دوران) اپنی جاگیر میں " کاشتکاری کی توسیع " کے خیال سے اس کی مرمت کرا کرا سے شہاب نہر کے نام سے موسوم کیا۔ نورالدین محمد ترخان نے غالباً نہر کے مجرا کی صرف مرمت یا دوبارہ کھدائی کرائی تھی کیونکہ بقول بدایونی ج (3) ص 190 اس کی نہر جو شاہزادہ سلیم کے نام سے موسوم کی گئی تھی۔ دریائے جمنا سے کاٹی گئی تھی اور کرنال اور اس کے آگے 30 کوروہ تک رواں تھی (قیاساً سفیدون کے آگے تک جو اس کی جاگیر تھی) نہر کی تعمیر کا مادہ تاریخ ناقص معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سے 976 کی عدد نکلتی ہے جبکہ سلیم 977 ھ (1569 ء) میں پیدا ہوا تھا

بھدرا تک پہونچ کر ہی ختم ہوتی تھی۔[1] یہ نہر دوبارہ گاد سے بھر گئی تھی لیکن شاہجہاں نے اس کے دہانہ سے لے کر جو تقریباً پہاڑیوں کے دامن میں بمقام خضرآباد واقع تھا سفیدوں تک اس کے صاف کرانے کا اور پھر وہاں سے تیس کو روہ یعنی تقریباً 78 میل لمبا اس کا ایک نالہ دلی کے نئے شہر شاہجہاں آباد کی ضرورت کے تحت کھودے جانے کا فیصلہ کیا۔[2] یہ مشہور نہر بہشت یا نہر فیض تھی جسکی تعمیر کو اس زمانہ کے لحاظ سے ایک خاصہ بڑا کارنامہ تصور کرنا چاہیے[3] اور باوجودیکہ اس نہر کی بہ نسبت اس کی جانشین مغربی جمنا کی نہر کے کوئی حیثیت نہ تھی مگر پھر بھی اس سے یقیناً بہت زیادہ علاقہ کی آبپاشی ہوتی رہی ہوگی۔[4]

ہریانہ جو دریائے جمنا اور ستلج کے درمیان پھیلا ہوا ہے ایک ایسا علاقہ ہے جس میں کوئی بارہ ماہی دریا نہیں پایا جاتا۔ موسمی ندیاں جو شیوالک کی پہاڑیاں یا اس کے دامن سے نکلتی ہیں میدان تک پہنچتے پہنچتے یا تو ناپید ہو جاتی ہیں یا ان نالوں میں سے کسی ایک میں شامل ہو جاتی ہیں جو ریگستان کی خشک دریائے گھگر یا ہکڑا تک جاتے ہیں۔ اس خطہ میں یہ رواج رہا ہے کہ مصنوعی پانی کی زیادہ یا کم از کم

---

[1] آئین اکبری۔ ا۔ ص 15-514

[2] وارث (رائے): اوراق 401 الف - 402 الف - 411 الف (ب) اوراق 16 ب - 18 الف 30 ب صالح 3 ص 29 سوجان رائے 29 - 30 36 - 37 نہر کا کام عہد شاہجہانی کے بارھویں سال شروع ہو کر اکیسویں سال ختم ہوا۔ نہر کی لمبائی جس کو روہ کے پیمانہ میں دی گئی ہے اسے 'کو روہ شاہی' بتایا گیا ہے جس کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ الف 'علی مردان خاں' کا اس نہر سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس کے نام کو محض بعض کی روایات ہی اس سے منسوب کیا گیا ہے یعنی 'بہار گلشن' مترجمہ سرکار ص 124 اور فرینکلن 'The History of the Reign of Shah, Aledum' ص 208 مورلینڈ 'اکبر تو اورنگ زیب' Akbar to Aurangzeb 196 بھی ملاحظہ ہو

[3] صرف 'شاہ نہر' یعنی شاہی نہر کے نام سے بھی معروف ہے۔

[4] سوجان رائے 34-7 کہتا ہے کہ اس نہر کے متعلق بیشک یہ کہا جا سکتا تھا کہ دریائے جمنا کا نصف پانی اسکے مصرف میں آجاتا تھا اور "یہ نہر بہت سے پرگنوں کی کاشتکاری کے لیے نفع بخش تھی اور دارالسلطنت کے قریب کے باغوں کو بھی سیراب کرتی تھی" فرینکلن حوالہ سابقہ میں مندرجہ 'احوال دہلی میں' جو 4-1793ء میں لکھا گیا تھا بتلاتا ہے کہ "یہ اپنے راستہ میں 90 میل سے زائد لمبے علاقہ کو زرخیز بناتی ہے" اور وہ یہ کہتا ہے کہ "یہ نہر ٹھوس پتھر کی کان سے کاٹ کر نکالی گئی تھی اور یہ مفصلات مغل پارہ میں پہونچکر جو تقریباً 3 میل لمبا تھا 25 فٹ گہری اور اسی قدر چوڑی تھی

رسی فراہمی کی غرض سے ان ندیوں پر پشتے یا بند باندھے جاتے تھے[1] مگر دریا کے نچلے حصہ میں پانی کی صورت حال قطری طور پر مایوس کن رہی ہے جس کی تصدیق دریائے چوٹنگ یا چتر نگ کے متعلق ایک نیم سرکاری تحریر سے ہوتی ہے جس کے ذریعہ اس کی تفصیلی اطلاعات ہم تک پہونچتی ہیں۔ دور شاہجہانی میں مرتب کی ہوئی یہ ایک طویل یادداشت ہے جس میں اس کے راستہ کی صفائی اور اسے زیادہ گہرا کرنے کے متعلق تجاویز موجود ہیں۔ ان کا مقصد اس کے پانی کو حصار تک پہونچانا تھا جبکہ نواحی علاقہ میں عرصہ دراز سے پانی نہ پہونچنے کی وجہ سے بیحد پریشانی تھی[2] مگر اس امر کی تصدیق نہیں ہوتی کہ یہ تجویز روبکار لائی گئی[3] اور نہ بعد کے کاغذات ہی سے اس قسم کے کسی کام کے تکملہ کا کوئی پتہ چلتا ہے۔

---

[1] چنانچہ مثلاً کرنال ندی کے بند کو اصالت خاں نے بنوایا تھا اور شاہجہاں نے اپنی حکومت کے گیارھویں سال اس کا معائنہ کیا تھا (لاہور 2 ص 112) مونسریٹ (Monserrate) (ص 102) سرہند کے نواحی میدان کے باغات کی تعریف کرتا ہے جو "ایک گہری اور مصنوعی جھیل" سے سیراب ہوتے تھے اور جس میں "بارش کے موسم میں آبپاشی کے نالوں کے ذریعہ" پانی بھرجاتا تھا (غالباً موسمی ندیاں پڑھنا چاہئے۔)

[2] یادداشت میں کس قدر خطیبانہ انداز میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ دریائے چٹنگ نے حصار کو "ایک برس" سے پانی کی فراہمی بند کردی تھی مگر شہاب نہر کے متعلق ہماری اطلاعات اور نیز آئین اکبری کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاخ حصار کے مقام پر شہاب نہر کے گاد سے بھرجانے کے بعد ہی خشک ہوئی۔ شاہجہاں کی نہر نے دریائے چٹنگ کو بالکل چھوڑ کر دریائے جمنا کے تمام پانی کو دہلی کی طرف منتقل کردیا۔ یہ یادداشت دریائے جمنا کی اس شاخ کا کوئی حوالہ نہیں دیتی (جو اب شاید ہی بحال ہوسکی ہو) اور اپنے بیان کو دریائے چٹنگ ہی پر مرکوز رکھتی ہے۔ یہ اس دریا کے منبع کی نشاندہی سدھورا کے قریب کرتی ہے اور اس میں یہ دلیل بھی پیش کی گئی ہے کہ اگر یہ ایک موسمی دریا تھی تب بھی ایک بہتر نالے کے ذریعہ یہ حصار تک پہنچائی جاسکتی تھی۔ اس میں اس خیال کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ اس دریا میں چکلہ سرہند کے دو یا تین مقامات پر بند باندھے جاسکتے تھے۔ یہ یادداشت ان کاغذات میں موجود ہے جسے بالکرشن نے جمع کیا تھا۔ Add. 16859 اوراق 107 الف سے 109 ب۔ یہ کاغذات شاہجہاں کے اختتامی اور اورنگ زیب کے ابتدائی دور کے متعلق ہیں لیکن اس یادداشت میں اعلیٰ حضرت کے لقب کا حوالہ ملتا ہے جو معمولاً شاہجہاں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

[3] یہ کہا گیا ہے کہ چکلہ حصار کے زمینداران اور کاشتکاران جوں ہی اس نالے کا پانی ان کے قریب آجاتا تو اپنی زمینوں یا آبادیوں پر اس کی کھدائی کے کام کے لیے تیار ہوجایا کرتے تھے۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

البتہ خاص پنجاب میں بالائی باری کے دوآبہ میں نہروں کا ایک مختصر سا سلسلہ قائم کیا گیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور شاہ نہر بھی دور شاہجہانی میں کھودی گئی تھی۔ یہ نہر پہاڑیوں کے دامن میں مقام راجپور (یا شاہ پور) سے شروع ہو کر بفاصلہ 37 کوروہ یا 94 میل لاہور تک پانی پہونچاتی تھی[1] اسی مقام سے ایک اور نہر شروع ہو کر پٹھان کوٹ، دوسری بٹالہ اور تیسری پٹی ہیبت پور تک جاتی تھی۔ مقامی مورخ سترھویں صدی کے اختتام پر لکھتا ہے کہ "ان نہروں سے کاشتکاری کو بیحد فائدہ پہونچتا ہے"[2]

پنجاب کے بقیہ حصوں کے متعلق ہمارے ماخذ زیادہ اطلاعات فراہم نہیں کرتے۔ سدھنائی[3] کے نالہ کی صورت اب نہر کی نہ رہ سکتی تھی کیونکہ یہ دریائے راوی کے خاص دھارے کا اب مجرا بن چکا تھا

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

یادداشت سے بہر حال یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ چونکہ سرہند یعنی اس نالہ کے بالائی علاقہ کے حکام اس منصوبہ سے زیادہ دلچسپی نہ رکھتے تھے۔

[1] لاہوری۔ 2، ص 160-9، ص 233/4، ص 311/315 صادق خاں۔ Or. 174 اوراق 92 الف، 102-الف ب۔ Or. 1671 اوراق 50 ب، 56 الف مآثر الامراء 2، ص 6-2/0 سوجان رائے۔ 77۔ لاہوری کے بیان کے مطابق، پہلی کوشش جو علی مردان خاں کے ایک آورد کی نگرانی میں شروع ہوئی تھی ناکام رہی، حالانکہ اس کی کھدائی کا کام لمبائی میں 48 ½ کوروہ جریبی تک مکمل ہو چکا تھا۔ شاید اس کے گھیر کو اس قدر زیادہ چوڑا کر دیا گیا کہ پانی کافی مقدار میں لاہور تک نہ پہونچ سکا۔ نالے کو گہرا کرانے کی دوسری کوشش بھی ناکام رہی۔ بالآخر 5 کوروہ کی لمبائی کو "نستثنی" کر کے پہلے کا پورا نالہ چھوڑ دیا گیا اور ایک نیا نالہ جس کی لمبائی 1 ½ کوروہ کم تھی کھود کر عہد حکومت کے سولھویں برس تک مکمل کر لیا گیا۔ غالبًا فاصلے سابقہ (اور نسبتًا چھوٹے) سرکاری کوروہ میں دیے گئے ہیں۔ (ملاحظہ ہو ضمیمہ الف)

[2] سوجان رائے۔ 77 ممکن ہے بٹالہ تک جانے والی نہر اسی نالہ میں ہو کر بہتی ہے جو پہلے شاہ نہر کے لیے کھودا گیا تھا۔

[3] آئین اکبری میں ملتان اندر تولمبا کے جائے وقوع کو دوآبہ باری میں بتایا گیا ہے جس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دریائے راوی اپنے پرانے نالے کو چھوڑ چکی تھی جو ملتان کے مشرق سے گذرتا ہوا سدھنائی میں بہتا تھا (سوجان رائے۔ 77 بھی ملاحظہ ہو) دریا کے اس حصہ کے متعلق روایات مظہر ہیں کہ یہ ابتداً انسانوں کی بنائی ہوئی ایک نہر تھی اور اس کی تائید اس کے غیر معمولی سیدھے راستہ سے بھی ہوتی ہے (موازنہ ہو، ملتان گیزیٹیر، 1883-4، ص 2، J.A.S.B. 1892، ص 370 نوٹ نمبر 365، (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

بہرحال، ہمارے علم میں آیا ہے کہ دریائے رچنا کے بالائی دوآبہ میں وزیر آباد کے نزدیک بمقام سودھرا علی مردان خاں کے باغ کو سیراب کرنے کی غرض سے دریائے تاوی سے کاٹ کر ایک چھوٹی نہر نکالی گئی تھی[1]۔ علاقہ میں 'میراب'، (کینال سپرنٹنڈنٹ) کی تقرری کے حکم کے مسودہ سے جو انتظامی تحریروں کے ایک مجموعہ میں اس وقت تک محفوظ ہے سرکار ملتان میں نہروں کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ اس مسودہ میں میرآب' کو ہدایت دی گئی ہے کہ "نئے نالے کھودے جائیں، پرانے صاف ہوں اور سیلابی بہاؤ پر بند سیل کی تعمیر کی جائے" اور کاشتکاروں کے درمیان نہر کے پانی کی منصفانہ تقسیم کا انتظام کیا جائے[2]۔ موجودہ سندھ ساگر کے دوآبہ کا انتہائی جنوبی حصہ جو علاقہ بلوچستان میں واقع ہے اپنی زرخیزی کے لیے مشہور تھا[3]۔ اورنگ زیب اس زرخیزی کا سبب سیلابی پانی کی موجودگی اور کنوؤں سے آبپاشی کو بتاتا ہے[4]۔ بلاشک یہ علاقہ دریاؤں کے غیر مستقل نالوں سے بھرا ہوا تھا[5]۔ لیکن روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دریائے سندھ کا جو حصہ اس وقت مٹھن کوٹ کے پاس سے بہتا ہے وہ ابتداً انسانوں کی بنائی ہوئی ایک نہر تھی جس میں اوائل انیسویں صدی میں دریائے سندھ نے بہنا شروع کیا اور پھر اسی کو چوڑا کرکے اپنا مجرا بنا لیا[6]۔

علاقہ سندھ میں پہونچ کر دریائے سندھ میں نئی شاخوں کے پھوٹنے اور ان نالوں کو جو پورب میں مشرقی نارا تک چلے گئے ہیں، سیلابی پانی سے لبریز کرنے کا رجحان اور زیادہ ہو جاتا ہے اس کے علاوہ، دیگر بڑی مصنوعی نہریں بھی تعمیر ہوئی تھیں خصوصاً بالائی سندھ کے علاقہ میں بیگاری

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)

جی آر، ایلساٹی تھرٹی فائیو ایرس ان دی پنجاب (G.R. Elmsie 'Thirty five years in the Punjab)' 1858 93 354

[1] سوجان رائے 74 یہ تصور کرتے ہوئے کہ دریائے تاوی اس وقت دریائے چناب سے اس کے موجودہ سنگم پر یا اس کے قریب ملتی ہوگی اس نہر کی لمبائی کو 30 میل سے اچھا خاصا زیادہ ہونا چاہیے۔

[2] نگار نامۂ منشی' اوراق 190 ب' 199 الف Rodl. ورق 157 الف-ب مطبوعہ۔ 151-2 میں مندرج ایک پروانہ

[3] سوجان رائے۔ 63، 64

[4] ادب عالمگیری، اوراق 13 ب، 14 الف۔ رقعات عالمگیری ص 29

[5] جے۔اے۔ایس۔بی (JASB) 1892 ص 299

[6] ایضاً ص 303 نوٹ نمبر 301 - مسلم یونیورسٹی جرنل۔ ا۔ ص 560

آہ کی لبی نہر جس کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ بیگاری کے مزدوروں نے اسے کھودا تھا اور نوشہرہ ڈیویژن میں نوتکی نہر جس کے متعلق قیاس ہے کہ یہ اوائل اٹھارھویں صدی کے قبل تیار ہوئی تھی[1]۔ ڈیلٹائی علاقہ میں جام حکمرانوں کے ایک وزیر دریا خاں نے سولہویں صدی کے اوائل میں 'خان واہ' نہر کھدوایا تھا[2]۔ گاد کے مسلسل تہہ نشین ہونے کی وجہ سے دریائے سندھ کا مجرا اپنے آس پاس کے میدانی علاقوں کی سطح سے بہت اونچا ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً اس کے اصل دھارے و نیز اس کے نالوں کے سیلابی پانی کو کھیتوں کی آبپاشی کے مصرف میں لانے میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ بقول برنیر عام دستور یہ تھا کہ دریا یا نہروں سے 'کاریز' یا مصنوعی نالے کاٹ کر نکالے جاتے تھے[3] یا پانی کو اوپر لانے کی غرض سے 'چرخ فارسی' (Persian Wheel) جس کا حوالہ ہمعصر شہادتوں میں بھی ملتا ہے نصب کیے جاتے تھے[4]۔

نہروں کے ذریعہ آبپاشی کے نظام کے متعلق ہماری اطلاعات مسلمہ طور پر نامکمل ہیں۔ تاہم اس قدر بات واضح ہے کہ ہمارے عہد میں قدرتی سیلابی نالوں کے بہ کثرت استعمال کے علاوہ کچھ

---

[1] لیمبرک (Lambrick) ان جرنل آف سندھ ہسٹوریکل سوسائٹی 3- 1937ء حصہ 1 ص 17

[2] تاریخ طاہری، 1605 ورق [illegible] الف۔ یہ نہر سروے کے نقشوں میں اس وقت بھی ملتی ہے یہ ٹھٹھہ کے قریب دریائے سندھ کے اصل نالے سے نکل کر مغرب کی طرف بہتی ہے۔ بقول تاریخ طاہری اس کی کھدائی سے "پرگنہ سنکورہ (موجودہ میرپور سکرو) اور پہاڑیوں (یعنی دریائے سندھ کی کھاڑی گھاڑو کے اتر کی چھوٹی پہاڑیوں) کے دامن اور شہر (ٹھٹھہ) کے اطراف کے دیگر علاقوں کو آباد کرنا مقصود تھا" ملاحظہ ہو ہیگ 'انڈس ڈیلٹا کنٹری' (Haig, 'Indus Delta Country') ص 86 نوٹ۔

[3] Bernier، 454 وہ "کالیس" کہتا ہے۔ اس کا مفہوم یا تو کاریز یعنی دریا سے کاٹ کر نکالا ہو یا کھال (یا کھالا) یعنی ایک مصنوعی نالہ جیسا کہ پنجاب میں رائج تھا۔ ملاحظہ ہو پرنسپ 'ہسٹری آف دی پنجاب' Prinsep, 'History of the Punjab' لندن، 1846 جلد ا- ص 33 و 154 جس میں ان الفاظ کی املا ترتیب وار 'کہریز' اور کھول درج ہے اور Elliot, Memoirs 2- 126 بھی۔

[4] پیلزیرٹ (Pelsaert) Jahangir's India، 1626- 10 ص 119 نیل کے کاشتکاروں کے متعلق ان دونوں حوالوں کے لیے ملاحظہ ہو لیمبرک، حوالہ سابقہ ص 15،

نہریں بھی کھودی گئی تھیں جن میں سے بعض واقعتہً بڑی تعمیرات ہیں[1] پنجاب اور سندھ کے علاقوں میں جس اعلیٰ قسم کی فصل کا ہم کو اکثر ہمعصر ماخذ میں حوالہ ملتا ہے[2] وہ بیشتر انھیں علاقوں میں جو مذکورہ طریقہ پر سیراب کئے جاتے ہیں پیدا ہوتی تھی۔ باوجود اس کے یہ بھی ایک واضح امر ہے کہ آبپاشی کے لیے یہ قدرتی نالے ہر موقع کے لیے مشکل ہی سے موزوں ہو سکتے ہیں، کیونکہ ان نالوں سے آبپاشی اسی صورت میں ممکن ہو سکتی تھی جب ان نالوں کے مخرجی (دریاؤں) میں پانی کی سطح کھیتوں سے بہت اونچی تھی۔ نہ ہی اس دور میں انسان کی بنائی ہوئی نہریں گنجائش اور باضابطہ تعمیر کے اعتبار سے دورِ حاضر کی انجینئری کے اصولوں پر تعمیر شدہ نہروں کا مقابلہ نہ کر سکتی تھیں۔ لہٰذا اس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ وادی سندھ اور دریائے گنگا کے بالائی میدانوں میں جو نہروں کا جال دورِ حاضر میں پھیلایا گیا وہ دورِ وسطیٰ نہروں کے بہترین سلسلہ سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہے۔

فصل 3 — فصلیں اور دیگر زرعی پیداوار

مغلیہ ہندوستان میں غذائی اجناس کے پیداوار کی عمومی تقسیم ایسی ہی تھی جیسی کہ ان دونوں چاول اور گیہوں و باجرہ کے درمیان ہے اور 40 و 50 انچ کے سالانہ مساوی البارش (Isohyets) خطوط ان کے مابین حد فاصل کو متعین کرتے ہیں۔ وادی آسام میں[3] بنگال[4] و اڑیسہ[5] میں مشرقی ساحل پر[6] اور علاقہ تامل[7]، مغربی ساحل کی تنگ پٹی[8] اور کشمیر[9] میں چاول پیدا ہوتا تھا اور ان علاقوں میں

---

[1] اس کے متضاد رائے کے لیے جو غالباً سرسری طور پر قائم کی گئی ہے ملاحظہ ہو مورلینڈ 'India & c. of Akbar' 107 ص

[2] آئین اکبری۔ ا۔ 538، تھیونو (Thevenot) 85 اور سجان رائے 79 پنجاب کے لیے اور آئین اکبری۔ ا۔ 556 اور مینرق (Manrique) 2- 238۔ سندھ کے لیے۔

[3] فتحیہ عبریہ۔ ورق 32، ب [4] آئین اکبری۔ ا۔ 389، [5] ایضاً۔ 391

[6] ریلیشنز آف گولکنڈہ (Relations of Golcunda) ص 7-8؛ فرائیر (Fryer) ا ص 99

[7] ولکشا، اوراق 112، 113۔ الف

[8] Fryer ص 137، 139؛ لنشاٹن Linschoten 245؛ 6 Factories 1665-67 ص 45

[9] آئین اکبری۔ ا۔ 563 تزک جہانگیری 300 - 301 کشتوار کی صورت اس کے لیے متضاد تھی (ایضاً۔ ص 296)

گیہوں و باجرہ کی کاشت بالکل نہ تھی۔ بہار[1]، الہ آباد[2] و اودھ[3] اور خاندیش[4] چاول تھوڑا بہت ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی پیداوار گجرات میں خصوصاً جنوبی ساحلی پٹیوں[5] پر اور اٹھارہویں صدی کے وسط کے ایک مصنف کے دعوے کے مطابق اس صوبہ میں بمقابلہ "قدیم ایام" کے بہت بہتر قسم کا چاول اگنے لگا تھا۔[6] چاول کی کاشت ان دنوں اپنی مخصوص آب و ہوا کے حدود سے گذر کر دور حاضر کی طرح شمال و مغرب کے خشک خطوں میں داخل ہو چکی تھی دریائے سندھ اور اس کی شاخوں سے آبپاشی کی سہولیتوں نے اسے ڈیلٹا[7] کی خاص فصل کا درجہ عطا کر دیا تھا جبکہ اعلیٰ قسم کا چاول صوبہ لاہور میں بویا جانے لگا تھا۔[8]

اسی طور پر گیہوں کی کاشت بظاہر اپنے تمام طبعی خطوں میں ہوا کرتی تھی۔ دلچسپ بات یہ ملتی ہے کہ اس کی پیداوار حدود بنگال میں بھی دخل انداز ہو گئی تھی اور حالانکہ اس پیداوار کو ادنیٰ درجہ کا تصور کیا جاتا تھا مگر اس کا امکان پایا جاتا ہے کہ ان دنوں اسکی وہاں پیداوار بمقابلہ اسوقت کے زیادہ رہی ہو۔[9]

---

[1] آئین اکبری ۔ا۔ ص 416

[2] ایضاً ص 423 منڈی (Mundy) 91 ،2 -98

[3] آئین اکبری ۔ا۔ 433

[4] ایضاً ، 473 Tanrnir 102 Thevenot 41

[5] آئین ۔ا۔ 493 کومیسریٹ، مینڈلسلو Commissariat, Mandelslo Tansumier

:54 Thavenot -37

[6] مرآۃ ا۔ ص 14

[7] آئین اکبری ا۔ ص 556 ، مینرلق 2۔ ص 238 ،

[8] سوجان رائے۔79۔ موازنہ یہ نیز Manrique ص 221 Thevenot ,85

[9] Bernier اسٹر (Vaster) 2 ص 2-81 (اطراف ہگلی کے حوالے) 16.16 میں سورت کے گماشتوں کو اس سے انکار تھا کہ "بنگالہ گیہوں نہیں بھیجتا.... انڈیا کو" لیٹرس ریسیوڈ Letters Received) 4 ص 327) ان دنوں انگریز 'انڈیا' سے ہندوستان کے پرتگالی مقبوضات کا مفہوم لیتے تھے۔ مترجم) اس انکار کی بنیاد یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ گیہوں بندرگاہ سے فراہم ہوتا ہے یا اسکے عقبی علاقے سے ز ملاحظہ ہو، مورلینڈ کی 'India ... of Akbar' 120

شمالی گیہوں کے جو وسطی میدانوں[1] اور گجرات[2] کے علاقوں میں بہ افراط پیدا ہوتا تھا مگر بنگال[3] میں اس کی اچھی کاشت ممکن نہ رہی ہوگی جبکہ کنارا،[4] تامل ناڈ،[5] اور کشمیر[6] میں تو یہ پیدا ہی نہ کیا جاتا تھا۔ ملٹس[7] (Millets) (جوار، سانواں، لدھرا وغیرہ۔ مترجم) اور گیہوں کے علاقے بیشتر ایک ہی تھے لیکن اول الذکر کے لیے نسبتاً زیادہ خشک علاقہ سازگار ہوتا ہے۔ چنانچہ جوار اور باجرہ کی کاشت صوبۂ الہ آباد[8] میں نہ تھی جبکہ بہ سمت مغرب دیبلپور کے علاقہ میں جوار ہی کو خریف (موسم خزاں) کی خاص پیداوار کا درجہ حاصل تھا اور گیہوں ربیع[9] (موسم بہار) میں بویا جاتا تھا۔ اجمیر[10]

---

[1] ایسا مالوہ کے علاوہ، تقریباً تمام شمالی صوبوں (یعنی الہ آباد، اودھ، آگرہ، اجمیر، دہلی، لاہور اور ملتان) میں ملتا ہے۔ مالوہ میں صرف رائے سین کے دستور میں ایسا ملتا ہے۔

[2] Fryer، ص 297 اڑیسہ میں بھی ایسا ملتا ہے۔ باوڑی (Bowry) 121

[3] آئین اکبری۔ ا۔ 389 آسام میں بھی نہیں (فتیحۂ عبریہ ورق 32 ب)

[4] Linschoten، ص 246

[5] Fryer ۔ ا۔ ص 226

[6] آئین اکبری۔ ا۔ ص 389 ہمعصر حوالوں میں جو کو اکثر جنس غلّہ یا (یورپی مآخذ) میں 'کارن' ('Corn') اور سیریلس Cereals کے قسم کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔

[7] آئین اکبری (ا۔ 293 - 300) میں 'ملٹس' سے مراد جوار، لہدرا (یعنی باجرہ)، سانواں (فارسی: شاماخ) (موجودہ سانواں)، چینا (فارسی؛ اردو)، منڈوا (موجودہ مڑوا یا رگی)، کودرون یا کودرم (موجودہ کودوں)، کنگنی (فارسی: گال)، موجودہ کاکن)، کودیری یا کوری اور برتی ہیں۔ ان میں سے آخری دو کا پتہ نہ چل سکا۔ کودیری کو صراحتاً کمتر درجہ کی پیداوار بتایا گیا ہے اور دستوروں میں 'برتی' کا کوئی اندراج نہیں ملتا۔ شاید کودری، کونڈلی (Panisum Milliare) کا بدلا ہوا نام ہو۔ بقول مورلینڈ India & c. of Akbar منجھری یا کٹکی (Panicum Psilopodium) کے مماثل ہیں۔

[8] آئین اکبری۔ ا۔ 423 بہرحال جوار اس دبہ کے دستوروں میں ملتا ہے۔ لیکن لہدرا (یعنی باجرہ) اور تین یا چار قسم کے دوسرے 'ملٹس' نہیں ملتے۔

[9] سوجان رائے۔ 63۔

[10] آئین اکبری۔ ا۔ ص 505

گجرات[1] اور خاندیش[2] کے علاقوں میں ملٹس درحقیقت غذائی اجناس پر غالب تھا، لیکن مالوہ[3] اور سوراشٹر[4] میں ایسا نہ تھا۔ دالوں کے معاملہ میں بھی دور مغلیہ سے اس وقت تک کسی خاص تبدیلی کا پتہ لگانا دشوار ہے۔ آئین اکبری سے مختلف پیداوار وں کے متعلق جو اطلاعات ہم پہونچی ہیں وہ ظاہر کرتی ہیں کہ اس وقت کی فصلوں کا عمومی انداز اس وقت کے اگر مماثل نہیں تو اس کے مشابہ ضرور تھا[5]۔

لہٰذا خاص غذائی فصلوں کی جغرافیائی تقسیم موجودہ حالات سے بہت ہی تھوڑا فرق ظاہر کرتی ہیں۔ مورلینڈ صوبہ جات اودھ، آگرہ اور دہلی کی مختلف فصلوں کے متعلق آئین اکبری میں مندرج قیمتوں اور تشخیص کی شرحوں کی جانچ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ ایک جنس کی قیمت اور

---

1. ایضاً۔ 485 تزک جہانگیری۔ 207 - مرآۃ۔ ا۔ 14
2. آئین اکبری۔ ا۔ ص 473 دستور العمل، ورق 7 الف
3. آئین اکبری۔ ا۔ 455۔
4. مرآۃ۔ ا۔ ص 178 حالانکہ آئین اکبری۔ ا۔ 490 میں بتایا گیا ہے کہ سورٹھ میں جوار کی تین سالانہ فصلیں ہوتی تھیں
5. آئین اکبری۔ ا۔ 298۔300 میں یہ فہرست درج ہے۔ نخود (چنا) دو قسم، کابلی اور ہندی یا معمولی۔ مسور (فارسی: عدس) مٹر (فارسی: مشنگ، ہرا مٹر) مونگ (فارسی ماش) ارد (ماش سیاہ، لیکن دستوروں میں صرف ماش درج ہے اور مونگ کو اس کے دیسی نام سے بیان کیا گیا ہے) لوبیا اور کلٹ (موجودہ کلتھی) ارہر کو اس فہرست میں نہیں دکھایا گیا ہے لیکن 'آئین نوزدہ سالہ اور دستوروں میں یہ درج ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ دستوروں میں اودھ کے چند حلقوں کو چھوڑ کر بقیہ میں اس کے سامنے کی جگہوں کو خالی چھوڑ دیا گیا ہے۔ 'آئین نوزدہ سالہ' میں بھی ارہر کا نرخ صرف الہ آباد، اودھ، اور ملتان کے صوبوں کا دیا گیا ہے اور یہ بھی عہد حکومت کے بیسویں سال کے بعد سے جو یکساں طور پر 20 دام فی بیگھہ درج ہے۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ اسے اس قدر کمتر درجہ کی پیداوار خیال کیا جاتا تھا کہ بیشتر خطوں میں اس کا نرخ تک درج نہیں کیا گیا۔ جن دالوں کو ان دنوں کھیسری کہا جاتا ہے۔ اس کا کساری کے نام سے اندراج اس کے اصل خطہ یعنی بہار میں ملتا ہے اور اسے غریبوں کی غذا اور اس کے استعمال کو بیماری کا سبب بتایا گیا ہے (آئین اکبری۔ ا۔ 416) یہ بھی کہا گیا ہے کہ چمپارن میں ماش یعنی ارد و زمین پر بغیر ہل چلائے بوئی جا سکتی تھی (ایضاً۔ 417) موٹھ، صوبہ الہ آباد میں بہت کم پیدا کی جاتی تھی (ایضاً۔ 423)

نیز قدر مبادلہ فی ایکڑ میں بمقدار دوسری جنس کے اس وقت سے بہت کم تبدیلی ہوئی ہے۔ غذائی غلوں میں صرف "چھوٹے ملٹس" کی قیمت (بمقدار گیہوں) فی ایکڑ بمقابلہ اس وقت کے زیادہ اور باجرہ کی، بمقابلہ ان دنوں کے بہت کم معلوم ہوتی ہے[1]۔ "چھوٹے ملٹس" کی قیمت میں موجودہ کمی کا سبب متعین کرنا آسان نہیں۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ فی زمانہ زیادہ خشک زمینوں پر اس کی جگہ مکے کی کاشت زیادہ ہونے لگی ہے۔ (ترمیم مابعد) اس بیان کو کہ چھوٹے ملٹس کی مجموعی پیداوار فی ایکڑ کی قیمت بمقدار گیہوں کم ہوئی ہے حذف کر دینا چاہیے۔ چونکہ زرعی شماریات میں مذکورہ قسم کے چھوٹے ملٹس، کی مجموعی پیداوار کے فی ایکڑ کے اعداد نہیں ملتے، لہٰذا اس کے موازنہ کی کوشش نہیں کی جا سکتی مجھے اس سلسلہ میں بظاہر مورلینڈ کے بیان (انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر۔ 103) کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس اہم غلہ کی کاشتکاری میں توسیع اور اس کو یہاں کی آب و ہوا کے موافق بنانے کا کام مخصوص

---

[1] جے، آر، اے، ایس JRAS 1917 820 ایضاً 1918 8-377، India & c. of Akbar 103

معہ نوٹ (اضافہ مابعد) مورلینڈ کے دور آئین اکبری اور زمانۂ حال کی مختلف فصلوں کی کل پیداوار فی ایکڑ کی تقابلی قیمتوں پر تحقیق کی جانچ میرٹھ ڈسٹرکٹ گیزیٹیر 1922ء کے 142 اور مابعد صفحات پر مندرج ضلع کی مختلف فصلوں کی فی ایکڑ کل پیداواروں کی قیمت کے متعلق اطلاعات سے کی جا سکتی ہے گیزیٹیر میں مندرج غذائی فصلوں کی مقدار پیداوار کی تقابلی قیمتوں کو (گیہوں = 100 کے مساوات پر) آئین اکبری کے میرت (میرٹھ) کے دستور کے حلقہ کی انہیں فصلوں کی مالگذاری کی شرحوں کے تقابلی اعداد (مذکورہ ہی مساوات پر) کے ساتھ ساتھ اس طور پر رکھا جا سکتا ہے۔

نام فصل	آئین اکبری	میرٹھ ڈسٹرکٹ گیزیٹیر
گیہوں	100ر0	100ر0
چاول	92ر5	66ر6 - 77ر7
جو	65ر3	55ر5
جوار	57ر7	44ر4 - 66ر4
باجرہ	38ر4	44ر4
چنا معمولی	69ر2	66ر0
مٹر	42ر3	55ر5

(باقی صفحۂ آئندہ پر)

طور پر انیسویں صدی میں انجام پایا ہے[1] اور سترھویں صدی کے ہندوستان میں غالباً یہ ایک نامعلوم جنس تھی[2]

دور حاضر میں نقدی فصلوں کے زمرہ میں عملاً وہی فصلیں آتی ہیں جنہیں مغلیہ اندراجات میں 'جنس کامل' یا 'جنس اعلیٰ' کہا گیا ہے یعنی وہ اعلیٰ درجہ کی فصلیں جن کی کاشت کا خاص مقصد بازار میں فروخت کرنا ہو۔ اس وقت اس زمرہ کی دو خاص فصلیں روئی اور گنا تھیں اور ہمبئی کے

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ارد	6 ر 59	4 ر 44
مونتھ	4 ر 38	3 ر 33

مذکورہ بالا تقابلی گوشوارہ سے مورلینڈ کے اس نتیجۂ تحقیقات کی عمومی تائید ہوتی ہے کہ بیشتر غذائی فصلوں کی اضافی مقدار پیداوار فی ایکڑ ایک سطح پر برقرار رہی بجز باجرہ کے جس کی پیداوار فی ایکڑ دور آئین اکبری میں کم تھی۔ میرٹھ ڈسٹرکٹ گزیٹیئر میں غالباً جو کی مقدار پیداوار کی قیمت کا کم تخمینہ لگایا گیا ہے کیونکہ 1950 51ء میں یوپی میں جو کی فی ایکڑ قیمت کو گیہوں کی پیداوار کی قیمت کا 5 ر 72 فیصدی بتایا گیا ہے۔ گوشوارہ مذکورہ بالا میں مندرج مٹر اور ارد کی دالوں کے پیداوار کی قیمتوں میں ایک عجیب الٹی صورت دیکھی جا سکتی ہے۔ مٹر کی دور حاضر میں اور ارد کی دور آئین اکبری میں زیادہ قیمتیں بتائی گئی ہیں۔

[1] موازنہ بہ واٹ، ڈکشنری اکانومک پراڈکٹس آف انڈیا Watt, Diet. Eoo. Productes of India ج۔ 6۔ حصہ 4۔ صفحہ 334۔5

[2] Moreland, 'India of Akbar' صفحہ 305۔6 میں اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ ہندوستانی 'کارن' (Corn) (مکئی۔ مترجم) سلطنت وجے نگر میں پیدا ہوتا تھا۔ واٹ، حوالہ سابق صفحہ 334 میں تسلیم کیا گیا ہے کہ مکئی ان پیداواروں میں ہے جن کے نرخ آئین اکبری میں درج ہیں شامل نہیں ہے لیکن وہ Blackm arm's tr (صفحہ 83) کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ اس میں مکئی کا ضمنی تذکرہ موجود ہے۔ لیکن اس کا سبب اسکے متن (ا۔ صفحہ 97) کا غلط ترجمہ ہے جس میں جواری لکھا ہوا ہے۔ کسی دوسری ہمعصر تصنیف میں بھی اس کے مستند حوالہ کا ابھی تک پتہ نہیں چل سکا ہے۔ اس کا عام ہندوستانی نام مکا یا مکئی ہے اور بھٹا بھی لیکن آخر الذکر نام مخصوص طور پر اس کے خوشہ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

[3] یہ دونوں اصطلاحیں آئین اکبری کے بعد کے کاغذات مال میں اکثر ملتی ہیں۔ مگر ہر جگہ ان کا مفہوم وہی سمجھا گیا ہے جو ان کے ناموں سے ظاہر ہے۔ خافی خاں نے غلوں کی یہ قسمیں بتائی ہیں۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

موجودہ روئی کے علاقے خاص طور پر خاندیش[1] کے خطہ میں روئی کی کاشت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ پورے شمالی ہندوستان میں بھی اس کی کاشت ہوا کرتی تھی[2]۔ اور خاص بات یہ ہے کہ دور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

جنس غلہ (غذائی اناج) اور جنس اعلیٰ مثلاً گنا وغیرہ" (ا ص 156 و ص 735 نوٹ) اٹھارہویں صدی کے اواخر کی مال کی اصطلاحوں کی ایک فہرست (مخطوطہ .Add 6603 ورق 57 الف) میں جنس کامل میں گنا، پان، کپاس وغیرہ کو شامل کیا گیا ہے۔ اس سے مختلف 'جنس ادنیٰ' میں کم قیمت کے غلے مثلاً ملٹس (Millets) کی مختلف قسمیں شامل ہیں۔

[1] خاندیش کے لیے، ملاحظہ ہو آئین اکبری ا، ص 473) سالبنکے پرچاز (Salbanke, ' Purchas) (3 82 3 Pelsart Hevert Thevenot, 101 ص 3-42) برار کے لیے Thevenot 151 اور اورنگ آباد اور جنوبی مہاراشٹر کے لیے Factories 102 1655 60، ص 241، 1668-9 ص 270 Fryer ص 331-334 اس کی کاشت گولکنڈہ تک پھیلی ہوئی تھی (ریلیشنز (Relations) جہاں کی روئی بمقابلہ گجرات کے بہتر اور ارزاں ہوتی تھی (.Lett. Recd 2-102) گجرات کے لیے گودنہو Commissariat Jasb (12) Lett 1938 549' 50، factories 1634-36 ص 64 Mandelslo بھی ملاحظہ ہو اور کیمبے (دیکھو) کے لیے Factories 1634 -8، ص 130، Fryer ص 15، 158-9

[2] Manrique 2 ص 221 نے لاہور اور ملتان کے دریائی خطوں میں لائی کے کھیتوں کو دیکھا تھا صوبہ ملتان "روئی کی افراط" پیداوار کے لیے مشہور ہے۔ بقول Thevenot 77 اور علاقہ ٹھٹھہ میں روئی کی "بیحد مقدار جمع کی جاتی تھی (Manrque 2 ص 238-9، Salbabeke Puchas 84 نے بیانہ، میرٹھ (راجستھان) کے راستہ پر "کپاس کے ذخیرہ" کا ذکر کیا ہے۔ رو (Roe) ص 322 نے ٹوڈا کے قریب اجمیر سے مانڈو کے راستہ پر اور Mundy (ص 56، 57) نے مالوہ میں کپاس کے کھیت دیکھے تھے بظاہر آگرہ کی خطہ کی یہ ایک اہم پیداوار تھی (Factories 1655 60 118) اور صوبہ دہلی کے علاقہ سرسا میں اس کی کاشت کا حوالہ ملتا ہے۔ (بالکرشن، ورق 62 الف) اجمیر، الہ آباد اور اودھ کے تقریباً تمام حلقوں کے دستوروں میں اس کی شمولیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان صوبوں میں بھی اس کی کاشت ہوتی تھی۔ Factories 1618-21، 192-3 اور Mundy 134 کے مطابق اس کی کاشت پٹنہ تک پھیلی ہوئی تھی اور اڑیسہ میں بھی کپاس کی کاشت کے حوالے ملتے ہیں۔ Ryley: Fitch 114 Early Travels 26 آئین اکبری ص 391)

مغلیہ میں صوبہ بنگال کی یہ ایک اہم فصل[1] تھی جہاں اس کی کاشت اب تقریباً ختم ہوچکی ہے۔[2] یہ زیادہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی صدی کے دوران اس کی کاشت کا علاقہ جغرافیائی اعتبار سے بہت کم ہوگیا ہو۔ سمندری تجارت میں ترقی اور بعدہٗ ریلوے کی تعمیر نے روئی کی کاشت کو مخصوص علاقوں میں مرکوز کردیا ہے اور ممکن ہے کہ اب زمین کا جو اوسط ایکڑ اس کے زیر کاشت ہے وہ بمقابلہ دور مغلیہ کے اس کی کاشت کے لیے زیادہ موزوں ہو۔ علاوہ بریں اس وقت کسانوں کے استعمال کے لیے جس قدر کپڑے کا میسر ہونا ہمارے علم میں ہے اس کی مقدار سے بھی یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ روئی کی مجموعی پیداوار اور غالباً رقبہ زیر کاشت بھی اس وقت سے اب بہت اضافہ ہوا ہے۔[3] بمقابلہ دیگر پیداواروں کے اس کے فی ایکڑ حاصل کی جس قیمت کا ذکر آئین اکبری میں آیا ہے، اس کا سبب ہمارے عہد میں اس کی اضافی کمیابی ہو سکتی ہے۔[4] بہرحال، یہ خیال رہے کہ گنے کی تقابلی شرح میں اس قسم کی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔[5] دور مغلیہ میں اس کی کاشت یقیناً

---

[1] (1) Linschoten ص 95، Ryley، Early Travels، 25، 28، 112، 118
(2) Bernier ص 402، 439، Master ص 2-81، Bowery 4-132

[2] 1886-07ء کی ایک سرکاری رپورٹ جس کا Watt حوالہ سابقہ-4- ص 134 نے حوالہ دیا ہے مظہر ہے کہ "کپاس کی کاشت پہلے اضلاع ڈھاکہ و میمن سنگھ کے زیادہ علاقہ میں بڑے پیمانہ پر ہوتی تھی ..... جہاں کی زمین اس کی کاشت کے لیے بہت موزوں تھی۔ جو روئی یہاں پیدا ہوتی تھی وہ دنیا کی بہترین خیال کی جاتی تھی اور اسی روئی سے ڈھاکہ کے ململ تیار کئے جاتے تھے۔ اس مشہور کپڑے کی تیاری ختم ہو جانے کے بعد اس علاقہ میں روئی کی کاشت تقریباً" بالکل ختم ہوگئی ہے۔"

[3] اسی نتیجہ کے لیے موازنہ بہ Moreland, India & Co. of Akbar 105

[4] ایضاً ص 105 اور JRAS 1919 ص 381 میں اس کا حساب لگایا گیا ہے۔ (اضافہ ابعد) میرٹھ ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں کپاس کی مجموعی پیداوار فی ایکڑ کی قیمت کو گیہوں کی قیمت کا صرف 66/6 سے 77/7 فیصدی تک بتایا گیا ہے، جبکہ آئین اکبری میں میرٹھ کے دستوری حلقہ میں بوئی ہوئی کپاس کے ایک بیگھہ کی شرح مالگزاری کو گیہوں کے ایک بیگہ کی شرح کا 153 فیصدی بتایا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ کپاس کی اضافی قیمت میں نصف سے زائد کمی ہوئی۔

[5] India....of Akbar ص 103،

کافی علاقہ میں پھیلی ہوئی تھی جو بمقابلہ رائی کے بہت زیادہ تھا۔[1] بنگال کی شکر اس وقت، مقدار
پیداوار اور قسم دونوں ہی اعتبار سے ایک نمایاں حیثیت رکھتی تھی[2]۔ مگر بظاہر اس وقت سے
اب بنگال میں گنے کے علاقہ کاشت میں معتد بہ کمی واقع ہوتی ہے، تاہم اس کا اب بھی اس صوبہ کی
اہم فصلوں میں شمار ہے۔ مختلف قسم کے تلہن کی پیداواروں کے متعلق جو تھوڑی اطلاعات موجود ہیں
ان سے ان کے کاشت کی علاقائی تقسیم میں کسی خاص تبدیلی کا پتہ نہیں چلتا۔ بنگال میں اس کی نمایاں
حیثیت تھی[3] اور الہ آباد سے ملتان تک کے تمام صوبوں کے دستوروں یا مالگذاری کے شرحناموں میں

---

[1] بہار کے لیے آئین اکبری۔ ا۔ صفحہ 416 اور Mundy 134 یہ آئین اکبری میں بلا استثنا تمام صوبوں کے دستوروں
میں دو قسموں میں معمولی اور موٹے پونڈے کے طور پر) درج ہے۔ (صوبہ آگرہ) بیانہ اور کالپی اور (صوبہ
دہلی کی سرکار حصار فیروزہ میں اہم خاص طور پر اپنی شکر کے لیے مشہور تھے۔ (آئین اکبری۔ ا۔ 442-522) اسٹیل
اور کروودر Steel & Crowther پرچاز (Purchas) (4، 268. "لاہور اور آگرہ کے درمیان
تمام علاقوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ "یہاں زیادہ مقدار میں سفوف کی ہوئی شکر ہوتی تھی۔۔۔" آگرہ کے
لیے Factories 1646-50، صفحہ 255، 1655-60، صفحہ 118، ملاحظہ ہو Thvenot 60، Bernir
283، دہلی کے لیے، بابرنامہ مترجمہ Bevenidy (ا) 388، Factories 1637-41، صفحہ 134-5،
Thernot 85 اور سوجان رائے 79، صوبہ لاہور کے لیے Pelseeit 31، Thevenot 77، ملتان
کے لیے اور آئین اکبری۔ا۔ 556 مالوہ کے لیے۔ سندھ کے لیے linschotun 56، ملاحظہ ہو، گجرات کے
لیے Linschten (ا)، صفحہ 60، Taveneer (ا)، صفحہ 54، Thewenot 16، Fryer ا۔ صفحہ 366
ملاحظہ ہو، لیکن برآمد کے لیے کچھ پس انداز نہ ہوتا تھا۔ Lett. Recd. 5، صفحہ 115، 6۔ صفحہ 280، خاندیش کے لیے
Mundy، 8، 48، بنگالہ کے لیے صادق خاں or 174، ورق 60 ب۔ 61 الف، 1671، ورق 34 الف
برار کے لیے Manucci 2، صفحہ 429، صوبہ اورنگ آباد کے لیے Thevenet 102، کونکن کے لیے کریری
(Careri) 168، 179

[2] Linschoten 1، صفحہ 91، ہفت اقلیم 94، 97، Lactonie 1630-33، صفحہ 323، 1646-50، صفحہ Bernir
437، 442۔ آسام میں سفید، سرخ اور سیاہ رنگ کی میٹھی مگر سخت شکر تیار ہوتی تھی (فتحیہ عبریہ، ورق
33 ب) دکن اور لاہور کی شکر بھی اپنی اعلیٰ قسم کے لیے مشہور تھی (سوجان رائے، 79 Thevenot 85)

[3] بقول Bernier 442 "تیل کے لیے سرسوں اور تل کے بیج" اس صوبہ میں پیدا ہوتے تھے (باقی صفحہ آئندہ پر)

چند معمولی استثنیات کو چھوڑ کر اس کا ذکر ملتا ہے[1] تل اور غالباً ارنڈ کے پودھے کی کاشت کے سلسلہ میں گجرات کا بھی نام آتا ہے[2] سن کی کاشت کا خاص مقصد اسی یعنی اس کا تیل حاصل کرنا تھا حالانکہ اس کی ریشہ پیدا کرنے کی خاصیت سے بھی لوگ واقف تھے[3] مگر یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ یورپ اور مملکت عثمانی میں اس کی پیداوار بہتر اور زیادہ تھی[3 الف] غذائی غلوں کی نسبت سے تلہن خصوصًا اسی کی قیمت بہ اعتبار وزن اور مالیت فی ایکڑ ان دنوں کے مقابلہ میں[4] جبکہ ان کی اہمیت کچھ مال اور نیز گھی کے بدل یا اس کے اجزا کی حیثیت سے بہت زیادہ ہوگئی ہے بہت کم تھی۔ چنانچہ مقابلہ دور مغلیہ کے اگر اب تلہن کی بہ اعتبار آبادی فی کس پیداوار کافی زیادہ نہ ہو تو تعجب کی بات ہے۔

عہد زیر مطالعہ کے دوران ریشہ پیدا کرنے والی فصلوں میں سن (کی کاشت) کو پٹ سن پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بنگال کے اونڈی ریشم کا انحصار ارنڈ کے پودھوں پر تھا Master 2 ص 2-81، Bowery، 132 131 بھی ملاحظہ ہو۔

[1] آئین اکبری میں (تیج مابعد) پانچ قسم کے بیجوں کی پیداوار کا ذکر آیا ہے۔ کسم، السی، سرسوں، تل اور تورید، معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے پہلے تیسرے اور چوتھے کی کاشت ہر جگہ ہوتی تھی۔ صوبہ آگرہ کے دستوروں میں دوسرے کا ذکر آتا ہے اور آخرالذکر کا اندراج صرف اودھ، آگرہ، لاہور اور اجمیر (صرف وسطی مشرقی اور جنوبی مشرقی حصوں) میں ملتا ہے۔ بقول Monserrate سن کے درخت دریائے سندھ کے اطراف میں ہوتے تھے۔ لیکن ملاحظہ ہو Thevnot 51 جو اس کی موجودگی سے انکار کرتا ہے۔ یہ غلطی شائد اس لیے ہوئی ہو کہ اس کے ریشے ہندوستان میں استعمال نہ ہوتے تھے (اضافہ مابعد) عہد مغلیہ میں ایک اور روغن پیدا کرنے والی فصل مونگ پھلی کی کاشت نہ کی جاتی تھی۔

[2] Pryer ص 1-297

[3] "کتن (سن کا پیڑ) لوگ اسے موسم خریف میں بوتے ہیں، تیل کے لیے یا رسی کے لیے یا کپڑے کے لیے" نسخہ ورفن فلاحت، آئی۔ او 4702، ورق 30 ب) مغلیہ دور میں بہرحال کبھی بھی قابل لحاظ مقدار میں اس سے کپڑا تیار نہیں کیا گیا۔ [3 الف] "ملک روم و فرنگ میں"

[4] Moreland 'India & O. of Akbar' ص 4-103' JRAS 1918، 9-378 (اضافہ مابعد) میرٹھ ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں دی ہوئی اطلاعات کا آئین اکبری میں 'میرٹھ' کے دستوری حلقوں کی شرحوں سے موازنہ کرنے سے بھی یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے۔ ہر دو صورتوں میں گیہوں کی پیداوار کی قیمت کو 100 کے مساوی تصور کرتے ہوئے آئین اکبری میں تل کا نرخ 70 و 76 لیکن گزیٹیر مذکورہ میں صرف 4 و 44 درج ہے

غالباً فوقیت حاصل تھی۔ آئین اکبری میں دیے ہوئے دستوروں میں ضبطی صوبوں کے تقریباً ہر حصہ کے تحت اس کی کاشت کا اندراج ملتا ہے۔ بظاہر بنگال میں پٹ سن صرف مقامی بازاروں میں فروخت کرنے کی غرض سے پیدا کیا جاتا تھا، کیونکہ آئین اکبری میں اس کا ذکر صرف سرکار گھوڑا گھاٹ کی پیداوار کے سلسلہ میں کیا گیا ہے[1] اور اس کے بعد اس کا ایک اور جگہ حوالہ بالکل اتفاقی ہے[2] صوبہ بنگال میں چاول اور شکر کی کاشت کو کم کر کے پٹ سن کی کاشتکاری میں غیر معمولی توسیع، غالباً زیادہ تر پچھلی صدی میں واقع ہوئی ہے اور غالباً اس صورت حال کا اس صوبہ میں غذا کی مستقل کمی سے گہرا تعلق معلوم ہے[3]

رنگ پیدا کرنے والی فصلوں کو اب کوئی اہمیت نہ رہ گئی ہو۔ مگر سترھویں صدی میں یقیناً ایسی صورت بالکل نہ تھی۔ چنانچہ اس وقت کے تجارتی کاغذات میں خاص طور سے نیل کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آگرہ کے قریب علاقہ بیانہ میں بہترین نیل پیدا ہوتی تھی[4] جبکہ دوآبہ میں خورجہ اور کول (علی گڑھ) کے اطراف میں کمتر درجہ کی نیل کی کاشت ہوا کرتی[5] احمد آباد کے قریب سرکھیج کی نیل کو دوسرے درجہ کا مقام حاصل تھا[6] لیکن صوبہ سندھ میں سہوان کی نیل کو اس کے مقابلہ میں متعدد حیثیتوں سے بہتر خیال کیا جاتا تھا[7] دکن میں تلنگانہ کی نیل، مذکورہ اعلیٰ

---

[1] آئین اکبری۔ ا۔ ص 390 پارچائے ٹاٹ بند، ٹاٹ یا پٹ سن کا بنا ہوا کپڑا۔

[2] Master 2 ص 2-91 میں بنگال کے نواحی علاقہ کی پیداواروں میں "کمر دراسن"، بورا اور بہت سی دیگر چیزیں" بیان کی گئی ہیں۔

[3] عہد زیر مطالعہ میں ایک اور ریشہ پیدا کرنے والی فصل 'ریہا' (Rhea) (اسے بنگال میں کنکوڑہ کہتے ہیں۔ مترجم) اور چائنا گراس (China Grass) کی بھی کاشت بنگال (Linschoten ا۔ ص 95-6) اور اڑیسہ (Fitch-Ryby 114 Early Frands 126) میں ہوتی تھی۔

[4] آئین اکبری۔ 442 Early Frands Finch 15-1 Pelsaert 13-14 Mundy 222، 234 Tavernier (ا) 72 اور Factories میں مختلف مقامات پر۔

[5] Pelsaert 15، Mundy 96، Factories 1630 - 33، ص 125

[6] آئین اکبری۔ ا۔ 486 - Finch Early Travels 174، جورڈین (Jourdain) 3-92 بروک Brocke مترجمہ مورلینڈ بی اے ایچ (JIH) 10 ص 246 Factories میں مختلف مقامات پر

[7] Factories 1637 41 ص 274، 1646 - 50، ص 29 ملاحظہ ہو (باقی صفحہ آئندہ پر)

اور کمتر قسم کے درمیان کی ہوتی تھی جو بنگال سے خاندیش تک عملاً ہر جگہ پیدا کی جاتی تھی[1]۔ علاقہ بیانہ اور سرکھیج کی نیل کی فصلیں اس قدر نفع بخش ہوا کرتیں کہ ان کے ڈنٹھلوں کو کھیتوں میں اس خیال سے چھوڑ دیتے تھے کہ وہ سال میں انہیں تین بار کاٹا جا سکے۔ اس معمول کا ہمعصر مصنفوں نے بھی بار بار ذکر کیا ہے[2]

(باقی حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

نیز دوسنگٹن (Withington) 218، Factores 78 (Roe) 1634-36، ص 129، 1637-41، ص 196-7، 1642-45، ص 203، 1646-50، ص 12، 13، 33، 119،

[1] علاقہ تلنگانہ کی نیل کے لیے ملاحظہ ہو Lett. Reco. 2، ص 102، Mastr. Supp. Cal 93 Relations- 35 36 61 Factories 1665، 7، ص 164

نیل بنگال میں پیدا کی جاتی تھی (Tanrmir (2) 8) اور نیز بہار میں (Mundy 15، 153) آئین اکبری میں اس فصل کا اندراج تمام ضبطی صوبوں میں ملتا ہے۔ یہ گوالیار کے قریب پیدا کی جاتی تھی (Factories 1646-50، ص 122) میوات میں (Pelsart 15) اور دہلی کے قریب (Thevent 68) بھی پیدا کی جاتی تھی Tavernier 235-240 کو کمتر درجہ کی نیل کی پیداوار لال سوٹ اور صوبۂ اجمیر میں سانبھر کے قریب ملی تھی اور Salbenke (Porches 3، 84، 88) میں بیانہ اور میرٹھ کے راستہ پر چند مواضعات میں "کمتر درجہ کی نیل" کی کاشت کا ذکر آیا ہے سرکھیج کے علاوہ، گجرات کے دیگر حصوں میں یعنی کھمبات کے اطراف کے علاقوں، بردوہ اور بھروچ میں بھی نیل کی کاشت ہوتی تھی (Jourdain 173-4) Mandalsls Commissariat 10، Jarenier (1، ص 54) خاندیش میں بھی نیل کی کاشت کے لیے Jhevenot 101 اور Javernier 1، ص 42 ملاحظہ ہوں۔ نیل جنوبی کورومنڈل کی بھی ایک اہم پیداوار تھی (موازنہ کیجئے رائے چودھری The Dutch in Coroonordel تحقیقی مقالہ کی ٹائپ کی ہوئی نقل ص 291

[2] Jrande Early Fiahh 152-3، Lett. Recd. 4، ص 240-41، Pelsart 10-13، Mundy 221-2، 3، یہ کام بیانات صرف علاقہ بیانہ کے متعلق ہیں۔ لیکن اس قسم کی عبارتوں سے جو مثلاً Factories 1655-60، ص 76 پر درج ہیں ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا رواج سرکھیج کے نواح میں بھی تھا۔ Janernoer 2، ص 9، 8 کا یہ کہنا کہ یہ ہندوستان کا عام رواج ہے ویسا ہی غلط ہے جیسا کہ اس کا یہ بیان کہ "یہ سال میں تین بار کاٹی جاتی ہے۔" نسخۂ در فن فلاحت مذکورہ بالا میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ اسکی کاشت کا عام طریقہ کپاس کی کاشت کے بے حد مشابہ تھا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ یہ اس سے نسبتاً جلد کاٹ لی جاتی ہے (J.O. 4702، ورق 31 الف) نشاٹن کا گجرات میں اس کے (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

حالانکہ بعد میں یہ طریقہ زیادہ تر متروک ہوگیا تھا[1] غالباً نیل ہی وہ واحد فصل جس کی پیداوار کے ہمعصر تخمینے ملتے ہیں، حالانکہ اس کی پیداوار سال بہ سال موسم کے سازگار رہنے یا نہ ہونے کے نتیجہ میں قدرتی طور پر کم و بیش ہوا کرتی تھی۔ ہمارے مآخذ میں مندرج متعدد تخمینوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نیل کے تین خاص خطوں یعنی بیانہ۔ دوآبہ۔ میوات و سرکھیج اور سہوان میں نیل کے رنگ کی سالانہ پیداوار کا وزن اچھی فصل کے برسوں میں تقریباً 18 لاکھ پونڈ ہوتا تھا[2]۔ اس تخمینہ میں سرکھیج

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)

طریقہ کاشت کے متعلق بیان (2۔ ص91) بھی اس سے مطابقت رکھتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ ایک ہی ڈنٹھل ایک سے زائد بار کاٹا جاتا تھا۔

1۔ بہرحال یہ طریقہ کلیتہً متروک نہ ہوا تھا۔ شمالی مغربی صوبہ میں دوبارہ کٹائی کا دستور چلتا رہا (Watt حوالہ سابقہ، 4۔ ص404) جبکہ خاندیش میں" دو سالہ اور کبھی تین سالہ فصل بہت مختصر پیمانہ پر" پیدا کی جاتی تھی (حوالہ سابقہ ص412) اس تبدیلی کا خاص سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ نیل کے پرانے علاقوں میں دوسری کٹائی سے جو زائد منافع حاصل ہوتا وہ بمقابلہ پہلی کے زیادہ تھا مگر اس سے زمین کو مسلسل دو برسوں تک صرف نیل ہی کی کاشت کے مصرف میں رکھنے کا جواز نہیں پیدا ہوتا جیسا کہ اس طریقہ میں ضروری تھا۔ علاوہ اس کے علاقہ بیانہ کی نیل کنویں کی آبپاشی پر منحصر تھی جو اس کی عمدگی کا بڑا سبب تصور کیا جاتا تھا (Pelsart ص1973) آبپاشی کا کام نہر دلی سے شروع ہو جانے کے بعد اس کی عمدگی بیحد کم ہوگئی (موازنہ بہ Watt حوالہ سابقہ ص406)۔

2۔ ہمعصر تخمینے گانٹھوں، پہ لوں یا فارڈلوں یا منوں کی مقدار میں دیئے گئے ہیں۔ دونوں قسم کی اکائیوں کی مقدار مختلف خطوں میں مختلف ہوا کرتی اور من بھی مختلف اوقات میں تبدیل ہوتے رہے۔ اس نوٹ میں جملہ اصل اعداد کو ان معلومات کی بنیاد پر جو ضمیمہ 'ب' میں یکجا کی گئی ہیں ان کے مساوی انگریزی وزن کے پونڈ میں تبدیل کیا گیا ہے۔ پلسارٹ - 13، 15، علاقہ بیانہ کی پیداوار کا وزن اچھی فصل کی صورت میں 00 48 88 پاؤنڈ اور خراب فصل میں اس کا نصف بتاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے خیال کے مطابق دوآبہ اور میوات کے علاقوں میں سے ہر ایک کی پیداوار کا وزن 2 21200 پاؤنڈ سالانہ تھا۔ 1633ء میں "پورے ہندوستان" یعنی تمام مملکت کے وسطی خطوں کی پیداوار کے وزن کا تخمینہ تقریباً 832000 پونڈ لگایا گیا ہے جس کے ایک تہائی کے متعلق خیال تھا کہ تنہا علاقہ بیانہ کی پیداوار تھی (Factories, 1630 - 33 ص325) معلوم ہوتا ہے کہ 1615ء کے ایسے اچھی فصل کے برسوں میں سرکھیج کی پیداوار کا وزن 312000 پونڈ یا اس سے بھی زائد اور قحط کے دنوں کو چھوڑ کر 44-1644ء کے ایسے خراب فصل کے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کے علاوہ) علاقۂ گجرات کے دیگر حصے، خاندیش، بہار وغیرہ کی پیداوار بوجہ اس امر کے کہ ان کے تخمینے موجود نہیں ہیں شامل نہیں کیے گئے۔ اس کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی پوری مملکت کی مجموعی پیداوار بمقابلہ 18 80 - 89ء کی مدت کی مجموعی پیداوار کے جبکہ اس کی باہری مانگ پورے شباب پر تھی ایک تہائی یا ایک چوتھائی سے زائد نہ رہی ہوگی[1] لیکن اس کی پیداوار کا مذکورہ سنوات کے صرف دس یا بیس برس کے بعد کی مدت کی پیداوار سے تقابل درست نہ ہوگا، جبکہ ہندوستان میں اس کی کاشت یورپ میں اس کا ایک کیمیاوی بدل تیار ہوجانے کے باعث تیزی سے زوال پذیر ہوکر کلیتہً ختم ہونے والی تھی۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ نیل کی کاشت کے اخراج کا دوسری فصلوں، خصوصاً گیہوں اور دیگر غذائی غلوں پر ناموافق اثر پڑا کیونکہ اس میں زمین کو زرخیز بنانے کی بے حد صلاحیت

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

برسوں میں یہ گھٹ کر 21400 پونڈ ہوجایا کرتا تھا Lett Recd 3، ص 51، Factories 1624-29 ص 232، 1630-36، ص 73، 292، 1642-45، ص 163)

علاقہ سہوان میں بظاہر اس کی پیداوار مسلسل کم ہوتی جارہی تھی۔ اس کمی کی تصدیق واضح طور پر صرف Factories 1642-45 ص 136 سے ہی نہیں بلکہ یہ پیداوار کے اس تخمینہ سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو 132 6000 پونڈ 1635ء میں 73 760 پونڈ 1639ء میں اور صرف 29 480 پونڈ 1644ء میں تھا Factories 1634-36، ص 129، 1637-41، ص 136-7، 1642-45، ص 203)

متن میں 18 لاکھ کا جو تخمینہ دیا گیا ہے وہ پلسارٹ کے تخمینہ بابتہ بیانہ دوآبہ و میوات اور 1615ء میں سرکھیج کی اور 1635ء میں سہوان کی پیداوار کے تخمینوں کی مجموعی میزان کے برابر ہے۔ لیکن ہر علاقہ میں اچھی فصل کے سال ایک ہی نہیں ہوا کرتے تھے اور پیداوار کی میزان غالباً بیشتر برسوں میں نسبتاً بہت کم ہوا کرتی تھی Factories 1637-41، ص 92، میں سورت سے یہ بیان درج کیا گیا ہے کہ "عام اطلاعات کے مطابق 1638ء میں مملکت میں "بٹوں کی پیداوار" 40,000 من ہونے کی توقع ہے یعنی اگر اسے گجرات کا من تصور کیا جائے تو اس کا 147 6000، ال۔ بی۔ پونڈ ہوگا۔

[1] یہ بات اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ 18 80 - 89ء میں مملکت مغلیہ کے علاقوں کی مجموعی پیداوار کا وزن تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ ال۔ بی۔ پونڈ رہا ہوگا۔ وزن کا یہ مقدار اس طور پر اخذ کی گئی ہے کہ بنگال، بمبئی و سندھ کی بندرگاہوں سے ایک کروڑ 8 لاکھ ال۔ بی۔ پاؤنڈ برآمد ہوئی اور پورے ہندوستان کے اندرونی خرچ کے تخمینہ کا وزن 20 لاکھ ال۔ بی۔ پاؤنڈ تھا۔ (Watt حوالہ سابقہ۔ 4۔ ص 421 3)

تھی اور ساتھ ساتھ اس کی کاشت کا ربیع کی فصلوں سے متصادم ہونا امر لازم نہ تھا۔[1] نیل کی کاشت کے متعلق آل' (مورنڈا سائیٹری فولیا Morindes Citrifolia) کے انجام کو دیکھ کر جو آئین اکبری کی تحریر کے وقت دو آبہ کے نچلے حصہ اور بندیلکھنڈ میں پیدا کی جاتی تھی اور جس سے ایک قسم کا سرخ رنگ نکلتا تھا پیشین گوئی کی جاتی تھی[2] مصنوعی رنگوں کی تیاری نے اس کی کاشت کو بھی کلیتہً ختم کر دیا تھا۔[3] (اضافہ مابعد) کی کاشت بھی جس سے ایک قسم کا بیجنی رنگ نکلتا ہے بہت کم ہو گئی ہے۔

سرکاری پابندیوں کی وجہ سے افیون اور بھنگ (ٹرو ہمپ True Hemp) کی کاشت دور مغلیہ کے مقابلہ میں اب بہت کم ہو گئی ہے افیون تقریباً ہر جگہ خصوصاً مالوہ و بہار کے علاقوں میں پیدا کی جاتی تھی۔[4]

---

[1] ملاحظہ ہو مورلینڈ Agricultural conditions of the United Provinces & districts میں یادداشت بابتہ بلند شہر ص 5، 6 گیہوں پر اس کی پیداوار کے ختم ہونے کے برے اثرات کے لیے' اور گیہوں کی کاشت کی تیاری کے لیے اس پیداوار کی اہمیت کے لیے Voeleker کی رپورٹ 361. بھی ملاحظہ ہو نیل کے سڑے پودوں کا فضلہ' بیت بھی بحیثیت کھاد کے بیحد قدر و قیمت کا حامل تھا (ایضاً 106) موازنہ بہ نیز Watt حوالہ سابقہ 407 -

[2] اس پیداوار کے نرخ سوائے صوبۂ آگرہ کے دستوری حلقہ کالپی، بھیسوند اور ایرچ والہ آباد میں کوٹیا اور کالنجر کے کسی اور جگہ نہیں ملتے۔ موخر الذکر کے متعلق مخطوطات اور بلاکمین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ بلاکمین میں کورا اور رجاج مئو کی شرحیں درج ہیں۔ (اضافہ مابعد) بقول مالکم' میمائرس آف سنٹرل انڈیا (Maleom, Menoirs of Central India) 1824، ص 77 مالوہ میں' آل' کی بھی کاشت ہوتی تھی جو وہاں سے زیادہ مقدار میں برآمد کیا جاتا تھا۔

[3] مورلینڈ 'India & C. of Akbar' ص 102-3 (اضافہ مابعد) رنگ کسم کہلاتا ہے اور اسے پھول سے نکالتے ہیں۔ اس کی کاشت میں تخفیف کے لیے ملاحظہ ہو میرٹھ ڈسٹرکٹ گزیٹیر ص 47 اور مظفر نگر ڈسٹرکٹ گزیٹیر ص 37

[4] مالوہ کے لیے ملاحظہ ہو آئین اکبری 455-1 Finch Early Jranels 142 Jourdain 149 ترک جہاں گیری 179 Imperial Gazetteer 190، ص 36 بہار کے لیے Early 110 Fitch:Ryby 24 Jrands Marshal 414؛ افیون کا اندراج بنگال میں (Bernier 440' (باقی صفحہ آئندہ پر)

مٹر و سپ (سدھی یا بھنگ کے پودے) کی کاشت بھی وسیع پیمانہ پر تھی[1]، حالانکہ اورنگ زیب نے اس کو بالکل ختم کر دینے کا حکم دیا تھا۔[2] فی زمانہ اس کی کاشت غیر قانونی قرار دی جا چکی ہے

تمباکو کی کاشت کی ابتدا اور اس کے پھیلاؤ میں بہ عجلت اضافہ سترھویں صدی کے دوران فصلوں کے مروجہ نظم کی اہم ترین تبدیلیوں میں سے ایک ہے۔ آئین اکبری میں تمباکو کا کوئی ذکر نہیں آتا۔ لیکن اس کی تصنیف کے دس برس کے اندر اندر حاجیوں نے مکہ سے واپسی پر اس اُعجوبہ کی اطلاع شاہی دربار تک پہونچائی اور ایک شاہی سفیر نے بیجاپور سے واپسی پر اکبر کو ایک عمدہ قسم کا حقہ (چلم) پیش کیا۔[3] اس کے بعد تمباکو کے استعمال کی لت بہ سرعت پھیلی۔ جہانگیر کے اس کے متعلق امتناعی احکام غالباً رسمی تھے اور عملاً بالکل بے اثر ثابت ہوئے۔[4] عہد شاہجہانی تک تمباکو طبقہ امرا کے گھریلو خوشبویات میں داخل ہو چکا تھا۔[5] اگلے عہد حکومت میں جبکہ مسلمانوں کے متعلق اطلاع ہے کہ وہ "اس شئے کا بہ کثرت" استعمال شروع کر چکے تھے[6]، ایک مصنف افسوس

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

Mester 2, 81-2) اور آئین اکبری میں مندرج ضبطی صوبوں کے جملہ دستور روں میں بھی موجود ہے۔ ملتان کے لیے Pelsaert 31 اور Thevenot 77 سیوان کے لیے Factories 1634-36، ص 129 اروار کے لیے Mundy 247 میواڑ کے لیے Manrique 2، ص 432 گجرات کے لیے Linschoten، ص 60 گوڑ نسو (Godinho [illegible] 4 Lett. (1938) 549-50 برار کے لیے Manucci 2، ص 429 ملاحظہ ہوں۔

[1] Monservate 214، Linschoten، ص 60 (میں صرف گجرات کے لئے حوالہ آتا ہے)

[2] گجرات کے دیوان کے نام، اورنگزیب کا علم مورخہ متی 1659، جس میں اس کی کاشت کی ممانعت کی گئی ہے مرآۃ، ا، ص 247 میں محفوظ ہے۔ اس کے عہد کے اواخر میں ہم کوچ بہار کے فوجدار کو اس کی کاشت ختم کرنے کے متعلق ایک ایسے ہی حکم کی وصولی کو تسلیم کرتا ہوا پاتے ہیں (متین الانشاء ورق 12 الف۔ ب) موازنہ بہ نیز فریزر (Fraser) 86، ورق 92 ب)

[3] اسد بیگ نے اپنے تذکرہ میں اس موقع کا ایک تفصیلی بیان محفوظ کیا ہے (1996، ورق 21 الف۔ب)

[4] تزک جہانگیری 183، بقول سجان رائے 455-56 لاہور میں تمباکو کے بعض عادی لوگوں کے ہونٹ اس حکم کی خلاف ورزی میں کاٹے گئے تھے لیکن اسکے اس قول کا ماخذ جو دو توعہ کے تقریباً اسی سال کے بعد کا ہے غیر واضح ہے۔

[5] بیاض خوشبوئی 828، ورق 11 ب [6] Manucci 2، ص 175

کے ساتھ ذکر کرتا ہے کہ امیر و غریب سبھی بلا کسی امتیاز کے اس کے عادی بن چکے تھے[1]۔ اس کا یہ بھی بیان ہے کہ ابتدًا تو یہ ملک فرنگ (یورپ) سے بہت تھوڑی مقدار میں آیا کرتی تھی اس لیے اس کا استعمال عام نہ ہوا تھا لیکن بالآخر کسانوں نے اس کی کاشت کو اس قدر گرمجوشی سے شروع کر دیا کہ یہ دوسری فصلوں پر سبقت لے گئی۔ یہ تبدیلی اس کے عہد جہانگیری میں واقع ہوئی[2] یہ بیان کافی حد تک درست معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ 1613ء تک سورت کے قریبی مواضعات میں تمباکو کی "ایک کثیر مقدار" میں کاشت شروع ہوگئی تھی[3]۔ ٹیری ((Torry)) بھی اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ اس کے زمانہ میں یہ "بہ افراط" بوئی جاتی تھی[4]۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی کاشت نے عمومیت حاصل کر لی اور وسط سترھویں کے صیغۂ مال کے دو ضوابط ناموں میں اندرون ملک سنبھل اور بہار کے علاقوں تک اسکی موجودگی کا ذکر آتا ہے[5]۔

زیر مطالعہ عہد میں قہوہ بحیثیت ایک مشروب کے امرار اور شائستہ طبقہ میں متعارف

---

[1] سوجان رائے 454 ۔

[2] ایضًا۔

[3] Lett. Reed (I) ص 299 - 300 موازنہ بہ Fryer ص 266 اسی خط میں اسکی کاشت کے لیے متھوولڈ (Methwold) کے زمانہ یعنی 1618 - 22ء کے "چند سال" قبل اس کی کاشت گولکنڈہ تک پھیل چکی تھی (ریلیشنز (Relations)) 35 - 36)

[4] Early Travels 299 بقول اس کے (جیسا کہ Lett. Reed حوالہ سابقہ کا منشا ہے) کسان "ابھی تک اسے سوکھا کر مغربی ہندوستان (مغربی جزائر الہند) کی تمباکو کے شکل کر دوا بنانے کا طریقہ نہ جانتے تھے" موازنہ بہ نیز Relations Mathesld 35 6

[5] دستور العمل نویسندگی، ورق 182 الف - ب، دستور العمل عالمگیری، ورق 36 ب۔ (اضافہ مابعد) مظہر شاہجہانی ص 84 سے اس کی کاشت میں بہ سرعت توسیع کے متعلق اس سے بھی قبل کی شہادت فراہم ہوتی ہے۔ بقول اس کے سیوان میں تمباکو کی کاشت دینداد خاں کے عہد جاگیرداری کے دوران شروع ہوئی تھی جسے شاہجہاں نے 1628ء میں تخت نشین ہونے کے بعد جلد ہی جاگیردار مقرر کیا تھا اور 1634ء سے کچھ ہی قبل جب مظہر شاہجہانی لکھی گئی واپس بلا لیا تھا۔

ہو چکا تھا[1] اس کی درآمد جزیرہ نمائی عرب اور ملک حبشہ سے براہ مخا (Mocha) ہوتی تھی مگر ہندوستانی آب و ہوا ابھی تک اسے پوری طرح راس نہ آسکی تھی[2] تاہم اس کی ایک بظاہر ناقص قسم کی کاشت جنوبی مہاراشٹر میں شروع ہو چکی تھی[3] لوگ چائے سے اب تک ناواقف تھے اور یہ ملک میں کہیں بھی نہ بوئی جاتی تھی[4] حتیٰ کہ آسام میں بھی نہیں، جہاں اس دور میں یہ خودرو حیثیت میں ضرور موجود رہی ہوگی[5]

مصالحہ جات میں غالباً مرچ سیاہ، تجارتی اعتبار سے سب سے زیادہ اہم ہندوستانی پیداوار تھی۔ لمبی قسم کی سیاہ مرچ (فلفل دراز) خاص طور پر صوبۂ بنگال میں پیدا ہوتی تھی لیکن بہترین مرچ جو گول یا سیاہ ہوتی ہے مملکت مغلیہ کے حدود کے باہر مغربی گھاٹ کے پہاڑی سلسلوں میں پیدا ہوتی تھی[6] مغلیہ ہندوستان میں 'کیپ سیکم' (Capsicum) یا سرخ مرچ بے جواب

---

[1] اونگٹن (Ovington) 180۔ قہوہ کی دریافت کا حوالہ ہفت اقلیم 14 میں ملتا ہے لیکن اس مشروب کا ذکر نہ تو آئین اکبری میں ہے، اور نہ عہد شاہجہانی کی بیاض خوشبوئی میں اس لیے اس کا امکان پایا جاتا ہے کہ یہ سترھویں صدی کے نصف آخر میں مقبول ہوئی۔ دور عالمگیری کے اختتامی زمانہ میں اسے دربار شاہی میں پیش کیے جانے کے لیے ایک موزوں تحفہ تصور کیا جاتا تھا (اخبارات 44/269 ، 49/25) اٹھارھویں صدی کے وسط کی تصنیف 'مرآۃ الاصطلاح' ورق 218 الف میں اس مشروب اور اس کے بیج کے متعلق ایک محتاط بیان ملتا ہے۔

[2] Javernier 2 ص 20 Factories 180 ۔ مرآۃ الاصطلاح، ورق 218 الف۔

[3] Factories 1655 - 60 ، ص 241 ، معموری ورق 202 الف (خافی خان۔ 2۔ ص 501) میں قہوہ کاان پیڑوں کے سلسلہ میں ذکر آیا ہے جو قلعہ کھلنا جسے اورنگ زیب نے 1702ء میں فتح کیا تھا کے چاروں طرف لگے ہوئے تھے۔

[4] Factories 1655 - 60 ، ص 276 ، Ovington 181۔

[5] ذخیرۂ عتبریہ میں جس میں ملک کے تفصیلی حالات درج ہیں چائے کے قسم کی کسی چیز کا ذکر نہیں ملتا۔

[6] پس مرچوں کے لیے جو بنگال میں پیدا کی جاتی تھی ملاحظہ ہو، آئین اکبری۔ 1۔ ص 390 ہفت اقلیم، 94 97 Fitch:Ryoy 189 ، Early Travels 46 ، Bernier 440 Bowery 134 ۔ یہ پگم (پیچ بہانہ) (ہفت اقلیم 100) اور چمپارن کے جنگلوں (بہار) (آئین اکبری۔ 1۔ ص 417) (باقی صفحہ آئندہ پر)

اس قدر زیادہ پیدا کی جاتی ہے اور ہر ہندوستانی کھانے کا ایک لازمی جزو بن گئی ہے لوگ[1]
ناواقف تھے۔ اسے ہمارے ملک کی آب ہوا تقریباً اٹھارھویں صدی کے وسط تک راس آسکی[1]
پان تقریباً ملک کے تمام حصوں میں پیدا کیا جاتا تھا[2] اور اس کی کاشت میں اس وقت
سے اب تک کوئی فرق نہیں ہوا ہے۔ غالباً ذرائع حمل و نقل کی موجودہ ترقی نے اس کاشت کی
وسعت میں اضافہ کیا ہے، لیکن اس کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا۔

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)
میں بھی پیدا ہوتی تھی۔ Javernier (2) ص 12 کا یہ تنہا بیان ہے کہ "حدود مغل اعظم کے باہر گئے بغیر ہی صوبہ
گجرات میں (لمبی مرچ) کافی مقدار میں ہوتی ہے۔" لیکن ایسا لکھتے وقت غالباً اس کے ذہن میں گجرات کی پیداوار
نہیں بلکہ اسکی دوبارہ برآمدات تھی۔ علاقہ بیجاپور، کنارا اور کیرل میں گول مرچ کی پیداوار کے لیے ملاحظہ ہو۔
Linschoten, I, ص 66، 67، 71-74 Fitch: Ryby 186 · 188 Early Travels 45، 46
Factories 1622-23، ص 51، 1624-29، ص 2، 3، 1634-36، ص 212، 1637-41، ص 93
ص 112-224، 5 Journier 20، ص 11، Jryer 1، ص 139، 2، ص 42، مقوری، ورق 202 الف
[1] اس کی دو سب سے زیادہ عام قسمیں کیپسی کم فروٹی سنس Capsicum fruitescens اور کیپسی کم اینیم
(Capsicrum Annum) اصلاً جنوبی امریکہ کی پیداوار ہیں Pelseart 2، ص 34، 5
137-6 وغیرہ) آزاد بلگرامی نے 1762-3 میں لکھتے ہوئے سرخ مرچ کی ہندوستان میں آمد کے متعلق
ایک دلچسپ روایت بیان کی ہے۔ بقول ان کے ہندوستان یعنی شمالی ہند میں دس بیس برس قبل لوگ اس سے
ناواقف تھے اور مرہٹوں نے جو اس کے بیحد عادی تھے اسے وہاں پہونچایا۔ وہ بہرحال، یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اب
ہندوستان کے کچھ لوگوں نے اسے اپنے کھانے میں استعمال کرنا سیکھ لیا ہے (خزانۂ عامرہ، نولکشور
کانپور۔ 1871ء ص 48)
[2] پان کی کاشت کے لیے ملاحظہ ہو، آئین اکبری ص 80-82 اور نسخہ در حق فلاحت I.O. 4702، ورق
27 الف-ب، آئین اکبری میں ان خطوں کے پان کا خاص طور پر تذکرہ یا تعریف کی گئی ہے۔ بنگال۔
(جہاں سے بنگلہ پان آتے تھے) (ا-ص 80) اڑیسہ (ا-ص 391) بہار (تصحیح مابعد) (مگھی) (ا-ص 416)
بنارس (کپور کانت) (ا-ص 80) صوبۂ آگرہ (ا-ص 441) دیگر تصانیف میں بھی اس کے بہ افراط حوالے
مالوہ (455) خصوصاً بھل پور، سرکار سارنگ پور میں (ا-ص 462) اور خاندیش (ا-ص 473) دیگر
تصانیف میں بھی اس کے بہ افراط حوالے آتے ہیں

ایک اور فصل جو کلیتۂ بازار میں فروخت کرنے کی غرض سے پیدا کی جاتی تھی، زعفران تھی، لیکن موجودہ زمانہ کی طرح اس کی کاشت اس وقت بھی کشمیر ہی تک محدود تھی۔[1]

مغلیہ ہندوستان میں ترکاریوں کی کاشت ایک وسیع پیمانہ پر تھی۔ شہری مانگ کی وجہ سے آبادیوں کے نواحی علاقوں میں اس کی کاشت زیادہ نفع بخش تصور کی جاتی تھی اور ہندوستانی سماج کی روایات کے تحت ایک مخصوص ذات کے افراد یعنی مالیوں نے اس کی کاشت کو بطور اپنے خصوصی پیشہ کے اختیار کر رکھا تھا۔[2] ترکاریوں میں شکر قند اور عام آلو کی کاشت کا رواج وہ سب سے اہم تبدیلی ہے جو دور مغلیہ کے بعد سے اب تک واقع ہوئی ہے۔[3] لیکن رتالو کی مختلف قسموں سے لوگ آشنا تھے[4] اور دکن کے ایک حصہ اور ممکن ہے شمالی

---

[1] ملاحظہ ہو اکبرنامہ، 3، ص 648، آئین اکبری، 1، ص 98، 565، 570۔ تزک جہانگیری ص 45، 296، 315، Pelsaert، 35، 36

[2] ملاحظہ ہو رپورٹ مندرجہ وقائع اجمیر، 235 "ایک شخص مسمی باجا، ذات مالی یعنی باغبانی جو سبزی اور ترکاریوں کی کاشت کرتے ہیں ایک رات "بیگن کے کھیت کی حفاظت کے خیال سے شہر (اجمیر) کے باہر رہ گیا تھا اس کو چوروں نے اغوا کر لیا وغیرہ۔" ملاحظہ ہو آنند رام مخلص سفرنامہ مخلص ص 37 قصبہ حسن پور (روہیلکھنڈ) کے اطراف میں بیگن کی کاشت کے لیے اور ملاحظہ ہو تشریح الاقوام، اوراق 231 ب، 233 الف، مالیوں کی ذات کے لیے۔

[3] آلو کی ابتدا اور اس کی ہندوستان میں آمد کے موضوع پر بہترین بحث Watt 3 ص 115-122 میں ملتی ہے

[4] پھلوں کے سلسلہ میں، آئین اکبری میں رتالو کی دو قسموں کا ذکر آیا ہے یعنی 'ترٹی' اور 'پنڈالو' (1، ص 79-80) قیمتوں کے گوشواروں میں اول الذکر کو تو پھلوں کے زمرہ میں دکھایا گیا ہے لیکن آخر الذکر کو رتالو کی ایک اور قسم کچالو کے ساتھ "ان پھلوں میں دکھایا گیا ہے جو پکائے جانے کے بعد کھائے جاتے ہیں۔" (1، ص 70-72) Inschotev 2، ص 42 کے قول کے مطابق "ہندوستان میں لوگ شکر قند اور میٹھے آلو بہ افراط پیدا کرتے ہیں۔" اور کیری (Careri) ص 206 کے بیان میں بھی یہی بات کہی گئی ہے۔ جیسا کہ واٹ، حوالہ سابقہ کا قول ہے، انیامو (Inlomo) اور بٹاٹا (Batata) جس کا تذکرہ انہوں نے ذکر کیا ہے رتالو ہی کے مختلف اقسام ہیں اور بٹاٹا سے اس کا مفہوم میٹھے آلو کا نہیں ہے۔ اس وقت کی انگریزی تحریروں میں پوٹیٹو سے مراد میٹھے آلو یا معمولی آلو کی ہے (Oxford Dictionary: ص 1184) لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ہندوستان میں بھی یہ لوگوں کی عام غذا کا ایک جز رہا ہو۔[1] ٹماٹر بے شک ایک نو وارد ترکاری ہے۔ ان استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر، ان دنوں جو ترکاریاں معمولاً پیدا کی جاتی تھیں وہی تھیں جن کی کاشت ہمارے زمانہ ہوتی ہے[2] اور ان کی افراط اور تعدد اقسام نے بعض یورپی سیاحوں کو بھی بیحد متاثر کیا تھا۔[3]

پھلوں کی کاشت کے سلسلہ میں یہ قدرتی بات تھی کہ خصوصیات کے تنوع کا خاص اہتمام کیا جائے۔ بہت سے پھل جنگلوں میں خودرو ہوا کرتے جنہیں غربا اپنی خوراک کے لیے جمع کر لیتے تھے۔[4]

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)

انگریز سیاحوں نے اسے رتالو کی جگہ بھی استعمال کیا ہے اور شمال نشاٹن کے رتالو کو شکر قند سے خلط ملط کر دیا ہے۔

میتھوولڈ نے گولکنڈہ میں آلو کا معقول ذخیرہ دیکھا تھا (Relations) Jerry Early Travels

297 میں آلو کو ہندوستان میں پیدا ہونے والی کھانے کے قابل جڑوں کے زمروں میں دکھایا گیا ہے۔

[1] بقول Jryer 2۔ ص 76، ملاقہ کنارا میں "آلو (رتالو) ان کی (الوتگونکی) بہترین غذا ہے"۔ ٹیری نے اپنی تصنیف مطبوعہ 1655ء میں اس بات کا اضافہ کیا ہے کہ 1617ء میں آصف خاں نے جو دعوت کی تھی اس میں "بہترین پکے ہوئے آلو" کھلائے گئے تھے۔ (لندن 1777 ص 197 آرلی ٹریولس، 297 نوٹ) مگر ممکن ہے اس سے بھول ہوری ہو کیونکہ آئین اکبری۔ ا۔ ص 55-59 میں مندرج کھانے کے نسخوں یا 'بیاض خوشبوئی' اوراق 96 الف 103۔ ب میں کہیں بھی رتالو کا ذکر نہیں ملتا۔ برخلاف اس کے ممکن ہے رتالو کو کمتر درجہ کی ترکاری خیال کرتے ہوئے، شاہی مطبخ یا امراء کے گھرانوں میں اس نے قابل استعمال نہ تصور کیا جاتا ہو اور یہ صرف غربا رہی کے عام استعمال کی چیز رہی ہو۔

[2] اس وقت کی بازاری ترکاریوں کی مفصل ترین فہرست آئین اکبری۔ ا۔ ص 63-4 اور ص 72-3 میں ملتی ہے اس فہرست میں خالص ترکاریاں اور پھل جو پکانے کے بعد استعمال کیے جاتے ہیں علیحدہ علیحدہ زمروں میں درج ہیں۔

[3] Jerry Early Travels 97 Pelsert 48 Mundy 310، Naunoc (ا) ص 66

Jryer (ا) 297-8، Carori 206،

[4] آم، کمرنی، اور املی کے جنگل گجرات میں براہ دوہد داخل ہونے کے وقت (تزک جہانگیری، 205) "کمرنی، پیلو وغیرہ کے اچھے خاصے جنگل" اور "آم" کے بھی سرودی کی طرف سے صوبہ میں داخلہ کے وقت (منڈی ص 260-62 - 263) ملتے تھے "کھجور کے جنگلی درخت" بھڑوچ اور سورت کے درمیان پیدا ہوتے تھے Finch Early Travel 175

کسان دوسرے پھلوں خصوصاً خربوزہ کی کاشت کو بطور ایک موسمی فصل کے کیا کرتے تھے[1] بہتر قسم کے پھل مثلاً اعلیٰ قسم کے آم پیدا کرنے والے پیڑ باغوں میں بہ احتیاط پیمائش شدہ قطاروں کی ترتیب میں نصب کیے جاتے تھے[2] کسانوں کے پاس بھی باغ ہو سکتے تھے[3] لیکن غالباً، باغوں کے مالک زیادہ تر امیر ہی لوگ ہوا کرتے تھے جو ان کی فصلوں کو آج کل کی طرح کاشتکاروں یا پیشہ ور پھل فروشوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے[4] رؤسا اور سرکاری عہدہ داران کے پاس بھی باغات ہوا کرتے تھے وہ انکے پھل خود ہی استعمال میں نہ لاتے بلکہ منافع کے خیال سے فروخت بھی کرتے تھے[5] بیشتر باغ کے

---

[1] آئین اکبری کے دستوروں میں ولایتی (وسطی ایشیائی) اور ہندوستانی دونوں ہی قسم کے خربوزوں کا ذکر آیا ہے۔ بلاشک آخرالذکر قسم کی کاشت زیادہ تھی۔ دکن میں مفلس اور نادار لوگ دریاؤں کے کنارے ریت میں خربوزہ (خربوزہ گرما) کی کاشت کرتے تھے (معموری، ورق 184 الف۔ خافی خاں 2 ص 405)

[2] "نسخہ در فن فلاحت"، I.O. 4702، ورق 28 ب کی تجویز ہے کہ آم کے درخت باغ (بستان) میں ایک دوسرے سے 23 گز کے فاصلہ پر نصب کیے جائیں۔ ملاحظہ ہو، Mundy 97 ، کیرا (کڑہ صوبۂ الٰہ آباد) کے اطراف سے ... گذرتے ہوئے ہم نے آم کے پیڑوں کے متعدد باغات دیکھے جو قطاروں میں ناپ کر لگائے گئے تھے۔

[3] ایسا تزک جہانگیری، 251-2 سے ظاہر ہوتا ہے جس میں درج ہے کہ جو شخص بھی اپنی مزروعہ زمین پر باغ نصب کرے، وہ اپنی کل لگان کی معافی کا حقدار ہوگا۔ الٰہ آباد 1190 (1085ھ) میں ایک باغ کا حوالہ آیا ہے۔ جسے ایک گاؤں کے دو مقدموں (مکھیوں) نے نصب کیا تھا۔

[4] یہ صورت گوا میں تھی، جہاں پرتگالی "(اپنے ناریل کے پیڑ) کناریوں کو کرایہ پر اٹھاتے تھے"۔ بعض لگان داروں کے 300 یا 400 یا اس سے زائد پیڑ تھے (Linschoten (1) ص 187 مملکت مغلیہ میں بھی سرہند کا بڑا شاہی باغ " 50 ہزار روپیہ " سالانہ لگان پر اٹھایا جاتا تھا Finch: Early Travel 158)

[5] فرمان شاہی مجریہ سنہ 8 جلوس عالمگیری کے اندراج کے بموجب " 15 ۔ سرکاری حکام و ملازمین اپنے اور نیز شاہی (سرکار والا) باغوں میں ہر قسم کی ترکاریاں اور پھل پیدا کرتے ہیں اور انہیں سبزی فروشوں کو دوگنی قیمت پر دیتے ہیں اور قیمت کی وصولی میں زبردستی کرتے ہیں۔ (مرآۃ 1- ص 261)

مسلمان مالکوں کے یہاں پھلدار درختوں کے [illegible] ہونے کا رواج تھا۔ ان باغوں کی آمدنی سے ان کے ورثاء کی یا قبروں کی نگرانی کرنے والوں کی بسر اوقات ہوا کرتی[1]

ہمارے ماخذ، پھلوں خصوصاً ان کے ذائقہ کا خاصہ ذکر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مثلاً بہترین آموں کے خطوں کے تعین[2] یا ناریل کے پیڑوں کی غیر معمولی فائدہ مندی[3] یا اس نوعیت کے دیگر امور کے بابت ان میں جو کچھ اطلاعات ہیں وہ آج بھی اتنی ہی صحیح ہیں۔ بہترین صورت یہ ہوگی کہ ہم عہد زیر مطالعہ کے دوران اور اس کے بعد سے اب تک پیداواروں اور باغبانی کے عملی طریقوں میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں انہیں اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بنائیں۔ اولاً تو یہ تبدیلیا پھلدار درختوں کے ان نئے اقسام کی وجہ سے واقع ہوئیں جنہیں پرتگالی امریکہ یہاں پہلی بار لائے تھے۔ ان میں سب سے اہم اناناس کا درخت تھا جس کی کاشت ملک کے طول و عرض میں انتہائی تیز رفتاری سے پھیلی۔ ابتداءً تو اس کی کاشت مغربی ساحل کے پرتگالی مقبوضات تک ہی محدود رہی[4] لیکن سولہویں صدی کے اختتام تک یہ بنگال[5] گجرات[6] اور بنگالہ میں اس قدر عام ہوگئی کہ اس کو ان علاقوں کی خاص پیداوار شمار کیا جانے لگا۔ ابوالفضل کے ہندوستانی پھلوں کے بیان میں اس کا نمایاں طور پر ذکر آتا ہے[7] اور عہد جہانگیری میں آگرہ کے شاہی

---

[1] Pelsert، مراۃ ۔ا۔ 263۔ 4، نگارنامۂ منشی، ورق 200 الف Badl ورق 158 الف ب، مطبوعہ 152 ۔ اور درالعلوم اوراق 55 ب 56 الف۔

[2] آئین اکبری۔ ا۔ ص 75-76 میں بنگال، گجرات، مالوہ، خاندیش اور دکن کے خطوں کا تعین کیا گیا ہے۔

[3] "تمام دنیا میں اس سے زیادہ نفع بخش کوئی اور پیڑ نہیں" (سیزر فریڈرک، پرچاز (Ceaser Fred ertcks Purchas 10، ص 91)، موازنہ بہ آئین اکبری ا ص 79 Munecoe 3 ص 185 6 وغیرہ

[4] Linschoten 2۔ ص 19، تزک جہانگیری ص ـــــ پی۔ ڈی۔ ویل (P.D. Valle) ا۔ ص 134-5 قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اس پھل کا برازیلی نام اناناس، فارسی اور مقامی دونوں ہی زبانوں میں اختیار کیا گیا۔

[5] ہفت اقلیم 94 ملاحظہ ہو نیز عالمگیرنامہ ص 691-2 Bermier 3 Mannucci ص 183 سترھویں صدی کی ساتویں دہائی میں اعلیٰ قسم کا اناناس آسام میں پیدا ہوتا تھا (فتحیۂ عبریہ ورق 32 ب)

[6] آئین اکبری۔ ا۔ ص 488 و 492

[7] ایضاً۔ ا۔ ص 69-76

باغوں میں اس کے کئی ہزار پھل جمع کیے جاتے تھے۔[1] پپیتہ اور کاجو اسی ذریعہ سے ملک میں آئے تھے لیکن ان کی کاشت کے پھیلنے میں زیادہ وقت لگا۔[2] امرود غالباً دور زیر مطالعہ کے بعد ملک میں لایا گیا۔[3]

ثانیاً، دور شاہی و نیز امرا کا طبقہ اس امر کی بہت زیادہ کوشش کرتا کہ ان کی باغوں میں تقریباً ہر قسم کے پھلوں کی کاشت کی جائے۔[4] وسطی ایشیا کے پھلوں کو اگانے کی کوشش کا کام بابر کے زمانے سے شروع ہو چکا تھا۔[5] اور اس کے پوتے کے عہد میں یہ دعویٰ کیا جانے لگا تھا کہ توران اور ایران کے ایسے نفیس خربوزے اور انگور آگرہ کے نواحی میدانوں میں پیدا کیے جانے لگے ہیں۔[6] لیکن اس کامیابی کا دائرہ ابھی تک صرف بادشاہ اور امرار کے باغات تک محدود تھا۔ جہاں

---

[1] تزک جہانگیری ص 173

[2] P.D. Vallea. ص 134-5 نے ان دونوں پھلوں کو 1623ء میں ڈمن میں چکھا تھا۔ وہ آم اور اگیا مبو Engenia Jambolana engina Jambos کو امریکی اصل کا بتانے میں مبالغہ سے کام لیتا ہے۔ Linschoten 2 ص 27 نے پہلے ہی کاجو کو پرتگالی مقبوضات میں پیدا ہوتے ہوئے پایا تھا اور اس کے قول کے مطابق اس کے پودے برازیل سے یہاں لاکر لگائے گئے تھے۔ تھیونو 102 نے اسے سورت سے اورنگ آباد کے راستہ پر دیکھا تھا۔

[3] یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہمعصر تصانیف مثلاً آئین اکبری، ا۔ ص 68 یا نسخہ در فن فلاحت مذکورہ بالا I.O. 4702 ورق 16 ب - 17 الف میں امرود کا مفہوم Guavas نہیں بلکہ ناسپاتی ہے بہت عرصہ کے بعد Guavas کو امرود کا نام دیا گیا۔

[4] مقرب خاں کے باغ بمقام کیرانہ (واقع درمیان دہلی و سرہند) کے آموں کی تعریف کرتے ہوئے معتمد خاں لکھتا ہے کہ "مقرب خاں نے دکن، گجرات اور دوسرے بعید مقامات سے جہاں جہاں کے آموں کی تعریف سنی بیج منگوا کر یہاں لگایا۔" یہ وہ بھی لکھتا ہے کہ مذکورہ باغ میں جو 140 بیگھہ یا 84 ایکڑ رقبہ پر پھیلا ہوا تھا گرم اور سرد دونوں آب و ہوا کے موافق کثیر تعداد میں درخت لگے ہوئے تھے۔" (اقبال نامہ جہانگیری، نولکشور ایڈیشن۔ 3 ص 557)

[5] بابر نامہ ترجمہ بیورج۔ 2۔ ص 686

[6] آئین اکبری۔ ا۔ 441 '2۔ 6 موازنہ بہ نیز ماثر رحیمی۔ Bib. Ind. 2 ص 604

ان کی کاشت کا کام اکثر وسطی ایشیا کے باغبانوں کے سپرد تھا۔[1] قطع نظر اس کے کہ ان باغوں کے لیے آبپاشی کی خصوصی سہولتیں تھیں[2]، ان کے استعمال کے لیے بیج برابر باہر سے درآمد کیے جاتے تھے۔[3] تاہم پھلوں کی کاشت میں ایک دوسرے سے ہمسری کی کوشش کے نتیجہ میں فن باغبانی میں قلمیں لگانے کے ایک اہم طریقہ کو قبولیت عامہ حاصل ہوئی۔ عہد اکبری کے قبل شاہ آلو کشمیر میں نہ بوئے جاتے تھے، لیکن اب محمد قلی افشار نے اس کی قلموں کو کابل سے یہاں لا کر لگایا۔ اسی طریقہ پر خوبانی کے پیڑ جو پہلے بہت کم ہوتے تھے اب بہ افراط پیدا ہونے لگے۔[4] بظاہر وقار کے خیال سے کچھ عرصہ تک تو قلمیں لگانے کا طریقہ صرف شاہی باغوں تک محدود رہا لیکن شاہجہاں نے اس رکاوٹ کو ہٹا کر اس کے دروازے "خاص و عام" پر کھول دیے۔ کہا جاتا ہے کہ اس طریقہ کے وسیع پیمانہ پر رائج ہونے سے غیر معمولی نتائج برآمد ہوئے۔ نارنج، کولا اور نارنگی کی عمدگی میں بیحد اضافہ ہوا۔[5] اس طریقہ کو بنگال میں بھی آموں پر استعمال کیا گیا۔[6] اس کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ کس حد تک یہ ایک بالکل نیا طریقہ تھا یا یہ کہ اس کی حیثیت کسی پرانے اصول کی بنیاد پر صرف ایک نئے تجربہ کی تھی۔[7]

---

1. بابرنامہ، حوالہ سابقہ، آئین اکبری۔ 2 ص؁، اور صادق خاں، Or. 174 ورق 102 الف 167، ورق 56 الف سے یہ اطلاع فراہم ہوتی ہے۔

2. Pelsaert 48، Bernier ص 249-50

3. مغل باغوں کے آب رسانی کے نظام کی شہرت حق بجانب ہے۔ طامس رو نے بھی تسلیم کیا ہے کہ "بادشاہ اور امراء کا قائم کیا ہوا مصنوعی نظام آب رسانی پسندیدہ اور اعلیٰ درجہ کا تھا"۔ Lett. Recd. 6 ص 26، ملاحظہ ہو نیز سی۔ ایم۔ ویلیرس اسٹوارٹ، گارڈنس آف دی گریٹ مغلس (C.M. Villiers stuart, Gardens of the Great Mughals) لندن۔ 1913، ص 14-15 اور دیگر متعدد مقامات پر۔

4. تزک جہانگیری، 299۔

5. صادق خاں، Or. 174، ورق 102 الف 167 ورق 56 الف

6. I 4702، ورق 28 الف، ب۔

7. فارس اور وسطی ایشیا میں بلاشبہ یہ رواج عام تھا۔ نسخہ در فن فلاحت میں جس کا ابھی حوالہ آیا ہے اس طریقۂ کار پر تفصیلی بحث ملتی ہے اور اس میں انجیر کی قلم شہتوت پر، سیب کی ناشپاتی پر، شفتالو کی بیر پر، خوبانی کی بادام پر اور انگور کی سیب پر لگانے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ یہ تمام مشورے رسالۂ فلاحت، Add. 177، اوراق 157، 269 وغیرہ) سے جو فارسی میں سب سے پہلے لکھا گیا تھا ماخوذ ہیں۔

برنیر کے قول کے مطابق صدی کی ساتوی دہائی تک اس طریقۂ کار پر یا تو سرے سے عمل ہی نہ ہوتا تھا یا اگر ہوتا بھی تھا تو بہت لاپرواہی کے ساتھ اور وہ بھی محض کشمیر میں جو ملک میں اس طریقہ کا پہلا تجربہ گاہ تھا[1]

ملک کے اندر پچھلے ایک سو سال کے اندر ریشم کی پیداوار میں بین تخفیف ہوئی ہے۔ سلطنت مغلیہ میں بلاشک ریشم کی سب سے زیادہ پیداوار بنگال میں تھی[2] لیکن اس کی کاشت کا سلسلہ علاقۂ آسام[3]، کشمیر[4] اور مغربی ساحلوں[5] پر بھی تھا۔ اس کی ان دنوں کی مجموعی پیداوار کے متعلق تخمینہ کے قسم کی کوئی چیز ہمیں صرف ٹیورنیر سے حاصل ہوتی ہے اور اس کے قول کے مطابق بنگال میں تنہا قاسم بازار سے ریشم کی 000 22 گانٹھیں فراہم کر سکتی تھیں۔ چونکہ ٹیورنیر کا بیان کردہ ایک گانٹھ کا ایبورے سے مساوات مشکوک ہے، لہٰذا ان گانٹھوں کا مجموعی وزن 31 لاکھ یا 24 لاکھ پاؤنڈ تک ہو سکتا ہے[6] اس تخمینہ کا جو پورے بنگال کا بھی نہیں بلکہ غالباً وہاں کی بڑی منڈی کے

---

[1] Bernier -397

[2] آئین اکبری ۔ ا۔ ص 390، ہفت اقلیم 94، 97 Bernier 202، 439، 441 Master 2-81،

Bournery 133 ۔ بنگال کا ریشم فارس اور شام کے ریشم کی طرح عمدہ تو نہیں لیکن مقابلتاً ارزاں تھا اور ایسا خیال کیا جاتا تھا کہ "اگر انتخاب اچھا ہو اور احتیاط کے ساتھ تیار کیا جائے" تو اس کی عمدگی بھی بڑھ سکتی ہے۔ (Bernier 439 - 40) بنگال میں کھردرے قسم کے ریشم، ٹسر اور ارنڈی یا ایری کو بھی کاشت ہوتی تھی موخر الذکر زیادہ تر گھوراگھاٹ میں پیدا کیا جاتا تھا (Master 2 ۔ ص 2-81، 202) اڑیسہ بھی "ایری" کا بڑا ذخیرہ پایا جاتا تھا۔ لیکن اس کی وہاں کاشت نہ ہوتی تھی، بلکہ ہمارے علم میں آیا ہے کہ "جنگلوں میں بغیر کسی محنت کے از خود پیدا ہوتا ہے" Purches 10 Ceaser Frederick ص 113)

[3] Javernier 2 ۔ ص 220 غالباً اس کا منشا ٹسر کے ریشم سے ہے۔ ریشم کچ یا کچ بہار میں بھی پیدا ہوتا تھا۔ (ہفت اقلیم ۔ 100)

[4] آئین اکبری ۔ ا ص 562 - 3، تزک جہانگیری ۔ 300

[5] Factories 1668 - 9 ص 91

[6] Javernier 2 ولندیزی تحریروں کے بموجب بنگال کے ریشم کی ایک گانٹھ کا وزن 143، آل بی پاؤنڈ ہوتا تھا جبکہ اس وقت 100 فرانسیسی لیورے، 109 انگریزی آل۔ بی پاؤنڈ سے وزن کم تھا۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ "ب"۔

صرف ذخیرہ کا ہے[1] اگر موازنہ اس کے اب سے پچاس سال قبل کے پورے ہندوستان کے تیئس لاکھ پونڈ کے تخمینہ[2] سے کیا جائے تو غالباً ہم اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ بمقابلہ زیر مطالعہ عہد کے اب آبادی کی فی کس پیداوار کے علاوہ اس کی مجموعی پیداوار میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔

دور مغلیہ میں لاکھ کی پیداوار کا کام بھی ایک اہم پیشہ کی حیثیت رکھتا تھا اور بمقابلہ دور حاضر کے اس کے حالات میں کسی خاص فرق کا پتہ نہیں چلتا۔[3]

مویشی اور بار برداری کے جانوروں کے معاملہ میں سترھویں صدی کے کسان کو اسکی موجودہ اولاد پر ایک قابل امتیاز فوقیت حاصل تھی۔ ان دونوں کاشتکاری کے رقبہ کے متعلق ہماری جس قدر بھی اطلاعات ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ویرانے اور جنگل دونوں

---

[1] یہ ایک عجیب بات ہے کہ مصنف کی صریح وضاحت کے باوجود مورلینڈ (India & o. of Akbar P.P. 173-4 ص 173-4) ایک متضاد مفروضہ قائم کرتا ہے۔

[2] میکسویل۔ لفرائے ان جرنل رائیل سوسائٹی آف آرٹس Manwell Lefroy in Journal, Royal Society of Arts 1917، ص 290 اور اس کے بعد کے صفحات، جس کا مورلینڈ نے اپنی تصنیف مذکورہ بالا ص 195'174 میں حوالہ دیا ہے۔

[3] بنگال میں لاکھ بہترین، ارزاں ترین اور ہر جگہ سے زیادہ ہوتی تھی (Factories 1630-33، ص 323، 1634-6، Tavernier ص 146، 2-18، Bernier 440، Bowery 132) بویری کا یہ بھی بیان ہے کہ یہ آسام میں بہ افراط (ص 221-2) اور اڑیسہ میں بھی پیدا ہوتی تھی (Bowery 121-2)، اور بہار میں بھی لیکن اس خطہ کی نہ تو بہت اچھی اور نہ ہی بہت ارزاں تھی (Mundy 153-157) یہ گجرات میں بھی جمع کی جاتی تھی (Lett. Reed.، 160، Commissariat Mandelisto 16) اور بیجاپور اور مالابار میں بھی (Linschoten 2، ص 90، Factories 1624-29، ص 258) یہ علاقائی تقسیم موجودہ صورت حال کے بیحد مماثل ہے۔ فرق بس یہ ہے کہ عہد زیر مطالعہ کا کوئی بھی مصنف لاکھ کی پیداوار کا برطانوی صوبۂ متوسط میں جہاں یہ اب "بہ افراط" پیدا ہوتی ہے ذکر نہیں کرتا (موازنہ بہ Watt حوالۂ سابقہ۔ ص 570، 4) لاکھ سے ایک قسم کا سرخ رنگ پیدا ہوتا تھا اور یہ ہر لگانے اور وارنش کے مصرف میں بھی آتی تھی (Lett. Reed. 1، ص 30، Commiss rit Mandelalo 16-17، Tavernier 2، ص 18، 221) بحیثیت رنگ کے دیگر کیمیاوی رنگ تیار ہونے کے باعث اب اس کی قدر کم ہو گئی ہے۔

قسم کی چراگاہوں کا رقبہ بمقابلہ ان دنوں کے بہت زیادہ تھا۔[1] بنگال کے ایسے گھنی کاشتکاری کے علاقہ تک میں ایک سیاح نے چراگاہوں میں جانوروں کے بہت بڑے بڑے گلّوں کو وہاں کے دیہاتی منظر کا ایک نمایاں پہلو بیان کیا ہے۔[2] یورپی ہمعصر شاہدین کے ہندوستان کے مختلف حصّوں میں مویشیوں کے بہ کثرت پائے جانے کے متعلق بیانات[3] پر ہمیں زیادہ بھروسہ کرنا چاہئے کیونکہ یورپ کے بیشتر حصّوں میں خاص طور پر مویشی کمیاب تھے اور اس وقت تک انکی غذا اور موسم سرما میں ان کی حفاظت کے مناسب طریقے بھی دریافت نہ ہوئے تھے لیکن ابوالفضل کے اس بیان سے کہ فی ہل چار بیل دو گائیں اور ایک بھینس بغیر کسی محصول کی ادائیگی کے رکھے جا سکتے تھے،[4] یہ تاثر لازمی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ بمقابلہ اس وقت کے ان دنوں ایک عام کسان کے پاس اپنے کاموں کے لیے زیادہ مویشی ہوا کرتے تھے۔[5] اس وقت آبادی کے پاس فی کس نسبتاً زیادہ

---

[1] موازنہ بہ Alorcland India & c. of Akbar P.P.106-7 & Royal Cammissio Indian 2.201 ص یہ بھی یاد رہے کہ ترائی کے جنگلوں تک کاشت کے پھیل جانے کے سبب پیشہ ور جانور پالنے والوں کے لیے بہترین چراگاہوں کے رقبہ میں کمی واقع ہوگئی ہے (ملاحظہ ہو، مورلینڈ Agricultural Conditions of the United Provinces and the Districts 20 31

[2] مینرلق (Maurioue) 2۔ ص 123

[3] Linschoten ، ص 300-301 Relations ، 63، 86 Roe 67 Jerry Early Travels ص 296 Pelseart ، 49 - Manroeqie 2- ص 123، 329

[4] آئین اکبری۔ ا۔ 287 صوبہ متحدہ میں 1924-25ء میں مویشی کی اوسط تعداد فی ہل 2 بیل اور ا گائے اور ایک بھینس اور پنجاب میں 2 بیل 1/3 گائے اور 1/4 بھینس تھی۔ (ان اعداد کا Royal Agricultural Commission کی رپورٹ میں مندرج گوشواروں سے حساب لگایا گیا ہے) صوبہ متحدہ کے لیے مورلینڈ Agricultural Conditions ص 26-27 بھی ملاحظہ ہو۔

[5] صوبہ اورنگ آباد اورنگ زیب کو دکن میں اس کی نیابت سلطنت کے دور میں بطور جاگیر عطا ہوا تھا۔ اس کے بعض پرگنوں میں جو نئے کسان آباد کئے گئے تھے ان کی اور ان کے بیلوں کی تعداد کے متعلق ایک دلچسپ یادداشت موجود ہے (سلکٹڈ ڈوکومنٹس آف شاہجہاں زرین Selected Documents of Shahjahan's Reign ص 245) یادداشت کے سرورق پر بیلوں کی میزان (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

مویشیوں کے ہونے کا اس سے بھی بڑھ کر ثبوت اُن دنوں گھی کی بہ افراط موجودگی سے ملتا ہے۔ بہاری اطلاع کے مطابق آگرہ کے علاقہ میں چاول میں گھی ملا کر "عام لوگ کھاتے تھے" بلکہ آگرہ میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو اسے نہ کھاتا ہو[1] اسی طور پر بنگال میں گھی اس قدر زیادہ تیار ہوتا تھا کہ عام لوگوں کے غذائی مصرف میں آنے کے علاوہ برآمد بھی کیا جاتا تھا۔[2] ان دنوں کے مقابلہ میں یہ بمقدار گندم د 'ملٹس' بیحد ارزاں تھا۔ آئین اکبری میں اس کا نرخ بمقابلہ گیہوں 75 ر 8 گنا گراں درج ہے[3] اور آگرہ سے 69 16 ء میں سرکاری ذرائع سے بھی نرخ کے اسی تناسب کی اطلاع ملتی ہے[4] مورلینڈ کے لگائے ہوئے حساب کے مطابق 1910 - 12 ء میں آگرہ دہلی اور لاہور میں گھی

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

کو غالباً مؤلف نے غلط پڑھا ہے کیونکہ یہ اس کے تحتی اعداد کے مطابق نہیں ہے۔ پرگنوں کے کسانوں اور بیلوں کی وہ مجموعی تعداد جو صاف طور پر پڑھی جا سکتی ہے علی الترتیب 158 و 290 ہیں۔ (اضافہ مابعد) علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کی ریسرچ لائبریری میں موجود اصل دستاویز کے فوٹو سے میں نے سلکٹوڈ دکو منٹس کے مطبوعہ متن کو جانچا ہے۔ مرتب نے میزان کو صحیح پڑھا ہے۔ لیکن پرگنہ پارنیر کے تحت جہاں مرتب نے بیلوں کی تعداد کو ناخواندنی قرار دیا ہے وہاں حقیقتاً اصل میں صفر کی علامت ملتی ہے۔ سرے پر بیلوں کی نسبتاً کم میزان کی توجیہہ غالباً اس پرگنہ میں بیلوں کی تعداد کی غیر موجودگی سے ہوتی ہے۔ پارنیر اور دو دیگر پرگنوں کے تحت مردوں اور بیلوں کی تعداد پڑھی نہیں جاتی۔ علاوہ ان کے دیگر پرگنات میں مردوں کی مجموعی تعداد 58 اور بیلوں کی 290 جیسا کہ حاشیہ کی سطر میں اوپر درج ہے نہیں ہے بلکہ یہ اعداد ترتیب وار 150 اور 298 ہیں: بمبئی بشمول سندھ کے متعلق 1924 - 25 ء میں یہ تخمینہ لگایا گیا تھا کہ ہر 8 ر 1 کاشتکار (مرد کام کرنے والے) کے پاس صرف 10 بیل تھے Royal Commission of Indian Agriculture Report صہ 182) مذکورہ اعداد اس پہلو سے اور بھی قابل توجہ ہیں کہ توقع کی جاتی ہے کہ نقل مکانی کرنے والے کسان عموماً غریب ترین طبقہ کے افراد ہوتے ہوں گے۔

[1] I. Anier مترجمہ Hosten, JASB N.S. (23) 1927 ء صہ 121،

[2] Bernier صہ 38، 440۔

[3] آئین اکبری، ۱۔ صہ 60، 65،

[4] مآثر عالمگیری، 98۔ مطبوعہ متن میں مندرج لفظ روغن کے لیے Add. 495 ء ورق 54 ب میں روغن زرد تحریر ہے کیونکہ یہ گھی کے لیے زیادہ مخصوص لفظ ہے۔ اجیر میں قیمتوں کی (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کی مروجہ قیمت گیہوں کی قیمت کا ۱۳ر۵ گنا تھی[1] اور اس وقت سے کم و بیش یہی شرح چل رہی تھی[2]
مگر دکن میں گھی کی اضافی قیمت میں اس قدر زیادتی نہیں ہوئی ہے اور غالباً اس کی گیہوں سے
نسبتی قیمت تقریباً ۷: ۱ سے بڑھا کر صرف ۹: ۱ ہوئی ہے[3]

ایسا قیاس کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ اس وقت چارہ اور گھاس زیادہ مقدار میں دستیاب
تھا، لہٰذا مویشی بھی اوسطاً بہت بہتر ہوتے رہے ہوں گے لیکن بیکار مویشیوں کے ذبیحہ سے روایتی بیزاری[4]

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)

رپورٹ مورخہ 5 اگست 1978ء میں گھی کی قیمت کو اس قدر کم یعنی گیہوں کا 3 ر5 گنا بتایا گیا ہے، غالباً
اس کمی کا سبب یہ تھا کہ بارش کی کمی کے باعث غلے بہت گراں ہو گئے تھے (وقائع اجمیر ص 14)

[1] J.R.A.S. 1918 ص 820

[2] امرتسر کی بازار میں گھی کی قیمت لدھیانہ میں 1939ء میں گیہوں کی قیمت کا 14 گنا اور 1952ء میں
اس کی قیمت کا 6 ر6 گنا تھی۔ دوآبہ میں صرف کمتر درجہ کی دیسی بھینسوں کے گھی کی قیمتوں کا پتہ چلتا ہے اور اس گھی
(چندوسی) کی شرح بھی بمقابلہ (ہاپوڑ) کی 1952ء میں گیہوں کی قیمت کا 12 گنا تھی۔ ملاحظہ ہو، ایگریکلچر
پرائیسز ان انڈیا، 1951ء 1952ء Agricultural Puces in in India 13 2 مو

[3] اورنگ آباد کی قیمتوں کے متعلق ایک سرکاری رپورٹ مورخہ 20 مئی 1661ء مظہر ہے کہ گھی کی قیمت گیہوں
کی قیمت کا 5 ر7 گنا تھی (وقائع دکن، 37-43-44) جبکہ ایک دوسرے نرخنامہ مورخہ 19 فروری 1662ء
میں اسے 5 ر6 گنا بتایا گیا ہے (ایضاً 75-78 دفتر دیوانی و مال و ملکی ... وغیرہ ص 73-75) زمانۂ حال کے تناسب
کا حساب حیدر آباد کی بازار میں فروری 1952ء میں گھی کی قیمت کے پوری ریاست بشمول ضلع بیدر میں فصل
پر گیہوں کی قیمت سے موازنہ کرنے کے بعد لگایا گیا ہے۔ ضروری اعداد و شمار Agricultural Prices
in India 1951 و 1952 - اور اس کے ضمیمہ Farm (Harvest) Prices of
Principal Crops 1947-48 تا 1951-52 سے حاصل کیے گئے ہیں۔

[4] یہ جذبہ خصوصاً گایوں کے ذبح کرنے کے متعلق سب سے زیادہ شدت کے ساتھ ان علاقوں میں مثلاً بنگال
(Ryby=Fitch 19 Early Travels 287) گجرات (رو Roe 67) اور دکن Relations
(Factories 1655-60 ص 261) Tavernier 2-169) میں ملتا تھا۔ اکبر اور جہانگیر
انتظامی مصلحتوں کے پیش نظر ذبیحہ گاؤ کے موید نہ تھے جس کا تھوڑا بہت اثر شمالی ہندوستان میں پایا جاتا
تھا (Polseare 49) پھر بھی اس علاقہ میں مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی ہونے کے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کے پیش نظر اس کا بہت کم امکان پایا جاتا ہے کہ ان کی نسل عمدہ رہی ہو۔[1] شاہی اصطبل کے گائے اور بھینسوں کے دودھ کی زیادہ سے زیادہ پیداوار بھی[2] موجودہ دور کے بہترین نسلوں کے مویشیوں کی پیداوار سے زیادہ نہ تھی۔ ایک ولندیزی مشاہد کے قول کے مطابق مویشی "اس قدر زیادہ دودھ نہیں دیتے" جس قدر اس کے ملک کے مویشی جہاں[3] ہر سال جاڑوں کے قبل بیکار مویشیوں کو عام طور پر بیدردی کے ساتھ ذبح کر دیا جاتا تھا

ہندوستانی بھیڑوں کا اُون بھی اس قدر عمدہ نہ ہوتا تھا جو یورپی سیاحوں کو متاثر کرسکے۔ یہ کھردرا اور صرف کمبلوں ہی کے بنانے کے کام آسکتا تھا۔[4] کشمیر کی مشہور شال کے لیے بکری کا بال درحقیقت لداخ اور تبت سے درآمد کیا جاتا تھا۔[5]

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)
باعث گوشت کی بھاری مانگ تھی (موازنہ بہ Javernier 100-38) سندھ سے واقعۃً چمڑوں کی برآمد ہوتی تھی (Linschoten 6(I) Manaccie 2-427)

[1] بہرحال یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ پیشہ ور مویشی پالنے والے خانہ بدوشوں کی ایک مخصوص ذات کی کوششوں کے نتیجہ میں جو اپنے گلّوں کو دور دور چرائی پہنچایا کرتے، ہندوستان میں مویشیوں کی ایک بہترین نسل وجود میں آئی۔ کاشتکاری میں توسیع کے باعث یہ پیشہ بہت کم یا بالکل ختم ہو گیا۔ (Royal Agricultural Commission, Report ص 198-9) بیانات دلچسپی سے خالی نہیں کہ مویشیوں کے بہترین نسل کے مرکز حصار سے مویشی برآمد کرنے کی تاریخ بہت پرانی ہے (چکلہ حصار سے 349 اور 652 گاؤ (گائے، سانڈ اور یا بیل) کے دو گلّوں کے ایک نامعلوم رئیس کے پاس $7\frac{1}{2}$ روپیہ فی راس کے نرخ پر بھیجے جانے کے متعلق موازنہ بہ بالکرشن برہمن اوراق 59 ب - 60 الف)

[2] ایک گائے روزانہ ایک سیر سے 15 سیر (4/2 سے 20/7 پونڈ، آل۔بی) تک اور ایک بھینس 30 سیر (2/8 سے 5/41 پونڈ، ال۔بی) تک دودھ دیتی ہے۔" آئین اکبری۔ ا۔ ص 151 ناسور (برار) نسل کی بھینس ایک میں (32 ر 55 پونڈ، ال۔بی) یا زائد دودھ (روزانہ) دیتی تھی۔ ایضاً۔ 477

[3] Relations ص 86 یہ بیان صرف گولکنڈہ کے متعلق ہے۔

[4] Tarry Early Travels ص 297، 6 Lett. Recd. ص 200

[5] تزک جہانگیری۔ 301 موازنہ بہ محب الحسن، کشمیر انڈر دی سلطانس (Kashmir under the Sul..ns) کلکتہ 1959ء ص 245 - 6

جیسا کہ ہم نے اوپر خیال ظاہر کیا ہے، اگر مویشیوں کی تعداد کافی کس تناسب بمقابلہ ان دنوں کے زیادہ تھا تو پھر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ عہد زیر مطالعہ میں مویشیوں کے ذریعہ حاصل کی گئی کھاد کی مقدار بھی زیادہ رہی ہوگی۔ علاوہ بریں، چونکہ ویران زمینوں اور جنگلات کی غیر معمولی افراط کے باعث لکڑی کا ایندھن سہل الحصول تھا اس لئے غالباً مویشیوں کا گوبر ایندھن کے مصرف سے محفوظ رہ کر زمین کی زرخیزی بڑھانے کے اپنے اصل مقصد میں استعمال کیا جاتا تھا۔[1] پھر بھی آگرہ ایسے زیادہ کاشتکاری کے علاقوں میں جہاں لکڑی کے ایندھن کی کمیابی تھی "غیر لوگ" مویشی کے گوبر کو عموماً گھریلو ضروریات میں استعمال کرتے تھے۔[2]

دورِ زیر بحث کے بعد جو تبدیلیاں آئیں ان کا بیان ہمارے موجودہ مقصد سے باہر ہے پھر بھی بعد میں پیش آنے والی نسبتاً زیادہ نمایاں تبدیلیوں کو جس حد تک وہ زیر مطالعہ عہد کی زرعی پیداوار کے خصوصی پہلوؤں کی نشاندہی میں ہماری معاون ہیں بیان کر دینا مفید ہوگا۔ غذائی فصلوں کے معاملہ میں مکئی اور آلو کا واحد اضافہ ہوا ہے اور گھٹیا درجہ کے 'ملٹس' کی اہمیت کم ہو گئی ہے لیکن اہم فرق یہ ہوا ہے کہ غذائی غلوں کو کم کر کے نقدی اجناس کے رقبۂ کاشت میں متناسب اضافہ ہوا۔ اس اضافہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی صورت پیش آئی کہ بعض فصلوں کی کاشت مخصوص جغرافیائی علاقوں میں مرتکز ہو گئی۔ یہ دوگانہ عمل انیسویں صدی میں رونما ہوا جبکہ اہم ہندوستانی گھریلو دستکاریاں تباہ ہوئیں، خصوصاً سوتی کپڑوں کی بنائی کی اور ہماری زرعی معیشت عالمی کارخانہ (انگلستان۔ مترجم) کے لیے صرف خام فراہم کرنے کا ایک وسیلہ میں تبدیل ہو گئی۔[3] انہیں محرکات نے نیل اور ریشم کی کاشت کو بالآخر ختم کر دیا۔[4] لیکن مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ فصلوں کی تقسیم کے جدید نظم کے تحت زمین پر اسی مخصوص جنس کی کاشت ہونے لگی جو اس کے

---

[1] بہرحال، موازنہ بہ Moreland India & c.of Akbar 107 جس میں یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ خود ویرانوں کی غیر معمولی وسعت کی وجہ سے چراگاہوں میں مویشیوں کا گوبر بالکل جمع نہیں کیا جاتا رہا ہوگا اور کھاد ضائع ہو جاتی رہی ہوگی۔

[2] Pelsert 48 اونگٹن (Ovington) 183۔

[3] موازنہ بہ، کارل مارکس، کیپٹل، (Capital) ج۔ا۔ انگریزی ترجمہ و ایڈیشن ڈونا ٹور (Donna Torr) 453، 4

[4] ہم نے دورِ مغلیہ سے اس وقت تک جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، ان میں تمباکو اور انناس کو (باقی صفحۂ آئندہ پر)

لیے سب سے زیادہ موزوں ہو، جبکہ دور مغلیہ میں یہ رجحان رہا ہے کہ زیادہ تر خطّوں کو اہم فصلوں کے معاملہ میں خود کفیل بنایا جائے۔ علاوہ بریں ان ایام میں غذائی فصلوں کی کاشت کو غیر معمولی اہمیت دیئے جانے کی وجہ سے اچھی فصل کے برسوں میں فاضل غلہ ضرور ضائع ہوتا رہا ہوگا۔ فصل اول کے خاتمہ پر ہم اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کاشتکاری کے طریقوں میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے تو اب بمقابلہ دور مغلیہ کے فی ایکڑ زیر کاشت زمین کی کاشت زمین کی زرخیزی اوسطاً گھٹی ہے۔ ایک طرف یہ دعویٰ کیا جا سکتے ہے کہ زمینوں پر فصلوں کی بہتر تقسیم کی وجہ سے زرخیزی کی مذکورہ کمی کے اثرات کافی حد تک زائل ہوسے ہوں گے۔ مگر دوسری طرف ایک جاں بہ لب معیشت کے ماحول میں چراگاہوں اور جنگلات کی زمینوں پر بے تحاشہ دخل اندازی نے جانوروں کی داشت کے نقطۂ نظر سے ایک خطرناک بحران کی صورت پیدا کر دی ہے، حالانکہ جانوروں کو ایک ایسے ملک میں جہاں ان کی توانائیوں کو ہل چلانے اور پانی کو زمین سے نکال کر کھیت تک پہونچانے کے ایسے اہم کاموں میں استعمال کیا جاتا ہو، زراعت کا اہم ترین ستون تصور کیا جانا چاہیئے تھا۔

فصل ۴ ـــ زرعی مصنوعات

ہمارے عہد میں ہندوستانی کسان کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو یہ رہا ہے کہ اس نے اپنے خالص زرعی مشغلوں کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت کے سلسلہ کو بھی قائم رکھا۔ ان دیہی گھریلو صنعتوں کی بربادی ہندوستان میں حکومت برطانیہ کی معاشی تاریخ کے انتہائی جارحانہ ابواب میں سے ایک باب ہے[1]۔ پچھلی صدی کے حالات سے جبکہ سابقہ نظام کے اجزا یا انکی یادیں محفوظ تھیں، ہم مغلیہ دور کی ان گھریلو صنعتوں کی عمومی ہیئت کو سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن سطور ذیل میں پیش

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)

شامل نہیں کیا ہے کیونکہ اس کی کاشت حقیقتاً سترھویں صدی کے اوائل ہی میں شروع ہو گئی تھی اور یہ بات صاف نہیں ہے کہ ان کی پیداوار کے فی کس تناسب میں اب کس قدر اضافہ ہوا ہے۔ موجودہ دور کے قہوہ اور چائے کے علاقے، مملکت مغلیہ کے حدود سے باہر، تھے ہیں اور دوسری طرف افیون اور بھنگ کی کاشت اب ختم ہو رہی ہے۔

[1] ملاحظہ ہو آر سی دت The Economic Histot. of Indian Under British Rule لندن، ایڈیشن 6 - 256 اور صفحات مابعد اور دی اکنامک ہسٹری آف انڈیا۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کردہ خاکہ بیشتر ہمعصر تحریروں سے ماخوذ ہے۔

غذائی غلوں کا جہاں تک تعلق ہے، یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کے پیدا کرنے کے عمل میں کسان کا کام اناج کی مالش ہو جانے پر عموماً ختم ہو جاتا تھا[1] اور آٹے کو ہاتھ سے پیسنے اور دھان کو کوٹ کر صاف کرنے کے کام معمولاً استعمال کرنے والوں کے گھروں کے اندر ہی انجام پاتا تھا۔ جہاں تک کسانوں کا تعلق ہے ان کے گھر والے ان کاموں کو اپنے کھانے کی ضرورت کی حد تک اسی طور پر کر لیا کرتے تھے[2] اور خاص طور پر مبینہ اجناس نقدی کے معاملہ میں صورتحال

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ان دی وکٹورین ایجز The Economic History of India in the Victorian Ages۔ لندن 1950 صفحہ 99 23 اور نیز ڈی۔ آر۔ گیڈ گل' دی اندسٹریل ایوولوشن آف انڈیا (The Industrial Evaluation of India 1944) 33 47 .

[1] جس کے اس وقت کے طریقے علاوہ ہی تھے جواب ہیں۔ Fryor 2- صفحہ 108 نے اس کے طریقہ کار کو بیان کیا ہے۔ اس نے غلہ گاہنے کے کام کو جتے ہوئے بیلوں کی مدد سے "کھلے ہوئے کھیتوں" میں انجام دیئے جانے کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ یہ بات واضح نہیں کہ اس نے اس طریقہ کو کیوں "مور لوگوں" (مسلمانوں) سے اور "ڈنڈے" سے غلہ گاہنے کو "جنیٹوز" (Gentues) (ہندوؤں) سے منسوب کیا ہے۔ حالانکہ حقیقتاً اس طریقہ میں اختلاف کا انحصار غلہ کی قسم اور مقام پر تھا نہ کہ کسان کے عقائد پر)

[2] "ہندوستانی گھر والیاں اپنے شوہروں کے لیے کھانا پکاتیں، پانی لاتیں اور ہاتھ کی چکی سے اناج پیسی تھیں اور ساتھ ساتھ ان کا گانا بجانا، بات چیت اور ہنسی مذاق بھی چلتا رہتا" Fryor 2-118 موازنہ ہو نیز Linschoten۔ صفحہ 246، 261) مشینی طاقت سے چلنے والی چکیوں نے اور وہ بھی صرف شہروں میں ہندوستانی عورت کے اندرون خانہ روزانہ کی معروفیات کی عمومی تصویر کو ایک حد تک تبدیل کر دیا ہے۔ دستور العمل عالمگیری ورق 57 الف و ب میں 4 من 4 سیر گیہوں کے پیسنے کا حال بیان کیا گیا ہے۔ پسائی کے بعد 4 من آٹا تیار ہوا اور پیسنے والے کی مزدوری 3 آنہ فی من آئی جس کے عوض اس ضوابط نامہ میں مندرج شرح کے بموجب $3\frac{3}{4}$ سیر گیہوں خریدے جا سکتے تھے۔ بقول آئین اکبری۔ ا۔ صفحہ 63 معمولی گیہوں کے آٹے (خشکہ) کی قیمت گیہوں سے بقدر ایک چہارم زیادہ درج ہے۔ وقائع دکن' 37، 42، 43، 75، 77 پر مندرجہ قیمتیں بھی ملاحظہ ہوں۔ Factories 1630۔ 33ء صفحہ 62 کے مطابق 1630ء میں انگریزوں کی تجویز 7000 من دھان خریدنے کی تھی (جسے کوٹنے پر تقریباً 4500 من چاول تیار ہوتا)"

یہ رہی ہے کہ صرف مروجہ تکنیکی تقاضوں ہی کے تحت نہیں بلکہ باربرداری کے حالات کی وجہ سے بھی یہ ضروری ہوتا تھا کہ پیشتر اس کے کہ یہ پیداوار یں کسان کے ہاتھوں سے یا کم از کم اس کے گاؤں کے حدود سے باہر نکلیں ان کے متعلق کچھ مخصوص صنعتی کاروائیاں انجام پاجائیں۔ چنانچہ کسان روئی کو چن کر ان کے بنولے نکالتا تھا۔ اس کے بعد ایک مخصوص قسم کے گشتی مزدور جنہیں دھنیا کہتے تھے۔ اس کی صفائی یا دھنائی کرتے تھے[1] پھر کسان کے کنبہ کے افراد اسے کات کر سوت بناتے تھے[2] اس کے بعد بالآخر یہ بن کر کے ہاتھوں فروخت کیے جانے کے قابل ہوتا تھا۔ دور حاضر میں جبکہ روئی کی آخری منزل ہوتی کارخانوں کو منتقل ہو چکی ہے، بنولے نکالنے، روئی کی صفائی کرنے اور کاتنے کے تمام کاموں سے دیہات کے لوگ بڑی حد تک محروم ہو گئے ہیں، کیونکہ چنی ہوئی روئی اب معمولاً براہ راست بنولے صاف کرنے کے بعد کارخانوں کو بھیجدی جاتی ہے شکر اور گڑ سازی گاؤں کی دوسری اہم صنعت تھی[3] جو اب مشینی طاقت سے چلنے والے صاف سازی کے کارخانوں کے قیام کی وجہ سے

---

[1] یہ ہندی نام ہے۔ اس عمل کو دھنائی اور دھنے والے کو فارسی زبان میں 'نداف' کہتے ہیں۔ یہ اطلاع کردہ گشتی لوگ اپنے کنبوں کے ساتھ گاؤں گھوما کرتے تھے Jhevenot 10، مرآۃ۔ا۔ 260 ضوابط عالمگیری؛ ایتھے 415 ورق 181 ب، 1641 ورق 136 الف'۔ Add. 6598 ورق 189 الف میں درج ہے۔ جیمس اسکز James Skinner کی بیحد دلچسپ تصنیف 'تشریح الاقوام' (اوراق 302 ب - 303 الف) میں جو 1825ء میں لکھی گئی تھی اس ذات کا تذکرہ آیا ہے۔ جب سوت نہیں، بلکہ کپاس کو فروخت کرنا مقصود ہوتا تو کپاس کی دھنائی پہلے نہیں کی جاتی تھی ورنہ اس کا حجم زیادہ ہو جاتا اور باربرداری میں دقت پیش آتی (Factories 1665-67، ص 174، موازنہ بہ تیز ایضاً 1630 - 33، ص 19 - 20)

[2] "اس (سوت) کو انتہائی غریب لوگ شہر کے باہر گاؤں میں تیار کرتے یا کاتتے تھے جہاں سے اس کے تاجر اسے جمع کر لیتے تھے۔" ایضاً 1661 - ص 112 - 65-

[3] Thevenot ص 102، سورت سے احمد آباد تک اپنے سفر کا حال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے "بہت سی جگہوں میں لوگوں کے پاس گنے کچلنے کے لیے چکیاں اور رس ابالنے کے لیے بھٹیاں ہوتی ہیں۔" Careri ص 69 کا بیان ہے کہ "گنوں کو لکڑی کے دو بڑے بیلنوں کے درمیان، جنہیں بیل گھماتے ہیں پیلا جاتا ہے۔ اس (عمل) سے گنے بالکل نچڑ کر باہر نکل آتے ہیں۔ ابھی پچھلی صدی میں لکڑی کی جگہ لوہے کا بیلن کا استعمال شروع ہو گیا ہے۔ موازنہ بہ کرک North Western Provinces of India ص 332 ، علاوہ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

مکمل طور پر پسپا ہو رہی تھی۔ تیل پیلنے کا کام بھی پہلے گاؤں ہی میں تیلی ذات کے نیم گشتی قسم کے لوگ پرانی وضع کے کولہو کی مدد سے جنہیں بیل چلایا کرتے تھے انجام دیتے تھے[1]۔ کم از کم خطۂ آگرہ میں نیل سے رنگ سازی کا کام جو غالباً عام طور پر کسانوں کی امداد باہمی کا محتاج ہوتا ہے، گاؤں کے اندر ہی انجام پاتا تھا۔ اس وقت رنگ بنانے کا جو طریقہ رائج تھا اسے معاصرین نے اکثر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے[2] اور اس کی کاشت کے آخری ایام تک بجنسہٖ یہی طریقہ برقرار رہا[3] لیکن

(باقی حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

Hevenot حوالہ سابقہ کے 169 Careri، مرآۃ (ا) ص 287، اور درالعلوم ورق 61 ب پر بھی شکر کو لوہے کے کڑاہوں میں ابال کر صاف کرنے کا حوالہ ملتا ہے۔ گڑ (فارسی: قند سیاہ) ضرور مختلف اقسام کی شکر میں سب سے زیادہ عام رہا ہوگا۔ ابوالفضل (آئین اکبری۔ ا۔ ص 77) اس کا ذکر کرتا ہے مگر اس کی قیمت نہیں بتاتا۔ اورنگ آباد سے 1661ء میں اور رام گیر سے 1662ء میں اس کی قیمت کی جو اطلاعیں موصول ہوئی تھیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی قیمت گیہوں سے دوگنی تھی (وقائع دکن، 37، 43، 75، 76 دفتر دیوانی وسال دہلی 173) اس کا مطلب یہ ہوا کہ گڑ بمقابلہ اس وقت کے جب اس کی قیمت گیہوں کے سوا گنے سے شائد ہی کہیں زیادہ ہو گراں تھا 169 Careri نے مواضعات میں سفید شکر تیار ہوتے ہوئے دیکھا تھا اور ابوالفضل علاوہ گڑ کے چار اقسام کا ذکر کرتا ہے، سرخ اور سفید (سفوف کی ہوئی) شکر، سفید قند (یا دانے) اور بہترین صاف کی ہوئی نبات (آئین اکبری۔ ا۔ ص 65، 77) مورلینڈ، آئین اکبری میں مندرج بمقدار گیہوں ان کی قیمتوں کا زمانۂ حال سے بہت زیادہ ملتا ہے (JRAs 1918ء ص 379 India & C. of Akbar 157-8)

[1] تیلی کو فارسی میں عصار کہتے ہیں جسے اورنگ زیب کے ایک فرمان مندرجہ مرآۃ۔ ا۔ ص 260 میں بہ اعتبار پیشہ روئی دھنے والے کی طرح گشتی تصور کیا گیا ہے۔ دھنیے اور تیلی دونوں کی معاشی حیثیت میں یکسانیت کی بنیاد پر یہ روایت ہے کہ اول الذکر ذات موخر الذکر کی ایک شاخ ہے (تشریح الاقوام، حوالہ سابقہ، تیلی کے تفصیلی حالات اوراق 299 ب - 301 الف پر درج ہیں)

[2] Early Travels Finch 153-4 Lett. Recd. Pelsert 241/4 10-11 Mundy 15 Tavernier 221 2، 8-9 یہ طریقہ مختصراً اس طور پر تھا کہ پہلے ڈنٹھلوں کو ایک بڑے حوض میں رکھتے تھے پھر پانی کے رنگ جذب کر لینے کے بعد اسے دوسرے حوض میں لے جا کر اس قدر مسلسل چلاتے کہ رنگ پوری طرح گھل جائے۔ اس کے بعد رنگ کو پیندے میں بیٹھنے دیتے تھے اور پھر رنگ کو جمع کر کے کپڑے پر سوکھنے کی غرض سے پھیلا دیتے تھے۔

[3] اینگلو انڈین مزارعین کے طریقہ کاشت جو مثلاً این۔ جی۔ مکرجی کی تصنیف، (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گجرات میں کسان نیل کی پتیوں کو اکثر درمیانی لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دیا کرتے جو اس سے رنگ نکلوا کر بالآخر بازار میں فروخت کرتے تھے[1]

اوپر پیش کیے گئے واقعات کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جاتا کہ یہ کسی درجہ میں بھی جامع ہیں لیکن پھر بھی یہ واقعات زراعت سے صنعت و حرفت کی مکمل علیحدگی کی وجہ سے واقعات میں موسمی بیروزگاری کا مسئلہ اگر اکلیۃً طور پر نہیں پیدا ہوا ہے تو اس نے جس درجہ میں بھی شدت اختیار کی ہے اسے سمجھنے میں ہمارے معاون ہو سکتے ہیں اور اگر مزید غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جن صنعتوں کا اوپر ذکر آیا ہے وہ کسان کے کنبہ کی تقسیم ترین ضرورتوں پر حاوی تھیں۔ جب ایک گاؤں یا متعدد گاؤں کے ایک مجموعہ کے لوگ اپنے لیے خود سوت کات لیں اور شکر اور تیل خود ہی تیار کر لیں[2] اور جب گاؤں کا بن کر، بڑھئی، لوہار اور کمہار تقریباً ان تمام چیزوں کو خود ہی فراہم کرے جن کی کسان کے کنبہ کو ضرورت ہو سکتی ہے، مثلاً کپڑا، ہل، چند زراعتی اوزار اور مٹی کے برتن[3] تو پھر کونسی چیز باقی رہ گئی جس کے لیے گاؤں والا باہر کا محتاج ہو۔

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) Handbook of Indian Agricultur صفحہ 301 میں بیان کیے گئے ہیں اور تیرھویں صدی کے کسان کے طریقہ میں کوئی بنیادی فرق نہیں پایا جاتا۔ Woolcker Report 261-5 ان کاشتکاروں کے طریقۂ تیاری پر ایک مفصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ نیل کے کاشتکاروں کا ہندوستانی تاریخ میں مقام ان کے کسی اختراعی کارنامہ پر نہیں بلکہ ان کی ڈاکہ زنی، ایذا رسانی، قتل اور ان گھٹیا طریقوں پر جنہیں مارکس نے ابتدائی اکتناز (Primitive Accumulation) کے نام سے موسوم کیا ہے منحصر ہے۔ ملاحظہ ہو ایل نٹراجن پیزنٹ اپرائزنگس ان انڈیا L. Natrajan. Peasant Uprisiags in India 1850 1900 بمبئی 1953 صفحہ 23-47

1 Factories 34-1636، صفحہ 292: محمد آباد میں انگریزوں نے کوشش کی کہ پتی خرید کر اجرت پر مزدوروں کی مدد سے خود رنگ تیار کرائیں مگر یہ تجربہ غیر نفع بخش ثابت ہوا (ایضاً 1646-50، صفحہ 77-78، 189، 202، 3)

2 یہاں یہ یاد کر لینا مناسب ہوگا کہ کپاس اور گنے کی کاشت بمقابلہ ایام حاضرہ کے جغرافیائی اعتبار سے بہت زیادہ پھیلی ہوئی تھی

3 ہر الدیہ (aldea) (گاؤں) میں کپڑا دھونے، گندگی اٹھانے اور لوہار وغیرہ کے تمام پیشے اور ان کے کام کرنے والے موجود ہیں (مونسریٹ، انفارمیکن Information) ترجمہ ہوسٹن (Hosten) J A S B N.S. 18 صفحہ 352) یہ 1579ء کی تحریر جزیرۂ سالسٹ اور کوکن سے متعلق ہے۔ ابتدائی فصل ایک بھی مغلیہ ہندوستان کے کسانوں کے مختصر اثاثہ کے متعلق واقفیت حاصل کرنے کے لیے ملاحظہ ہو۔

باب 2

زراعتی پیداواروں کی تجارت

فصل اول، لمبے فاصلوں کی تجارت

غالباً یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ کسی ملک کی زرعی پیداوار کی منڈی کے پھیلاؤ اور تنظیم پر توجہ وہاں کی زرعی معیشت کے کسی گہرے مطالعہ کے لیے امر لازم ہے عہد زیر مطالعہ کے تجارتی حالات پر موجودہ شہادتیں کسی لحاظ سے بھی کم نہیں ہیں۔ ان شہادتوں میں زیادہ قیمتی مالوہ کی تجارت پر جن سے ہمارا براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے زور دیے جانے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ علاوہ اس کے اس موضوع کے ہر پہلو پر مفصل اور سیر حاصل تجزیہ کا کام ابھی تک انجام نہ پا سکا ہے[1] چونکہ تفصیلات میں جانے سے ہمیں اپنے مطالعہ کے حدود سے بہت زیادہ ہٹ جانے کا خطرہ ہے، لہٰذا اس سے بچتے ہوئے فی الحال زرعی پیداواروں کے صرف خاص خاص پہلوؤں پر ایک مختصر سی بحث پیش کی جاتی ہے۔

دور حاضر کی باہم مربوط قومی منڈی واضح طور پر ریلوے کی تخلیق ہے۔ ہمارے عہد میں لمبے فاصلہ کی تجارت میں سب سے زیادہ بدیہی رکاوٹ حمل و نقل کے وسائل کی مجبوریاں تھیں

---

[1] یہاں مورلینڈ کی تحقیقات مندرجہ India &..Akbar Akbar to Aurangzeb کی کسی طور پر تنقیص مقصود نہیں۔ مورلینڈ کا خاص مقصد صرف عام حالات کو بیان کرنا تھا اور آخر الذکر تصنیف میں تو اس نے اپنی توجہ کو خاص طور پر بیرونی تجارت ہی پر مرکوز رکھی ہے۔

بیل گاڑیوں، اونٹوں اور باربرداری کے بیلوں کے ذریعہ تجارتی مال زمینی راستوں پر جو پگڈنڈی سے بہتر نہ تھے ڈھویا جاتا تھا۔ گو کہ جو بڑی شاہراہیں تھیں، انہیں بہرحال یہ امتیاز حاصل تھا کہ ان میں رات گذارنے کے لئے سرایوں یا فصیل بند قیامگاہ اور گوداموں کا ایک نظام قائم تھا لیکن

لہ راستوں میں سرایوں کی منظم تعمیر کو عام طور پر شیر شاہ سے منسوب کیا جاتا ہے (عباس خان، اوراق 108 ب 109 الف طبقات اکبری۔ 2۔ 106، بدایونی۔ ا صـ 363 - 384 احمد یادگار۔ 227۔ 8) یورپی سیاحوں نے بھی اکثر سرایوں کا ذکر کیا ہے مثلاً اسٹیل اور کراؤتھ Steel & Crowdhs پرچاس (ا) صـ 268 ، Manrique (2) 99 - 101 Bernier 233 Tavernier ا۔ صـ 45 Bourssy 117 Marncci ا صـ 16 67 68 برنیر وامذان کا مذاق اڑاتا ہے۔ سرائے میں قیام کا جو کرایہ ادا کرنا ہوتا تھا اس کے زیادہ ہونے کی بھی ماخذ میں ہمیں شکایت نہیں ملتی اور بقول Marshall 117۔ 8، بظاہر کرایہ قریب قریب برائے نام ہی تھا۔ بعض راستوں کے کنارے کنارے درختوں کی دورویہ قطار تھی اور تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر کنویں اور سرکوردہ، پر مینار تعمیر تھے۔ (مذکورہ فارسی تصانیف کے علاوہ، ملاحظہ ہو اکبرنامہ 3 صـ 111 Early Travels Finch 160، 168 Crowther 6 Steps حوالہ سابقہ، کوریاٹ (Coryat) Early Travels 244، تزک جہانگیری۔ 277 Roe 493 Mundy 82، 84، 86، 92 Bernier 484 Thevenot 57، 95 Tavernier صـ 78

مقامی حکام کو ہدایت تھی کہ ان راہوں سے گذرنے والوں کو جہاں جہاں وقت پیش آتی تھی وہاں ندی نالوں پر پل تعمیر کرائیں (نگارنامہ منشی ورق 128 الف، Bodl. 98 ب 99 الف مطبوعہ 98۔ 99) اس امر کی شہادتیں موجود ہیں کہ وہ عظیم شاہراہ جو شمالی ہند کے میدانوں سے گزرتی تھی۔ دریائے دینغ، کرنال ندی، سنگر، رنڈ، گومتی اور کدرا کو بذریعہ سنگی و خشتی پل پار کرتی تھی۔ Monserrate 98، Mundy 89، 91 Tavernier 92۔ سوجان رائے۔ 73) اسی طرح آگرہ سے دکن جانے والا راستہ اوٹنگن اور کواری دریاؤں کو اسی قسم کے پلوں کے ذریعہ پار کرتا تھا Mundy 64 65 Tavernier صـ 53) اور اس کے بعد سندھ ندی سے گزرتا تھا Manaveed 2 صـ 322) لیکن تقریباً تمام بڑے دریاؤں پر پل نہ تھے (Bernier 380) بجز اس قسم کے کشتیوں کے پل کے جیسا کہ آگرہ اور دہلی میں دریائے جمنا پر باندھے گئے تھے۔ (اکبرنامہ۔ 3 صـ 151 Bernier 241) غالباً بیشتر چھوٹے دریاؤں اور ندیوں کو بھی گھاٹوں ہی پر عبور کیا جاتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ موسم برسات میں جہاں بعض راستے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

لیکن سوداگر کے عام کاروائیاں یا قافلے اپنے ہمراہ صرف زیادہ قیمت ہی کے مال لے جاسکتے تھے زیادہ جسامت والے سامان مثلاً غلہ، چینی، گھی اور نمک کی زمینی حمل و نقل کا کام ایک مخصوص ڈھنگ پر بنجاروں کی مشہور ذات کے افراد جو عملاً ان سامانوں کی تجارت کے اجارہ دار ہوتے تھے انجام دیا کرتے[1] ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ مال سے لدے ہوئے بیلوں کے بڑے بڑے ریوڑ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہانک کرلے جاتے تھے اور یہ راستہ کے کنارے کنارے چرتے ہوئے آگے بڑھتے رہتے تھے[2]۔ بنجارے خود خانہ بدوش ہوتے تھے اور یہ اپنے گھر والوں کے ساتھ پڑاؤ یا ٹانڈوں میں گذر کرتے تھے۔ ایک بڑے ٹانڈے میں 600 یا 700 تک انسان اور 12,000 یا 15,000 یا 20,000 تک[3] بیل ہو سکتے تھے جو 1600 سے لے کر 2700 ٹن تک مال ڈھونے کی صلاحیت رکھتے تھے[4]۔

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)
مثلاً آگرہ تا پٹنہ بیچ دار گاڑیوں کی آمد و رفت کے لیے دشوار یا ناموزوں ہوجایا کرتے تھے۔ Factories 1618-21، 258، 283 Mundy 143-4) وہاں آگرہ سے برہانپور کا راستہ دریاؤں میں طغیانی کے سبب سے اس موسم میں بالکل ہی بند ہوجاتا تھا۔ (Tavernier ا، 31)

[1] موازنہ بہ تزک جہانگیری۔ Factories 345، 1624-29، ص 270، Mundy 95-55

Tavernier (ا) 33-34۔ ٹیورنیر کا بنجاروں کی چار علیحدہ علیحدہ ذاتوں میں اس طور پر تقسیم کہ ان میں سے ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ غلہ، چاول، دال اور نمک کا کاروبار مخصوص تھا بالکل خیالی بات معلوم ہوتی ہے حقیقت یہ تھی کہ یہ لوگ ہر خطے میں وہاں کی ضرورت کی چیزیں پہنچاتے اور واپسی میں وہاں کی فاضل اشیاء کو اپنے ہمراہ لایا کرتے تھے، Mundy 96، 98 ۔ 9 موازنہ بہ نیز احکام عالمگیری، ورق 83 الف) وہ بیشتر خود اپنے ہی مال کی تجارت کیا کرتے لیکن موقع موقع سے دوسروں کا مال پہونچانے کے لیے بھی تیار رہا کرتے تھے (Mundy 95-6)

[2] Mundy 96۔ اورنگ زیب نے جن محصولوں کو غیر قانونی قرار دیا تھا ان میں وہ محصول بھی تھا جو بنجاروں سے ان کے جانوروں کو راستہ کے کنارے کنارے چرانے پر وصول کیا جاتا۔ مرآۃ (ا) 287، Bernir 86، ورق 93 الف۔ خافی خاں (ا)، 87۔

[3] Roe 67، Mundy 95-6، Tavernir (ا)، 32-3،

[4] ایک بیل معمولاً 4 4/5 من شاہجہانی - 310 ، ال۔ بی پونڈ، وزن ڈھو سکتا تھا۔ Factories 1655-60، ص 63) اس وزن کو Mundy 95، 4 من جہانگیری یعنی 5/265 (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کسی بڑی فوج کو رسد مہیا کرنے کے موقع پر بنجارے ایک لاکھ یا اس سے بھی زائد بیل جمع کر سکتے تھے[1]
تجارتی مال جو بنجارے ہر سال ایک جگہ سے دوسری جگہ ڈھو کرلے جاتے تھے ان کا مجموعی وزن اس
قدر زیادہ ہوتا جس کا شمار غالباً سینکڑوں ہزار ٹنوں میں کیا جا سکتا تھا۔ اس طریقہ پر مال ڈھونے
کے اخراجات بمقابلہ دیگر زمینی ذرائع حمل ونقل کے بدیہی طور پر بہت کم ہوتے تھے[2] لیکن ساتھ
ساتھ ان کے نقل وحرکت کی رفتار بھی بہت سست ہوا کرتی[3] اور راستہ کے کنارے کنارے
قابل حصول چارہ پر انحصار کی مجبوریاں بنجاروں کے سفر کو موسم گرما اور نسبتاً خشک علاقوں میں حد درجہ کم کر دیتی تھیں
یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ ان دنوں دریائیں حقیقتاً ارزاں ترین وسیلہ حمل ونقل فراہم کرتی تھیں[4]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

پونڈ ال۔بی اور Marshall 425 ، 4 من شاہجہانی (یا 295 ال۔بی پونڈ) بتاتا ہے۔ برخلاف اس کے
Tavernier) 32۔ کے خیال کے مطابق اس وزن اس قدر زیادہ یعنی 300 یا 350 ,لیور یعنی 327
سے 5 ر 390 پونڈ ال۔بی تک تھا۔

[1] تزک جہانگیری 345 احکام عالمگیری 83 الف۔

[2] مثلاً یہ نتیجہ Factories 1618-21، ص 102 اور 1655-60، ص 63 سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ خرچ کی کفایت بنیادی طور پر بیلوں کے استعمال کیے جانے کے سبب سے نہ تھی۔ بیل ڈھونے والے بیلوں کا کرایہ باعتبار ڈھوئے جانے والے وزن کے معمولاً بیل گاڑیوں سے زیادہ ہوتا تھا (Marshall 17، 118 -) جو کہ خود بمقابلہ اونٹوں کے قطعی طور پر گراں تھا۔ (Lett. Recd. 4- 237-8) بنجاروں کے نفع کا اصل سبب یہ تھا کہ ان کے ٹانڈوں میں محض ایک گھر کے افراد 50 سے لے کر 100 بیلوں تک کی دیکھ بھال کر لیتے تھے اور چونکہ وہ راستہ میں اپنے مویشیوں کو چرائی کرنے کا موقع دیتے تھے لہٰذا انہیں معمولاً چارہ پر کچھ خرچ نہ کرنا ہوتا تھا۔

[3] ایک دن میں زیادہ سے زیادہ بس 6 یا 7 میل" (Mundy 96) قطع نظر اس کے بوجھ ڈھونے والے بیل سب سے زیادہ تیز رفتاری سے سامان لے جاتے تھے (Tevenir I، ص 33) یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ خشک موسم میں مال سے لدی ہوئی گاڑی معمولاً پٹنہ سے آگرہ تک 35 دن میں (Factories 1618-21، ص 191-199) اور گاڑی واونٹ دونوں ہی آگرہ سے سورت 50 دنوں میں طے کر لیتے تھے (Lett. Recd. ؛ ص 237-8)

[4] اخراجات حمل ونقل کے 1639ء کے اندراجات سے اس کی وضاحت ہو سکتی ہے: "مال کے ڈھونے یا گاڑی کا خرچ آگرہ تا ملتان $2\frac{1}{2}$ روپیہ فی من تھا۔ لیکن ملتان سے ٹھٹھہ تک جو قدرے زیادہ فاصلہ تھا کشتی سے مال ڈھونے کا نرخ صرف $\frac{3}{4}$ روپیہ فی من تھا۔ (Factories 1637-41، 135 -6)

بنگال[1]، سندھ[2] اور کشمیر[3] میں مال بیشتر کشتیوں کے ذریعہ منتقل کیا جاتا تھا۔ بڑے وزن یعنی 300 سے 500 ٹن (tonnes) تک کی کشتیاں آگرہ سے دریائے جمنا و گنگا کے بہاؤ پر پٹنہ اور بنگال کا سفر موسم برسات میں پورا کرتی تھیں اور پھر سال کا بقیہ حصہ ان کی واپسی پر صرف ہوجایا کرتا۔[4] اسی طرح لاہور اور ملتان کی بھی حیثیت دریائی بندرگاہ کی تھی جہاں سے نسبتاً چھوٹی کشتیاں دریا کے بہاؤ پر ٹھٹھہ جایا کرتیں[5]۔ صرف نمک ہی کے وزن سے جو بمقدار دس ہزار ٹن ہر سال بذریعہ کشتی آگرہ سے بنگال پہونچایا جاتا[6]۔ یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حقیقتاً تجارتی کاروبار کا ایک بہت بڑا حصہ دریاؤں ہی کے ذریعہ انجام پاتا تھا۔ ان دنوں کے حالات کا لحاظ رکھتے ہوئے ساحل پر تجارت کرنے والے بیڑوں کی سمائی بھی نمایاں حیثیت رکھتی تھی[7]۔ اور غذائی اجناس

---

[1] آئین اکبری۔ ا۔ 369 ۔

[2] ایضاً 555 کہا جاتا ہے کہ تقریباً 40,000 چھوٹی بڑی "کشتیاں سرکار ٹھٹھہ یا سندھ میں بھکر کے نیچے چلا کرتی تھیں۔ ملاحظہ ہو تاریخ طاہری 1685 ' ورق - 58 الف۔ب

[3] ایضاً 563 تزک جہانگیری۔ 298 بقول ابوالفضل کشمیر کے علاقہ میں 30,000 کشتیاں پائی جاتی تھیں (اکبرنامہ۔ 3 - 550) جبکہ جہانگیر مذکورہ تصنیف میں "شہر (جو بعد میں سری نگر کے نام سے موسوم ہوا) اور پرگنوں کے لیے 5,700 کشتیاں درج کرتا ہے۔

[4] Jourdian 162 Mundy 87 - 88 - مورلینڈ اس وقت کے انگریز حکام کے 'ٹن' (Tun) کو دور حاضر کے خالص، معدقہ جہازی ٹن کا $\frac{4}{10}$ سے $\frac{6}{10}$ تک بتاتا ہے India & o.of Akbar 310-12 Mombery کے مطابق "بالکل چپٹے پیندے کی بہت مضبوط بڑی بڑی کشتیاں جنہیں پٹیلا کہتے تھے" اور جن میں سے ہر ایک 225 4000 سے لے کر 6000 تک 'بنگالی من 130 سے تقریباً 200 ٹن تک وزن ڈھو سکتی تھی' پٹنہ اور ہگلی کے درمیان چلا کرتی تھیں

[5] اسٹیل اور کراوتھر، پرچاز (Steel & Crowther, Purchas) 4 268 Factories 1634، 36 244 1637 - 41، ص 135 - 7 میں ان کشتیوں کے وزن کو مختلف مقامات پر 40 سے 50 ٹونس (tonns) 100 ٹن (Tunnes) و اس سے زائد اور 500 سے لے کر 2000 من تک (یعنی 65 من وزن تک) بتایا جاتا ہے رسالبنکے، پرچاز Salbancker, Purchas 3 85 Factories حوالہ سابقہ

[6] جورڈین (Jourdain) 162۔

[7] مثلاً 1648 میں سورت کے انگریز گماشتے بتاتے ہیں کہ "ان ملکی سوداگروں (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اور زیادہ جسامت والے مال کی بار برداری کے سلسلہ میں وہ بڑے پیمانہ پر استعمال کی جاتی تھیں[1]
مگر ان کشتیوں کو یورپی جہازوں کی طرف سے جو اس وقت ہندوستانی سمندروں پر قابض تھے
قزاقانہ حملوں، لوٹ مار اور گوناگوں بندشوں کا بڑا خطرہ رہا کرتا تھا[2]

اس وقت کے حمل و نقل کے حالات کے تجارت پر جو عمومی اثرات مرتب ہوا کرتے اسکا
بہترین اندازہ اس وقت کی مروجہ قیمتوں کے پس منظر میں بار برداری کے اخراجات کے
مطالعہ سے کیا جاسکتا ہے، مثلاً سترھویں صدی کے اوائل میں ایک من بوجھ کو بذریعہ اونٹ آگرہ
سے سورت لے جانے کا خرچ آئین اکبری میں مندرجہ قیمتوں کے بمقدار[3] اسی قدر گیہوں کی قیمت

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

کے پاس پہلے ہی سے بہ افراط جہاز ہیں" اور "نتیجتہً" انہیں تردد ہے کہ اگر وہ کمپنی کے جہازوں کو فروخت کرنا چاہیں
"تو باوجودیکہ وہ کتنے ہی قابل مصرف اور اچھے ہوں، لیکن ان کی قیمت بہت ہی کم لگے گی" (Factories 1646،
90، ص 190) موازنہ کیجئے مورلینڈ India & c. of Akbar 227 و ما بعد صفحات اور Akbar
to Aurangzeb 81 و صفحات ما بعد۔

1. گجرات کے دیوان کو اکتوبر 1705ء میں اورنگ زیب کی فوج کے لیے مغربی ساحل پر مصروف کار تھی، بذریعہ سمندر
200,000 من غذائی اناج بھیجنے کا حکم موصول ہوا (اخبارات (ا ے) 182) یہ وزن بمقدار من شاہجہانی 6400
اور بمقدار من گجراتی 3300 ٹن کے مساوی ہوگا۔ اس طور پر بذریعہ سمندر 100,000 من اناج بھیجنے کے
متعلق ایک اور حکم سال یا دو سال قبل موصول ہوا (اتھار مرآۃ۔ ا۔ 354).

2. یہی نہیں کہ پہلے پرتگالیوں نے لائسنس کا جو نظام شروع کیا اور جسے بعد میں انگریزوں نے جاری رکھا اس نے
صرف ہندوستان کی جہازی تجارت پر بھاری مالی بوجھ عائد کیا، بلکہ اس کے تحت ہندوستانی جہازوں کے لیے بعض اشیاء
کی تجارت بھی ممنوع قرار دی گئی چنانچہ ولندیزی انہیں علاقہ مالابار کو روئی یا افیون لے جانے اور وہاں سے سیاہ
مرچ لانے سے زبردستی روکتے تھے (ملاحظہ ہو ذیل میں) انہوں نے 1677ء میں جنجلی یا کالنگا کے ساحل سے چاول
کی بذریعہ سمندر جملہ برآمد پر روک لگا دی تھی (ٹی۔ رے۔ چودھری، ڈچ ان کورومنڈل، J. R.
Chaudhri, 'The Dutch in Coromondal')

3. نرخ فی من جہانگیری، تین مسلسل برسوں میں اس طور پہ درج ہیں: 1½ روپیہ (3 سرا۔ جہانگیری)
1617ء میں 1 2/5 روپیہ، 1618ء میں اور 1 2/5 روپیہ اور 1 3/5 روپیہ 1619ء میں Letters
Recd. 6 ص 238 Factories 1618-21، ص 47، 51، 73، 4

کے چار گنے سے کسی طرح کم نہ تھا جبکہ یہ سفید شکر کی قیمت کا صرف نصف تھا۔[1] بدقسمتی سے بنجاروں کے مال ڈھونے کے اخراجات کا کہیں اندراج نہیں ملتا۔[2] لیکن بذریعہ دریا مال لے جانے کے اخراجات کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ 1639ء میں بذریعہ کشتی ملتان سے ٹھٹھہ مال لے جانے کا خرچ آئین اکبری میں مندرج گیہوں کی قیمت کا دو گنا مگر سفید شکر کی قیمت کا تقریباً $\frac{1}{6}$ گنا تھا۔[3] یہ تصریحات، اس امر کو نمایاں کرتی ہیں کہ اس زمانہ کے صرف ذرائع حمل ونقل کا لحاظ رکھتے ہوئے، غذائی اجناس اور مثل ان کے دیگر جسامت والی اشیا صرف اسی صورت میں دور دراز لیجائی جاسکتی تھیں جب دور کی منڈیوں میں ان کی قیمتوں کا تناسبی فرق بہت زیادہ ہو، مگر زیادہ قیمتی اشیاء کی نقل وحرکت کے لیے مضبوط فرق کا زیادہ ہونا امر لازم نہ تھا۔ اس کے علاوہ، بمقابلہ ان مقامات کے جہاں مال براہ خشکی پہونچتا تھا، ایسے مقامات پر جو دریا کے کنارے واقع تھے، قیمتوں میں فرق کے بہت زیادہ کم رہنے کا رجحان رہتا ہوگا۔

لیکن حمل ونقل کے مادی (Physical) وسائل کے علاوہ دیگر عناصر بھی تھے۔ جو ڈھلائی کے کاروبار پر یقیناً بڑی حد تک اثر انداز ہوتے رہے ہوں گے۔ ان میں محصول راہداری کو اوّلین اہمیت دی جاسکتی ہے۔ اکبر اور اس کے جانشینوں نے بذریعہ احکام شاہی ان محصولوں

---

[1] آئین اکبری ۔۔ صفحہ 60۔65

[2] جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے، بنجاروں کے زیر اہتمام حمل ونقل کا طریقہ، زمین پر مال ڈھونے کے جملہ طریقوں میں ارزاں ترین تھا پھر بھی اس کی ارزانی کو زیادہ بڑھا کر بیان کرنا غلط ہوگا۔ 1656ء میں شورہ آگرہ سے سورت بظاہر بنجاروں کے ذریعہ روانہ کیا گیا تھا اور اس طریقہ سے جو بچت ہوئی اس پر بہت زور دیا گیا ہے۔ کرایہ 7 ر 2 روپیہ فی من شاہجہانی کی شرح سے ادا کیا گیا تھا۔ چونکہ اس میں محصول راہداری شامل تھا، لہٰذا صحیح تقابل ممکن نہیں۔ لیکن یہ خرچ یقیناً کم نہ تھا (Factories 1655 - 60 صفحہ 63)

[3] Factories 1637 - 41ء صفحہ 135 - 34 لاہور اور ملتان میں سفید شکر کی مروجہ قیمتیں اس تحریر میں درج ہیں اخراجات باربرداری ان کا علی الترتیب $\frac{1}{9}$ اور $\frac{1}{13}$ تھا۔ اس میں گیہوں کی مروجہ قیمت بیان نہیں کی گئی ہے لیکن صدی کے آخر میں اس کی جو قیمت لاہور میں بتائی جاتی ہے، یہ اس کے تقریباً دو تہائی کے برابر تھی (خلاصۃ السیاق، ورق ۔ 90 ب Or 2026 ورق 57 ۔ الف)

کو جو بلاتخصیص، باج، تمغہ یا زکوٰۃ کے عمومی ناموں سے موسوم تھے، کلیتہً یا چند مستثنیات کے ساتھ موقوف
کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔[1] ممکن ہے اس طور پر بعض وہ محصول اور ٹیکس معاف ہو گئے ہوں جو مغلوں
کے مفتوحہ علاقوں میں پہلے سے چلے آرہے تھے۔[2] پھر ان احکام کی عبارت کے جامع طرز بیان کے

---

[1] اکبر نے اپنی حکومت کے اوائل میں اس مفہوم کا ایک فرمان جاری کیا تھا (عارف قندھاری' 30 72) اس کے عہد حکومت کے سینتیسویں سال جو فرمان جاری ہوا تھا، انشائے ابوالفضل' 67 - 8 اور مرآۃ۔ 171-3 میں محفوظ ہے (ملاحظہ ہو اکبرنامہ۔ 3۔ 295-6 آئین اکبری 3۔ 347؛ آئین اکبری ' ا، 284) جہانگیر اپنے حکم کا حوالہ تزک جہانگیری۔4 میں دیتا ہے (موازنہ بہ اسد بیگ' ورق 30 الف) فرمان شاہجہانی، صالح کنبوہ کی تصنیف' بہار سخن .Add' 5 557، اوراق 23 ب' 24 الف .Or 178' اوراق 51 الف 53 الف میں درج ہے (موازنہ بہ چار چمن برہمن راے) ورق 25 الف (ب) ورق -16- الف-ب) فرمان عالمگیری جو اس کی تخت نشینی کے سال جاری ہوا تھا درالعلوم' اوراق 37 ب 38 ب میں نقل اور مرآۃ احمدی علی گڑھ مخطوطہ' اوراق 138 ب 139 الف' عالمگیرنامہ 435-9' مرآۃ ا۔ 249' 251-2'' مآثر عالمگیری' 530-31 'خافی خان 2۔ 87-90 میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک دوسرے حکم کے لیے جس میں موقوف شدہ محصول درج ہیں' ملاحظہ ہو مرآۃ۔ ا۔ 286-7 ۔

[2] ان احکام کے نفاذ میں تھوڑی بہت کامیابی کا ماننا Monserrate 79-80 اور جہانگیر اینڈ دی جیسوئٹس Jah-ngir & the Jesuits 36 میں ملاحظہ ہو۔ اس کا امکان پایا جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں بمقابلہ صوبہ جاتی بادشاہتوں کے مملکت مغلیہ میں حالات کافی بہتر رہے ہوں۔ Thevenet 131 کا مفہوم ہے کہ بمقابلہ گولکنڈہ کے مملکت مغلیہ میں محصولوں کا نظام بہتر تھا۔ اسی طور پر جب مغلوں کے زیر انتظام علاقوں کے محصولوں کا بجگذار سرداروں کے علاقہ کے محصولوں سے موازنہ کیا جاتا ہے تو بھی اول الذکر ہی میں صورتحال بہتر معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ آگرہ اور پٹنہ کے درمیان محصول راہداری 14 روپیہ اور 1621ء میں زیادہ سے زیادہ فی گاڑی 20 روپیہ بتایا جاتا ہے (Factories 1618-21' 269-70) اس کے بارہ سال بعد آگرہ سے احمد آباد کے راستہ کا محصول جس کا فاصلہ اس سے زیادہ نہ تھا بطور ٹھیکہ 45 روپیہ فی گاڑی طے ہو جاتا تھا (Mundy 278) یہ راستہ راجپوت فرمانرواؤں کے علاقہ سے گذرتا تھا۔ 1616ء کی ایک انگریزی تصنیف میں اس راستہ میں "چنگی اور ناجائز وصولیوں" کو "ناقابل برداشت بتایا گیا ہے" اور سورت سے براہ برہانپور آگرہ تک متبادل راستہ کو جو پورا شاہی علاقہ سے گذرتا تھا۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

باوجود' یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی کبھی بھی کلّی طور پر تعمیل ہوئی ہو اور ہر طرح کے محصول وصول کیے جاتے رہے۔ یہ غیر قانونی وصولیاں یا تو جاگیرداروں یا دیگر سرکاری عمّال کی منفعت کے لیے کی جاتی تھیں یا پھر یہ صورت ہو سکتی ہے کہ جن وصولیوں کو ایک طرف سے بند کیا گیا تھا' انہیں دوسری طرف سے جائز قرار دے دیا گیا۔[۲] ہمیں بظاہر ان دو زمروں کے محصولوں کو ایک دوسرے سے مختلف سمجھنا چاہیے۔ بڑی منڈیوں' سرحدی مقامات اور بندرگاہوں میں وہ تمام سامان جو یہاں سے باہر جاتے یا یہاں سے ہو کر گذرتے ان پر بحساب مالیت : $2\frac{1}{2}$ فیصدی محصول واجب الادا ہوا کرتا۔[۲]

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اس بنا پر کہ وہ نسبتاً محفوظ اور بہ عجلت قابلِ گذر اور ارزاں ہے ترجیح دی گئی ہے (فوسٹر پلینٹ۔ کلکتہ 89 Foster
Sarg-Cal. مقامی سرداروں کے علاقوں میں عائد کردہ محاصل کے متعلق دیگر شکایات کے لیے ملاحظہ ہو۔
Factories 1 31 Factories 46 16 50 ؛ 192 - 3 اور وقائع اجمیر 12، 13 و 196 وغیرہ

[۱] بقول اکبر نامہ (73 670 ' عہدِ حکومت کے چالیسویں برس اطلاع موصول ہوئی کہ باوجودیکہ تمغہ موقوف کر دیا گیا ہے مگر راستوں میں یہ اب بھی اسی نام پر وصول کیا جاتا ہے۔ لہٰذا مجبوراً اس کی روک تھام کے لیے افسران مامور کیے گئے۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے' کیونکہ جہانگیر نے تخت نشین ہونے کے بعد یہ ذکر کیا ہے کہ اس قسم کے محاصل" ہر صوبہ و سرکار میں" وصول کیے جا رہے ہیں (تزک جہانگیری۔ 4) اس سلسلہ میں خود جہانگیر کے احکام جو اس کے باپ کے احکام سے زیادہ وسیع تھے' نفاذ سے زیادہ نہ ثابت ہوئے' کیونکہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ نورجہاں کے گماشتے بین آگرہ کے بالمقابل علاقوں میں محصول راہداری وصول کر رہے ہیں Pelsert 6) ان محصولوں کی موقوفی کے متعلق اورنگ زیب کے احکام کو بے اثری کے اسباب کے سلسلہ میں خافی خاں کا قول اورنگ زیب کے پیشرو حکمرانوں کے متعلق بھی درست ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اوّل تو غیر قانونی محصولوں کو وصول کرنے کے جرم میں ماخوذ شخص کو کبھی بھی سخت سزا نہ دی گئی' دوسرے یہ کہ جاگیروں کی جمع میں ممنوعہ محصولوں کو اکثر شامل کر دیتے تھے جس کے باعث جاگیرداروں کے لیے ان کی وصولی کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ رہتا۔۔۔۔
(خافی خاں۔ 2 ص 88-9

[۲] یہ شرحیں بندرگاہوں کے متعلق آئینِ اکبری۔1۔ ص 204 میں درج ہیں۔ عہدِ شاہجہانی میں ایک ایسا ہی محصول ملتان میں ان سامانوں پر جو قندھار یا ٹھٹھہ کے لیے بھیجا جاتا تھا وصول کیا جاتا تھا۔ (Factories 37 6 41 ء ص 81) جو سامان بالائی سندھ میں خریدا جاتا تھا اس پر بھی یہ محصول عائد کیا جاتا تھا (ایضاً 55 16-60 ص 18) اورنگ زیب راہداری کے محصولوں کی ممانعت کے متعلق اپنے فرمانوں کے ذریعہ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

گو کہ بعض مقامات پر یہ زیادہ اور بعض پر کم تھا[1] اورنگ زیب نے اس شرح کو ہندوؤں کے لیے بڑھا کر 5 فیصدی کر دیا تھا' لیکن مسلمانوں کے لیے سابقہ شرح مسلسل قائم رہی بجز چند برس سال کی مدت کے جب مسلمانوں کو اس سے بالکل مستثنیٰ کر دیا گیا تھا[2] غذائی اناجوں پر مثل دیگر سامانوں کے یہ محصول لازمی طور پر واجب الادا ہوا کرتا' [3] گو کہ قلت کے دنوں میں انہیں معاف کیا جا سکتا تھا[4] ان متعدد محصولوں اور چنگیوں کا بار جو سترھویں صدی میں عام طور پر راہداری کے نام سے موسوم تھے اور جنہیں وہ مختلف حکام جن کے زیر نگرانی راستوں کا انتظام تھا یہ جبر وصول کرتے تھے' غالباً زیادہ رہا ہوگا۔ یہ محصول بیشتر بظاہر تو سامان کی مالیت پر وصول کیے جاتے[5] گو دریا پار کرنے کی صورت میں ان پر یکساں شرح عائد کی جا سکتی تھی[6] شاہی احکام' غذائی اجناس اور زیادہ مقدار میں استعمال ہونے والی اشیاء کے ان تمام محصولوں سے استثنا پر زور دیتے تھے[7] مذکورہ

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

مقررہ زکوٰۃ کو جو شاہی احکام کے مطابق سرحدوں اور مخصوص شہروں میں قائم کی گئی ہے واضح طور پر مستثنیٰ کرتا ہے (دستور العلوم' اوراق 37 ب۔ 38 ب) سامانوں پر محصول ان کی تخمینی مالیت کے اعتبار سے واجب الادا ہوتا تھا جو سرکاری رپورٹوں کے مطابق مقامی بازار میں ان کی مروجہ قیمتوں کی بنیاد پر قائم کی جاتی تھی 43elseart' Or. 37 16 - 41 ء صفحہ 136 ' مرآۃ (۱) ص 318۔19' 339 ۔ 40 'خلاصۃ السیاق' اوراق 90 الف 92 ب۔ 2006' اوراق 57 الف۔

[1] سورت میں "درآمد و برآمد" ۲½ فیصدی اور بھڑوچ میں ۲¼ یا ۲½ فیصدی Faster Supp. Cal. 47- 86 Pelsert 59 الف) 420 43 Commissgnial Clandelsl'e 209) اس مفروضہ پر کہ ملتان میں ملک کے بالائی حصہ کے مال پر اصل محصول ادا ہو چکا ہے گھاٹ یا نالوں کو پار کرتے وقت بمقام ٹھٹھہ صرف ¼ فیصدی ادا کیا جاتا تھا Factories 1637-41 ' صفحہ 136)

[2] ملاحظہ ہو Factories (تصحیح ابعد) 1665 - 7 ء صفحہ 266'

[3] موازنہ بہ خلاصۃ السیاق' حوالہ سابقہ' Fraser 86 ' 74 ' الف۔ب۔

[4] خافی خاں ۔2۔ صفحہ 88' 6574 ' ورق 33 ب۔ مرآۃ ۔1۔ صفحہ 309-315

[5] چنانچہ سورت سے انگریز گماشتے 1616 میں برہانپور اپنے ساتھیوں کو مطلع کرتے ہیں کہ "محصول وغیرہ جو تمہارے راہ میں گاڑیوں پر لگے ہیں ان کے متعلق ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ مختلف اشیاء پر مختلف ہیں"۔ (Foster Supp. Cal. 66)

[6] آئین اکبری۔ ا صفحہ 204 Tavernier صفحہ 96 [7] اکبر شاہجہاں اور اورنگ زیب کے مذکورہ بالا فرمانوں کا متن ملاحظہ ہو۔

[illegible] ہوتا ہوگا۔ لیکن الٹی بات یہ تھی کہ قلت اجناس یا [illegible] تھا۔ ان صورتوں میں محصول کی رقم میں ضرور متناسب اضافہ ہی نہیں ہو جاتا بلکہ وصولی کے نام پر عمال تجارتی کاروبار میں رخنہ اندازی بھی شروع کر دیتے تھے۔ جن کا مقصد بڑھی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے تاجروں کے زائد منافع میں اپنا حصہ لگانا ہوتا تھا اس کے علاوہ یہ امر تقریباً یقینی ہے کہ دور زیر مطالعہ کے اختتامی ایام میں مرکزی حکومت کی گرفت ڈھیلی ہو جانے پر اس نوعیت کے ناجائز محصولوں کے بارے میں بیحد اضافہ ہوا ہوگا۔[2]

---

[1] 1662۔3ء میں بنگال کے شہر ڈھاکہ کے قحط کا یہ سبب بیان کیا گیا تھا "زکوٰۃ کی گرانباری، راہداروں (راستو کے نگراں عمال) کے مظالم اور چوکیداروں (چوکیوں یا چنگی پر امور محافظین) کی ناجائز وصولیاں" جس کی وجہ سے تاجر شہر تک غلہ پہونچانے سے معذور رہتے تھے۔ بالآخر داؤد خاں قائم مقام صوبیدار بنگال، اپنے خصوصی اختیارات کے تحت تمام غذائی اجناس کو اس قسم کے تمام محصولوں سے مستثنیٰ کرنے پر مجبور ہوا جس کی بعد میں دربار شاہی سے توثیق ہوئی (فتحیہ عبریہ، اوراق 79 ب 80 الف 110ب 111الف) گو کہ اورنگ زیب کے عمومی فرمان کی اصل عبارت (مندرجہ مرآۃ العلوم) میں اس سلسلہ میں خاموشی اختیار کی گئی ہے مگر جملہ وقائع نگار اس فرمان پر رائے زنی کرتے ہوئے اس امر سے متفق ہیں کہ اس کے اجرا کا اصل مقصد مملکت کے بیشتر علاقوں میں قلت غلہ کی پریشانی کے پیش نظر راحت پہونچانا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عام دنوں میں سندھ میں تجارتی سامانوں کی آمد و رفت بظاہر وصولی محصول کے نام پر ہٹ گرادلاً رشوت ستانی کی غرض سے روک دی جاتی تھی۔ [illegible] (1637 - 41، ص 137، 55 16 - 60، ص 81) یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ یہ نفع بخش کاروبار سندھ ہی تک محدود نہ رہا ہوگا۔ دور عالمگیری کے اختتامی زمانہ میں جب دکن کی فوجی چھاؤنی میں قیمتوں کی شرحیں بڑھی ہوئی تھیں، سورت کا متصدی، دو روپیہ اور اس کا گماشتہ ایک روپیہ فی بیل بنجاروں سے شاہی فوج کو غلہ پہونچانے کی اجازت کے معاوضہ کے طور پر وصول کرتا تھا (احکام عالمگیری، ورق 140 ب)

[2] خافی خاں 2۔ 87 - 90 گو کہ بعد کے دور کا ایک مصنف ہے مگر صورت حال کا تفصیلی نقشہ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دور عالمگیری کے محصول اور چنگیاں سابقہ ایام پر سبقت لے گئیں اور زمیندار بھی ہر جگہ ان کی وصولی پر جری تھے۔ بندرگاہوں سے اندرون ملک جانے والی تمام اشیاء پر ان کی قیمت خرید کے برابر تک محصول وصول کیا جا سکتا تھا۔ خود اورنگ زیب، سیونی (خاندیش) کے امین دفوجدار کی جبری وصولیوں کے واقعہ کو یوں بیان کرتا ہے "یہ راہداری نہیں راہزنی (کھلی ڈاکہ زنی) ہے۔" رقعات عالمگیر، کانپور، [14] موازنہ ہو نیز Manuccie 4 [16]

جہاں تک امن و امان کے ان عام حالات کا سوال ہے جس کے تحت تجارت ہوا کرتی تھی، یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اوّل تو کاروانوں، سرایوں اور اسلحہ لے کر چلنے والے بنجاروں کے ٹانڈوں[1] اور غالباً کشتیوں کے بیڑوں[2] میں سے ہر ایک کے نظام کی تشکیل، اثنائے راہ میں ڈاکہ کے خطرات کو ملحوظ خاطر رکھ کر کی جاتی تھی[3]۔ اس کے علاوہ راستہ کی حفاظت انتظامیہ کے اہم ترین فرائض میں شمار ہوا تھی اور مملکت کا یہ ایک مسلمہ قانون تھا کہ جس افسر کے علاقائی حدود میں ڈاکہ یا چوری کی واردات پیش آئے وہ مال کی برآمدگی اور بصورت دیگر مظلوم کے نقصان کی تلافی کا ذمہ دار ہوتا تھا[4]۔ افسران اپنی اس ذمہ داری کو ایک وحشیانہ انتقامی جذبہ کے ساتھ، مشتبہ مواضعات کو لوٹ کر پورا کیا

---

1. Mundy \ 262 ان کے اماوہ پیکار رہنے کے سلسلہ میں لاحظہ ہو Tavernier ا، ص 33

2. مورلینڈ India & c. of Akbar، ص 8-167

3. اٹھارہویں صدی کے اختتامی اور انیسویں صدی کے ابتدائی زمانہ میں ٹھگی یا منظم طور پر گلا گھونٹ کر مار ڈالنے کی رواج کی وجہ سے تجارت اور سفر کے لیے جو اس قدر سنگین خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور جس نے حمل و نقل کے پرانے نظام کو منتشر کر دیا تھا، ممکن ہے اس کا یہی سبب رہا ہو۔ ہمارے یورپی سیاحوں میں صرف Thevenot 58 اور Fryer ا ص 5-244 اس جرم کا حوالہ دیتے ہیں۔ راجپوتانہ میں "عام راستہ پر لوٹنے والے جنہیں ہندی میں ٹھگ کہتے ہیں" کے حوالہ کے لیے ملاحظہ ہو، وقائع اجمیر 405۔

4. اس عظیم مملکت میں انصاف اور حسن انتظام کی وجہ سے راستوں اور ٹھہرنے کی جگہوں پر ایسا امن و امان قائم ہے کہ سوداگر، تاجر اور مسافر سکون قلب اور خوشی خرمی (؟ بعید ؟) مقامات کا سفر کرتے ہیں۔ اگر کسی مقام پر کسی چیز کا نقصان ہو جائے تو علاقہ کے افسران (علاوہ ان بعض مخطوطات میں : عمال، حکام سیغہ ال) اپنی غفلت کے لیے معاوضہ کے علاوہ جرمانہ بھی ادا کرنے پر مجبور کیے جاتے ہیں۔" (چار چمن برہمن (اے) ورق 25۔ الف۔ ب (بی) 16 ب) آئین اکبری (ا، 284 میں یہ ذمہ داری صرف کوتوال (شہر کی پولیس کا افسر) پر عائد کی گئی ہے، لیکن جن مقامات پر کوتوال علیحدہ سے مقرر نہیں ہوتا (ایضاً۔ 288) وہاں محصل مال ہی کو پولیس کے فرائض بھی انجام دینا ہوتا تھا اس لیے ایسی صورت میں یہ ذمہ داری اس افسر ہی پر عاید ہوتی تھی۔ Manucci 2 ص 421 کے قول کے مطابق اگر راستہ میں "کوئی تاجر یا مسافر دن دہاڑے لوٹا جائے" تو فوجدار (علاقہ کا کمانڈنٹ) کو معاوضہ ادا کرنا ہوتا تھا۔ اخبارات (اے) 193 ملاحظہ ہو۔ جاگیرداران پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی (ملاحظہ ہو Factories 1646 ص 30 300 302 موازنہ نیز درالعلوم، ورق 64 ب 65 الف

کرتے تھے۔ یہ طریقے، کسی حال میں بھی ان کے لیے غیر نفع بخش نہ ثابت ہوتے[1] یہ صورت تو صرف شمالی ہندوستان اور ان علاقوں میں تھی جو مرکزی حکومت کی کڑی نگرانی میں تھے۔ مگر پہاڑوں یا نیکے نواحی علاقوں، گھاٹیوں اور ویران خطوں میں یہ طریقہ زیادہ کامیابی کے ساتھ اختیار نہ کیا جا سکتا تھا۔ ان حصوں میں اکثر ڈاکو اور باغی کے درمیان کوئی تفریق نہ رہتی تھی اور یہ لوگ اپنے علاقوں سے گذرنے والے تاجروں سے اس قسم کی رقمیں وصول کرتے تھے جنہیں رہائی کا معاوضہ یا خراج کہا جا سکتا ہے[2] بہرحال، خاص طور پر ہندوستان میں یورپی تجارت کے تجربوں کو پیش نظر یہ عمومی تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ایک تنہا سفر کرنے والے کے لیے اثنار راہ میں خواہ کچھ بھی خطرات رہے ہوں، مگر مملکت مغلیہ کے بیشتر حصہ میں قافلوں کی شکل میں تجارت کا کام معمولاً اچھی خاصی حفاظت کے ساتھ انجام پاتا تھا[3]

آخر میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ مالی کاروبار اور قرضہ کے لین دین کا ایک غیر معمولی ترقی یافتہ نظام لمبے فاصلوں کی تجارت کو سہارا دینے کے لیے موجود تھا[4] ہنڈیوں، صرافوں کا ڈرافٹ (بینکرس

---

[1] ان طریقوں کے وسیع پیمانہ پر استعمال کے سجانے کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو باب 9 کی فصل 2۔

[2] "اس (جہانگیر) کو صرف میدانوں یا کھلی ہوئی سڑکوں کا بادشاہ تصور کیا جا سکتا ہے کیونکہ بہت سے مقامات پر طاقتور محافظین کی نگرانی میں یا باغیوں کو کثیر محصول ادا کرنے کے بعد ہی سفر کیا جا سکتا تھا۔ Pelseart 58، 59) آگرہ اور دہلی کے درمیانی راستوں میں میواتیوں اور جاٹوں کی وجہ سے اور رنگیل گمنڈ کے راجپوت اور گجرات کے کولیوں کی وجہ سے مستقل خطرہ رہا کرتا تھا۔ آخرالذکر دو اقوام کے افراد سے مڈبھیڑ کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ Mundy 110-111، 117-20، 259، 263-4، 269-70۔ گجرات کے Geloynssen۔ J.I.H: 34، 74، 79، 81 بھی ملاحظہ ہو۔

[3] منفرد سیاحوں کے تاثرات مختلف ہیں۔ پنچ کے ناموافق بیان کے مقابلہ میں مینرق اور ٹیورنیر ایسے سیاحوں کے تجربات پیش کیے جا سکتے ہیں۔ علاوہ اس کے، ممکن ہے کہ بعض راستے بمقابلہ دوسرے راستوں کے زیادہ محفوظ رہے ہوں۔ چنانچہ آگرہ سے پٹنہ کا راستہ ڈاکوؤں کے لحاظ سے بہت پر خطر نہ تھا۔ Factories 1618-21، ص 269) منڈی کے خیال کے مطابق براہ جونپور سفر کی صورت میں اسے ڈاکو نہ ملتے (Mundy ص 110) مغلوں کے دور میں امن عامہ کے متعلق اچھی رائے کے لیے۔ پی۔ سرن، پراونشیل گورنمنٹس آف دی مغلس (P. Saran, Provincial Governments of the Mughals) ص 399-403 پر ملاحظہ ہو۔

[4] سوجان رائے۔ 25 اس کا ایک پرجوش انداز میں تذکرہ کرتے ہوئے اسے ہندوستان کے عجائب میں شمار کرتا ہے

ڈرافٹ) اور تجارتی ہنڈی (بل آف اکس چینج) کا استعمال عام تھا اور زمانہ کے لحاظ سے انکی شرحیں بھی فطرتاً واجبی تھیں[1] اس کے علاوہ اثنائے راہ میں سامان کے نقصان کے خطرات ہی کے لیے نہیں[2] بلکہ ٹیکسوں کے بار سے محفوظ رہنے کے لیے بھی 'بیمہ' کا ایک باضابطہ نظم پایا جاتا تھا[3]

مذکورہ عوامل میں سے ہر ایک کے تجارت پر اثرات کا صحیح تعین آسان نہیں۔ بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی کسی درجہ میں ذرائع وحمل ونقل سے متعین شدہ اخذ مانی

---

[1] ہنڈیوں کو اکثر صراف یا ساہوکار بعوض ان رقوم کے جو ان کے پاس نقد جمع کردی جاتی تھی، دوسرے مقامات پر اپنے گماشتوں یا آڑھتیوں کے نام جاری کرتے تھے۔ ان صورتوں میں یہ محض ایک مقام سے دوسرے مقام پر روپیہ بھیجنے کا وسیلہ ہوا کرتی تھیں (اکبر نامہ۔ 3 ص 762، سوجان رائے۔25 مرآۃ۔ 1 ص 411) لیکن ہنڈیاں ایسے تاجر بھی لکھا کرتے تھے جن میں قرض کی ضرورت ہو اور اس صورت میں یہ موجودہ زمانہ کی 'اعتباری ہنڈی' (Accomodation Bill) کی حیثیت میں ہوتی تھی (Tavernier ص 30، موازنہ بہ نیز .Cal .Foster,Supp 112) شرح مبادلہ کے سلسلے میں یاد رہے کہ یہ چالانی (مروجہ) اور سکہ (نئی ڈھلائی) کے روپیوں جن میں ہنڈی کی آخری ادائیگی کی جاتی تھی کی قیمتوں کے فرق کے مساوی ہوتی تھی (ملاحظہ ہو، ضمیمہ ج اور نیز FosterSupp.Cal 60.64) انگریز عام طور پر روپیہ کو بذریعہ ہنڈی بھیجنے کی شرح کو معقول تصور کرتے تھے۔ (مثلاً سورت سے آگرہ کے لیے Factories 1618-21 ص 155، آگرہ اور دہلی کے درمیان یہ شرح ایک فیصدی تھی (ایضاً۔ 1655 - 60، ص 18-19) جو شرحیں Tavernier (1، ص 30-31) میں درج ہیں، حقیقتاً ہنڈی وہ شرحیں ہیں جن پر اعتباری ہنڈیوں کو بھنایا جاتا تھا۔ وہ انہیں نسبتاً زیادہ بتاتا ہے لیکن اس کا سبب یہ تھا کہ ہنڈی دار اثنائے راہ میں ہنڈی لکھنے والے کے مال کے نقصان کے خطرہ میں بھی شریک ہوتا تھا۔ فاصلہ کی دوری کے لحاظ کے ساتھ ساتھ، ہنڈی لکھنے والے کی ساکھ پر بھی بھنانے کی شرح کی کمی وبیشی کا انحصار ہوتا تھا (Factorics 1655 60 ص 18-19)۔

انگریزی تحریروں سے تجارتی کاروبار میں ہنڈیوں کے بکثرت استعمال کے متعلق کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ خود حکومت بڑی بڑی رقموں کو بھی ایک مقام سے دوسرے مقام کو منتقل کرنے کے سلسلے میں اس کا استعمال کرتی تھی (اکبر نامہ۔ 3۔ ص 762، وقائع دکن۔ 17۔ نگار نامۂ منشی ورق 150۔ الف، احکام عالمگیری ورق 109 الف، اخبارات 40/31) ہنڈیوں کا بازار اس قدر ترقی یافتہ تھا کہ کاروبار میں اکثر عملی طور پر نقدی لین دین کی نوبت بہت کم آتی تھی (مرآۃ۔ 1۔ ص 411)

[2] بقول سوجان رائے 25 اسے بیمہ کہتے تھے۔ [3] موازنہ نیز Mundy 278، 291 - اسکے ماہرین کو اداد یا کہتے تھے

امکانات پر اثر انداز نہ ہوتے۔ ان امکانات کا اعادہ اس طور پر کیا جا سکتا ہے کہ یہ بمقابلہ جسامت والے سامانوں کے زیادہ مالیت کے سامانوں کی آمد و رفت کے لیے اور بمقابلہ خشکی کے دریائی آمد و رفت کے لیے زیادہ سازگار تھے۔ غالباً بعض اوقات حکومت غذائی اجناس کی نقل و حرکت کی ہمت افزائی کیا کرتی تھی، لیکن ساتھ ساتھ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اکثر حکومت ہی کی طرف سے اس کام میں رکاوٹ پیدا ہو جایا کرتی اور براہ خشکی باربرداری کے اخراجات کی زیادتی کے ساتھ ساتھ یہ طریقہ مقامی حکمرانوں اور باغیوں کی جبریہ وصولیوں کی زد سے نسبتاً زیادہ غیر محفوظ تھا، جیسا کہ خاص طور پر راجپوتانہ کے راستہ پر[1] مذکورہ بالا حقائق کو ملک کے مختلف حلقوں کے درمیان تجارت کے عام ڈھانچہ کا مطالعہ کرتے وقت ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ذیل میں زیادہ اہم زراعتی پیداواروں کے متعلق تفصیلات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان تفصیلات سے صرف ان پیداواروں ہی کا حال نہیں معلوم ہوگا جو دور کی منڈیوں سے متاثر ہوا کرتی تھیں بلکہ اگر ہم مذکورہ نتائج کو منطبق کریں تو ہمیں مختلف صوبوں میں مروّجہ قیمتوں کی نسبتی سطحوں کا بھی حال معلوم ہو سکے گا۔

اولاً تو بلاشبہ ہمارے عہد کے دوران بنگال میں قیمتیں نمایاں طور پر کم تھیں[2] اور وہاں برآمد کرنے کے لیے کافی سامان بچ رہتا تھا۔ بنگال سے کورومنڈل تک[3] اور راس کماری کا چکر لگاتے ہوئے کیرل تک چاول، شکر اور مکھن کی باضابطہ ساحلی تجارت کا سلسلہ تھا[4]۔ شکر بذریعہ

---

[1] ملاحظہ ہو فصل ہذا، نوٹ 25۔

[2] Linschoten، 94-5، آئین اکبری، ا، 389، Bowery 193، 4-کلمات طیبات، ورق 50 الف ایک انگریز گماشتہ 1650ء میں کہتا ہے کہ "بنگال میں موم، سیاہ مرچ، مشک، چاول، مکھن، نیل اور گیہوں بمقابلہ دوسری جگہوں کے نصف قیمت پر مل سکتا تھا" (Factories 1646 - 50، 338)۔

[3] Relations 40، 60، Factories 1634-36، 41، Bernier 437، دوسری برآمدات میں "جنجیلی (روغن شیریں) کے بیج، لمبی مرچیں، گوند کی لاکھ، موم، وریشم وغیرہ شامل تھے (موازنہ ہو نیز Cooser Frederick 10، 114) کورومنڈل کو یہاں سے چاول کی برآمد جو خود ہی چاول کی پیداوار کا ایک بہترین علاقہ تھا، تعجب کی بات ہے Methwold Relation 40 میں درج ہے کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے نیوکاسل کو باہر سے کوئلہ لایا جائے لیکن یہاں لوگ اسے منہ مانگی قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔"

[4] Fitch, Ryby 165 Early Travels 44 Relations 60۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

جہاز گجرات[1] بلکہ فارس تک[2] جبکہ افیون خاص طور پر کیدل کو برآمد کی جاتی تھی[3]۔ بعض اوقات بنگال کے بندرگاہوں سے نیچے کی طرف جنوبی ہندوستان[4] اور پرتگالی مقبوضات[5] تک گیہوں بھی بھیجا جاتا تھا اڑیسہ سے بھی براہ سمندر 40,000 ٹن سے زائد غلہ (چاول) مع مکھن (بمعنی گھی۔ مترجم) اور لاکھ کے کورومنڈل کے بندرگاہوں کو برآمد کیا جاتا تھا[6]۔ مشرقی ساحل سے بنگال میں کپاس کے سوت اور تمباکو کی درآمد تھی۔

سترھویں صدی کے دوران، ولندیزی نے بنگال کے ریشم کی سمندری تجارت کو بے حد ترقی دی اور انہوں نے اسے جاپان اور ہالینڈ تک برآمد کیا کہا جاتا ہے کہ وہ منجملہ 22,000 گانٹھوں کے جو قاسم بازار میں سالانہ برائے فروخت آیا کرتی، 6 یا 7 ہزار گانٹھیں خود خرید لیا کرتے تھے اگر مملکت مغلیہ کے دیگر حصوں اور وسطی ایشیا کے تاجر اس کا موقع دیتے تو وہ اس سے بھی زیادہ کی خریداری کرتے[8]۔ صدی کے اواخر میں یہاں سے کپاس کا سوت اور شکر بھی یورپ کو برآمد

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)
اور مغربی ساحل کے پرتگالی مقبوضات کو بھی جس کے لیے ملاحظہ ہو Early Travels 110 Fitch Reloy
24، 28 Lett. Recd 4، صفحہ 327 (یہاں مرتب نے یہ سمجھنے میں کہ انڈیا سے مراد ہندوستان ہے بظاہر غلطی کی ہے۔ اس زمانہ کے انگریز اس کا مطلب معمولاً پرتگالی ہندوستان سمجھتے تھے)

[1] Pelsaert 19، Factories N.S. (3)، صفحہ 256

[2] Bernier، Factories 1666-90، صفحہ 179، T-R. Chaudhri, 'The Dutch in Coromondal' صفحہ 240 بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ Bengal Past & Present 76 حصہ 1، صفحہ 37

[3] Factories 1661-64، صفحہ 355 ولندیزیوں نے اس تجارت کی جبری اجارہ داری قائم کر لی تھی۔

[4] مغلیہ فوج کے لیے جو کرناٹک میں مصروف تھی، گیہوں، بنگال ہی سے فراہم ہوتا تھا (دلکشا اوراق 113۔ ب 114۔ الف۔)

[5] Lett. Recd. (4)۔ 327۔

[6] Bowrary 121۔ 2 موازنہ بیز Purchas، Seaser Frederick 10، صفحہ 112-13، ریلیشنز 54

[7] ریلیشنز۔ 60۔

[8] بقول Tavernier 2، صفحہ 2، انکے حریف ولندیزیوں کے اتنا لیتے تھے بقیہ بنگال کے مقامی صرف کے لیے رہ جاتا تھا۔

ہوتی تھی[1]

بنگال دریائے گنگا کے بالائی علاقہ پٹنہ کو چاول اور ریشم[2] بعوض گیہوں، شکر اور افیون کے برآمد کرتا تھا[3]

براہ دریائے گنگا و جمنا اور ان کے کنارے کے مقامات کے ساتھ آگرہ تک خوب تجارت ہوا کرتی تھی۔ آگرہ، بنگال اور پٹنہ سے صرف کچا ریشم اور شکر ہی نہیں، بلکہ مشرقی صوبوں سے چاول گیہوں اور مکھن کے قسم کے سامان بھی درآمد کیا کرتا تھا۔ ایسا خیال کیا جاتا تھا کہ ان اشیاء کی درآمد کیے بغیر یہاں کی غذائی ضروریات پوری نہ کر سکیں گے[4] اس کے عوض، بنگال کو نمک جس کی یہاں بے حد قلت تھی معہ کپاس و افیون کے پہونچایا جاتا تھا[5]

آگرہ سے پھر شکر، گیہوں اور بنگال کا ریشم گجرات بھیجا جاتا تھا[6] مگر بحیثیت ایک تجارتی منڈی کے آگرہ کی شہرت کا خاص سبب نیل کی تجارت تھی۔ دنیا کی بہترین نیل، اس کے قرب و جوار میں پیدا ہوتی تھی اور ہندوستان کے تمام حصوں کو بھیجے جانے کے علاوہ اس کے لیے بین الاقوامی مانگ بھی تھی۔ پہلے اس کو مشرق وسطیٰ کے تاجروں کے ہاتھ فروخت کرنے کی غرض سے لاہور لاتے تھے[7]

---

[1] Factories 1655-60، ص 179، 297، این۔ ایس۔ 2، ص 301، ہیجز Hedges (1)، ص 75

[2] Factories 1618-21، ص 193-4، Mundy 153، Bernier 437، پٹنہ آگرہ کی نسبت سے اپنے محل وقوع کی سہولت کے باعث بنگال کے ریشم کے لیے غالباً ایک اہم منڈی رہی ہوگی۔ (موازنہ ہو Pelsort)

[3] Fitch-Reley 110، Early Travels 24، Bower 275۔

[4] Pelsaert 4، 5-9، Mundy 95-6، 98، 9 شاہی ضرورت کے لیے سکھداس چاول کی ضرورت بہرائچ سے ہوتی تھی۔ آئین اکبری ۱، ص 53

[5] Jourdain 162، Pelsaert 9۔ بنگال میں نمک کی گرانی کے لیے ملاحظہ ہو آئین اکبری ۱، ص 390۔ آسام میں اس کی قلت اور بھی زیادہ تھی (فتحیۂ عبریہ۔ اوراق 32 ب)

[6] Factories 1618-21، ص 102، 1624-29، ص 235-6، Pelsaert 19، Tavernier 2، ص 2۔ پلسارٹ اور ٹیورنیر کی اطلاعات کے مطابق احمد آباد میں ریشم کی بنائی کی بڑے پیمانے پر صنعت تھی جس کا کلی انحصار بنگال کے ریشم پر تھا۔

[7] Pelsaert 30۔ اسی وجہ سے بیانہ کی نیل یورپ میں لاہور کی نیل کے نام سے مشہور تھی۔

لیکن جب یورپ کے ساتھ سمندری تجارت کا سلسلہ قائم ہو گیا تو آگرہ اس کا واحد تو نہیں لیکن خاص مرکز ضرور بن گیا[1] سترھویں صدی کے اوائل میں یورپی ممالک کے ساتھ اس کی تجارت کو بے حد فروغ حاصل ہوا، لیکن اس کے بعد یہ تیزی سے زوال پذیر ہوئی[2]
بظاہر لاہور کے بازار میں گیہوں، مرادآباد ایسے دور دراز مقام سے اور اعلیٰ قسم کا چاول سرہند سے لایا جا سکتا تھا[3] لاہور اور ملتان سے شکر اذرادرک براہ کشتی نیچے کی طرف ٹھٹھہ کو بھیجی جاتی تھی، جہاں سے یہ سیاہ مربوں اور کھجوروں سے بھری ہوئی واپس ہوا کرتی[4] برآمد کے لیے مکھن (مراد گھی۔ مترجم) بھکر سے براہ دریا نیچے کی طرف ٹھٹھہ کو لایا جاتا تھا[5] اسی طور پر نیل سہوان سے بذریعہ بحری جہاز بصرہ بھیجے جانے کی غرض سے[6] اور کبھی کبھی براہ سورت یورپ بھیجے جانے کی غرض سے یہاں لائی جاتی تھی[7] بوجوہ چند بصرہ کی تجارت رو بہ زوال ہوئی[8] اور انگریز

---

[1] بہترین یعنی بیانہ کی نیل بیشتر ولندیزیوں اور انگریزوں کی خریداری میں آجاتی تھی اور اسے آرمینی، مغل اور فارس کے تاجر بھی خریدا کرتے اور یہ لوگ زیادہ مقدار میں دوآبہ میں خورجہ اور کول کے قریب پیدا ہونے والی نیل بھی حاصل کیا کرتے تھے۔ میوات میں نیل کی جو قسم پیدا ہوتی تھی وہ مقامی اور نیز ہندوستانی منڈیوں کے مصرف میں آجاتی تھی Pelsaert 15، 18 Factories 1642..5، ص 136،

[2] اس کا بڑا سبب آگرہ کی نیل کی قیمتوں میں اضافہ اور اس میں اور مغربی جزائر الہند میں غلاموں کی محنت سے کاشت کی ہوئی نیل میں باہمی مقابلہ تھا Factories 1646 50، ص 32، 76-7، 1655-60، ص 322، 336، موازنہ بہ نیز مورلینڈ Akbar to Aurangzeb 112-113 جس میں اس کی تجارت کچھ سنبھل گئی تھی کیونکہ 1684 میں انگریز کمپنی نے آگرہ 500 گانٹھوں کا آرڈر بھیجا تھا جس میں سے صرف 212 دستیاب ہو سکیں، Factories 3، ص 285،

[3] شاہدرہ۔ لاہور میں عائد کئے گئے محصولوں کا تذکرہ 'خلاصۃ السیاق' اوراق 90 الف۔ 92 ب Or. 2026، اوراق 57 الف۔ 59 الف ملاحظہ ہو۔

[4] Pelsaert 31- 2 Factories 1637 - 41، 1637-41، ص 136

[5] Factories 1637 - 41، ص 136، سندھ کے مکھن (یعنی گھی۔ مترجم) کی Factories، ص 56، اور آئین اکبری (1)، ص 556 میں تعریف کی گئی ہے Manucci 2، ص 427 کے قول کے مطابق یہ مسقط کو برآمد کیا جاتا تھا۔

[6] Factories 1637 - 41، ص 136-7

[7] پرتگالیوں کے لیے Roe 175 اور انگریزوں کے لیے Factories 1637 - 41، ص 274، 1642-5، ص 203 وغیرہ ملاحظہ ہو

[8] ایضاً 1642 - 5، ص 136

اس کی جگہ لینے میں ناکام رہے[1]

کشمیر سے آگرہ[2] اور ہندوستان کے دیگر مقامات کو زعفران برآمد کی جاتی، اور پٹنہ میں اس کا نیپالی زعفران سے مقابلہ رہتا۔[3] اس کے بدلے میں کشمیر نمک، سیاہ مرچ، افیون، کپاس دسوت وغیرہ کی درآمد کیا کرتا تھا۔[4]

مغربی ہندوستان کی تجارت کا اہم ترین پہلو، گجرات میں غذائی اجناس کی درآمد تھی۔ یہ گیہوں اور دیگر غذائی اجناس، مالوہ اور اجمیر سے اور چاول دکن سے حاصل کیا کرتا۔[5] بلکہ یہاں کی بازاروں میں گونڈوانا ایسے دوردراز خطے تک کی پیداوار یں فروخت ہوا کرتی تھیں[6] جبکہ مالابار سے بذریعہ بحری راستہ یہاں چاول بھی لایا جاتا تھا۔[7] برخلاف اس کے یہاں کی اہم برآمدات نقدی فصلوں پر مشتمل تھیں ان میں کپاس کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ سورت اور برہانپور (خاندیش) کے درمیانی علاقہ میں جو کپاس پیدا ہوتا تھا اسکی بنیاد پر وسیع پیمانہ پر آگرہ سے تجارت ہوا کرتی تھی۔[8]

---

[1] ایضاً، 302، 1646 - 50ء 33، 29، 13.12 -

[2] Pelsaert 35 -

[3] Marshall 413 - "فارس کے ایسے زعفران" کے لیے جو بھوٹان میں پیدا ہوتا تھا موازنہ بہ نیز Fitch: Rely 116 - Early Travels 27 -

[4] Pelsaert 36 تزک جہانگیری - 300 - 315 - Pelsaert 36 -

[5] آئین اکبری - I - 485 - اور نیز آگرہ سے جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے۔

[6] گڑھہ کا ذکر کرتے ہوئے جو کاغذات کی رو سے صوبۂ مالوہ میں شامل تھا، ابوالفضل کہتا ہے کہ "اسکی کاشت کے باعث دکن اور گجرات کے علاقوں کو سہولیت پہونچتی تھی"۔ (آئین اکبری - I ص 456)

[7] ٹوسٹ (Twist ترجمہ مورلینڈ، J I H 16 : 1936ء) ص 76، اور ایسا باوجودیکہ خود کیرل میں چاول کی افراط نہیں معلوم ہوتی، ہوا کرتا تھا (موازنہ بہ Fitch: Roley 185، Early Travels 44) کیرل سے دیگر اشیاء جو درآمد کی جاتی تھیں، علاوہ مرچوں کے ناریل، ناریل کی جٹا، کھجور کی شکر اور چھالیہ وغیرہ تھیں (Pelsaert 19 - Twist حوالہ سابقہ، Fryer. I - ص 136)

[8] Pelsaert 9

یہاں سے کپاس اور اس کا سوت سمندری راستہ سے خلیج فارس اور بحر قلزم[1] کی بندرگاہوں تک اور ملابار ساحل کے نیچے نیچے کیرل تک بھیجا جاتا تھا[2] کبھی کبھی یہ یورپ کو بھی برآمد ہوتا تھا[3] گجرات میں پیدا ہونے والی نیل خصوصاً سرکھیج کی یورپ اور مشرق وسطیٰ کو برآمد کی جاتی تھی[4] افیون کی بڑی مقدار کیرل کو[5] تمبا کو ٹھٹھہ[6] فارس[7] اور بحر قلزم کی بندرگاہوں کو بذریعہ سمندری جہاز بھیجی جاتی تھی[8] دوبارہ برآمدات میں شکر اکثر یورپ[9] کو، ریشم مشرق وسطیٰ کو[10] اور زعفران مالابار کو بھیجی جاتی تھی[11]

---

[1] Fryer ۱۔ ص 282

[2] Twirt حوالہ سابقہ Factories 1665 - 67، ص 101

[3] سوت کی برآمدات کے لیے موازنہ ہو Akbar to Aurangzeb ص 137-8 روئی کے لیے ملاحظہ ہو۔ Factories 1624 - 26، ص 212، 1665 - 67، ص 174 یہاں سوتی کپڑوں کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے جو یورپ کے ساتھ ہونے والی تجارت کا ایک بڑا حصہ تھا۔

[4] آئین اکبری ۱۔ ص 406 Factories 1630 - 33، ص 19-20 Fryer ص 282 سرکھیج کی بیشتر نیل برآمد کی جاتی تھی۔ جب اسکی پیداوار کم ہوتی تھی جس کا تخمینہ صرف 6,000 من گجراتی لگایا ہے، تب بھی مقامی ضرورت اس کے ایک بٹہ چھ سے زائد نہ تھی (Factories 1642 - 45، ص 163-4)

[5] Linschoten 2 ص 113، ٹوسٹ، حوالہ سابقہ Factories 1661 - 64، ص 355، 1665 - 67، ص 99-101 ممکن ہے گجرات سے جو افیون برآمد ہوتی تھی اس کا بیشتر حصہ مالوہ کا ہوتا رہا ہو۔ ولندیزی اپنی مرچوں کے کاروبار کو چلانے کی غرض سے اسے برہانپور میں خرید اکرتے تھے (Tavernier ۱۔ ص 19)

[6] Factoeis 1646 - 50، ص 48

[7] ایضاً۔ 1637 - 41، ص 126۔

[8] ایضاً۔ 1618 - 21، ص 63۔

[9] حالانکہ گجرات میں شکر پیدا کی جاتی تھی، مگر اس کی برآمد تو درکنار یہ مقامی ضرورت کے لیے بھی ناکافی تھی۔ انگریز اسے آگرہ سے منگانے کا ٹھیکا اکثر بنجاروں کو دیتے تھے Lett. Recd 5 ص 115، 6 ص 280 Factories 1618-21 ص 102، 1624 - 42 ص 235، 270 موازنہ بیجیئے Akbar to Aurangzeb ص 138 (9

[10] Feyor ۱۔ ص 282۔

[11] Twist حوالہ سابقہ۔

مغربی ساحل کی غالباً سیاہ مرچ سب سے زیادہ اہم تجارتی چیز تھی۔ مہاراشٹر اور بالائی گھاٹ کے بعض علاقوں اور آگرہ کے درمیان براہ خشکی خوب تجارت ہوا کرتی تھی[1] لیکن مالابار کا پرانا تجارتی سلسلہ گجرات کے ساتھ قائم تھا اور مرچیں براہ سمندر، افیون اور کپاس کے بدلے میں بھیجی جاتی تھیں۔ سترھویں صدی کی ساتویں دہائی میں ولندیزیوں نے اس کی تجارت کو کلیتًا منتشر کرکے ان پر اپنی اجارہ داری مسلط کرلی جس نے مالابار میں افیون کی اور سورت میں سیاہ مرچوں کی قیمتوں کو غیر معمولی طور پر بڑھا دیا۔[2]

جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ مذکورہ جائزہ میں سامان کی واقعۃً اس مجموعی مقدار کا جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوا کرتی تھیں ہم مشکل ہی سے کہیں ذکر کر سکتے ہیں۔ مگر اس جائزہ سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں ہندوستانی زراعت کا ایک اہم پہلو یہ رہا ہے کہ دور دور کی منڈیوں کے لیے فصلیں پیدا کی جاتی تھیں۔ خاص طور سے بنگال سے برآمدات اور گجرات میں درآمدات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایک وسیع علاقہ میں بعید مقامات کی منڈیوں کی مانگ غذائی غلوں پر بھی اثر انداز ہوا کرتی تھی۔ قدرتی طور پر، یہ اثر اندازی نقدی فصلوں پر اور بھی زیادہ نمایاں تھی اور بعض خطوں میں جو اعلیٰ قسم کی پیداواروں کی کاشت کے لیے مخصوص تھے، مثلاً بیانہ اور سرکھیج، نیل کے لیے اور کشمیر زعفران کے لیے معمولی حیثیت کے کسانوں کا تجارت پر دارومدار قطعاً بہت زیادہ رہا ہوگا۔

فصل ۲ ـــ مقامی تجارت، کسان اور منڈی

بہرحال، یہ ایک واضح امر ہے کہ حالانکہ زرعی پیداوار کی مجموعی مقدار جو ملک کے ایک خطے سے دوسرے کو منتقل کی جاتی تھی، اچھی خاصی زیادہ تھی، لیکن پھر بھی اس دور میں حمل و نقل کے جو حالات تھے ان کے پیش نظر یہ مملکت کی کل پیداوار کے ایک بہت ہی قلیل جزو سے کبھی بھی زائد نہ ہوسکتی تھی کسانوں کی ایک کثیر تعداد کے لیے مقامی بازاروں کی ضرور بے حد اہمیت رہی ہوگی اور مقامی تجارت کا مفہوم شہر اور گاؤں کے درمیان تجارت کا تھا۔

اس زمانہ کے ماخذ کے مطالعہ سے ناممکن ہے کہ یہ تاثر نہ پیدا ہو کہ اس وقت کی شہری آبادی

---

[1] Factories 1646 ـ 50 ص 255، 1661 ـ 64 ص 344

[2] ایضاً ص 261، 1665 ـ 67 ص 99 ـ 101، 151، 174،

بہت زیادہ تھی۔ کاریگروں، پیونس (Peons) (بمعنی ملازم پیشہ) اور نوکروں کی تعداد کی
کثرت جو شہروں میں پائی جاتی تھی، اس پر غیر ملکی مشاہدین نے اکثر تبصرہ کیا ہے[1] ہماری اطلاع ہے
کہ اکبر کے زمانہ میں مملکت میں 120 بڑے شہر اور 3200 چھوٹے قصبات تھے جن میں سے ہر ایک،
کے مشتملات میں ایک سو سے لے کر ایک ہزار تک مواضعات تھے[2]۔ سترھویں صدی کا سب سے بڑا شہر
آگرہ تھا جس کی آبادی کا تخمینہ وہاں بادشاہ کے قیام کے دنوں میں 5 لاکھ سے لے کر 6 لاکھ 60 ہزار تک
کیا گیا ہے[3] شاہی دربار کے دہلی منتقل ہونے کے بعد بھی یہ دہلی سے بڑا ہی رہا۔[4] حالانکہ اس وقت خود
دہلی کی آبادی پیرس کے مساوی تصور کی جاتی تھی[5] جو اس وقت یورپ کا سب سے بڑا شہر تھا۔ لاہور
کے متعلق جب اس کی شان و شوکت عروج پر تھی کہا گیا ہے کہ "ایشیا یا یورپ کے کسی بھی شہر سے یہ کمتر نہ تھا"[6]

---

[1] ہندوستان میں دوسری اچھی بات یہ ہے کہ یہاں ہر قسم کے کام کرنے والوں کی ایک کثیر اور غیر مختتم تعداد پائی جاتی ہے" بابر نامہ، ترجمہ ایس۔ بیورج 2 ص 520 یورپی شہادتوں میں ملاحظہ ہو مثلاً P. Di. valles, I, P. 42 Pelsaert 61

[2] طبقات اکبری۔ 3 ص 545-6

[3] اول الذکر تخمینہ آگرہ سے 1609 میں جے۔ زیویر (J. Zavier) کے خط (ترجمہ J A S B, Hosten N.S. 23 1927 ص 121) اور آخر الذکر تخمینہ Marriage 2 ص 152 کے خط میں ملتا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اس تعداد سے باہری باشندے خارج ہیں۔ 1583 6 میں آگرہ اور فتحپور سیکری میں سے ہر ایک لندن شہر سے بڑے تصور کیے جاتے تھے۔ (Early Travels 98 97 Fitch; Ryby 17-18۔ اور موازنہ بہ نیز Salbancke Puchas 3 ص 84 فتحپور سیکری کے لیے) یہ اعداد اس وقت کے ہیں جب آگرہ نے لاہور پر مختتم فوقیت۔ اصل نہ کی تھی۔ عہد عالمگیری کے اوائل میں جب شاہی دربار دہلی میں تھا اس وقت افواہوں کی بنیاد پر Thevenot 41 کا یہ دعویٰ ہے کہ آگرہ "ایک بڑا شہر ہونے کے باوجود بھی اس قابل تھا کہ دو لاکھ آدمی میدان جنگ کے لیے فراہم کر سکے" لیکن اس دعوے سے اس کی آبادی کے متعلق کوئی مثبت اشارہ نہیں ملتا۔

[4] Bernier 284 Tavernier I. ص 86

[5] Bernier 281-2

[6] یہ بیان Monserrate 159-60 جس نے 1581 میں لاہور کا سفر کیا تھا کے بیان کے مطابق ہے۔ کوریٹ (Coryat) کے 1615ء کے قول (Early Travels ص 243) کے مطابق "یہ پوری دنیا کے عظیم ترین شہروں میں تھا" اور "قسطنطنیہ" (جسے اس نے دیکھا تھا) سے "یہ بڑا تھا"۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اس وقت یہ آگرہ سے بڑا تھا۔ آئین اکبری، I ص 539 بھی ملاحظہ ہو جو بعد میں اس کا زوال ہوا Pelsaert Tavernier 74-77

ان دنوں پٹنہ کی آبادی کا تخمینہ دو لاکھ تھا[1] اور سترھویں صدی کے اوائل میں، احمد آباد کو لندن اور اس کے مضافات کے برابر بتایا گیا تھا[2] ڈھاکہ، راج محل، ملتان اور برہانپور کے ایسے دیگر بڑے شہروں کے متعلق اس قسم کے اشارات نہیں ملتے[3] پھر بھی تھوڑے بہت جو معلومات حاصل ہوتے ہیں، ان سے ملک کی مجموعی آبادی میں شہری آبادی کے ایک بہت بڑے تناسب کی نشاندہی ہوتی ہے اور انیسویں صدی میں شہروں کی آبادی میں غیر معمولی تخفیف کے متعلق جو اطلاعات ہمارے پاس ہیں، ان سے مذکورہ تناسب میں ابھی بالکل قریبی زمانہ تک کسی اضافہ کے واقع ہونے کا امکان نہیں پایا جاتا[4]

---

[1] Manrique 2. ص 146 1671ء میں پٹنہ کے قحط میں وہاں کے صوبیدار کے مرقد پر جس قدر مسلمان دفن کیے گئے۔ ان کی تعداد کے متعلق کوال کی ایک مفصل رپورٹ کی بنیاد پر مارشل کا تخمینہ ہے کہ اس قحط میں یہاں کے کل 90 ، 220 باشندوں کی جانیں تلف ہوئیں۔ اس سے قبل کی، مگر بظاہر معتبر، کوتوال کے چبوترہ کی رپورٹوں میں مرے ہوؤں کو اولاً 135,400 اور پھر 103,000 بتایا گیا ہے۔ Morehed ص 152، 153)ان تعداد سے مینزلق کے تخمینہ کی تائید ہوتی ہے۔

[2] Lett. Recd. 2. ص 28، وتھنگٹن Withington Early Travels 206

[3] سورت شہر کے متعلق جو ہمارے مطالعہ کے جغرافیائی حدود سے باہر ہے بتایا گیا ہے کہ یہاں دو لاکھ انسان رہتے تھے Fryer 1. ص 93)

[4] انگریزی حکومت کی پہلی صدی میں ہندوستانی شہر جس ہولناک تباہی کے شکار ہوئے اور جس کے نتیجہ میں انہیں جو مصائب برداشت کرنے پڑے وہ تجارت کی تاریخ میں شاید ہی اپنا نظیر رکھتے ہوں" دبلکہ یہ مشہور واقعات ہیں جن کی پوری تفصیلات شاید ابھی یکجا نہیں کی گئیں ملاحظہ ہو، آر۔ پی ۔ دت، انڈیا ٹوڈے' India Today) لندن۔ 1940ء ص 124 وما بعد۔ مینزلق کے تخمینہ کے مطابق برطانوی ہند کے سب سے بڑے شہر کلکتہ کی آبادی 1891ء تک آگرہ سے زائد ہو پائی تھی لیکن چونکہ درمیانی مدت میں ہندوستان کی آبادی میں بے حد اضافہ ہوا ہے، لہٰذا کلکتہ اس معاملہ میں مغلوں کی دارالسلطنت سے پھر بھی نسبتاً بہت پیچھے رہا۔ چھوٹے شہروں کی آبادی ابھی موجودہ صدی تک گھٹتی رہی اور 1901ء اور 1931ء کی درمیانی مدت میں کل آبادی میں شہری آبادی کے تناسب کا اضافہ قابل لحاظ رہا۔

دیہی علاقہ کو شہروں کے لیے صرف غذائی سامان ہی نہیں، بلکہ ان کی صنعتوں کے لیے خام مال بھی فراہم کرنا ہوتا تھا۔ بہرحال یہ یاد رہے کہ چونکہ اس امر کی کوئی سند نہیں ملتی کہ دیہات کی کوئی بھی قابل توجہ شہری مضافات پر منحصر نہیں رہتی ہو، لہٰذا شہروں کو وہاں سے صرف وہی خام مال آیا کرتا تھا جس کی پرتکلف سامانوں کی تیاری میں ضرورت رہا کرتی یا وہ جسے شہری آبادی بالآخر خود اپنے استعمال میں لایا کرتی تھی۔ اس کے باوجود مذکورہ خام مال کے علاوہ اتنی کثیر تعداد میں لوگوں کی غذائی ضروریات کا سامان سب ملا کر دیہات کی مجموعی زرعی پیداوار کا یقیناً ایک اچھا خاصہ حصہ ہوا کرتا تھا اور شاید ہی کوئی ایسا گاؤں رہا ہو جو شہری منڈی کی مانگ سے متاثر نہ ہوتا ہو۔

یہ بھی امر یقینی ہے کہ کسی نہ کسی مقدار میں ایسی تجارت ہوا کرتی تھی جسے خالصتہً دیہی کہا جاتا ہے بیشتر نقدی فصل پیدا کرنے والے مواضعات یا علاقوں کو غذائی اجناس کی ضرورت رہا کرتی ہوگی اور نمک، گڑ، تیل اور نیز گھی کے ایسی اشیاء کی تجارت بھی، جن میں تمام مواضعات خود کفیل نہ ہوتے رہے ہوں گے، ضروری ہوا کرتی تھی۔ ایک گشتی اور نسبتاً نیچی ذات کے بیوپاری جو عموماً بے دیپک، اور دوسرے ناموں سے پکارے جاتے تھے، مذکورہ اشیاء کا کاروبار کیا کرتے تھے[1]

چنانچہ اگر کسان کی پیداوار کا بیشتر حصہ، بالآخر بازار ہی میں آتا تھا تو خود اس کے اور اس کی پیداوار کے درمیان تعلق پر تحقیقات قدرتی طور سے واجب ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات، کسان اپنی پیداوار کے اس حصہ کو مالگذاری کے عوض دے دیتا تھا اور ایسی صورت میں رؤسا، یعنی جاگیردار یا ان کے گماشتے ہی ان کی فروخت گی کا لازم انتظار کرتے رہے ہوں گے۔ لیکن بیشتر صوبوں میں

---

[1] ملاحظہ ہو تشریح الاقوام، اوراق [illegible] ب۔ 165 الف۔ اس تصنیف میں دوسرے اور نام جو ملتے ہیں۔ وہ سارتھ باہک، اور، بنجی والا ہیں۔ ابوالفضل، ریمیوں کا حقارت سے ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس کا تعلق میوات کے شہر ریواڑی کے نیچی ذات کے غلہ فروشوں سے تھا اور وہ، دھوسر گھرانہ میں پیدا ہوا تھا جو ہندوستان کے غلہ فروشوں میں سب سے نیچے درجہ کی ذات ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ بڑی عیاری رہے تھی، کے ساتھ سڑکوں پر کھارا نمک (نمک شور) بیچا کرتا تھا۔ اکبرنامہ، ا۔ 337 قوسین میں مندرج فارسی الفاظ ذو معنی ہیں۔ نمک گاؤں کی تجارت کی ایک اہم چیز تھی۔ یہ پنجاب کے نمک کے علاقہ اور سانبھر سے لایا جاتا تھا (آئین اکبری۔ ا، [illegible] Mundy 241 سوجان رائے) 55 - 75) لیکن نونیہ ذات کے لوگ بھی اسے زیادہ مقدار میں شور زمین سے کھود کر نکالا کرتے تھے (تشریح الاقوام، اوراق 334 ب 334 الف)

ضابطہ کی رو سے کسان، لگان ان کی نقد ادائیگی پر مجبور تھا[1] اور ایسے صوبوں پہ کسان کو اپنی پیداوار خود ہی فروخت کرنا ہوتا تھا۔ اس مقصد سے وہ اکثر اپنی پیداوار کو گاڑی پر شہر یا مقامی بازار لے جاتا رہا ہوگا۔[2] بہرحال نیل ایسی اعلیٰ حیثیت کی پیداوار کے لیے اس کے تاجر خود گاؤں میں اسکے پاس پہونچ سکتے تھے[3] لیکن اس کا امکان پایا جاتا ہے کہ کسانوں کی ایک کثیر تعداد کھلی ہوئی منڈیوں تک بالکل نہ پہونچ پاتی تھی، کیونکہ وہ اپنی پیداوار کو اپنے قرض خواہوں کے ہاتھ پہلے سے طے شدہ نرخ پر فروخت کرنے پر مجبور رہا کرتے۔ قرض خواہ، تاجر ہوں یا گاؤں کے مہاجن، کسانوں کو ہمیشہ اسکی پیداوار کم قیمت ادا کیا کرتے تھے۔[4] لیکن جو کسان قرض کے بارے محفوظ رہتے، انہیں بھی پیداوار کی معقول قیمت نہ مل پاتی، کیونکہ ادائے مالگزاری اور نیز اپنے کو زندہ رکھنے کی غرض سے نقد روپیہ کی فوری ضرورت انہیں اپنی پیداوار کو بہ عجلت فروخت کرنے پر مجبور کرتی، جبکہ بیوپاریوں کو معمولاً انتظار کرنے کا موقع حاصل رہا کرتا تھا۔[5] اس کے علاوہ بازار تک کے راستہ میں اور خود بازار میں بھی

---

[1] ملاحظہ ہو باب 6 کی فصل 5

[2] پرگنہ چپلا وغیرہ کے کسان غلّے سے بھری گاڑیوں کو فروخت کرنے کی غرض سے احمدآباد لایا کرتے ہیں۔ (اخبارات (اے 77) ہم 0 165 ء میں ایک سکھیا (پٹیل) کو 1000 گجراتی من غلّہ کی فروختگی کا معاملہ جس میں نے نصف خود اس کا اور بقیہ نصف (اس کے یا) بمطوپا کے قریب کے ایک گاؤں کے دوسرے لوگوں کا تھا، سورت کے انگریزوں سے کرتا ہوا پاتے ہیں۔ بموزہ مقام جوانگی کا ذکر نہیں آیا ہے (Factories 1630-33 صـ 91)

[3] یہ سب علاقہ بیانہ کے متعلق ہے۔ Lett. Recd-6 ، 220 234 5 248 9 Pelsaert 1615

[4] Lett. Recd ، 4 ، 106 ، Pelsaert-16 ، 1628 ءمیں انگریز بیانہ کے قریبی مواضعات سے پیشگی روپیہ ادا کرکے 24 ½ روپیہ فی من کے نرخ پر جبکہ مروجہ نرخ بازاری 36 ½ روپیہ تھا نیل حاصل کرسکے۔ اگر گاؤں کی نیل، بمقابلہ سوداگروں سے حاصل کی ہوئی نیل کے ہری یعنی بھیگی تھی جس کا وزن خشک ہونے ہونے پر کم ہوجاتا ہے، تب بھی نرخوں کا مذکورہ فرق اچھا خاصہ تھا۔ (Factories 1625 9 صـ 208) سورت کے قریب کے کپاس پیدا کرنے والے مواضعات میں سوداگر، انگریزوں کے دلالوں سے سازباز کرکے "متعدد پڑوس کے مواضعات میں پرانا، کرم خوردہ اور ناقص غلّہ دیا کرتے ہیں اور اس کے بدلے میں سوت سے کر انہیں پارسلوں کی شکل میں در سورت لاتے ہیں"۔ (ایضاً 1661-65 صـ 112)

[5] کاشتکاروں سے نیل کی خریداری کے معاملہ میں مقامی سوداگروں کو انگریزوں پر جو فوقیت حاصل تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے طاس رو نے ایسا کہا ہے۔ (Lett. Recd. 220

کسان پر مختلف محصولوں اور بالائی رقوم کی ادائیگی کا بار ہو سکتا تھا۔ بیچنے کے عمل کے دوران پیداوار کے وزن[2] اور قیمت (نقد) کی ادائیگی کے سلسلہ میں بھی غالباً اس کے ساتھ عام طور پر دھوکہ بازی سے کام لیا جاتا تھا۔[3]

---

[1] مثلاً اخبارات (۱-۲) ۲۳۱ میں جس کا حوالہ پہلے آ چکا ہے، اس بات کی شکایت کی گئی ہے کہ تیلدر سے غلّہ لانے والے کاشتکاروں کو احمد آباد کے (گرد) نواح کے فوجدار کے مامور کردہ ناکہ داروں اور چوکیدار کو بحساب دو روپیہ فی گاڑی بطور محصول راہداری ادا کرنا ہوتا تھا۔ مرآۃ۔ ا 260-64 میں ایک فرمان بجریہ ۵ ۹ جلوس عالمگیری لگا ہے جس میں گجرات میں اس نوعیت کے متعدد محصولوں کی جبری وصولی کو منع کیا گیا ہے، مثلاً بیلوں کو کھلانے کے لیے جب وہ باہر سے شہر میں گاڑی کھینچنے یا بوجھ ڈھونے کے سلسلہ میں داخل ہوں ایک ٹکہ کی فیس، ان گاڑیوں پر جو گھاس یا بھوسہ لاد کر لائیں، تانبہ کا ایک سکہ، لاایندھن سے لدی گاڑیوں سے ۵ سیر ایندھن اور ہر بیل کے بوجھ پر اثنائے راہ میں متعدد مقامات پر 4 بادام۔ "اس کے علاوہ غربا اور کسان ہر طرح کے مویشی شہر اور اس کے مضافات میں انہیں واپس لے جانا مقصود ہوتا تو دوبارہ روانگی کے نام پر کچھ ادا کرنا ہوتا تھا۔ پٹن میں کیلوں اور گنوں کی ہر گاڑی پر 4 یا 5 روپیہ عائد کیے جاتے تھے، وغیرہ۔

[2] Pelsaert 16-17 میں بیان کیا گیا ہے کہ نیل کے کاروبار میں یہ طریقہ اختیار کر کے کیونکہ کسانوں سے 40 کے بجائے 47 سیر یا اس سے بھی زائد لیا جاتا تھا۔ وہ بہرحال لکھتا ہے کہ ان کی پیداوار کی مانگ بڑھ جانے کی وجہ سے کسان ہوشیار ہوتا جا رہا ہے ہندوستانی بازاروں میں فروختگی کے وقت مال کی وزن کشی کا کام ہوتا تھا ایک تیسرا فریق انجام دیتا ہے جسے بیا یا کیال کہتے ہیں (موازنہ ہو Elliot, Memoirs & c (i) 236) یہ شخص اپنا نذرانہ دونوں طرف سے وصول کرتا ہے لیکن عام طور پر اس کی سازش تاجر سے رہتی ہے چاہے وہ خریدار ہو یا بیچنے والا ہو (موازنہ ہو Royal Agricultural Report 16.46 (9-388) و کے ایک پروانہ میں اس عہدہ کی حیثیت کا بیان ہے۔ گوکل کی منڈی یا غلہ بازار کی بیائی اس وقت گوشائیں تیجمل داس کے گماشتوں کے سپرد تھی۔ ایک شخص مسمی ناتھا اس عہدہ پر اپنی تقرری کے لیے حکام کو 173 روپیہ سالانہ ادا کرنے پر رضامند تھا۔ اس شکایت پر کہ ناتھا اس عہدہ کا اس لیے خواہش مند تھا کہ وہ دوسرے سوداگروں کو خارج کر کے پوری منڈی کا اجارہ دار بن جائے، اس کی درخواست مسترد کی گئی (جھویری، دستاویز نمبر ۹) آئین اکبری۔ ا۔ ص 301 میں کیالی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ غالباً اس محصول سے وزن کرنے والے کا نذرانہ نہیں بلکہ وہ رقم مراد ہے جو اس استحقاق کے لیے اسے افسران کو ادا کرنا ہوتا تھا۔

[3] Tavenier ۔ا 24-25۔

آخر میں اجارہ داری اور ذخیرہ اندوزی یعنی احتکار کی لعنت تھی، جسے یکساں طور پر معلمین اخلاق نے مذموم[1] اور قانون نے ممنوع قرار دیا تھا۔[2] ذخیرہ اندوزی کے تھوڑے ہی لوگوں کے اندر محدود رہنے کی صورت کسان کے لیے نہیں بلکہ شہری آبادی کے لیے ضرر رساں تھی۔[3] مگر اکثر مقامی حکام اجارہ داری قائم کرنے کے خیال سے کسانوں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ اپنی پیداوار ایک منفرد خریدار یا خریداروں کے ایک مخصوص گروہ کے علاوہ کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کریں۔ یہ صورت کسان کے لیے بھی نقصان دہ ہوا کرتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نوع کی مقامی اجارہ داری کی صورت عام تھی۔ پھر بھی چونکہ اسے[4] دربار شاہی میں ناپسند کرتے تھے، لہٰذا امکان ہے کہ اس کا رواج عموماً ایک خاص حد سے تجاوز نہ کرتا رہا ہوگا۔

[1] آئین اکبری ۔ا۔ ص 291 میں اسے رذیل پیشہ بتایا گیا ہے۔

[2] انشائے ابوالفضل ص 65، مرآۃ ۔ا۔ ص 70-167، آئین اکبری ۔ا۔ ص 294

[3] ایسی غیر سرکاری یا کلیتہً تجارتی اجارہ داریاں قلت کے حالات میں آسانی سے قائم ہو جایا کرتی تھیں۔ چنانچہ 1657ء میں جب خلاف توقع علاقۂ آگرہ میں فصل بہ افراط پیدا ہو گئی تو کہا جاتا ہے کہ "بہت سے صرافوں اور دوسرے لوگوں نے پچھلے برسوں کے منافع کی شیرینی کی طمع میں شکر، غلّہ اور کپاس کی کثیر تعداد جمع کر لی تھی اور انہیں اپنے لگائے ہوئے سرمایہ کا ایک تہائی بھی بدقت ہی مل سکا۔" (Factories 1655-60، ص 118)

[4] گجرات کے دیوان کے نام ۸ جلوس عالمگیری کے ایک فرمان میں ان طریقوں کو ممنوعات کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ "۱۳ صوبۂ مذکور کے بیشتر پرگنوں کے افسران، سیٹھ (سوداگر)، دیسائی (مکھیا) دوسروں کو غلّہ کی مٹی پیداوار نہیں خریدنے دیتے۔ وہ پہلے خود خریداری کرتے ہیں اور جس قدر ناقص اور سڑا ہوتا ہے اسے کاروبار کرنے والے (بیوپاریوں) کو بہ جبر سپرد کر دیتے ہیں اور انہیں مجبور کرتے ہیں کہ اس کی قیمت (اچھے) غلّہ کے پورے نرخ پر ادا کریں۔ 23،000 احمد آباد اور اس کے مضافات اور صوبۂ مذکور کے پرگنوں میں کچھ لوگوں نے چاول کی خرید و فروخت پر اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ ان کی اجازت کے بغیر کوئی خرید و فروخت نہیں کر سکتا اس وجہ سے گجرات میں چاول گراں ہو گیا ہے۔" (مرآۃ ۔ا۔ ص 260،62) 1647ء میں احمد آباد کے انگریز گماشتوں کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ شائستہ خاں صوبیدار "یہاں کا بلا شرکت غیرے اکیلا تاجر بننے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اگر وہ نیل کا ذخیرہ جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر "ہمیں توقع رکھنی چاہیے کہ ہم کو اپنا مکھن اور چاول تک اسی سے حاصل کرنا ہوگا" (Factories 1646-50، ص 130) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت اشیا اجارہ داری کے دائرہ میں شامل کی گئی تھیں۔ ممکن ہے اورنگ زیب کے ابتدائی عہد میں (باقی صفحۂ آئندہ پر)

پھر بھی 1633ء میں شاہی اجازت اور منظوری سے تین سال کی مدت کے لیے نیل کی اجارہ داری جس کے حدود کار میں پوری مملکت شامل تھی قائم کی گئی، لیکن یہ دوسرے ہی سال ختم کر دی گئی جس کی وجہ یہ تھی جو شائد کم اہم نہ رہی ہو کہ "بہت سے کاشتکاروں نے (جو عموماً ضدی اور ناقبت اندیش تھے) احتجاجاً اپنے پودھوں کو جڑوں سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔"[1]

کسان پر قرض اور متعدد محصولوں کا بار، منڈیوں کی بدعنوانیاں اور اجارہ داری کا عائد کیا جانا، ان سب نے مل کر ثانوی منڈی میں مروجہ قیمتوں اور کسان کو ادا کی جانے والی قیمتوں کے فرق کو ضرور زیادہ کر دیا ہوگا۔ پھر بھی عموماً ان دونوں قیمتوں کے درمیان کوئی نہ کوئی تناسب ضرور قائم رہتا ہوگا۔ جب قیمتوں کا فرق زیادہ ہو جایا کرتا تو ثانوی منڈیوں کے تاجروں اور خریداروں کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ کسان سے براہ راست اپنی خریداریاں کریں[2] اور ایسی صورت میں

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) جب قلت کے حالات پیدا ہوتے تو اجارہ داری کے رجحان نے شدت اختیار کر لی شائستہ خاں نے اپنے تجارتی کاروبار کو بعد میں بنگال میں پھیلایا۔ اس کے قصیدہ خواں کا بیان ہے کہ شائستہ خاں کے آنے کے پہلے "اس صوبہ کے افسران بیشتر غذا، کپڑا اور دیگر تمام تجارتی اشیا و سامان (کی تجارت) کے اجارہ دار بنے ہوئے تھے اور اپنی من مانی قیمتوں پر انہیں فروخت کیا کرتے تھے۔ اس جلیل القدر سپہ سالار نے جو انصاف اور جود و سخا کا منبع تھا، اس ذلیل طریقہ پر عمل نہ کرتے ہوئے حکم جاری کیا کہ جو بھی چاہے خرید و فروخت کر سکتا ہے۔" (فتحیہ عبریہ ورق 127 ب) اس حکم پر حقیقتاً کس قدر عمل ہوا اس کا اندازہ ایک دوسرے ہمعصر مشاہد کے بیان کئے ہوئے حالات سے کیا جا سکتا ہے۔ نواب (شائستہ خاں) کے افسران لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور وہ بیشتر اشیا حتیٰ کہ ایسی کمتر چیزیں بھی جیسے جانوروں کے گھاس، بیت، ایندھن، پھوس وغیرہ اپنی اجارہ داری میں لے لیتے ہیں اور نہ ہی انہیں لوگوں پر جو تاجر پیشہ ہیں خواہ ملکی یا غیر ملکی ظلم کرنے میں دریغ ہوتا ہے۔" (Master 2، 80)

1. Factories 1630-33، ص 5-324 میں زیر حوالہ کسان صوبۂ آگرہ کے ہیں۔ ولندیزی اور انگریز دونوں متحدہ طور پر اجارہ داری کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے لیکن جلد ہی دونوں اس موقف سے ہٹ گئے (ایضاً 1630-33، ص 8-327، 1634-36، ص 12 اور 1)۔ اجارہ داری کا سلسلہ گجرات میں بھی قائم کیا گیا لیکن وہاں دوبارہ آزاد تجارت کے قائم ہونے کا حوالہ، ایضاً 1634-36، ص 70، 142 میں ملتا ہے۔

2. ایسا آگرہ میں نیل کی تجارت سے واضح ہوتا ہے۔ یہاں غیر ملکی سوداگروں کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ خواہ مقامی تاجر سے یا کاشتکار سے خریدیں Pelsaert 16/15۔ خاص طور پر ملاحظہ ہو، جب عہد عالمگیری کے اوائل میں دہلی میں غلہ کی بعد قلت ہوئی تو "شہرہ باشندے مواضعات میں، جہاں غلہ بچا تھا، جمع ہونے لگے (عالمگیر نامہ ص 611)

دیکھا جاتا تھا کہ کسان موقع سے فائدہ اٹھا کر فوراً اپنی قیمتوں کو بڑھا دیتا ہے[1]۔ حقیقتاً ہم یہ دیکھتے ہیں کہ منڈی کی مانگ پورا کرنے کے لیے کاشتکار پوری بلکہ بے تحاشہ طور پر کوشش کرتا تھا، مثلاً گجرات کے کسانوں نے 1630-32 کے بڑے قحط کے بعد غذائی اجناس کی قیمتوں میں زیادہ اضافہ کی طرف راغب ہو کر کپاس کی جگہ غلّہ کی کاشت شروع کر دی تھی[2]۔ اسی طور پر اس صدی کی پانچویں دہائی میں جب سندھ کی نیل کی تجارت زوال پذیر ہوئی تو اسی لحاظ سے وہاں اس کی کاشت کم ہو گئی[3]۔ اس امر کی واضح ترین مثال کہ کسان ہر اس چیز کی کاشت پر جو اس کے زیادہ نفع بخش ہوا کرتی کیونکر مستعد رہا کرتا، تمباکو کی کاشت میں تیز رفتاری کے ساتھ توسیع سے فراہم ہوتی ہے۔ اس توسیع کو دیکھ کر ایک ہمعصر مصنف نے ایسا محسوس کیا کہ گویا کسان منڈی میں اس کی مانگ کا پہلے سے اندازہ کر لیتا تھا[4]۔

فصل 3۔ زرعی قیمتوں میں تبدیلیاں

پس کسان کے لیے منڈی کی قیمتوں کے رجحان کی اہمیت خود ہی واضح ہے۔ بہرحال، متعلقہ شہادتوں پر غور کرنے سے قبل بطور احتیاط کچھ باتیں تحریر کر دینا بے موقع نہ ہوگا۔ زرعی قیمتیں موسم اور فصل کی حالت کے مطابق بہت زیادہ تبدیل ہوا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ، مختلف خطّوں کی مروّجہ قیمتوں میں بھی بے حد فرق ہوا کرتا۔ یہ حقائق، ہماری موجود مختصر شہادتوں کے

---

1. جیسا کہ نواح آگرہ کے نیل کے علاقہ میں ملاحظہ ہو۔ Pelsaert 16، Lett. Reed. 6، 35، 2، 249۔

2. "جس (یعنی غلّہ کی گرانی) نے دیہات کے لوگوں کو بلاشبہ ان راہوں پر لگا دیا جو ان کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش تھیں۔ پس انہوں نے کپاس کی کاشت کو ختم کر دیا، جو اب پہلے کی طرح نفع بخش نہ رہ گئی تھی، کیونکہ کاریگر، یا دستکار زیادہ تعداد میں یا تو مر گئے یا بھاگ گئے تھے۔" (Factories 1634-36، 64)

3. مشرق وسطیٰ میں سہوان کے نیل کی مانگ میں کمی نے "اس کے تیاری کے علاقے میں اس کی قیمت کو اس قدر گرا دیا ہے کہ اس کے کاشتکار تقریباً فقیر ہو گئے ہیں۔ چنانچہ سال بہ سال اس کی تیاری کی مقدار کم ہوتی جا رہی ہے" (Factories 1642-45، 136)

4. سوجان رائے، 454۔ کسانوں کے منڈی کی مانگ کے مطابق عمل کرنے کے عام رجحان کے سلسلہ میں، ملاحظہ ہو نیز مورلینڈ Akbar to Aurangzeb، 190-92۔

بیشتر حصہ کی قدر و قیمت کو بے حد کم کر دیتے ہیں پھر بھی، ایسی صورت میں کہ مندرجہ قیمتیں معمول کی فصل کے برسوں کی ہوں، تقابلی جائزہ کا کام کیا جا سکتا ہے۔ اسی طور پر ہمیں لمبے فاصلوں کے تجارتی نظم کے اپنے جائزہ کے سلسلہ میں بعض صوبوں کی چند اہم اشیاء کی قیمتوں کی اضافی سطحوں کے متعلق تھوڑی معلومات حاصل ہو چکی ہیں اور ان کی مدد سے بین العلاقائی موازنہ کا عمل بھی ایک سرسری اندازہ لگانے میں کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔

زیر مطالعہ عہد کی قیمتوں کی اب تک مفصل ترین محفوظ فہرست آئین اکبری میں ملتی ہے۔ ابوالفضل کی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ یہ وہ قیمتیں ہیں جنہیں شاہی دربار میں معمول کی قیمتیں تصور کرتے تھے[1] آئین اکبری کی تحریر کے دوران چند برسوں کے لیے شاہی دربار کا مرکز لاہور منتقل ہو گیا تھا۔ لیکن انہیں اس شہر کی مروّجہ قیمتیں خیال کرنا غلط ہوگا، کیونکہ ہمیں دیگر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ شاہی دربار کی منتقلی کی وجہ سے پنجاب میں زرعی پیداواروں کے نرخ بہت چڑھ گئے تھے[2] لہٰذا آئین اکبری میں مندرج قیمتوں کے متعلق اس کا امکان پایا جاتا ہے کہ وہ لاہور کی عام قیمتوں سے زیادہ رہی ہوں۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ قیمتیں ملک کے دوسرے دارالسلطنت آگرہ کی قیمتوں کا کسی قدر میں بھی اشاریہ تھیں کیونکہ ہمارے پاس ان دونوں شہروں کی قیمتوں کے اضافی سطح کے متعلق کوئی اطلاع نہیں۔ بظاہر ان دونوں شہروں کے درمیان غلّہ کی باضابطہ تجارت نہ تھی مگر ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ بمقابلہ لاہور کے آگرہ میں عام طور پر قیمتیں کم رہی ہوں گی، کیونکہ یہاں

---

[1] ابوالفضل قیمتوں کی فہرست کو اس دیباچہ سے شروع کرتا ہے۔ "آئین نرخ اجناس۔ حالانکہ فوجوں کے کوچ اور بارش وغیرہ کے دنوں میں ان قیمتوں میں بے حد تفاوت ہو جاتا ہے پھر بھی جستجو کرنے والوں کی اطلاع کے لیے (لفظاً چند) درمیانی قیمتیں درج کی جاتی ہیں۔" (آئین اکبری۔ ا۔ ص60) بقول مورلینڈ JRAS 1917، ص815 اور ما بعد، یہ وہ قیمتیں ہیں جنہیں میر بکاول (شاہی مطبخ کا داروغہ) مزدوری سامانوں کی خریداری کے لیے معقول تصور کرتا اور انہیں اختیار کرتا۔ لیکن یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ میر بکاول دور دور سے جہاں بھی بہترین سامان ملتا، خرید اکرتا تھا (آئین اکبری۔ ا۔ ص53) میر بکاول ان خریداروں کے لیے جو قیمتیں ادا کرتا، وہ شاہی دربار کے سفر سے متاثر نہ ہوا کرتیں۔ لیکن قدرتی طور پر ایسی صورت شاہی کیمپ کے بازار میں ہوتی رہی ہوگی، جہاں سے فوجی اور شاہی دربار کے دیگر ہمراہی خریداریاں کرتے تھے۔ [2] اکبرنامہ: 3، ص741۔

مشرقی صوبوں سے براہ دریا رستے غلّہ کو درآمد کیا جا سکتا ہے۔ آگرہ و لاہور دونوں شہروں کے لیے عہد زیر مطالعہ کے اواخر کے متعلق غذائی اجناس کی قیمتوں کے متعلق کچھ معلومات ہمارے پاس موجود ہیں اور ان کا آئین اکبری میں مندرج قیمتوں سے موازنہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔ 1670ء کی فصل ربیع بظاہر بہت اچھی ہوئی تھی اور مارچ 1670ء یا اس کے لگ بھگ آگرہ کی قیمتوں کی خاص طور پر اطلاع شاہی دربار کو بھیجی گئی تھی جس پر ایک وقائع نگار نے اپنے زیادہ اطمینان کو قلم بند کیا ہے[1] لاہور کے متعلق اطلاعات کم اطمینان بخش ہیں۔ یہاں کی قیمتیں جنوری 1702ء کی ایک تحریر میں ملتی ہیں جن کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ یہ شاہدرہ (لاہور) کے مطالبہ منڈی کے رجسٹر سے ماخوذ ہیں[2] لیکن ہمارے پاس اس سال کے فصل کی عام حالت کو معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ذیل کے گوشوارہ میں مذکورہ تینوں ذرائع کی قابل موازنہ قیمتیں ساتھ ساتھ درج کی گئی ہیں۔ ان میں ضروری تبدیلیاں کر کے قیمتوں کو مقدار روپیہ فی من شاہجہانی معیّن کیا گیا ہے[3]

	آئین اکبری	1670ء آگرہ	1702ء لاہور
گیہوں	40 ر 0	14 ر 1	14 ر 1
سکھداس چاول	33 ر 3	86 ر 2	00 ر 2
چنا	27 ر 0	95 ر 0	00
گھی	50 ر 3	00 ر 10	00
مونگ	60 ر 0	00	00 ر 1
موٹھ	40 ر 0	00	00 ر 1

پس اچھی فصل کے باوجود، 1670ء میں آگرہ کی قیمتیں اکبر کی درباری قیمتوں کے

---

[1] آثر عالمگیری ص 98 ر Add 19,495 ورق 54 ب) کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ جن قیمتوں کی اطلاع ملی وہ غیر معمولی طور پر ارزاں خیال کی گئی تھیں "داروغہ امور خانہ داری (بیوتات) نے دارالسلطنت اکبر آباد (آگرہ) میں غلّہ کی قیمتوں سے بادشاہ کو مطلع کیا جس سے سب کو ظاہری و باطنی مسرت حاصل ہوئی اور ان کی دین و دنیا معمور ہوئی! (قیمتوں کا اندراج) مخلوق نے دعا کے بربط پر شکر کے ترانے گائے۔"

[2] خلاصۃ السیاق، ورق 90 الف۔ب۔ Or. 2026 اوراق 57 الف۔ 59 الف میں۔

[3] یہ ضمیمہ جات 'ب' اور 'ج' سے اخذ کردہ نتائج کے مفروضہ پر معین کی گئی ہیں۔

مقابلہ میں عام طور پر تین گنا تھیں اور 1702ء میں لاہور کی قیمتوں کی بھی تقریباً یہی صورت تھی سکھداس چاول کی قیمت مستثنیات میں ہے۔ علاوہ اس امر کے کہ یہ چاول کی ایک اعلیٰ قسم تھی جس کی مانگ محدود تھی، یہ بھی ممکن ہے کہ آئین اکبری میں مندرج سکھداس چاول کے نام سے بعد کے دنوں میں اس سے کوئی کمتر درجہ کا چاول موسوم ہوگیا ہو۔[1]

اس کے علاوہ بعض دوسرے اشارات سے بھی مندرجہ بالا اشیاء میں سے کم از کم دو کی قیمتوں میں اضافہ کی تائید ہوتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ گجرات میں گیہوں کی قلت تھی جو جزوی طور پر آگرہ سے پوری ہوتی تھی۔ لہٰذا بمقابلہ آگرہ کے گجرات میں گیہوں ضرور گراں رہا ہوگا۔ ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ 1630ء - 320ء کے قحط کے تیل گجرات میں عام طور پر گیہوں 79. 0روپیہ فی من شاہجہانی کے مساوی نرخ پر فروخت ہوا کرتا تھا۔[2] یہ قیمت آئین اکبری میں مندرج قیمت کا تقریباً دوگنا ہے۔ لیکن زیادہ قابل غور یہ امر ہے کہ 1670ء میں آگرہ کے گیہوں کی قیمت سے یہ ایک ثلث کم ہے برخلاف اس کے 57. 16ء میں صوبۂ بہار میں جو اپنے غلہ کی ارزانی کے لیے مشہور تھا[3] اور جہاں سے غلہ آگرہ کو برآمد کیا جاتا تھا، گیہوں کا نرخ 50. 0روپیہ تھا۔[4] یہ نرخ آئین اکبری کے نرخ سے ¼ گنا زیادہ تھا۔ اس تقابل کی توجیہہ صرف اس صورت میں ہوسکتی ہے جب ہم یہ تسلیم کرلیں کہ عہد اکبری اور عہد عالمگیری کے درمیان گیہوں کے نرخوں میں اچھا خاصہ اضافہ ہوا تھا۔ گھی کی قیمتوں میں عام اضافہ کے سلسلہ میں بھی اسی قسم کا ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے۔ بھکر مویشیوں کی پیداوار کے لیے مشہور تھا

---

[1] اب سکھداس نام کے چاول کا پتہ نہیں چلتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کا نام تبدیل ہوگیا ہے اس کی خصوصیات کے لیے ملاحظہ ہو سوجان رائے۔ ا۔

[2] اکتوبر 1611ء میں انگریزوں نے صورت میں گیہوں 1336 ا روپیہ فی من شاہجہانی کے مماثل نرخ پر خریدا تھا۔ (Twist, Mr. Moreland, JIH 16 - ص 60 - Lett. Recd. ا - ص 41) مورلینڈ کے قول کے مطابق یہ خریداری خسارہ کے ساتھ ایک جہاز کے لیے مال کے ایسے وقت میں کی گئی تھی جبکہ گیہوں کا نرخ انتہائی گراں رہا ہوگا (Akbar to Aurangzeb 171) فروری 1616ء میں بنتم جانے والے ایک جہاز پر جو غلہ لاد لیا گیا تھا اس کے بیجک میں 91ء کا مساوی نرخ درج تھا (Factories 1616 و 61)

[3] موازنہ بہ اکلات طیبات، 30 الف جس میں اس کا بنگال کے ساتھ جوڑ معلوم ہوتا ہے۔

[4] دستور العمل عالمگیری، اوراق 57 الف - ب 59 ب۔

اور یہاں سے گھی دوسرے مقامات کو برآمد کیا جاتا تھا۔ اس لئے اس کی قیمت بمقابلہ دیگر مقامات کے یہاں بہت کم رہی ہوگی۔ یہ 1639ء میں 33 ر 5 روپیہ بتائی جاتی ہے[1] اور حالانکہ بعد میں دوسرے خطوں کی جو قیمتیں دی گئی ہیں ان سب میں بہار کو چھوڑ کر[2] یہ سب سے کم ہے۔ پھر بھی اس کا آئین اکبری میں مندرج نرخ 50 ر 3 اور سورت کے 1611ء کے 83 ر 3 سے موازنہ کیا جا سکتا ہے[3]۔

انگریزوں کے اس دور کے تجارتی کاغذات میں شکر کے نرخ کا اکثر حوالہ ملتا ہے، لہٰذا اس کے نشیب و فراز کا قدرے تفصیلی جائزہ مناسب ہوگا۔ ایک انتہائی صاف کی ہوئی مصنوع جسے 'نبات' کہتے تھے اور لال شکر کے علاوہ آئین اکبری میں دو اور مختلف اقسام یعنی قند سفید اور سفید دسفوف کی ہوئی) شکر (شکر سفید) کے نرخ بھی بمقدار روپیہ فی من شاہجہانی، علی الترتیب، 33 ر 7 اور 27 ر 4 درج ہیں[4]۔ 1615ء میں شکر سفید کا نرخ "آگرہ اور لاہور کے درمیان"

---

[1] Factories 1637-41، ورق 136۔

[2] دستور العمل عالمگیری، 59 ب۔ بہار کے دودھ کی بہ اعتبار عمدگی و ارزانی، آئین اکبری، ا، 416 میں تعریف کی گئی ہے۔

[3] Lett. Recd. ، 141 ۔ بھیم سین کو اپنی ضعیف العمری میں یاد آیا کہ 1658ء میں یعنی اپنی سرگذشت لکھنے کے 50 برس قبل "گیہوں اور چنے کے قسم کے غذائی غلے $2\frac{1}{2}$ من فی روپیہ اور جوار، بجری $3\frac{1}{2}$ من فی روپیہ کے نرخ پر فروخت ہوا کرتی تھی۔" وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ عہد عالمگیری کے دوسرے پرنس (1659-60ء) دکن میں گیہوں اور چنے کا عام 2 من فی روپیہ تھا۔ (دلکشا، اوراق 25 ب۔ 20 ب) لیکن یا تو اسے سہو ہوئی یا یہ ارزانی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہی۔ خوش قسمتی سے مئی 1661ء میں اورنگ آباد کی منڈی کے مروجہ نرخوں کی ایک سرکاری رپورٹ موجود ہے۔ اس رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت گیہوں کا نرخ $\frac{3}{4}$ من فی روپیہ اور چنے کا ایک من سے تھوڑا کم تھا۔ جوار کی ایک من سے قدرے زائد اور بجری ایک من سے قدرے کم فی روپیہ تھی۔ رپورٹ مذکور میں گڑ کا نرخ 20 سیر فی روپیہ اور گھی کا 4 سیر بیان کیا گیا ہے۔ یہ بھیم سین کے نرخوں کے مطابق ہے، حالانکہ رپورٹ میں یہ نرخ صرف سب سے گھٹیا درجہ کے مال کا دیا گیا ہے (وقائع دکن، 37-44) موازنہ بذیر سرکار رام گیر کا نرخنامہ 1666ء، دفتر دیوانی وغیرہ، 171-5۔ وقائع دکن، 75-77۔ غلہ کی قیمتیں وقائع اجمیر، صفحہ 19، 148، 143، 599، 703 (21-24، جلوس عالمگیری) میں بھی درج ہیں۔ مگر چونکہ اس صوبہ کے پہلے کے اعداد و شمار موجود نہیں ہیں، لہٰذا یہ اطلاع ہمارے موجودہ مقصد کے لیے کارآمد نہیں۔

[4] آئین اکبری، ا، 63

صرف 75ر2 روپیہ سے لے کر 30ر3 روپیہ تک تھا[1] مگر لاہور میں 1639ء میں قند سفید کا نرخ 00ر11 سے کم نہ تھا اور بہترین دسفوف کی ہوئی (شکر) 00ر7 روپیہ اور اس کے کمتر درجہ کی 75ر5 روپیہ اور 00ر6 روپیہ کے نرخ پر ملتی تھی[2]۔ 1646ء میں آخر الذکر کی ایک بہت اچھے قسم کا نرخ آگرہ میں 00ر6 تھا[3] اور 1651ء میں بتایا گیا ہے کہ اس کی قیمت 00ر6 سے زائد نہ تھی[4]۔ چنانچہ اوائل سترھویں صدی میں مملکت کے وسطی خطوں میں شکر کے نرخ میں بقدر 40 فیصدی یا اس سے بھی زائد اضافہ ہوا۔ گجرات میں بھی یہی عمل نسبتاً زیادہ نمایاں طور پر دیکھا جاتا تھا۔ اس صوبہ میں آگرہ سے زیادہ مقدار میں شکر درآمد ہوتی تھی، لہٰذا یہاں اس کے نرخ کا زیادہ گراں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اس کے باوجود 1613ء میں احمد آباد میں سفوف کا نرخ صرف 44ر4 تھا[5] اور ٹیری، جس کی واقفیت گجرات اور مالوہ تک محدود تھی (1616-19ء) اس بنیاد پر کہ اس کے معمول کی قیمت 93ر4 تھی حساب لگاتا ہے[6]۔ لیکن 1622ء میں شکر کی قیمت کو 11ر9 کے مساوی بتاتے ہوئے اسے بیحد گراں کہا گیا ہے[7]۔ اس کے بعد اس کا نرخ 1628ء اور 1630ء میں 8 اور 9 روپیہ کے درمیان چلتا رہا[8]۔ بمقام صورت 1619ء میں اس کا نرخ 11ر7 یا 00ر8 تھا[9] لیکن 1635ء میں قحط

---

[1] Steel and Crowther Purchas ص 269 میرا خیال ہے کہ چالیس کا بڑا من جس میں قیمتیں درج ہیں، من جہانگیری ہے نہ کہ من اکبری۔ اگر اب بھی شکر کے کاروبار میں، من اکبری ہی مستعمل تھا، تو یہ نرخ من شاہجہانی میں تحویل کئے جانے پر 33ر3 سے لے کر 66ر3 روپیہ تک فی من رہے ہوں گے۔

[2] Factories 1637-41 ص 135

[3] ایضاً۔ 1646-50ء ص 62۔

[4] ایضاً۔ 1651-54ء ص 52

[5] Lett. Recd ص 6-305

[6] Terry Early Travels ص 296 (شکر) محصول معاف کرنے کے بعد 2 پنس کی ایک پونڈ یا کچھ کم مل سکتی ہے۔ وہ معمولاً ایک روپیہ کو 2 شلنگ 6 پنس کے مساوی شمار کرتا ہے۔ (ایضاً 284، 302)۔

[7] Factories 1622-23ء ص 109

[8] ایضاً۔ 1624-29ء ص 321 1630-33ء ص 61

[9] Factories 1618-21ء ص 102۔ جب تک یہ حوالہ قند کی شکر کے متعلق نہ ہو۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کے بعد یہ 77 روپیہ ہوگیا[1] اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں نے اس کی براہِ راست آگرہ سے خریداری میں اضافہ کیا لیکن انہوں نے بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ بہترین صورت اسے بنگال سے منگانے کی ہے[2] جہاں یہ ارزاں ترین اور سب جگہوں سے زیادہ مقدار میں دستیاب ہوسکتی تھی اور وہیں سے یہ آگرہ بھی آیا کرتی تھی۔ بنگال کی شکر کے مندرجہ نرخ 1650ء، 1659ء اور 1683ء کے متعلق موجود ہیں جو 4 روپیہ سے لے کر 5 روپیہ تک ہیں[3] پس بنگال میں بھی اس کی اس وقت تک قیمت بڑھ کر وہی گئی جو صدی کے اوائل میں وسطی خطوں اور گجرات میں تھی۔

آخر میں، نیل کی قیمتوں کے متعلق کچھ تحریر کیا جاتا ہے۔ جس کے متعلق ہماری اطلاعات نسبتاً سب سے زیادہ مکمل ہیں۔ مورلینڈ نے سرکھیج کی قیمتوں کی شہادتوں کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد دعویٰ کیا ہے کہ اس کی قیمتوں میں اضافہ کے کوئی خاص آثار نہیں ملتے[4] سرکھیج کی نیل کی پیداوار کا بہت زیادہ انحصار یورپی تجارت پر تھا اور ممکن ہے اس کی مانگ میں شدید کمی نے جواب

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

سورت کے متعلق جو نرخ Factories 6-ص 280 میں درج ہے وہ ناممکن ہوگا 1617ء کے پہلے کی مدت کے لیے اس کا حساب 14/00 سے لے کر 17/00 تک لگایا گیا ہے۔ سورت میں شکر مذکور کا نرخ 1616ء میں 17/24 روپیہ تھا (ایضاً 4 ص 299)

[1] Factorien 1634-36ء ص 177

[2] موازنہ Akbar to Aurangzeb ص 139

[3] Factorles 1641-50ء ص 137-8، 1655-60ء ص 297 ہجز Hedges 1، ص 75

1650ء میں سب سے کم نرخ جس کی اطلاع ملتی ہے 75ر2 ہوسکتی ہے بشرطیکہ ایک گانٹھ کا وزن 2 من جہانگیری نہیں بلکہ 2 من شاہجہانی رہا ہو (ضمیمہ ب ملاحظہ ہو) یہ بھی اطلاع ملتی ہے کہ برسات کے دنوں میں نرخ بڑھ کر 11 یا 12 روپیہ فی گانٹھ تک ہو جایا کرتا تھا۔ لندن کی کمیٹی نے 1658ء میں جو مراسے مدراس روانہ کیے تھے ان میں بنگلی میں شکر کے بیجک میں 11 شلنگ فی گانٹھ کا، لیکن مدراس میں 28 شلنگ فی گانٹھ کا حوالہ ملتا ہے۔ شبہ ہوتا ہے کہ مدراس کے گماشتوں نے کمپنی کے ساتھ کھلا ہوا فریب کیا تھا (Factories 1655 ص 179) لیکن جہاں تک اوّل الذکر مد کا تعلق ہے، یہ غلط معلوم ہوتی ہے اور غالباً شبہ کو صحت پر فوقیت دی گئی ہے۔

[4] Akbar to Aurangzeb ص 160-64

مغربی ہند کی کاشت سے پوری ہونے لگی تھی اس کی قیمتوں کو ایک بڑھتے ہوئے اضافہ سے روکا ہو
بیانہ کی نیل کے معاملہ میں یہ مسئلہ نسبتاً بہت ہی کم اہم تھا اور تعجب ہے کہ مور لینڈ نے اپنی تحقیقات
کے دائرہ میں نیل کی اس قسم کے قیمتوں کی تاریخ کو شامل نہ کیا۔ ان کی تفصیلات کو جو بیشتر انگریزی
تجارت کاغذات سے تلاش کر کے جمع کیا گیا ہے، ایک فٹ نوٹ میں درج کیا جا سکتا ہے[1] اور حقیقتاً

[1] ان اطلاعات کو گوشوارہ کی شکل میں درج کرنے کے قبل یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ اس پورے دور میں آگرہ میں نیل کا کاروبار اکبری من میں ہوتا تھا، لہٰذا قیمتیں معمولاً اسی من میں دی گئی ہیں۔ کسی دوسرے وزن میں قیمتیں درج ہونے کی صورت میں، انہیں موازنہ کی سہولیت کے خاطر روپیہ فی من اکبری میں تحویل کر دیا گیا ہے۔ اگر نیل خاص علاقہ بیانہ کے علاوہ کہیں اور کی پیداوار ہے یا اگر قیمت مندرجہ سودت یا سوالی میں سپردگی مال کی شرط کے ساتھ ہے تو اسے بھی واضح کر دیا گیا ہے۔

سنہ	روپیہ فی من	نوعیت	ماخذ
			آئین اکبری، مخطوطہ Add 76 52
96 - 1595	10 تا 16	معمول	6555، 5646 وغیرہ)
			Blochman .I 442 میں 10 تا 12 فی من درج ہے۔
1609	16 تا 24	معمول	Lett. Recd. 1 - 28 -
"	25	ادا کی ہوئی	"
1614	31	ادا کی ہوئی (سورت؟)	ایضاً - 2 - 194
15 - 1614	34 ، 36	مذکور (نرخ جاریہ)	" - 3 - 70_49
1616	27 ، 38	"	" - 4 - 397
1616	35	"	" - 4 - 397، 339
"	29 تا 33	ادا کی ہوئی	" - 4 - 339
"	36 ، 38	آگرہ کی مستقل قیمت	" " "
"	36. ، 37	ادا کی ہوئی۔ سورت	" - 5 - 110
1617	28 تا 36 اوسط $33\frac{1}{4}$	ادا کی ہوئی	" - 6 - 234، 245-6، 249

(باقی صفحہ آئندہ پر)

یہ شہادت بجائے خود اس قدر واضح ہے کہ اس پر زیادہ تبصرہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ یہ تسلیم کہ گوشوارہ کے خط قیمت میں بے حد نشیب و فراز ملتا ہے، لیکن ایک ایسی فصل کی قیمتوں کے

(باقی صفحہ گذشتہ)

1618	55	مفروضہ	6-284 ص 5.1662 Factories
5 - 1626	28 تا 32	مذکور (نرخ جاریہ)	65 ص، 29-1624 ف
1626	50	معمول	پلسارٹ 15
1627	$55\frac{5}{4}$ تا 55	ادا کی ہوئی	189 ص، 29-1624 ف
〃	55 تا $58\frac{1}{2}$ ، 50	〃	208 ص 〃
28 1627	$53\frac{1}{2}$ تا 55	〃	228 ص 〃 〃
29 - 1628	36 و 37	〃	335 ص 〃 〃
1630	58	〃	131 ص 35-1630 〃
1635	61	ادا کی ہوئی۔ اجارہ دار کی قیمت	2·1 ص، 36-1634 〃
34 - 1636	2 ، 62	〃	12 ص
36 - 1638	45 تا 56	ادا کی ہوئی	206 ص 〃 〃
1639	46	تخمینہ سوالی (سواحلی)	192 ص 41-1637 〃
1640	40 اور زائد	ادا کی ہوئی	278 ص 〃 〃
1643	52 اور کم	〃	186 ص 5-1642 〃
44 - 1643	26 تا $31\frac{1}{2}$	〃	202 ص 〃 〃
45 - 1644	37 تا 40	〃	254 ص 〃 〃
1645	35	کوڑیہ	304 ص 〃 〃
46 - 1645	40	ادا کی ہوئی	33 ص، 50-1646 〃
1646	43	متوقع	62 ص 〃 〃
47 - 1646	45 اور زائد	مذکور (نرخ جاریہ)	114 ص 〃 〃
48 - 1647	$40\frac{5}{4}$ تا $42\frac{5}{4}$	ادا کی ہوئی	202 ص 〃 〃
1648	42	نصف خشک مذکور (نرخ جاریہ) 〃	219 ص 〃

(باقی صفحہ آئندہ پر)

آگرہ و جڑھاؤ پر جو قدرت کے رحم و کرم پر منحصر ہو[1] اور جس کی کاشت بیشتر دور دور کی منڈیوں

(باقی صفحہ گذشتہ)

1648	5/8 42	ہندوَن۔مذکور (نرخ جاریہ)	ت 50-1646	219/ص
"	37 و 38	روآب۔ادا کی ہوئی	" "	"
49 - 1648	46 تا 40	مذکور (نرخ جاریہ)	" "	
1648	38 و 35	"	" "	276/ص
1650	47 اور زائد	ہندوَن۔مذکور (نرخ جاریہ)	" 54-1651	9/ص
"	46	"	" "	51/ص
1651	5/4 45	خورجہ مذکور (نرخ جاریہ)	" "	302/ص
1655	38 و 52	خورجہ۔ادا کی ہوئی	" 60-1655	18/ص
66 - 1655	35	ہندوَن۔مذکور (نرخ جاریہ)	" "	65/ص
1658	38	ادا کی ہوئی	" "	155/ص
64 1,665	1/2 10	مذکور (نرخ جاریہ) سورت	" 64-1661	320/ص
1666-	4/5 97	ادا کی ہوئی۔سورت	" 67-1665	5/ص
1667	58	مذکور (نرخ جاریہ) سورت	" 69-1668	5/ص
1668	51	ادا کی ہوئی	" 69-168	7-6/ص
70 - 1669	55	متوقع۔سورت (غالباً)	" "	194/ص

اگر 1669 ۔70 ء کی قیمت کے ساتھ سورت میں سپردگی مال کی شرط ہے تو آگرہ کی قیمت 47 روپیہ فی من سے کم نہ رہی ہوگی۔ اس امر سے کہ 1651 ء میں آگرہ سے احمد آباد تک بوجھ سے لدے ہوتے ایک اونٹ کی اجرت 15 روپیہ 3 یعنی تقریباً 2/1 روپیہ فی من اکبری تھی (Factories 1651-52 ، 52/ص) یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ آگرہ اور سورت کے درمیان مال ڈھونے کا خرچ 2 تا 5 روپیہ فی من سے زیادہ نہ رہا ہوگا۔ اس کے علاوہ اس راستہ پر انگریزوں کے تمام مال راہداری کے محصول سے مستثنیٰ تھے (ایضاً (تتبع مابعد) 1665-67 ، 266/ص) لیکن انہیں خود اپنے آبخشوں کو 10 فیصدی بطور دلالی ادا کرنا ہوتا تھا (ایضاً 1669-9 ، 7/ص) بقول Tavernier ، 72/ص بیانہ کی نیل کے لیے خریدار کو عموماً 36 روپیہ فی من تک ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس کا ہندوستان کا تجربہ 1640 ء اور 1667 ء کی درمیانی مدت کا تھا لیکن اس اثنا میں اس نے آگرہ کا صرف دو بار 1640-43 ء اور 1665 - 67 ء میں سفر کیا تھا۔ اس سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا مذکورہ بیان بعد کے برسوں کے متعلق نہ رہا ہوگا بلکہ غالباً اس کو اپنے پہلے سفر کے وقت جو مروجہ قیمتیں تھیں وہی یاد رہی ہوں گی۔ بدقسمتی سے 1669 - 70 ء کے بعد کی قیمتوں کا انگریزوں کے مطبوعہ کاغذات سے پتہ چلانا ممکن نہیں۔

[1] موازنہ ہو Pelsaert -13.

کے خیال سے کی جاتی ہو ہمیں تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ پھر بھی اس پورے اتار چڑھاؤ میں قیمتوں کا قطعی طور پر ایک مسلسل اور اکثر تیز رفتار اضافہ بالکل واضح ہے۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ صدی کی چھٹی دہائی میں، جب یورپی مانگ میں تخفیف ہونا شروع ہو گئی، تب بھی یہ اضافہ قائم رہا۔ جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے 70-1667ء نیل کی افراط پیداوار کا سال تھا اور اس وقت بیانہ کی نیل "کافی ارزاں" بتائی گئی تھی لیکن متوقع قیمت، ابو الفضل کی بتائی ہوئی انتہائی قیمت کی تقریباً 3 گنی اور 1609ء میں معمول کی قیمت کی انتہائی مقررہ سطح کی دوگنی تھی۔

پس اس امر میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ عہد زیر مطالعہ میں زرعی پیداوار کی قیمتوں میں معتد بہ اضافہ ہوا۔ اس امر کی تحقیقات کہ آیا اس اضافہ کا تعلق اس دور میں بیش قیمت دھاتوں کی اضافی قیمتوں سے قائم کیا جا سکتا ہے یا نہیں، ہمارے موجودہ مطالعہ کے حدود سے باہر ہے لیکن یہ مسئلہ اس قدر اہم اور اس وقت تک اس کی جس قدر چھان بین ہوئی ہے وہ اس درجہ ناکافی ہے کہ[1] حکومت مغلیہ کے معیاری سکہ یعنی چاندی کے روپیہ کی بمقدار سونا و تانبہ قیمت کے تفصیلی جائزہ کے لیے تصنیف ہذا کے ضمیمہ ج میں گنجائش نکالی گئی ہے۔ یہ دیکھا جائے گا کہ مذکورہ دونوں دھاتوں کی نسبت سے روپیہ کی قیمت میں عمومی تخفیف کی تقریباً بے پناہ شہادتیں موجود ہیں۔ لہٰذا، اس تخفیف کی مفصل تحقیق کی جا سکتی ہے۔ مثلاً دور آئین اکبری میں اگر قیمتوں کی سطح کو بمقدار چاندی 100 کے عدد سے ظاہر کیا جائے تو صدی کی تیسری دہائی میں یہ بڑھ کر 150 سے اوپر پہونچ گئی ہوگی اسکے بعد چھٹی اور ساتویں دہائی میں یہ مزید بڑھ کر تقریباً 178 اور 276 کے درمیان میں ہو گئی۔ اس کے بعد صدی کے ختم ہوتے ہوتے یہ قدرے گھٹ کر 145 اور 200 کے درمیان آ گئی۔ یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ گو کہ زرعی قیمتوں کے اعداد و شمار چاندی کی اس بعد کی بحالی کی تائید نہیں کرتے، پھر بھی زرعی قیمتوں اور چاندی کی قیمتوں کے رجحانات کی ابتدائی مطابقت حیرت انگیز ہے صدی کی تیسری دہائی میں روپیہ کی قیمت میں تخفیف کو مثلاً اسی دہائی میں شکر کی قیمت کے اضافہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ روپیہ کی قیمت میں دوسری بڑی تخفیف کی تصدیق 1669-70ء

[1] مورلینڈ اپنی تصنیف Akbar to Aurangzeb صفحہ 183-185 میں بمقدار چاندی، تانبہ کی قیمت میں اضافہ کا ذکر کرتا ہے لیکن سونے کے متعلق اسے یقین نہیں (صفحہ 182-3) ہودی والا نے مغل نیوس میٹکس (Mughal Numismatics) صفحہ 245-52 سونے کی قیمت میں بھی بے حد اضافہ کے متعلق کچھ شہادتیں یکجا کی ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی بھی تحقیق ہمارے مقصد کے لیے کافی مفصل ہیں۔

میں غذائی اجناس اور نیل کی قیمتوں سے ہوتی ہے۔

زرعی تجارت کے اپنے اس جائزہ میں ہم نے اس بات پر زور دیا ہے کہ حالانکہ مواضعات کا دارومدار شہروں کی پیداواروں پر نہ تھا، لیکن مواضعات کی پیداوار کا بیشتر حصہ شہروں کے مصرف میں آجاتا تھا۔ یہ صورت حال صرف مالگذاری کے بھاری مطالبہ کے باعث تھی۔ جو روپیہ شہر سے دیہات میں غذائی اجناس اور خام مال کی خریداری کے سلسلہ میں پہونچتا تھا وہ مالگزاری کی شکل میں شہر کو دوبارہ واپس آجاتا تھا اور جب مالگزاری جنس کی شکل میں وصول ہوتی تو اسے شہر کی ضرورت کے تحت محض گاڑیوں کے ذریعہ وہاں پہونچادیتے۔ زرعی قیمتوں میں اضافہ کی صورت میں جو رقم فاضل نکلتی تھی اسے صرف شہری مصنوعات کی قیمتوں میں اضافہ کرکے پورا نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ ان مصنوعات کی دیہاتوں میں مانگ نہ تھی۔ یہ فرق صرف مالگذاری زمین کو بڑھاکر پورا کیا جاسکتا تھا (باب ۸ کی فصل ۱، اور باب ۹ کی فصل ۲ میں ہم دیکھیں گے کہ مالگذاری میں یہ اضافہ واقعتہً کیونکر ہوتا تھا) چونکہ کاشتکار کی پیداواری بچت کا بہت بڑا حصہ مالگذاری ادا کرنے میں صرف ہوتا تھا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ زرعی قیمتوں میں اضافہ سے اسے جو کچھ بھی منفعت حاصل ہوسکتی تھی وہ مالگذاری میں اضافہ کرکے برابر کردی جاتی تھی۔

باب 3

کسانوں کی زندگی کے حالات

فصل - ا - عام کیفیت

عہد جہانگیری میں ایک ولندیزی مشاہد کے قول کے مطابق "عوام اس قدر غیر معمولی اور مصیبت انگیز افلاس" میں زندگی بسر کرتے تھے کہ "ان کی زندگی کو صحیح طور پر غایت درجہ کی تنگی کے مسکن اور المناک مصائب کے قیامگاہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے"[1] زیر مطالعہ عہد کے کسان کے مصرف اور ضرورت کی اشیاء کا اگر احاطہ کیا جائے تو وہ حقیقتاً زندگی کی چند ناگزیر ضروریات تک محدود رہے گا۔ یہ ایک ایسا مستند قول ہے جس سے ہمعصروں کو غالباً بلا تامل اتفاق ہوتا[2]

---

[1] Pelsaert 40

[2] بھیم سین سوال کرتا ہے کہ جنوبی ہندوستان کے بےشمار مندر جن میں سے بعض دنیا میں بے نظیر ہیں کیونکر تعمیر ہوئے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ اس لیے تعمیر ہوئے کہ وہاں کی زمین انتہائی زرخیز اور باشندوں کی معاشی ضروریات بہت ہی محدود ہیں۔ چنانچہ راجاؤں نے اس افراط بچت کو مندروں کی تعمیر پر صرف کیا۔ اوّل تو اس لیے کہ اس بچت کا اس سے بہتر کوئی دوسرا مصرف نہ تھا، دوسرے یہ کہ خود ان کے مذہبی رجحانات کا بھی یہ تقاضہ تھا۔ (دلکشا اوراق 112 ب 113 ب) پس وہ قیاس کرتا ہے کہ کسان کی قوت لایموت کے بقدر چھوڑ کر اسکی پیداوار کا بقیہ تمام حصہ معمولاً حکمران کا حق تھا۔ عام لوگوں کے متعلق شیواجی کا بیان ہے کہ "روپیہ پیسہ ان کے لیے زحمت کا سبب ہے۔ انہیں صرف کھانا اور سر تن چھپانے کے لیے چیتھڑا دیدو کافی ہے۔" (Freyer 2. ص 62)

بیحد افسوس کی بات ہے کہ اس دور کے مصنفین نے ایسے اہم موضوع پر کہ کسان کے ذاتی مصرف میں آنے والے غلہ کی مقدار کس قدر تھی کافی روشنی نہیں ڈالی ہے۔ لیکن جہاں تک ان کی عام غذاؤں کے اقسام کا تعلق ہے، حالات قدرے بہتر ہیں۔ چونکہ بنگال، اڑیسہ، سندھ و کشمیر کی خاص پیداوار (چاول) حاصل تھی اس لیے قدرتی طور پر توقع کی جاتی ہے کہ وہاں کے لوگوں کی خاص غذا بھی رہی ہوگی[1] جبکہ گجرات میں جوار اور باجرہ کو بھی مقام حاصل رہا ہوگا۔[2] لیکن عمومی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسان اپنی پیداوار میں سب سے معمولی درجہ کے اقسام کو اپنے گھر والوں کے لیے بچا پاتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کشمیر کے عوام جس چاول کو استعمال کرتے تھے وہ بہت بڑا ہوتا تھا[3] اور بہار میں "غریب لوگ" مٹر کی طرح کا ایک اناج یعنی کساری جس سے بیماری پیدا ہوتی تھی کھانے پر مجبور تھے۔[4] باوجودیکہ علاقہ آگرہ۔ دہلی میں بہترین گیہوں پیدا ہوتا تھا، لیکن یہ یہاں کے "عوام کی غذا" کا جزو نہ تھا۔ بلکہ یہاں کے لوگ چاول، باجرہ اور دالیں کھاتے تھے۔[5] اسی طرح

---

[1] بنگال کے لیے، آئینِ اکبری۔ ا۔ ص 389، Fitch: Ryby، Early Travels 28، Bernier 438
اڑیسہ کے لیے، آئینِ اکبری۔ ا۔ ص 391 سندھ کے لیے، ایضاً 556 اور کشمیر کے لیے ایضاً۔ 564

[2] آئینِ اکبری۔ ا۔ ص 485 حالانکہ Fryer .2۔ ص 119، ہندوستان کے لیے عمومی طور پر یہ کہتا ہے کہ "ابلا چاول۔ نچھانی (رگی کے قسم کا باجرہ) باجرہ اور (زیادہ قلت کی صورت میں) گھاس کی جڑیں معمولی لوگوں کی غذا ہے۔" لیکن غالباً اس سے مقصود صرف گجرات اور مغربی ساحلی علاقے ہیں۔

[3] تزکِ جہانگیری۔ 300

[4] آئینِ اکبری۔ ا۔ ص 416

[5] J.Xavier ترجمہ Hoster JASB N.S.، 23، 1927 ص 121 Bernier 283 Pelsaert 60 - 61 خصوصی طور پر آگرہ کے کاریگروں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "انہیں اپنے یک رنگ کھانے کے لیے تھوڑی کھچڑی کے علاوہ (متن میں Kitchery درج ہے) جو ہری دال (موتھ) اور چاول ملا کر بنتی ہے، اور کچھ میسر نہیں ہوتا۔ جسے وہ صرف شام کو مکھن (یعنی گھی۔ مترجم) ملا کر کھاتے ہیں اور دن میں وہ صرف تھوڑی سی بھنی ہوئی دال یا کوئی غلہ چبا لیتے ہیں جس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ ان کے دبلے پیٹوں کے لیے کافی ہے"۔ اغلباً کسان کی غذا بھی ایسی ہی رہی ہوگی۔ حیرت ہے کہ ہمارے ماخذ سے کوئی بھی جو کا ذکر نہیں کرتا جو عام طور پر ضرور استعمال ہوتا رہا ہوگا۔ آئینِ اکبری۔ ا۔ ص 60 میں اس کی قیمت معمولی چنے کے مساوی بتائی گئی ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے کہ مالوہ میں برآمد کیے جانے کے لیے گیہوں کافی ہوتا تھا، مگر اس کے باوجود بقول ٹیری جو اس علاقہ کا خصوصی تجربہ رکھتا تھا "معمولی قسم کے لوگ" گیہوں نہیں بلکہ ایک نسبتاً "موٹے غلہ (غالباً جوار) کا آٹا استعمال کرتے تھے"[1]

عام طور پر غذائی غلوں کے ساتھ چند ترکاری یا کھانے کی سبزی کا بھی اضافہ کر لیا جاتا تھا[2] بنگال، اڑیسہ، سندھ اور کشمیر کے ایسے صوبوں میں مچھلی عوام کی غذا میں شامل تھی[3] کسان کو گوشت (ذبیحہ گاؤ اور سور پالنے کے متعلق) مذہبی بندشوں اور نیز غربت کے باعث شاذ ہی میسر ہوتا تھا[4]

---

[1] "روغنی (کذا!) صحت بخش اور آسودہ کرنے والا" اور گول، چوڑی اور موٹی چپاتیاں بنا کر" ٹیری وایج ٹو ایسٹ انڈیا (Voyagate Eost India) طبع ثانی، لندن 1777ء ص 87، 199) یہ بیان ٹیری کے رسالہ کے پہلے نسخہ میں جو Early Travels میں دوبارہ طبع ہوا ہے نہیں ملتا۔

[2] Tavornier ص 38، 238 کے بیان کے مطابق سیم اور دیگر ترکاریاں چھوٹے چھوٹے مواضعات میں بھی فروخت ہوا کرتی تھیں۔ بنگال میں "تین یا چار اقسام کی ترکاریاں عام لوگوں کی خاص غذا" میں شامل تھیں Bernier 438) اڑیسہ میں بینگن عام استعمال کی چیز تھی (آئین اکبری۔ ا۔ ص 391) کشمیر میں مختلف قسم کی ترکاریاں" استعمال ہوتی تھیں (ایضاً۔ 564 تزکِ جہانگیری۔ 300)

[3] آئین اکبری۔ ا۔ ص 389، 391، 556، 564۔

[4] بڑے شہروں میں عموماً ایک مسلمان جو بیدار ہوتا ہے اور وہاں بھیڑ، چڑیے اور کبوتر فروخت ہوتے ہیں" لیکن " ان مقامات پر جہاں صرف بنئے 'ہندو' رہتے ہیں" یہ چیزیں نہیں ہوتیں Tavernier ا۔ ص 38) فاس رو، سورت سے برہانپور کا سفر کرتے ہوئے شکایت کرتا ہے کہ باوجودیکہ مواضعات میں "خاص طور سے مویشی بہ افراط تھے" لیکن بنئے "ان کی جان نہیں مارتے اور اسی سبب سے ہمارے ہاتھ فروخت بھی نہیں کرتے" (رو۔ 67) آگرہ کے کاریگر "گوشت کے ذائقہ سے ناآشنا تھے" (Pelsaert) بنگال کے "لوگ نہ تو گوشت کھاتے تھے اور نہ جانور کی جان لیتے تھے" (Early Travels 119 Fitch; Ryley 28) مینرِق کو اڑیسہ میں گاؤں والوں نے تھوڑے فاصلہ پر روک دیا، کیونکہ یہ ان لوگوں میں تھا جو "چڑیے اور گائے و سور کا گوشت بھی کھاتے ہیں" اس کے ساتھیوں کے مور مارنے پر وہاں کے لوگوں کو بے حد غصہ آیا (Manicue 2 ص 105-113) آسام کے لوگوں کو اس قسم کا کوئی پرہیز نہ تھا اور وہ سب کچھ کھاتے تھے (عالمگیر نامہ ص 726 فتحیۂ عبریہ ورق 36 الف

پہلے گذر چکا ہے کہ دورِ مغلیہ میں بمقابلہ اس وقت کے گھی کی پیداوار فی کس زیادہ تھی۔ یہ بات علاوہ دیگر باتوں کے اس امر سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ گھی علاقہ آگرہ[1]، بنگال[2] اور مغربی ہندوستان[3] کے لوگوں کی خاص غذا کا ایک لازمی جزو تھا۔ لیکن آسام کے رہنے والے اس سے بالکل ناآشنا اور اس سے سخت نفرت کرتے تھے[4]۔ کشمیری بھی اپنا کھانا پانی میں پکاتے اور ان کے یہاں اخروٹ کا روغن اور گھی تکلفات میں شمار ہوا کرتا تھا[5]۔

بقول ٹیورنیر "چھوٹے مواضعات میں بھی شکر اور دوسری مٹھائیاں، خشک اور سیال دونوں ہی شکلوں میں بہ افراط دستیاب ہو سکتی ہیں[6]"۔ اس قول سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بہر حال مواضعات میں گڑ کا عام استعمال رہا ہوگا۔ نمک کے متعلق، مورلینڈ کا بیان ہے کہ آئین اکبری کی تحریر کے وقت اس کی قیمت بمقدار گندم، بمقابلہ دورِ حاضر کے دوگنی تھی[7]۔ لہٰذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] زیویئر Xavier | حوالہ سابقہ Pelsaert 61

[2] Bernier :438 اور موازنہ Ryby Fitch :19 Early Travels :28 (اس نے یہ بات گھی (گھی مترجم) کے متعلق نہیں بلکہ دودھ کے متعلق کہی ہے۔

[3] Early Travels صفحہ 296 ' طبع ثانی۔ 1777 ' صفحہ 198-9

[4] عالمگیر نامہ صفحہ 726 فتیہ عبریہ ' ورق 36 الف

[5] تزک جہانگیری ' 300 - 301 -

[6] Taverniera I. صفحہ 238 موازنہ ہو نیز Early Travels ' Terry صفحہ 325 جس کے قول کے مطابق سبزی خور ہندو جڑی بوٹیوں، دودھ، گھی، پنیر اور مٹھائیوں پر "اپنی زندگی بسر کرتے ہیں" جو وہ انواع و اقسام کی تیار کر لیتے ہیں"۔ ان بیانات کی روشنی میں، مارلینڈ کی اس رائے پر تعجب ہوتا ہے کہ "ہندوستان میں مٹھائی کا نسبتاً زیادہ استعمال دورِ حاضر کی خصوصیات میں سے ہے" India a.t.d. of Akbar صفحہ 272)

[7] جے، آر، اے، ایس (J R A S) 1918، صفحہ 379 لکھنؤ کی بازار میں مروجہ قیمتوں کو وہ دورِ حاضر کی قیمتیں تصور کرتا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں کانپور کی بازار میں نمک کی قیمت بحوالہ Crooke, North-Western Provinces 272، مارلینڈ کی بتائی ہوئی قیمت کا تقریباً دوگنا اس لیے آئین اکبری کی نسبتی قیمت کے تقریباً مساوی تھی۔ نمک کی قیمت میں کمی کا بظاہر سبب اس کی تیاری کے طریقوں میں کوئی تبدیلی نہیں بلکہ اس کے حمل و نقل کے اخراجات کی کمی ہے۔ سا تجر جیل (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

مقابلہ اس وقت کے نمک کا فی کس خرچ بہت کم رہا ہوگا۔ مثلاً یہ بنگال میں بہت کمیاب اور گراں تھا۔[1] چنانچہ اس کے ایک حصہ اور آسام میں لوگ کیلے کے ڈنٹھل کی راکھ سے نکالی ہوئی ایک کڑوی چیز جس میں نمک کا جز و ہوا کرتا، استعمال کرنے پر مجبور تھے۔[2] کیپسی کم Capsicum یا سرخ مرچ جو ان دنوں ہر کھانے کا ایک لازمی جز و ہے ایک معمولی چیز ہونے کے باوجود بھی ملک میں اس وقت غیر متعارف تھی۔[3] غالباً اس وقت کے کسانوں کی دسترس صرف زیرہ، دھنیا اور ادرک ہی ایسے مسالوں تک تھی۔[4] لیکن لونگ، دار چینی اور سیاہ مرچ کم از کم وسطی خطوں میں بہت گراں تھیں۔[5] ولندیزی کے مشرقی جزائر الہند کی سمندری تجارت پر اجارہ داری کے قیام کے قبل جب لونگ بہت ارزاں تھی تو گاؤں کے لوگ اسے کھانے کے بجائے، اپنے بچوں اور عورتوں کی گردنوں کی زینت کے لیے بطور زیور استعمال کیا کرتے تھے۔[6]

بعض مخصوص موسموں کے دوران، قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کسان، زیادہ عام اقسام کے

(باقی صفحہ گذشتہ)

اور نمک کے علاقہ میں اس کی تیاری کے طریقوں کا بہترین ہمعصر بیان سوجان رائے، 66-75 میں ملتا ہے نونیا کی ذات اور ان کی صنعت کے اب ختم ہو جانے کا بین سبب اس کی قیمتوں میں کمی ہے۔

[1] آئین اکبری۔ ا۔ ص 39

[2] ہفت اقلیم۔ 95۔ فتحیہ عبریہ، ورق 32 ب

[3] باب ا کی فصل، 3 ملاحظہ ہو۔

[4] جیسا کہ آئین اکبری۔ ا۔ ص 65، 66 میں مندرج قیمتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ زیرہ، سیاہ دانہ، ہنکو نجی اور اجوائن، دستوروں میں بھی درج ہیں۔ ادرک کے لیے ملاحظہ ہو نیز Terry, Early Travels 324 اور 1777ء کی طبع ثانی۔ ص 198

[5] قیمتیں آئین اکبری، حوالہ سابقہ میں درج ہیں۔ ٹیری اپنے دوسرے نسخہ (طبع ثانی 1777ء ص 198) میں بتاتا ہے کہ وہاں ادنیٰ درجہ کے لوگ چاول کو ہری ادرک اور تھوڑی سیاہ مرچ کے ساتھ کھاتے ہیں۔

[6] Pelsaert 24-25۔ اس کا یہ کہنا کہ آگرہ میں لونگ 60 سے لے کر 80 روپیہ من کے نرخ پر فروخت ہوتی تھی، اوائل سترھویں صدی کے متعلق ہے۔ اکبری اور جہانگیری اوزان کے فرق کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی یہ نرخ آئین اکبری کے مساوی 60 روپیہ فی من اکبری آتا ہے۔ مورلینڈ کے حساب سے آئین اکبری کا نرخ بمقدار گیہوں، لونگ کے موجودہ نرخ کا 15 گنا ہوتا ہے (J R A S 1918 ص 379)

اور نیز خود درد وپھلوں کو استعمال کرتے رہے ہوں گے[1] گاؤں کے اطراف میں پان کے استعمال کی کوئی خاص اطلاع نہیں ملتی، بلکہ یہ بھی مشتبہ ہے کہ عوام کو اس کا موقع تھا یا نہیں کہ وہ اپنے کو اس کا عادی بنائیں۔ نشہ آور مشروب "تاڑی یا ٹوڈی" کی اطلاع، یورپی سیاح اکثر دیتے ہیں جسے وہ استعمال بھی کرتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کا استعمال ملک کے اندرونی حصوں میں بمقابلہ گجرات کے ساحلی صوبہ کے کم تھا[2]۔ یہ فیصلہ کرنا کہ افیون کس حد تک استعمال میں تھی مشکل ہے۔ بقول ابوالفضل، مالوہ کے "بڑے اور چھوٹے" لوگوں میں بچوں کی افیون کھلا کر سلانے کا رواج مخصوص تھا[3]، جبکہ موجودہ ایام میں یہ رواج پورے ملک میں پھیل چکا ہے۔ عہد زیر مطالعہ کے اختتام تک عوام تمباکو کشی کے عادی ہو چکے تھے۔ بظاہر تو فرائیر، پورے ہندوستان

---

[1] چنانچہ میواڑ کی پہاڑیوں میں کاشت کا کام بہت کم تھا لیکن آم بہ افراط ہوتے تھے۔ یہ دوسری جگہوں کے آم کی طرح میٹھے اور لذیذ نہ ہوتے تھے۔ لیکن (بظاہر فصل کے زمانہ میں) غربا کی یہ خاص غذا رہا کرتی تھی جس سے یہ بیمار بھی پڑ جاتے تھے (بدایونی، ورق 234 ـ 5) بنگال میں زیادہ پھل کھائے جاتے تھے۔ (Fitch4 Ryley Early Travels 119، 20) آسام میں سنترے، اتنے افراط تھے کہ تانبہ کے ایک سکے کے 10 ملتے تھے (فتحیہ عبریہ۔ ورق 26 الف۔ب) ناریل کی صورت بالکل ہی مختلف تھی لیکن وہ علاقے (مثلاً مالابار، موازنہ بہ Tavernier ۔ صـ 197) جہاں کے لوگوں کی یہ خاص غذا تھی بیشتر مملکت مغلیہ کے باہر واقع تھے۔ دور حاضر کا ایک مصنف، اتر پردیش کے دیہاتوں کے ادنیٰ طبقہ کے متعلق بیان کرتا ہے کہ "گاؤں کے آم کی فصل کے علاوہ بہت سے جنگلی پھل اور جڑیں، باوجودیکہ قوت بخش نہیں ہوتیں مگر کھڑی فصل کے کاٹے جانے کے قبل کی تنگی میں ان کی زندگی کا سہارا ہوتی ہیں۔ (کروک، نارتھ ویسٹرن پراونسز (Crooke', North Western Provinces) صـ 274)

[2] گجرات کے لیے ملاحظہ ہو، Finch Early Travels 175، Mundy 33-37، Ovington 3-142 وغیرہ۔ بابر نے چنبل کی وادی میں بیانہ اور دھولپور کے درمیان گاؤں کے لوگوں کو کھجوروں کی شراب نکالتے دیکھا تھا اور وہ اس قسم کی شراب اور نیز تاڑی نکالنے کا طریقہ بھی بیان کرتا ہے۔ (بابرنامہ، ترجمہ بیورج۔ 2۔ صـ 505-9) منڈی نے بنارس کے قریب مگر دریائے گنگا کے جنوب سے گذرتے ہوئے "تاڑی کے بہ افراط درختوں" کو دیکھا جو اس کو آگرہ سے اپنے بیس دن کے سفر میں کہیں نہیں ملے تھے۔ اس کو، بہرحال یہ بتایا گیا تھا کہ ان پیڑوں کو شراب کی غرض سے نہیں بلکہ ان کی پتیوں کے لیے اگاتے تھے جو چٹائی بنانے کے کام آتی تھیں (Mundy 5-124)

[3] آئین اکبری - 1 - صـ 455

کے متعلق عام طور پر کہتا ہے کہ معمولی لوگ "تمباکو کا پائپ" استعمال کرتے ہیں، لیکن حقیقتاً اس کے اس قول کا اطلاق صرف گجرات اور مغربی ساحل کے علاقوں تک محدود ہونا چاہیے[1] جبکہ ہم جانتے ہیں کہ اس وقت تک کورومنڈل کے "غریب لوگوں" نے چروٹ کا استعمال شروع کر دیا تھا[2]۔ سوجان رائے کی ایک مبالغہ آمیز تحریر سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شمالی ہند کے عوام بھی تیزی سے تمباکو پینے کی عادت اختیار کر رہے تھے[3]۔

واقعات مذکورہ بالا کی روشنی میں صحیح موازنہ بہ آسانی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن عمومی طور پر اگر دور حاضر کے کسانوں کے صرف متوسط اور نسبتاً غریب طبقہ پر نظر رکھی جائے تو ان کی غذاؤں میں بہت زیادہ فرق نہ ملے گا۔ دور مغلیہ کے کسان کو گھی زیادہ مقدار میں میسر تھا، جبکہ اس کی موجودہ نسل کے افراد کو زیادہ مقدار میں نمک کے علاوہ تین بالکل نئی چیزیں، مثلاً آلو اور سرخ مرچ حاصل ہیں اور رفاہیت یہی سب کچھ ہے۔

کپڑوں کے معاملہ میں، ہمارے ماخذ مختصراً مگر بے کم و کاست اطلاعات فراہم کرتے ہیں ہندوستان میں بھیرا سے بہار تک کے علاقہ کے متعلق بابر لکھتا ہے کہ "کسان اور نچلے درجہ کے لوگ بالکل ننگے پیر چلتے پھرتے ہیں۔ وہ ایک چیز جسے لنگوٹہ کہتے ہیں یعنی شرمگاہ کا کپڑا، باندھتے ہیں۔ یہ کمرے سے دو بالشت نیچے تک لٹکتا ہے۔ اس لٹکنے والے کپڑے میں بذریعہ گانٹھ پھر ایک دوسرا کپڑا باندھ کر اندر کی طرف سے جانگھوں سے گذرتا ہوا پیچھے باندھ دیا جاتا ہے۔ عورتیں بھی صرف ایک کپڑا (لنگ) باندھتی ہیں جس کا نصف کمر کے چاروں طرف اور بقیہ سر پر پڑا رہتا ہے[4]" بہ الفاظ دیگر مردوں کے لیے محض مختصر ترین دھوتی اور عورتوں کے لیے ایک ساڑی کافی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں پہنتے۔ اسی طور پر اس کے بعد کی صدی میں آگرہ کے ایک انگریز گماشتہ کا بیان ہے کہ "عام

---

[1] Pryer 2: ص 119۔

[2] Bowery ص 97۔

[3] سوجان رائے، 454۔

[4] بابر نامہ، ترجمہ Beveridge ص 519۔ مسز بیورج کے ترجمہ میں دو ایک باتوں سے مطمئن نہیں ہوں چنانچہ پہلے جملے کے الفاظ میں تبدیلی کر کے اس کے آگے ایک فقرہ کا اضافہ کر دیا ہے۔ یہ تبدیلی عبدالرحیم خان خاناں کے معیاری فارسی ترجمہ Or 3714، اوراق 411 ب۔ 412 الف کی بنیاد پر کی گئی ہے۔

قسم کے لوگ اس قدر غریب ہیں کہ ان میں سے بیشتر اپنے تمام جسم کو برہنہ رکھتے ہیں، علاوہ شرمگاہ کے جسے وہ کتان (کپڑا سوت) کے ٹکڑے سے ڈھانک لیتے ہیں۔[1] فنچ، اسی طرح کی بات بنارس کے متعلق بیان کرتے ہوئے یہ بھی کہتا ہے کہ جاڑوں میں اون کے بجائے "لوگ روئی دار لبادہ جو ہمارے یہاں کے گدوں اور روئی دار ٹوپی کی شکل کا ہوتا ہے، پہنتے ہیں۔"[2]

بنگال کے معمولی لوگوں کا لباس اس سے بھی مختصر ہوتا تھا۔ بقول ابوالفضل "مردوں اور عورتوں کی کثیر تعداد ننگی پھرتی ہے اور علاوہ دھوتی (لنگ) کے کچھ نہیں پہنتی"[3] اس سے بھی بڑھ کر اڑیسہ میں "عورتیں اپنے جسم کا کوئی بھی حصہ علاوہ شرمگاہ کے نہیں چھپاتیں اور ان کی ایک کثیر تعداد درختوں کی پتیوں سے اپنے کپڑے تیار کرتی ہے"[4]

---

[1] Lett. Recd. 6، ص 107

[2] Ryley، Early Travels ص 107، 22۔ آگرہ سے سیلبنکے لکھتا ہے کہ "حقیقتاً بسبب اونی سوتی کپڑوں کی ارزانی اور اون کی گرانی کے اس ملک کے لوگ اونی کپڑے بہت شاذ پہنتے ہیں" (Lett. Recd. 6، ص 200) یہ بات ان دونوں بھی کافی حد تک صحیح ہے۔ آئین اکبری۔ ا۔ ص 111 میں اون کی مندرج قیمت بمقدار گندم، موجودہ صدی کے اوائل کی قیمت سے تھوڑی سی زائد تھی (ر J R A S 1918 ص 391، Crooke حوالہ سابقہ 273)

Pelsaert [illegible] آگرہ کے کاریگروں کے گھریلو سامان کے متعلق لکھتا ہے کہ ان کے بستر مختصر ہوتے ہیں صرف ایک چادر یا شامیانہ جو بچھانے اور اوڑھنے دونوں مصرف میں آتی ہے۔ گرمی کے موسم کے لیے تو یہ کافی ہوتی ہیں لیکن شدید سردی کی راتیں ان کے لیے شدید تکلیف کا سبب بنتی ہیں اور وہ لوگ اپنے دروازوں کے باہر تھوڑی آگ سلگا کر اپنے کو گرم رکھتے ہیں۔" یہ بات اس وقت بھی ہندوستان کے دیہاتوں اور قصبوں کے لاکھوں انسانوں کے بارے میں درست ہے۔

[3] آئین اکبری۔ ا۔ 389۔ موازنہ بہ Fitch: Ryley ص 118-9، Early Travels 28

[4] آئین اکبری۔ ا۔ 391۔ موازنہ بہ Bowery ص 208۔ "اور یہ لوگ بہت غریب ہوتے ہیں اور علاوہ لنگی کے اور کچھ نہیں پہنتے یا ایک سفید کپڑا جسے وہ اپنی کمر کے چاروں طرف باندھتے ہیں۔" کہا جاتا ہے کہ آسام میں "پگڑی باندھنے یا لبادہ، تنگ مہری کا پاجامہ یا جوتہ پہننے کا یا بستر پر سونے کا رواج نہ تھا۔ وہ لوگ کرپاسی (چھینٹ) کا ایک ٹکڑا سر پر اور لنگی کمر پر باندھتے ہیں اور شانہ پر ایک لمبا رومال رکھ لیتے ہیں۔ موسم سرما میں بعض دولت مند یعقوب خانی طرز کا نیم جامہ (واسکٹ) پہنتے ہیں (فتحیہ عبریہ، ورق 37 الف) موازنہ بہ عالمگیرنامہ ص 727، Tavernier 2، ص 223

دوسری طرف سندھ میں "گاؤں کے لوگ (میری مراد شہروں کے باہر کے رہنے والوں سے ہے) تقریباً سب انتہائی غیر مہذب ہوتے ہیں اور کمر کے اوپر سے ننگے رہتے ہیں اور ان کے سروں پر پگڑی ہوتی ہے۔"[1] کشمیر میں سوتی کپڑا بالکل نہ پہنا جاتا تھا۔ مرد اور عورتیں سبھی اون کا صرف ایک کپڑا جسے پٹو کہتے ٹخنوں تک پہنتے تھے۔ وہ اسے اپنے جسموں پر تین یا چار سال تک بغیر دھوئے ہوئے، جب تک کہ یہ بالکل چیتھڑا نہ ہو جائے پہنتے رہتے تھے[2]

گجرات میں عورتوں کے لباس کے متعلق بتایا گیا ہے کہ "ایک لنگی جو پٹی کی طرح شانہ پر ڈھیلی باندھی جاتی تھی اور چھوٹی بر جس کی طرح ٹانگوں کے درمیان سلی ہوئی رہتی تھی" اور اس کے علاوہ ایک چھوٹا شلوکہ، بس یہی دو کپڑے ان کی "تمام تر پوشاک ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ بغیر جوتوں اور موزوں کے چلتی پھرتی ہیں۔"[3] گو کہ مغلیہ دکن کے متعلق جو کپاس کی پیداوار کا ایک بڑا علاقہ تھا، کوئی براہ راست سند نہیں ملتی، لیکن اس سلسلہ میں وہاں بھی حالات غالباً اس سے مختلف نہ رہے ہوں گے۔[4] برخلاف اس کے مزید جنوب کے علاقہ گولکنڈہ اور جنوبی ہند میں کپڑے کی قلت نمایاں ہوتی جاتی

---

[1] 216 Withington Early Travels

[2] آئین اکبری ا۔ 564، تزک جہانگیری 301، 35 Pelsaert ۔

[3] 2 Fryer - 116-117 گو کہ نفس مضمون سے یہ بیان "مشرقی ہندوستان" سے متعلق معلوم ہوتا ہے لیکن مصنف کی واقفیت قطعاً گجرات اور مغربی ساحل تک محدود ہے۔

[4] بھیم سین برہانپور کا باشندہ تھا اور اپنی زندگی کے بیشتر حصہ میں وہ اورنگ آباد مقیم رہا۔ مغلیہ اور جنوبی ہندوستان کے عام لباس کے فرق کو آخر الذکر کے متعلق اس کے حقارت آمیز بیان سے سمجھا جا سکتا ہے۔ گولکنڈہ اور بیجاپور کے کرناٹک (یعنی خاص کنارا اور تامل ناڈ) کے بارہ میں اس کا بیان ہے کہ "مرد اپنے سروں پر ایک گندا رومال باندھتے ہیں اور کپڑے کا ایک چھوٹا ٹکڑا (ستر) چھپانے کے لیے اور کپڑے (کرپاس) کی ایک چادر (جو وہ اپنے شانوں پر ڈال لیتے تھے) برسوں کے لیے کافی ہوتی ہے عورتوں اپنی کمر پر تین یا چار ہاتھ لمبا کپڑا لنگ کی طرح باندھتی ہیں اور سر اور سینہ کو ننگا چھوڑ دیتی ہیں۔" (دلکشا، ورق 113 الف) بھیم سین کے اس بیان کو دیگر ہمعصر شہادتوں سے بھی تائید ہوتی ہے مثلاً Ryley: Fitch, Early Travels, Relations 76-77 گولکنڈہ اور کورومنڈل کے لیے Linschoten 1-260-61، کنارا کے لیے Fitch: Bowery 97 Ryley 186, Early Travels 47, Tavernier 1. 97 (باقی صفحہ آئندہ پر)

لہٰذا اس امر میں ذرا شبہ نہیں کہ کپاس کے معاملہ میں فی زمانہ اچھی خاصی تبدیلی ہوئی، حالانکہ اس وقت بھی حالات قابلِ افسوس ہی ہیں۔ بابر کا بیان، مثلاً اس وقت بھی مشرقی اتر پردیش کے بعض حصوں کے متعلق درست ہو سکتا ہے۔ لیکن علاقہ دوآبہ اور پنجاب کے حالات کے بالکل خلاف ہے۔ اسی طور پر بنگال کے مواضعات میں بیحد افلاس کے باوجود، وہاں عورتیں جو ساڑیاں اس وقت پہنتی ہیں، وہ بہرحال اس قدر لمبی ہوتی ہیں کہ وہاں کے موجودہ حالات پر ابوالفضل کا مذکورہ بیان صادق نہیں آتا۔

اس دور کے کسانوں کے گھروں کے متعلق موجودہ معلومات کا ایک طائرانہ جائزہ مناسب ہوگا۔ کہا گیا ہے کہ بنگال کی معمولی جھونپڑی "ہندوستان کے بیشتر علاقوں کی طرح "بہت مختصر اور پھوس سے چھائی ہوئی" ہوتی تھی[1] یہ "دیواروں" پر بلکہ موقع ہی پر کھودی ہوئی مٹی کی کرسی[2] پر بانسوں کو آپس میں باندھ کر بنائی جاتی تھی[3]۔ اڑیسہ میں دیواریں سرکنڈوں کی بنائی جاتی تھیں[4] بہار میں زیادہ تر مکانات کی چھتیں کھپریل کی ہوتی تھیں[5] علاقہ دوآبہ کے کسانوں کی جھونپڑوں کو "مٹی کی دیواروں اور ناقص چھپروں کے چھائے ہوئے خراب مکانات" سے تعبیر کیا گیا ہے[6]

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اور Fryer .I. ص 137-8 کیرل کے لیے Manucci 3 ص 39-41 جنوبی ہند کے لیے عمومی طور پر جزیرہ سالٹ میں "مرد اور عورت دونوں برہنہ رہتے ہیں۔ ایک کپڑے سے اپنی ستر کو اور دوسرے سے سینہ کو چھپاتے ہیں۔ اپنے بازوؤں، پانگوں اور ٹانگوں کو ننگا چھوڑ دیتے ہیں" (Careri 179) ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ کونکن کی عام حالت بھی ایسی ہی رہی ہوگی۔

[1] Fitch: Ryley Early Travels 119, 28.

[2] آئین اکبری I- ص 389

[3] Master 2 ص 92-3 موازنہ بہ امپیریل گزیٹیئر ج 7، 1908، ص 241 تعمیر کا طریقہ بالکل ایسا ہی آج بھی ہے۔ آسام میں "غریب و امیر سب ہی اپنے اپنے گھروں کو لکڑی، بانس اور پھوس سے بناتے ہیں" (عالمگیر نامہ ص 327)

[4] آئین اکبری I- ص 391

[5] ایضاً ص 416

[6] Mundy 72- کول کے اطراف کا خصوصی طور پر ذکر کرتا ہے۔ وہ کسانوں کو (باقی صفحہ آئندہ پر)

اطلاع ہے کہ دریائے سندھ کے کناروں پر آباد مواضعات میں "مکانات لکڑی اور پھوس کے" ہوتے تھے جو ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیے جاسکتے ہیں[1] صوبۂ اجمیر میں "عوام خیمہ کی شکل کی بانس کی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں[2]" سرونج (مالوہ) کے اطراف میں کسان چھوٹی، گول جھونپڑیوں" یعنی تنگ، تاریک اور تکلیف دہ گھروں" میں رہا کرتے تھے[3] گجرات میں مکانات کی چھتیں ٹائیلوں (کھپریلوں) کی ہوا کرتیں اور وہ اکثر اینٹ و چونے کے بنے ہوتے[4] لیکن خاندیش اور بیدر میں بھی جھونپڑیاں مٹی کی دیواروں اور پھوس کے چھپروں کی ہوتی تھیں[5] ان مناظر سے ہم (ان دنوں بھی) مانوس ہیں اور یہ واضح ہوتا ہے کہ پچھلے تین برسوں کے دوران کسانوں کے رہائشی حالات میں کوئی بھی تبدیلی، اچھی خواہ بری نہیں واقع ہوئی ہے۔ ان دنوں کی طرح اب بھی جھونپڑیاں یعنی کسی تعمیری فن کے ایسی ہی سامانوں سے جو سب سے زیادہ سہل الحصول ہوں۔ بنائی جاتی ہیں۔ پس ایک علاقہ اور دوسرے علاقہ میں جو فرق پایا جاتا ہے اس کا تقریبًا تمام تر سبب سامان مستعملہ اور آب و ہوا و مٹی کا فرق ہوتا ہے۔

کسانوں کے جھونپڑوں میں ہمعصر مشاہدین کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے کوئی چیز نہ تھی۔ "پانی رکھنے اور کھانا پکانے کے چند مٹی کے برتنوں اور ایک مرد کے لیے اور دوسرا عورت کے لیے کل دو بستروں (یعنی کھاٹ) کے علاوہ فرنیچر کے قسم کی کوئی چیز وہاں نہ ہوتی تھی۔"[6] حالانکہ

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

(گنوار) اور 'مزدور' کہتا ہے۔ (اس کے آخر الذکر لفظ کے استعمال کے لیے ایضًا ص 90 بھی ملاحظہ ہو آگرہ کے کاریگر بھی "مٹی کے بنے ہوئے مکانات میں جن میں پھوس کے چھپر ہوا کرتے تھے (Pelsaert 61)

[1] آئین اکبری۔1۔ ص 550 سوجان رائے، 64۔

[2] آئین اکبری۔1۔ ص 505 Mundy (249) کے بیان کے مطابق مارواڑ کے گاؤں میں "ہر گھر از خود کھڑا ہوا معلوم ہوتا جیسے ہمارے کھیتوں میں غلّہ کے گول شکل کا ڈھیر مگر نہ تو اتنا بڑا اور نہ اتنا اونچا۔

[3] Monserrate 21۔

[4] آئین اکبری ۔1۔ 485 ۔ جب منڈی نے احمد آباد جاتے وقت کو ہ ابو کو پیچھے چھوڑا تو اس نے دیکھا کہ کھپریل کی چھتوں کے گھر اب شروع ہو گئے (ص 258۔)

[5] Fitch: Ryley Early Travels 94 - 95، رو 16

[6] Pelsaert 61

یہ بات آگرہ کے کاریگروں کے متعلق کہی گئی ہے مگر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ عام طور پر کسانوں کا اثاثہ اس سے بہتر رہا ہوگا۔ ٹیری کی شہادت کی بنیاد پر گھریلو سامانوں کی اس مختصر فہرست میں "لوہے کے چھوٹے چولہوں کا اضافہ کیا جاسکتا ہے جس پر" عوام" اپنی روٹی سینکتے تھے[1] بتایا جاتا کہ جنوبی ہند میں "درخت کا ایک پتہ یا تانبہ کا ایک چھوٹا پلیٹ ان کے لیے تشتری کا کام کرتا ہے، جس میں گھر کے تمام افراد کھانا کھاتے ہیں۔"[2] بقول لنشاٹن کنارا کے کسان " ایک ٹونٹی دار تانبہ کے برتن میں عام طور پر پیتے ہیں۔ اور ان کے گھروں میں دھات کی مقدار صرف اسی قدر ہوتی ہے۔"[3] چونکہ تانبہ کی بڑی کھانیں شمالی ہند میں واقع تھیں، لہٰذا یہ گمان غالب ہے کہ مملکت مغلیہ کے کسانوں کے مصرف میں یہ دھات نسبتاً کچھ زیادہ رہی ہوگی۔ لیکن تانبہ کی قیمت جو آئین اکبری میں درج ہے وہ بمقدار گندم، اس کی 1914 کی قیمت سے پانچ گنا تھی[4] پلسارٹ کے کھانا پکانے کے سلسلہ میں بھی محض مٹی کے برتن کے حوالہ کا یہی سبب ہے۔ حقیقتاً پچھلی صدی کے اوائل تک وسطی علاقوں کے کسان مٹی کے برتنوں کو" تقریباً عام طور پر" استعمال کرتے تھے اور محض اس کے بعد ہی "پتیل اور دوسری دھاتوں (کے برتن) کا ان کی جگہ کلیتاً استعمال شروع ہوا۔"[5] کھاٹوں کے علاوہ، غالباً ان کے گھروں میں کوئی اور لکڑی کا سامان غالباً بجز ایک نیچے اسٹول کے جسے چوکی کہتے تھے اور جس کا استعمال گاؤں کی معاشرتی روایات میں داخل نہ ہوا کرتا[6] مذکورہ اشیاء میں اگر ٹین کی صندوقوں اور چینا۔ ٹوم جستوں

---

1. Early Travels جلد 296 اس کی مراد اس آہنی پلیٹ سے ہے جسے توا کہتے ہیں اور جس پر چپاتی سینکتے ہیں۔

2. Manucci جلد 3 صفحہ 40۔

3. Linschoten جلد 1 صفحہ 261-2 و 226،

4. لکھنؤ کی بازار میں، J.RAS 1918، صفحہ 281، 2 یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ سترھویں صدی کے دوران ہندوستان میں تانبہ کی پیداوار میں غالباً کمی ہوئی۔

5. مونین کی سٹلمنٹ رپورٹ فار بریلی ڈسٹرکٹ Moen's Settlement Report for Bareilly District صفحہ 55 (جن کا کرک نے حوالہ دیا ہے صفحہ 276) North, Western Provinces موازنہ ہو نیز مورلینڈ India & c. of Akbar صفحہ 215-4

6. بہان (دیر (صوبہ آگرہ کی سرکار ایرچ میں) کے ایک مالی کا قصہ بیان کرتے ہوئے مشتاقی ورق 21 الف کہتا ہے کہ "گاؤں کے لوگ (ہندوستان) کے ایک طبقہ میں رواج ہے کہ جب کوئی مہمان ان کے گھر آتا ہے تو میزبان کی عورت اس کے ہاتھ پیر دھونے کے لیے پانی پیش کرتی اور اس کے سامنے ایک چوکی رکھتی ہے۔"

کا اضافہ کر دیا جائے[1] تو دورِ حاضر کے کسان کے گھریلو اثاثہ کی تصویر مکمل ہو جائے گی[2]۔

جہاں تک زیورات کا تعلق ہے، بچت کی رقم عورتوں کے زیورات کی شکل میں رکھنے کا بظاہر عام رواج تھا اور غیر ملکی سیاح تقریباً ہر جگہ عورتوں میں زیورات کے بکثرت استعمال کو لکھتے ہیں[3] حالانکہ معمولاً زیورات کے متعلق سیاحوں کے بیانات بہت عمومی انداز کے ہیں۔ پھر بھی ان سے اور نیز فرائیر[4] کے ایک مخصوص بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غریبوں کے یہاں جو زیورات استعمال ہوتے تھے وہ تانبہ، شیشہ یا سیپ کے خول[5] یا جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے لونگ بھی ہوتی تھی۔

ہمعصر تذکروں میں مذہبی رسوم، تہواروں اور تیرتھ یاتراؤں کے جو اندراجات محفوظ ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسان کی زندگی میں انہیں، اس وقت بھی وہی اہمیت حاصل تھی جیسا کہ ان دنوں ہے۔ بچوں کی شادیوں، مردوں کے آخری رسوم اور دریا کے کنارے تہواروں کی شرکت کے ایسے مواقع پر کسان کے قلیل سرمایہ کا ایک جزو ضرور خرچ ہو جایا کرتا یا ان اخراجات سے اس پر قرض کے بارے میں اضافہ ہو جاتا تھا[6]۔ ایک ہمعصر ولندیزی شاہد گجرات کے لوگوں کے

---

[1] موازنہ بہ، مورلینڈ، India Sc. of Akbar، 277-8۔

[2] موازنہ بہ، کرک ((Crooke)) حوالہ سابقہ، صفحہ 268، "ایک چھوٹے کسان کے گھر کا فرنیچر گندی اور ٹوٹی کھاٹ، کچھ کھانا پکانے کے پیتل کے برتن، سرخ رنگ کے مٹی کے برتنوں کا ایک ذخیرہ، بچوں کے لیے ایک یا دو تپائی، کپڑے اور دیگر معمولی زیورات رکھنے کے لیے ایک صندوق اور مٹی کا بنا ہوا اناج رکھنے کا کٹھا جس میں گھر کا استعمالی غلہ بھرا جاتا ہے پر مشتمل ہوتا تھا۔"

[3] موازنہ بہ Ryley .Fitch: 107، 109، 118 Early Travels 322، 28 Fryer، 2 صفحہ 117، Ovington، 188۔ وغیرہ۔

[4] "دولت مند عورتوں کے بازو اور پیر سونے و چاندی سے اور غریبوں کے پیتل، شیشہ اور ملاوٹی دھات سے جکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے ناک، کان، پیر کے پنجوں اور انگلیوں میں چھلّے بھی ہوتے ہیں" Fryer، صفحہ 117۔

[5] جیسا کہ اڑیسہ میں (Bowrey 208-9) یہاں مرد بھی اسی طور پر زیورات استعمال کرتے تھے جیسا عورتیں (آئین اکبری۔ ا۔ صفحہ 391)

[6] حکام کو ان تیرتھ یاتراؤں پر جبریہ وصولیوں کا ایک مزید موقع مل جاتا تھا۔ حالانکہ اکبر نے تیرتھ یاترا محصول کو جو "کر" کہلاتا تھا موقوف کر دیا تھا (اکبر نامہ۔ 3۔ 190 آئین اکبری، ا۔ صفحہ 301) لیکن اسے (باقی صفحہ آئندہ پر)

جو ابھی فصل کے دنوں میں اپنی "بچت" کو اپنے "شیطانی تہواروں پر فضول خرچی کے ساتھ پھونک دیتے تھے" جس کی وجہ سے خدا نے اپنے معمول کے مطابق 30-1632ء کا بڑا قحط نازل کرکے' انہیں سزا دی مذمت کرتا ہے[1]

فصل 2 — قحط

ابھی تک ہم نے دور مغلیہ کے کسان کی صرف اس غربت اور خستہ حالی کو دیکھا' جس میں وہ معمول کے برسوں میں مبتلا رہا کرتا۔ پانی برسانے والی ہواؤں کی فیض رسانی جس پر اس کی فصل کا دارومدار ہوا کرتا ہمیشہ یکساں نہ رہتی تھی۔ اگر عین موقع پر بارش نہ ہوئی یا اس قدر زیادہ ہوئی کہ فصل ڈوب گئی تو پھر اس کا سب کچھ برباد ہو جاتا۔ ریلوے کے موجودہ شاندار نظام کی وجہ سے اب بچت کے علاقوں سے غذائی اجناس کو متاثرہ علاقوں میں بہ عجلت منتقل کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ ریلوے کے اس احسان نے حکومت برطانیہ کے کارناموں کی فہرست میں جن کا بانگ دہل دعوٰی کیا جاتا ہے' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک اور مد کا اضافہ کر دیا ہے اور وہ ہے غذائی قحط کے بجائے کام کا قحط۔ اس دعوے سے حقیقتاً ہمارا کوئی تعلق نہیں لیکن چونکہ دور مغلیہ میں قحط کی ہولناکیوں کا حکومت برطانیہ کے تحت آسودہ حالی اور افراط سے جس کی بہت مدح سرائی کی جاتی ہے۔ موازنہ کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں' لہٰذا ایک فٹ نوٹ میں چند واقعات قلم بند کر دیئے گئے ہیں تاکہ

(باقی صفحہ گزشتہ)

خاموشی کے ساتھ دوبارہ عائد کر دیا گیا تھا۔ نگار نامۂ منشی' ورق 77 الف۔ب Bodl. ورق 73۔الف مطبوعہ 76 (ناقص) میں محمد مومن امین کے نام ایک پروانہ ملتا ہے جس میں اس کو "دریائے گنگ کے کنارے جسے ہندوی زبان میں گنگا کہتے ہیں' کثیر تعداد میں ہندوؤں کے اجتماع کے قریب الوقوع ہونے کی جسے وہ ہر چند برسوں کے وقفہ پر پار کرتے ہیں" اور نیز اس امر کی کہ "ایسے مواقع پر سائر کے محال (مال گزاری کے علاوہ دیگر محصولوں) سے کافی آمدنی ہوتی ہے" یاددہانی کرائی گئی ہے۔ چنانچہ پروانۂ مذکور میں راستوں اور پوجا پاٹ کے مقامات کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے تاکہ کوئی بھی شخص محصول کی ادائیگی سے نہ بچ سکے۔ اس کے باوجود "دریائے گنگا میں اشنان کا محصول دور عالمگیری کے ممنوعہ محصولوں کی فہرست میں شامل ہے (ضوابط عالمگیری' ایتھے 415 ورق 10 ب Or. 1641 ورق 136 ب Add. 6595 ورق 109 ب)

[1] Moreland tr. Twist J I H 16 ص 66

اس تقابل کی معقولیت واضح ہو سکے[1]

زیر مطالعہ عہد میں ان آفات کی کثرت اور شدت کا اندازہ قحط اور قلت کی حسب ذیل سرگذشت سے لگایا جاسکتا ہے جو ہمعصر ماخذ سے ترتیب دی گئی ہے۔ یاد رہے کہ اس سرگذشت کے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جاتا اور یقیناً یہ فہرست جیسے جیسے زیادہ شہادتیں فراہم ہوں گے[2] طویل ہوتی جائیگی۔

---

[1] 1630 - 32ء میں گجرات کے قحط کے "ہولناک منظر" نے ونسنٹ اسمتھ کو جو کسی وقت اینگلو انڈین مورخین کی جماعت کا امام تھا اس بات کا موقع فراہم کیا کہ وہ ان دنوں "جبکہ حکومت مغلیہ اپنی عظمت کے انتہائی عروج پر تھی اور فی زمانہ حکومت برطانیہ کے تحت عام زندگی کے حالات کے درمیان بے پایاں فرق" کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرے Oxford History of India, Oxford 1923 ص 394 حالانکہ اس دور جدید کی حکومت نے ہندوستان میں اپنا آغاز ایک ایسے قحط سے کیا جس سے بنگال کی ایک تہائی آبادی ضائع ہوگئی۔ ابتدائی ماخذ کی غلط تعبیر کے بعد اسمتھ اپنے انتہائی غصہ کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ 1630-32ء میں شاہجہاں نے "مالگذاری کی تخفیص کا صرف $\frac{1}{11}$ حصہ" معاف کیا تھا۔ یہ موہوم ظالمانہ کارروائی اور 1769-70ء میں انگریزوں کی دریا دلی قابل موازنہ ہے۔ "ایک ایسے سال میں جب 35 فیصدی کاشتکار موت کا شکار ہوتے تو 5 فیصد مالگذاری بھی معاف نہ کی گئی بلکہ اگلے سال یعنی 1770-71ء میں 10 فیصدی کا اضافہ کیا گیا۔" (ہنٹر، دی اینلس آف رورل بنگال (The Annuals of Rural Bengal) لندن 1897 ص 39) مورلینڈ جو اس نوعیت کے بیانات میں عموماً احتیاط سے کام لیتا ہے فخریہ کہتا ہے کہ دور برطانیہ میں "چیز ایسے علاقوں کو چھوڑ کر جہاں اب بھی رسائی ممکن نہیں، بقیہ تمام ملک سے غذائی قحط کے تخیل ہی کو خارج کر دیا گیا ہے" (Akbar to Aurengzeb ص 210) اس تحریر کے بیس برس بعد ہی 1943 - 44ء میں بنگال میں تقریباً 35 لاکھ انسان فاقہ کشی کا شکار رہے اور دور وسطیٰ کی تمام ہولناکیوں کا ایسے پیمانہ پر اعادہ ہوا جو درحقیقت 'دورِ جدید' ہی کو فریب دیتا ہے۔

مذکورہ امور کی بناء پر ہمیں مغلیہ ہندوستان میں قحط کی دلخراش ہولناکیوں کو کم کر کے بیان کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے اور ڈاکٹر سرن کے صرف ایک واحد عبارت کے چند خطیبانہ اجزاء کی بنا پر ان آفات کے تمام تذکروں کو مبالغہ اور صرف ایک ادبی مشغلہ قرار دینا کوئی زیادہ معقول بات نہ ہوگی۔ (پراونشیل گورنمنٹ آف دی مغلس (Provincial Governments of the Mughals) ص 422 و مابعد)

[2] واضح رہے کہ کورومنڈل کو جہاں قحط معمولات میں داخل تھا مملکت مغلیہ کے حدود سے باہر ہونے کے باعث اس جائزہ میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

زیر مطالعہ دور کا آغاز ایک ہولناک قحط کے ختم ہوتے ہوتے ہوا تھا جو دو مسلسل برسوں تک یعنی 1554 - 55ء اور 1555 - 56ء میں ہندوستان یا "ہند کے تمام مشرقی حصوں" (یعنی بہ استثنائے بنگال اور غالباً بہار) خصوصاً آگرہ، بیانہ اور دہلی کے نواحی علاقوں کو پامال کر چکا تھا۔ لوگ بیک وقت "دس دس، بیس بیس یا اس سے بھی زائد تعداد میں ہلاک ہوئے اور مردوں کو "نہ تو قبر ہی میسر آئی اور نہ کفن۔" "عوام کا گذر صحری کانٹے کے بیجوں، جنگل کی خشک گھاس اور گائے کے چمڑوں پر ہونے لگا۔" بدایونی خود مردم خوری کا عینی شاہد تھا۔ بیشتر متاثرہ علاقہ "ویران ہوا" کاشتکار اور کسان لاپتہ ہوئے اور باغیوں نے مسلم آبادیوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔"[1] ابوالفضل کا دعویٰ ہے کہ یہ قلت غالباً ایک اچھی فصل ہو جانے کے باعث اکبر کے تخت نشین ہونے کے وقت تک رفع ہو گئی تھی۔[2]

گجرات بظاہر صدی کی ساتویں دہائی کے وسط کے دوران، غذا کی شدید قلت سے متاثر ہوا قلت کے ان ایام میں لوگ عام طور پر بچوں کو کوڑیوں کے مول فروخت کرتے تھے۔[3] اگلی دہائی میں 1572 - 73ء یا اس کے لگ بھگ سرہند کے اطراف میں شدید قحط کے پیش آنے کا اشارہ ملتا ہے۔[4] 1574 - 75ء میں گجرات میں دوبارہ شدید قحط مگر اس بار وبائی امراض کے ساتھ ساتھ آیا اور "چھوٹے و بڑے" دونوں ہی طرح کے لوگ کثیر تعداد میں صوبہ سے منتقل ہوئے۔[5] اسی سال

---

[1] بدایونی (1)، صفحہ 9-428؛ اکبر نامہ (2)، صفحہ 35؛ اکبر نامہ میں بھی مردم خوری کا ذکر آیا ہے۔ آئین اکبری 3۔ میں ابوالفضل کی خود نوشت سوانح عمری بھی (رقعات ابوالفضل۔ 3 صفحہ 7 - 320) میں نقل کی گئی ہے)، اس قحط کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو۔

[2] اکبر نامہ -2- صفحہ 35

[3] Cesser Frederick Purchase صفحہ 10 اس اطالوی سیاح نے کھمبات کی سیاحت کے دوران اس قلت کو 1563ء اور 1567ء کے درمیان خود دیکھا تھا۔

[4] اس علاقہ میں ایک خاندان کے لوگوں نے جو مردم خوری کے مرتکب ہوئے تھے پکڑے جانے پر بتایا کہ انہوں نے اس عادت کو اس قحط کے دوران اختیار کیا تھا (فیضی سرہندی، ورق 121 الف 122 الف)

[5] عارف قندھاری، 177 - 79؛ طبقات اکبری 2 صفحہ 301؛ بدایونی، 2 صفحہ 186؛ فیضی سرہندی، ورق 122 الف ب آخر الذکر دونے بظاہر اپنی اطلاعات کو طبقات اکبری سے اخذ کیا ہے۔ لیکن طبقات اکبری (باقی صفحہ آئندہ پہ)

شمالی ہندوستان میں بھی خشک سالی کا عام خطرہ محسوس کیا جا رہا تھا مگر بروقت بارش سے یہ خطرہ ٹل گیا۔[1] ہندوستان کے بعض حصوں میں بظاہر 1578ء میں غذا کی قلت محسوس کی گئی۔[2] 1587ء و 1588ء میں بھکر کے علاقہ میں ٹڈیوں نے فصل کو تباہ کیا۔ "بیشتر لوگ یہاں سے بھاگ گئے اور سیمجہ اور بلوچ قبیلوں کے افراد نے دریا کے دونوں طرف لوٹ مار کرتے ہوئے، ایک آبادی بھی نہ چھوڑی"[3]۔ 1589 ـ 90ء میں اسی علاقہ میں خشک سالی کی وجہ سے دوبارہ قحط پڑا۔

1596ء میں بارش عام طور پر کم تھی۔ "گرانی نے ایک دنیا کو مصیبت میں مبتلا کر دیا" اور اکبر نے ہر شہر میں مفت لنگر خانوں کا انتظام کیا۔[4] اگلے سال خشک سالی سے کشمیر میں شدید قلت

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

میں مرنے والوں کی تعداد نہیں بیان کی گئی ہے۔ اگر بدایونی کے قول کے مطابق بے شمار جانیں تلف ہوئی تھیں جو نا ًبا صرف ایک مفروضہ معلوم ہوتا ہے۔

[1] اکبر نامہ، 3 صـ 106-7

[2] اکبر نامہ 3 صـ 224

[3] معصوم، تاریخ سندھ داؤد پوتا ایڈیشن صـ 249

[4] ایضاً صـ 250

[5] اکبر نامہ۔ 3۔ صـ 714 نورالحق دہلوی کی تصنیف 'زبدۃ التواریخ' میں اس قحط کو بے حد شدید اور طویل المیعاد بیان کیا گیا ہے۔ ہماری اطلاع ہے کہ یہ خشک سالی 1595-6ء میں رونما ہوئی اور ہندوستان میں مسلسل 3۔ 4 سال تک خوفناک قحط کا دور دورہ رہا۔ انسانوں نے انسانوں ہی کو کھایا۔ لاشوں سے سڑک اور راستے رک گئے (ایلیٹ و ڈاسن (Elliot & Dawson) ۔6۔ صـ 193) یہ تصنیف عہد جہانگیری کے اواخر کی ہے اور اس میں بے حد مبالغہ آرائی کا امکان پایا جاتا ہے (ملاحظہ ہو 'سرن' حوالہ سابقہ صـ 424، نوٹ) نورالحق نے 1601ء کے قبل کے واقعات بیان کرنے میں عام طور پر فیضی سرہندی کی پیروی کی ہے اور فیضی اس قسم کی کسی بات کا ذکر نہیں کرتا۔ یسوعی مشن کے افراد جو مئی 1595ء میں لاہور پہونچے تھے اور اس کے بعد دربار شاہی سے برابر وابستہ رہے، 1597ء میں صرف کشمیر کا ذکر کرتے ہیں اور اگر دو جیرک (du Jarric) (ترجمہ پین (Payne) اکبر اینڈ دی جیوئیٹش (Akbar & the Jesuits)) ان کی صحیح ترجمانی کرتا ہے تو وہ میدانی علاقوں میں قحط کا بالکل ذکر نہیں کرتا اور اگر صورت حال واقعتہً اس قدر سنگین تھی جیسا کہ نورالحق کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے تو پھر اس فرو گذاشت کا کوئی جواز نہیں ملتا۔

پیدا ہوگئی جہاں غریبوں نے "بچوں کو پرورش کا سامان نہ ہونے کے باعث انہیں سر بازار فروخت کرنا شروع کیا۔[1]

جہانگیر 1615 - 16ء میں لکھتے ہوئے اس برس اور اس سے ایک برس قبل پنجاب سے سرہند تک اور علاقہ دوآبہ اور دہلی میں گلٹی دار طاعون کی وبا کے پھیلنے کا ذکر کرتا ہے۔ وہ اس سلسلہ میں علماء کی یہ رائے قلم بند کرتا ہے کہ پچھلے دو برسوں (1613 - 14ء اور 1614 - 15ء) کی شدید خشک سالی اس وباء کا سبب تھی لیکن وہ اس قلت کی تفصیلات نہیں بیان کرتا۔[2]

1630 - 32ء کا بڑا قحط غالباً ان تمام مصائب میں جن کا تحریروں میں ذکر آتا ہے سب سے زیادہ تباہ کن تھا اور اس نے یقیناً ہمعصر ذہنوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ اس قحط سے گجرات اور دکن کے بیشتر علاقے متاثر ہوئے۔[3] پہلے تو 1630ء میں ان علاقوں میں بارش بالکل ہی نہیں ہوئی۔ دوسرے سال گجرات میں فصل کی حالت امید افزا تھی۔ لیکن پہلے تو چوہے اور ٹڈیاں فصل پر حملہ آور ہوئیں اور اس کے بعد وہ کثرت سے بارش سے برباد ہوئیں۔[4] جبکہ بظاہر دکن میں

---

[1] Akbar and the Jesuits صفحہ 77-8 اور موازنہ بہ اکبر نامہ 3- صفحہ 727،

[2] تزک جہانگیری، 161-2-

[3] اس قحط کا ذکر قزوینی Add. 20:734، صفحہ 442-444 .Or 173، اوراق 220 ب۔ 221 الف) صادق خاں .Or 174، اوراق 29 الف، 32 الف، Or 1671، اوراق 17 الف 18 ب میں ملتا ہے۔ یہ دونوں واقعات کے عینی شاہد ہونے کے مدعی ہیں کیونکہ یہ لوگ بظاہر اس وقت دربار شاہی سے وابستہ تھے جس کا اس وقت مستقر برہانپور تھا۔ لاہوری۔ ا۔ صفحہ 362-3 میں قزوینی کا صرف خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ بات کے پہلے تو اس کے بیان کو فارسی کا واحد ہمعصر تذکرہ ہونے کی بنا پر قبول کر لیا جائے اور پھر مبالغہ آرائی کے الزام میں نکتہ چینی کی جائے مناسب نہ ہوگا۔ (مرن، حوالہ سابقہ صفحہ 427 وما بعد) خافی خان (ا) 444 - 5 میں صادق خاں کے قول کی لفظ بہ لفظ نقل کی گئی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ذاتی حوالوں کو یا تو حذف یا تبدیل کر دیا گیا ہے۔ قحط کے خاص یورپی ماخذ Mundy، Factories 1630-33ء (بیوجا بجا) اور Twist (J I H 16 صفحہ 65-69 ہیں مگر ان کے بیانات بیشتر گجرات سے متعلق ہیں۔

[4] اس سلسلہ میں یورپی ماخذ کی تقلید کی گئی ہے Factories 1630-33ء صفحہ 134-5، 158، 165، 181، Mundy 193، Twist 38، J I H 16، صفحہ 66، 68 جو سب ایک دوسرے سے بحد مطابقت رکھتے ہیں۔

خشک سالی کا سلسلہ چلتا رہا[1] وبا نے جو قحط کے فوراً بعد نمودار ہوئی فاقہ کشی سے بچے ہوئے لوگوں کو شکار کیا۔ انتہائی ہولناک مناظر دیکھنے میں آئے۔ والدین نے اپنی جان بچانے کے خاطر بچوں کو فروخت کر ڈالا اور نسبتاً کم متاثرہ علاقوں کے جانب عمومی نقل مکانی عمل میں آئی۔ مگر کم ہی لوگ سفر کی پہلی منزل طے کر پائے تھے کہ اثنائے راہ موت کے شکار ہوئے اور مردوں سے سڑکیں رک گئیں۔ پہلے سال تو غریبوں کی جانیں تلف ہوئیں، مگر دوسرے سال کچھ دولت مند بھی لقمۂ اجل ہوئے[2] مویشیوں کا چمڑا اور کتوں کا گوشت بطور غذا استعمال کیا گیا۔ مردوں کی ہڈیوں کو پیس کر آٹے کے ساتھ بیچا جانے لگا اور بالآخر مردم خوری عام ہو گئی[3] 1630ء میں بنجاروں

---

[1] بقول قزوینی، حالانکہ 1630ء میں "بالاگھاٹ کے بیشتر محالوں میں خصوصاً دولت آباد کے اطراف کے خطوں میں" بارش کی کمی تھی لیکن 1631ء میں خشک سالی اس سے بھی زیادہ وسیع پیمانہ پر تھی۔ برخلاف اس کے صادق خاں غالباً صحیح ترتیب کو الٹ کر یوں کہتا ہے کہ 1630ء میں بارش کی کثرت تھی جس کی وجہ سے فصل غارت ہوئی اور اس کے بعد 1631ء میں مکمل خشک کا دار و دورہ رہا۔ اس کا یہ بھی بیان ہے کہ تیسرے برس چوہوں اور ٹڈیوں نے فصل کو بے حد نقصان پہونچایا۔ جیسا کہ پہلے ذکر آیا مذکورہ دونوں مصنفین کو صرف دکن کے حالات کا ذاتی علم تھا اور ممکن ہے وہاں 1631ء میں قحط کے قائم رہنے کا سبب گجرات میں قحط کے سبب کا بالکل متضاد رہا ہو۔ کورو منڈل میں بھی دوبارہ قدرت ناسازگار رہی۔ مثل دیگر علاقوں کے یہاں بھی 1630ء میں قحط کا آغاز ہوا (Factories 1630-33، ص 73-268) 1631ء میں بھی خشک سالی قائم رہی، لیکن بالآخر اگست 1632ء میں "بارش کی کثرت ہوئی" (ایضاً ص 203-4، 228) لیکن 1633ء میں یہاں بارش کی اس قدر کثرت رہی کہ غلہ کا زیادہ حصہ نصف پکنے کے قبل ہی سڑ گیا" (Factories 1634-36، ص 40)

[2] یہ عجیب معاملہ ہے کہ اس مسئلہ پر صادق خاں اور ڈونسٹ دونوں نے ہی زور دیا ہے۔

[3] مردم خوری کے متعلق صادق خاں اور ڈونسٹ کے متعلق ڈاکٹر سرن کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حقیقت رنگینیٔ بیان اور افواہوں سے زائد نہیں (سرن، حوالہ سابقہ 429-31) مذکورہ دونوں مصنفین کے قول کے والدین نے خود اپنے بچوں کو کھایا (Mundy ص 276) بھی جو قحط کے بعد جلد ہی گجرات واپس ہوا تھا اسی طور پر بیان کرتا ہے۔ صادق خاں دربار میں واقعتاً ایک ایسی اطلاع کی موصولگی کا حوالہ دیتا ہے جس میں ایک عورت نے احمد آباد کے قاضی کے روبرو یہ شکایت پیش کی کہ اس کے ایک پڑوسی نے اس کے لڑکے کو اس کی مرضی سے مار ڈالنے کے بعد اس کے گوشت میں سے اسے حصہ نہ دیا۔ اس قسم کے واقعات (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کو مالوہ اور اس کے آگے گجرات تک غلّہ پہونچانے کے کام میں شاہجہاں کی فوج کو رسد رسانی کے باعث جو برہانپور میں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھی رکاوٹ پیدا ہوئی[1] لیکن باوجودیکہ فوج وہاں سے کوچ کر گئی اور دوسرے ہی سال سے بنجاروں نے بہ افراط غلّہ سورت پہونچانا شروع کر دیا[2] تاہم قیمتیں بیحد گراں رہیں[3] حکومت نے اپنے دستور کے مطابق بڑے شہروں میں لنگر خانے یعنی مفت کھانے کی فراہمی کا انتظام کیا[4] لیکن ایسا حقیقی معنوں میں فاقہ کشوں کو زیادہ راحت رسانی کی غرض سے نہیں بلکہ جود و سخا کے مظاہرہ کے طور پر کیا جاتا تھا۔ اور مجبوراً مالگزاری میں چھوٹ بہت زیادہ دینی ہوتی تھی۔

صوبوں میں گجرات پر قحط کے شدید ترین اثرات تھے[5] کہا جاتا ہے کہ اکتوبر 1631ء کے قبل کے دس مہینوں میں اس صوبہ کے تیس لاکھ انسان موت کے نذر ہوئے، جبکہ علاقہ احمد نگر کے متعلق مشہور تھا کہ وہاں ایک لاکھ انسانوں کا یہی حشر ہوا[6] اور گجرات کے شہر اموات کی کثرت یا نقل مکانی سے گھٹ کر پہلے کا دسواں حصہ ہو گئے[7] کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ مواضعات کی حالت

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اور نیز مردم خوری کی غرض سے قتل کی مشتبہ وارداتوں سے اس بات کا اندازہ ملتا ہے کہ لاشوں کو بطور غذا کئے جانے کا رواج کس قدر عام ہو گیا تھا اس سلسلہ میں باتفاق رائے، اس کثرت سے سندیں ملتی ہیں کہ انہیں نظرانداز کرنا مشکل ہوگا۔

[1] Mundy 56 Factories 1630-33، ص 165

[2] Factories 1630-33، ص 196، 1634-6، ص 224-25

[3] جنوری 1632ء میں سورت میں غلّہ $6\frac{1}{4}$ اور $6\frac{1}{2}$ محمودی فی من کے منافع پر فروخت ہو رہا تھا اور کہا جاتا تھا کہ یہ نرخ بمقابلہ نرخ سابقہ کے، بنجاروں کے ذریعہ اور نیز براہ سمندر غلّہ آنے کے باعث ارزاں تھا۔ (Factories - 1630-33، ص 196) ستمبر 1631ء میں نرخ 16 محمودی فی من سے کم نہ تھا۔ (ایضاً 165) قحط کے قبل گیہوں کی معمولی قیمت صرف $1\frac{1}{8}$ محمودی فی من تھی (J I H Twist 16، ص 68)

[4] تزوینی. Add. 20.734، ص 444. Or. 173، ورق 221 الف، لاہوری ا۔ ص 363، صادق خاں Or. 174، ورق 31 ب Or 1671، ورق 18 ب خافی خاں۔ ا۔ ص 448-9۔

[5] لاہوری۔ ا۔ ص 363

[6] پرتگالی وائسرائے کی اطلاع کے مطابق جو اس نے بادشاہ کو بھیجا تھا (Factories 1630-33، ص 21)

[7] موازنہ بہ Mundy 276 جو کپڑا بننے والوں کی مثال دیتا ہے اور نیز (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اس سے بہت بہتر رہی ہو۔ بقول صادق خاں "سلطانپور، بیور، مانڈو، احمد آباد ہی کے پرگنے نہیں بلکہ صوبۂ خاندیش اور بالاگھاٹ کے چند پرگنے بھی بالکل ویران ہو گئے تھے" اور دوسرے مقامات سے یہاں کسانوں کو آباد کرنے کے خیال سے لانا پڑا۔ 1634ء کے آخیر میں یعنی تین موافق موسموں کے بعد گجرات سے اطلاع آئی کہ شہروں کی آبادی تو ضرور بحال ہو رہی ہے، لیکن مواضعات کے آباد ہونے کی رفتار سست ہے۔[1] 1638-9ء تک بھی قحط کے "علامات ہر جگہ دیکھے" جا سکتے تھے۔[2] عہد شاہجہانی کی دوسری دہائی کے اختتام تک بھی کاشتکاری کا کام بظاہر پورے طور پر بحال نہ ہو سکا تھا۔[3]

1636-7ء میں پنجاب سے قحط سالی و کمیابی کی اطلاعات موصول ہوئیں۔[4] 1640ء میں بارش کی کثرت اور نتیجۂ طغیانی نے کشمیر کی فصل خریف کو تباہ کر دیا۔[5] 1642ء میں دوبارہ انہیں وجوہ سے وہاں قحط کے حالات رونما ہوئے جس سے تقریباً تیس ہزار مصیبت زدہ انسان وہاں سے منتقل ہو گئے۔[6] اسی برس، اڑیسہ ایک طویل خشک سالی سے دوچار ہوا جس کے باعث یہاں سے کورمنڈل کو معمولاً جو غلہ برآمد ہوتا تھا اس میں خلل پیش آیا۔[7]

صدی کی پانچویں دہائی میں شمالی ہندوستان کے بعض حصوں میں بارش کی بار بار کمی رہی۔ چنانچہ خشک سالی سے 1644ء میں صوبۂ آگرہ بھی متاثر ہوا، لیکن وہاں کے متعلق قحط کی اطلاعیں نہیں ہیں۔[8]

(باقی حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

Factories 1630-33، ص 180 دسمبر 1631ء میں "سوالی (سواحل) شہر میں بجائے 260 کے صرف 10 یا 11 خاندان بچے تھے۔

[1] Factories 1634-36، ص 65

[2] Commissariat Mandelolo، ص 7

[3] لاہوری 2، ص 712-12، 20 جلوس شاہجہانی (1646-7ء) کے تحت لکھتا ہے کہ گجرات اور دکن کے صوبے قحط سے اس درجہ متاثر تھے کہ ان کی جمع (رقمۂ مالگذاری) میں کوئی اضافہ تو درکنار، یہ پہلے سے بھی کم رہی۔

[4] لاہوری۔ 2، ص 29

[5] ایضاً 204۔ 3، صادق خاں، Or. 174، ورق 96 الف، Or. 167 ورق 53 ب

[6] لاہوری 2، ص 302-3، صادق خاں، Or. 174، ورق 97 ب، Or. 167، ورق 84 الف۔ ب، خافی خاں 1، ص 587

[7] موریلینڈ Akbar to Aurangzeb، ص 208، رسے چودھری Dutch in Coromondal، ص 142

[8] Factories 1642-45، خانجہاں بارہہ نے ایک یادداشت Add. 16859، (باقی صفحۂ آئندہ پر)

فروری 1646ء میں دربارشاہی میں یہ عرضداشت پیش کی گئی کہ "غریب' پنجاب میں گرانی کے باعث اپنے بچوں کو فروخت کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں' لیکن بظاہر یہ مصیبت محدود پیمانہ پر رہی[1] 1646ء میں آگرہ اور احمد آباد دونوں مقامات پر خشک سالی کا پیش آئی[2] 1647ء میں مارواڑ میں بارش بالکل نہ ہوئی جس کی "وجہ سے ایسا شدید قحط پڑا کہ اموات کی کثرت یا نقل مکانی کے نتیجہ میں وہ علاقہ بالکل غیر آباد اور ناقابل گذر ہو گیا[3]" 1648ء میں دوبارہ علاقہ آگرہ میں بارش کم رہی[4] برخلاف اس کے 1644-5ء اور 1648ء میں بنگال کثرت بارش کا شکار ہوا جس نے وہاں گنے کی فصل کو نقصان پہونچایا[5]

1650ء میں "ہندوستان کے تمام حصوں" میں بارش کم رہی[6] اور اودہ سے "غلہ کی قلت" کی اطلاع موصول ہوئی[7] جس سے آگرہ اور احمد آباد کے درمیانی علاقے متاثر ہوئے[8] پنجاب میں

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اوراق ۱-ب - 2 ب) میں جو دربارشاہی میں ۱۵ جمادی الاول میں بھیجی گئی تھی اپنی گوالیار کی جاگیر کی فصل ربیع کی مالگذاری کی وصولی کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ امسال "خشک سالی کی شدت اس قدر زیادہ تھی کہ مقابلہ پچھلے برسوں کے آمدنی (حاصل) بےحد کم ہوئی" حالانکہ اس عرضداشت میں سن تحریر درج نہیں ہے لیکن نفس مضمون سے اسے عہد شاہجہانی کے اٹھارہویں سال سے اور چونکہ مہینہ کا نام درج ہے' لہٰذا اس کے مطابق ۱ سے جون جولائی 1645ء سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا جو فصلیں خشک سالی سے متاثر ہوئیں' 44-16ء کی خریف اور 1645ء کی ربیع کی رہی ہونگی

[1] لاہوری 2 ص 489۔ قلت کے محدود پیمانہ پر ہونے کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ شاہجہاں نے ان تمام بچوں کو جنہیں ان کے والدین نے فروخت کر دیا تھا' خزانۂ سرکاری سے اسی قیمت پر خریدکر ان کے والدین کو سپرد کئے جانے کا حکم صادر کیا تھا۔ اگر ایسے بچوں کی تعداد زیادہ رہی ہوتی تو شاید اس عمل کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ غالباً قیمتوں میں اضافہ فصل ربیع کے کاٹے جانے تک عارضی طور پر قائم رہا۔

[2] Factories 1646-50 ص 92-99

[3] ایضاً ص 192-3

[4] ایضاً ص 219

[5] Ray Chaudhuri حوالہ سابقہ ص 240

[6] Factories 1646-50 ص 322' 1651-54 ص 29

[7] ایضاً 1651-54 ص 9-10 [8] ایضاً ص 26'

فصلوں کو پہلے خشک سالی سے اس کے بعد بارش کی کثرت نے نقصان پہنچا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلہ بہت گراں ہو گیا اور کسان مالگذاری کا پورا مطالبہ ادا کرنے سے معذور رہے[1] 1650ء میں صوبہ ملتان کی فصل ربیع کو ٹڈیوں نے اور یہاں کے علاوہ دیگر مقامات کی فصل خریف کو بھی خشک سالی نے تباہ کیا، جبکہ 1651ء کی فصل ربیع کی طغیانی سے نقصان پہونچا[2]

1655ء میں مغلیہ دکن کے صوبہ بالاگھاٹ میں کہیں کہیں فصل خریف کو دیر سے ہونے والی اور نیز چھینٹوں سے ضرر پہونچا[3]

1658ء میں شمالی ہند میں قلت کے ایک طویل دور کا آغاز ہوا۔ اس کا سلسلہ جنگ جانشینی کی تباہ کاری سے شروع ہو کر، عہد عالمگیری کے ابتدائی چار پانچ برسوں تک بارش کی بے عنوانیوں کی وجہ سے قائم رہا۔ غلہ کی کمیابی خاص طور پر آگرہ، دہلی اور اطراف لاہور کے علاقوں میں محسوس ہوئی۔ 4ء جلوس عالمگیری میں یا اس کے قبل حکومت کو ان شہروں میں بڑے پیمانہ پر لنگر (مفت باورچی خانوں) کا انتظام کرنا پڑا[4] بہرحال، ان سب میں سندھ سب سے زائد مصیبت کا شکار ہوا کیونکہ 1659 ـ 60ء میں یہاں قحط اور طاعون دونوں ہی کا حملہ ہوا اور "آبادی کا بیشتر حصہ ان آفات کے نذر ہو گیا"[5] گجرات میں 1659ء، 1660ء اور دوبارہ 1663ء میں خشک سالی پیش آئی، جس سے غلہ کی گرانی میں اس قدر اضافہ ہوا کہ 1664ء میں یہ سوچا

---

[1] وارث (اے) ورق 445 الف (بی) ورق 76 الف۔ ب۔ صادق خاں۔ Or ـ 174 اوراق 68 ـ 1۔ الف 169 الف Or 1,671، ورق 84 ب صالح 3 ص 125 نانا بابکرشن برہمن کے مجموعہ میں مندرج ایک خط کو (اوراق 39۔ الف ب، 37 الف۔ اوراق کی ترتیب بدل گئی ہے) جس میں حصار کی خشک سالی کا ذکر ہے، اسی سال سے منسوب کیا جانا چاہیے۔

[2] ادب عالمگیری، اوراق 202 الف۔ ب۔ رقعات عالمگیری، ندوی اڈیشن ص 227 - 28۔ یہ خط جہاں آرا کو لکھا گیا ہے اور اس کی تاریخ تحریر صرف استخراجاً معین کی جا سکتی ہے۔

[3] ادب عالمگیری، اوراق 54 ب، 55 ب۔ رقعات عالمگیر، ایڈیشن ندوی۔ ص۔ 40 - 41، 166 - 7

[4] عالمگیرنامہ، 609 - 611 خافی خاں۔ 2 ص 87 - 124 (موازنہ با اختلاف Or 65-74، ورق 33 الف)

Bowery ـ 433

[5] Factories 1655 - 60ء ص 210 اور لوٹ 307

[6] ایضاً۔ ص 306 - 7، 320، 1661-64ء ص 25، 200، 257، 329 ـ موازنہ برمرارة (ا) 251

جانے لگا کہ اگر بارش ایک بار پھر نہ ہوئی تو یہ علاقے بالکل غیر آباد ہو جائیں گے[1]" مگر خوش قسمتی سے یہ ایک ایسا خطرہ تھا جو پیش نہ آیا[2] اور وہ بھی جو مستقلاً افراط کا علاقہ تھا۔ متاثر ہوا کیونکہ جنگ جانشینی کے باعث 1658ء کی بیشتر فصل خریف تباہ ہو چکی تھی[3] بہ سمت مشرق بنگال کے شہر ڈھاکہ میں 1662 - 3ء میں ایک مقامی نوعیت کا قحط رونما ہوا جس کی ہولناکی میں سرکاری ملازمین کی ناجائز وصولیوں اور راستے کی رکاوٹوں کے باعث غلہ کے حمل ونقل میں جو خلل اندازی ہوئی اس نے بحد شدت پیدا کر دی[4] لیکن عام طور پر کوئی ایسی اطلاع نہیں ملتی کہ سندھ کے علاوہ کسی اور جگہ بڑے پیمانہ پر موت یا وہ ہولناک مناظر جو ایک شدید قحط کے لوازمات میں ہی دیکھنے میں آتے ہوں۔

1670ء میں بہار کی فصل خریف بارش کی کمی سے بالکل تباہ ہو گئی اور اس کے آگے سال ایک شدید قحط نے بنارس کے پچھم سے شروع ہو کر راج محل تک کے پورے علاقہ کو تباہ کر ڈالا ہمارے پاس شہر پٹنہ میں اور نیز راستوں پر انسانوں کی ایک کثیر تعداد کی ہلاکت اور مصیبت زدوں کے اپنے بچوں کو فروخت کرنے کے قریبی شہروں میں سے بعض تو بالکل ہی غیر آباد ہو گئے اور ان میں ایک متنفس تک نہ بچا۔"[5]

1678ء کے اواخر تک لاہور سے غلہ کی بیحد گرانی کی اطلاعیں موصول ہوئیں[6] لیکن جو مصائب پیش آئے ان کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔ 1682ء میں گجرات میں "قحط اور قلت" کا غلبہ ہوا اور احمد آباد کے صوبیدار کے خلاف "روٹی کے لیے فساد" برپا ہوا[7] دکن بھی خشک سالی ظاہر ہوئی اور اس سال سے یہاں کے شہروں میں ظالموں نے شدت اختیار کی[8] 1684ء میں

---

[1] Factories 1661-64، صفحہ 320 - 21
[2] ایضاً صفحہ 323
[3] عرضداشت جعفر خاں مندرجہ جامع الانشاء ورق 10 ب اور ریاض القوانین 617 ج 1 ورق 130 ب
[4] فتحیہ عبریہ اوراق 79 ب- 80 الف، 110 ب- 111 الف
[5] Marshall ص 125، 27، 138، 149 - 53- و موازنہ برنیئر 226 - 27-
[6] مآثر عالمگیری صفحہ 167
[7] مرآۃ 1- صفحہ 300 301، Factories N.S. 3، صفحہ 277
[8] معموری، ورق 155 ب 156 الف۔ خافی خاں .Add 65.74 ورق 105، الف۔ ب

جزیرہ نما میں دوبارہ فصلیں خراب ہوئیں اور کہا جاتا ہے کہ قیمتیں بہت زیادہ بڑھ گئیں[1]

گجرات میں بھی غذا کی قلت کا سلسلہ چلتا رہا۔ 1685ء میں غذائی اجناس کی قیمتوں کے بڑھ جانے سے ان پر جملہ محصول معاف کر دینے پڑے اور احمد آباد میں قاضی کے خلاف ذخیرہ اندوزوں سے ساز باز کرنے کے شبہ پر ہنگامہ برپا ہوا[2]۔ اگلے سال بھی خشک سالی کے باعث قیمتوں کی گرانی قائم رہی[3]۔ 1691ء میں قحط اور وبائی امراض کی مصیبتیں ایک ساتھ صوبہ میں نازل ہوئیں[4] اور 1694 .5ء میں دوبارہ غذا کی قلت پیش آئی[5]۔ اس سال قلت غذا سے دہلی کے گرد و نواح کے علاقے بھی متاثر ہوئے، لیکن سب سے زیادہ پریشانی ریگستان تھار کے شمالی و مشرقی کنارے کے علاقہ باگر میں محسوس کی گئی۔ یہاں کے ہر باشندے دوسرے علاقوں کو منتقل ہوگئے اور انہوں نے مردار کھانا، اپنے بچوں کو فروخت کرنا اور ہزاروں کی تعداد میں مرنا شروع کیا[6]۔ 1696 - 7ء میں گجرات اور مارواڑ کے بعض علاقوں میں خشک سالی کے آثار نمودار ہوئے اور پٹن اور جودھپور کے درمیانی علاقوں میں گھاس یا پانی کے کوئی بھی آثار باقی نہ رہے[7]

دکن میں 1702ء میں ایک بڑے قحط کا آغاز ہوا۔ فروری میں سنگمنیر (صوبہ اورنگ آباد) سے دربار شاہی میں یہ اطلاع آئی کہ خشک سالی کے سبب سے "بیشتر مواضعات ویران ہوگئے تھے[8]۔ تمام سال" پورے دکن میں کاشتکاری کے لیے موقع پر بارش بالکل نہ ہوئی[9] اور ہوئی بھی وہ ایسی بے اندازتھی کہ تمام

---

[1] خافی خاں۔ 2۔ 317

[2] مرآۃ۔ 1۔ ص 309

[3] ایضاً۔ 315۔

[4] ایضاً۔ 325۔

[5] ایضاً۔ 329 - 30

[6] یحییٰ خاں "تذکرۃ الملوک۔ ایتھے" 409۔ ورق 108 الف۔ ب کے قول کے مطابق وہ لوگ پہلے دہلی آئے پھر اجین کی طرف منتقل ہو گئے۔ کیا مشرقی مالوہ میں بنجاریوں کی موجودہ نوآبادی اسی نقل مکانی کے نتیجہ میں وجود میں آئی؟ ملاحظہ ہو، Elliot, 'Memoirs.&c' ص 109،

[7] مرآۃ 1۔ 335۔6۔

[8] اخبارات 46/12

[9] دلکشا، ورق 146۔ الف۔

فصل ستیاناس ہوگئی[1] دریائے نربدا کے جنوب میں ہر جگہ بیحد قلت ظاہر ہوئی اور لوگ اپنے اپنے آبائی مکان کو چھوڑ کر دوسری جگہوں کو جانے پر مجبور ہوئے[2] اگلے سال (1703ء) بھی عافیت نہ نصیب ہوئی، کیونکہ سرمائی بارش کی کثرت سے فصل ربیع تباہ ہوگئی خصوصاً گیہوں کو سڑ جانے سے نقصان پہونچا[3] اس کے بعد خشک سالی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک مورخ اپنی سرگذشت میں اس برس کو مہاراشٹر کے لیے "بہ سبب خشک سالی، غریبوں کی اموات، اور کمزوروں کی آہ و زاری کے قحط و قلت غذا" کا سال بتاتا ہے[4] خشک سالی اور اس کا قریبی ساتھی طاعون دونوں 1704ء تک قائم رہے[5] "ان دو برسوں" یعنی 1702۔ 03ء اور 1703۔ 4ء میں دکن میں "بیس لاکھ سے زائد جانیں تلف ہوئیں، باپ، بھوک سے عاجز آکر چوتھائی سے نصف روپیہ تک میں اپنے بچوں کو بیچنے کے خواہشمند ہوئے اور پھر بھی ان کے خریدار نہ مل سکے اور انہیں بھوکا ہی رہنا پڑا"[6]

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہماری شہادتیں مختلف علاقوں میں قحط کے حملوں کے تعدد میں زیادہ فرق کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اس کا ایک جزوی سبب یہ ہو سکتا ہے کہ بعض صوبوں کے متعلق ہماری معلومات بہ نسبت دوسرے صوبوں کے زیادہ مکمل ہیں۔ مگر اس سے مثلاً بنگال میں جس کے متعلق پوری سترھویں صدی کی ہماری اطلاعات کافی زیادہ ہیں، کسی سنگین قحط کا تحریری اندراج نہ پائے جانے کی توجیہہ نہیں ہوتی۔ حقیقتاً 1662۔ 63ء میں ڈھاکہ میں قلت کو اس صوبہ کے ایک انوکھے واقعہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے[7] اسی طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مدت میں مالوہ کی قلت غذا سے مستقلاً محفوظ رہنے کی شہرت برقرار رہی[8] دریائے گنگا کے بالائی علاقہ کی

1۔ Manucci 3، 423۔ معموری ورق 202 ب۔ خافی خان۔ 2، 510
2۔ دلکشا، ورق 146 الف
3۔ معموری، ورق 202 ب۔ خافی خان۔ 2، 510۔11
4۔ آثر عالمگیری۔ 477
5۔ ملاحظہ ہو اخبارات، اے 245: 22 جنوری 1704ء "پورے دکن میں غلہ کی قلت اور بارش کی کمی" کے حوالہ کیلئے۔
6۔ Manucci 4، 97
7۔ فتحیہ عبریہ، ورق 80 الف۔ 8۔ Mundy، 57۔

حالت اس قدر اچھی نہ تھی۔ لیکن ایک بڑا قحط جس میں بڑے پیمانہ پر جانیں تلف ہوئی تھیں زیرِ مطالعہ عہد کے فور الاتبل واقع ہو چکا تھا اور بہار کے متعلق اس پیمانہ صرف ایک قحط کا ذکر ملتا ہے۔ دوسری طرف، وادی سندھ کے صوبے گجرات اور مغلیہ دکن، آسمانی آفات کے زیادہ زد میں تھے اور ان میں بار بار مبتلا ہوتے رہے۔

غالباً، قحط سالی سے عام خلوص کو جو بے پناہ مصائب برداشت کرنے ہوتے تھے، انکے پھیلاؤ پر زور دینا ضروری ہوگا۔ ایسے برسوں کی تعداد جن میں جانوں کا اتلاف بڑے پیمانہ پر ہوا کرتا قلیل رہی ہوگی لیکن جب ایسا پیش آجاتا تو آبادیوں ہولناک ویرانی سے دوچار ہوا کرتیں۔ ایسی حالت میں انسان صرف فاقہ کشی ہی سے نہیں مرتے، بلکہ ہر قسم کے وبائی امراض کے بھی شکار ہوا کرتے، خصوصاً اس ہیبتناک طاعون کے جس کا حملہ معمولی درجہ کی غذائی قلت کے بعد بھی ہو جایا کرتا[1] اس امر کا صحیح تخمینہ نہیں لگایا جا سکتا کہ یہ آفات آبادی کی قدرتی افزائش میں کس درجہ مزاحم ہوئی تھیں۔ اس لحاظ سے انکے اثرات کو مبالغہ کے ساتھ پیش کرنا ممکن ہو جاتا ہے 1630۔32ء کے قحط نے گجرات کے ایک بڑے حصّہ کو انسانی آبادی سے محروم کر دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد پھر بہرحال اگلی تین نسلوں تک اس قسم کی کوئی صورتحال پیش نہ آئی۔ اسی طور پر ہندوستان کو زیرِ مطالعہ عہد میں، پورے ڈیڑھ سو سال کی مدّت آبادی کی اس کمی کو جو 1554ء 76 کے قحط کے نتیجہ میں واقع ہو چکی تھی پورا کرنے کو مل گئی۔ علاوہ اتلاف جان کے قحط کی وجہ سے غربا دوسرے مصائب کے بھی شکار ہوا کرتے۔ ایسے دقتوں میں جو غذا انہیں میسر ہوتی وہ انکے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے خطرناک حد تک ناکافی ہوا کرتی۔ اور غذائی قلت کے دنوں میں وہ جن جن چیزوں کے کھانے پر مجبور ہوتے، ان کا سرسری تذکرہ کہیں کہیں آچکا ہے۔ فرائیر اسے ایک مسلّمہ حقیقت کے طور پر تسلیم کرتا ہے کہ "(شدید غذائی قلت میں) عوام گھاس کی جڑوں کو

---

[1] طاعون اور خشک سالی کے باہمی تعلق کے بارے میں جہانگیر کے حوالہ دینے کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ عام طور پر لوگ اپنے تجربہ کی بنیاد پر ایسا ہی یقین رکھتے تھے۔ چنانچہ 1664ء میں سورت کے انگریز گماشتے لکھتے ہیں کہ "یہ لوگ پچھلے سال کی غذائی کمی کو ہوا کے غیر معتدل ہونے کا سبب بتلاتے ہیں جس کے بعد ہمیشہ بارش اور غذا کی کمی ہو جاتی ہے۔ یہاں اطراف کے تمام شہروں اور مواضعات میں بیماری پھیلی ہوئی ہے اور شاید ہی کوئی گھر بچا ہو" (Factories 1661-64، ص 329)

عام غذا کے طور پر" استعمال کیا کرتے۔[1] کھیتوں کی تباہی کسانوں کو مجبور کرتی کہ وہ اپنے رزق کے خاطر اپنے گھروں کو خیرباد کر کے دور دور کے علاقوں کو منتقل ہو جائیں اور ہر غذائی قلت کے بعد غلاموں کی بازار میں بے پناہ افراط ہو جاتی تھی۔[2] اس طرح قحط سالی زرعی پیداوار کی جامد علیٰحدگی میں وقتاً فوقتاً تحرک اور انتشار کا ایک بھیانک عنصر شامل کر دیا کرتی تھی۔ کسی اور سبب کی غیر موجودگی میں تنہا اسی صورت حال کو دور وسطیٰ میں کسانوں میں نقل مکانی کی خصوصیت کی توجیہ کے لیے جس کا تفصیل بیان آگے آئے گا کافی ہونا چاہیے۔

---

1. Frver 2، 119

2. مذکورہ بادشاہوں کے علاوہ اکبر کے احکام مندرجہ بدایونی۔ 2 ص 391 میں بھی والدین کا اپنے بچوں کی فروخت کرنا قحط اور آفات کا معمول کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں موازنہ ہو نیز Fitch: Ryby 57 Early Travels 12، Manucci 2 ص 451 رسے چودھری Dutch in Coromondal 322، 288

باب 4

کسان و زمین اور دیہی برادری

فصل - ا - کسان اور زمین

برطانوی تسلط کے قبل ہندوستان میں "زمین کے مالک" کی جستجو نے دورِ حاضر کے متعدد مصنفین کی اختراعی صلاحیتوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ زیرِ مطالعہ عہد کے یورپی سیاحوں کی شہادتیں اس مباحثہ پر اچھی خاصی اثر انداز ہوئی ہیں اور ان کا یہ متفقہ قول ہے کہ اس دور میں زمین کا اصل مالک تنہا بادشاہ تھا[1] دورِ برطانیہ کی زرعی تاریخ کے مستند شارحین نے بھی اسی نظریہ کو قبول کر لیا تھا[2] گو یہ اب بظاہر پہلے کی طرح سرکاری تصورات کا ایک جزو نہیں معلوم ہوتا ہے[3] اس امر پر

1۔ ایضا Xavuer ترجمہ Hosten J A S B N.S 23، 1927، 2.121، Roe 105۔ Relation II-10 Bernier 5، 204، 226، 232، Factories 16 1668، 69، Fryer 184 صفحہ 1، Manucci 137 صفحہ 2، 46 میں۔

2۔ یعنی گرانٹ، 'اینیلی سس آف دی فنانسز آف بنگال'، ففتھ رپورٹ Grant, 'Analysis of the Finances of Bengal' Fifth Report) مدراس: 1883ء جلد ا صفحہ 272، بیڈن پاول، دی انڈین ویلیج کمیونیٹیز؛ Baden Powell, 'The Indian Village Community'، لندن 1896ء صفحہ 223

3۔ ملاحظہ ہو خصوصاً یو۔ پی۔ زمینداری ابالیشن کمیٹی رپورٹ، الہ آباد، 1948ء صفحہ 63-65، 73

زور دیا گیا ہے کہ یہ نظریہ ہندو یا مسلم قوانین کے جملہ جانے بوجھے اصولوں سے یکسر بیگانہ ہے۔ علاوہ اس کے، دور وسطی کے ہندوستانی مصنفین کی تحریروں یا اس وقت تک محفوظ کسی انتظامی یا نجی دستاویزات میں اس کا حوالہ نہیں ملتا۔ ابوالفضل کی "کسان اور تاجروں" پر عائد کیے ہوئے محصولوں کے جواز میں ایک دلیل یہ ہے کہ یہ محصول "پاسبانی کا معاوضہ" ہے جنہیں بادشاہ کی اپنی رعایا کو فراہم کردہ حفاظت و انصاف کے عوض میں ادا کیا جاتا تھا۔ محصولوں کی اس لیے ضرورت ہوتی کہ بادشاہ پر ان لوگوں یعنی فوجیوں کی کفالت لازم ہے جو اس کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اس بات کا کہیں سے بھی اشارہ نہیں ملتا کہ مالگزاری زمین ایک قسم کی لگان تھی جسے کسان کو شاہی املاک کے استعمال کے معاوضہ کے طور پر ادا کرنا ہوتا تھا۔[1]

مزید برآں شہری علاقوں میں زمین کی ذاتی ملکیت کا بظاہر ایک قطعی تصور موجود تھا۔ ہمیں ایسے حوالے ملتے ہیں جن سے بادشاہ کی رعایا کے، بحیثیت ایک مالک کے، بادشاہ کے ہاتھ زمین فروخت کرنے اور اس سے قبضہ کے مسئلہ پر بھی نزاع کرنے کی نشاندہی ہوتی ہے۔[2] شہروں کے باہر بھی ہمیں، متعدد دستاویزات سے ایسے غیر سرکاری افراد کا مالک زمین کی حیثیت میں پتہ چلتا ہے جنہیں مواضعات کی زمین یا اس کے ایک جزو پر حقوق ملکیت حاصل تھے۔[3] 'مالک' اور 'ملکیت'

---

[1] آئین اکبری ۔ا۔ 91-290

[2] وقائع دکن 50 - 51 - وقائع اجمیر 430 - 32 تعجب ہے کہ اس نوعیت کے تمام معاملات سے بے خبر نہ ہونے کے باوجود بھی یورپی سیاحوں میں سے کسی ایک نے بھی، زمین پر بادشاہ کے بلاشرکت غیرے ملکیت کے متعلق اپنے عمومی دعوے میں کوئی ترمیم نہ کی۔ صرف ایک موقع پر Bernier 204 نے اپنے عمومی بیان میں یہ کہہ کر صرف ایک بار ترمیم کی ہے کہ کچھ "ایسے مقامات اور باغات تھے جن کے متعلق (مغل اعظم) کبھی کبھی اپنے رعایا کو اس میں خرید و فروخت اور دیگر طریقوں سے منتقل کرنے کی اجازت دیدیتا تھا۔" رو (Roe) 105 کو یقین تھا کہ علاوہ بادشاہ کے "کوئی شخص بھی ایک فٹ زمین کا مالک نہ تھا۔"

شہری زمین کے متعلق ملکیت کا تخیل کس قدر ترقی یافتہ تھا، اس کا اندازہ وقائع اجمیر 386 - 7 کی اس اطلاع سے کیا جا سکتا ہے جس میں یہ فرض کیا گیا ہے کہ مالک کو یہ حق حاصل رہا کرتا تھا کہ وہ زمین پر متصرف شخص کو بیدخل کر سکے۔

[3] جن لوگوں کو مالک کے نام سے پکارا گیا ہے، وہ بعض کاغذات میں کسان مگر زیادہ تر زمیندار ان ہیں۔ فصل ہذا میں آگے اور باب 5 کی فصل ایک ملاحظہ ہو۔

کے اصطلاحات کے عملی مفہوم کی جو بھی تعبیر کی جائے ان حوالوں سے یہ امر بہرحال مسلّم ہو جاتا ہے کہ علاقہ بادشاہ کے کچھ دیگر لوگ بھی زمین پر ایسے حقوق کے مدعی تھے جو "ملکیت" کے نام سے موسوم تھے۔

بہرحال، یہ دریافت کرنے میں ہم حق بجانب ہوں گی کہ یورپی سیاحوں نے بالاتفاق بادشاہ کی طرف ایسے حقوق کیوں منسوب کیے جن کا وہ خود مدعی نہ تھا۔ یہ درست ہے کہ بہت سے سیاحوں کی ہندوستان کے متعلق معلومات بالکل سطحی تھیں اور انہوں نے بازاری اطلاعات یا دوسروں کی تقلید میں غلط تخیلات کو دوام بخشا۔ مگر ایسا بیان کرنے والوں میں بعض مثلاً منوچی ہندوستان میں برسوں مقیم رہے تھے اور وہ یہاں کے انتظامی اداروں سے اسی طور پر واقف تھے جیسا کہ اس وقت کا کوئی بھی باخبر ہندوستانی ہو سکتا تھا۔ اس سلسلہ میں جو توجیہات سامنے آئی ہیں ان کے بیان میں ایک طرح کافی صداقت ہے۔ منجملہ یورپی سیاحوں کو مغلیہ دور کے جاگیرداران، یورپ کے ان امرا کی ہو بہو ضرور نقل معلوم ہوتے ہوں گے جو زمین کے مالک ہوا کرتے تھے، اور چونکہ مغل بادشاہ جاگیرداروں یعنی کسی علاقہ کی مالگذاری کے حقوق استفادہ میں حسب مرضی ردّ و بدل کر سکتا تھا، اس لیے یورپی سیاحوں کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا بادشاہ نے اپنے امراء کو ان کے زمین کے قدرتی حق ملکیت سے محروم کر کے ان پر خود اپنا تصرف کر لیا ہے[1]۔ غالباً اس غلطی میں مبتلا ہونا اس لیے اور بھی آسان ہوا کہ ان سیاحوں کو ملک کے ان بڑے علاقوں میں جن میں رعایتی نام کے مواضعات[2] یا کاشتکاروں کے زیر ملکیت مواضعات واقع تھے زمین کی پیداوار میں شریک داروں کا صرف دو طبقہ نظر آیا۔ اوّل، کسان، دوسرا، بادشاہ یا اس کا جاگیردار یا کوئی اور شخص جسے یہ حقوق سونپے گئے ہیں۔ چونکہ وہ بظاہر کسان کو کبھی بھی مالک کی حیثیت میں تصور نہ کر سکتے تھے، لہٰذا انہوں نے یہ حیثیت بادشاہ سے منسوب کر دی[3]۔

---

[1] موازنہ ہو 'Seren, Provincial Govt. of the Moghuls' 130 31 333

[2] رعیتی اور زمینداری مواضعات کی تقسیم کے لیے ملاحظہ ہو باب ۶ کی فصل ایک۔ غلط فہمی سے محفوظ رہنے کے لیے "رعیتی" کو رعیت داری کا جو کہ حکومت برطانیہ میں مالگذاری زمین کے ایک مخصوص نظام کا نام تھا ہرگز مرادف نہ تصور کرنا چاہیے۔

[3] بنگال میں بندوبست استمراری کے قبل انگریزوں نے زمین کے مختلف حقوق کے متعلق (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

لیکن کیا یورپی سیاحوں کا یہ مفروضہ کہ کسان زمین کے مالک نہ ہو سکتے تھے درست ہے؟
ان دنوں بعض مصنفین نے اس نظریہ پر کہ کسان واقعتاً زمین کے مالک تھے بے حد زور دیا ہے۔
گو کہ انہوں نے اس کی تائید میں معقول ہمعصر شہادتیں پیش نہ کیں[1] شہادت کی اس کمی کو ایک
حد تک اب بھی پورا کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے پیش نظر اورنگ زیب کا محمد ہاشم کے نام فرمان ہے
جس میں معمولی کاشتکاروں یا کسانوں کے لیے 'مالکان' اور 'ارباب زمین' (مالکان زمین)
کی اصطلاحیں بالکل واضح طور پر استعمال کی گئی ہیں۔ اس فرمان کی صداقت مشتبہ ہے کیونکہ اسکی
تحریر کا واضح مقصد احکام شرعیہ کی صراحت تھی جو ہندوستان کے زرعی حالات سے مناسبت نہ
رکھتے تھے[2] لیکن ممکن ہے کہ فرمان میں کسان کے لیے مالک کا لفظ استعمال کرنے میں مروجہ طریقوں
کی خلاف ورزی نہ کی گئی ہو۔ خافی خاں اپنے زمانہ کے عمّال مال کے اس معمول کے خلاف کہ وہ کسانوں

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)
دیسی عمّال کی رائے معلوم کرنے کی غرض سے ایک سوالنامہ جاری کیا تھا جس میں سب سے زیادہ یہ سوال پوچھا گیا
تھا کہ "زمین کا مالک کون ہے؟ فرمانروا، حاکم یا زمیندار؟" یاد رہے کہ سوال اس انداز میں ترتیب دیا گیا تھا
کہ کسان بالکل خارج از بحث ہو جاتا ہے۔ اس سوال کا جواب یہ تھا کہ ایام قدیم میں راجہ اور زمیندار زمین
کے مالک تھے۔ لیکن چونکہ شاہان مغلیہ اپنی مرضی سے انہیں بے دخل کر دیا کرتے تھے، لہٰذا اب یہ تصور کرنا چاہیے
زمین کی ملکیت حکمران کو منتقل ہو گئی (Add. 19 504، ورق 100 الف وغیرہ) یہاں پھر دہی یورپی
سیاحوں کی دلیل اختیار کی گئی ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ جاگیردار کی جگہ زمیندار کہا گیا ہے۔
[1] مثلاً Saran, Provincial Govt. & c. 328-35.
[2] موازنہ ہو Agrarian System 133، 139-40۔ مورلینڈ کی طرح یہ قیاس کرنا ضروری
نہیں کہ اس فرمان کا تعلق فتوٰی عالمگیری کی تیاری سے تھا۔ جو پورے اسلامی فقہ پر حاوی ایک تالیف ہے۔
فرمان عالمگیری میں جو ضابطے درج ہیں، انہیں احکام کے شرعیہ کے واقف کار پہلے ہی سے بخوبی جانتے تھے۔
مثلاً ملاحظہ ہو، دستور الالباب فی علم الحساب جو 1357ء میں لکھا ہوا انتظامی ضابطوں کا ایک مجموعہ ہے
(مترجمہ شیخ عبدالرشید Medieval Indian Quarterly نمبر شمارہ 3، ص 66 و مابعد)
واقعی دلچسپی کی بات یہ نہیں ہے کہ فرمان کو شریعت سے اخذ کیا گیا ہے بلکہ یہ ہے کہ جیسا کہ فتاوٰی عالمگیری
کے موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے، اس میں صرف منتخبہ اصولوں کو دہرایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مقصد
یہ تھا کہ صرف ان احکام کو درج کیا جائے جو ہندوستان کے مخصوص زرعی مسائل سے متعلق ہوں۔

کی "مالکانہ (ملکی) اور موروثی زمینوں" کو بیچ ڈالتے تھے احتجاج کرتا ہے[1] چند سرکاری کاغذات میں بھی یہ اصطلاح اس سیاق میں استعمال کی گئی ہے جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ حوالہ کسان کے مالک ہونے کا ہے[2]

مسئلہ کا پیچیدہ پہلو، اصلاً یہ ہے کہ کیا کسان کے حقوق محض برائے نام یا حقیقتاً بھی اس نوعیت کے تھے کہ انہیں صحیح معنوں میں قانون کی رو سے مالکانہ کہا جا سکتا ہے۔ پس کوئی فیصلہ کرنے کے قبل، ضروری ہے کہ کسانوں کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں جو معلومات ہمارے ماخذ فراہم کرتے ہیں انہیں یکجا کر لیا جائے۔

ان معلومات کا مثبت پہلو یہ ہے کہ عام طور پر کسان کے لیے اپنی مزروعہ زمین پر تصرف کا دوامی اور موروثی حق تسلیم کیا جاتا تھا۔ محمد ہاشم کے نام فرمان میں بتایا گیا ہے کہ اگر مالک (اور مالک سے یہاں کسان مراد ہے) زمین کی کاشت کرنے سے معذور ہو یا اگر وہ اسے کلیتہً چھوڑ چکا ہو تو اسے کسی دوسرے ایسے شخص کے سپرد کر دینا چاہیے جو اس کی کاشت کرنے پر رضامند ہو تاکہ سرکاری لگان کا نقصان نہ ہو لیکن جب پھر مالک کاشت کرنے کے لائق ہو جائے یا واپس آ جائے تو زمین اسے واپس کر دینی چاہیے[3] یہ محض ایک نظریاتی اصول ہی نہ تھا بلکہ ایک ویران موضع کی کاشت کو دوبارہ بحال کرنے کی سلسلہ میں جو شاہی سند جاری ہوئی تھی، اس میں اسی اصول کو عملی طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دوسرا شخص مذکورہ ویران زمین کے کنوؤں کی مرمت کر کے اس کو زیر کاشت لانے پر آمادہ تھا۔ سندہ کے متعلق ہدایات تھیں کہ اگر مالک موجود

---

[1] خافی خان I، ص $\frac{8-157}{}$، Add (6573) اوراق 67 ب- 70 الف۔

[2] ملاحظہ ہو نگارنامہ منشی، اوراق 187 الف 188 الف Bodl اوراق 148 ب 149 الف مطبوعہ 143۔ 4 دارالعلوم، اوراق 46 ب- 47 الف۔

[3] دفعہ 3 کا یہی مرکزی موضوع ہے۔ یہ ایسی زمین کے متعلق ہے جس پر خراج موظف، یا لگان بشرح معین ادا کی جاتی تھی۔ لیکن دفعہ 17 میں ہدایت ہے کہ اگر خراج مقاسمہ، یا فصل کے اعتبار سے کم و بیش ہونے والی لگان کی زمین کا مالک کاشت کرنے سے معذور ہو جائے (مرآۃ۔ I، ص $\frac{272}{}$) یا ایک دوسری خواندگی — دارالعلوم ورق 142 الف۔ JASB 1906-2، $\frac{243}{}$ کی رو سے اگر وہ بغیر وارث چھوڑے مر جائے تو اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو خراج موظف ادا کرنے والی زمین کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

ہو اور کاشت کرسکے تو دوسرے شخص کی درخواست نامنظور کر دی جائے۔ محض ایسا نہ ہونے کی صورت میں درخواست منظور کی جائے بشرطیکہ سابقہ مالک بھی اس پر رضامند ہو[1]۔ عہد اکبری و جہانگیری کے دو ضابطوں میں بھی کسانوں کے حقوق ذیلکاری کو ناقابل تنسیخ قرار دیا گیا ہے۔ پہلا ضابطہ آئین اکبری میں درج ہے اور اس میں عمال مال کو کسانوں کی اراضیات (رعیت کا رشتہ) کو سرکاری کاغذات میں مدد معاش کے معافیداران کی ذاتی کاشت کی زمین (خود کاشتہ) کے طور پر درج کرنے سے منع کیا گیا ہے[2]۔ دوسرا ضابطہ جہانگیر کی تخت نشینی پر جاری کئے ہوئے بارہ احکام میں سے ایک ہے۔ یہ عمال مال کو کسانوں کی زمین (زمین رعایا) کو بجز اپنی زمین (خود کاشتہ) میں تبدیل کرنے سے منع کرتا ہے[3]۔

کسانوں کے حقوق کا موروثی ہونا آئین اکبری میں مندرج ایک حوالہ سے واضح ہوتا ہے جس میں بادشاہ کی طرف سے ان کسانوں کے حقوق کی حفاظت کا ذکر آیا ہے جو "مزرو عہ زمینوں پر نسلاً بعد نسلاً متصرف ہیں"[4]۔ جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے خافی خاں بھی کسانوں کی موروثی زمینوں کا حوالہ دیتا ہے محمد ہاشم کے نام فرمان میں کسی مالک کے مرنے پر اس کے ورثا سے لگان سرکاری وصول کرنے کے طریقہ کا بیان بے محل نہیں معلوم ہوتا[5]۔ اس کے علاوہ فرمان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کسان کے حقوق قابل فروخت تھے، حالانکہ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی شخص اسے قابل خریداری تصور تصور کرتا[6]۔

---

[1] نگارنامہ منشی، اوراق 187 الف۔ 188 الف Bod. اوراق 148 ب 149 الف، مطبوعہ 149-4
[2] آئین اکبری۔ ۱۔ ص 287
[3] تزک جہانگیری۔ 4۔
[4] آئین اکبری۔ ۱۔ ص 290
[5] دفعہ ۱۱۔
[6] ملاحظہ ہو دفعہ 13 جس میں دوران سال بیع کی صورت میں خریدار یا مشتری سے لگان وصول کرنے کی ہدایت ہے۔ اس فرمان کے تبصرہ نگار کو جیسے مورخ سرکار نے ہم سے متعارف کرایا ہے اس پورے مفروضہ ہی پر شک ہے جو کسان کی ملکیت کے متعلق فرمان کی عبارت اور دفعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو کوئی بھی کسان اپنی زمین فروخت کئے بغیر نہ بھاگتا اور پھر زمین کو چھوڑنے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

لیکن حقیقی معنوں میں آزادانہ انتقال کا یعنی تابعین کے اپنی مرضی کے مطابق زمین کو ترک کرنے یا علیحدہ کرنے کا جو ان دنوں حقوق مالکانہ کا لازمی عنصر ہے، کوئی سوال نہ تھا۔ لہٰذا اگر ایک طرف، زمین کسان کی ہوتی، تو دوسری طرف کسان زمین کا ہوا کرتا۔ غالباً جب تک اسے کوئی جانشین نہ مل جائے وہ اسے نہ چھوڑ سکتا تھا اور نہ ہی اس کی کاشت سے انکار کر سکتا تھا۔ ایک یورپی مشاہد کے قول کے مطابق "ان (ہندوستانی کسانوں) میں اور پولینڈ کے "سرف" (زرعی غلام۔ یورپ میں زمین سے بندھے ہوئے کسان جو زمین کے ساتھ ساتھ منتقل ہوا کرتے تھے مترجم) میں کوئی فرق نہ تھا، کیونکہ ہر صورت میں ان پر کاشت کرنا لازم تھا۔"[1] محمد ہاشم کے نام فرمان (دفعہ 7) میں صاف طور پر بیان کیا گیا ہے کہ "اگر تحقیقات کے بعد ظاہر ہو کر کاشت کرنے کی اہلیت اور آبپاشی (کی موجودگی) کے باوجود وہ (کسان) کاشت کرنے سے گریزاں ہیں" تو حکام مال کو لازم ہے کہ "ان پر سختی کریں اور انہیں دھمکائیں اور قید کریں و جسمانی سزائیں دیں۔" اگر ان جبری طریقوں پر بھی معلوم ہو کر کسان کاشت کرنے کے قابل نہیں ہو تو پھر زمین پر اس کا حق کم از کم عارضی طور پر ختم ہو کر دوسرے کو منتقل ہو سکے گا۔ عمال دینہ کی طرف سے ایک مچلکہ کے مضمون سے جو صیغہ مال کے ایک دستور العمل (1713 - 2ء) میں درج ہے، اورنگزیب کے فرمان میں مندرج اصولوں کی بجنسہ تائید ہوتی ہے۔ عمال و بہہ خود کو اس امر کا پابند کرتے تھے کہ وہ "کسی بھی کاشتکار کو اس کی زمین نہ چھوڑنے دیں گے،" اور اگر کوئی کاشتکار بھاگ جائے تو وہ مفرور کی زمین کا موجودہ لوگوں کے ساتھ انتظام کرنے کے ذمہ دار تھے۔[2]

اس نظریہ کے قدرتی نتیجہ کے طور پر یہ تصور کیا جاتا تھا کہ حکام کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

کا مسئلہ ہی (بحوالہ دفعہ 3) نہ پیدا ہوتا۔ (T A S B., N. S. 1906ء، ص 244) اس دلیل کو یوں رد کیا جا سکتا ہے کہ باوجودیکہ نظریاتی طور پر زمین فروخت کی جا سکتی تھی، لیکن چونکہ ان دنوں زمین کی قلت نہ تھی اور لگان کا بار اس قدر زیادہ تھا کہ کسان کو اکثر خریدار نہ ملتے رہے ہوں گے۔

[1] گیلنس (Geleynssen J I H) جے، آئی، ایچ۔ 4، ص 78۔

[2] بیکس، ورق 47 ب۔ یہ دستاویز زمینداروں، مقدموں (گاؤں کے چودھریوں) اور پٹواریوں (گاؤں کے حساب نویسوں) کی طرف سے مچلکہ کی شکل میں ہوا کرتا، جس میں یہ لوگ اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کا اقرار کرتے تھے۔ بیکس میں جو دستاویزات درج ہیں وہ سب سرکار سنبھل (صوبہ دہلی) کے کاغذات مال سے ماخوذ ہیں

وہ مفرور کسان کو بہ جبر اس کی زمین پر خصوصاً اس صورت میں جب وہ کسی سردار یا زمیندار کے علاقہ میں بھاگ کر چلا گیا ہو واپس لا سکیں۔ چنانچہ 1641ء میں نوانگر کے جام کے خلاف ایک کامیاب فوج کشی کر کے اسے مجبور کیا گیا کہ وہ "اطراف احمدآباد کے ان کاشتکاروں کو جو اس کے علاقہ میں بھاگ کر چلے گئے تھے اپنے یہاں سے نکال لائے تاکہ وہ اپنے گھروں اور وطن) کے مقامات پر واپس آجائیں"۔[1] عہد عالمگیری کے اواخر میں (تصحیح مابعد) کلیان کے تھانیدار نے پرتگالی مقبوضات پر اپنی فوج کشی کو اس بنا پر جائز قرار دیا کہ "فرنگی" ان کسانوں کو جنہیں وہ زمینداروں کے علاقوں سے ان کی اصل زمینوں پر واپس لایا تھا، دوبارہ ورغلا کر اپنی مملکت میں بسانے کے لیے لے گئے۔[2]

زمین پر کسانوں کے حقوق دخیلکاری کو تسلیم کرنے میں حکام کی مستعدی اور نیز انکی یہ فکر کہ کسان اپنی زمینوں کو نہ چھوڑیں ایک ایسے دور میں جب زمین افراط اور کسانوں کی قلت تھی بالکل قدرتی بات تھی۔ ہم باب اوّل میں دیکھ چکے ہیں کہ دورِ مغلیہ کے دوران بہت سے علاقوں میں زمین زیرِ کاشت کا رقبہ آج سے پچاس برس قبل زیرِ کاشت، رقبہ کا غالباً صرف نصف اور بعض میں دو تہائی سے لے کر تین چوتھائی تک تھا۔ لہٰذا ایک طرف تو اچھوتی زمینوں کے وسیع قطعات کسانوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہتے اور دوسری طرف کسانوں کے پاس انکی کمتر معاشی حالت کے باعث بجز ان کی پرانی وضع کی جھونپڑیوں کے کوئی اور غیر منقولہ جائداد نہ تھی جو اسے اپنے قدیم جائے رہائش سے وابستہ رکھ سکے۔ بابر کا مشاہدہ تھا کہ "ہندوستان میں گاؤں، قریئے بلکہ قصبے

---

[1] لاہوری 2، ص 232؛ مرآۃ 1، ص 214

[2] کارنامہ، اوراق 238 الف 239 الف، 243 ب۔ 244 ب خود پرتگالیوں نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر اپنے مقبوضات میں مکمل زرعی غلامی کو رائج کیا۔ جزیرہ سالٹ کے حالات بیان کرتے ہوئے (1695ء) کیتا ہے کہ "کسانوں کی حیثیت گاؤں کے زمینداروں کے ماتحت سرداروں سے بھی بدتر ہوتی ہے، کیونکہ وہ زمین کی کاشت کرنے کے پابند ہوتے ہیں یا انہیں اس قدر کھیتی کا کام بہرحال کرنا ہوتا ہے کہ وہ زمیندار کو لگان ادا کر سکیں۔ چنانچہ اگر وہ ایک گاؤں سے دوسری جگہ بھاگ جائیں تو زمیندار انہیں بہ جبر مثل غلاموں کے واپس لاتا ہے" (Careri 179؛ انگریزی ترجمہ کے اصل میں مرتبہ کے صحت نامہ کی روشنی میں ترمیم کی گئی ہے)

بھی غیر آباد ہو کر چند لمحات کے اندر اندر از سرِ نو وجود میں آجاتے ہیں۔ اگر کسی بڑے قصبہ کے باشندے جو وہاں برسوں رہ چکے ہوں، وہاں سے بھاگتے ہیں تو وہ اس کام کو کچھ اس انداز میں کرتے ہیں کہ دن ڈیرھ دن کے اندر اندر وہاں ان کی کوئی بھی علامت باقی نہ رہ جاتی تھی، دوسری طرف، اگر وہ کسی نئی جگہ کو اپنی آبادی کے لیے پسند کر لیتے ہیں تو پھر وہ یہ ضرورت نہیں محسوس کرتے کہ وہ وہاں پانی کے بہاؤ کے لیے راستہ کھودیں یا پشتے تیار کریں، کیونکہ انکی تمام تر کاشت بارش کے پانی پر منحصر ہوتی ہے۔ ہندوستان کی آبادی بے پناہ ہے۔ ان کا ایک گروہ یکجا ہو کر ایک تالاب بناتا ہے یا کنواں کھودتا ہے۔ انہیں اس کی بالکل محتاجی نہیں رہتی کہ مکانات یا دیواریں بنائی جائیں۔ خس کے گھاس کی افراط ہے۔ درخت بھی بے شمار (ہیں) اور فی الفور ایک گاؤں یا قصبہ وجود میں آجاتا ہے۔"[1] اس عمومی بیان کے ساتھ ساتھ، اس دور کے ایک دوسرے ماخذ میں مندرج ایک ضمنی حوالہ کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے جس میں مارواڑ کے ایک راٹھور کسان کا اپنے آبائی وطن سے بہار ایسے دور دراز علاقہ میں جا کر آباد ہونا بیان کیا گیا ہے۔[2] ہمیں کسانوں کی نقل و حرکت کی اس صلاحیت کو اس دور کی سماجی اور اقتصادی زندگی کے نمایاں پہلوؤں میں شمار کرنا چاہیئے۔ قحط کے حملوں یا انسان کے مظالم کا کسان کے پاس یہ پہلا جواب ہوتا تھا۔ چنانچہ جاگیرداروں کی اس خواہش کا انہیں وہ مادی وسائل حاصل رہیں جنہیں استعمال کر کے وہ نقل مکانی کو روک سکیں، یہی راز تھا۔

زمین کے معاملہ میں مغلیہ ہندوستان کے کسان اور جدید نظام زمینداری کے تحت رہنے والی اس کی موجودہ اولاد کی حیثیتوں میں نمایاں فرق معلوم ہوتا ہے۔ دورِ حاضر کے زمیندار کا (علاوہ طاقت کے آزادانہ استعمال کے) سب سے بڑا اسلحہ کسانوں کو زمین سے بے دخل کرنے کی رہا ہے۔ اس کے لیے کسی کاشتکاری کا زمین کو چھوڑ دینا کسی تردد کا سبب نہیں ہوتا اور اسے اس عمل سے باز رکھنے کا نہ تو وہ اختیار رکھتا ہے اور نہ ہی اسے اس کی حاجت ہے۔ زمیندار کے قانونی حقوق دورِ برطانیہ کے استمراری یا دیگر بندوبستوں کے عطا کردہ ہیں۔ لیکن بمقابلہ کسان کے

---

[1] بابرنامہ، ترجمہ Bereridge ج 2 صفحہ 487 - 88 میں نے اس ترجمہ میں عبدالرحیم کے فارسی نسخہ کے حوالہ سے کافی ترمیم کی ہے 3714 ، ورق 377 ب۔

[2] حسن علی خاں۔ تاریخ دولت شیر شاہی، Medieval India Quarterly - ا۔ نمبر 1 (جولائی 1950ء) فارسی متن صفحہ 3

اس کی برتر حیثیت کا اصل سبب دو صدیوں کا معاشی جمود ہے۔ (صنعتی ترقی کی غیر موجودگی میں) زمین پر بڑھتی ہوئی آبادی کے دباؤ نے اس وجہ سے کہ اس کے ساتھ ساتھ، طریقۂ کاشت اور معاشی تنظیم میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے، بالآخر زمین کو کمیاب اور انسانوں کو فاضل کر دیا ہے۔

چنانچہ دورِ مغلیہ کے کسان کو وہ حق حاصل تھا، جو برطانوی ہندوستان کے بعض طبقوں کے کسانوں کو بعض صوبوں میں خصوصی قوانین آراضی کے تحت عطا کیا گیا تھا، یعنی دوامی و موروثی حق دخیلکاری۔ بعض صورتوں میں، ان حقوق کی نوعیت کو مالکانہ تصور کیا جا سکتا تھا لیکن مالک کی حیثیت، ایک ایسے آزاد عامل کی ہونی چاہیے جسے آزادانہ حق انتقال حاصل ہو۔ مگر چونکہ کسان اپنی زمین کو قانوناً ترک نہ کر سکتا تھا، لہٰذا اس کی حیثیت حقیقت میں ایک زرعی نظام (سرف) کے قریب قریب تھی۔ لہٰذا، اگر بادشاہ زمین کا مالک نہ تھا تو پھر کسان بھی اس کا مالک نہ تھا۔ بہ الفاظ دیگر، اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ کم از کم رعیتی علاقوں میں ہم کسی واحد مالک کے وجود کو معین نہیں کر سکتے۔ زمین اور اس کی پیداوار پر مختلف حقوق ہوا کرتے اور کسی واحد بلا شرکت غیرے جائداد کے حق کا کوئی وجود نہ تھا۔

ابھی تک ہم نے اپنی توجہ کو رعیتی علاقوں کے حالات تک محدود رکھا ہے۔ اگلے باب میں ہم دیکھیں گے کہ زمینداری کے علاقوں میں بعض اوقات زمینداروں کو عملاً مالکانہ حقوق حاصل رہا کرتے تھے۔ یہ امر کہ، زمینداروں کو مالک کہا جاتا تھا، کوئی فیصلہ کن چیز نہیں ہے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ یہ اصطلاح اس حق کے مفہوم کو صحیح طور پر ظاہر نہ کرتی ہو جو اس کے نام سے واضح ہوتا تھا۔ اس سلسلہ میں قابل قبول سند صرف ایک واحد دستاویزات کی ملتی ہے جس میں اودھ کے دو مواضعات کے کاشتکاران، صرف زمیندار کی اجازت کی صورت میں اپنے کو زمین کی کاشت کرنے کا پابند کرتے ہیں۔ اس کی تفصیلی تعبیر کو اگلے باب پر ملتوی کرتے ہوئے، اس بات پر زور دینا ضروری ہوگا کہ ایک ایسی صورت جو صرف دو مواضعات کے متعلق علم میں آئی ہے ضروری نہیں کہ زمینداری کے عام علاقوں میں بھی پائی جاتی ہو، لیکن یہ ممکن ہے کہ غیر معمولی زرخیزی اور اچھے محل وقوع کی زمینوں کے کچھ ایسے قطعات پائے جاتے ہوں جن کی کاشت کے لیے کسانوں کی کمی نہ رہتی ہو۔ یہ آراضی کے وہ قطعات ہوتے ہوں گے جن کی زمین بے حد زرخیز ہوں گی یا جن کی آبپاشی کا معقول انتظام رہا ہوگا یا پھر وہ جو شہری منڈی کے قریب واقع ہونے کے باعث ان پر کاشت بے حد نفع بخش ہوتی رہی ہوگی۔ ایسی زمینوں کے سلسلہ میں کسان ان کے مالکوں کی عائدکردہ

ہر شرط کو ہمیشہ قبول کر لیا کرتا تھا اور حکام یا زمیندار کو بھی تردد نہ رہتا تھا کہ اگر انھوں نے اسکے کاشتکار کو بے دخل کر دیا تو پھر اس کا بدل نہ ملے گا۔

فصل 2 — دیہی برادری

مغلیہ ہندوستان[1] میں مواضعات کے معاشی ماحول پر اپنی بحث کے دوران، ہم نے دیکھا کہ اس وقت کی دیہی معیشت کا یہ ایک نمایاں پہلو تھا کہ باوجود کہ گاؤں کی پیداوار کا ایک بڑا حصہ شہری منڈی کو چلا جاتا تھا، لیکن اس کے بدلہ میں گاؤں کو مشکل ہی سے کچھ مل پاتا تھا۔ مواضعات، اشیاء کی پیداوار (یعنی بازار کے لیے پیداوار) کی ضروریات سے بے حد متاثر ہوا کرتے اور ساتھ ساتھ انہیں اپنی جملہ ضروریات موضع کے اندر ہی سے پوری کرنی ہوتی چنانچہ روپیہ پیسہ کی معیشت اور خود کفیل ہونے کے حالات پہلو بہ پہلو پائے جاتے تھے۔ غالباً ان دو متضاد معاشی عناصر کی موجودگی، اس سماجی تضاد کا سبب رہا ہوگا جو ہمیں ایک طرف زراعت میں پیدا کرنے کے انفرادی طریقہ اور دوسری طرف دیہی برادری کی تنظیم میں ملتا ہے۔

کسان معہ اپنے کنبہ کے، ہمارے ماٰخذ میں ہمیشہ ایک واحد پیدا کرنے والے کی شکل میں ملتا ہے۔ سرکاری کاغذات میں اس امر کی تاکید ملتی ہے کہ لگان کے تعین کی غرض سے ہر کسان کی آراضی کی تشخیص علیحدہ علیحدہ کی جائے[2]۔ اگر اس تاکید کو صرف کاغذی تصور کر لیا جائے، تب بھی اس کے پس پشت قطعی طور پر منفرد کسان کی کاشت کا تصور ہی ہو سکتا تھا۔ گجرات کے متعلق بصراحت بتایا گیا ہے کہ "کسان اپنی زمین کے حصہ کی حد بندی "خاردار جھاڑیوں کے ذریعہ کیا کرتے تھے"[3]

پچھلی فصل میں ہم نے ان حقوق کی نوعیت پر تفصیلی بحث کی ہے جو کسان کو زمین پر حاصل تھے لیکن ہمارے ماٰخذ میں اس کا ذرا بھی اشارہ نہیں ملتا کہ یہ حقوق کبھی بھی بالاشتراک حاصل ہوا کرتے اشیاء (کموڈیٹی: Commodity) کے پیدا کرنے اور اس کے منطقی نتیجہ یعنی

1۔ باب ایک کی فصل چار اور باب دو کی فصل دو۔

2۔ آئین اکبری۔ ا۔ ص 285 - 6، 288 - راسکر اس کے نام عالمگیر کا فرمان دفعہ 3 وغیرہ۔ کتاب ہذا باب 6 کی فصل 1 بھی ملاحظہ ہو۔

3۔ تزک جہانگیری ص 205۔

زمین پر انفرادی قبضہ نے گاؤں میں کسی قسم کے مساوات کو لازمی طور پر خارج از بحث کر دیا ہوگا[1] پنجاب کے ایک موضع پر تشخیص کیے ہوئے جزیہ (غیر مسلموں پر محصول) کا ایک نمونہ گوشوارہ (1697 - 8ء) جو حساب کتاب کے دو ضوابط ناموں میں محفوظ ہے، ہمارے لیے ایک دلچسپ سند فراہم کرتا ہے۔ اس سے گاؤں والوں کے ذاتی اثاثہ کی تشخیص شدہ مالیت کے حدود کا پتہ چلتا ہے اس میں منجملہ 280 مردوں کے 73 کو بچے، جسمانی طور پر معذور یا غیر موجود وغیرہ ہونے کی بنا پر مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ 22 کو "بالکل نادار" بتایا گیا ہے۔ بقیہ 185 میں 137 کو درجہ سوئم میں جس کا یہ مفہوم ہے کہ ان کے اثاثہ کی مالیت 52 روپیہ سے کم 35 کو درجہ دوئم میں یعنی ان کے اثاثہ کی مالیت 52 روپیہ سے زائد اور 13 کو درجہ اوّل میں رکھا گیا ہے، یعنی ان کے اثاثہ کی مالیت 25.00 روپیہ سے زائد تشخیص کی گئی ہے[2]

گاؤں کے لوگوں کو، ان کے اثاثہ کی مالیت کے اعتبار سے یہ درجہ بندی، دیہی آبادی

---

[1] یہ دلیل پیش کی جا سکتی ہے کہ زمین کی قلت نہ ہونے کے باعث ہر شخص کو برابر کی زمین مل سکتی رہی ہوگی۔ لہٰذا کسانوں کے زیر قبضہ زمین کے رقبہ میں فرق نہ ہونا چاہیے۔ لیکن حقیقت میں ایک شخص اسی قدر زمین پر قبضہ کرتا رہا ہوگا جس قدر کہ وہ کاشت کر سکے اور جو شخص بیج، مویشی، کنواں کھودنے کے لیے روپیہ وغیرہ ایسے وسائل کا مالک ہوتا ہوگا وہ بمقابلہ اپنے مفلس پڑوسی کے زیادہ رقبہ پر کاشت کرنے کے قابل ہوتا ہوگا

[2] خلاصتہ السیاق، علی گڑھ مخطوطہ ورق 41 الف۔ ب 2026، ورق 58 الف۔ ب خلاصتہ السیاق کے مخطوطہ میں دی ہوئی میزانیں مختلف زمروں کے تفصیلی اعداد کے مطابق نہیں ہیں لیکن 2026 میں دی ہوئی میزانیں صحیح ہیں۔

اورنگ زیب کے جزیہ عائد کرنے کے فرمان میں تینوں زمروں کے لوگوں کے اثاثہ کی مالیت کو بمقدار درہم اس طور پر درج ہے: درجہ اوّل 10,000 سے زائد، درجہ دوئم 200 سے زائد اور درجہ سوئم 200 درہم سے کم (مرآۃ۔ ا۔ ص 296) میں نے درجہ سوئم کے لیے منظور شدہ شرح یعنی 3 روپیہ 2 کے 12 درہم کے مساوات کی بنیاد پر، درہم کے اعداد کو روپیوں میں تحویل کیا ہے۔ ایسر داس، ورق 74 الف۔ ب نے اس درجہ بندی کو روپیوں ہی میں دیا ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ درجہ دوئم و سوئم کی مالیت کے سلسلہ میں اس سے سہو ہوئی ہے۔ وہ درجہ اوّل کے لیے 25.00 روپیہ سے زائد، درجہ دوئم کے لیے 250 روپیہ سے زائد اور درجہ سوئم کے لیے صرف 52 روپیہ بتاتا ہے۔

کی مختلف معاشرتی طبقوں میں فی الواقعی تقسیم کی مظہر ہوسکتی ہے۔ درجہ اوّل کے زمرہ میں ہم زمینداران، ساہوکاران اور تاجران غلہ کی مختصر تعداد کو شامل کرسکتے ہیں۔ درجۂ دوئم غالباً دولت مند کسانوں پر مشتمل رہا ہوگا اور درجہ سوئم میں کسانوں کی بھاری اکثریت شامل رہی ہوگی ایک شاہی حکم کی رو سے "چھوٹے کسانوں (ریزہ رعایا) کو جو کاشت کا کام کرتے ہیں، لیکن جنکا استطاعت (کاشت) اور بیج و مویشی کی فراہمی کے لیے کلیتہً انحصار قرض پر تھا" نادار کے زمرہ میں رکھنا چاہیے[1] اغلباً اس آخری زمرہ میں اس سے بھی معمولی حیثیت کے کسان شامل رہے ہونگے بنگال میں وسط اٹھارہویں صدی کے دوران کاشتکاروں کا ایک طبقہ "کلجانہ" تھا جو دوسرے کسانوں کی زمین کی کاشت کرتا تھا۔[2] آخر میں کسانوں کا وہ زمرہ تھا جو صحیح معنوں میں بالکل نادار تھا یعنی بغیر زمین کا مزدور۔ پسماندہ ذات کے لوگ صرف ان کاموں ہی کو نہیں کیا کرتے جنہیں ذات والے کسان حقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتے مثلاً کچی کھال اور غلاظت کی صفائی وغیرہ بلکہ ان کی ایک کثیر تعداد زراعتی مزدور کی بھی ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ چمار اور کچی کھال کے صاف کرنے والے "اجرت پر زمینداروں اور کاشتکاروں کے کھیتوں میں کام کیا کرتے تھے"[3] دھانک، جو اس سے بھی کمتر ذات کے لوگ تھے، انہیں اس نام سے اس وجہ سے پکارتے تھے کہ وہ چاول (دھان) کوٹتے تھے اور اس کے علاوہ وہ "کاشتکاروں کی فصلوں کو کاٹنے اور ڈھونے کی محنت کا کام بھی کیا کرتے تھے"[4] صوبۂ اجمیر میں وہ تھوڑی، اور دیگر مقامات پر بلاہر کہے

---

[1] نگارنامۂ منشی، ورق 180 الف۔ ب۔ Bodl مخطوطہ اوراق 143. ب۔ 144. الف، مطبوعہ نسخہ ص 139 معارف۔ 40 (1937ء) نمبر چار ص 295 بھی ملاحظہ ہو (لیکن ذی تی نادار، کی جگہ 'زمیندار' اور 'قرض' کے بجائے قرض کا اندراج، متن کا نقص ہے)

[2] رسالۂ زراعت Edinburgh 144، ورق 8 الف۔

ان اشیاء کو جنہیں پیدا کنندہ بازار میں فروختگی کی غرض سے نہ کہ خود اپنے صرفہ میں لانے کی غرض سے پیدا کرتا ہے کموڈیٹیز Commodities کہتے ہیں (مترجم)

[3] تشریح الاقوام۔ بانسی 1825، ورق 182. الف۔

[4] تشریح الاقوام، ورق 101ب۔ 102 الف۔ ولسن اس ذات کا نام سنسکرت لفظ 'دھانکا' بمعنی تیر انداز سے اخذ کرتا ہے (ابیٹسن، پنجاب کاسٹس ('Ibbetson, Punjab Castes') ص 295،

جاتے اور ان کا خاندانی پیشہ راستہ بنانے اور سامان ڈھونے کا تھا[1]۔ بلاہر' نام ایک خصوصیت رکھتا ہے کیونکہ اس سے چودھویں صدی کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ جب ضیاء الدین برنی نے ادنیٰ ترین درجہ کے کسانوں کو اسی نام سے موسوم کیا ہے[2]۔

اس سے ہمارا یہ مفہوم نہیں کہ دور حاضر کے دیہی مزدوروں کا کثیر التعداد طبقہ کلیتہً دور مغلیہ کی دین ہے۔ حقیقتاً اس طبقہ میں غیر معمولی اضافہ کا عمل اب سے ڈیڑھ سو برس قبل شروع ہوا تھا[3]۔ علاوہ اس کے جب تک قابل زراعت زمینیں سہل الحصول تھیں' بغیر زمین کے مزدوروں کی تعداد ہرگز زیادہ نہ ہوسکتی تھی' کیونکہ جو بھی کسان اپنی زمین سے محروم ہوجاتا' وہ ہمیشہ دوسری جگہ جاکر اچھوتی زمینوں پر آباد ہوسکتا تھا[4]۔ اس کے باوجود بھی اگر ہمیں' عہد مغلیہ میں بغیر زمین کے مزدوروں کے ایک طبقہ کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے تو اس کے دو اسباب ہوسکتے ہیں۔ اولاً اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ اس وقت زمین کی قلت نہ تھی تو ایک کسان کی مقبوضہ زمین کا اوسط بمقابلہ ان دنوں کے بہت زیادہ رہا ہوگا۔ بڑی آراضی کی صورت میں' کسان کے گھر کے لوگوں کو فصل کی تیاری کے ایسی خصوصی مواقع پر اپنے مزدوروں کی امداد کے لیے عارضی کام کرنے والوں کی زیادہ ضرورت ہوتی رہی ہوگی۔ ایسے مزدوروں دیہاتی آبادی کے صرف غیر کسان طبقہ ہی

---

[1] 'دھانک' اور 'تھوری' کا ہم معنی ہونا تشریح الاقوام' ورق 188 الف' اور 'تھوری' اور 'بلاہر' کا ہم معنی ہونا وتایع اجمیر 131 میں 1679ء کی خبروں کی ایک رپورٹ میں درج ہے۔ یہی ماخذ ان کے روایتی پیشوں کے لیے۔ اس کے علاوہ Add. 6603 اوراق 51 ب۔ 52 الف اور Minors...& c 2 صفحہ 249

[2] خوطا کے بالمقابل' تاریخ فیروز شاہی' مطبوعہ سید احمد خاں' ب۔ انڈ' کلکتہ 1862: صفحہ 287

[3] ملاحظہ ہو ایس جے پٹیل' ایگریکلچرل لیبررس ان انڈیا اینڈ پاکستان S.J. Patol, 'Agricultural Labourcrs in India & Pakistan', خاص طور پر صفحہ 9-20

[4] یہ سرکاری ضابطہ کہ صرف غیر جمعی' کسان (یعنی وہ جن پر کسی دوسری جگہ مالگزاری عائد نہ کی گئی ہو) نئی زمینوں پر بسائے جائیں' ایک طرف تو اس خطرہ کو ظاہر کرتا ہے کہ مالگزاری ادا کرنے والے کسان نئی زمینوں کی لالچ میں اپنی پرانی زمینوں کو چھوڑ دیں اور دوسری طرف اس سے بلا زمین کے کسانوں کے ایک طبقہ کی موجودگی کا بھی پتہ چلتا ہے جو ابھی تک مالگزاری نہ ادا کرتا تھا اور جنہیں نئی زمینوں پر لگایا جا سکتا تھا' نگارنامہ منشی اوراق 103 ب 104 ب 167 الف 168 الف' Bodl. اوراق 79 الف۔ ب 148 ب۔ 149 الف مطبوعہ نسخہ 81 / 144۔

سے حاصل ہوسکتے تھے یعنی گاؤں کے ایسے طبقہ سے جن کا کاشت کے علاوہ کوئی اور پیشہ تھا۔ چنانچہ ایسے مواقع پر چمار اور دھانک جن کے اپنے مخصوص پیشے ہوا کرتے 'زراعتی مزدوروں کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ ان دو مثالوں سے بغیر زمین کے مزدوروں کے طبقہ کے ایک اور سرچشمہ کا پتہ چلتا ہے۔ یہ پسماندہ ذات کے افراد سے جو موجودہ ایام میں بھی بغیر زمین کے مثالی طبقے شمار ہوتے ہیں فراہم ہوتا تھا[1] معلوم ہوتا ہے کہ ذات پات کے اپنے کٹر نظام کی وجہ سے زرعی پیداوار کے لیے مخصوص مزدوروں کا ایک مستقل طبقہ وجود میں آیا۔ نیچی ذات کے افراد جن کے سپرد انتہائی ذلیل اور حقارت آمیز کام ہوتے، ان کسانوں سے بھی کبھی ہمسری کا دعوٰی نہ کر سکتے تھے جو خود اپنی زمینوں پر قابض تھے یا ان کی کاشت کرتے تھے۔ یہ بات حقیقتاً قابل حیرت نہ ہوگی کہ ان میں سے بہتوں کی واقعی حیثیت نیم غلاموں کی رہی ہو جس کا مفہوم ذات والے کسانوں یا زمین والوں کی ایک مخصوص برادری کی بندگی سے تھا[2]

ذات پات کے نظام نے کسانوں اور بغیر زمین کے مزدوروں کے درمیان جو موروثی امتیاز پیدا کر دیا تھا اس سے ایک طرف تو گاؤں میں ایک حد تک طبقاتی اونچ نیچ کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اور دوسری طرف یہ اس " ناقابل تنسیخ تقسیم کار" کی مثال بھی ہے جو بقول مارکس ہندوستان میں دیہی برادری کے قیام کے لیے ناگزیر تھی۔ گاؤں میں تقریباً سب ہی دستکاری

---

[1] موازنہ یہ S.J/ Patels Agricultural Labourers & c 63 - 65 جس میں موجودہ حالات کے متعلق جو رائے ہے اس کی بنیاد پر یہی اعتراض کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ مختلف صوبوں کی مجموعی آبادی اور پست اقوام وزراعتی مزدوروں کے تناسب میں مشکل ہی سے کوئی تعلق پایا جاتا ہے۔

[2] موازنہ بہ Crooke, North-Western Provinces 208 مورلینڈ Agrarian System 160 مارکس جس وقت علاوہ دیگر باتوں کے ہندوستان کی دیہی برادریوں کے متعلق "غلامی" کا، لعنت میں "آلودگی" کا ذکر کرتا ہے اس کے ذہن میں غالباً اسی قسم کی غلامی رہی ہوگی New York Daily Tribune 25 جون 1853، جو کارل مارکس آرٹکلس آن انڈیا (Karl Marx. 'Articles on India') بمبئی 1951 ص 28-29 میں دوبارہ طبع ہوا ہے) ہمعصر ماخذ پست ماندہ اقوام کی حیثیت کے متعلق کوئی بلا واسطہ شہادت فراہم نہیں کرتے، مگر یہ بات قابل توجہ ہے کہ ان ذاتوں کے بہت سے اقسام کے نام اونچی ذاتوں (گروہوں اور قبیلوں) کے نام پر ہیں۔ اس بات سے یہ اندازہ ملتا ہے کہ یہ اونچے نام والے نیچی ذات کے لوگ کسی وقت متعلقہ اونچی ذات کے لوگوں کے نوکر رہے ہوں گے۔

مثلاً بڑھئی، کمہار وغیرہ کے کام علیحدہ علیحدہ ذات کے لوگوں میں تقسیم تھے اور ممکن ہے وہاں انکی نمائندگی ایک خاندان سے زائد نہ کرتا ہو۔ خود کفیل ہونے کی ضرورت، وہ معاشی سبب تھا جس نے ہر موضع میں بعض بنیادی دستکاری کا قیام لازمی کر دیا تھا لیکن، اگر "کاروبار کی تقسیم" ابتداءً "از خود وجود میں آگئی تھی" تو اسے "ذات پات کے قانون نے راسخ کرکے بالآخر مستقل کر دیا۔" ایک بار اس تقسیم کے مکمل ہو جانے کے بعد، ہر موضع بذات خود ایک جداگانہ معاشی اور سماجی اکائی یعنی ایک برادری کی شکل اختیار کر لیتا تھا اور اپنی آبادی کے کسی اضافہ کی صورت میں، یہ اکائی خود اپنے اندر سے اسی نمونہ کی دوسری برادری قائم کر سکتی تھی[1]

اس اکائی کے اندر، کسان قدرتی طور پر دیہی آبادی کا سب سے بڑا جزو ہوتا تھا۔ گو کہ عموماً "کسانوں میں متعدد ذاتیں پائی جاتی تھیں، لیکن غالباً ایک گاؤں کے کسان بیشتر ایک ہی ذات کے افراد ہوتے تھے۔ یہ صورت آج بھی متعدد مواضعات میں پائی جاتی ہے، مثلاً وسطی دوآبہ میں مواضعات کو اکثر وہاں کے رہنے والے ٹھاکر، جاٹ، اہیر، گوجر یا کسانوں کی دوسری ذاتوں سے پہچانا جا سکتا ہے۔ یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جب ذات پات کی بندشیں سخت تھیں، تو یہ صورت حال اور بھی زیادہ شدید رہی ہو گی۔ اجمیر کے وقائع نویس کی ۱۶۷۹ء کی اطلاع میں ذات پات کے نظام کے اس پہلو کو بہ تاکید واضح کیا گیا ہے۔ وقائع نویس مذکور سے "ایک گاؤں کے لوگوں نے جو جاٹ ہیں" بعض راجپوتوں کے خلاف جنہوں نے ان کے موضع کو رات میں گھیرنے کے بعد دریافت کیا کہ گاؤں میں کوئی راجپوت ہے یا نہیں، شکایت کی۔ اس گاؤں میں صرف ایک "نادار" راجپوت تھا جو اپنی ناداری کے سبب سے وہاں بس گیا تھا۔ محاصرین نے اسے پکڑ کر قتل کر ڈالا کہ تاکہ اس کے سر کو دو سرکاری قاصدوں کے قاتل کے سر کے طور پر پیش کیا جا سکے[2] اس سانحہ سے یہ اندازہ ملتا ہے کہ راجپوتوں اور جاٹوں کے لیے ایک گاؤں میں ساتھ ساتھ سکونت اختیار کرنا معمولات میں نہ تھا۔ حد یہ تھی کہ ایک راجپوت جس نے حالات کی مجبوری سے جاٹوں کے گاؤں میں

---

[1] مارکس، کیپٹل، طبع اوّل، ڈونا ٹور، 52-35 Marx, 'Capital', I ed. Donar Torr ; میں دیہی برادری کی معاشیات کے متعلق مشہور عبارت ملاحظہ ہو۔

[2] وقائع اجمیر، 132 یہ رپورٹ فروری۔ مارچ ۱۶۷۹ء کی مدت کے بارے میں تھی اور یہ موضع علاقہ پیرتہ میں واقع تھا۔

سکونت اختیار کی تھی اپنی ذات کے لوگوں کی تمام ہمدردیوں اور مہربانیوں سے محروم ہوگیا۔

ایک گاؤں کے کسان بیشتر ایک ذات ہی کے نہیں بلکہ اس ذات کی ایک ہی خاص شاخ درشاخ کے افراد ہوتے تھے۔ وہ اپنے کو ایک ہی مورث کی اولاد کہتے، لہٰذا ان کا تعلق ایک ہی بھیاچارہ یا برادری سے ہوا کرتا۔[1] اس برادری کے افراد میں خون کے تعلق کی بناء پر جس درجہ کا مستحکم اتحاد پایا جاتا تھا، ویسا محض ہمسائیگی کی بنیاد پر قائم نہ ہوسکتا تھا۔ وہ لوگ جو اس برادری سے تعلق نہ رکھتے تھے اور نہ ہی اس گاؤں میں رہتے تھے، لیکن یہاں پر ان کی کاشت تھی، ایک علیٰحدہ زمرہ میں جسے 'پائی کاشت' کہا کرتے رکھے جاتے تھے۔[2]

پس، دیہی خودکفالت کی بنیاد پر جو کسانوں کے درمیان موروثی تقسیم کار اور ذات کے باہمی ارتباط سے پوری ہوتی تھیں، دیہی برادری وجود میں آئی ہم یہاں جب دیہی برادری کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ گاؤں کی کوئی کمیون (برادری) ہوا کرتی جو اس کے جملہ ممبروں کی طرف سے زمین کی مالک تھی۔ ہمیں زمین کی مالک تھی۔ ہمیں زمین کی کسی اجتماعی ملکیت کی کوئی سند نہیں ملتی اور نہ ہی یہ پتہ چلتا ہے کہ کسانوں کے درمیان زمین کی کوئی میعادی یا دوبارہ تقسیم عمل میں آئی ہو۔ جیسا کہ پیشتر گذر چکا ہے، کسان کا زمین پر حق ہمیشہ انفرادی ہوا کرتا تھا۔ یہاں یہ کہنا مقصود ہے کہ پیدا کرنے کے عمل کے علاوہ بعض معاملات ایسے ہوا کرتے جن میں ایک برادری کے کسان اکثر اجتماعی طور پر کام کرتے تھے اور انہوں نے اس نوعیت کے اجتماعی کاموں کی انجام دہی کے لیے جو جماعت قائم تھی ہم اسے دیہی برادری کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ان دنوں کے حالات کے تحت کچھ ایسے میدان عمل پائے جاتے تھے جن میں اجتماعی کام ناگزیر ہوا کرتا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان دنوں نقل مکانی، کسانی زندگی کی ایک عام خصوصیت تھی

---

[1] Agrarian System ص 160 میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی شہادتوں پر مارلینڈ کا جائزہ ملاحظہ ہو موازنہ بہ نیز بیڈن پاول، ویلیج کمیونٹی Beden Powell Village Community ص 274 و مابعد کے لفظ بھیاچارہ (بھائی یعنی برادری) اور آچار (یعنی برتاؤ) سے مرکب ہے۔ Elliot Menors & c ،2 ص 23

[2] رسالہ زراعت Edinbergh، 144، اوراق ۷ ب ۔ ۸ الف Agrarian System 161 نوٹ اور Zamindari Abolition Committee Report ص 64 جس میں ہولٹ میکنزی (Holt Mackenzic) کی 1819ء کی رپورٹ کا حوالہ ملتا ہے۔

ہم واحد افراد کے دور دراز مقامات پر منتقل ہو کر جنگلوں کے کاٹنے کا مشکل ہی سے تصور کر سکتے ہیں یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا تھا جب لوگ بقول بابر "ایک گروہ" میں کام کریں۔ دوسری غالباً اہم ترین بات یہ تھی کہ گاؤں والوں کو حکومت سے مقابلہ کی صورت میں متحد ہونا پڑتا تھا۔

یہ دوسری صورت کونکن کی دیہی برادریوں کے متعلق سولہویں صدی کی ایک سرگذشت میں بخوبی واضح کی گئی ہے۔ مونسریٹ مخصوص جزیرہ سالسٹ کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہے۔

"یہاں 84 الائیے (مواضعات) ہیں جو کم کر کے 12 کر دیئے گئے ہیں اور یہ ایک دارالسلطنت میں جو 'جنرل چیمبر' کہلاتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ پورے جزیرہ اور نیز پورے کونکن پر حکومت کرتے ہیں۔ طریقہ حکومت یہ ہے کہ ان 12 الائیوں کے دو دو نمائندے مع اپنے اپنے ساتھیوں کے ایک مخصوص جگہ جمع ہوتے ہیں اور وہاں ایک جلسہ میں امور مفاد عامہ اور ہز ہائینس (شاہ پرتگال) کی لگان (بدل خدمت) اور مالگذاری کی اصولی کے طریقہ کار کے متعلق طے کرتے ہیں۔ کوئی فیصلہ ہو جانے پر 'کاتب' مثل نیلام کی بولی بولنے والے کے اس کا چلا کر اعلان کرتا ہے (اور اسے وہ لوگ 'فیو' کہتے ہیں) جو ان کا متفقہ اقرارنامہ ہوتا ہے اور اگر ان میں سے صرف ایک نمائندہ فیصلہ سے متفق نہ ہو تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ صرف کاتب ہی تنہا فیصلہ کی تصدیق کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی دستخط نہیں کرتا، خواہ یہ اہم ترین ہی معاملہ کے متعلق کیوں نہ ہو۔ ہز ہائینس کی مالگذاری کچھ اس طور پر مقرر کی جاتی ہے کہ اسکی ادائیگی بہرحال لازمی ہوتی ہے خواہ زمین کی پیداوار کم ہو یا زیادہ۔ اور اگر کسی الایہ کی پوری فصل برباد ہو جاتی تو دوسرے اس کے جانب سے ادا کرتے اور کچھ بچ رہتا تو یہ ان میں تقسیم کر دیا جاتا۔ اس جزیرہ کی عملداری اور انتظام ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جنہیں گن کار (Gancares) کہتے ہیں[1]

اس نہایت دلچسپ عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ کونکن برادریوں کی نمایاں خصوصیت ان کا مشترک مالی سرمایا تھا، جس میں ہر شخص جمع کرتا تھا اور جس سے گاؤں کے نمائندے مالگذاری کے مطالبہ کو پورا کرتے تھے۔ فاضل رقم یا تو پھر انہیں میں تقسیم ہو جاتی، یا اس کا ایک جز دنا لبا

---

[1] مونسریٹ، انفارمیشن "Monserrate Information" ترجمہ ہوسٹن۔ این۔ ایس، 18، 922، ص 351-2 وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ گوا کے قریبی جزائر چوور اور دیور کے مواضعات کا انتظام بھی اسی طرز پر تھا (ایضاً 362) اس کی یہ تحریر 1579ء کی ہے

مفاد عامہ کے کاموں پر صرف کر دیا جاتا تھا۔

شمالی ہندوستان کی دیہی برادریوں کے متعلق اس قسم کا کوئی ہمعصر بیان نہیں ملتا۔ مگر سرکاری دستاویزات میں ادھر ادھر ان کی کچھ جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ ہم ان ایام میں جب گاؤں کے کسانوں کو اجتماعی طور پر روپا دار اور لگان ادا کرنے والا یا بالاشتراک حکام کا کھلم کھلا مقابلہ کرتا ہوا پاتے ہیں (تجاویز ٹوڈر مل ۲۷ جلوس اکبری) تو ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ مذکورہ قسم کی برادریاں پائی جاتی تھیں[1] یا جب ہم آئین اکبری کا یہ بیان پڑھتے ہیں کہ پٹواری "کسانوں کی طرف سے جمع و خرچ کا اندراج کرنے والا حساب نویس ہوتا ہے۔ اور کوئی بھی گاؤں بغیر ان کے نہیں ہوتا" تو مونسریٹ کی بیان کی ہوئی[2] برادریوں کے "کاتب" کی یاد تازہ ہوتی ہے[3]۔ یہاں ہم پھر گاؤں کے لوگوں کو اجتماعی طور پر ایک شخص واحد کو اپنی ملازمت میں رکھتا ہوا پاتے ہیں جس کا دور حاضر کا جانشین قطعی طور پر ایک سرکاری ملازم ہے۔ پٹواری کے تحریر کئے ہوئے اندراجات بھی معنی خیز ہیں کیونکہ ان سے اس امر کا اشارہ ملتا ہے کہ ہر گاؤں کا اپنا جمع خرچ یعنی مشترکہ سرمایہ ہوا کرتا تھا۔ حقیقت میں اس امر کی قطعی شہادت موجود ہے کہ کوکن کی دیہی برادریوں کی طرح شمالی ہندوستان کے مواضعات میں بھی ایک مشترکہ مالی سرمایہ پایا جاتا تھا۔ حالانکہ پٹواری کے کاغذات، مغلیہ سرکاری تحریروں کے جزو کی حیثیت نہ رکھتے تھے، تاہم عمال مال کے حسابات کی جانچ (بر آمد) کے سلسلہ میں ان سے استفادہ کیا جاتا تھا[4]۔ پٹواریوں کے کاغذات کی بنیاد پر محاسب کے تیار کئے ہوئے گاؤں کے حسابات کے

---

[1] تجاویز کا دفعہ 8 ۔Add 27247 ، ورق 332 الف میں مندرج متن کی عبارت جو غالباً تجاویز کے اصل مسودہ کی صحیح نقل ہے بمقابلہ اکبرنامہ، ب۔ انڈ۔ 3 ص 382 کے آخری ترجمہ کے زیادہ تفصیلی ہے۔ آخری ترجمہ میں 'رعایائے اہل' (گاؤں کے کسانوں) کا ذکر کرتے ہوئے حکام مال کے نام ہدایت ہے کہ ان کے ساتھ اس طور پر پیش آئیں کہ انہیں وقت پر لگان ادا کرنے کی ترغیب ہو اور ایڈ 27247 میں رعایائے موضع اقتادی یعنی "قابل اعتماد مواضعات کے کسانوں" کا حوالہ دیتے ہوئے ہدایت کی گئی ہے کہ ہر پرگنہ کے متعلق ایسی فہرست تیار کی جائے جس میں وفادار کسانوں (رعیت خاص) اور باقی کسانوں (متمرد) علیحدہ علیحدہ درج ہوں۔

[2] از طرف برزگران، غالباً اس مفہوم میں کہ (کسانوں کی طرف دیا ان کے ملازم رکھے ہوئے)

[3] آئین اکبری۔ ا۔ ص 300 ،

[4] اکبرنامہ 3 ص 457 آئین اکبری، ا ص 288-9 راسکداس کے نام فرمان، دفعہ ۱۱۔ سیاق نامہ ص 75-76۔ خلاصۃ السیاق، ورق 91 ب۔ Or. 2026 ، ورق 59 الف۔

گوشواروں کے نمونے دورِ عالمگیری کے حساب کتاب کے تین ضوابط ناموں میں نقل کئے گئے ہیں اور ان سے گاؤں کی مالیات کے متعلق بیحد مفید معلومات فراہم ہوتی ہیں[1]

ان میں سب سے پہلے منفرد کسان کی ادا کی ہوئی رقم کو گاؤں کی آمدنی کے طور پر درج کیا گیا ہے[2]۔ ناتھا رام کرداس کے نام عالمگیر کے فرمان کے رخصار میں انہیں ادائیگیوں کا حوالہ آیا ہے اس دفعہ میں حکام مال کے نام ہدایت ہے کہ وہ "ہندوی حسابات کی فارسی میں جانچ کی غرض سے 'باچھ' اور 'بہری مال' اور صلہ، خدمت (فیس) اور نذرانہ غرضیکہ ہر اس چیز کو جو کسان کے گھر سے کسی بھی مد میں باہر نکلی ہو معلوم کریں"۔ 'باچھ' کی اصطلاح، نظام 'بھیاچارہ' کی خصوصیات میں ہے اور دورِ حاضر میں بھی اس سے وہ رقم مراد ہوتی ہے جو برادری کا ہر فرد مشترک سرمایہ میں جمع کرتا ہے۔ 'بہری' کی اصطلاح، عام طور پر چندہ یا لگان کی قسط کے لیے مستعمل ہے لیکن 'بھیاچارہ' مواضعات میں یہ مجموعی زیرِ قبضہ زمین کی ایک چھوٹی تقسیم یا حصہ کا خصوصی مفہوم رکھتی ہے۔ اس طور پر 'بہری مال'، وہ لگان (مال) ہوتی جو ہر برادری کے افراد اپنی زمینوں کے حصوں پر ادا کرتے تھے[3]۔ اسی طور پر گاؤں کے حسابات میں گاؤں کی آمدنی کو اخراجات کی متعدد مدوں کے بالمقابل درج کرتے تھے۔ اخراجات کی سب سے پہلی اور بڑی مد وہ رقم ہوتی جو خزانہ میں بطور لگان

---

[1] دستور العمل عالمگیری، اوراق 41 ب - 42 ب۔ سیاق نامہ 77 - 79 - اور خلاصۃ السیاق، اوراق 92 الف 94 الف د Or 2026 اوراق 59 ب 64 الف) پہلا رسالہ بہار میں اور دوسرا الٰہ آباد میں اور تیسرا پنجاب میں لکھا گیا تھا۔

[2] خلاصۃ السیاق میں ایسا واضح طور پر بتایا گیا ہے۔ موازنہ بہ نیز آئین اکبری۔ ا۔ ص 287

[3] 'باچھ' اور 'بہری' کی اہمیت کے لیے 2Elliot, Menoirs &c ص 23-38 ولسنز گلوسری Wilson's Glossary 42، 70، 71 ملاحظہ ہوں۔ Add. 6603 ورق 50 الف میں 'بہری' کو وہ رقم بتائی گئی ہے جو علاوہ لگان اور ابواب کے ہر منفرد کسان سے طلب کی جاتی ہے۔ اس کی یہ بھی اطلاع ہے کہ اسے دہلی میں باچھ کہتے تھے۔ باچھ کا یہ مفہوم، مغلیہ کاغذات میں بعض اوقات یہ لفظ جس طور پر استعمال ہوا ہے اس کے مطابق ہے۔ مثلاً نگار نامہ منشی ورق 117 الف، Bodl. ورق 91 الف، مطبوعہ نسخہ 91 جس میں قانون گو کو صلاح دی گئی ہے کہ وہ ہرگز "ظلم و زیادتی اور باچھ (جبری وصولی) کے قریب نہ جائیں" لیکن راسکداس کے نام فرمان کے الفاظ کا یہ واضح مفہوم ہے کہ 'باچھ' اور 'بہری مال' اور "فیس نذرانہ" وہ سب کچھ تھا جسے کسان کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ علاوہ اس کے فرمان کے مذکورہ دفعہ میں (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

جمع کی جاتی[1] اس کے بعد مختلف عمال اور ان کے گماشتوں کا صلۂ خدمت (فیس) اور نذرانہ اور حکام کے بعض خصوصی مطالبات کی رقوم ہوا کرتیں۔ یہیں سب سے نیچے، غالباً دلچسپ ترین مد 'خرچ دیہہ' یعنی گاؤں کے اخراجات کی ملتی ہے[2]۔ اس مد میں گاؤں کے مکھیا اور پٹواری کے گذارے، قانون گو اور (تصحیح مابعد) زمین کی پیمائش کرنے والے کے نذرانے اور چودھری کی تواضع کی رقوم وغیرہ شامل ہوا کرتی تھیں[3]۔ ایک کتابچہ میں بمد خرچ ایک کثیر رقم مہاجن (قرض

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ان چار رقوم کی میزان سے، خزانہ میں داخل کی جانے والی رقم (واصلات فوتہ خانہ) کو وضع کرنے کی ہدایت ہے۔ پس، باچھ، اور بہری ال' مل کر تکان کے مسلم مطالبہ کو پورا کر دیتے تھے۔

[1] دستور العمل عالمگیری میں گاؤں کے 4655 روپیہ کے مجموعی خرچ بن خزانہ میں 27 44 روپیہ کی سیاق نامہ میں منجملہ 2118 روپیہ کے 109 روپیہ کی اور خلاصۃ السیاق میں منجملہ 1282 روپیہ کے 1011 روپیہ کی ادائیگی دکھائی گئی ہے۔

[2] گاؤں کے سرمایہ سے علاوہ زمین کی مالگذاری کے بقیہ دیگر ادائیگیوں کے لیے ہندی کا لفظ 'ملبا' ہے۔ لہٰذا اس میں مختلف عمال کے نذرانے اور اخراجات موضع شامل تھے (ملاحظہ ہوں، Wilson Glossary 324 اور Meerut Districst Gazetteer 1922، صفحہ 108) عہد مغلیہ کے کاغذات، مثلاً اکبرنامہ میں تجاویز ٹوڈرمل، 47 172 اوراق 331 ب یادداشت فتح اللہ شیرازی، اکبرنامہ۔ 3 صفحہ 458 (Add. 26207 اوراق 194 ب۔ 195 الف) راجکماس کے نام فرمان، دفعہ 10، نگارنامۂ منشی اوراق 175 ب 189 الف .Bodl اوراق 140 ب۔ 150 الف۔ مطبوعہ نسخہ 136-145 جن میں یہ اصطلاح گاؤں والوں سے عمال کی جبری وصولیوں کے عمومی مفہوم میں اکثر ملتی ہے۔ باب چھ کی فصل سات بھی ملاحظہ۔

[3] (ترجمہ ما بعد) پیرزیہہ کے لفظی معنی سرپا ہو مستے ہے Malcom, Memoirs of Central India 2 صفحہ 13-14 میں اس عہدہ دار کی حیثیت و فرائض منصبی بیان کیے گئے ہیں۔ اتر پردیش میں یہ قانون گو کو ماتحت ہوتا ہے اور اس کی ہدایت کے مطابق پیمائش کا کام کرتا ہے (یہ اطلاع میرے ساتھی مسٹر اطہر علی نے فراہم کی ہیں) (نوٹ: برطانوی اور نیز موجودہ دور میں اس عہدہ کو عرف عام میں مرّدھا' یا چین مین' (Chain man) (چین، لوہے کی جریب کے مفہوم میں) کہتے ہیں اور یہ قانون گو کا چپراسی ہوتا ہے۔ مترجم) دستور العمل عالمگری میں موضع کے نمونہ حسابات میں 'پیرودیہہ' کی بالائی آمدنی کو خرچ دیہہ میں نہیں بلکہ ملازمین مال اور انکے گماشتوں کی جبری وصولیوں کے زمرہ میں رکھا گیا ہے۔

دینے والے) کے قرض کی واپسی کے طور پر دکھائی گئی ہے[1] بظاہر گاؤں کی پوری برادری مذکورہ مشترکہ سرمایہ کی ضمانت پر قرض لے سکتی تھی۔ اس مخصوص معاملہ میں لگی ہوئی رقم، اس سال میں ادا کی ہوئی لگان کا تین چوتھائی تھی اور ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ کسی بھی پچھلے سال میں لگان کے جزوی مطالبہ کی ادائیگی یا کسی آفت سماوی پر قابو پانے کی غرض سے قرض لی گئی ہوگی۔ گاؤں کے اخراجات میں زرعی منصوبوں، مثلاً نالوں پر پشتوں کی تعمیر یا خربوزہ کے بیجوں کی خریداری کے اخراجات بھی شامل رہا کرتے تھے[2] عام تفریحی مشاغل یا گاؤں کے لوگوں کی اخلاقی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے سلسلہ میں بھی اس رقم سے کچھ خرچ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ہم مداریوں اور سوانگ بھرنے والوں کو دی جانے والی رقوم اور مسافروں کو پورا کرنے کے سلسلہ میں بھی اس میں درج پاتے ہیں[3]

چنانچہ گاؤں کے مذکورہ حسابات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مشترکہ سرمایہ میں ہر کسان اپنا حصہ جمع کیا کرتا تھا اور اس سے زمین کی لگان، عمال سرکاری کے مطالبات، لئے ہوئے قرض کی واپسی اور گاؤں کے اقتصادی، سماجی حتیٰ کہ روحانی مفاد کے اخراجات بھی پورے کئے جاتے تھے ہمارے کاغذات سے یہ نہیں پتہ چلتا کہ شمالی ہندوستان کی برادریاں اس سرمایہ کا انتظام اس قسم کے کسی 'جنرل چیمبر' کے ذریعہ کیا کرتیں جن کا مونٹ سٹوارٹ بیٹ نے ذکر کیا ہے۔ بہرحال، مستند روایات مظہر ہیں کہ گاؤں کی ایک پنچایت اپنے لفظی معنی کے اعتبار سے پانچ افراد کی ایک کمیٹی ہوا کرتی تھی۔ پنچایت کو اپنے کام کے سلسلہ میں سب سے زیادہ پیش آنے والے موقع "جو اس وقت بھی، بلکہ ابھی زمانۂ حال تک قائم تھا، ہر کھیت پر متناسب لگان کی تشخیص کے نقطۂ نگاہ سے، بعض مواضعات میں سالانہ یا ہر فصل کے بعد حسابات کی ترتیب اور موضع کے "مشترکہ اخراجات کی" منظوری تھی[4] اس

---

[1] ملاحظہ ہو سیاق نامہ 79 قرض کی رقم جو واپس کی گئی تھی، گاؤں کی مجموعی آمدنی 218 روپیہ میں 80 روپیہ دکھائی گئی ہے۔

[2] یہ مدیں، دستور العمل عالمگیری، میں درج ہیں۔

[3] ملاحظہ ہو خلاصۃ السیاق 108، Meerut District Gazatteer Beden Powell. Indian Village Communnity

[4] Baden Powell Indian Village Community 24، 25۔ ہمارے ماخذ میں پنچایت کا کوئی حوالہ نہ ہونا، باعث حیرت ہے۔

قسم کے موضع میں مکھیا کی حیثیت برادری کے محض ایک نمائندہ کی ہوا کرتی اور وہ ہمیشہ انکی مرضی کے مطابق عمل کیا کرتا۔[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض مواضعات میں مکھیا بھی نہ ہوا کرتے اور ان کے روبرو مواضعات کی نمائندگی ایسے لوگ کیا کرتے جن کے پاس کوئی عہدہ نہ ہوا کرتا بلکہ زیادہ مخصوص اسی مقصد کے لیے برادری کے جانب سے مامور کئے جاتے تھے۔[2]

ایسا خیال کرنا غلط ہوگا کہ تمام دیہی برادریاں مذکورہ بالا خاکہ کے بجنسہ مطابق ہوا کرتی تھیں اور نہ ہی یہ تصور کرنا چاہیے کہ ہر گاؤں کے کسان ایک برادری کی شکل میں منظم رہا کرتے تھے۔ جبکہ، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ایک طرف بعض ایسے عوامل موجود تھے جو کسانوں کو انکی برادریوں سے منسلک کرنے میں معاون تھے، تو دوسری طرف اس کے متضاد عوامل بھی پائے جاتے تھے جو کسانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کا سبب بنتے تھے یا بنیر برادری کے مواضعات کے قیام کو ممکن بناتے تھے۔ اشیاء کی پیداوار[3] کے عمل یا منڈی کے لیے اشیاء کے پیدا کرنے کی وجہ سے کسانوں کے اندر معاشی طبقات پیدا ہو گئے تھے۔ زیادہ دولت مند طبقہ اور بقیہ آبادی کے درمیان فاصلہ کے بڑھنے سے ذات پات اور برادری کے بندھنوں کا ڈھیلا ہونا لازمی تھا۔ یہ توقع جا سکتی ہے کہ ایک منزل پر پہونچ کر زیادہ دولت مند کسان برادری کے دیگر افراد پر تسلط حاصل کر لیا کرتا تھا۔ چنانچہ، اس طور پر مکھیا (مقدم) بڑے لوگ (کلان تران) یا غالب افراد (متغلبان) کے طبقے وجود میں آئے جن پر ہمارے معاصرین کا الزام ہے کہ یہ گاؤں کے

---

[1] Agrarian System 163. 65 Indian Village Community, Baden Powell 24

[2] دراالعلوم، ورق 65 الف۔ ب کے ایک حسب الحکم سے مثلاً ہمیں ایک ایسے موضع کا پتہ چلتا ہے جس کا بظاہر کوئی مکھیا نہ تھا۔ اس میں ایک گاؤں کے کسانوں کی درخواست کا ذکر آیا ہے جن میں سے تین کے نام درج ہیں، مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ گاؤں کے عہدہ دار تھے۔ درخواست دہندگان نے ایک چودھری کے خلاف جس نے گاؤں کو اجارہ پر لیا تھا زائد وصولی کی شکایت کی ہے۔ اس چودھری نے گاؤں کے سرمایہ (خزانہ) سے لمبی رقمیں لے لی تھیں اور اسے چھپانے کے خیال سے اس نے گاؤں کے حسابات (کاغذ خام) کو اپنے قبضہ میں کر لیا تھا۔ گاؤں کے سرمایہ کی موجودگی ایک دیہی برادری کے وجود کی دلیل ہو سکتی ہے۔

[3] ملاحظہ ہو نوٹ مترجم ص 87

مشترک سرمایہ کا جو چاہے سو کرتے، خصوصاً لگان کے کل مطالبہ کو کسان پر اس طور سے تقسیم کرتے تھے جو ریزہ ورعایا یعنی چھوٹے کسان کے مفاد کے لیے مضر ہوتا۔[1] کچھ وقت گذر جانے کے بعد، بعض صورتوں میں برادری کا وجود بالکل ختم ہو سکتا تھا اور اس کے جملہ اختیارات اس کے ان دولت مند افراد میں مرکوز ہو جایا کرتے جو معمولاً گاؤں کے مقدموں کی حیثیت میں نمودار ہوتے۔

فصل 3 — گاؤں کے عمال

ہماری تحریروں میں شمالی ہندوستان میں گاؤں کے مکھیا کو مقدم اور دکن میں اس نے[2] پٹیل کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ پٹواری یعنی حساب نویس کے علاوہ گاؤں کا واحد کارکن ہوا کرتا

[1] رسالہ اس کے نام عالمگیر کے فرمان کا دفعہ 6، خاص طور پر ملاحظہ ہو۔ تجاویز ٹوڈرمل کی اصل عبارت (اکبرنامہ Add. 27,247 اوراق 332 ب) کے غیر شائستہ الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ "(گاؤں کے) اور مقدمین اپنے اپنے حصے اپنے پاس رکھتے ہیں اور (اپنے ذمہ مطالبہ مالگذاری کو) ریزہ ورعایا کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔" آئین اکبری۔ ا۔ ص 286 میں بھی لگان کے محصل کو موضع کلاں تران کے ساتھ نسق (گاؤں پر ایک قسم کی تشخیص) طے کرنے سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ اس سے "ظالمانہ رجحان کے لیے ذی اقتدار لوگوں کو طاقت حاصل ہوتی ہے۔"

[2] "مقدم" عربی زبان کا ایک لفظ ہے جس کے معنی وہ شخص ہے جسے اوّل مقام حاصل ہو۔ ہندوستان میں دور وسطیٰ کے بالکل ابتدائی سے گاؤں کے چودھری کے خصوصی مفہوم میں اس کا استعمال شروع ہو چکا تھا (برنی، تاریخ فیروزشاہی، ب۔ انڈ، 288، 291، 430۔ موازنہ ہو Agrarian System، 19 اور نوٹ 1)۔ مقدم کی دکن میں پٹیل سے مماثلت کے لیے ملاحظہ ہو، آئین اکبری۔ ا۔ ص 476۔ تعجب ہے کہ محض ان دو ناموں کو سرکاری سند حاصل ہو سکی، حالانکہ مقامی استعمال میں چودھری کے متعدد دیگر نام بھی تھے۔ Add. 6603 کا مصنف جو دہلی اور بنگال کے نظام تسمیہ سے واقف تھا مقدم کے علاوہ، 'منڈل'، 'جیٹھ' اور 'مہتون' بھی بتاتا ہے (ورق 81 الف۔ ب) اڑیسہ میں سولہویں صدی میں اسے 'پدھانا' کہتے تھے (J A S B, N.S. 12-1916 ص 30) ابوالفضل ایک مقام پر اس عہدہ دار کے لیے لفظ 'رئیس دیہہ' استعمال کرتا ہے (آئین اکبری ا۔ ص 285) اور اس سلسلہ میں اٹھارھویں صدی کے اواخر کی ایک تصنیف دستورالعمل خالصہ شریفہ (Edinburgh 230 ورق 33 الف میں اس کی تقلید کی گئی ہے۔ اس میں لفظ منڈل کی صراحت کے سلسلہ میں اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔

لیکن ایک گاؤں میں ایک سے زائد مکھیا ہو سکتے تھے اور ہم واقعتاً دیکھتے ہیں کہ ایک گاؤں کو سات مکھیوں تک کی موجودگی کا فخر حاصل ہے۔[1] اس کے عہدہ اور اختیارات میں اضافہ کے عمل کی وجہ سے جیسے ہم نے پچھلی فصل کے خاتمہ پر بیان کیا ہے، ایسا تصور کیا جا سکتا ہے کہ جب ایک بار یہ عہدہ زیادہ دولت مند کسان کے قبضہ میں آکر برادری کے بقیہ افراد پر تسلط حاصل کرنے کے لئے بطور آلہ کار کے استعمال ہونے لگتا تھا تو پھر قدرتی طور پر ان کی یہ خواہش ہوتی رہی ہوگی کہ وہ اس عہدہ پر مستقلاً قابض رہیں اور اسے نجی جائداد کی ایک شئے میں تبدیل کر دیں۔ چنانچہ یہ عہدہ صرف موروثی ہی نہ ہوتا تھا[2] بلکہ اس کی خرید و فروخت بھی ہو سکتی تھی جو نقدی معیشت کی نشو و نما کی ایک دلیل ہے۔[3] مکھیا معمولاً خود کسان ہی ہوا کرتا، لیکن چونکہ یہ عہدہ خریدا بھی جا سکتا تھا، لہٰذا کوئی باہری شخص یا کوئی شہری باشندہ بھی اس پر قابض ہو سکتا تھا۔[4] صحیح معنوں میں وہ کبھی بھی

---

[1] ملاحظہ ہو اودھ کے ایک موضع کی مقدمی کا بینامہ، 1653ء (الہ آباد 1183 -) درالعلوم، ورق 55 ب میں اودھ کے ایک موضع کی مقدمی کے لیے تین درخواست گزاروں کا مشترکہ دعویٰ ملاحظہ ہو اور ایک موضع میں دو مقدموں کے لیے ملاحظہ ہو، الہ آباد 329 - اور 1198 - سیاق نامہ، 29 وغیرہ۔

[2] گاؤں کے مذکورہ ۲ مقدم اس امر کے مدعی ہیں کہ انہیں یہ عہدہ اپنے مورثوں سے پہنچا ہے (الہ آباد 1183) ایک درخواست گزار صاحب سے اپنے عہدہ کے واپس دلائے جانے کی استدعا کرتے ہوئے یوں عرض پرداز ہے: اس موضع کی مقدمی اس کے مورثوں کے وقت سے اس کی تھی؛ نگار نامۂ منشی ورق 127 ب؛ مطبوعہ نسخہ، 98؛ پٹیل کے عہدہ کا موروثی ہونا 1566 کے ایک عادل شاہی شاہی حکم سے ظاہر ہوتا ہے Indian Historical Records Commission 1945-22 (11)

خافی خاں (۱) 733 نوٹ، 73 65 ورق 261 میں بھی جہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ورثاء کی غیر موجودگی کی صورت میں مقدمی کا عہدہ خالی رہنے دیا جائے اسی مفروضہ کو تسلیم کیا گیا ہے۔

[3] الہ آباد 1183- یہ اودھ کے کسی موضع کی "مقدمی کے منافع" کے متعلق 1653ء کا ایک بینامہ ہے۔ سابقہ مالکان کے جانب سے اس عہدہ کے بہ رضا و رغبت کئے ہوئے ایک مبینہ انتقال نامے کے لیے جزناً بیعنامہ تھا، ملاحظہ ہو درالعلوم ورق 55 الف۔ ب۔

[4] الہ آباد، 329 (1677ء) میں دو مقدم اپنے کو واضح طور پر کاشتکار (مزارعین) کہتے ہیں۔ پالم کے مقدم کے حوالہ اور نیز احکام اکبری کے تحت اس کی زمین کو بھر مدد معاش (عطیۂ مالگذاری) تبدیل کئے جانے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بصورت دیگر صرف ایک معمولی مالگذاری تھا (طبقات اکبری، 2 صفحہ 336؛ دستور العمل نویسندگی، اوراق 182 الف - 185 الف سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مقدم کے کھیتوں پر (باقی صفحہ آئندہ پر)

سرکاری ملازم نہ تھا۔ لیکن حکام مال، مکھیا کو اس کے فرائض سے کوتاہی کی علت میں کبھی کبھی برطرف کر سکتے تھے[1] اور ساتھ ساتھ نو آبادیاں ان مواضعات میں جو آباد ہونے والے ہوں، یا پرانے مواضعات میں، جن میں قدرتی ورثاء کے نہ ہونے کے باعث، عہدہ خالی ہو، یہ مکھیوں کو نامزد بھی کر سکتے تھے[2]

مقدم کی حیثیت، فی الواقعی ان رعیتی مواضعات میں جہاں برادری کا نظام کمزور ہوا کرتا

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)

شل دیگر کسانوں (آسامی) کے لگان تشخیص کی جاتی تھی۔ Manccis 2 450 میں بھی صاف ظاہر ہے کہ مقدم کو بڑا کاشتکار کہا گیا ہے۔

دوسری طرف، دار العلوم ورق 55 الف۔ ب میں مندرج ایک درخواست پر حکم سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک قصبہ کے باشندوں کی ایک جماعت نے ایک گاؤں کا، مقدمی کو اسی قصبہ کے تین دیگر اشخاص کے حق میں بیع کیا تھا۔ اسی طور پر، ہم جب 7 مقدموں کو جن کے نام غیر مسلموں کے ہیں اپنے مواضعات کے حقوق مقدمی کو ایک واحد مسلمان کے نام اس قدر گراں قیمت یعنی 230 روپیہ پر فروخت کرتا ہوا پاتے ہیں (الہ آباد ر 1183) تو ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ اس کا خریدار کوئی باہری شخص اور غالباً کوئی سٹہ باز رہا ہوگا۔

[1] ایک درخواست پر جس میں بربنائے وراثت کسی گاؤں کی مقدمی کا دعویٰ کیا تھا، بذریعہ پروانہ حکم صادر ہوا کہ "اگر سابقہ حکام بربنائے سرکشی و نااہلی 'شکایت کنندہ' اسے کسی اور کو منتقل نہ کر چکے ہوں" تو یہ اسے واپس کر دی جائے (نگارنامہ منشی ورق 127 ب .Bodl ورق 98 ب، مطبوعہ 98)
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جاگیرداروں کو اپنی مرضی سے مقدم کو برطرف کرنے کا اختیار نہ رہتا تھا، مثلاً الٰہن پور کے مقدم اور وہاں کے جاگیردار کے لڑکے کے درمیان نزاع کی رپورٹ ملاحظہ ہو جس میں مقدم کو شاہی حمایت حاصل رہی ہو (وقائع اجمیر، 64 - 65) غالباً چودھری کو معزول یا نامزد کرنے کے اختیارات صرف شاہی اختلافیہ ہی کو حاصل رہا کرتے تھے۔

[2] عہد شاہجہانی کے اواخر میں دیوان دکن مرشد قلی خاں نے "غیر مزروعہ زمینیں ایسے لوگوں کو دیں جو کسانوں کو آباد کرنے اور ان کی دیکھ بھال کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ انہیں خلعت اور مقدمی کا عہدہ عطا کر کے کاشتکاری (کے کام) پر مامور کیا" (صادق خاں .Or 174 ورق 185 ب Or 1671 ورق 91 الف) خافی خاں I۔ 733 (نوٹ) کی عبارت یوں تو عام طور پر صادق خاں کی عبارت کے مطابق ہے، (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

یا سرے سے موجود ہی نہ ہوتا، بہت اہم ہوا کرتی۔ حکام، گاؤں پر تشخیص کی ہوئی لگان کا اسے اولین ذمہ دار ٹھہرایا جاتا[1] چنانچہ، ہر کسان کے حصے کی لگان کی وصولی اس کے فرائض میں تھی[2] اس خدمت کے معاوضے کے طور پر اسے موضع کی کل تشخیص شدہ زمین کا 2½ فیصدی رقبہ بلا لگان ملتا تھا، یا بصورت دیگر وہ اپنی کل وصول کی ہوئی لگان کی رقم سے خود ڈھائی فیصدی وضع کر لیتا تھا[3]

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)
لیکن اس میں اس مقام پر کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ بقول اس کے مرشد قلی خاں نے "ان مواضعات میں جہاں شوئی تقدیر سے سابقہ مقدموں کے ورثاء کے لاپتہ ہو جانے کے سبب سے مقدم نہ تھے، نئے مقدم مقرر کیے۔

[1] موازنہ بہ آئین اکبری، ا، صفحہ 285 جس میں اسے 'ڈیس دیہہ' کا نام دیا گیا ہے۔ مقدموں کی دستخطی قبولیتیں یا ایسے کاغذات کی نقلیں جن میں مطالبہ لگان کو قبول اور اس کی ادائیگی کا انہوں نے اپنے کو پابند کیا ہے، فرہنگ کاروائی، ورق 34 الف۔ ب، سیاق نامہ، 29 اور خلاصۃ السیاق اوراق 74 الف۔ 75 الف 2026، اوراق 23 الف 24 ب میں موجود ہیں۔ موازنہ بہ نیز Factories 1622-23، صفحہ 353-4

[2] آئین اکبری۔ ا، صفحہ 283 ("آئین بتکچی" کے تحت) ملاحظہ ہو نیز۔ 2 صفحہ 405 جس کے بقول لگان کی وصولی کے لیے "ضروری ہے کہ خاص سربراہوں کو پابند کیا جائے جو" کسانوں سے اسی قدر سختی سے وصول کرتے ہیں۔"

[3] آئین اکبری۔ ا، صفحہ 285 مرآۃ۔ ا، صفحہ 173 آئین اکبری کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ اجرت کا اول الذکر طریقہ زیادہ تر معمول کے مطابق تھا برار کے پرگنہ پیل کے کاغذات میں بتایا گیا ہے کہ دیگر عمال کی طرح مقدم کے پاس بھی بغیر لگان کی کچھ زمینیں ہوا کرتی تھیں (I.H.R.C. 1929، صفحہ 85-86) مرآۃ مذکورہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ لگان سے 5 فیصدی رقم لے کر مقدم اور دیسائی (چودھری) کے درمیان برابر برابر تقسیم کر دی جاتی تھی بالکل اسی طور پر ایک اور بار تھا جسے صد دوئی یا دو فیصدی کہتے تھے جو پٹواری اور قانون گو کے درمیان برابر برابر تقسیم ہوتا تھا (آئین اکبری۔ ا، صفحہ 300) عہد اکبری اور اس کے بعد کے دستاویزات مدد معاش میں جو فہرست ایسے محصولوں کی دی ہوئی ہے جن سے معافیداران کو چھوٹ رہتی تھی ان میں اکثر علاوہ 'صد دوئی قانون گوئی' ایک اور محصول یا محصولات موسومہ 'دھ ہیمی' شامل ہیں۔ لفظ 'دھ ہیمی' بہ معنی دس کا نصف یعنی پانچ فیصدی ہوا کرتا (الہ آباد (2) 23 میں جو اکبر کا 75-1515 کا جاری کیا ہوا ایک فرمان ہے 'دھ ہیمی' اور 'مقدمی' کو ایک دوسرے سے علیحدہ مگر دور جہانگیری سے انہیں برابر ایک ساتھ جوڑا جانے لگا تھا۔ Add. 6603 ورق 61 ب میں 'دھ ہیمی' کو مقدم کا حق اور گاؤں کی جملہ وصولی کا پانچ فیصدی بتایا گیا ہے۔ خلاصۃ السیاق، اوراق 40 ب 44 الف کے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

لیکن یہ خطرہ برابر محسوس کیا جاتا تھا کہ آزاد چھوڑ دیئے جانے پر وہ مطالبۂ لگان کو پورا کرنے یا عمال مال کے نذرانے کے نام پر، مکرر کسانوں سے غیر قانونی طور پر کثیر رقمیں وصول کرنا شروع کر دے گا۔[1] جب حکام، کاشتکاری کی ہمت افزائی کے خیال سے تقاوی کے قرضوں کو تقسیم کی منظوری دیتے تو یہ رقم بھی گاؤں کے مکھیا ہی کی وساطت سے کسانوں کو تقسیم ہوا کرتی جو یقیناً اپنا کمیشن وصول کیا کرتے تھے۔[2] علاوہ ان مالی منفعتوں کے جو ان اختیارات کی وجہ سے حاصل یا ممکن الحصول تھیں، مقدم گاؤں کے سرمایہ سے خوراک یا قیام کے نام پر کچھ دستوری یا بالائی رقمیں[3] اور ہر کسان سے منفرد، ایک دوسرا محصول موسومہ 'مقدمی' وصول کیا کرتے تھے۔[4]

مقدم کے گاؤں پر اختیارات صرف مالیات ہی تک محدود نہ رہا کرتے، بلکہ وہ ہر اس جرم

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

نمونۂ حسابات میں وصولی مالگذاری (حسب الحصول) میں 16. روپیہ 14، فی ہزار کی شرح پر مقدم کی اجرت (انعام مقدمی) وضع (مجرا) کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پانچ فیصدی کی شرح جس میں مقدم کا حق نصف ہوا کرتا محض برائے نام تھی اور حقیقتاً یہ شرح مختلف علاقہ میں مختلف ہوا کرتی تھی۔

[1] عباس خاں اوراق 11ب 12 الف، 106 الف۔ راس کداس کے نام عالمگیر کے فرمان دفعہ 5 مواضعات کے لگان کی بالمقطع چھوٹ کو اسی سبب سے کہ چودھری منفرد کسانوں کو اس سے مستفید نہ ہونے دے گا، ہمت افزائی نہ کی جاتی تھی۔ ملاحظہ ہو باب 5 کی فصل 4

[2] ملاحظہ ہو باب 5 کی فصل 8۔

[3] 'خوراک مقدمان' کو پہلی فصل میں جن تین دیہی حسابات پر بحث آئی ہے ان سب میں 'خرچ دیہہ' کے تحت دکھایا گیا ہے۔ ان میں سے دو میں یہ خرچ بہت کم یعنی کل ادا کی ہوئی لگان کے ایک فیصدی کے ثلث سے کم ہے، 'سیاق نامہ' میں بیشک یہ دو فیصدی سے زائد ہے مگر ممکن ہے اس میں دیگر اخراجات مثلاً پٹواری کا خرچ بھی جو اس کے حسابات میں نہیں دکھایا گیا ہے شامل ہو۔ خوراک کے معنی تو کھانا یا غذا ہوتا ہے، لیکن ممکن ہے اس نام کے خرچ میں مکھیا جب گاؤں کی کسی ضرورت سے باہر جاتا تھا تو اس کے وہاں کے قیام کا خرچ بھی شامل رہتا ہو۔

[4] جیسا کہ فٹ نوٹ 10 میں پہلے ذکر آیا ہے، سترھویں صدی کے فرمانوں میں مدد معاش پانے والوں کو جو محصولوں سے چھوٹ دی گئی ہے ان کی فہرست میں مقدمی کا 'دھدیمی' کے ساتھ جوڑ لگایا گیا ہے (یعنی یہ نام موٹا درج ہے؛ دھدیمی و مقدمی)۔ 'دھدیمی' ایک ایسی رقم تھی جو وصول شدہ لگان سے مجرا کی جاتی تھی نہ کہ خود کوئی محصول، یہ امر کہ مقدمی ہر کسان پر عائد کیا ہوا کوئی محصول ہوتا، بالکل قیاس آرائی معلوم ہوتی ہے۔

کے لیے جو گاؤں یا اس کے نواح میں سرزد ہوتا ذمہ دار قرار دیا جاتا، خصوصاً ڈاکہ زنی یا مسافروں کے قتل کی صورت میں مجرم اور مال مسروقہ دونوں کی برآمدگی کا وہ ذمہ دار ہوتا[1] اس ذمہ داری کی وجہ سے وہ "اپنی سبکدوشی کے خاطر کسی مجبور شخص کو ملزم قرار دینے پر" اپنے کو مجبور پاتا تھا۔[2] چنانچہ یہ ایک مزید آلہ کار ہوا کرتا جسے مقدم استعمال کر کے اپنے گاؤں کے ساتھیوں کو دباؤ میں رکھ سکتا تھا۔

آخر میں مقدم کو گاؤں کی غیر مزروعہ زمینوں کو خواہش مند لوگوں میں تقسیم کرنے کا اختیار رہتا تھا[3] مقدموں کو جب بھی نئے مواضعات بغرض آبادکاری سپرد کیے جاتے، تو اسی وقت حکام انکے اس اختیارات کو بالکنایہ تسلیم کر لیتے تھے[4] مقدم کو غالباً پہلے سے آباد زمینوں میں مداخلت کا اختیار نہ

---

[1] شیر شاہ کا رائج کیا ہوا تحفظ امن و امان کا یہ ایک سرسری اور برجستہ مشہور طریقہ تھا جس کا عباس خاں اوراق 110 - 111 الف میں تفصیلی ذکر آیا ہے۔ مغلیہ انتظامیہ نے اس طریقہ کو اس کے ضروری اجزاء کے ساتھ قائم رکھا مثلاً Factories 1622 - 23، ص 250 - 52، 253 - 54 میں مندرج ایک انگریزی تباہ شدہ جہاز کو لوٹنے کے سلسلے میں رپورٹ ملاحظہ ہو۔ اس سلسلہ میں مشتبہ گاؤں کے مقدم کو فوراً طلب کر کے ہدایت کی گئی کہ وہ ملزموں کا پتہ چلائے اور لوٹا ہوا مال برآمد کرے۔ بالکرشن برہمن، ورق 33 الف۔ ب کے ایک خط میں ایک افسر کو جس کا عہدہ ظاہر نہیں کیا گیا ہے ایک گاؤں کے مقدم کو سزا دینے کی ہدایت کی گئی ہے جہاں کے بعض باشندے دوسرے گاؤں میں زبردستی گھس کر وہاں پر مامور محافظین مالگزاری پر حملہ آور ہوتے تھے۔ آخر میں سیاق نامہ 69 میں شاہراہ پر واقع مواضعات کے مقدموں سے جو مچلکے لیے جاتے تھے اس کا مضمون درج کیا گیا ہے۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ اگر ان کے حدود اختیار میں چوری ہو یا ڈاکہ پڑے تو وہ مجرم قرار دیے جائیں۔ وہ اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ وہ یا تو چوری کا مال برآمد کرنے گے یا بصورت دیگر معاوضہ کے دیندار رہیں گے۔

[2] یہ ایک ایسے مقدم کے متعلق ہے جس پر ایک انگریزی جہاز کے لوٹنے میں شرکت کا شبہ تھا Factories، 1621 - 23، صـ 254)

[3] کسی زمین کی کاشت کرنے کا خواہش مند گاؤں کے مکھیا کے پاس جاتا ہے اور جس قدر زمین جہاں چاہتا ہے مانگتا ہے۔ ایسا شاذ ہی ہوتا کہ اس کی خواہش نامنظور رہی ہو اور سارے وہ ہمیشہ مل جاتا ہے وغیرہ (JIH، Geleyssen، صـ 78 - 79، اس عبارت کا مفہوم ڈی لیٹ (De Laet، 95) میں بعد میں کیے بیان کیا گیا ہے، گیلنس کا بیان خصوصاً گجرات کے متعلق ہے۔

[4] نئے مواضعات کی آبادکاری کی غرض سے مرشد قلی خاں کی مقدموں کی تقرری کے سلسلہ میں فصل ہذا کا فٹ نوٹ 2 ملاحظہ ہو۔

ہوا کرتا، تاہم ہم اسے کم از کم ایک موقع پر دو قابضان آراضی کے درمیان حد بندی کی نزاع کا تصفیہ کراتے ہوئے پاتے ہیں[1]

کسی ایسے موضع میں جو لگان کے غیر معمولی بار سے بالکل پسا ہوا تھا مقدمی کا عہدہ نفع بخش ہوا کرتا تھا۔ اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ بعض اوقات دولت مند لوگ اپنے سرمایہ کے ایک اچھے مصرف کے لحاظ سے اس عہدہ کی خریداری پر راغب ہوتے تھے۔ چنانچہ ہم داودہ کے ایک دستاویز میں ایک ایسے شخص کو جو بظاہر باہر کا تھا ایک گاؤں کی پرانی موروثی مقدمی کو 230 روپیہ میں جو اس وقت کے لحاظ سے ایک بڑی رقم تھی خریدتا ہوا پاتے ہیں[2] ایک دوسری تحریر میں ایک قصبہ کے تین اشخاص اعلان کرتے ہیں کہ ایک ویران موضع کے عہدۂ مقدمی کو حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اس کی دوبارہ آبادکاری پر ایک بڑی رقم خرچ کی اور کاشتکاروں کو اپنے پاس سے 400 روپیہ بطور تقاوی قرض تقسیم کیا[3]

گاؤں کے مکھیا اور عام کسان کے درمیان جو فاصلہ پیدا ہو گیا تھا اور نیز ان وسیع اختیارات کی وجہ سے جو گاؤں میں اسے حاصل تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعض اوقات ایسے حقوق کے دعویدار یا ان پر قابض ہو جایا کرتے جو زمیندار کے مماثل ہوتے۔ عہد عالمگیری کے دو دستاویزات میں ہم مقدمی کا استارجی' اور 'بسوی' یا 'بسوا' کے ساتھ جو حقوق زمینداری کے خصوصی لوازمات تھے جوڑا پاتے ہیں[4] لہٰذا اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے کہ اواخر اٹھارہویں صدی کی ایک فرہنگ میں مقدم کو "ایک گاؤں کا مالک" بتایا گیا ہے اور غالباً اس میں اور زمیندار میں صرف اس قدر فرق ہوا کرتا کہ آخر الذکر کے قبضہ میں معمولاً ایک سے زائد مواضعات ہوتے تھے[5]

---

[1] الہ آباد 1197۔ مقدم اپنے عہدہ کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ دونوں فریق اسے ثالث نامزد کرتے تھے تصفیہ کرتا تھا۔

[2] الہ آباد L 1183 اس دستاویز کے مضمون پر فصل ہذا کے فٹ نوٹ 2-4 میں تبصرہ کیا گیا ہے۔

[3] دار العلوم، ورق 55 الف۔ب۔

[4] الہ آباد 255، نگارنامۂ منشی، ورق 127 ب، .Bodl ورق 98 ب، مطبوعہ 98؛ (مخطوطہ .Bodl میں اس دستاویز کا تعارف اس عنوان سے کرایا گیا ہے، "مقدمی اور زمینداری کے متعلق شکایات")

[5] .Add 6603 ورق 81 الف۔ اسی ورق پر مقدم کو "کسانوں میں ایک سربرآوردہ شخص" بھی بتایا گیا ہے

چنانچہ رعیتی علاقوں میں مقدم آگے چل کر عملاً زمیندار ہی کے حقوق حاصل کر لیا کرتا تھا۔ لیکن اس کی حیثیت ان مواضعات میں جو زمینداروں کے کلی قبضہ میں ہوتے تھے بہت مختلف ہوتی تھی۔ 1662ء میں ایک موضع کی زمینداری کے بابتہ نزاع کے کاغذات میں ایک فریق نے دوسرے پر گاؤں کے "پرانے مقدم" کے اخراج کا الزام عائد کیا تھا۔ مدعا علیہ کا کہنا تھا کہ مقدم متعلقہ اس کا کارندہ تھا جسے گاؤں کے موروثی زمیندار کی حیثیت سے برطرف کرنے کا اسے پورا اختیار تھا۔[1] مال و دیوانی کے افسران نے مقدمہ کی سماعت کے بعد، مدعا علیہ کے جواب کی توثیق کر دی اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اس معاملہ میں مکھیا کو زمیندار کے ملازم کی حیثیت میں تصور کیا گیا تھا جس کے عہدہ کا انحصار آخر الذکر کی مرضی پر موقوف تھا۔ چنانچہ دور برطانیہ میں زمیندار کی توسیع نے مکھیا کی حیثیت کو بہت گرا دیا اور بعض مقامات پر تو یہ عہدہ صرف برائے نام ہی رہ گیا۔[2]

ہم اس کے قبل بار بار گاؤں کے حساب نویس یعنی پٹواری کا ذکر کر سکتے ہیں۔[3] یہ عہدہ بہت قدیم تھا اور اس کا تذکرہ علاؤالدین خلجی کے انتظام ضابطوں میں موجود ہے۔[4] بقول ابوالفضل پٹواری کے فرائض میں گاؤں کے "جمع و خرچ" کا حساب لکھنا تھا۔[5] اس کے خصوصی فرائض میں منفرد کسانوں سے لگان کی وصولی اور پھر اس کی حکام کی ادائیگی کے متعلق ضروری کاغذات کو تیار کرنا تھا۔[6] غالباً اس کے عہدہ کی وجہ تسمیہ حقیقتاً یہ تھی کہ اس کا پٹوں یا ان کاغذات سے تعلق ہوا کرتا جن میں ایک گاؤں یا اس کے منفرد کاشتکاروں کے ذمہ مطالبہ لگان کی رقوم درج ہوتی تھیں۔[7] پٹواری کی

---

1. الہ آباد 375 — یہ موضع اودھ کے پرگنہ سندیلہ میں واقع تھا۔
2. موازنہ ہو W.C. Benett., Chief of the Roy Bereilly Direct. Lucknow 1870ء، ص 7-66
3. شمالی ہندوستان میں عام طور پر پٹواری کی اصطلاح رائج تھی۔ دکن میں اس کا مترادف کل کرنی (آئین اکبری - ا - ص 476) اور اڑیسہ میں بھوئی تھا (J.A.S.B. N.S. 12 - 1916ء، ص 30)
4. برنی، تاریخ فیروز شاہی، ب۔ انڈ ص 288-89
5. آئین اکبری - ا - ص 300
6. اکبر نامہ - 3 ص 282-3 ر Add. 27247، ورق 332 الف؛ و ص 457 آئین اکبری ص 286-88
7. خلاصۃ السیاق، اوراق 73 ب - 75: الف Or. 2026 اوراق 22 ب 23 الف دراالعلوم، ورق 62 الف، فرہنگ کاروانی، ورق 35 الف، الہ آباد 177، 897، 1206، (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

معمولاً اپنے کاغذات کو جنہیں بہی یا کاغذ خام کہا جاتا تھا، ہندوی یا مقامی زبان میں لکھا کرتا تھا[1]
ابوالفضل ہی کی سند کے مطابق پٹواری گاؤں والوں کا ملازم ہوتا تھا اور ہمیں یہ فرض کرنا لازم
ہو جاتا ہے کہ جہاں کہیں بھی دیہی برادری کا وجود پایا جاتا تھا، وہاں وہ اس کے ملازم کی حیثیت
سے کام کرتا تھا۔[2] ہمارے پاس گاؤں کے حسابات کے جو نمونے موجود ہیں ان میں اس کے گزارہ
کو گاؤں کے سرمایہ پر ایک بار کے طور پر" اخراجات موضع "کی مدعا میں دکھایا گیا ہے[3] مگر انتظامیہ
بھی اسے خدمات کا کچھ صلہ دیا کرتی تھی جو دور اکبری میں اس کے مواضع کی لگان کا ایک فیصدی تھا[4]

یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ جہاں جہاں دیہی برادری میں انحطاط اور مقدم کے اختیارات
میں توسیع کا عمل رونما ہوا، وہاں پٹواری پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ لیکن یہ کہا جاسکتا ہے
کہ کم از کم بعض صورتوں میں پٹواری کو بھی چھوٹے چھوٹے کسانوں پر ظلم کرنے کے لیے کافی مقدرت
حاصل ہو گئی[5] ساتھ ساتھ دیہی برادری سے اس کی علیحدگی نے سرکاری حکام کے ساتھ اس کے تعلق
کو نسبتاً زیادہ نمایاں کیا، حتیٰ کہ دور برطانیہ میں اس نے کلی طور پر ایک سرکاری ملازم کی حیثیت
اختیار کر لی۔

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

Wilsoh's Glossery of Judioi-l & Reneme Terms & c. پٹہ کی تعریف

406 میں بھی ملاحظہ ہو ولسن (ایضاً 406) پٹواری کو مرہٹی لفظ پت بمعنی رجسٹر یا تحریر سے اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اسے
تسلیم ہے کہ ہندی میں لفظ پت کا یہ مفہوم نہیں پایا جاتا اور مہاراشٹر میں پٹواری کا لفظ غیر معروف ہے۔

[1] اکبر نامہ۔ 3 ص 457 آئین اکبری۔ ا۔ ص 289 راسکداس کے نام عالمگیر کا فرمان دفعہ 11، خلاصۃ السیاق، ورق
91 ب، 26 20 ورق 59 (الف۔ ب، 66.03 ورق 52 الف۔ ب [2] آئین اکبری۔ ا۔ ص 300

[3] دستور العمل عالمگیری، اوراق 41 ب۔ 42 ب میں یہ گذارہ 'کاغذ پٹواری' کے نام کے تحت لتا ہے، گویا کہ
یہ کاغذ کے خرچ کے لیے تھا۔ خلاصۃ السیاق میں پٹواری کے لیے دو مختلف گذاروں کی گنجائش رکھی گئی ہے یعنی
فصلانہ، (فصل سے) اور خوراک، (بمعنی غذا)

[4] وہ کمیشن موسوم صدوئی، قانون گوئی (قانون گو کا 2 فیصدی کا کمیشن) کے نصف کا حقدار ہوتا تھا (آئین
اکبری۔ ا۔ ص 300)

[5] راسکداس کے نام عالمگیر کا فرمان کا دفعہ 6 ملاحظہ ہو۔ دفعہ 9 میں اس کا ریزہ رعیت یعنی چھوٹے کسان کے
بالمقابل اور چودھری، قانون گو اور مقدم کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

باب-5

زمینداران

فصل-1 حق زمینداری کی نوعیت

ان دنوں ہندوستان میں "زمیندار" کو رواجاً زمین کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ یہ سوال کہ کیا دور حاضر کا زمیندار کلیتہً حکومت برطانیہ کی تخلیق ہے، ایک مسلسل بحث کا موضوع رہا ہے۔ (اس نزاعی مسئلہ سے جس سے یہاں ہمارا براہِ راست تعلق نہیں)، یہ مزید سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دور مغلیہ کی تحریروں میں لفظ زمیندار کا استعمال اس کے موجودہ مفہوم میں کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے آئین اکبری یا اس سے زیادہ سہل الحصول تاریخی مآخذ میں اس کے ان دنوں کے مفہوم کی کوئی براہ راست وضاحت نہیں ملتی لہٰذا اس کی حالیہ تعبیریں بیحد قلیل شہادتوں سے مستنبط کی گئی ہیں۔ عام طور پر تسلیم شدہ نکتۂ نگاہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دور مغلیہ میں زمیندار کا واقعی مفہوم ایک ماتحت سردار کا تھا اور اس کا وجود بادشاہ کے براہِ راست انتظامی علاقوں میں ممکن نہ تھا۔[1]

---

[1] جدید مصنفین میں غالباً مارلینڈ نے بار اول اس نقطۂ نگاہ کو پیش کیا ہے (Agrarian System - 279) اس نے بہرحال یہ تسلیم کیا ہے کہ ممکن ہے کہ بنگال میں زمیندار کا مفہوم زیادہ وسیع رہا ہو (ایضاً 191-4) اسکے ساتھ ساتھ آئین اکبری کو خود پڑھنے کے بعد وہ جن نتائج پر پہونچا ہے' ان میں اودھ کے بعض حصوں میں سرداروں، ان کے قبیلوں اور فوجی کارناموں کے متعلق مقامی روایات میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں دشواری ہوئی (ایضاً 123) ڈاکٹر سرن اس قسم کے کسی شک میں مبتلا نہ ہوتے۔ مارلینڈ کی طرح (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اس میں شک نہیں کہ ہمعصر تصانیف میں اکثر زمیندار کا لفظ سردار کے عمومی مفہوم میں استعمال کیا گیا تھا[1] مگر شک اس قیاس میں معلوم ہوتا ہے کہ یہی اس کا پورا یا حقیقی مفہوم تھا۔ زمیندار کے اس مفہوم کی کہ یہ ماتحت سردار ہوا کرتے۔ آسان ترین تردید اس حقیقت کو ظاہر کر کے کی جا سکتی ہے کہ جن لوگوں کو زمیندار کہا جاتا تھا وہ کسی طور پر صرف باجگذار ریاستوں ہی میں نہیں بلکہ مغل حکمرانوں کے براہ راست زیر انتظام علاقوں میں بھی پائے جاتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس بات کی تائید کے لیے آئین اکبری کی تنہا شہادت ہی کافی ہے۔ ابھی تک اس حقیقت کے واضح نہ ہونے کا سبب آئین اکبری کے بلاک مین کے معیاری ایڈیشن کی ایک واحد غلطی ہے جس کی گرفت نہ ہو سکی۔ یہ ایک ایسی غلطی ہے جس سے اس کی اطلاعات کی تعبیر میں شدید غلط فہمی ہوئی۔[2] اس نسخہ میں، تیاری طباعت کی سہولیت کے خاطر "آئین دوازدہ صالہ" کے اعداد و شمار کو اپنے اصل جدول کی شکل میں جیسا کہ اس کتاب کے بہترین مخطوطات میں پایا جاتا ہے نقل نہیں کیا گیا۔ بلاک مین نے صرف اصل جدولات کے خانوں ہی کو نہیں بلکہ کوئی وجہ ظاہر کیے بغیر خانوں کی سرخیوں کو بھی حذف کر دیا۔ پس اس کے قارئین کے پاس یہ معلوم

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)

زمیندار کی تعریف (ماتحت سردار) بیان کرنے کے بعد وہ اس خیال کو کہ زمیندار مملکت کے ہر حصہ میں پائے جاتے "مہمل" قرار دیتے ہیں۔ (Provincial Govt. &c. ii) (اور نوٹ)

یہ درست ہے کہ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں ہندوستان میں مرتب کی ہوئی دو معیاری لغات فرہنگ رشیدی (مرزبان کے تحت) اور بہار عجم (زمیندار کے تحت) زمیندار اور مرزبان کو ایک دوسرے کا مترادف اور "مرزبان" کے معنی سردار بتاتی ہیں۔ لیکن ان لغات کا فنی اصطلاحات سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ علاوہ اس کے بہار عجم میں لفظ زمیندار کے استعمال کی وضاحت کے سلسلہ میں قلم بند کیے ہوئے اشعار میں سے جو تمام ہندوستانی شعراء کے ہیں، ایک میں فرہاد اور مجنوں کا اس بناء پر کہ اول الذکر ایک مزدور اور آخر الذکر ایک زمیندار تھا حقارت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ تو کیا مشہور عاشق مجنوں واقعی ایک ماتحت سردار تھا!

[1] ملاحظہ ہو باب ہٰذا کی فصل 4۔

[2] یاد رکھنا چاہئے کہ نولکشور پریس نے بلاک مین ایڈیشن، بب۔ انڈ۔ کلکتہ 1867 - 77 کے حق تالیف پر تصرف بیجا کر کے اس کے 1882 و 1893ء کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ یہ دونوں طباعتیں جنہوں نے غالباً زیادہ مقبولیت حاصل کی بلاک مین ایڈیشن کا لفظ بہ لفظ نقل ہیں۔ لہٰذا اس کے اعداد و شمار کی غلطیاں بھی ان میں بجنسہ نقل ہوئیں۔ آئین اکبری کے نسخہ مرتبہ سید احمد 1855ء میں جلد دوم جس میں اعداد و شمار کو ہونا چاہئے تھا نہیں ہے۔

کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ ان جدولات میں پرگنہ کے سامنے ذاتوں کے جو نام درج ہیں وہ حقیقتاً اختلاط میں دیے ہوئے خانہ زیر عنوان 'زمیندار'، اور بعض مواقع پر 'بومی' سے متعلق ہیں۔[1] اس خانہ میں بیرونی حدود پر واقع پانچ صوبوں بنگال، اڑیسہ، بہار، برار اور خاندیش کو چھوڑ کر حکومت کے براہ راست زیر انتظام علاقوں کے تقریباً ہر پرگنہ کے متعلق اندراجات دیئے گئے ہیں۔ ان پانچ صوبوں اور باجگذار سرداروں کے زیر حکومت علاقوں میں پرگنوں کے سامنے کوئی اندراجات نہیں ملتے، بلکہ معلّم سرکاروں کے لیے زمیندار کی ذاتوں کا اندراج ملتا ہے۔[2]

آئین اکبری کی شہادت کی تائید ان کثیر دستاویزی شہادتوں سے بھی ہوتی ہے جو بیناموں، سرکاری تحریروں اور سولہویں و سترھویں صدیوں کے دیگر کاغذات کی شکل میں موجود ہیں۔ ان سے بھی، حقوق زمینداری کے وجود کا بنگال اور گجرات ایسے دور افتادہ صوبوں کے علاوہ مملکت مغلیہ کے تقریباً تمام حصوں اور صوبجات آگرہ، دہلی، پنجاب، اجمیر (شاہی علاقوں) اور خصوصاً اودھ میں پتہ چلتا ہے۔[3]

---

[1] اصل جدولات میں 8 خانے ان عنوانات کے تحت ہیں۔ پرگنات (پرگنے)، قلاع (قلعے)، نقدی (مالگذاری کی نقد رقم)، سیورغال (عطیات)، مالگذاری و نقدی، زمیندار (یا بومی)، سوار اور پیادہ۔ بلاک مین کے مرتبہ نسخہ میں سیورغال، سوار اور پیادہ کو چھوڑ کر بقیہ کو بالکل حذف کردیا گیا ہے۔ ان دونوں کو ان کے پہلے حروف سے مخفف کرکے ان کے اعداد کے ساتھ ہر پرگنہ کے سامنے لکھا گیا ہے۔

بلاک مین کے اصل جدولات کی اس ترتیب سے جو الجھنیں پیدا ہوئیں، ان میں جارٹ Jarret کے ترجمہ آئین اکبری ج 2، سرکار ایڈیشن، 129 اور اس کے مابعد، راق میں خانوں اور عنوانات کو بے تکے طور پر درج کرنے کی وجہ سے اضافہ ہوا۔ اس نے زمیندار کے عنوان کے بجائے "ذاتیں" لکھا ہے اور اسے اصل جدول کے چھٹے خانہ سے ہٹا کر بالکل آخر میں کردیا ہے۔ ساتھ ساتھ اس نے سوار اور پیادے کے اعداد کے خانوں کو "لگان" کے فوراً بعد رکھا ہے۔

[2] ملاحظہ ہو انڈین ہسٹری کانگریس، اکیسواں اجلاس بمقام ٹریونڈرم 1958ء کارروائی 23-320 پر مطبوعہ میرا مقالہ بعنوان 'آئین میں زمینداران'

[3] اس سلسلہ میں شہادتیں اس قدر زیادہ ہیں کہ یہاں ان کے مخصوص حوالے نہیں دیے جاسکتے، اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے، کیونکہ اس فصل میں مذکورہ تمام علاقوں میں زمینداروں کے متعلق دستاویزات کا مختلف سلسلوں میں خود ہی ذکر آئے گا۔ میں نے اودھ کے پہلے لفظ "خصوصاً" کا استعمال محض اس سبب سے کیا ہے کہ یو۔ پی۔ ریکارڈ آفس" الہ آباد میں اس علاقہ کی زمینداریوں کے متعلق کثیر تعداد (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

حقیقتاً یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ پرانے کاغذات کا جہاں جہاں بغور مطالعہ کیا جائے گا۔ وہاں زمین داروں کے وجود کا پتہ لازمی ملے گا۔

پس، اگر زمیندار کی اصطلاح کو ماتحت سردار کے مفہوم میں محدود کرنا ممکن نہ ہو تو پھر ہمیں از سر نو کوشش کر کے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ ان کی حیثیت یا حقوق خصوصاً براہ راست شاہی انتظام کے تحت علاقوں میں کیا تھے۔

جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، ہماری تاریخ کی کتابوں میں، زمینداری کی تعریف یا اس کے لازمی خصائص بیان نہیں کئے گئے ہیں۔ لفظی طور پر زمیندار ایک فارسی مرکب لفظ بمعنی مالک زمین کے ہیں۔ یہ اصطلاح، غالباً ہندوستان میں اس قدر قبل یعنی چودھویں صدی کے ابتداء[1] میں گڑھی گئی تھی اور خاص ملک فارس کے کاغذات مال میں اس کا کہیں استعمال نہیں ملتا[2] ایک دوسرا فارسی لفظ 'بومی' تھا جسے ابوالفضل نے اکثر اور دوسرے مصنفین نے بہت کم زمیندار کے مترادف لفظ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس کے لفظی معنی (بوم یعنی زمین) وہی ہیں جو زمیندار کے لیکن یہ لفظ بھی ملک فارس میں کسی فنی اصطلاح کے طور پر نہیں استعمال ہوا ہے[3] حالانکہ

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)

میں دستاویزات موجود ہیں جنہیں میں نے دیکھا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بمقابلہ دیگر علاقوں کے اودھ میں زمینداران زیادہ تھے، یا یہاں زمینداری کا نظام زیادہ مستحکم تھا۔

1 برنی اور عفیف چودھویں صدی کے وہ بہترین مورخ کے اس اصطلاح کے استعمال کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو، مورلینڈ Agririan System 18 فٹ نوٹ

2 یہ لفظ 'قبضہ آراضی اور نظم ونسق مال' کی اصطلاحات کی فرہنگ میں جو اے۔ کے۔ لیمبن کی تصنیف لینڈ لارڈ اینڈ پیزنٹ ان پرشیا (A.K. Lambton, Landlord & Peasant in Persian لندن 1953 ص 422 وما بعد میں بطور ضمیمہ منسلک ہے شامل نہیں کیا گیا اور خاص فارسی الفاظ کی سترھویں صدی کی معیاری لغت فرہنگ رشیدی میں یہ لفظ اپنے مقام پر نہیں ملتا، حالانکہ اس میں 'مرزبان' کی اصطلاح کی وضاحت کے سلسلہ میں اس کا ذکر آیا ہے لیکن بہرحال فرہنگ رشیدی ہندوستان کی تصنیف تھی۔ بہار عجم میں اس لفظ کو شامل تو کیا گیا ہے لیکن اسکے استعمال کی وضاحت کرتے ہوئے محض ہندوستانی شعراء کے اشعار قلم بند کیے گئے ہیں۔

3 لفظ 'بومی' کا کبھی بھی مستند فارسی میں استعمال نہیں معلوم ہوتا اور ابوالفضل اور اس کے ہمعصروں کا اس لفظ کو استعمال کرنا درحقیقت قدامت پسندی کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ان فارسی اصطلاحات نے رواج پکڑا لیکن لفظ زمیندار کو بحیثیت ایک معیاری اصطلاح کے مقبولیت حاصل ہوئی۔ پھر بھی اس کے بعض مقامی نام قائم رہے جنہیں انہیں حقوق کا مرادف تصور کیا جاتا جو زمینداری کا مفہوم تھا۔ اودھ میں 'ستارہی'، اور 'بسوی' یا 'بیسی' کے نام ہے[1] اور راجستھان میں بھوبیا زمیندار کا صحیح مثنیٰ تھا۔[2] ان تینوں اصطلاحوں میں اول الذکر کے لفظی مفہوم کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ دوسرے کے معنی $\frac{1}{20}$ ویں کے ہیں۔ اس سے بھی فی الوقت ہماری واقفیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔[3] تیسری (اصطلاح) اسی ہندی۔ آریائی مادہ سے مشتق ہے جس سے فارسی لفظ بومی اور اس کے معنی بھی وہی ہیں[4] سترھویں صدی کے اواخر میں 'تعلقہ' اور 'تعلقہ دار' کی نئی

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

یہ لفظ نہ تو فرہنگ رشیدی میں، نہ بہار عجم میں اور نہ ہی لیبٹن کی گلاسری میں شامل ہے۔

[1] یہ دونوں اصطلاحیں عہد اکبری کے ایک بیعنامہ میں ملتی ہیں (الٰہ آباد، 1588ء کا 317) 1650ء کے ایک دستاویز کے اس اندراج سے کہ "بیسوی المعروف ستارہی" ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں کے ایک ہی معنی ہیں، ستارہی، کو بمقابلہ 'بیسی' یا 'بسوی'، کے بہت زیادہ استعمال کیا گیا ہے، لیکن یہ دونوں اصطلاحیں صرف لکھنؤ کے قرب و جوار خصوصاً سندیلہ کے کاغذات میں ملتی ہیں۔ سرکاری بہرائچ کے کاغذات میں ان کا استعمال نہیں ملتا 'بیسوی' اور 'زمینداری' کا ایک مفہوم میں براہ راست استعمال کہیں نہیں ملتا۔ لیکن اٹھارھویں صدی کے دو دستاویزات (الٰہ آباد، 1764ء کا 457 اور الٰہ آباد 362) میں اندراج "ملکیت اور زمینداری المعروف ستارہی" سے ظاہر ہوتا ہے کہ ستارہی اور زمینداری واضح طور پر ایک ہی چیز ہیں۔ اس کے قبل 1698ء کے ایک دستاویز میں اس سے بھی مختصر اندراج "ملکیت المعروف ستارہی" ملتا ہے جس سے بھی مذکورہ ہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے، کیونکہ ان کاغذات میں زمینداری اور ملکیت کی اصطلاحیں تقریباً ایک ہی مفہوم میں استعمال ہوئی ہیں۔

[2] موازنہ کیجیے، ٹوڈ، اینلس اینڈ اینٹی کوائٹیز آف راجستھان Jurb. 'Annals & Antiquities of Rajasthan، لندن، 1914ء، ا، 133-136

[3] 'ستارہی' کی اصطلاح اب بظاہر متروک ہو چکی ہے اور میں اس لفظ کی ساخت اور معنے کا پتہ نہ چلا سکا۔ 'بیسی' یا 'بیسوی' کی تمثیل پر (جن کے مادے بیس ہیں) اس کا مادہ ستر اور معنی $\frac{1}{17}$ ہو سکتا ہے، لیکن یہ غالباً ایک بالکل ہی قیاسی بات ہے۔

[4] 'بھومیا' سنسکرت لفظ بھومی سے ماخوذ ہے جس کے معنی فارسی لفظ بوم کی طرح (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اصطلاحیں بعض مواقع پر زمینداری اور زمیندار کے مفہوم میں استعمال ہونا شروع ہوئیں۔ ان کے صحیح مفہوم پر بعد (باب ہذا کی فصل 3) میں بحث آئے گی۔ فی الحال، صرف اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ یہ دونوں اصطلاحیں لفظ 'تعلق' سے ماخوذ ہیں جس کے معنی 'رشتہ' کے ہوتے ہیں اور یہ اصطلاحیں اپنے لفظی معنوں میں استعمال نہیں ہوتیں۔

لفظ 'مالک'، زمیندار کے دیگر ہم معنی الفاظ کے مقابلہ میں زیادہ مستعمل تھا۔ بعض دستاویزات میں زمیندار کو واضح الفاظ میں مالک کہا گیا ہے[1]۔ سترھویں صدی کے دو دستاویزات میں ملکیت (یعنی مالک کے حقوق) اور زمینداری بغیر کسی فرق کے ایک ہی حق کے لیے استعمال کیے گئے ہیں[2] اور دستاویزات کی کثیر تعداد ایسی ہے جن میں "ملکیت اور زمینداری کا ایک ہی حق کے دو مختلف ناموں کے طور پر آپس میں جوڑ لگایا گیا ہے[3]۔ دیگر مترادفات کے مفہوم تو واضح نہیں ہیں، لیکن 'مالک'، عربی زبان کا ایک لفظ ہے جو اسلامی قانون میں 'صاحب جائداد' کا ایک خاص مفہوم رکھتا ہے۔ لہٰذا ملکیت کا تقریباً وہی مفہوم ہوا جو انگریزی زبان میں بھی جائداد کا ہوتا ہے۔

بہرحال، یہ کہنا کہ زمینداری، ملکیت کی ایک شکل تھی، اس بات سے بالکل مختلف ہے کہ زمین پر وہ تمام حقوق جنہیں ہم ملکیت سے تعبیر کرسکتے ہیں، حقوق زمیندارانہ ہی ہوتے تھے۔ ذیلی دربار کے ایک عہدہ دار آنند رام مخلص نے عہد محمد شاہی کے اواخر میں لفظ زمیندار کی جو تعریف بیان کی ہے اس کا مرکزی نقطہ یہی معلوم ہوتا ہے۔ بقول اس کے "اشتقاقاً (دراصل) زمیندار ایسے شخص کو کہتے ہیں جو زمین پر قابض (صاحب زمین) ہو لیکن اس سے اب ایسا شخص مراد ہے جو کسی گاؤں

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)

مٹی یا زمین' ہے۔ یہ دونوں ایک ہی آریائی لفظ سے مشتق ہونے کے باعث ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ لفظ 'بومی' ہندوستان ہی میں یہاں کے دیسی لفظ 'بھومیہ' کے زیر اثر گڑھ لیا گیا ہو۔ دور جہانگیری کی دور تصنیف سندھ کی تاریخ موسومہ 'تاریخ طاہری'، ورق 26 الف میں اس کی ایک درمیانی شکل 'بومیہ' ملتی ہے

[1] الہ آباد، 1192، 1649ء میں "مالک اور زمیندار اور چودھری" کے محاورے ملتے ہیں۔ Add. 6603 ورق 79 الف میں زمینداروں کی مالکیت یعنی ان کی مالکانہ حیثیت کا ذکر آیا ہے۔

[2] الہ آباد 375 (1662ء) اور الہ آباد 323 (1675ء) [3] الہ آباد 891، 1192، 1196، 1205، 1216، 1219، 1221، 1222، 1224، 1227 وغیرہ (یہ سب سترھویں صدی کے دستاویزات ہیں)

یا شہر کی زمین کا مالک ہو اور کاشتکاری کرتا ہو۔"[1] یہاں زمین پر ایک معمولی قبضہ و تصرف رکھنے والے شخص اور ایک ایسے شخص کے درمیان فرق کو واضح کیا گیا ہے، جس کا حق متعدد اشخاص (یعنی ایک گاؤں یا شہر کی آبادی) کے قبضہ کی زمین پر پہونچتا ہو۔ زمیندار کا اطلاق صرف آخر الذکر زمرہ کے لوگوں پر ہوتا تھا۔ پچھلے باب میں ذکر آیا ہے کہ اکثر کسانوں کو فی الواقعی مالک کہا جاتا تھا، لیکن مخلص کی تعریف کی رو سے یہ زمیندار نہ کہے جا سکتے تھے۔ زیر مطالعہ عہد کے دستاویزات میں حقوق زمینداری کے رقبوں کی پیمائش کو جس طور پر لکھا گیا ہے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمینداری کا تعلق موضع سے ہوتا تھا نہ کہ منفرد اراضیات سے۔ زمینداری کا تعین بیگھوں کے اعداد یا رقبہ کی متعین اکائیوں میں نہیں، بلکہ ہمیشہ ایک موضع یا اس کے کسی کسری حصہ میں کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات لفظ 'بسوہ' کا مفہوم جیسے زمینداری کا رقبہ ظاہر کرتے ہیں، واقعتہً اس نام کے رقبہ کی اس اکائی کا جو بیگھہ کے بیسویں حصہ کے برابر ہوتی ہے نہیں، بلکہ موضع کے بیسویں حصہ ہوتا ہے۔[2]

لہٰذا زمینداری ایک ایسا حق تھا، جس کا مالک کسان نہیں بلکہ اس سے برتر گاؤں کا ایک دوسرا طبقہ ہوا کرتا۔ بیشتر اس کے کہ ہم کسان اور اس طبقہ کے واقعتہً باہمی تعلق پر بحث کا آغاز کریں، ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ زمینداروں کا تسلط پورے دیہی علاقوں پر نہ ہوتا تھا، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر علاقہ میں ایسے مواضعات کی کثیر تعداد ہوا کرتی جن میں حقوق زمینداری کا وجود نہ ہوتا۔ لہٰذا انہیں زمینداروں کے مواضعات سے مختلف، مواضعات رعیتی یا مواضعات زیر قبضہ کسان کہا جاتا تھا۔

---

[1] مرآۃ الاصطلاح ورق 153-الف۔

[2] مثلاً، عہد اکبری کے حقوق 'ستاری' اور 'جیسی' کے ایک بیعنامہ میں انہیں "پورے موضع" سے متعلق کیا گیا ہے، لیکن چند سطروں کے بعد ہی جب ان حقوق کے تحت رقبہ کا دوبارہ حوالہ آتا ہے تو اسے "موضع مذکور کا بیس بسوہ" کہا گیا ہے (الہ آباد 317، 15،86 ء)

اس طور پر استعمال کی وجہ سے بعض اوقات لفظ 'بسوہ' سے کسی موضع میں زمینداری کا صرف ایک حصہ مراد لیا جانے لگا۔ اسی طرح الہ آباد 1191 (67 16 ء) میں نصف موضع کی زمینداری کے بسوؤں، (بسوہ ہا)" وغیرہ کے حوالے ملتے ہیں۔ نگارنامۂ منشی، ورق 127 ب .Bodl ورق 98 ب، مطبوعہ 90۔ درالعلوم، اوراق 48 الف (بنگال)، 53 الف (بہار) اور 61 الف 62 ب بھی ملاحظہ ہوں۔

پوری مملکت میں رعیتی اور زمینداری مواضعات کی مذکورہ تقسیم بالکل واضح طور پر قائم تھی، خواہ ہر جگہ ان کی حد بندی ہمیشہ راحت کے ساتھ متعین نہ ہوتی ہو۔ صوبہ شاہجہاں آباد (دہلی) میں لکھے گئے ایک انتظامی ضوابط نامہ میں ایک موضع کی زمینوں کو خود کاشتہ زمینداران (لفظاً زمینداروں کی خود کاشت کی ہوئی زمین) اور رعیتی میں تقسیم کیا گیا ہے۔[1] اسی طرح صوبۂ الہ آباد میں لکھے گئے دوسرے ضوابط نامہ میں ایک پرگنہ کے مواضعات کی تعلقہ (تعلقداروں کے تحت) اور رعیتی میں تقسیم ملتی ہے۔[2]

گجرات میں اس تقسیم کا وہاں کی مشہور تاریخ کی کتاب مرآۃ احمدی میں جو تقریباً 1761ء کی تصنیف تھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے ذکر میں دلچسپی کی اور باتیں بھی ملتی ہیں۔ لہٰذا اس کے اقتباس کا تفصیلی حوالہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"خان اعظم کی نیابت سلطنت کے زمانہ (عہد اکبری 1588-92) میں بیشتر پرگنات کے دیہاتیوں، مقدموں اور کسانوں نے دربار شاہی (اصل: دربار آسماں جاہ) میں شکایت پیش کی کہ صوبیداروں (اصل: ناظمان) اور جاگیرداروں کے گماشتے (مختلف) محصولوں کے ذریعہ تمام لگان (یا پیداوار؛ حاصلات) پر تصرف بے جا کرتے ہیں۔ ان کی جبریہ وصولیوں کے نتیجہ میں راجپوتوں، کولیوں اور مسلمانوں نے فساد برپا کیا جو درخواست پیدا کرنے والوں نے پیداوار (حاصل) اور کھیتوں کو تباہ کر رہے ہیں۔ یہ طریقہ کسانوں کی پامالی اور سرکاری آمدنی کے گھٹنے کا سبب ہو رہا ہے۔ لہٰذا حکم ہوا کہ کولیوں اور دیگر لوگوں کی ایک چہارم زمین علیحدہ کر کے ان پر کوئی محصول نہ طلب کیا جائے اور قابل اعتماد لوگوں سے ان کی نیک چلنی کی ضمانت لی جائے۔ تمام مواضعات (دیہات وروبست) اور علاقوں (مکانات عمدہ) کے زمینداروں کو چاہیے کہ وہ اپنے گھوڑوں پر داغ لگوائیں تاکہ وہ صوبے دار کے روبرو اپنے کو پیش کر کے سرکاری خدمت انجام دے سکیں اور اپنی فروخت کی ہوئی زمین کی جنہیں 'بیجان' کہتے ہیں نصف لگان (محصول) کو اپنے تصرف میں نہ لائیں۔ اس حکم پر عملدرآمد کیا گیا اور صوبہ میں ان دنوں روز بروز خوشحالی کا دور دورہ ہوا۔

---

[1] دستور العمل نویسندگی، ورق 183-الف۔

[2] سیاق نامہ، 35، 36، 38، 39، 53، وغیرہ۔

مخفی نہ رہے... کہ جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے، پرانے زمانہ میں ملک گجرات پر راجپوتوں اور کولیوں کا قبضہ تھا[1] سلاطین گجرات کے عہد میں مسلمانوں کے مکمل تسلط جما لینے کے بعد بہ سبب ان (راجپوتوں اور کولیوں) کی سرکشی کے وہ (سلاطین) ان کی سرکوبی میں مصروف ہوئے۔ بیچاروں کو ان کی فرمانبرداری قبول کرنے کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار نہ تھا۔ (معافی کے لیے) منت و سماجت کرتے ہوئے، انہوں نے نوکری اور لگان (کی پابندیوں) کو قبول کیا۔ ان کے وطن (مواضعات) کے ایک چہارم حصہ کا جسے گجراتی زبان میں 'بانٹھ' کہتے تھے ان کے ساتھ بندوبست کرکے (ان کی زمینوں کا بقیہ) تین حصہ جسے 'تلپد' کہتے تھے بحق شاہی حکومت ضبط کیا گیا۔ بڑے زمینداروں کے ساتھ جن کے تصرف میں بہت سے (لفظاً: اکثر) پرگنے تھے ان کے تعلقہ کا اس شرط پر بندوبست کیا گیا کہ وہ شاہی ملازمت اختیار کریں گے، اسی طور پر جیسا کہ جاگیر میں کرتے ہیں۔ یعنی ہر شخص اپنے وسائل اور طاقت کے اعتبار سے سوار اور پیادہ فوج کے حاضر رہے گا۔ اس طرح کولی اور راجپوت جو متعدد مواضعات میں بانٹھ پر متصرف تھے، عرصہ تک اپنے اپنے مواضعات میں چوکیداری (چوکی و پہرہ) کی خدمت انجام دیتے رہے اور جاگیردار کو ہر فصل پر کچھ بطور سلامی ادا کرتے ہوئے اپنی 'بانٹھ' پر قابض رہے۔ کچھ مدت گذر جانے پر بعض کولی راجپوت اور دوسرے لوگوں نے جنھیں تھوڑی بہت طاقت حاصل ہو گئی تھی، دور و نزدیک کے رعیتی مواضعات میں مویشیوں کی چوری اور کاشتکاری کو قتل کرکے بدامنی پیدا کی۔ پس ان مواضعات کے کسان بعض بعض مقامات پر انھیں ہر سال ایک مقررہ رقم یا دو ایک قابلِ کاشت کھیت دیکر راضی رکھنے پر مجبور ہوئے۔ اس وصولی کو 'گیراس' اور 'وول' کہتے ہیں۔ اس ملک میں اس دستور نے خوب رواج پکڑ لیا ہے اور صوبہ داروں کی کمزوری کے باعث عام (لفظاً: پایۂ تکمیل کو پہونچ گیا) ہے پرگنوں میں شاذ ہی کوئی مقام ایسا ہو جہاں راجپوتوں، کولیوں اور مسلمانوں کی ایک جماعت کے پاس ان کے مسکن یا 'گیراس' اور 'وول' نہ ہوں۔" اس کے بعد کی عبارت میں اس تصنیف کی تحریر کے وقت کے حالات اس طور پر قلم بند کیے گئے ہیں۔ اب "شاہی اقتدار کے اٹھ جانے سے "یہ لوگ" بعض مقامات پر بس گئے ہیں اور صرف پورے 'تلپد' یا سرکاری حصہ پر ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ اپنے 'گیراس' (کے حق) کو پورا کرنے کے خیال سے متعدد (دیگر) مواضعات

---

[1] مطبوعہ نسخہ میں اس مقام پر الفاظ غلط ملط ہو گئے ہیں۔

پر بھی تصرف بے جا کر رہے ہیں۔"[1]

اوپر کی عبارت سے جو خاص بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ گجرات میں زمین رعیتی مواضعات اور زمینداروں کے تعلق میں تقسیم تھی[2] اور جبکہ کچھ مواضعات تو زمینداروں کے قبضہ میں پورے طور پر دیدئے گئے تھے، مگر ایک بڑے علاقہ کی زمینداری کے مواضعات دو حصوں میں تقسیم تھے، جس میں سے ایک حصہ یعنی بانٹھ کی لگان تو زمیندار خود لے لیتے تھے اور دوسرے حصہ یعنی تلپد کی شاہی انتظامیہ کو ملتی تھی[3] بعد کے زمانہ میں، زمینداروں میں صرف تلپد ہی پر تصرف بیجا کا رجحان نہیں پیدا ہوگیا بلکہ انہوں نے رعیتی مواضعات سے جبری وصولیاں، جو گیراس، کہلاتی تھیں شروع کر دیں[3] صرف یہی بیان یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ رعیتی زمین "تلپد" سے مختلف تھی اور یہ ابتدا میں بھی کولیوں اور دوسروں کے قبضہ میں نہ تھی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ٹوڈ کو انیسویں صدی کے ابتدائی دنوں میں ہی مارواڑ میں مواضعات کے دو واضح زمروں کی موجودگی کا پتہ چل گیا تھا۔ بھومیئے یعنی آزاد زمینداران جنہیں وہ دیگر مقامات کے زمینداروں کے مرادف قرار دیتا ہے، اس علاقہ میں تھوڑے سے مواضعات پر قابض تھے بقیہ پٹاوٹ کے تحت آتے تھے جنہیں ٹوڈ بھی گرا سیئے کہتا ہے۔ اس وقت تک پٹاوٹ، کی حیثیت بھومیوں سے ناقابل تفریق ہو چکی تھی۔ لیکن روایات سے پتہ چلتا تھا کہ کسی پچھلے دور میں یہ حکومت کے ملازم تھے جنہیں مملکت مغلیہ کی جاگیروں کی طرح، مالگذاری کے عطیات ملے ہوتے تھے۔[5]

---

[1] مرآة۔ ا ص 4-173 ملاحظہ ہو نیز ضمیمہ ص 29-228

[2] ایضاً ضمیمہ 215 - 17 میں بھی ایسی ہی تقسیم کا مفہوم نکلتا ہے۔ اس میں سرکار سورتھ کے بعض محالوں کے مواضعات کو بظاہر بقیہ موضعوں سے جو زمینداروں یا جگذار سرداروں کے تصرف میں تھے جدا کرنے کی غرض سے رعیتی دکھایا گیا ہے۔

[3] مرآة۔ ا ص 285 میں نوانگر کے سرداروں کی تاریخ کے حالات کو بیان کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ گجرات کے آخری سلطان مظفر کے ایام میں" نوانگر کے زمیندار (حکمران) کے پاس اس کی زمینداری میں 400 محل دو زدہ بستہ مواضعات اور 400 مواضعات کا ایک چہارم حصہ تھا" اس کا غالباً یہ مطلب ہے کہ 400 مواضعات میں اسے صرف 'بانٹھ' کی لگان وصول کرنے کی اجازت تھی۔ [3] 'گراس' کی تفصیل فصل ہذا میں آگے آئے گی۔

[4] Tods, 'Annals & Antiquities of Rajasthan' ا ص 38-732 پٹاوٹوں کے لیے ملاحظہ ہو باب ہذا کی فصل

چنانچہ، اگر کل مواضعات یا تو زمینداری تھے یا رعیتی تو یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ زمینداروں اور کسانوں کے حقوق ملکیت باہم دگر متناقض تھے۔ جہاں ان میں سے ایک حق موجود ہوتا، وہاں دوسرا نہ ہو سکتا۔ اودھ کے ایک دلچسپ دستاویز سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ مفروضہ میں تھوڑی بہت اصلیت ہو سکتی ہے اور یہ کسانوں کے حقوق دخیلکاری، زمیندار کے تحت سوخت ہو جایا کرتے۔ اس دستاویز میں ایک گاؤں کے دو مقدموں کا 1677ء کا یہ بیان درج ہے کہ دونا مزد مواضعات کی "ملکیت" جن میں سے ایک خود ان کا تھا، کسی چودھری کی "موروثی زمینداری کے اندر) تھی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہم اس کے کاشتکاران (مزارعین) ہیں اور ہم اس کی اجازت (رضامندی) سے زمین کی کاشت کرتے ہیں۔"[1] زمیندار نے یہ تصدیق بظاہر اپنے اس حق کو جتانے یا قائم رکھنے کی غرض سے کرائی ہے جس کے تحت وہ اپنی زمین کو اپنی مرضی کے شخص کو دے سکتا ہے۔ عہد عالمگیری کے ایک مجموعہ میں شامل ایک خط سے بھی یہ مفہوم نکلتا ہے کہ زمیندار کو زمین فروخت کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ اس میں مکتوب الیہ کے ایک موضع کی زمینداری کی سند (دستاویز) کے حصول" کے ساتھ ساتھ موضع مذکور کی زمین کو لگان ادا کرنے والے اور جفاکش کاشتکاروں کے درمیان تقسیم کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔[2]

بہرحال، دو مثالیں یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں کہ ہر جگہ کے زمیندار کسانوں کو زمین دینے یا اسے واپس لینے کے مجاز ہوا کرتے تھے۔ پچھلے باب میں وضاحت کی گئی ہے کہ ایسے بہت کم مقامات تھے جہاں کسانوں کو بے دخل کرنے کے حق کا اختیار یا اس کا استعمال کچھ اہمیت رکھتا تھا۔ ایسے وسیع ویرانوں کی موجودگی میں جن پر ابھی تک کاشت نہ ہوئی ہو، زمیندار کی

---

[1] الہ آباد 329۔ "زمینداری" کا لفظ بہت واضح نہیں ہے۔ مواضعات کے پرگنہ یا سرکار کا ذکر نہیں کیا گیا ہے لیکن اسی چودھری کے متعلق اس مجموعہ کے دیگر کاغذات سے اندازہ ملتا ہے کہ یہ سرکار لکھنؤ کا سندیلہ پرگنہ تھا۔

[2] در العلوم، ورق۔ 90۔ الف۔ علاقہ کا نام ظاہر نہیں کیا گیا ہے۔ مگر چونکہ چھپر بندی یا جھونپڑی بنانے کا بھی حوالہ دیا گیا ہے، لہٰذا ممکن ہے کہ کوئی ویران موضع رہا ہو۔ ایسی صورت میں اس کی زمین کی تقسیم نے کسی موجودہ حقوق کو متاثر نہ کیا ہوگا۔

انتہائی خواہش کسان کو نکالنے کی نہیں بلکہ اسے رکھنے کی رہا کرتی ہوگی۔ یہ امر یقینی نہیں کہ زمیندار قانوناً کسان کو مثل شاہی حکام کے (جس میں جاگیردار اور اس کے عمال بھی شامل ہوا کرتے) اپنی زمینوں پر جبراً رکھ سکتا تھا۔ اس سلسلہ میں واحد سند ایک مچلکہ (ضمانتی دستاویز) کے مسودہ سے فراہم ہوتی ہے۔ جس میں مقدموں اور پٹواریوں کے ساتھ ساتھ، زمینداران اپنے کو پابند کرتے ہیں کہ وہ کسی "کاشتکار کو اس کی جگہ نہ چھوڑنے دیں گے"[1] چونکہ اس مچلکہ میں زمیندار کے ساتھ دو اور دیہی عمال شریک ہیں، لہٰذا یہاں بھی یہ مشتبہ ہے کہ کسانوں کو زمین سے لگائے رہنے کا اختیار اسے بذات خود حاصل تھا یا محض انتظامیہ کا تفویض کردہ تھا

حق زمینداری کی قدرتی طور پر غرض وغایت یہ ہوتی تھی کہ اس کے مالک کو اس سے آمدنی حاصل ہو۔ چونکہ بنیادی طور پر یہ حق زمین سے متعلق ہوا کرتا، لہٰذا توقع کی جاسکتی ہے کہ اس حق کے مالک کو زمین کی پیداوار کا ایک حصہ ملتا رہا ہوگا۔ ہماری تحریروں میں اس حصہ کے مختلف نام ملتے ہیں اور ممکن ہے کہ یہ اعتبار جگہ اس کی مقدار میں زیادہ کمی وبیشی ہوتی رہی ہو۔

اودھ کی بعض دستاویزات ہمیں رسوم زمینداری (زمینداروں کے دستوری محصولات) اور حقوق زمینداری (زمینداروں کے مالی حقوق) کی اصطلاحوں سے روشناس کراتے ہیں۔[2] ایک موضع کے زمیندار کی شکایت کے حوالہ میں بتایا گیا ہے کہ ایک قاضی (جج) نے موضع کے رسوم زمینداری اور پورے ایک سال کی مالگذاری (محصول۔حاصل) کو بہ جبر وصول کر لیا۔[3] اس شکایت کو ایک دوسرے دستاویز کی اس عبارت کے ساتھ پڑھنا چاہیے جس میں ایک مدد معاش کے عطیہ دار کے لیے جسے اس کے تحت زمین کی کل مالگذاری کا حق پہونچتا تھا، ضروری قرار دیا گیا کہ وہ "اپنے عطیہ کی زمین کا حق ملکیت (لفظاً: حق بربنائے ملکیت)" مالک کو ادا کرے۔[4] چونکہ یہ دستاویزات اودھ کے ایک ہی حصہ (سرکار بہرائچ) سے متعلق ہیں،

---

[1] بیکس، ورق 67 ب۔

[2] الہ آباد، 782 (سنہ 14 جلوس عالمگیری)، اور اوّل الذکر اصطلاح کے لیے 1214، اور موخر الذکر کے لیے الہ آباد، 175 (1662ء)

[3] الہ آباد، 782۔ [4] الہ آباد، 1203 (سنہ 19 جلوس عالمگیری)

لہٰذا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم اس علاقہ میں زمیندار علاوہ باضابطہ مالگذاری کے زمین کے ابواب یا محصول کا بھی حقدار ہوتا تھا۔ اسی صوبہ اودھ کے ایک دوسرے علاقہ یعنی نواح لکھنؤ کے متعلق اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ اس قسم کا ایک محصول 'ستارہی' کے نام پر جو زمینداری کا مقامی نام تھا، وصول کیا جاتا تھا۔ 1746ء میں بعض دیہی عمّال (کارندوں) کے دیئے ہوئے ایک کاغذ میں ستارہی کو 10 سیر غلّہ فی بیگھ کی شرح پر بتایا گیا ہے اور اس کا جوڑ 'دامی' یعنی تانبہ کے ایک سکہ (فلوس) فی بیگھ کی شرح کے ساتھ لگا لیا گیا ہے۔ کارندوں نے اپنے کو اس امر کا پابند کیا تھا کہ وہ ان حقوق کے مالکان کو قیاساً بشرح مذکور بطور ستارہی غلّہ کی ایک مقدار اور بطور 'دامی' کچھ نقد ادا کریں گے۔[1]

لیکن زمینداران ہمیشہ اپنے حقوق کو ہر کسان سے علیحدہ ایک محصول کی شکل میں وصول نہ کیا کرتے، مثلاً بنگال میں (ذیل میں ملاحظہ ہو) جہاں زمینداران حکام کو کسی گاؤں کی مالگذاری کے طور پر ایک معینہ رقم ادا کرنے کے بعد کسی رواجی یا خود ساختہ شرح پر ہر کسان سے لگان وصول کیا کرتے، وہاں اس کی آمدنی اس کی جمع کی ہوئی رقم میں سے حکام کو ادا کرنے کے بعد جو بچتا تھا صرف اسی قدر ہوتی ہوگی۔ حقیقتاً صرف ان علاقوں میں جہاں شاہی انتظامیہ خود کسانوں پر لگان کی شرحیں مقرر کرتا تھا وہاں زمیندار اپنی آمدنی کے لیے علیحدہ محصول عائد کرنے پر مجبور ہوا کرتا لیکن ایسے علاقوں میں انتظامیہ یہ رجحان پایا جاتا تھا کہ وہ مطالبۂ مالگذاری کو بڑھا کر کسان کی آخری حد استطاعت یا بہ الفاظ دیگر اس کی کل پیداوار کی بچت تک پہنچا دے۔[2] ایسی صورت میں مطالبۂ مالگذاری میں کسان کے ذمہ جس قدر بھی دیگر قسم کے مالی مطالبات ہوتے وہ سب

---

[1] الہ آباد، 299 غلہ جو دینا ہوتا تھا اس کی مجموعی مقدار 51 من سالانہ مقرر تھی۔ فصل خریف میں 25 من (چاول 10 من، باجرہ (کردم وشامانخ) 15 اور ماش 5) (یہ اعداد غلط معلوم ہوتے ہیں۔ مترجم) اس مقام پر دستاویز میں ایک نوٹ ملتا ہے جس کا مفہوم واضح نہیں ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ گنے اور کپاس پر ستارہی کا محصول عائد کرنے کے سلسلہ میں ہے۔ فصل ربیع سے 18 من دیئے جانے کی تفصیل اس طور پر ہے۔ گیہوں 8 من اور جو 9 من۔ نقد کے سلسلہ میں 7 روپیہ سالانہ ہر فصل پر نصف نصف ادا کرنا ہوتا تھا۔

[2] ملاحظہ ہو باب 6 کی فصل ایک۔

شامل کرلیے جاتے تھے جس کے نتیجہ میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ مطالبات زر مالگذاری سے ادائگیوں سے منظور شدہ منہائیوں کی حیثیت رکھتے تھے۔

جب زمیندار کا حق یہ شکل اختیار کر کے وصول شدہ مالگذاری پر ایک بار کے طور پر ظاہر ہوتا تھا تو اسے 'مالکانہ' کہتے تھے۔

جب زمیندار کا حق یہ شکل اختیار کر کے وصول شدہ مالگذاری پر ایک بار کے طور پر ظاہر ہوتا تھا تو اسے 'مالکانہ' کہتے تھے۔ اٹھارہویں صدی کی اصطلاحات مال کی ایک فرہنگ میں جسے دہلی اور بنگال کے رواج سے واقف کار ایک عہدہ دار نے مرتب کی تھی بتایا گیا ہے کہ "مالکانہ زمیندار کا ایک حق ہے۔" ان (حکام) کی طرف سے زمین دار کی زمین کی سیر میں تبدیل کرنے (یعنی اس پر براہ راست لگان تشخیص کر کے کسان سے وصول کرنے) کی صورت میں زمیندار کو حکام ہر سو بیگھہ یا ہر سو من غلّہ پر اس کے مالک ہونے (ملکیت) کی وجہ سے کچھ ادا کرتے ہیں۔"[1] ایک دوسری جگہ یہ بات دہرائی گئی ہے کہ یہ ادائیگی صرف اس صورت میں ہوتی جب زمیندار کی زمین، سیر ہو یا اسے سیر بنایا گیا ہو۔ جب "مالگذاری کی ادائیگی خود اس کے ذمّہ ہوا کرتی تو اسے مالکانہ نہیں بلکہ صرف نانکار (گذارہ بصلہ خدمت) ملتا۔"[2] لہٰذا مالکانہ صرف اس صورت میں ادا کیا جاتا جب حکومت زمیندار کو نظر انداز کر کے خود براہ راست لگان کی تشخیص و وصولی کا کام کرتی۔ فرہنگ مذکورہ بالا میں مالکانہ کی شرح کو کل وصول شدہ مالگذاری کا ۱۰ فیصدی بتایا گیا ہے[3]

---

[1] Add. 6603 ورق 79 الف۔ سیر کی تعریف جیسا کہ قوسین میں درج ہے، ایضاً ورق 66 الف ب میں بیان کی گئی ہے۔ اس مفہوم کو 'سیر' کے دوسرے مفہوم سے جو ان دنوں نسبتاً بہت عام ہے خلط ملط نہ کرنا چاہیے، یعنی زمینداروں کی خاص زمین جس کی کاشت وہ خود یا ان کے فرد و ریا شکمی کرتے ہوں۔ Wilson, Glossary &c, 618 میں اسی مفہوم کو ترجیح دی گئی ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ "اس اصطلاح کا بعض اوقات اطلاق منجانب حکومت کاشت کی جانے والی زمینوں یا ان زمینوں پر ہوتا ہے جن کی لگان خود کاشت کار براہ راست یعنی بغیر کسی درمیانی شخص کے ادا کرتا ہے۔"

[2] Add. 6603 ورق 61 ب۔ ایک دوسرے مقام ورق 58 ب پر چودھری کے متعلق بھی یہی بات کہی گئی ہے کہ وہ اپنا مالکانہ اس صورت میں پاتا ہے جب اس کی زمین کو سیر میں تبدیل کر دیا جائے۔ "اگر وہ اپنی زمین کی مالگذاری خود ادا کرتا ہے تو وہ مالکانہ نہیں پاتا۔"

[3] Add. 6603 ورق 61 ب

یہ شرح مالکانہ کی نقدی ادائیگی کی صورت میں ہوتی تھی۔ لیکن جیسا کہ مذکورہ بالا تعریف سے مفہوم نکلتا ہے، حق مالکانہ کی ادائیگی بجائے نقد کے مالگذاری سے مستثنیٰ زمین کی شکل میں مالگذاری ادا کرنے والی کل مالگذاری ادا کرنے والی کل زمین کی ایک معین فیصدی ("ہر سو بیگھہ پر کچھ" کے حساب سے بھی کی جا سکتی تھی۔ مالکانہ کو ہمارے قدیم ترین حوالہ میں حقیقتاً آراضی زیر قبضہ بتایا گیا ہے[1] فرہنگ مذکورہ میں ایک دوسرے مقام پر بتایا گیا ہے کہ ہر بیگھہ میں دو بسوی یا دو بسوہ زمین 'زمیندار کا حق ہوا کرتا اور یہ دہی چیز یعنی مالکانہ ہوتا ہے[2] گورکھپور کے اوائل انیسویں صدی کے ایک تذکرہ میں زمینداروں کا بطور برتیوں کے حوالہ ملتا ہے۔ جنہیں کسان پر براہ راست لگان کی تشخیص کی صورت میں (ہنگام خام) "ایک بٹہ دس یا دو بسوی ملا کرتا تھا"[3] ہو سکتا ہے کہ اودھ میں مقامی طور پر زمینداری کے لیے 'بسوی' کے مختصر لفظ کے استعمال کا یہی سبب رہا ہو۔

حکام نے بظاہر گجرات میں بھی زمینداروں کے ساتھ کچھ اسی قسم کا بندوبست کیا تھا.

---

[1] الہ آباد 294 (95 15ء) یہ دستاویز، چند اشخاص کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔ یہ لوگ علی الترتیب 20 بیگھہ اور 9 بیگھہ بطور مالکانہ دیتے ہیں۔ اندراج اس طور پر ہے کہ "ہم لوگ (عطیہ دار کو) مالکانہ عطا کرتے ہیں۔ ہم لوگوں نے ... بیگھے زمین کو (لگان سے) مستثنیٰ (معاف) کر دیا ہے۔" یہ بات صاف نہیں ہے کہ عطا کنندہ کون تھے۔ غالباً یہ مدد معاش پانے والے تھے۔

[2] Add 6603، ورق 61 ب۔

[3] غلام حضرت، کوائف گورکھپور (1810ء) علی گڑھ مخطوطہ، ورق 14 الف۔ ب (تصحیح ابعد) برتیہ (یعنی برت پر متصرف شخص) کو کسی ایسے زمیندار کے مصداق تصور کیا جا سکتا ہے جس کے حقوق واقعتاً یا مفروضہ طور پر کسی زمیندار اعلیٰ کے عطیہ سے ماخوذ ہوں اور جو سرکاری افسران کو زمین کی مالگذاری ہمیشہ تو نہیں مگر معمولاً اپنے عطا کنندہ یا اس کے جانشینوں کی وساطت سے جو تعلقہ دار کہا جاتا تھا ادا کرتا تھا۔ ملاحظہ ہو نیز Elhist, Manccies & c. 25-6

سترھویں صدی کے ایک دستاویز میں برت کی اصطلاح کے استعمال سے اندازہ ملتا ہے کہ زمینداری کا یہ محض ایک مقامی نام تھا۔ 1669ء کے ایک بیعنامہ میں فروخت کنندہ نے اس امر کا اعلان کیا ہے کہ اس نے ایک گاؤں میں اپنی "ملکیت، زمینداری اور چودھرائی کی بشکل برت" علیحدہ کیا ہے الہ آباد۔ 1192 .

مرآۃ احمدی' کی جس طویل عبارت کا ابھی حوالہ آیا ہے اس کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ زمیندار کی زمین کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا یعنی 'تلپد' جو اس کا تین چوتھائی اور 'بانٹھ' جو ایک چوتھائی تھا۔ تلپد کی مالگذاری حکام کو ملتی تھی اور 'بانٹھ' کی زمیندار کو۔ ایک چوتھائی ہونے کے باعث 'بانٹھ' کے تحت بمقابلہ مالکانہ کے جو عموماً ایک بٹہ دس ہوا کرتا۔ زمین کا زیادہ حصہ آتا تھا۔ لیکن بہ اعتبار نوعیت دونوں ایک دوسرے کے مثل تھے۔ چنانچہ مالکانہ کی طرح 'بانٹھ' کی بھی شکل نقد کی ہو سکتی تھی پوربندر کے زمیندار کو مغلیہ حکام نے بندرگاہ کا چوتھائی محاصل ادا کرنے میں بداہتہً یہی صورت اختیار کی تھی[1] ایسی صورتوں میں یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ زمیندار کی کل زمین کی لگان کو انتظامیہ وصول کر کے اسے ایک چوتھائی ادا کر دیا تھا۔

یہ ایک خاص بات ہے کہ مراۃ میں 'بانٹھ' اور 'گراس' (اور وول) کے درمیان ایک واضح امتیاز قائم کیا گیا ہے[2] 'بانٹھ' اس کے مالک کی زمینداری کی زمین کا ایک جزو ہوتا تھا۔ 'گراس' وصول کرنے والے کی زمینداری کے باہر کے رعیتی یا کسانوں کے زیر تصرف مواضعات سے ایک ناجائز وصولی کا نام تھا خواہ اس کی شکل نقد کی ہو یا زمین کی۔ 'بانٹھ' کی بنیاد ایک سابقہ قانونی حق پر تھی اور 'گراس' دھمکی یا سراسر طاقت کے استعمال پر مبنی تھا۔ گجرات کے متعلق 1672ء کے ایک شاہی حکم میں نا بنا گراسیوں' اور زمینداروں (ملاحظہ ہو جواڑ میں گراسیے ٹھاکر اور بھومیے جن کا ٹوڈ نے ذکر کیا ہے) کے درمیان ایک معمولی فرق کے ساتھ ایک عمومی یکسانیت کا مفہوم نکلتا ہے[3]

---

[1] مرآۃ۔ ا۔ ص $\frac{288}{}$ بندرگاہ اس وقت (1677 - 8ء) خالصہ میں شامل تھا۔

[2] "گراس" بمعنی لفظ رزق اور عام استعمال میں منہ بھر کھانا" (ٹوڈ' اینلس اینڈ اینٹی کوٹیز آف راجستھان ا۔ $\frac{133}{}$)

[3] شاہی حکم کے لیے' ملاحظہ ہو مرآۃ۔ ا۔ ص $\frac{277}{}$ ٹوڈ کے "گراسیہ ٹھاکر" اور "بھومیہ" کے لیے ملاحظہ ہو اسکی حوالہ سابقہ (اضافہ ما بعد) "Annals & Antiquitis Malcon, 'Menivors of Orental India لندن 824 ۱ء۔ ا۔ ص $\frac{10, 508}{}$ میں گراس کا مفہوم خصوصاً اس کے حق زمینداری سے تعلق اور نیز فرق کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے (بقول اس کے "گراس وہ رقم تھی جو مواضعات "گراسیہ کو" لوٹ مار سے استثناء کی شرط پر" ادا کرتے تھے۔ مالوہ میں گراسیے "سب کے سب راجپوت تھے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

'بانٹھ' اور گراس کی اصطلاحوں کے مفہوم کو اگر سمجھ لیا جائے تو اس سے ہمیں 'چوتھ' کے محصول کے اصل کے متعلق جسے مرہٹوں نے شہرت دی مزید روشنی حاصل ہو سکتی ہے۔ بعض مورخین نے شیواجی کے چوتھ کا ولزلی کے امدادی مطالبہ Subsidy Demand سے جو اس نے دیسی ریاستوں پر عائد کیا تھا۔ موازنہ کیا ہے[1] جبکہ دوسروں نے زیادہ دو ٹوک طریقہ پر اسے ایک جبری وصول کی ہوئی رقم کہا ہے۔ شیواجی اور اس کے جانشینوں کی نگاہ میں یہ درحقیقت ضلع کی چوتھائی مالگزاری کے مساوی ایک محصول تھا جسے مرہٹے اپنی لوٹ مار سے مستثنیٰ کرنے کے عوض طلب کیا کرتے تھے[2] پرتگالی کاغذات کے مطالعہ سے یہ امر مسلم ہو گیا ہے کہ نہ بحیثیت ایک محصول کے اور نہ بحیثیت ایک نام کے 'چوتھ' شیواجی کی ایجاد تھی۔ سولہویں صدی ہی سے ڈمن کے پرتگالی باشندے اپنے پڑوس کے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کو مالگزاری کا ایک چوتھائی اسی نام کے ساتھ ادا کرتے چلے آرہے تھے[3] یہ قیاس کرنا غلط معلوم ہوتا ہے کہ ڈمن کے یہ انتظامات کوئی انوکھی

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اور ان میں بہت سے اپنی مقبوضہ زمینوں سے نکالے ہوئے سردار تھے مگر مو لکم انہیں بنظر احتیاط خاص راجپوت سرداروں سے جنہیں نے کبھی لوٹ مار سے روزی حاصل نہ کی، مختلف رکھتا ہے۔

[1] ماناڈے کا ولزلی کے 'امدادی مطالبہ' کا چوتھ سے موازنہ بظاہر شیواجی کی تعریف کے مقصد سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس تصور کو اصلاً شیواجی کے ذہن کی تخلیق بتاتے ہوئے اس کی تعریف کرتا ہے جو ولزلی کے ہاتھو اس قدر برگ و بار لایا۔ ایس این سین Military System of the Marhattas بمبئی 1958، 37 - 38 میں یہ عبارت قلم بند کی گئی ہے کہ مرہٹوں کی چوتھ کی جبری وصولی کے لیے مورخ سرکار نے 'بلیک میل' کا لفظ انتہائی آزادی سے استعمال کیا ہے۔

[2] "چوتھ" کے لفظی معنی ایک چوتھائی ہیں۔ شیواجی کے چوتھ کا سب سے پہلا حوالہ سورت کے انگریز گماشتوں کے کمپنی کے نام خط مورخہ 26 نومبر 1664ء میں ملتا ہے: "شیواجی روزانہ سخت دھمکی دیتا ہے کہ وہ ایک بار پھر شہر میں آئے گا، ورنہ بادشاہ خود چپ چاپ اور دیہاتوں سے اپنی سالانہ وصولی کا ایک چوتھائی اس کے سپرد کر دے" (Factories 1661 - 64 ص 312) مرہٹوں کے چوتھ کی نوعیت پر بہترین بحث سین Military System of the Marhattae میں ملتی ہے۔ اس کے ص 37-39 پر بجا طور پر تحریر ہے کہ مرہٹے چوتھ ادا کرنے والوں کی اپنے علاوہ کسی اور سے حفاظت نہ کرتے تھے۔ وہ ایک حفاظتی طاقت کے فرائض کی انجام دہی کے مدعی بھی نہ تھے۔

[3] پرتگالی زبان سے اپنی ناواقفیت کے باعث میں خود اس ماخذ کو نہ دیکھ سکا۔

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

چیزاورشیواجی کے چوتھ کا واحد نمونہ تھے[1] اس رواج میں کسی جدت کے نہ ہونے کا ثبوت جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے یہ ہے کہ حکام مغلیہ ساحل کاٹھیاوار پر پوربندر کے محاصل کا ایک چوتھائی، ان کے زمیندار کو ادا کیا کرتے تھے۔ اس کی بنیاد خود، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، تقریباً یقینی طور پر بانٹھ یعنی زمینداری کی چوتھائی زمین کے حقوق زمیندارانہ پر تھی۔ اس تمثیل پر یہ سوچا جا سکتا ہے کہ ڈمن میں چوتھ کی ادائگی کو دکن میں زمینداروں کے کسی ایسے ہی حقوق کی بنا پر رہی ہوگی۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ڈمن کا 'چوتھ' بانٹھ سے تو مشابہ، لیکن اس بنا پر کہ یہ ایک ایسی ادائگی یا رقم تھی جو ایک بالاتر طاقت اپنے کمتر بلکہ ماتحت کو ادا کیا کرتی، شیواجی کے چوتھ سے قطعاً مختلف تھا[2] حالانکہ شیواجی کے چوتھ مطالبہ زمیندارانہ حق کے دعوے کی بنیاد پر شروع ہوا تھا، لیکن جیسے جیسے اس کی طاقت میں اضافہ ہوا، اس کے دعوے کا یہ قانونی پہلو کہ یہ حق زمینداری سے متعلق ہے بالکل ختم ہو گیا اور اس محصول نے استحصال کی شکل اختیار کر لی۔

بہر حال، اس بات کا تھوڑا بہت پتہ چلتا ہے کہ ڈمن میں بھی چوتھ نے لوٹ مار کی نوعیت اختیار کر لی تھی۔ 1638ء میں چوتھ کی تعریف اس طور پر بیان کی گئی ہے "یہ ایک قسم کا محصول ہوتا ہے جو مذکورہ بالا بادشاہ (راجہ سرکیٹیا دسایٹ۔ مترجم) کو پابند کرتا ہے کہ وہ اپنی مملکت میں ڈاکوؤں کو پناہ نہ دے اور صوبۂ ڈمن کے کاشتکاروں کے آدمیوں اور مویشیوں کو پکڑنے سے احتراز

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

سین نے اس کی جو تعبیر کی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ طویل اقتباسات کا جو ترجمہ اس کی مذکورہ تصنیف کے ص 20-29 پر ملتا ہے، میں نے بیشتر انہیں پر اعتماد کیا ہے۔ انگریزی مطبوعہ تحریروں میں اس رواج کا صرف ایک مقام پر حوالہ آتا ہے۔ 1639ء کی ابتدا میں دو پرتگالی سفیر ڈمن سے سورت آئے اور انہوں نے وہاں کے صوبیدار سے اورنگ زیب تک جو ان دنوں دکن میں نائب سلطنت کے فرائض انجام دے رہا تھا انکی یہ شکایت پہونچانے کے لیے کہا کہ اس کی فوجیں "ڈمن کے تمام نواحی علاقوں میں پریشانی اور بربادی پھیلانے سے باز نہیں آتیں،" مغلیہ فوج کی واپسی کے معاوضہ کے طور پر پرتگالی اس رقم کو جسے وہ وہاں کے مورروثی راجہ راموگر (رام نگر) کو سالانہ ادا کیا کرتے تھے، یعنی مالگذاری کا چوتھائی بخوشی دینے پر رضامند تھے۔" (فوسٹر سپلیمنٹ کلکتہ 141- (141.- (Faster, 'Supp;Cal. (

[1] موازنہ بہ سین، حوالہ سابقہ، 29، 32، 43 جس کی بالکل یہی رائے ہے۔

[2] موازنہ بہ ایضاً، 28 - 29 -

کرے۔[1] بہ الفاظ دیگر، یہاں اس کا تصور اس محصول کے مشابہ تھا جسے مرآۃ احمدی میں 'گراس' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ 1617ء میں یہ اصطلاح 'گراسو' کے نام سے جو اس کی پرتگالی شکل تھی، ڈمن کے ایک حصہ میں وصول کیے جانے والے چوتھ کے لیے واقعۃً زیر استعمال تھی۔[2]

ماحصل یہ کہ تقریباً پوری مملکت مغلیہ میں زمیندار کا اس کی زمینداری کی زمینوں پر ایک قسم کا مالی استحقاق پایا جاتا تھا۔ یہ یا تو کسان پر ایک جداگانہ محصول عائد کرکے یا زمین کے ایک حصہ کی مالگذاری کو معاف کرکے یا حکام کی کل وصول شدہ مالگذاری سے نقدی صورت میں ادا کیا جاتا تھا۔ اس کی آخری دو شکلیں شمالی ہند و بنگال میں 'مالکانہ'، اور ودبسوی اور گجرات میں 'بانٹھ'، اور دکن میں 'چوتھ' کے ناموں سے موسوم تھیں۔

علاوہ اس خاص مالی حق کے زمیندار ان، بظاہر کسانوں سے کچھ اور چھوٹی چھوٹی بالائی رقمیں بھی وصول کرتے تھے۔ وہ کہیں تو ایک عام محصول موسومہ 'دستار شماری' (پگڑی کا شمار) کہیں شادی اور پیدائش کے محصولات اور کہیں گھر پٹیکس (خانہ شماری) اور دیگر محصولات وصول کیا کرتے تھے۔[3] اس پر مستزاد، زمینداروں کو کہیں کہیں آبادی کی بعض طبقوں سے بغیر کسی معاوضہ کے کام (بیگار) کرانے کا بھی حق حاصل رہتا تھا۔ بلاہر، تھوری، دھانک اور چمار ذات کے لوگوں کو اپنے زمینداروں کے علاوہ بظاہر گاؤں میں باہر سے آنے والے زمیندار ذات کے تمام لوگوں کو راستہ بتاتے اور ان کا سامان ڈھونے کا بھی کام کرنا پڑتا تھا۔[4] بہرحال، اس

---

[1] ایضاً، 26۔

[2] ایضاً، 26۔ 27۔

[3] بالکرشن برہمن، ورق 52 الف۔ب، درالعلوم، ورق 91 الف۔ب۔ ان دونوں صورتوں میں محصولوں کو ابواب ممنوعہ یعنی وہ محصول جن کی وصولی دربار شاہی سے منع ہو، قرار دیا گیا ہے۔

[4] ملاحظہ ہو وقائع اجمیر 131 جس میں راجپوتوں کی ایک جماعت کے معہ اپنے ایک زخمی ساتھی کے بھاگنے کا ذکر آیا ہے۔ ہر موضع میں مقامی زمینداروں کے تھوریوں کی حاصل کی جاتی تھیں جو زخمی کی چھارپائی (کھاٹ) کو اپنے موضع کی سرحد تک پہونچاتے تھے۔ پھر دوسرے گاؤں کے تھوری اسے آگے لے جاتے۔ ملاحظہ ہو نیز Add. 6603 اوراق 51 ب۔ 52 الف اور تشریح الاقوام، اوراق 181 الف، 182 الف، 188 الف۔ یہ بات کہ کسی شخص کو بیگار پر مجبور کیا جا سکتا ہے یا نہیں (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

امر کی کوئی ہمعصر سند نہیں ملتی کہ زمیندار اپنی کھیتوں کا کام جبری بیگاری پر کراتے تھے۔

جو تھوڑی بہت اطلاعات موجود ہیں، ان کی بنیاد پر ایک معمولی حیثیت کے زمیندار کی ان بالائی ذرائع سے ہونے والی آمدنی کا تخمینہ لگانا مشکل ہے۔ اس کا امکان نہیں پایا جاتا کہ یہ آمدنی اس کے سب سے اہم مالی حق سے ہونے والی آمدنی سے کسی درجہ میں بھی قابل موازنہ تھی۔ حقوق مالکانہ اور گجرات و دکن میں اس کے بدل کے متعلق ہماری جو اطلاعات ہیں ان کی مدد سے پیداوار کی بحث میں زمیندار کے حصہ کا ایک سرسری اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مالکانہ، مالگزاری کا عموماً ایک بٹہ دس اور بانٹھ و چوتھ ایک چہارم ہوا کرتا تھا۔ ایسی صورت میں جب زمیندار اپنے حصہ کو سرکاری مالگزاری کی رقم سے پانے کے بجائے براہِ راست کسان سے وصول کرتا تھا تو ضروری نہ تھا کہ مذکورہ شرح کی پابندی کی جائے۔ لیکن 'ستارہی' کے نام کے تحت دی ہوئی زمیندار کے محصول کی شرح کی ایک واحد مثال[1] سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سرکاری مالگزاری کو معمول کی شرح کے بالمقابل کافی کم تھی۔ حکومت کے حصہ سے موازنہ کے سلسلہ میں زمیندار کی متفرق وصولیوں کے بھی شامل کیے جانے پر اصرار کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ انکے بالمقابل، سرکاری حکام کی، علاوہ مالگذاری زمین کے سائر اور دیگر محصولوں کی وصولیاں ہوا کرتی تھیں۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں بنگال اور غالباً دہلی کے نواح میں زمینداروں کی بالائی وصولیوں کو اکثر سائر کے محصول کا بالمقطع ایک چوتھائی مقرر کر دیتے تھے اور ان کے حصہ کو 'سائر چوتھ' کہتے تھے[2]۔

بعض مواضعات میں زمینداری کی قیمت فروخت کے ساتھ ساتھ ان کی ادا کی ہوئی زمین

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) عموماً اس کی خفات پر موقوف ہوا کرتا۔ چماروں کو بیگار اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ انہیں بغیر کسی مزدوری کے سامان ڈھونا پڑتا تھا (تشریح الاقوام، اوراق 181 ب۔ 182 الف) اس کے برخلاف ہمیں ایک گوجر کا پتہ چلتا ہے جس نے بعض راجپوتوں کی بیگار کرنے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ اس کے خیال کے مطابق وہ اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس انکار کرنے پر اسے مار کر ہلاک کر ڈالا گیا، (وقائع اجمیر 187

[1] ملاحظہ ہو، الہ آباد 299 (د 46 17، ء) اس دستاویز اور اس کے مشمولات کا پہلے ذکر آ چکا ہے۔ اس میں ستارہی کی شرح ۱۰ سیر غلہ فی بیگہ درج ہے۔

[2] Add. 6603، ورق 65 الف۔ ب۔ سائر و دیگر محصولات کے لیے ملاحظہ ہو باب 6 کی فصل 7

کی مالگذاری کے مطالبہ سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ حکومت کے براہ راست زیر انتظام علاقوں کی پیداوار میں زمیندار کا حصہ بمقابلہ مالگذاری زمین میں اس کے حصہ کے بہت کم ہوتا تھا۔ موجودہ دور میں زمین کے حقوق ملکیت کی خرید و فروخت کے واقف کاروں کو معلوم کرکے حیرت ہوگی کہ دور مغلیہ میں زمینداری کی قیمتیں اس کے سالانہ مطالبۂ مالگذاری کے دوسے شاذ ہی زائد اور صرف چند صورتوں میں مشکل ہی سے اس کے مساوی سے زائد تھیں، حالانکہ انھیں، خرید کردہ حق ملکیت سے متوقع سالانہ آمدنیوں کی دراصل میں تحلیل کردہ قیمت (Capitalized Value) کے مساوی ہونا چاہیئے تھا۔

1703ء میں انگریزوں نے بعض زمینداروں سے دہی کل کتنا (موجودہ کلکتہ) اور دو دیگر مواضعات 1300 - روپیہ میں خریدے تھے۔ ان مواضعات کے لیے 1194 - روپیہ 14 آنہ بطور جمع یا مالگذاری سالانہ ان کے ذمہ واجب الادا قرار دی گئی تھی[1]

اودھ کے ایک پرگنہ میں ایک دوسرے سے ملحق متعدد مواضعات کے بیعناموں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دور عالمگیری کے وسطی برسوں میں ان مواضعات میں حقوق ملکیت و زمینداری کی فروختگی کی شرحیں کیا تھیں۔ دو دیگر دستاویزات میں انہیں مواضعات پر چار سال کی مدت کے دوران عائد کردہ سالانہ مالگذاری کا اندراج ملتا ہے۔ جن کی تفصیلات گوشوارہ ذیل میں پیش کی جاتی ہیں[2]

---

[1] Add 39 240، ورق 36 الف۔ ب میں دیوان کے جاری کیے ایک پروانہ کی نقل درج ہے جس میں اس بیعنامہ کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کی پشت (ضمن) پر بعض تصدیقی عبارتوں کے ساتھ ساتھ تین دوسرے دستاویزات بھی نقل کیے گئے ہیں، یعنی انگریزوں کے حق میں بیعنامہ، ایک نشان جس پر چند متعلقہ شرائط درج ہیں اور کمپنی کے وکیل (ایجنٹ) کی طرف سے مچلکہ جس میں اس نے اپنے موکل کی جانب سے سالانہ مالگذاری کی ادائیگی کا ذمہ لیا ہے۔ بیعنامہ علیحدہ ورق 39 الف پر بھی درج ہے۔

[2] بیعناموں کے دستاویزات الہ آباد 891، 1195، 1196، 1205، 1215، 1216، 1221، 1222، 1224 اور مالگذاری کے دستاویزات الہ آباد 897، 1206 ہیں۔ بیعناموں کی تاریخ بہ اعتبار سن ہجری ہے اور مالگذاری کا مطالبہ بہ اعتبار سن فصلی عائد کیا گیا تھا۔ الہ آباد 897 میں سن فصلی صحیح طور پر نہیں پڑھا جاسکتا۔ لیکن خوش قسمتی سے اس دستاویز میں سن ہجری درج ہے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر

موضع	بیعنامہ کا سن عیسوی	ملکیت و زمینداری قیمت فروخت روپیوں میں	مالگذاری زمین	
			سن عیسوی	رقم روپیوں میں
بیدورہ	1672[3]	301	1676-7	239-00
بیدوری)			1677-8	239-00
(دو مواضعات)			1684-5	226-00
			1685-6	126-00
				207-8 اوسط
پناجٹ	1672 ($\frac{1}{3}$ حصہ)	589	1676-7	271-8
(نصف موضع)[4]	1688 ($\frac{1}{9}$)		1677-8	224-8
	? ($\frac{1}{18}$)		1684-5	194-11
			1685-6	209-11
				225-1½ اوسط
انچھاپور	1677	138[5]	1684-5	44-9
			1685-6	34-9
				39-9 اوسط
دبی داس پور	1682	175	1684-5	14-12
			1685-6	14-12
				14-12 اوسط

الف۔ مواضعات کی مجموعی قیمت فروخت 00-1201 روپیہ

ب۔ مالگذاری کے اوسطوں کی میزان 00-526 روپیہ 14½ آنہ

الف۔ ب ۔ 44:100

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس میں اور نیز مالگذاری کے دیگر دستاویزات میں سن سابقہ کی مالگذاری بھی اصل کے تحت درج کی گئی ہے۔ اس کے بعد سن رواں میں بمقابلہ اصل کے جو کمی و بیشی واقع ہوتی ہے۔ اُسے دکھایا گیا ہے۔ اس طور پر ہر دستاویز میں دو برسوں کی مالگذی کا اندراج ملتا ہے۔

یہ تمام مواضعات، سرکار بہرائچ کے پرگنہ حسام پور تپّہ چوراسی میں واقع تھے۔ ان مواضعات کی زمینداری کو سیّد محمد عارف نے یکے بعد دیگرے خرید لیا تھا اور صرف ایک کو چھوڑ کر بقیہ انکی ادا کی ہوئی قیمتیں ہیں۔ مالگذاری کے دستاویزات میں وہ ان مواضعات کی ادائیگی کے ذمہ دار (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اس طور پر اب بھی زمینداری کی زمینوں کے کسان کی پیداواری بچت میں زمیندار کے حصّہ کی حیثیت بمقابلہ سرکاری مالگذاری کے ثانوی تھی۔ اس کے علاوہ زمیندار کا حصّہ اس کی مرضی

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ٹھہرائے گئے ہیں؛ ہمیں یقینی طور پر معلوم ہے کہ انہوں نے پیناجٹ کا $\frac{2}{3}$ حصہ اور انجھاپور کا $\frac{3}{9}$ حصہ اور دیبی داسپور مسلم توجن برسوں کی مالگذاری کے یہ اعداد ہیں ان کے قبل خرید اتھا لیکن ان کی خریداری بابت بیدوری $\frac{1}{2}$ حصہ اور پینجنٹ $\frac{1}{9}$ حصہ جو اسی مالگذاری کی تشخیص کے تحت آتے ہیں (ملاحظہ ہو فٹ نوٹ 58) بعد کی ہیں۔ بہر حال، یاد رہے کہ مالگذاری کے دونوں دستاویزات میں عارف کو تعلقہ دار کہا ہے اور یہ تصور کرتے ہوئے کہ تعلقہ دار کا مفہوم وہی ہے جو باب ہذا کی فصل 3 میں بیان کیا گیا ہے، ہمیں اس کے ایسی زمین پر مالگذاری ادا کرنے سے جو اس کی مسلّم زمینداری میں شامل نہ تھی نزدد نہ ہونا چاہیئے۔

[3] یہ قیمت اور سال کسی واقعی بیعنامہ کے نہیں ہیں، بلکہ ایک ایسے بیعنامہ کے ہیں جو اوّل ایک معینہ قیمت پر طے ہو کر ہونے والے خریدار کی خواہش پر بعد میں منسوخ ہوا (الہ آباد 1195)۔ بعد میں یہ دونوں مواضعات محمد عارف کے نام منتقل ہوتے اور موضع بیدوری کے نصف حصہ کا بیعنامہ جس کی تکمیل 1686 میں ہوئی اب تک محفوظ ہے (الہ آباد 1219)

[4] الہ آباد 1210۔ مالگذاری کے متعلق دو دستاویزات میں سے پہلے میں "پٹی پیناجٹ" کی مالگذاری اور بعد کے دستاویز الہ آباد 897 میں "دو پٹیوں یعنی پیناجٹ کے نصف موضع" کی مالگذاری معین کی گئی ہے۔ سیّد عارف کے والد سیّد احمد نے 1672ء میں موضع کا مسلم ایک تہائی حصہ خریدا تھا، (الہ آباد 1196) اس کے بعد کی خریداری (موضع کے $\frac{1}{9}$ حصہ کی) 1688ء میں کی گئی ہے۔ ایک اور بیعنامہ جس کی تاریخ کا پتہ نہیں چلتا موضع کی دوسری پٹی جس میں مذکورہ $\frac{1}{9}$ حصہ بھی واقع تھا کے $\frac{1}{18}$ حصہ کی خریداری سے متعلق ہے (الہ آباد 1221، 1222) ان دونوں خریداریوں کی بذریعہ قسمت نامہ (الہ آباد 1186) حد بندی کی گئی ہے۔ گوشوارہ میں قیمت کی میزان میں ان تینوں حصوں کی قیمت فروخت شامل کی گئی ہے، لیکن ممکن ہے کہ چونکہ دوسری پٹی میں خریداریاں بعد میں ہوئیں، لہٰذا 7-1676 اور 8-1677ء کی جو مالگذاری بتائی گئی ہے وہ صرف ایک پٹی یا ایک تہائی موضع کی رہی ہو۔ اس صورت میں جو تناسب قائم ہوگا وہ مالگذاری کے حق میں زیادہ موافق ہوگا۔

ضمناً یہ ذکر دینا بھی مناسب ہوگا کہ عارف نے 1689 میں موضع کا مزید $\frac{1}{8}$ حصہ بقیمت 61 روپیہ خریدا (الہ آباد 1224)

[5] ہمیں 1677ء کے تکمیل کردہ دو بیعناموں کا پتہ چلتا ہے جن میں سے ایک کا تعلق نصف حصہ سے (بقیمت 70 روپیہ) اور دوسرے کا ایک چوتھائی حصہ سے (بقیمت 32 روپیہ) ہے (الہ آباد 1189، 1205) پورے موضع کی قیمت کا اس کے تین چوتھائی حصہ کی مذکورہ قیمت خرید کی بنیاد پر حساب لگایا گیا ہے۔

کے مطابق بڑھایا نہ جا سکتا تھا۔ ایک واحد دستاویز میں جس میں 'دستاریی' کی شرح درج ہے بتایا گیا ہے کہ یہ "مثل سابق مقرر کی گئی ہے"، یعنی یہ زمیندار کے لیے صرف اس مخصوص سال کے لیے مقرر کی ہوئی شرح نہیں بلکہ ایک ایسی شرح ہے جو رواج کے مطابق تھی[1] جب زمیندار کا حصہ سرکاری مالگذاری سے ادائیگی کی شکل میں ہوتا تو یہ مالگذاری کا ایک مقررہ یا مستقل حصہ ہوا کرتا، خواہ اس کی شرح ۱۰ فیصدی ہو یا ایک چوتھائی۔ لہٰذا زمین کی پیداوار میں رواج شاہی یا سرکاری ضابطوں کا تابع ہوا کرتا۔ رسمی طور پر ہم ان دونوں کے زمیندار کو 'مالک' اور اس کے حق کو "ملکیت" کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں لیکن اسے نوآبادیاتی دور کا مالگذاری ادا کرنے والا زمیندار جو اپنی مرضی کے کاشتکاروں سے خود ہی مقرر کی ہوئی شرحوں پر لگان وصول کیا کرتا تصور کرنا بالکل غلط ہوگا۔

لہٰذا زمینداری کا مفہوم زمین پر مالکانہ حقوق کا نہ تھا۔ یہ حقوق زمین کی پیداوار پر دیگر حقوق اور دعوں کے ساتھ ساتھ پائے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ، یہ ایک قابل توجہ بات ہے کہ زمینداری بجائے خود (نہ کہ زمینداری کی زمین) بھی جائداد کی جملہ خصوصیات سے متصف ہوا کرتی تھی۔ یہ وراثتاً منتقل اور آزادانہ خرید و فروخت کی جا سکتی تھی۔

مملکت مغلیہ میں زمینداری کی وراثت کا عام قانون تھا۔ دور عالمگیری میں ہم ایک راجپوت ریاست کے دعویدار کے حمائیتوں کو اسی قانون کی بنیاد پر مرافعہ (اپیل) کرتا ہوا پاتے ہیں۔ انہوں نے جودھپور کے قاضی کے سامنے دعوی کیا کہ "ملک مارواڑ کی زمینداری، راجہ جسونت سنگھ کی جائداد (ملک) تھی، لہٰذا اس کے مرنے پر وراثت اور حق کی رو سے اسے اس کے لڑکوں کو منتقل ہونا چاہیے"[2] بیعناموں یا نزاعات کی ہمعصر تحریروں میں ہم کسی نہ کسی فریق کو بر بنائے وراثت

---

[1] الہ آباد 299

[2] انہوں نے یہ بھی کہا کہ "اس کے لڑکوں کی موجودگی میں اندر سنگھ 'وطن' اور زمینداری پر کیسے قابض (مالک) ہو جائے گا؟" جسونت سنگھ کا دسمبر 1678ء میں انتقال ہوا تھا۔ اورنگ زیب نے اس کے دو لڑکوں کے حق کو جو اس کے مرنے کے بعد پیدا ہوئے تھے، اندر سنگھ کے مقابلہ میں نامنظور کر دیا تھا بادشاہ کے اس فیصلہ پر متوفی راجہ کے دو افسروں نے قاضی کے روبرو یہ احتجاج پیش کرتے ہوئے استدعا کی کہ ان کے معاملہ میں شریعت کے قانون سے انہیں اطلاع بخشی جائے (وقائع اجمیر 245 - 4) (باقی صفحہ آئندہ پر)

زمینداری کا دعویٰ کرتا ہوا پاتے ہیں، گویا کہ یہ ان کا ایک بنیادی حق تھا۔[1] ایک بیعنامہ میں بائع کے ورثاء کو زمینداری کی دعویداری سے واضح طور پر محروم کیا گیا ہے۔[2] بعض بیعناموں میں ورثاء کا دقیاً تا بائع کے مقابلہ میں زمینداری کا زیادہ حق رکھتے ہوئے) اپنا حق ثابت کرنے کی صورت میں بائع اپنے کو خریدار کے نقصان کا ذمہ ٹھہراتے ہیں۔[3] یہ ضروری نہیں اور نہ ہی کسی طور پر موجودہ اوراق میں اس کی گنجائش ہے کہ زمیندار کے لڑکوں اور رشتہ داروں کے واقعتۂ زمینداری کی وراثت پانے کے متعدد واقعات کو جو ہماری تحریروں میں درج ہیں یہاں دہرایا جائے۔ مگر خاص طور پر دلچسپ بات یہ ہے کہ جائداد کے متعلق ہندو اور مسلم قانون وراثت کا پورا پورا اطلاق ہوتا تھا۔ چونکہ ان دونوں قوانین میں باپ کی وراثت لڑکوں کو بحصہ مساوی ملتی تھی، لہٰذا زمینداری ہمیشہ لڑکوں میں تقسیم ہوا کرتی۔ آنے والے پیرا میں چند مخصوص مثالوں کے ذریعہ اس رواج کی وضاحت کی جاتی ہے۔ علاوہ اس کے ہندو اور مسلم قانون وراثت کے معین کیے ہوئے مساتی ورثاء کے حقوق کا بھی احترام کیا جاتا تھا اور ہم اپنے اودھ کے کاغذات میں دیکھتے ہیں کہ ہندو اور مسلم عورتوں کو زمینداری یا حق ملکیت کی وراثت مل رہی ہے اور وہ اپنے حقوق کو فروخت یا دوسرے طریقوں پر منتقل کر رہی ہیں۔[4]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

عام زمیندار) کے قانون کا ایک راجہ کی وراثت کے معاملہ میں صرف اس وجہ سے اطلاق کہ حکومت مغلیہ کے سرکاری دفاتر نے اسے زمینداری کا درجہ دے رکھا تھا کوئی معقول بات نہیں، بلکہ محض اتفاقی تھی۔ لیکن بہرحال، اس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ عام زمینداری کے متعلق وراثت کا کیا قانون تھا۔

[1] اودھ کے ایک موضع کی ستارہی فروخت کرتے وقت بہت سے لوگوں نے اعلان کیا کہ "یہ باپ دادا سے ہم مالکان کے قبضہ و اختیار میں وراثتاً چلی آرہی ہے (الہ آباد 435، 1698ء) چند درخواست کنندگان دربار شاہی میں بعض افغانوں کے خلاف اس امر کی شکایت کرتے ہوئے کہ انہوں نے بہار میں ان کے بسوئیں اور زمینداری کو غصب کر لیا ہے، یہ دعویٰ پیش کرتے ہیں کہ یہ حق "باپ دادا کے وقت سے انکے قبضہ میں چلا آرہا ہے" (دارالعلوم، اوراق 52 ب۔ 53 الف)، الہ آباد 375 اور 1214 میں عہد عالمگیر کے دوران نزاعی مقدمات کے سلسلہ میں اسی نوعیت کے دو دعوے اودھ کے علاقہ کے متعلق ملتے ہیں۔

[2] الہ آباد، 1192 (1669ء)

[3] الہ آباد 891، 1196، 1205 وغیرہ

[4] الہ آباد، 1215 (1681ء) میں مہا سنگھ کی بہن وارث سنبھالو" (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمینداری ایک ناقابلِ تقسیم اکائی تصور نہ کی جاتی تھی کیونکہ جیسا کہ ابھی ذکر آیا ہے یہ ورثاء کے حقوق کو پورا کرنے کی غرض سے ہمیشہ تقسیم کی جاسکتی تھی۔ ہمارے سامنے ایک ایسی صورت ہے جس میں علاقہ سنبھل کے ایک مسلم پرگنہ پر مشتمل ایک بڑی زمینداری "ایک ہی دادا یا نانا کی اولاد کے درمیان تقسیم ہوئی جس میں ہر وارث کے حصہ میں چند گاؤں آئے"[1] تقسیم کے مسلسل عمل کے نتیجہ میں ایک ایسے وقت کا تصور کیا جاسکتا ہے جب پرانی زمینداری کا ایک موضع سے زیادہ کا نہ رہ جائے۔ یہ بات اس سے مختلف ہے کہ کوئی زمینداری ابتداً اپنے قیام کے وقت ہی محض ایک موضع پر مشتمل رہی ہو، ہر صورت میں، اگلی وراثت پر اس موضع کو ورثاء کے درمیان تقسیم کرنا ہوگا۔ اسکے نتیجہ میں زمینداری کا ایک حصہ گاؤں کی ایک معین کرکے برابر ہوجائے گا۔ اودھ کے سترھویں صدی کے دستاویزات سے سرکاری بہرایچ کے ایک موضع پسنا جٹ کی زمینداری میں اس تقسیم در تقسیم کے عمل کا قدرے تفصیل کے ساتھ پتہ چلتا ہے[2] بظاہر یہ ایک بڑا موضع تھا اور ابتداً برہمنوں کے ایک خاندان

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اپنے گماشتہ (ایجنٹ) کے صرفت موضع دیبی داسپور کے دو تہائی حصہ کے متعلق مہا سنگھ کے کیے ہوئے پچھلے بیناموں کی تصدیق کرتی ہے اور خریدار کو یقین دلاتی ہے کہ اگر نامزد اشخاص اس موضع پر اپنا حق ثابت کرنے میں کامیاب ہوگئے تو وہ اپنے دوسرے موضع سے اس قدر آراضی دینے کی ذمہ دار ہوگی۔ اس برس، بعد میں اس نے موضع کا بقیہ حصہ اسی خریدار کے ہاتھ فروخت کیا (الہ آباد 1216) مہا سنگھ کی ذات حسب تحریر الہ آباد 1205، کھتری تھی۔ الہ آباد (تصحیح مابعد) 1195۔ (1672ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ مساۃ بھیکی، دیبی داسپور کے دو قریبی مواضعات بید ورہ اور بیدوری کی مالک تھی۔ بیدوری کا نصف حصہ 1686 میں فروخت کیا گیا۔ دو بیچنے والے جوانے کو برہمن لکھتے ہیں اپنے باپ کے نام کے علاوہ اپنی ماں کا نام بھی جو واضح نہیں ہے مگر غالباً بھیکی ہے لکھتے ہیں (الہ آباد 1219) ماں کے نام کا اندراج معمول کے خلاف تھا لیکن قیاس ہے کہ ایسا اس لیے ظاہر کیا گیا کہ بیچنے والوں کو موضع میں حق باپ سے نہیں، بلکہ ماں کی وراثت سے حاصل ہوتے تھے۔

مسلمان عورتوں کے حقوق زمینداری کی ملکیت کے خاصی تعداد میں حوالہ ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو، الہ آباد 359، 810، 1191، 1208 وغیرہ (سب سترھویں صدی کے) متعدد مسلمان (شیخ) اور ایک ہندو بڑھئی ایک موضع کی ستار ہی فروخت کرنے کے سلسلہ میں اعلان کرتے ہیں کہ وہ یہ بینامہ "خود و منجانب اپنی ماؤں اور بہنوں کے" کر رہے تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملکیت میں ان لوگوں کی بھی ضرور شرکت رہی ہوگی (الہ آباد 435-1698ء)

[1] ورالعلوم، اوراق 43 الف - 44 - ب [2] یہ دستاویزات الہ آباد 1186، 1196، 1221، 1222 اور 1224 ہیں

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کی ملکیت میں تھا۔ اوّلاً یہ نائیاً تین بھائیوں کے درمیان تین مفروضہ مساوی حصّوں میں جنھیں پٹیاں کہتے تھے تقسیم ہوا کسی منزل پر ان تینوں پٹیوں کی حد بندی عمل میں آئی[1]۔ جو بیعنامے اب تک محفوظ ہیں وہ ان پٹیوں میں سے دو کے متلق ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی تقسیم کے بعد سے اس وقت تک تین پیڑھیاں گذر چکی تھیں اور ہر پٹی ورثاء کے درمیان تقسیم در تقسیم ہوتی چلی آئی تھی۔ خاندانی شجرہ اور ورثاء کے زیر قبضہ زمینوں کی حسب ذیل تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسلّم موضع کی ورثاء کے درمیان ہر بھائی کے مساوی حصّہ کے اصول پر کتنی پیچ تقسیم ہے۔
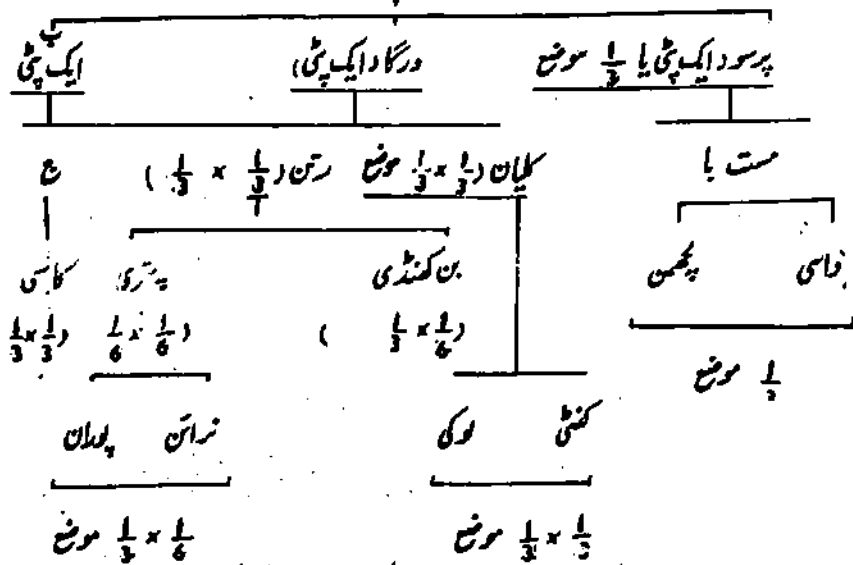
یہ امر قابل توجہ ہے کہ باوجودیکہ موضع تین پٹیوں میں تقسیم کیا گیا تھا مگر ہر وارث کا حصّہ

(باقی حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

ان میں بجز 1186 بقیہ بیعنامے ہیں۔ یہ وہی پسناجٹ ہے جس کا ذکر فصل ہذا میں پہلے قیمت فروخت اور سالانہ مالگذاری کے گوشوارہ میں آچکا ہے۔

[1] یہ بات الہ آباد، 1196 سے جو پسناجٹ کے دستاویزات میں سب سے پرانا ہے ظاہر ہوتی ہے۔ بیچنے والے اس امر کا اعلان کرتے ہیں کہ وہ موضع کے ایک ثلث پر قابض ہیں اور الفاظ "ہماری پٹی جو کل کی ایک تہائی ہے علیحدہ ظاہر کی جاتی ہے اور اس کی چوحدی حسب طریقہ پر ہے" وغیرہ اور نیز الہ آباد 1186 سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تینوں پٹیوں کی چوحدی موقع پر معین کی جا چکی تھی۔

وضع اور نیز پٹی کے کسری حصہ میں ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے: "موضع پسناجٹ کے ایک تہائی (یعنی ایک پٹی) کا پورا $\frac{1}{6}$ حصہ یعنی کل موضع کا $\frac{1}{18}$ حصہ" جن قیمتوں پر جملہ مختلف حصے تیس برس کی مدت میں فروخت ہوئے وہ بھی ان کے کسری اجزاء کے اچھے خاصے تناسب ہیں۔[1]

حالانکہ زمینداری ہمیشہ قابل تقسیم تھی، لیکن ورثاء کے حقوق کے ابتدائی زمینداریوں کے کسری حصوں میں تعین سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اس کی وحدت کا تخیل کسی نہ کسی درجہ میں موجود تھا۔ بعض صورتوں میں، ورثاء میں تقسیم شدہ زمینداری کو بھی مشترک دکھایا گیا ہے۔[2] اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ حالانکہ زمینداری میں ہر وارث کے حصہ کو تسلیم کیا جاتا تھا، لیکن زمینیں واقعتاً تقسیم نہ ہوتیں اور کم از کم کچھ مدت تک یہ ایک مشترکہ خاندان کے زیر قبضہ تصور کی جاتی تھیں غالباً آمدنی ورثاء میں ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کر دی جاتی تھی۔ پسناجٹ کے ایک دستاویز سے قدرتی طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ متعدد شرکاء کی موجودگی کے باوجود درمیانی پٹی کی زمین وقتین نسلوں تک غیر منقسم رہی اور ان کے حصوں کے مطابق اس کی حد بندی اسی وقت قائم ہوئی جب ایک باہری شخص نے اس کے دو حصوں کو جو اس کے نصف حصہ کے برابر تھا خرید لیا۔[3]

ایسی صورت میں کہ زمینداری کے مختلف پہلوؤں کے متعلق اس قدر کثیر اطلاعات ہمعصر بیانوں میں ملتی ہیں، زمینداری کے متعلق یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ یہ واقعتہً قابل فروخت ایک بدیہی

---

[1] موضع پسناجٹ کی زمینداری کے مختلف حصوں کی قیمت فروخت اس وقت تک محفوظ دستاویزات میں اس طور پر درج ہیں۔

پٹی 1 (موضع کا $\frac{1}{3}$)	405 روپیہ	1672ء (الہ آباد 1196)
موضع کے $\frac{1}{3}$ حصہ کا $\frac{1}{3}$ (پٹی 2)	127 روپیہ	1688ء (" 1222)
$\frac{1}{3}$ حصہ کا $\frac{1}{6}$ (پٹی 2)	57 روپیہ	— (" 1221)
موضع کا $\frac{1}{18}$ حصہ (پٹی 2 میں)	61 روپیہ	1689ء (" 1224)

[2] دررالعلوم، ورق 44 الف و ورق 47 ب۔

[3] الہ آباد 1186۔ ایک قسمت نامہ، زمین کو پیمائش کر کے دو قرعوں میں تقسیم کیا گیا۔ اس کے بعد ان میں سے خریدار اور بقیہ قابض داران کے مابین بحصہ مساوی تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر حصہ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

حقیقت پر وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوگا۔ لیکن پھر بھی اس مسئلہ کی اہمیت اور نیز اس حقیقت کو ہر شبہ سے بالاتر ثابت کرنے کی کوشش پر وقت صرف کرنا مناسب ہوگا۔ یہ بات کہ زمینداری ایک قابل فروخت حق تھا۔ بار اول محض اصطلاحات مال کی اٹھارھویں صدی کی ایک فرہنگ میں واضح طور پر بیان کی گئی ہے[1] زمینداری کے بیعناموں کی تحریری شہادتیں، واقعۃً عہد اکبری سے ملنا شروع ہوتی ہیں[2] اور دور عالمگیری میں انکی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ دربار عالمگیری سے جاری کیے ہوئے احکام میں ہمیں یہ ہدایت ملتی ہے کہ حقوق زمینداری کے متعلق متنازعہ دعوؤں کا فیصلہ کرتے وقت اگر آنے بیعنامے ہوئے ہوں تو ان کا لحاظ رکھا جائے۔[3] انگریزوں کے نام زمینداروں کے کیے ہوئے کل کتار بعد کا کلکتہ) اور چند مواضعات کے بیعناموں کا پہلے ذکر آ چکا ہے[4] اس کے بھی قبل انگریزوں نے کسی مقامی زمیندار سے اسی صوبہ (بنگال) میں مالوہ کی زمین خریدی تھی[5] الہ آباد کے پرانے کاغذات میں علاقہ اودھ کے متعلق اس قسم کے معاملات کی کثیر شہادتیں موجود ہیں[6] یہاں

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اس دستاویز کا سال مجھے یاد نہ رہا جو غالباً 16.88ء یا 16 89ء ہے۔

[1] Add. 6603 ورق 65 الف۔

[2] 38 ویں الہی میں اکبر کے جاری کیے ہوئے ایک پروانہ میں گوسائیں جھل رائے کی متھرا کے ایک قریبی گاؤں میں جس کا نام درج ہے "زمیندار سے زمین کی خریداری" کا حوالہ موجود ہے (جھویری دستاویز۔ 4) اس کے قبل کے ایک دستاویز الہ آباد 317 (1586ء) میں اودھ کے پرگنہ سندیلہ کے ایک موضع کی "ستار ہی اور بیسی" کی فروختگی کا ذکر ملتا ہے۔

[3] دراالعلوم، اوراق 48 الف، 62 الف۔

[4] Add. 24039 اوراق 36 الف و ب، 37 الف۔

[5] مالوہ ڈائری اینڈ کنسلٹیشن (Malola Diary & Consultations) JASB, N.S. (4) 1918ء ص 81۔ 2، 122۔ 3 یہ ایک شخص مسمی راجارے سے خریدی گئی تھی جسے یہاں چودھری بتایا گیا ہے لیکن اس کے بعد (ص 174، 182، 196، 202) اسے جمیدار جو بظاہر زمیندار کی بگڑی ہوئی شکل ہے بتایا گیا ہے۔

[6] الہ آباد، 891، 1180، 1194، 1196، 1205، 1215، 1219، 1221، 1223، 1224، 1227 سرکار بہرائچ کے لیے۔ الہ آباد 317، 335، 464 سرکار لکھنؤ کے پرگنہ سندیلہ کے لیے یہ تمام (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کے ایک فرمان میں متھرا کے قریب ایک زمینداری کے بیعنامہ کا حوالہ ملتا ہے[1] گجرات میں بھی زمیندار اپنی زمینیں فروخت کر سکتے تھے کیونکہ ہمارے علم میں آیا ہے کہ ان کی فروخت شدہ زمین کو "بجان" کہتے تھے[2]۔

معلوم ہوتا ہے کہ حقوق زمینداری کی فروختگی پر معمولاً کوئی سرکاری پابندی نہ تھی۔ حالانکہ کلکتہ اور دیگر مواضعات کی انگریزوں کی خریداری کی توثیق صوبہ کے دیوان نے بذریعہ پروانہ کی تھی۔ مگر اس سبب سے کہ اس میں ایک فریق ایک ولائتی کمپنی تھی بین طور پر یہ ایک خصوصی نوعیت کا معاملہ تھا۔ لیکن مثل دیگر معاملوں کے اس میں بھی اس بات کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ فروختگی کے پہلے حکام کی اجازت کا حاصل کرنا ضروری تھا۔ نہ ہی رواج اس راہ میں کوئی ناقابل عبور رکاوٹ پیدا کرتے۔ زمینداری بغرض فروختگی ویسی ہی قابل تقسیم تھی جیسا بغرض وراثت۔ اس پر قابض شخص اس کے ایک حصہ کو فروخت اور دوسرے کو اپنے تصرف میں رکھ سکتا تھا[3] موضع پناجٹ میں ہم اس خاندان کے افراد کو جو ابتداءً پورے موضع کے زمیندار تھے بغیر اپنے شرکا کے مشورہ کے اپنے اپنے حصہ کو فروخت کرتا ہوا پاتے ہیں۔ صرف ایک ہی مسلمان خاندان کی زمینداری کے معاملہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک حصہ دار نے دوسرے کے حصہ کے خلاف شفع کا دعوی کیا ہے[4]۔

بیعنامہ کے علاوہ، زمینداری بذریعہ پٹہ بھی منتقل کی جا سکتی تھی۔ پٹہ (اجارہ) کے ایک دستاویز میں جو ہم تک پہونچا ہے بتفصیل درج ہے کہ تین سال تک پٹہ دار کو سال کی ہر دو فصل میں کس قدر رقم بطور لگان ادا کرنا ہوگا[5] دوسرے دستاویز میں یہ اجازت دی

(باقی حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

دستاویزات عہد عالمگیری کے یا اس کے قبل کے ہیں۔ الہ آباد، 1192 (69، 16ء) ایک معمولی انتقال نامہ ہے۔

[1] جھویری، دستاویز

[2] مرآۃ، I، ص 173

[3] مثلاً مہا سنگھ نے موضع دیبی داسپور کا $\frac{2}{3}$ حصہ فروخت کیا اور اس کے بعد مسماۃ سبھاؤ نے موضع کا بقیہ $\frac{1}{3}$ حصہ فروخت کیا (الہ آباد، 1215، 1216)

[4] الہ آباد، 12.00 - (1676ء)

[5] الہ آباد، - 12.30 - موضع کی ملکیت اور زمینداری کے قابض کے پاس یہ موضع مدد معاش میں بھی تھا لہذا پٹہ میں لگان کی وصولی کے اختیارات بھی شامل تھے۔

گئی ہے کہ پٹہ دار نے کسانوں کو جو تقاوی کا قرض دیا ہو اس میں سے اختتام پٹہ پر جو بقایا رہ جائے وہ اسے بہ احتیاط وصول کرسکتا تھا[1] ہمارے دو پرانے دستاویزات میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ زمینداری کا پٹہ، پٹہ دار کو حقوق ملکیت عطا نہیں کرتا۔[2]

فصل ۔ 2 زمیندار طبقہ کی ابتداء بناوٹ اور طاقت

ہم نے ابھی تک اپنی بحث کو حق زمینداری کے صرف قانونی اساس اور نوعیت تک محدود رکھا ہے۔ اور اس کے دائرہ سے اس امر کو کہ ان حقوق کو کسی تاریخی ماحول میں رکھا جائے خارج کردیا ہے۔ حقوق زمینداری کے قابض کے پاس دوسرے مالکوں کی طرح کوئی ایسی جائداد نہ ہوتی جس کا عینی مشاہدہ کیا جاسکے، بلکہ انہیں سماج کی پیداوار میں ایک مستقل حصہ حاصل رہا کرتا تھا۔ یہ حق آسمان سے نہ ٹپک پڑا تھا بلکہ سماجی عوامل انہیں وجود میں لائے تھے۔ اٹھارہویں صدی کے مصنفین اس حق کی ابتداء کو کم از کم ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں کی حکومت کے آغاز سے منسوب کرتے ہیں[3] اور گو کہ ان بادشاہوں نے کچھ زمینوں کی زمینداریوں کو تسلیم کیا ہے بلکہ بعض اوقات عطا بھی کیا ہے[4] مگر اس حق کا وجود کسی شاہی عمل کا رہین منت نہ تھا۔ دور وسطیٰ کے ابتدائی دور کے متعلق ہم اپنی بڑھتی ہوئی واقفیت کی بنا پر ممکن ہے، ایک دن اس عمل کو جس کے نتیجہ میں اس حق کی تدریجی نشوونما ہوئی زیادہ تیقن کے ساتھ بیان کرسکیں۔ فی الحال ہمیں ان مقامی روایات پر ہی قناعت کرنا ہوگا جن میں باوجودیکہ بطور تاریخی شواہد کے بہت سی خامیاں پائی جاتی ہیں، لیکن پھر بھی ہمارے لیے انہیں کسی ایسے مسئلہ کے سلسلہ میں جن میں وہ کلیتہً یا قریب قریب متفق الرائے ہوں نظر انداز کرنا دشوار ہوگا۔ یہ روایات مقامی زمینداری کے

---

[1] الہ آباد، 323

[2] الہ آباد 323، 421۔ اس پیرا میں اجارہ داری کے جن دستاویزات کا حوالہ آیا ہے وہ سب کے سب عہد عالمگیری سے متعلق ہیں۔

[3] باب ہذا میں پہلے مرآۃ (ا) 173 ۔ 5 کی جس عبارت کا حوالہ آیا ہے، اس کا یہ واضح مفہوم ہے۔ اسی مفہوم کا نسبتاً زیادہ قطعی بیان Add. 6603، ورق 65 الف میں بھی موجود ہے۔

[4] ملاحظہ ہو اگلی فصل۔

حقوق کی ابتدا کو عموماً ایک ہی مخصوص نمونہ پر ایک طویل عمل کا نتیجہ بتاتی ہیں، یعنی یہ کہ اول ایک ذات یا قبیلہ کے افراد جو غالباً یا تو دیگر پہلے سے آباد کسانوں کو مادی تھے یا خود کسان تھے ایک جگہ آباد ہوتے ہیں۔ پھر دوسرے قبیلہ کے لوگ وہاں پہونچ کر انہیں یا تو باہر نکال دیتے ہیں یا ان پر غالب آجاتے ہیں اور اسی طور پر یکے بعد دیگرے یہ عمل جاری رہتا ہے۔ اگر ابتدا ہی سے نہیں تو آگے چل کر کسی منزل پر غالب ذات کے اقتدار کا علاقہ حق زمینداری کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس کے بعض سربر آوردہ افراد مغلوب علاقہ کے مختلف حصوں میں اس حق پر قابض ہو جاتے ہیں یہ عمل بظاہر دور مغلیہ تک چلتا رہا اور روایات کے علاوہ دیگر ماخذ سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عمل یہیں پر ختم نہ ہو گیا[1]

حقوق زمینداری کے قیام کے متعلق مروجہ منقولاتی بیان کے اس خلاصہ سے واضح ہے کہ ان

---

[1] ضلع گورکھپور کے متعلق ابتدائے انیسویں صدی کے ایک فارسی تذکرہ کی ایک مختصر عبارت کو منقولاتی شہادت کے مثالی نمونہ کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایام قدیم میں اس شہر (گورکھپور) کے نواح کا راج اور ریاست ڈوم ذات (قوم) کی ملکیت تھی۔ چنانچہ شہر کے قرب و جوار کے علاقوں میں مقامات بیتال گڈھ، رام گڈھ، بھنڈیا سکرلہ، ڈومن گڈھ وغیرہ میں ان کے قلعوں کے باقیات ابھی تک ملتے ہیں اور مواضعات میں تھارو ذات (قوم) یعنی پہاڑی لوگوں کی جن کا تعلق ان قبیلوں (قسم) سے ہے جو ان دونوں پہاڑوں کے دامن میں آباد تھیں۔ پہاڑی سامانوں کی فروختگی کے بجول کا بازار گورکھپور میں لگتا تھا۔ مسلمانوں کی عملداری کے قیام کے بعد سے یہ بازار اور تھارو لوگوں کی آبادیاں بتدریج ختم ہو گئیں اور اب وہ صرف ترائی کے علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔ سرینگر کے بعض سرینٹ راجپوتوں نے ان کی طاقت کو ختم کر کے اپنا تسلط قائم کر لیا اور یہ اب بھی گورکھپوری راجہ کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ورثاء سلہٹ اور گورکھپور کے نواحی پرگنوں کے مواضعات کی زمینداری پر قابض ہیں۔ گورکھپور کے نواحی پرگنوں اور سلہٹ میں بہت سے برتیے (زمینداران) (اپنی زمینوں پر) راجہ گورکھپوریوں کی عطا کردہ سند کی بنیاد پر قابض ہیں۔ اس کے بعد عہد اکبری میں کچھور کے تعلقہ دار کے عورتوں نے جو اپنے برادری کے لوگوں (لفظاً بھائیوں) کے ساتھ پہلے بھوا پارہ میں رہتے تھے نواح گورکھپور اور سلہٹ کی زمینداری پر اپنا زبردستی قبضہ کر لیا جو اب تک ان کے ورثاء کے پاس ہے (غلام حضرت، کوائف گورکھپور (1810ء) I.O. 4540، اوراق 5 ب 6 الف، علی گڈھ مخطوطہ ورق 7 الف۔ ب۔

اودھ میں مقامی زمینداریوں کی روایات کے متعلق دو مستند تصانیف رباقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر

میں زمیندار طبقہ کو ایسی متعدد ذاتوں پر مشتمل تصور کیا گیا ہے جنہوں نے متعدد علاقوں میں زمینداری کی زمینوں پر اجارہ داری قائم کر لی تھی۔ آئین اکبری' زمینداری کے ذات سے اس تعلق کو پوری طور پر تائید کرتی ہے کیونکہ اس کے "بارہ صوبوں" کی تفصیلی مردم شماری میں زمینداروں یا بومیوں کے خانہ کے تحت صرف زمینداران کی ذاتوں (قوم جمع اقوام) کے متعلق اطلاعات فراہم کی گئی ہیں۔ جیسا کہ باب ہذا کے شروع میں ذکر آیا ہے' ہندوستان کے تمام صوبوں کے ہر پرگنہ اور گجرات کے لیے اس خانہ میں علیحدہ علیحدہ اندراجات ملتے ہیں۔ عموماً ایک ہی پرگنہ کے سامنے صرف ایک ہی ذات درج ہے لیکن بعض اوقات دو اور تین نام بھی ملتے ہیں اور ایسا شاذ ہی ہے کہ الفاظ متعدد ذاتیں یا صرف 'متعدد' ہوں[1] پس ہمیں فرض کرنا چاہئے کہ ایک ہی ذات کے افراد کی زمینداری کے تحت متعین حدود اربعہ کے علاقائی ٹکڑے پائے جاتے تھے جن میں سے ہر ایک' ایک واحد پرگنہ یا پرگنوں پر مشتمل ہوا کرتا[2]

حالانکہ آئین اکبری کی معتبر سند کسی تائید کی محتاج نہیں' پھر بھی ہم بعض علاقوں میں زمینداری ذاتوں کے انفرادی حوالوں سے اسے تقویت پہونچا سکتے ہیں۔ بابر کے قول کے مطابق' نمک کا علاقہ تین حصوں میں منقسم تھا جن پر علی الترتیب جود' جنجوہہ اور گکھڑ قبیلے قابض تھے اور یہ دیگر جملہ

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

سی لے ایلیٹ The Chromicles of Donq الہ آباد 1862 اور ڈبلو۔ سی' بنٹ A report on the Family History of the Chief clons of Roy Bereilly District لکھنؤ 1870 ء ہیں۔

[1] اقوام مختلفہ" اور اصل میں" مختلفہ" موازنہ ہو۔ Elliot, Mineoccies , & c. ص 706

[2] Elthod, Menccles & c. میں ص 202 و ص 203 کے درمیان نقشوں کا ایک دلچسپ سلسلہ ملتا ہے۔ پہلے نقشہ میں قدیم شمالی' مغربی صوبہ (بہ استثنائے اودھ) کے علاقہ میں "آئین اکبری کے روسے مقبوضات زمینداری" اور دوسرے میں "1844 کے مقبوضات زمینداری" دکھائے گئے ہیں۔ نقشوں کے پیمانہ کے چھوٹے ہونے کے باعث ان میں بعض تفصیلات نہیں دکھائی گئی ہیں' مثلاً آئین اکبری میں مختلف راجپوت قبیلوں کو علیحدہ علیحدہ نہیں بلکہ ان کے مقبوضات کو ایک قسم کے رنگ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ نقشے قابل قدر ہیں' کیونکہ یہ ہمیں آئین اکبری کی تحریر کے وقت اور غدر کے قبل کی درمیانی مدت میں بڑی بڑی ذاتوں کے مقبوضات زمینداری کے رقبوں میں جو واضح تبدیلیاں ہوئی ہیں' انہیں بتاتے ہیں۔

باشندوں سے ان کے فی ہل اور گھرانہ کے حساب سے کچھ دستوری مطالبے (جنہیں ہم زمینداری کا محصول تصور کر سکتے ہیں) وصول کیا کرتے تھے[1] اسی طور پر صوبۂ اجمیر میں ہم کو بعض راجپوت قبیلوں کا حوالہ ملتا ہے جو بعض علاقوں کی زمینداریوں پر اجتماعی طور سے قابض تھے[2] صوبہ جات اودھ و الہ آباد کے ملحق علاقوں سے کاٹ کر سرکاری طور پر بیسواڑہ نام کا ایک ضلع بنایا گیا تھا اور ہمیں معلوم ہے کہ یہ "قبیلہ بیس کے سرکش زمینداروں کی سکونت کے متعدد محالوں" پر مشتمل تھا۔[3]

معلوم ہوتا ہے کہ چارلس ایلیٹ جو مقامی تاریخ کے بہترین محققوں میں سے ہے زمیندار قبیلوں میں زمین کی اس تقسیم سے بے حد متاثر ہوا۔ بقول اس کے "ایک پرگنہ کے حدود اور طبعی یا جغرافیائی حدود شاذ ہی کبھی یکساں ہوا کرتے تھے اور ان میں عدم مطابقت کا واحد ۔ دوسرا سبب محض حقوق ملکیت ہی ہو سکتا ہے۔" پھر چند دوسرے دلائل کی وضاحت کرنے کے بعد جن سے فی الوقت ہمارا کوئی تعلق نہیں وہ کہتا ہے کہ پرگنہ کو "زمین کا ایک ایسا علاقہ جو ایک غیر منقسم گروہ کے قبضہ میں کہا جا سکتا ہے۔"[4]

قبیلوں اور ذاتوں کے درمیان مقبوضات زمینداری کی علاقائی تقسیم اس طریق عمل کا نتیجہ تھی جس کے تحت حقوق زمینداری وجود میں آئے اس کے وجود کا ایک تاریخی پس منظر تھا۔ یہ تصور کرنا کہ یہ کسی اصول پر مبنی تھا اس کی تخلیق کی غلط تعبیر ہوگی۔ ایک قبیلہ کسی علاقہ پر تسلط حاصل کرنے کے بعد ممکن ہے سابق میں غالب قبیلہ کے تمام افراد کو علاقہ بدر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا ہو اور آخر الذکر میں سے بعض کا اس علاقہ کے دور افتادہ حصوں اور گوشوں میں تسلط باقی رہ گیا ہو[5] جب کبھی حق زمینداری

---

[1] بابرنامہ ترجمہ S. Beneridge (1) 379 - 387 اور طبقات اکبری (2) ص 159-50 بھی ملاحظہ ہو۔

[2] یعنی وتائع اجمیر ص 364 - 5 میں 'سیندھل' اور 'ریول' ذاتوں (قوم) کے حوالے۔

[3] انشائے روشن کلام' اوراق 6 ب - 7 الف ۔ بیسواڑہ 'لکھنؤ' اودھ' مانکپور اور کورہ (موجودہ کڑہ مترجم) کی جزوی سرکاروں پر مشتمل تھا۔ اس خطہ میں بیس لوگ اب بھی زمینداروں کی ایک مشہور ذات کی حیثیت سے موجود ہیں۔ ان محالوں کی فہرست کا جنہیں آئین اکبری میں بیس لوگ بطور زمیندار بیان کیے گئے ہیں Elliot, 'Chronicles of Oonao' ص 67 میں مندرجہ بیواڑہ کے محالوں سے موازنہ کرنا مفید ہوگا۔ چند اہم تبدیلیوں کے باوجود بیشتر محال دونوں فہرستوں میں مشترک ہیں۔

[4] دی کرانکلس آف اناؤ The Chronicles of Oonao ص 149 نوٹ۔

[5] گورکھپور کے متعلق غلام حضرت کے تذکرہ کی عبارت سے جو فصل ہذا کے فٹ نوٹ 3 (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

املاک کی ایک شئے کی حیثیت اختیار کر لیتا اور اس بنا پر اس کی آزادانہ خرید و فروخت شروع ہو جاتی جیسا کہ پورے مغلیہ دور میں تھا تو ایک اور زیادہ سنگین قسم کی بے ضابطگی رونما ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں سرمایہ ذات کے سابقہ حصار کو کمزور کر کے اس کے دروازوں کو باہر والوں کے لیے کھول سکتا تھا۔

الہ آباد میں محفوظ زمینداری کے بیعنامے اس امر کی کافی شہادت فراہم کرتے ہیں بائع اپنے حقوق کو غیر ذات کے اور بہت سے صورتوں میں غیر مذہب کے لوگوں کو بھی فروخت کیا کرتا تھا حسام پور کے زمرہ کے پانچ مواضعات جن کا حق زمینداری کے بعض پہلوؤں کی وضاحت کے سلسلہ میں پہلے حوالہ آچکا ہے یہاں بھی بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ یہ مواضعات جو ایک دوسرے سے متصلاً واقع تھے شروع میں بھی ایک ذات کے لوگوں کے قبضہ میں نہ تھے۔ ان میں سے تین برہمنوں اور دو کھتریوں کے تھے۔ لیکن بیس سال کے اندر اندر دو سید ذات کے باپ اور بیٹے نے مسلسل خریداریوں کے ذریعہ سابقہ تمام زمینداریوں کو خرید لیا[1] اودھ کے ایک دوسرے علاقہ یعنی پرگنہ سندیلا میں باچھل اور گہلوٹ قبیلوں کے راجپوتوں کا آئین اکبری میں بحیثیت زمینداران اندراج ملتا ہے[2] لیکن دور اکبری ہی کے ایک دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ چند برہمنوں اور دیگر اشخاص نے اس پرگنہ کے ایک موضع کے حقوق 'ستارہی' اور 'بیسی' کو ایک مسلمان کو ہاتھ فروخت کیا[3] اور عہد عالمگیری میں چند مسلمان (شیوخ) اور ایک غیر مسلم بڑھئی نے مل کر اسی پرگنہ کے ایک موضع کی "ملکیت یعنی ستارہی" کو دو غیر مسلم کلوار (شراب ساز) ذات (قوم) کے اشخاص کے ہاتھ فروخت کیا۔[4]

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

میں پہلے قلم بند ہو چکی ہے صاف ظاہر ہے کہ باوجودیکہ گورکھپور کے تعلقدار کے مورثوں اور برادری کے لوگوں نے نواح گورکھپور اور سلہٹ کے پرگنوں کی زمینداری پر زبردستی قبضہ حاصل کر لیا تھا پھر بھی سرینٹ راجپوتوں کے پرانے قبیلے ان دونوں پرگنوں کے بعض مواضعات کی زمینداری پر قابض رہے۔

[1] الہ آباد 891، 1196، 1205، 1215، 1216، 1219، 1221، 1222، 1224-12۔ یاد رہے کہ آئین اکبری میں پرگنہ حسام پور کے زمیندار کے تحت یہ اندراج ملتا ہے "ریکوڑ بجائے اور تھوڑے سے بسین"۔ اس میں نہ تو برہمنوں کا ذکر آیا ہے اور نہ سیدوں کا۔

[2] آئین اکبری۔ I، 439۔

[3] الہ آباد 317۔ [4] الہ آباد 435

ان تحریروں سے اس قسم کی مزید مثالیں فراہم کی جاسکتی ہیں۔ حالانکہ یہ ثابت کرنے کے لیے مذکورہ مثالیں ہی کافی ہیں کہ روپیہ، بیوپار اور تجارت کے بڑے مرکزوں سے فاصلہ پر واقع علاقوں میں بھی زمینداری کی ذاتوں میں تقسیم کے جغرافیائی حدود کو درہم برہم کر رہا تھا۔

آیئے، اب ہم ذرا پیچھے ہٹ کر نظام زمینداری کے ایک اور پہلو پر جو مذکورہ بالا منقولاتی شہادتوں سے واضح ہوتا ہے۔ نظر ڈالیں۔ یہ شہادتیں بتاتی ہیں کہ ہر ذات کے لیے زمینداری پر اپنا قبضہ قائم کرنے کا واحد ذریعہ اس کی مسلح طاقت ہوا کرتی تھی، بلکہ درحقیقت مسلح طاقت ہی حقوق زمینداری کے قیام اور نیز اس کے تحفظ کے لیے پہلی تاریخی شرط معلوم ہوتی ہے۔

بقول آئین اکبری، "(مملکت کے) زمینداروں کے سپاہی ۴۴ لاکھ سے زائد ہیں[1]۔" اس جملے کے ایک اضافی فقرے میں بتایا گیا ہے کہ ان لشکروں کی تفصیل کسی دوسرے مقام پر درج کی گئی ہے۔ اس سے مراد "دوازدہ صوبوں" کے گوشوارۂ اعداد و شمار میں "سوار" اور "پیدل" کے خانوں سے ہے[2]۔ یہ خانے، زمیندار کے خانے کے فوراً بعد آتے ہیں اور حالانکہ یہ واضح نہیں کیا گیا ہے مگر بالکل بدیہی طور پر ان خانوں کے اعداد زمینداروں ہی کی فوج کے ہیں۔ چنانچہ، جہاں کہیں بھی، ہر پرگنہ کے زمینداروں کے اندراجات دیئے گئے ہیں، وہاں سوار و پیدل کے بھی اعداد ملتے ہیں[3]۔ اسی طور پر جبکہ مسلم سرکاروں کے لیے تو صرف زمیندار ذاتیں درج ہیں، مگر

---

[1] آئین اکبری۔ ا ص 175۔ بلاکمین لکھتا ہے کہ اس نے جن دو مخطوطات سے رجوع کیا ہے۔ ان میں زمیندار کے قبل حرف "و"، (واو) لکھا ہوا۔ اس طور پر ابتدائی الفاظ "فوج اور زمیندار" ہوتے۔ حالانکہ اس صورت میں جملہ مہمل ہو جاتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر سرن اس تبدیلی کو یہ کہتے ہوئے تسلیم کرتے ہیں کہ "اس متبادل خواندگی کا جو بھی مفہوم ہو" Provincial Govt. & c ص 262

[2] اس گوشوارہ میں ہاتھی کے لیے کوئی علیحدہ خانہ نہیں ہے۔ بعض صورتوں میں جہاں ان کی تعداد درج ہے وہ سوار کے خانہ میں سوار کی تعداد کے نیچے دکھائی گئی ہے۔

[3] ایسی صورت میں جن میں کسی پرگنہ کے سوار اور پیادہ کی تعداد دکھائی گئی ہے مگر زمیندار کا خانہ خالی چھوڑا گیا ہو بہت شاذ ہیں اور ایسی صورت ہیں جن میں زمیندار کی تعداد دکھائی گئی ہو مگر فوج کی تعداد نہ لکھی گئی ہو اس سے بھی زیادہ شاذ ہیں۔ بعد والی چند صورتوں میں خاص طور پر یہ نوٹ درج ہے کہ اس پرگنہ کی فوج کی تعداد کو کسی دوسرے پرگنہ میں شامل کر دیا گیا ہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

فوج کے لیے سرکار کے اعداد ملتے ہیں۔ پرگنہ وار اعداد سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ صرف باجگذار سرداروں کی فوج کے ہی نہیں بلکہ خاص طور۔ معمولی زمینداروں کی فوج کے ہیں۔ حکومت کے براہ راست زیر انتظام علاقوں کے پرگنوں کی فوج کے اعداد درحقیقت باجگذار سرداروں کے علاقوں کے اعداد سے بہت زیادہ ہیں۔ ہر صوبہ میں زمینداروں کے سپاہیوں کی میزان کو لفظ 'بومی' کے تحت جو زمیندار کا مرادف ہے دکھایا گیا ہے۔ صوبوں کے اعداد کی میزان پوری مملکت کے شمار یعنی 44 لاکھ سے تھوڑا ہی زائد ہے۔ یہ اعداد پوری مملکت میں زمینداروں کی فوج کے اجزا ترتیبی کے لحاظ سے بھی دلچسپ ہیں۔ 384 558 سوار، 42 70 57 پیدل، 18 63 ہاتھی، 42 60 بندوقیں اور 4500 کشتیاں[1]

یہ پتہ نہیں چلتا کہ اکبر کی حکومت کے پاس زمینداروں کے فوجی وسائل کے متعلق اطلاعات حاصل کرنے کے کیا ذرائع تھے۔ لیکن ان اعداد و شمار کی تفصیلی نوعیت قابل قدر ہے۔ ایک طرف میدانوں کے کثیر اعداد اور دوسری طرف ان اعداد کی پرگنہ وار تقسیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقریباً ہر با حیثیت زمیندار کے پاس مسلح ملازمین تھے۔ پرگنہ صمام پور کے مواضعات کے متعلق دو سیدھی سادی تحریریں اس عام حقیقت کی بالکل واضح طور پر تائید کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک میں جو کسی شخص کی شکایت کے متعلق ہے اس امر کا ضمنی ذکر ملتا ہے کہ پانچ مواضعات کی زمینداری میں بھی جو بذریعہ خریداری حاصل کی گئی تھی۔ زمیندار کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنی مملوکات کی حفاظت کے لیے قلعچہ یعنی چھوٹا قلعہ تعمیر کرائے[2] دوسری تحریر، ایک سرکاری حکم کی ہے جس میں ایک موضع کے

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) (آئین اکبری۔ ا۔ ص 435، 459، 494-5، 541) بعض اوقات (ایضاً 435، 459، 541) یہ تحریر زمینداران ذات کے نام کے بالکل نیچے ہے جو اس بات کا ایک دوسرا معمولی سا ثبوت ہے کہ فوجیں درحقیقت زمینداروں کی تھیں۔ مگر چونکہ بلاکمین نے ان خانوں کو حذف کر دیا ہے، لہٰذا اس بات کو سمجھنے کے لیے ہمیں متعلقہ اندراجات کو آئین اکبری کے مخطوطات میں خود دیکھنا چاہیے۔ جیرٹ (Jarret) کے آئین اکبری کے اپنے ترجمہ میں ان خانوں کو برقرار رکھنے سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، کیونکہ اس نے خانوں کی اصل ترتیب کو قائم نہیں رکھا ہے۔ سوار پیدل اور ہاتھی کے خانے "ذاتوں" کے خانہ کے قبل آئے ہیں بعد میں نہیں۔

[1] آخری دو اعداد میں پہلا صرف بنگال کا ہے اور دوسرا بنگال کی تعداد (4400) اور بہار (100) کی میزان ہے سب سے زیادہ ہاتھیوں کی تعداد بنگال (1170) میں درج ہے۔

[2] الٰہ آباد، 1225۔ قلعچہ، پانچوں میں سب سے بڑے موضع پسناجٹ میں تعمیر کیا گیا ہے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

صرف ایک تہائی حصہ کے مالک کی اس شکایت کا ذکر آیا ہے کہ ایک غاصب نے "اس قلعچہ کو جسے اس نے اپنے آدمیوں کو قیام کے لیے تعمیر کیا تھا" مسمار کر کے اس کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے۔ حکم میں ہدایت ہے کہ قلعچہ کو مسمار کنندگان از سرِ نو تعمیر کر کے اس کے حوالہ کر دیں[1] یہ دونوں تحریریں جن کے مخاطب سرکاری عمال تھے ظاہر کرتی ہیں کہ قلعچہ کی تعمیر صرف یہی نہیں کہ زمینداروں کے معمولات میں داخل تھی بلکہ حکام بھی اس کی تعمیر کو بالکل جائز سمجھتے تھے۔ ایسی صورت میں پورے ملک میں اس قسم کے بے شمار چھوٹے چھوٹے قلعے پائے جاتے رہے ہوں گے۔ حکام، انہیں صرف اس وقت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے، جب زمینداران کا استعمال کسانوں کو اپنے دباؤ میں رکھنے کے بجائے حکومت سے سرکشی کرنے کے سلسلے میں کرتے تھے۔ ایسے چھوٹے قلعوں کے خلاف جنہیں قلعچہ یا گڑھی کہا کرتے سرکاری حکام کی طرف سے کارروائیوں کی کثیر اطلاعات ملتی ہیں[2] ان اطلاعات سے واضح ہوتا ہے کہ ایسے چھوٹے قلعے صرف اودھ کے ایسے چھوٹے قلعے صرف اودھ کے ایسے صوبوں ہی میں نہیں، بلکہ مملکت کے وسطی علاقوں کے اس قدر قریب یعنی مرکزی دوآبہ میں بھی پائے جاتے تھے۔

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

شکایت کنندہ خود سید محمد عارف ہیں۔ شکایت میں تاریخ نہیں ملتی، لیکن شجرہ کی تاریخ 12 دسمبر 1669ء بتائی گئی ہے۔ سید عارف کے کاغذات سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی زمینداری میں بعض دیگر مواضعات شامل تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی مذکورہ زمرۂ پسناجٹ کے مواضعات کے متصلاً واقع نہ تھے۔

[1] الہ آباد 786 (مورخہ جنوری 1684ء)

[2] ایک سرکاری عہدہ دار غالباً صوبیدار اکبرآباد (آگرہ) نے دربار شاہی میں اطلاع بھیجی کہ ایک ماتحت افسر کا پسی اور اٹاوہ سے براہ مارہرہ اور کول زمینداروں کے قلعوں کو مسمار کرتا ہوا آگرہ پہونچا۔ مسمار شدہ گڑھیوں کی ایک مکمل فہرست (طومار) کا اس کے حسن خدمت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ (درۃ العلوم، اوراق 73 الف 74 الف) بیسواڑہ میں اس طرح کے قلعوں کے خلاف کارروائیوں کے لیے ملاحظہ ہو، انشائے روشن کلام خصوصاً اوراق 2 الف 4 الف، 6 الف۔ 8 الف۔ صوبۂ الہ آباد میں کوڑہ کے ایک فوجدار نے دربار شاہی میں اطلاع بھیجی کہ اس علاقہ کے سرکش زمینداروں نے "ہر موضع میں تین تین، چار چار قلعچے تعمیر کر لیے ہیں۔" (اخبارات $\frac{47}{150}$) مملکت کے مختلف خطوں میں زمینداروں کے گاؤں کے قلعوں کے اس قدر کثیر حوالے ملتے ہیں کہ ان کی مکمل فہرست مرتب کرنا ممکن نہیں، لیکن ذیل کے اندراجات کو بطور مثال کے کافی ہونا چاہیے وقائع اجمیر 236، اخبارات $\frac{47}{56}$ احکام عالمگیری ورق 205؛ ببکس، اوراق 52 ب 53 الف

یہ چھوٹے قلعے زمینداروں کی مسلح طاقت کے عینی علامت ہوا کرتے۔ وہ ان سے قلعوں، فوج کے مستقر اور چھاؤنیوں کا کام لیتے تھے مگر ان کی طاقت کا حقیقی سرچشمہ ان کے لاکھوں کی تعداد میں مسلح سپاہی ہوا کرتے تھے۔

چونکہ حق زمینداری کی تشکیل میں ذات کے عنصر کو اس قدر دخل تھا، لہٰذا ہم یہ بجا طور پر قیاس کر سکتے ہیں کہ زمیندار کے سب سے زیادہ وفادار سپاہی ان کی ذات کے وہ لوگ ہوتے ہونگے جو ان کے ہمراہ آکر وہیں رہ بس گئے تھے۔ یہ امر کہ یہ طریقہ عام طور پر رائج تھا، سترھویں صدی کے مصنفین جس طور پر لفظ 'الوس' کا استعمال کرتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ لفظ منگولیا اور وسطی ایشیا سے درآمد ہوا تھا جہاں اس سے ایک قبیلہ جسے بطور ایک جنگی دستہ کے منظم کیا گیا ہو، یا ایک جنگی دستہ جسے ایک قبیلہ کا نام دے دیا گیا ہو مراد تھا۔[1] ہندوستان میں اسے شاہی فوج کی ایک اکائی سے نہیں بلکہ بیشتر زمینداروں سے منسوب کیا جاتا تھا۔ ایک طرف تو اسے زمیندار ذاتوں کے لیے استعمال کرتے، جیسا کہ ہم کچھواہوں، راٹھوروں، گونڈوں اور بلوچوں وغیرہ کے الوس کے بارے میں سنتے ہیں۔[2] صوبہ اجمیر کی ایک سرکاری خبروں کی رپورٹ مظہر ہے کہ بیندھل راجپوتوں کے الوس کے قبضہ میں میواڑ کے پاس کسی جگہ کی زمینداری تھی۔[3] ساتھ ساتھ، یہ لفظ ایک اسلحہ بند جماعت کا بھی مفہوم رکھتا تھا۔ چنانچہ کوئی شخص شورش زدہ علاقہ میں اسی وقت زمیندار تسلیم کیا جاتا تھا جب اس کے قبضہ میں کوئی الوس ہو۔[4] الوس کا یہ استعمال اسی صورت میں ممکن تھا جب یہ قیاس کر لیا جائے کہ زمیندار ذات اور کسی زمیندار کے ملازم سپاہیوں کی ایک جماعت میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔

بہر حال، یہ بالکل ناممکن ہے کہ آئین اکبری کے شماریات میں مندرج چوالیس لاکھ کی

---

[1] موازنہ بہ وآئی کوآئی سن، دی سیکرٹ ہسٹری آف دی منگول ڈائی نسٹی Wei Keeerieun, The Secret History of the Mongol Dynasty علی گڑھ 1955ء، ص 13-14، 16، 17

[2] اکبر نامہ 2 ص 156، آئین اکبری ا۔ ص 477-486، سوجان رائے 63

[3] وقائع اجمیر، 364۔ اس میں آگے بیان کیا گیا ہے کہ سندھیلوں کو جنہیں رانا نے میواڑ سے نکال دیا تھا جالور کے قریب زمینداری فراہم کی جانے والی تھی۔ وہ لوگ مع اپنے اہل خاندان کے دو ہزار پانچسو آدمی اور گھوڑے و پیدل تھے آئے۔

[4] انشائے روشن کلام، اوراق 3 ب۔ 4-الف، کلمات طیبات، اوراق 127 ب۔ 128-الف

فوج سب کی سب زمیندار ذات ہی کے افراد پر مشتمل رہی ہو۔ ممکن ہے گھوڑا سوار جو تعداد میں بمقابلہ پیدل کے کم مگر مرتبہ میں افضل ہوتے زیادہ تر اسی ذات کے لوگ ہوا کرتے ہوں۔ لیکن تحریروں میں ایک مثال ایسی بھی ملتی ہے جس میں بیواڑہ کے ایک پرگنہ کے ایک سرکش بتس (راجپوت) زمیندار نے ایک افغانی کو ایک ملازمت میں رکھ کر اسے اپنے تعمیر کیے ہوئے ایک قلعہ کا قلعدار مقرر کیا تھا[1] اگر دولت، حق زمینداری کے ذات کی بنیاد پر قبضہ میں مزاحم ہو سکتی تھی تو پھر ہمیں کسی زمینداری کے دوسری ذات و مذہب کے لوگوں کو ملازم رکھنے پر تعجب نہ کرنا چاہیے

حالانکہ اس کی کوئی سند نہیں ملتی، مگر ایسا ہو سکتا ہے کہ زمینداروں کے زیادہ تر پیدل سپاہی کسان یا گاؤں والے ہوتے رہے ہوں، جنہیں یہ ذہن نشین کرایا گیا تھا کہ ان کو اپنے زمینداروں کی بوقت ضرورت مدد کرنا ہوگا۔ ہم بعض اوقات سنتے ہیں کہ زمیندران اپنے مقامی ہنگاموں یا حکام سے مقابلہ میں، گنواروں، اور دیہاتوں کی کثیر تعداد کو استعمال کیا کرتے تھے[2] فرید (بعد کا شیر شاہ)، کی بہار میں اپنی باپ کی جاگیر کے سرکش زمینداروں کے خلاف مہم کے سلسلہ میں بتایا جاتا ہے وہ ان کے مواضعات پر فوج کشی کرنے کے بعد وہاں کے تمام آدمیوں کو ختم کر کے پرانی آبادی کے نام و نشان تک کو مٹا ڈالتا تھا اور پھر از سر نو کسانوں کو آباد کرتا تھا اس کے اس عمل کا محرک لازمی طور پر یہ تخیل رہا ہوگا کہ تمام پرانے کسان اگر زمینداروں کے نوکر نہیں تو کم از کم جنگ میں ان کی طرف سے ضرور شریک ہوئے ہوں گے[3]

زمینداروں کے اپنی مسلح فوج کی ادائگی کے طریقہ میں غالباً بیحد اختلاف پایا جاتا تھا۔

---

[1] انشائے روشن کلام، ورق 6 ب۔ صرف اسی قدر نہیں بلکہ اس نے اس افغان کے نام پر اس قلعہ کا نام سلیم گڑھ رکھا۔

[2] دور اکبری میں گنواروں کی پرگنہ جلیسر (آگرہ) میں ایک چھوٹے زمیندار کی طرف سے شاہی افسران کی ماتحتی میں ایک فوج کے خلاف جنگ میں شرکت کے لیے ملاحظہ ہو بدایونی۔ 2 ص 151 اور الہ آباد 1202، مورخہ مئی 1676ء میں سید احمد وغیرہ کی طرف سے ایک شکایت کا اندراج ملتا ہے کہ چند مواضعات میں ان کے حقوق زمینداری کو بعض لوگوں نے ناجائز طور پر غصب کر لیا ہے۔ جاگیردار (فوجدار) سے شکایت کرنے پر کچھ سوار فوج ان کا قبضہ واپس دلانے کے لیے بھیجی گئی۔ ان کے دشمنوں نے "سرکش اور گنواروں کی ایک کثیر تعداد" جمع کر کے سوار فوج کو بھگا دیا۔

[3] عباس خاں، اوراق 14۔ ب 15۔ الف۔

کسی زمیندار کا جب مالگذاری کے محصّل کی فوج کے حملہ سے مقابلہ ہوتا تو کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے "اپنے نئے اور پرانے سواروں اور پیدل سپاہیوں اور نوکروں کی فہرست" تیار کرتا تھا "جن کی خدمت کا صلہ زمین کے عطیہ یا نقد کی شکل میں ادا کیا جاتا"[1] بہت ممکن ہے کہ زمیندار معمولاً اپنے قبیلہ کے لوگوں کو ان سے اپنی خدمت کا قول وقرار ٹھہرا لینے کے بعد اپنی تھوڑی سی زمین دیدیتے ہوں جیسا کہ خود مختار سرداروں کے علاقوں میں راجپوتوں کے ساتھ ہوتا تھا۔[2] یہ امر کہ جب زمیندار اپنے گنواروں کو اپنے مناد کے تحفظ کے لیے طلب کرتا تو انہیں کچھ تنخواہ ادا کرتا یا وہ بطور بیگار (بلا اجرت) کام کرتے تھے، ہماری تحریروں کے نامکمل ہونے کے باعث ابھی تک تحقیقات طلب ہے

موجودہ و نیز پچھلی فصلوں میں جمع کی ہوئی معلومات کی بنیاد پر زمیندار طبقہ کی حیثیت کے متعلق کچھ عمومی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ اولاً یہ کہ چونکہ وہ کسان کی پیداوار بچت میں اپنے حصّہ کا دعویدار ہوا کرتا، لہٰذا ہم اسے ایک استحصال کرنے والا طبقہ قرار دے سکتے ہیں۔ باوجودیکہ یہ حصّہ مختلف مقامات پر ہوا کرتا مگر کسانوں سے حکومت کے نام پر جو کچھ بطور مالگذاری و دیگر محاصل ناجائز طریقہ پر وصول کیا جاتا۔ اس کے بالمقابل فی الجملہ اس کی حیثیت ثانوی ہوا کرتی۔ دوسرے یہ کہ، یہ طبقہ مختلف پہلوؤں سے استبداد یا خالصتہً ایک مقامی طاقت کے عناصر کی نمائندگی کرتا تھا۔ زمین پر ان کے حقوق موروثی ہوا کرتے اور ہر چند کہ قبیلوں کی نقل و حرکت یا فروختگیاں مقبوضات زمینداری پر اثر انداز ہو سکتی تھیں پھر بھی زمینداری کی معمولاً اپنے مورثوں کے نسلاً بعد نسلاً قبضہ کی زمینوں سے وابستگی بہت محکم ہوا کرتی تھی۔ زمین کی پیداواروں اور نیز آبادی کے رسم و رواج سے گہری واقفیت اس کے لیے بیحد فائدہ کا پہلو رکھتی تھی۔ لیکن مقامی روابط کا مفہوم مقامی عصبیت بھی تھا۔ اگر اس کے مطمح نظر کا دائرہ کبھی اپنے خاندانی حدود سے تجاوز کرتا بھی تو یہ اپنی ذات کے مقبوضات پر پہونچ کر ختم ہو جاتا۔ پہلے ذکر آچکا ہے کہ بحیثیت ایک طبقہ کے زمینداران حقیقتاً متعدد ذاتوں پر مشتمل ہوا کرتے جو عرصہ دراز سے ایک دوسرے کو تباہ

---

[1] بیکس ورق 52 ب

[2] "راجپوتوں کا دستور ہے کہ وہ اپنے وطن کے علاقے کے حالوں میں راجپوتوں کو مواضعات دیتے ہیں اور جنگ کے مواقع پر یہ اپنی جان کی قربانی پیش کرتے ہیں Documents of Auranzeb': Reign میں اندر سنگھ راٹھور کی دربار کے نام عرضداشت) موازنہ بہ Bernier 39 - 208 -

کرنے اور اپنا محکوم بنانے میں مصروف چلے آرہے تھے۔ زمینداریوں کی خرید و فروخت نے اس طبقہ میں سماجی اونچ نیچ کو اور بڑھایا ہوگا۔ جیسا کہ باب ہذا کے شروع میں گذر چکا ہے کہ مقبوضات زمینداری کا علاقائی تسلسل 'رعیتی' یا خالصتہً کسانوں کے زیر تصرف مواضعات کے علاقہ کی وجہ سے منقطع ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس طبقہ میں مذکورہ سماجی تقسیم کے علاوہ جغرافیائی تقسیم بھی پائی جاتی تھی

زمیندار طبقہ کی طاقت اور اس کی کمزوری اس کے زیر قبضہ مسلح طاقت کی نوعیت سے ظاہر ہوتی تھی۔ زمیندار کا قلعہ اس کی اپنی موروثی زمین کو محفوظ رکھنے کا عزم کا مظہر تھا۔ کسانوں کی تعداد کی کثرت کے باعث، وہ غالبًا پیدل سپاہیوں کی کمی کو محسوس نہ کرتا تھا۔ چالیس لاکھ پیدل سپاہی کوئی معمولی تعداد نہیں ہوتی۔ پیادہ فوج، زمیندار کے خالصتہً مقامی حوصلوں اور نقل و حرکت یا طویل المسافت مہموں سے اس کی بے رغبتی کی علامت تھی۔ حالانکہ عام طور پر گھوڑا سوار فوج کے معاملہ میں جو جنگی نقل و حرکت کا ایک ناگزیر بازو ہوتا ہے وہ نسبتًا بہت کمزور رہا کرتا۔ آئین اکبری کی مردم شماری کی رو سے زمیندار کے پاس ہر ۱۰ پیدل سپاہی پر مشکل سے ایک گھوڑا تھا۔ برخلاف اس کے 'دور شاہجہانی کے ایک سرکاری تخمینہ کے مطابق شاہی سوار فوج کو (باستثناء اس کے جو فوجداروں اور حکام مال کی ماتحتی میں مالگذاری کی وصولی کے کام پر مامور رہتی) 200,000 اور پیدل کو 40,000 بتایا گیا ہے یعنی ہر پیدل سپاہی پر 5 گھوڑا سوار[1] چونکہ مذکورہ شاہی سوار فوج میں وہ تعداد جو تحصیل مالگذاری پر لگی ہوئی تھی شامل نہیں ہے لہٰذا یہ

---

[1] لاہوری 2 ص 715 کا تخمینہ منصب داروں کی فوجوں کے فرد داغ کے معاینہ پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس نے یہ تعداد بظاہر سواروں کو مجموعی تعداد کو محض چار سے تقسیم کرکے، حاصل تقسیم میں شاہی خزانہ سے براہ راست تنخواہ پانے والے منصب داروں اور سواروں کی گنتی کو جوڑنے کے بعد حاصل کی ہے مگر واقعتہً ان منصب داروں کو جن کے پاس ان کے صوبہ ملازمت ہی میں جاگیریں تھیں اپنے سواروں کے ایک تہائی حصہ کو داغ کے لیے حاضر کرنا ضروری تھا۔ برخلاف ان کے پیمانہ ماہواری (Mouth scale) میں جو منصب دار ۵ ماہ سے کم کے درج تھے انہیں اس معیار سے کم لانا ہوتا تھا (موازنہ ہو لاہوری 2 ص 506-7) تاہم لاہوری کی تعداد ایک سرسری تخمینہ کا کام دے سکتی ہے۔ جہاں تک پیدل فوج کا تعلق ہے، بقول اس کے یہ "بندوقچیوں، گولہ اندازوں اور تیر اندازوں پر مشتمل رہا کرتی جن میں سے 10,000 دربار میں اور بقیہ (مطبوعہ نسخہ میں 30,000 کے بجائے 000 30 ایک صریح غلطی ہے) "صوبوں اور قلعوں میں" تعینات تھے۔

قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کی مجموعی تعداد آئین اکبری کے شمار کے مطابق زمیندار کے تقریباً چار لاکھ گھوڑ سواروں سے کم نہ رہی ہوگی۔ علاوہ اس کے، نسل کے معاملہ میں بھی آخر الذکر کا شاہی گھوڑوں سے کوئی مقابلہ نہ کیا جا سکتا تھا۔ قطع نظر اس کے، اس وجہ سے کہ زمینداروں کی فوجیں بجائے متحد رہنے کے منتشر اور بیشتر اپنی اندرونی نزاعات میں مصروف رہا کرتیں، وہ شاہی افواج کا مؤثر طور پر مقابلہ کرنے کی صلاحیت سے محروم رہی ہوں گی۔

زمینداروں کا طبقہ، اس خطرناک حد تک آپس میں تقسیم اور اپنی ذات پات و مقامی بندھنوں میں جکڑا ہوا تھا (حالانکہ حقیقتاً، بعض پہلوؤں سے یہی امرانکی طاقت کا اصل سرچشمہ اور ان کی بقا کا ضامن تھا) کہ ان کے لیے ایک متحد حکمران طبقہ کی حیثیت میں ابھر کر مملکت سازی کے کام کی انجام دہی کبھی ممکن نہ تھی۔ دور وسطیٰ میں غیر ملکی فاتحوں کے جانب سے ہندوستان میں مملکت سازی کی اہم تحریکوں کے بار بار شروع کیے جانے کا کم از کم ایک سبب ملک کی سب سے زیادہ طاقتور جماعت کی یہی نا اہلی ہو سکتی ہے[1]

فصل ۳ شاہی انتظامیہ اور زمیندار

شاہی انتظامیہ اور زمیندار کے درمیان جو تعلق قائم تھا اس کا مطالعہ کرنے کے قبل ہمیں اس تفریق کو مدنظر رکھنا چاہیے جس کا تذکرہ باب ہٰذا کی پچھلی فصلوں میں آچکا ہے۔ گو کہ ہمیں معلوم ہے کہ باجگذار سرداروں کو بھی زمیندار ہی کہا جاتا تھا، لیکن شاہی انتظامیہ کے براہِ راست تحتی علاقوں میں، ہمیں ان کے اور معمولی زمینداروں کے درمیان تفریق کرنا چاہیے۔ باجگذار سرداروں کا بیان اگلی فصل میں آئے گا۔ فی الحال، ہم اپنی بحث کو معمولی زمینداروں تک محدود رکھتے ہیں۔

پہلے ذکر آیا ہے کہ زمینداروں کو ان شاہی علاقہ کے بیشتر صوبوں میں زمین کے صرف ایک حصہ پر حقوق حاصل ہوا کرتے۔ علاوہ ان کے رعیتی علاقے تھے جن میں کسان ہی تنہا حقوق کے مالک تھے۔ آخر الذکر علاقوں میں حکومت کسانوں سے براہِ راست معاملہ کرتی اور اس

---

[1] غیر ملکی نسل دخون کے عناصر کا غلبہ ہمہ نیر کے وقت سے بحث کا موضوع رہا ہے (ص 215) آئین اکبری میں منصب داروں کی فہرست کی بنیاد پر مورلینڈ کا خیال ہے کہ اکبر کی ملازمت میں "غالب طور پر" غیر ملکی یعنی تورانی اور ایرانی تھے India & c. of Akbar 69 - 70) یہ موضوع ابھی تحقیق طلب ہے۔

حقیقت نے اپنے نقوش مغلوں کے پورے مالی نظام پر چھوڑے ہیں۔ یہی نہیں کہ سرکاری ضابطوں میں برابر کسانوں سے براہِ راست ربط قائم کرنے یعنی ان کی زمینوں پر لگان کی تشخیص کرنے کے اور اس کی انفرادی وصولی پر زور دیا جاتا تھا بلکہ ان میں سے اکثر خصوصاً ٹوڈرمل اور فتح اللہ شیرازی، آئین اکبری اور اورنگ زیب دراسکد اس[1] کے نام فرمان) کے ضابطوں میں باوجودیکہ لگان کی تشخیص اور وصولی کے جملہ اصول بیان کیے گئے ہیں، مگر ان میں زمینداروں کا حوالہ بالکل نہیں آتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شعبۂ مال کے مسلمہ انتظامی ڈھانچہ میں زمیندار کو کوئی مقام حاصل نہ تھا اور اس کا تذکرہ ان ایام کے انتظامی ضابطوں میں کہیں کہیں صرف ڈھکا چھپا ہوا ملتا ہے۔

مگر ہماری تحریروں میں اس امر کا کافی شہادت پائی جاتی ہے کہ زمیندار سے اس زمین کی مالگذاری جس پر وہ زمیندارانہ حقوق کا دعویدار ہوا کرتا طلب کی جاتی تھی۔ عہد عالمگیری میں بنگال سے راجستھان تک کے علاقہ کے متعلق اس نوعیت کی کثیر شہادتیں ملتی ہیں۔ ہمیں، انگریزی کمپنی انگریزی کی طرف سے ایک قرار داد (مچلکہ) کی نقل ملتی ہے جس میں کمپنی نے مواضعات بشمول دیہی کل کتا یعنی موجودہ کلکتہ کی مالگذاری (مال واجب) کو ان کے حقوق زمینداری کی خریداری کے بعد ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔[2] بنگال کے متعلق اسی نوعیت کی اور بھی کثیر شہادتیں موجود ہیں[3] اور ہم جلد ہی ایک دوسرے موضوع کے ضمن میں ان پر غور کریں گے۔ اودھ میں تحریروں کا ایک مجموعہ جنہیں 'قول و قرار' کہتے تھے ملتا ہے جو حکام کا جاری کیا ہوا تھا ان میں زمینداروں پر مخصوص برسوں کے لیے زمین کی مالگذاری تشخیص کی گئی ہے۔[4] اس مجموعہ

---

[1] اس میں زمینداروں کا صرف ایک مقام پر ضرور حوالہ آیا ہے لیکن لگان کی تشخیص یا وصولی کے طریقہ کے سلسلہ میں نہیں۔

[2] Add 24.039، ورق 36 ب۔

[3] موازنہ بہ خصوصاً دارالعلوم، ورق 47 الف سے 48 الف اور ہجز Hedges ا۔ ص 39

[4] الہ آباد 897، 1206، 1223 اور نیز 1220 (جو تشخیص کی قبولیت کا ایک دستاویز ہے) ان میں سے پہلے دو میں جن اشخاص پر مالگذاری تشخیص کی گئی ہے، انہیں تعلقہ دار کہا گیا ہے لیکن مضمون سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اشخاص مواضعات (یعنی زمرۂ پٹہ جٹ) باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کے دیگر دستاویزوں میں زمینداروں پر زجع، یا ان کے مواضعات پر تشخیص شدہ مالگذاری کو حکام کو ادا کرنے کی پابندی کا حوالہ ملتا ہے[1] فوجدار بیسواڑہ کے ایک خط میں ایک مخصوص علاقہ کے "کسانوں اور زمینداروں" کے متعلق بتایا گیا ہے کہ "وہ جاگیرداروں کے گماشتوں کے پاس حاضر ہو کر پابندی سے زمین کی لگان ادا کرتے ہیں"۔[2] سرکار سنبھل اور کاپسی کے زمینداروں کی درخواستوں پر جو دو شاہی احکام جاری ہوئے، ان میں، ماضی میں درخواست دہندگان کی پابندی کے ساتھ ادائگی مالگذاری کو ان کی درخواستوں پر غور کرنے کے لیے اول شرط قرار دی گئی ہے۔[3] ایک پروانہ کے ذریعہ جس میں متھرا کے نواح میں ایک شخص مسمی قاسم کے نام 25 مواضعات کی منظوری درج ہے جو پہلے سے اس کی جاگیر میں چلے آرہے تھے، نئے زمیندار کو مطلع کیا گیا ہے کہ وہ زمین کی مالگذاری اور سرکاری محصولوں (مال واجب و حقوق دیوانی) پر تیام جاگیر اپنا تصرف کر سکتا ہے۔ بعد میں جب وہ مواضعات دوسروں کو جاگیر میں دیے جانے لگے تو وہ وصول کردہ مالگذاری (حاصل) کے لیے اس جگہ کے عامل (محصل مالگذاری کو دتیا نائے جاگیردار کی طرف سے) جوابدہ ہوگا۔[4] ایک سرکاری خط میں حصار کے ایک پرگنہ کے بعض زمینداروں کی ایک عامل کے خلاف ان سے غلط وقت پر لگان وصول کرنے کی شکایت کا حوالہ ملتا ہے[5] صوبۂ اجمیر سے خبروں کی اطلاعات میں زمینداروں کے مالگذاری کو بطور ایک مسلمہ حقیقت کے یا بطور ایک ایسی پابندی کے جو بہ جبر نافذ کی جا سکتی تھی ادا کرنے کے اکثر حوالے ملتے ہیں[6]

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

کے مواضعات جن کا بار بار حوالہ آیا ہے) کے زمیندار تھے۔ آخری دو دستاویزوں میں شخص الیہم کو مواضعات کا مالک بتایا گیا ہے۔

[1] ملاحظہ ہو، الہ آباد 782 اور نیز الہ آباد 34 12۔

[2] انشائے روشن کلام، اوراق 19 ب۔ 20 الف اور ملاحظہ ہو نیز ورق 7 الف۔

[3] دارالعلوم، اوراق 43 ب 56 ب۔ 57 الف اور اوراق 61 ب۔ 62 الف۔

[4] نگارنامہ منشی، اوراق 199۔ الف 200 الف Bodl اوراق، 157 ب۔ 158 الف۔

[5] بالکرشن برہمن، 63 ب۔ 64 الف۔ عامل نے ابھی فصل ہری ہی تھی کہ مدعی کے لڑکوں اور مویشیوں کو فروخت کر کے مبلغ پانچ ہزار روپیہ زبردستی وصول کر لیا"۔ [6] وقائع اجمیر، 57، 398 وغیرہ۔

یہ شہادتیں محض وضاحت کے خاطر قلم بند کی گئی ہیں، ورنہ زمینداروں کے مالگذاری ادا کرنے کی عام مثالیں یا ایسی مثالیں جو مختص المقام نہ ہوں، اس قدر زیادہ ہیں کہ ان سب کو ضبط تحریر کرنا محال ہے۔ تنہا مذکورہ شہادتوں ہی کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی طور پر بھی زمینداروں کی وساطت سے مالگذاری زمین کی وصولی کا کام، اکبر کے قائم کردہ ضبط کے نام سے موسوم نظام کے تحت صوبوں یا بہ الفاظ مملکت کے بالکل مرکزی حصّوں کے خارج نہ تھا۔ ان شہادتوں کے کلیتہً عہد عالمگیری سے متعلق ہونے کا سبب یہ ہے کہ بمقابلہ پچھلی حکومتوں کے اس دور میں اطلاعات کی زیادہ فراوانی پائی جاتی ہے۔ یہ شبہ کہ یہ طریقہ اکبر اور اورنگ زیب کی درمیانی مدت میں رائج ہوا۔ اکبر کے ایک فرمان سے جو ابھی تک محفوظ ہے رفع کیا جا سکتا ہے یہ فرمان جو اس کی حکومت (الٰہی) کے اڑتیسویں سال جاری ہوا تھا ایک مذہبی پیشوا کو اسکی متھرا کے قریب زمینداروں سے خریدی ہوئی زمین پر مالگذاری و دیگر محصولات (مال و جہات) کی ادائیگی سے مستثنیٰ کرتا ہے[1] یہ ایسا استثناء ہے جو حقیقتاً ایک عام قاعدہ کو ثابت کرتا ہے۔

بظاہر سترھویں صدی کے نصف آخر تک زمیندار کی مالگذاری ادا کرنے کی حیثیت کو واضح کرنے والی ایک خاص اصطلاح تعلقہ دار رائج ہوئی۔ تعلقہ دار کسی تعلقہ پر قابض شخص کو کہتے ہیں۔ تعلقہ کے لفظی معنی تعلق ہوتا ہے۔ مگر یہ ایسی زمین یا علاقہ کے مفہوم میں استعمال ہوتا تھا جس پر کسی حق کا دعوٰی کیا جائے[2] تعلقہ دار کی اٹھارہویں صدی کی تعریف کے سلسلہ

---

[1] جھویری، دستاویز 4 ۔ اس موضع کے متعلق اسی موضوع پر شاہجہاں کے فرمان کے لیے ملاحظہ ہو ایضاً، دستاویز 6 ۔

[2] چنانچہ تعلقہ کا لفظ کہیں جاگیرداروں کے، کہیں زمینداروں کے اور کہیں خود مختار حکمرانوں کے علاقوں کے استعمال کیا گیا ہے۔ ہماری نگاہ سے اکثر اس قسم کی تحریریں بھی گذری ہیں "موضع الف، جاگیر ب کا تعلقہ (متعلقہ مشمولہ) (ملاحظہ ہو، مثلاً انشائے روشن کلام) اس کے بعد تعلقہ کے کسی جاگیردار کو دی گئی زمین کے مفہوم کے لیے (اخبارات (اے) 49.) کسی زمینداری کے زیر تصرف زمین کے مفہوم میں اس کے استعمال کی مثال کے لیے ملاحظہ ہو 15 of Aurangzeb's Reign کسی زمیندار کے زیر تصرف آخر میں مآثر عالمگیری ص 206 میں بھی "بدبخت" سنبھاجی کے تعلقہ یا مملکت کا اندراج ملتا ہے

میں دو مختلف بیانات پائے جاتے ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ صرف مالگزاری کا ایک ٹھیکہ دار ہوتا تھا۔[1] دوسرے یہ کہ وہ ایک چھوٹا زمیندار ہوتا تھا۔[2] ولسن کی فرہنگ میں مندرج وضاحت سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں بیانات بیک وقت کیونکر درست ہوسکتے تھے۔ حکام، عموماً یہ انتظام اس غرض سے کرتے تھے کہ وہ زیادہ لوگوں سے معاملہ کرنے کی زحمت سے محفوظ رہیں۔[3] چنانچہ تعلقہ دار اس پورے علاقہ کا جس کی وہ مالگزاری ادا کرتا، لازمی طور پر زمیندار نہ ہوا کرتا، بلکہ وہ صرف ایک جزو کا زمیندار اور بقیہ کا محض ایک درمیانی شخص ہوتا تھا۔ لہٰذا کسی علاقہ کا تعلق دار ہونا وہاں کے زمیندار ہونے سے کمتر درجہ کی چیز تھی، کیونکہ زمیندار کا حق وہاں کے ایک حصہ ہی پر نہیں بلکہ کل پر حاوی ہوتا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ وہاں کی مالگزاری کی وصولی و ادائیگی کا بھی ذمہ دار رہا کرتا۔ اس سے تعلقہ دار کی صرف اٹھارہویں صدی کی تعریف ہی کی نہیں کہ وہ ایک چھوٹا زمیندار ہوتا ہے بلکہ فتحیہ عبریہ کی اس عبارت کی بھی وضاحت ہوتی ہے جس میں ارکان کے تخت کے دعویداروں کے متعلق جنہوں نے شائستہ خاں کے چٹگاؤں کی مہم میں مغلوں کا ساتھ دیا تھا یہ بتایا گیا ہے کہ ان کو امید تھی کہ انہیں کم از کم اس کا کچھ عوض ملے گا۔ "اگر وہ راجہ نہیں ہوسکتے تو زمیندار ہوجائیں اور اگر زمیندار بھی نہیں تو پھر تعلقہ دار ہی صحیح"۔[4] بہرحال، یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ تعلقہ دار زمیندار کی محض ایک خاص قسم ہوا کرتی اور معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر مواقع پر ان دونوں اصطلاحوں میں سے کسی ایک کے بھی استعمال سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ چنانچہ، اودھ میں مالگزاری کی دو تحریروں میں جہاں شخص الیہ کے لیے تعلقہ دار کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، وہاں زمیندار کے لفظ سے بھی کام نکالا جا سکتا تھا، کیونکہ حقیقتاً وہ تشخیص شدہ مواضعات کا مالک یا زمیندار ہوتا تھا۔[5] اسی طرح انگریزی کمپنی کے دیہی کل کتا وغیرہ کی خریداری کی توثیق کے سلسلہ میں صوبہ کے

---

[1] Add 504 ,19، ورق 100 الف۔

[2] دستور العمل خالصہ شریفہ، اوراق 9 ب 19 الف۔

[3] ایڈ 603، اوراق 54 ب۔ 55 الف۔ ملاحظہ ہو رسالہ زراعت، ورق 9 الف بھی

[4] فتحیہ عبریہ، اوراق 155 ب 156 الف۔

[5] الہ آباد، 97 8 اور 1206 (ملاحظہ ہو فصل ہذا کا فٹ نوٹ 4) 897 میں جس شخص پر مالگزاری فی الواقعی تشخیص کی گئی ہے اسے مالک و تعلقہ دار کہا گیا ہے۔

دیوان کے پروانہ میں فروخت کنندگان کو زمینداران اور انگریزوں کو ان کے خرید کردہ علاقہ کا "مستقل تعلقہ دار" کہا گیا ہے[1]

حالانکہ ہم نے ابھی زمیندار (یا تعلقہ دار) کو جب وہ اپنی زمینداری کی مالگزاری کو ادا کرنے کا پابند ہوتا تھا مشخص الیہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن اس کے متعلق سرکاری نقطہ نگاہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ ایک درمیانی شخص کی حیثیت سے کسانوں سے صرف مالگزاری وصول کرنے کی خدمت انجام دیتا ہے۔ راسکداس کے نام عالمگیر کے فرمان (دفعہ ۱۱) میں تنہا زمینداروں کے حوالہ سے بتایا گیا ہے کہ گاؤں کے حسابات کے جانچ کنندہ کے فرائض میں ہے کہ وہ معلوم کریں کہ "مالگزاری کے تشخیص کنندہ اور محصل (امین و عامل) اور زمیندار وغیرہ" نے کسانوں سے کس قدر وصول کیا ہے۔ زمینداران اور حکام مال کا ایک زمرہ میں رکھا جانا ایک خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکام کسانوں سے زمینداروں کی تحصیل مالگزاری پر اسی قدر قابو رکھتے تھے جس قدر خود اپنے ملازمین کی وصولی پر۔ لہٰذا یہ قدرتی بات تھی کہ انتظامی ضابطوں میں زمینداروں کے کسانوں کے ساتھ سلوک کی نوعیت کے متعلق عمومی ہدایات ہوں۔[2] چنانچہ

---

[1] Add. 24039، ورق 36 الف۔ مورلینڈ باوجودیکہ اس مجموعہ کے ورق 39 الف کے بیعنامہ کا حوالہ دیتا ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس پروانہ اور نیز اس کی پشت پر مندرج تصدیقی عبارت پر دھیان نہیں دیا۔ اس کا خیال تھا کہ کمپنی کے حقوق کے لیے تعلقہ داری کی اصطلاح صرف فرخ سیر کے 1717ء کے فرمان میں استعمال کی گئی ہے۔ اس وجہ سے اس نے یہ غلط نتیجہ نکالا کہ "پس اس وقت کلکتہ میں زمینداری سے فری حق سمجھا جاتا تھا جو دہلی میں تعلقہ داری سے Agrarian System 191-2) ان دستاویزات میں ان دونوں اصطلاحوں کے لیے استعمال سے Add. 6603، ورق 55 الف میں تعلقہ دار کے ماتحت حیثیت کی تعریف کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس کا مفہوم وہ زمیندار ہو سکتا تھا جس کے حقوق نہ تو قدیم ہوں اور نہ شاہی عطیہ (حضوری) کے عطا کردہ بلکہ محض خرید کردہ ہوں۔ چنانچہ کل کتا وغیرہ کے فروخت کنندگان تو زمیندار تھے لیکن انگریز صرف تعلقہ دار ہی ہو سکتے تھے۔

[2] ملاحظہ ہوں، مذکورہ بالا دونوں فرمان۔ بنگال میں انگریزوں کی کل کتا وغیرہ کی خریداری کے متعلق دیوان کا پروانہ Add. 24039، ورق 36 الف اور حکام مال کے قول و قرار، اور بالآباد، 897، 1206، 1223 بھی ان قول و قرار میں زمیندار کو مختصراً ہدایت کی گئی ہے کہ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

زمیندار کی حیثیت ایک محصول ادا کرنے والے کے مقابلہ میں بطور ایک سرکاری اہلکار اور محصول کے وصول کنندہ کے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ پس وہ قطعہ فرمان جن کے ذریعہ حقوق زمینداری عطا کیے گئے تھے یا ان کی توثیق ہوئی تھی، اس حق کو ایک خدمت یا ملازمت کے عہدہ سے تعبیر کرتے ہیں[1] یہ بات صرف اصطلاحات یا کاغذی ہدایات ہی تک محدود نہ تھی۔ زمیندار کو مالگذاری کی وصولی و ادائیگی کی خدمات کے عوض میں ایک رقم جسے نانکار کہتے تھے ادا کی جاتی تھی۔ یہ رقم یا تو اس کی ادا کردہ مالگذاری سے منہا کر دی جاتی یا اس کے لیے بغیر مالگذاری کے زمین چھوڑی جاتی تھی[2] نانکار کی معیاری شرح، مطالبۂ مالگذاری کی ۱۰ فیصدی ہوتی[3] حالانکہ بعد کی ایک تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ بعض صوبوں میں یہ اس سے کم یعنی 5 فیصدی تھی[4]

حکام کی خدمت کی ایک شکل میں، زمینداری کا یہ تخیل اپنے لازمی خصائص کے اعتبار سے

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

(سے تشخیص شدہ مالگذاری ادا کرنا چاہیے۔ اس کے بعد یہ ہدایت ہے کہ" اسے اپنے پسندیدہ طور طریقوں سے کسانوں کو مطمئن رکھنا چاہیے اور زراعت کی ترقی اور کسانوں کی خوشحالی (یا اضافہ تعداد) کے لیے برابر کوشاں رہنا چاہیے۔

[1] (بہار کی سرکار مونگیر کے بعض پٹوں کی زمینداری اور چودھرائی کے متعلق ملاحظہ ہو جہانگیر کا اپنے عہد حکومت کے تیرھویں برس جاری کیا ہوا فرمان مطبوعہ IHRC 18 ، ص 188 ، شاہ عالم ثانی کے ایک فرمان میں بھی جو اس کے عہد حکومت کے پندرھویں برس جاری ہوا تھا اور جس کے لیے صوبۂ آگرہ کی سرکار کول میں ایک پرگنہ کی زمینداری کی راجہ سالیبان کے ورثاء کے نام تصدیق کی گئی ہے، خدمت زمینداری (بلاشک صرف لفظ خدمت بطور مترادف زمینداری) کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اس فرمان کے فوٹو نواب صاحب چھتاری کے پاس موجود ہے۔ یہ یقیناً آخری دور کا ایک دستاویز ہے لیکن سترھویں صدی کے اس نوعیت کے دیگر دستاویزات کی جو شکل ہوا کرتی تھی اسے غالباً اس میں برقرار رکھا گیا ہے۔

[2] Add. 6603 ، اوراق 65 الف، 79 ب، 82 ب۔

[3] بیکس ورق 52 ب میں ایک زمیندار، ایک حاکم مال کو مخاطب کرتے ہوئے صاف طور پر کہتا ہے کہ "اگر تعلقہ کی جمع (مالگذاری) پچھلے دس سال کے گوشوارہ (موازنہ دہ سالہ) کے مطابق تشخیص کی جائے اور اس کا دسواں حصہ بطور نانکار وضع کر دیا جائے" تو وہ حاکم کی مناسب خدمت کے لیے تیار ہے۔

[4] Add. 19504 ، ورق 100 الف۔

اسے چودھری کے عہدہ کے بہت قریب پہونچا دیتا تھا۔ چودھری جو عموماً خود بھی زمیندار ہوا کرتا ہوتی لگان کے نظام میں ایک اہم حیثیت کا مالک تھا اور خرمات کے معاوضہ میں اسے جو رقم ملتی تھی اسے بھی 'نانکار' ہی کہتے تھے[1] چونکہ زمینداری کے ساتھ لگان کی وصولی کے مفہوم کا تصور بھی منسلک تھا لہٰذا مغلیہ تحریروں میں اس کے بعض اوقات چودھرائی کے ساتھ جوڑ پر ہمیں تعجب نہ کرنا چاہیئے[2]

لہٰذا مذکورہ شہادتوں سے یہ بات بطور ایک مسلمہ اصول کے سامنے آتی ہے کہ مالگذاری زمین کسان پر ایک براہِ راست محصول تھا اور یہ کہ زمیندار کے اسے خزانۂ شاہی میں داخل کرنے کی صورت میں بھی کسان ہی اس کا اصل مشخص الیہ ہوا کرتا تھا۔ ممکن ہے کہ اکبر اور اورنگ زیب کے معیاری مالی ضابطوں میں زمیندار کا تذکرہ نہ کیے جانے کا ایک یہ سبب ہو۔ بلا لحاظ اس امر کے کہ کوئی موضع زمینداری ہے یا رعیتی کسی ایک علاقہ میں مطالبۂ مالگذاری کی مقدار اور طریقۂ تشخیص ایک ہی ہو سکتا تھا۔ حقیقتاً اٹھارہویں صدی میں حکام کے اس اختیار کا کہ وہ زمینداری کی زمین کو سیر کی زمین میں جب چاہے تبدیل کر دیں، یعنی زمیندار کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے کسانوں پر براہ راست مالگذاری کی تشخیص اور وصولی عائد کریں یہی مفہوم تھا، گو کہ حکام کو آخر الذکر صورت میں زمیندار کی ملکیت کے حصہ یعنی 'مالکانہ' کے لیے گنجائش رکھنی ہوتی تھی[3] سترھویں صدی میں بھی دو ایسی واضح مثالیں سامنے آتی ہیں جن میں زمینداری کی زمین پر مطالبۂ مالگذاری کی مقدار اور طریقۂ تشخیص وہی رکھا گیا جو رعیتی زمینوں کے لیے تھا۔ دورِ شاہجہانی کے ایک ضوابط نامہ میں مندرج ایک نمونۂ حسابات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہی موضع میں واقع زمینداروں کی خود کاشتہ زمینوں اور نیز رعیتی زمینوں پر مالگذاری کی تشخیص بیک وقت بہ طرز کنکوت کی گئی تھی[4] دورِ عالمگیری کے سرکاری دستاویزات کے ایک مجموعہ میں ہمیں ایک حکم ملتا ہے جس میں ایک زمیندار کی طرف سے زیادہ مالگذاری تشخیص کئے جانے کی شکایت پر ہدایت کی گئی ہے کہ اس کے موضع کی

---

[1] باب ۷ کی فصل ۲ میں اس حاکم کے فرائض اور خصوصیات پر قدرے تفصیل سے بحث آئے گی۔

[2] زبانِ جہانگیری، I H R C ‏18، ص 188، الہ آباد 1192 (1669ء)

[3] لیلین کی فرہنگ Add ‏6603، اوراق 61 ب، 66 الف۔ ب۔ لیلین کی دہلی اور بنگال دونوں صوبوں کے نظم ونسق مال کا تجربہ تھا۔ سیر کے لیے باب ایک کا فٹ نوٹ 35۔ ملاحظہ ہو۔

[4] دستور العمل نویسندگی ورق۔ 183۔ الف۔

مالگذاری بہ طرزِ غلہ بٹائی وصول کی جائے جس میں حکومت کا حصہ پیداوار کا نصف ہوگا جو عہدِ عالمگیری کی انتہائی تو نہیں مگر معیاری شرح تھی[1] اودھ کے دو دستاویزات اودھ کے دو دستاویزات سے جن میں کسی زمیندار پر تشخیص شدہ مالگذاری درج کی گئی ہے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہر فصل میں مطالبۂ مالگذاری پر نظرِ ثانی کی جاتی تھی جس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ ہر فصل کے دوران تمام زمینوں کے لیے معینہ شاہی ضابطہ کے مانند نئی تشخیص ہوتی تھی[2]

تاہم، یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی صورت بھی ہوا کرتی جن میں ایک بار کی معین کی ہوئی تشخیص کچھ دنوں تک قائم رہتی۔ پھر اودھ کے ایک دوسرے قریبی علاقہ کے دو دستاویزات میں مالگذاری بالمقطع یعنی متعدد مواضعات کے ہاتھوں، پر ایک ہم رقمیں دوامًا مقرر کی گئی ہے[3] لیکن اس انتظام کو ایک ہی جاگیردار کے کارندوں کی منظوری حاصل تھی اور ممکن ہے دوسرے جاگیرداروں کے کارندوں نے اس طریقہ کو قبول یا جاری نہ رکھا ہو۔

بنگال کا نظام بیشک مختلف تھا اور یہاں زمیندار حکومت کی مقرر کردہ رقم کو ایک طویل اور غیر معین مدت تک ادا کرتا رہتا تھا۔ اس طریقہ کی سند آئینِ اکبری کے بھی فراہم ہوتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ بنگال کی جمع "کلیتہً نقدی" ہوتی تھی[4] چونکہ نقد کے معنی روپیہ پیسہ کے نہیں، لہٰذا تنہا اس فقرہ کا یہ مفہوم سمجھا جا سکتا ہے کہ بنگال میں مالگذاری روپیہ پیسہ میں وصول ہوتی تھی[5] لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بہار اور الہ آباد کے ضبطی کے پرگنوں کی جمع اور نقدی

---

[1] نگارنامۂ منشی اوراق 126 الف۔ ب، Bodl. ورق 98 الف۔ مطبوعہ 98، دورِ عالمگیری میں پیداوار کا نصف بطور شرح مالگذاری کے ملاحظہ ہو باب 6 کی فصل 1۔

[2] الہ آباد، 1206، 897 (1677ء و 1685ء) ہر فصل کے تحت 'اصل' کا ایک عدد اور پچھلے سال کی اسی فصل کے متعلق تشخیص اس کے بعد اضافہ یا کمی جیسی بھی صورت ہو اور سب سے آخر میں میزان جواب واجب الادا ہوئی درج ہے۔

[3] الہ آباد 1220۔ 1223 (1687ء) دو مسلسل برسوں کے اعداد کسی بھی موضع میں کوئی تبدیلی نہیں ظاہر کرتے مقطعی کے لیے ملاحظہ ہو باب۔ 6۔ کی فصل 4۔

[4] آئین اکبری۔ 1، 393

[5] "دوآنزر دھولوں" کے گوشوارہ میں اعداد جمع کے خانہ کے عنوان کے طور پر ابوالفضل کے استعمال کیے ہوئے لفظ 'نقدی' کے معنی 'نقد' میں درج کیا گیا ہے:

میں تفریق برتی گئی ہے تو مذکورہ تعبیر غلط ہو جاتی ہے[1] نظام ضبط میں نقد مالگذاری کا عائد کیا جانا ضروری تھا اور اس کے باوجود بھی اگر یہ نقدی سے مختلف کوئی چیز تصور کی جاتی تھی تو اس کے یہ مطلب ہوئے کہ نقدی کا مفہوم محض نقد ادائیگی سے کچھ مختلف تھا۔ اس کے مفہوم کے بارے میں آئین اکبری کے اعداد و شمار میں ان مقامات کو دیکھ کر جہاں 'جمع' کے اعداد کے قبل لفظ 'نقدی' یا 'از قرار نقدی' (جیسا کہ نقد میں طے ہوا۔) درج ہے کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے[2] ان تمام محالوں کے بارے میں جن کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں پیمائش شدہ رقبہ کے اعداد و شمار نہیں ملتے[3] اس کے علاوہ گجرات کی سرکار سورتھ (کاٹھیاوار) کو نقدی کہا گیا ہے[4] آئین اکبری و نیز و

---

[1] آئین اکبری۔ ا، ص 417۔424 ۔ سرکار الہ باس (الہ آباد) کے متعلق بلاکمین کی عبارت بیحد گمراہ کن ہے۔ مخطوطات کے اندراج "ضبطی پر مشتمل 9 محال۔ 4 383838 208 دام اور نقدی 6 محال' 1993615 کے بجائے بلاکمین کا یہ اندراج "9 محال 33374 208 $\frac{1}{2}$ دام اور نقدی پر مشتمل۔"

[2] بلاکمین کی عبارت کے پڑھنے والوں کو یہاں بھی دھوکہ ہو سکتا ہے۔ بلاکمین کے لیے خانوں کے حذف کر دینے کے باعث 'نقدی' کے لیے جو جمع کے خانے کے عنوان کے طور پر استعمال کی گئی ہے کوئی جگہ نہیں رہ جاتی۔ اس نے اسے بعض سرکاروں اور پرگنوں کے جمع کے اعداد کے ادھر ادھر رکھ دیا ہے، جبکہ اصل میں یہ امتیاز نہیں ملتا۔ لہٰذا جب تک مخطوطات کو نہ دیکھا جائے ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ نقدی کی اصطلاح جو جمع کے اعداد کی تخصیص کرتی ہے بلاکمین کی اس غلطی کا نتیجہ ہے یا اسے ابوالفضل نے ہی ایسا لکھا ہے۔ Dr. Seran. 'Provincial Govt., & c ص 315 نے 'نقدی' اور 'از قرار نقدی' میں امتیاز قائم کرنے کو پسند کیا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ جہاں 'نقدی' کو صوبہ بہار کے جمع کے ایک جزو کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ وہاں 'از قرار نقدی' کو اسی صوبہ کی سرکاری بہار کی جمع کے لیے استعمال کیا گیا ہے (آئین اکبری۔ ص 417-18)

[3] محال یہ ہیں: اجے گڈھ سرکار کالنجر (الہ آباد) کھنڈیلا، سرکار نارنول (آگرہ) اودے پور، اسلام پور (موہن) سانور گھاٹی سیمبل مع آراضی مزروعہ۔ منڈل گڈھ اور مدریہ سرکار چتوڑ میں اور انکھورہ اور ڈیلانا سرکار رنتھمبور (اجمیر) میں سیونی سرکار ہنڈیہ میں اور اونرمل اور گگرہ مع شہر، سرکار گگرون (مالوہ) میں اور بندر سولا سرکار احمد آباد (گجرات) بلاکمین سرکار نرنول سنگھنا، اودے پور اور سرکار احمد آباد میں تھمنا کے آگے بھی 'از قرار نقدی' درج کرتا ہے۔ حالانکہ اس کی تائید نہ تو Add. 7652 سے ہوتی ہے اور نہ Add. 6552 سے۔

[4] آئین اکبری۔ ا، ص 493،

مرآۃ احمدی سے ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ اس سرکار کے بیشتر علاقے باجگذار سرداروں کے تھے۔ یہ بات کہ راجپوت سرداروں کے وطن صوبۂ اجمیر کے صرف چند محالوں کو صراحتاً 'نقدی' کہا گیا ہے، بادی النظر میں 'نقدی' اور خراج کے درمیان کسی باہمی ربط کے متناقض معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقتاً بڑے راجپوت سردار خراج نہ ادا کرتے تھے بلکہ انہوں نے جاگیرداروں کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور وہ اپنے موروثی علاقوں پر بحیثیت اپنے وطن کے قابض تھے اور ان کی مالگذاری پر ان کا تصرف تھا۔ صوبۂ اجمیر کے نقدی محال 'نمایاں' وہ چند علاقے تھے جن کے سردار بطور جاگیرداروں کے شاہی ملازمت میں شامل نہ ہوئے تھے، بلکہ نقد خراج ادا کیا کرتے۔ چنانچہ نقدی کا مفہوم جو اس طور پر منضبط کیا گیا[1] اگر اس کا اطلاق بنگال پر کیا جائے تو ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ وہاں زمینداروں سے مالگذاری ایک مقررہ زر نقدی کی شکل میں مثل خراج کے نہ کہ زمین یا اس کی پیداوار پر بطور ایک ایسے محصول کے وصول کی جاتی تھی جو گھٹتی بڑھتی ہو۔

دورِ عالمگیری کے دو تحریروں سے بنگال میں مالگذاری کے مذکورہ طریقہ کے رائج ہونے کی سند فراہم ہوتی ہے۔ ان میں سے پہلے میں جو ایک حسب الحکم ہے درج ہے کہ میر جملہ نے زمین کی مالگذاری ادا کرنے کی صلاحیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ زمینداروں کے کسی قصور کی سزا کے طور پر دو پرگنوں کی ایک زمینداری کے شریک داروں کی جمع میں من مانی طور پر اضافہ کر دیا تھا۔ مزید برآں یہ بڑھائی ہوئی جمع کسی مخصوص برس کے لیے نہیں، بلکہ واضح طور پر مستقلاً تھی۔[2] دوسرا دیوان کا 1703ء کا ایک پروانہ ہے جس میں انگریز کمپنی کے نام دیہی کل کتا اور دو دیگر مواضعات کی فروختگی کی تصدیق کی گئی ہے۔ اس میں ان مواضعات پر واجب الادا مالگذاری کو جمع کی ایک مقررہ رقم کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ اس رقم کی کمپنی کے وکیل کی طرف سے ضمانت کی عبارت میں جو پروانہ کی پشت پر نقل ہے حصہ کشی کر کے ہر موضع کی مالگذاری کو الگ الگ معین کیا گیا ہے۔[3] اودھ کے اسی نوعیت کے مالگذاری کے دستاویزات میں مندرج تفصیلات کے برخلاف، بنگال میں جمع کسی ایک مخصوص برس کے لیے

---

[1] مورلینڈ اور یوسف علی JRAS 1918ء صفحہ 33 میں اس رقم کی تعبیر کا تفصیلی تذکرہ نہیں ہے۔
[2] دُرالعلوم، اوراق 47 الف 48 الف۔ جمع کو پورا کرنے کے لیے انھیں کشتیاں فراہم کرنا ہوتا تھا جن کی تعداد 20 سے بڑھا کر 29 کر دی گئی تھی۔
[3] Add 24039، ورق 36 الف-ب۔

درج نہیں ہے، بلکہ انگریزی کاغذات سے پتہ چلتا ہے کہ سال بہ سال ایک ہی رقم ادا کی جاتی رہی ہے[1] یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ کمپنی کے نام جاری کیے ہوئے ایک نشان میں مالگزاری (حاصل) کو جمع طوماری کے مطابق ادا کرنے کی ہدایت کی گئی ہے[2] بنگال میں 'جمع' کو اس نام سے پکارتے تھے جس کی بنیاد پر جاگیریں منظور کی جاتی تھیں[3] لہٰذا ہمیں قیاس کرنا چاہیے کہ وہاں زمینداروں سے مالگزاری کی وصولی نیز جاگیروں کے عطیہ کے لیے اعداد کے ایک ہی سلسلہ کو استعمال میں لایا جاتا تھا[4] چونکہ اس کے یہ مطلب ہوئے کہ 'حاصل' یعنی اس مالگزاری میں جو فی الواقعی جاگیردار وصول کیا کرتا، کوئی تبدیلی نہ ہوتی تھی' اس لیے اس صوبہ میں 'جمع دامی' (جس کی بنیاد پر جاگیریں منظور کی جاتی تھیں) کو مثل دوسرے صوبوں کے تبدیل کرکے 'حاصل' کے مطابق یا تقریباً مساوی کرنے کا رجحان نہ پایا جاتا ہوگا۔ غالباً بنگال میں سترھویں صدی کے دوران 'جمع دامی' کے اعداد میں کسی تبدیلی کے رونما نہ ہونے کا یہی خاص سبب تھا[5]

یہ امر قابل توجہ ہے کہ تنہا اورنگ زیب کی وفات کے قبل کے ماخذ سے بنگال کے نظام مالگزاری کا جو نقشہ مرتب کیا گیا ہے اس کی تصدیق اٹھارہویں صدی کے نظام مالگزاری کی جملہ تحریروں سے ہوتی ہے[6] شہادت کی اس یکسانیت پر اس لیے اور بھی زور دینے کی ضرورت

---

[1] (ان مواضعات کی) لگان سرکاری رجسٹروں کے مطابق 1194 سو روپیہ ۱۴۔ اور قدرے زائد ہے جو سالانہ خزانہ میں جمع کی جاتی ہے۔ C.R. Wilsons 'Early Annals of the Btth) (2) Agrarian System صفحہ 60 جس کا حوالہ صفحہ 122 نوٹ میں آیا ہے، دیوان کے پروانہ نیز کمپنی کے وکیل کی ضمانت میں بھی یہی رقم بطور 'جمع' درج ہے۔

[2] Add .24039، اوراق 36 ب 37 الف۔

[3] Add 6586، ورق 22 ب۔

[4] اس امر سے بھی کہ 'حاصل' 'جمع' سے مختلف ہے کے اعداد و شمار، بنگال و اڑیسہ کو چھوڑ کر مملکت مغلیہ کے دیگر تمام صوبوں کے متعلق ملتے ہیں، یہ بات ظاہر ہوتی ہے (ملاحظہ ہو ضمیمہ د)

[5] ضمیمہ د میں اعداد کا جدول ملاحظہ ہو۔ عہد عالمگیری کے اختتامی زمانہ میں بنگال کا مجموعی 'جمع دامی' آئین اکبری میں مندرجہ '' 681 726 427 سے بڑھ کر صرف 240 636 524 ہو گیا تھا۔

[6] دو یا تین مفصل حوالوں سے یہ واضح ہو سکتا ہے ... Add. 6586، ورق 22 ب سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جمع طوماری کے مطابق، زمینداران ابھی تک اپنی سندیں (دستاویزات منظوری)، (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ہے کہ بعد کی (ملل کی) تحریروں کی تاریخی صحت کو جو ابتدائی انگریز حکمرانوں کی واقفیت کے لیے
مرتب کی گئی تھی، مجروح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے[1] مالگذاری زمین کے ایک استمراری خواہ

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)
اور جاگیرداران بھی اپنی تنخواہ کی منظوری اسی کی بنیاد پر پایا کرتے۔ اس میں یہ بھی درج ہے کہ 'جمع طوماری' زمین کی ادا کرنے کی صلاحیت سے بہت کم ہوتا تھا اس لیے ملک (ہمارے نسخہ میں ایسا ہی لکھا ہے، حالانکہ اس کے بجائے اگر زمیندار ہوتا تو غالباً زیادہ بہتر تھا) زیادہ خوشحال ہوا۔ تقریباً 1750ء کی ایک تصنیف 'نسخہ رسالہ زراعت' ورق 2 ب کی تحریر کے مطابق: 'جمع طوماری' کو دور اکبری میں ٹوڈرمل نے رائج کیا تھا اور واقعی تشخیص کے ذریعہ اس پر کبھی نظرثانی نہ ہوئی تھی اور باوجودیکہ اشخاص (زمینداران) حکام کو مالگذاری 'جمع طوماری' کے مطابق ادا کرتے تھے، لیکن وہ اپنی زمینداری (جائداد) سے اپنی آمدنی اور سرکاری مالگذاری (حاصل) کی وصولی واقعی تشخیص ہی کی بنیاد پر کرتے تھے۔ زمین پر واقعتہً جو رقم تشخیص کی جاتی اسے 'جمع تشخیص' کہتے تھے۔ مذکورہ تصنیف میں یہ بھی آیا ہے کہ عموماً 'جمع تشخیص'، 'جمع طوماری' سے کئی گنا زیادہ ہوتی تھی اور بنگال میں شاید ہی کوئی جگہ ایسی رہی ہو جہاں یہ آخرالذکر سے کم تھی۔ برطانوی حکومت کے قبل کی مدت کے بارے میں گورنر جنرل اور اس کی کونسل کے ایما پر رائے رایان اور قانون گوؤں کی تیاری کی ہوئی ایک رپورٹ (25 جنوری 1775ء) میں بھی صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ زمینداران، ٹوڈرمل کی 'جمع طوماری' کے مطابق لگان (مالگذاری) ادا کرتے تھے (Add. 6592، ورق 77 الف Add. 6586، ورق 53 الف) شور (Shore) کی جون 1789ء مشہور یادداشت خصوصاً پیرا 379 و 380 بھی ملاحظہ ہوں۔

غلام حسین نے اپنی مشہور تاریخ بنگال 'ریاض السلاطین' میں جو 1787-8ء میں مکمل ہوئی ذکر کیا ہے کہ اورنگ زیب کے آخری زمانہ میں مرشد قلی خاں نائب صوبیدار نے اپنے عہدہ کے زمانہ میں پرانے نظام کو ختم کر کے یا بہرحال اسے از سر نو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے زمینداروں کی جبری وصولیوں پر قابو کیا اور ان کے لیے صرف 'نانکار' کی گنجائش رکھی۔ اس نے بذریعہ پیمائش مالگذاری کی تشخیص اور کسانوں سے وصولی کے براہِ راست انتظامات کیے۔ ان کاموں کے لیے، اس نے خود اپنی مالگذاری کے محصل (عامل) اور ان کے ماتحت شقدار اور امین مقرر کیے (ببلیوتھیکا انڈیکا ایڈیشن ص 252) ہماری بعد کی شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرشد قلی خاں کے انتظامات کو صرف ایک حد میں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس تذکرہ کی زیادہ اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس کے ذریعہ مرشد قلی خاں کے قبل کے مروجہ نظام کے منشا کو سمجھا جا سکتا ہے۔

[1] مورلینڈ کو یہ شبہ تھا کہ یہ شہادتیں انگریزوں کے گمراہ کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

طویل المیعاد بندوبست کے سلسلہ میں انگریزوں کا اس قدر محکم تخیل کوئی بالکل باہری چیز نہیں بلکہ کم از کم جزوی طور پر بنگال کے حالات کا نتیجہ تھا۔ واقعۃً نئی بات یہ تھی کہ انہوں نے اس بندوبست کو بنگال کے باہر ایسے علاقوں میں رائج کیا جہاں لوگ اسے پہلے سے نہ جانتے تھے۔ ان علاقوں میں اس نے ایک ایسے بڑے آلہ کی حیثیت اختیار کی جس نے بیک وقت لیڈروں اور ساہو کاروں کو انگریز راج کے پکے وفادار یعنی موجودہ دور کے زمیندار طبقہ میں ڈھالا۔

پہلے گذر چکا ہے کہ ہمارے عہد میں حق زمینداری کو نجی جائداد کی ایک شے تصور کیا جاتا تھا۔ حکومت مغلیہ جس طریقہ پر زمینداروں کے باہمی تنازعات سے نپٹتی اس سے واضح طور پر ایسا ظاہر ہوتا تھا۔ ہمارے دستاویزات مظہر ہیں کہ قبضۂ زمینداری کے نزاعات کو عدالتی ذرائع سے بذریعہ قاضی یا اس کے تعاون سے فیصل کیا جاتا تھا۔ جب قبضہ کا اس طور پر فیصلہ ہو جاتا یا اس کے متعلق کوئی دوسرا عدالتی تنازعہ نہ ہوتا تو فوجدار یا علاقہ کا فوجی حاکم اسے نافذ کرتا۔[1] زمینداری کے متعلق قبضہ کی شکایات براہِ راست عدالت میں پیش کی جا سکتی تھیں جہاں سے مقامی افسران کے نام مناسب کارروائی کرنے کے لیے معمولاً احکام موسومہ حسب الحکم، جاری کیے جاتے تھے۔[2]

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ص 325 Akbar to Aurangzeb اور وہ اپنی تصنیف 52 - 51 و ص 1926 JRAS (
میں کہتا ہے کہ مغلیہ شماریات میں بنگال کے جمع کے اعداد کو بھی اسی مقصد کے تحت غلط دکھایا گیا ہے۔ بیشک ابی چند نے دھوکہ بازی میں کلائیو کو بھی مات کر دیا۔

[1] زمینداری کے متعلق ایک نزاع کے براہ راست قاضی کے روبرو پیش کیے جانے کی مثال کے لیے ملاحظہ ہو، الہ آباد 421۔ ایک نزاع جس کی سماعت فوجدار اور قاضی دونوں نے ایک ساتھ کی، لیکن فیصلہ تنہا قاضی نے دیا، الہ آباد 359۔ زمینداری پر غاصبانہ قبضہ کی ایک شکایت کو جس میں حق کا سوال تھا، امین و فوجدار نے فیصلہ کے لیے قاضی و متولی (مدد معاش کی زمینوں کے متولی) کے سپرد کیا (الہ آباد 375) فوجدار کسی مقدمہ کو اپنے اختیارات کے تحت فیصل کرنے کی صورت میں، قاضی کے سابقہ فیصلوں سے رہنمائی حاصل کرتا تھا (الہ آباد 370 و 1201) جائز حقدار کو زمیندار کا حق واپس دلائے جانے کے سلسلہ میں، ملاحظہ ہو الہ آباد 1202، 1203، 1225۔ اس نوٹ میں جن دستاویزات کا حوالہ آیا ہے وہ تقریباً سب عہد عالمگیری کے ہیں۔

[2] اس قسم کے ایک حسب الحکم کا اصل، الہ آباد 1214 میں محفوظ ہے۔ ملاحظہ ہو نیز در العلوم، اوراق 43 الف 44 الف 49 الف۔ ب 52 ب۔ 53 ب، 56 ب۔ 57 الف، 61 ب 62 الف۔

غالباً، عام طور پر حق زمینداری کے متعلق، معاملات اسی نہج پر فیصل ہوا کرتے، گویا کہ اس کی حیثیت بطور ایک نجی جائداد کے مسلّم تھی لیکن اس حق کے دو ایسے اہم پہلو تھے جن کی بناء پر حکومت اسے ایک دوسرے زاویہ سے دیکھنے پر آمادہ ہوئی۔ جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے کہ، چونکہ زمیندار سے مالگذاری کی وصولی اور اسے جمع کرنے کی توقع کی جاتی تھی لہٰذا اس کے حق کو سرکاری دستاویزات کی رسمی عبارتوں میں ایک خدمت یا ملازمت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اگر وہ اس خدمت کو بطریق مناسب انجام نہ دیتا اور مالگذاری ادا کرنے سے قاصر رہتا تو اسے برطرف کرکے اس کی جگہ کوئی دوسرا مقرر کر دیا جاتا۔ دوسرے یہ کہ زمینداروں کے پاس عموماً مسلح ملازمین ہوا کرتے تھے۔ لہٰذا، اگر ایک طرف وہ خود علم بغاوت بلند کر سکتے تھے تو ساتھ ساتھ بغاوت فرد کرنے میں معاون بھی ہو سکتے تھے۔ لہٰذا ایک غدار زمیندار قدرتی طور پر اپنے جملہ حقوق سے محروم کر دیا جاتا اور حکومت اس کی جگہ وفادار شخص کو لانے کی کوشش کرتی۔

مذکورہ مداخلت کی ضرورت کے تحت، یہ اصول مسلّم ہو گیا تھا کہ شاہی حکومت اپنی مرضی کے مطابق اس حق کو جس سے چھین لے اور جسے چاہے دیدے۔ ایک مشہور مثل مشہور تھی کہ دن کا حاکم پانچ سو برس کے زمیندار کو ایک لمحہ میں برطرف کرکے اس کی جگہ ایک ایسا آدمی لا سکتا تھا جس کے پاس تمام عمر کوئی زمین نہ رہی ہو۔[1] بعد کی ایک تصنیف میں اسی اصول کو قدرے کم سخت الفاظ میں اسطور پر دہرایا گیا ہے کہ کسی شخص کے قصوروار ہونے کی صورت میں صرف بادشاہ اس کی زمینداری کو دوسرے کے نام منتقل کر سکتا تھا، صوبہ دار یا کوئی اور افسر (صوبا و حاکم) ایسا کرنے کا مجاز نہ تھا۔[2] سترھویں صدی کی ہماری شہادتیں بھی اس کی تائید کرتی ہیں، کیونکہ ان میں آیا ہے کہ زمینداریوں میں جملہ تبدیلیاں حقیقتاً شاہی احکام ہی کے تحت عمل میں آتی تھیں۔ مقامی حکام کے اختیارات دربارِ شاہی میں صرف سفارشات (تجویز) بھیجنے تک محدود رہا کرتے۔[3]

عطیہ زمینداری کے بابت سب سے قدیم حکم جو اس وقت تک موجود ہے، عہد جہانگیری

---

[1] بیکس ورق 151 الف۔

[2] Add. 6603 ورق 65 الف۔

[3] ملاحظہ ہو وقائع اجمیر 396-8، اخبارات $\frac{38}{137}$ وغیرہ، نگارنامۂ منشی، ورق 199 الف ب، Bodl. اوراق 157 ب 158 الف، مطبوعہ 152، انشائے روشن کلام، اوراق 3 ب، 4 الف وغیرہ

کا ہے[1] اس کے علاوہ اس موضوع پر تمام تر مواد، دورِ عالمگیری سے جس کے دوران، زمینداروں کے متعدد تبادلے، معزولیاں اور تقرریاں عمل میں آئیں متعلق ہے۔ پرانے زمینداروں کی معزولی کے عام اسباب جس حد تک تحریروں میں درج ہیں، مالگذاری کی عدم ادائگی اور باغیانہ طرزِ عمل تھے۔ یہ دونوں صورتیں، معمولاً یکجا رہا کرتیں۔[2] زمینداری کے مالگزاری کرنے کی صورت میں اس کی معزولی کا کوئی سوال نہ پیدا ہوتا تھا۔[3] اس کے برعکس جو لوگ زمیندار مقرر کیے جاتے وہ مالگذاری ادا کرنے اور بغاوت کو فرو کرنے کے ذمہ دار ٹھہرائے جاتے تھے۔ ایک انتظامی ضوابط نامہ میں نئے زمینداروں کے لیے یہ ضابطے اس طور پر قلم بند کیے گئے ہیں۔ ایک منصب (یا عہدہ مع عہدۂ سوار جس کے نتیجہ میں فوجی ذمہ داری عائد ہوتی ہے) عطا کردہ حق سے متوقع آمدنی کے بالمقابل دیا جاسکتا تھا اور زمیندار اپنے حدودِ زمینداری میں باغیانہ کاروائیوں کی روک تھام کا ذمہ دار ہوا کرتا۔[4] متھرا کے قریب ایک زمینداری کے پانے والے کے معینہ فرائض میں "بدمعاشوں اور باغیوں کے اخراج کو ایک خاص مقام حاصل تھا"[5] اسی طور پر دیگر تحریریں حصولِ زمینداری کے لیے ایک الوس (مسلح ملازم پیشوں کی جماعت) پر قبضہ کو لازم قرار دیتی ہیں۔[6] چنانچہ ہمیں کسی پرگنہ کی فوجداری (فوجی کمان) اور زمینداری کے فرائض کو ایک شخصِ واحد کے سپرد کیے جانے پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔[7] ساتھ ساتھ، ان تقرریوں

---

[1] فرمان جہانگیری I H R C 18، 42، 19ء، ص 188-9 اس کے ذریعہ بہار کی سرکار مونگیر کے ایک پرگنہ کے چند پٹیوں کی زمینداری اور چودھرائی عطا کی گئی۔

[2] وقائع اجمیر، 365 - 396، 8، انشائے روشن کلام، اوراق 7 ب۔ 8 الف، بیکس، اوراق 50 الف۔ 53 الف

[3] انشائے روشن کلام، ورق 20 ب

[4] فریزر (Fraser) 86، ورق 62 الف۔ ب موازنہ بہ انشائے روشن کلام، ورق 3 ب جس میں منظوریٔ زمینداری کے کسی امیدوار کے لیے ایک منصب کے عطیہ کی سفارش "زمینداری کی شرط" کے ساتھ کی گئی ہے اور اخبارات $\frac{44}{142}$ بھی۔

[5] نگارنامہ منشی، ورق 199 ب، بوڈلی، ورق 158 الف، مطبوعہ 152۔

[6] انشائے روشن کلام، اوراق 3 ب 4 الف، کلمات طیبات، اوراق 127 ب۔ 128 الف۔

[7] وقائع اجمیر، 218-19 ایک افسر موسومہ مان سنگھ "فوجداری اور زمینداری" دونوں سے بیک وقت محروم کر دیا گیا تھا

کے حصول کے لیے روپیہ پیسہ بھی خرچ کیا جاتا تھا۔ امیدواروں کو اپنی مرضی کی زمینداری حاصل کرنے کے لیے عموماً دربار شاہی میں ایک زر کثیر بطور پیش کش ادا کرنے کا وعدہ کرنا ہوتا تھا[1]
ہماری بعض تحریروں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شاہی عطیات ہمیشہ موروثی اور کم از کم بعض صورتوں میں حین حیاتی بھی نہ ہوا کرتے[2] کیونکہ ان تحریروں میں ان زمینداریوں کی تبدیلی (تغیرا) کے حوالوں کے طرز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ گویا یہ جاگیر ہیں[3]

ہماری سترھویں صدی کی شہادتوں سے جن کا ابھی ذکر آیا ہے ظاہر ہوتا ہے کہ عطیہ زمینداری پر قابض شخص کی حیثیت معمولاً شاہی انتظامیہ کے ایک اہلکار کی تھی۔ برخلاف اگلی صدی کے جب غالباً صورت حال یہ ہو گئی کہ وہ اپنے زور بازو سے قبضہ حاصل کرنے کے بعد دربار شاہی سے اسے منظور کرا لیا کرتا تھا۔ گو کہ زمینداروں کی معزولی اور تقرری کے سلسلہ میں شاہی اختیارات معمولاً استعمال نہ کیے جاتے تھے لیکن زمینداروں کو دباؤ میں رکھنے کا یہ ایک اہم آلہ تھا۔ اس اختیار نے زمیندار طبقہ میں جا بجا حکومت کے وفادار پیدا کر دیتے تھے کیونکہ یہ محض سرکاری احکام کے بل پر بیدخل کیے ہوئے اشخاص کے عرصہ تک دعویدار رہنے کے باوجود ان کی زمینوں پر قابض رہا کرتے تھے بعض اوقات بظاہر ایسے ہی لوگ عطیہ داران منتخب کیے جاتے تاکہ بعض علاقوں کی زمینداری کی ذات کی اجارہ داری ختم ہو جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بیس راجپوتوں کے علاقہ کے بیچ میں

---

[1] اخبارات 38/137 (صوبہ دہلی کے پرگنہ برن کی زمینداری)، 44/142 (جہانگیر آباد، اودھ) انشائے روشن کلام، ورق 9 الف۔

[2] جیسا کہ برن بھی زمینداری کو اس کے سابق قابض کے مرنے پر کسی دوسرے عہدہ دار کو دیئے جانے سے ظاہر ہوتا ہے، اخبارات 38/137 لیکن سرکار سنبھل کے ایک زمیندار کی وفات پر جس کے پاس ایک منصب تھا اس کی زمینداری اس کے دو لڑکوں کو دی گئی اور زمینداری کی مناسبت سے جو منصب اس کے پاس تھا اس کے دو لڑکوں میں بحصہ مساوی تقسیم کیا گیا۔ ملاحظہ ہو اخبارات 48/148۔ جہانگیر کے عطیہ زمینداری اور چودھرائی کی عبارت (IHRC 1942، صفحہ 188-9) کے فقرہ 'بہ فرزندان' (معہ لڑکوں کے) کے ذریعہ معافیداران کے لڑکوں کی وراثت کے لیے واضح گنجائش رکھی گئی ہے۔ غالباً اگر کبھی عطیہ کا موروثی ہونا مقصود ہوتا تو شاہی حکم میں اس کی صراحت ضرور ہوا کرتی۔

[3] وقائع اجمیر 219۔ اخبارات 38/283، 44/142، 48/106 آثر عالمگیری 514۔

مقامی مسلمانوں کو بڑی بڑی زمینداریاں دی گئی تھیں[1] یا ایک راجپوت قبیلہ کو اس واضح ہدایت کے ساتھ زمینداری دی گئی کہ وہ مشتبہ وفاداری کے زمینداروں کو بے دخل کرے[2] اس کا امکان پایا جاتا ہے کہ عہد زیر بحث کے دوران زمینداریوں کے عطیات، ان مختلف ذاتوں کے مقبوضات زمینداری کی حد بندیوں میں جو آئین اکبری کی تحریر کے وقت سے چلی آ رہی تھی تبدیلی کا سبب بنا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عہد عالمگیری میں جو تبدیلیاں عمل میں آئیں وہ بیشتر مسلمانوں کے مخصوص طبقوں کے حق میں رہی ہوں کیونکہ اس عہد میں مقرر کیے گئے زمینداروں میں جن کے نام ہماری تحریروں میں درج ہیں ایک کثیر تعداد مسلمانوں کی ہے۔ ممکن ہے اس کا تعلق اورنگ زیب کی فرقہ دارانہ امتیاز کی عام پالیسی سے ہو۔ لیکن اس موضوع پر جو شہادتیں موجود ہیں وہ ایسی نہیں کہ ان کی بنیاد پر اس سلسلہ میں کوئی قطعی فیصلہ کیا جا سکے۔

فصل ۴ خودمختار سرداران

باب ہذا میں، ابھی تک ہم نے اپنی بحث کو حکومت کے براہ راست زیر انتظام علاقوں کے زمینداروں تک محدود رکھا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ کسی شخص کو زمیندار اس وقت کہا جاتا جب وہ کسان نہ ہو اور زمین پر ایک خصوصی حق کا مالک ہو۔ یہ حق مقامی طور پر تو مختلف ناموں سے مگر ہماری تحریروں میں باضابطہ طور پر حق مالکانہ کے نام سے موسوم تھا۔ یہ حق اگرچہ حقیقت میں مالکانہ نہ ہوتا، مگر اس کی تین نمایاں خصوصیات تھیں۔ یہ کسان کے حق سے بالاتر ہوا کرتا۔ اس کا قیام اس وقت کی شاہی طاقت سے بے نیاز تھا اور اس حق کا مفہوم زمین کی پیداوار میں ایک حصہ کا ہوتا جو سرکاری مطالبہ مالگذاری سے بالکل مختلف، گوکہ یہ اکثر اس کے ساتھ ساتھ بھی عائد کیا جا سکتا تھا۔ علاوہ اس کے، اس حق کا جوڑ معمولاً فوجی طاقت پر قبضہ سے رہا کرتا جو اس حق کے قیام اور نفاذ کے لیے ایک آلہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ شاہی علاقوں میں زمیندار، انتظامیہ کا کلیۃً ماتحت ہوا کرتا جس کی یہ مسلسل کوشش رہا کرتی کہ وہ ان کی حیثیت کو محصولوں کے محض ایک وصول کرنے والے میں تبدیل کر دے۔ لیکن اس کے بعض پہلو ایسے بھی تھے جو زمیندار اور اس سے

---

[1] انشائے روشن کلام، اوراق 3 ب۔ 4 الف، 6 الف

[2] وقائع اجمیر 364۔5۔

زیادہ بااختیار اشخاص یعنی سرداروں، چھوٹے بادشاہوں اور راجاؤں، راناؤں، راؤوں اور راوتوں کے ناموں سے پکارے جانیوالے میں مشترک تھے[1] مثل ان کے یہ بھی ایک علاقہ کا مالک ہوا کرتا جسے یہ اپنا کہہ سکتا تھا۔ ان کی طرح یہ بھی شاہی حکومت کا ساختہ نہ ہوتا اور انکی طرح اس کے پاس بھی اپنے مقبوضات کے تحفظ کے لیے لڑنے والے ہوا کرتے تھے۔ بعض اوقات ان دونوں کے درمیان صحیح تفریق کرنا دشوار ہوتا ہیں ایسے لوگ جو اپنے کو راجہ کہتے، کسی موضوع میں اپنے حق کو عام زمینداروں کی طرح فروخت کرتے ہوئے ملیں گے[2] اور دکن میں دیشمکھ (شمالی ہندوستان کے چودھری کا مرادف) ترقی کرکے سردار بن سکتا تھا[3] جبکہ ایک ماتحت سردار گھٹ کر دیشمکھ ہو سکتا تھا[4] ایک ایسے شاہی دفتر کے لیے جو مملکت کے تمام حکمرانوں کی حیثیت کو کم کرکے دکھانے کا خواہش مند ہو، انہیں ہم حیثیت قرار دینے کے لیے کافی مشابہت پائی جاتی تھی اور ایک بڑی بادشاہت کا مالک اور کسی موضوع کے ایک حصّہ پر قبضہ کا دعویدار دونوں زمیندار یا بومی ہی کے نام سے پکارے جاتے تھے[5]

---

[1] کسی سردار کے اطاعت قبول کر لینے پر مغل بادشاہ عموماً ان روایتی خطابات کو مستقل کردیتے تھے لیکن یہ خطابات ایسے اشخاص کو بھی عطا کیے جاتے جو سردار نہ ہوا کرتے، مثلاً عہد اکبری میں ٹوڈر مل اور بیربل۔

[2] الہ آباد، 1227 (مورخہ 12 دسمبر 1695ء) فروخت کنندہ اپنے کو ''راجہ بھرتن سنگھ ولد راجہ چھتا سنگھ، زمیندار موضع نہکہ'' بتاتا ہے۔ موضع فروخت شدہ، نہسکہ کے علاوہ اور کوئی تھا۔ یہ دونوں مواضعات اودھ کی سرکار بہرائچ میں واقع تھے۔

[3] آئین اکبری۔ ا صـ 477 میں، تلنگانہ میں واقع اندر کے سردار چناتیری دیشمکھ کو برار کے سرداروں میں بتایا گیا ہے۔ اس کے ورثاء کی جو سب چناتیری دیشمکھ ہی کے نام سے موسوم کیے گئے ہیں، مالی ذمہ داریاں اورنگ زیب کی نیابت دکن کے زمانے کے ایک مکتوب کا موضوع ہے (ادب عالمگیری، اوراق 161ب 162ب)

[4] اوداجی رام سردار ماہور کے ورثاء کے ساتھ ایسا ہی ہوا (ماثر الامرا۔ ا صـ 42 - 5)

[5] خود اختیار سرداروں کے لیے، زمیندار اور بومی کے اصطلاحوں کے استعمال کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو آئین اکبری۔ ا۔ ص 477 - 82، 486، 492، اکبرنامہ 3 صـ 533 عالمگیر نامہ صـ 677 وغیرہ۔ سرداروں کے لیے، زمیندار کی اصطلاح دہلی سلطنت میں بھی مستعمل تھی۔ ملاحظہ ہو برنی 'تاریخ فیروز شاہی' Bib.Ind ایڈیشن، صـ 326، 539 شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی' بب انڈ صـ 170 (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

بعض اوقات سرداروں اور معمولی زمینداروں دونوں کے لیے ایک ہی اصطلاح، خصوصاً جبکہ وہ اپنے عمومی مفہوم میں استعمال ہو ایک الجھن کا سبب بن سکتی ہے لیکن اس میں ایک بڑی خوبی بھی ہے۔ اس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ حکومت مغلیہ کے نقطۂ نظر سے پورے حدود مملکت میں شخصی حکومتوں کا ایک مقامی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ حکومتیں کہیں جزوی طور پر خود اختیار اور کہیں اچھی خاصی محکوم اور ان کی نمائندگی کہیں سردار اور کہیں معمولی زمیندار کیا کرتے تھے۔ بہت سی صورتوں میں ان دونوں زمروں کو ایک ہی طبقہ تصور کیا جا سکتا تھا۔

لیکن پھر بھی ان دونوں کے فرق کو فراموش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ فرق صرف فوجی طاقت اور علاقہ کے مقابلہ میں سرداروں کی معمولی زمینداروں پر برتری تک محدود نہ تھا۔ روایتاً دونوں کی وراثت کے اصول بھی مختلف تھے[1] مگر ان کے درمیان نمایاں ترین فرق اس رشتہ میں تھا جو ان کے اور شاہی اقتدار کے درمیان پایا جاتا تھا جس کے رو سے سردار خود مختار تصور کیے جاتے جبکہ زمیندار کی حیثیت بادشاہ کے محض ایک ایسے رعایا کی ہوتی جو صاحب جائداد ہو۔

حکومت مغلیہ اور ان سرداروں کے تعلقات کی نوعیت کسی طور پر بھی ایک طرح کی نہ ہوا کرتی، مثلاً بعض بڑے راجپوت سردار شاہی ملازمت میں داخل ہو کر مناصب اور عہدوں سے سرفراز ہوئے تھے۔ ان کے موروثی علاقوں کو ایک مخصوص نوعیت کی جاگیر تصور کیا جاتا جو

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)

مغلیہ شاہی دفاتر، ہندوستان کے کسی حکمران کے لیے اونچے خصوصاً شاہی القاب استعمال کرنے میں ہمیشہ بخالت سے کام لیتے تھے۔ ابوالفضل نے ہمعصر ہندوستان حکمرانوں کے لیے کبھی بھی بادشاہ کا لفظ نہیں استعمال کیا، بلکہ انہیں عموماً 'مرزبان' یا 'علاقوں کا سردار' کہا ہے۔ مثل یہ امرا، عادل شاہ کو عادل خان، اور قطب شاہ کو "قطب الملک" کہتے تھے اور دور عالمگیری کے بعد سے انہیں 'دنیا دار' (دنیا کے لوگ) کہا جانے لگا تھا۔ اس اصطلاح کے زمیندار (زمین بہ معنی بسی ہوئی دنیا) کے مرادف ہونے کے علاوہ، اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ جن لوگوں کو ایسا کہا جاتا تھا وہ دنیا دار ہونے کے سبب سے حقیقتاً مذہبی عقائد میں پختہ نہ تھے۔

[1] جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ معمولی زمینداریوں میں ترکہ بیٹوں میں بحصہ مساوی تقسیم ہوتا تھا اور سرداروں میں وراثت بیٹوں میں سے صرف کسی ایک کو ملتی تھی۔ ہماری اطلاع ہے کہ راجپوتوں میں وراثت عموماً سب سے بڑے بیٹے کو لیکن راٹھوروں میں اس ماں کے بیٹے کو ملتی تھی جو باپ کی سب سے زیادہ منظور نظر ہو (لاہوری (2) ص 98)

ناقابل انتقال اور موروثی ہوا کرتی تھی اور سرکاری اصطلاح میں اسے وطن کہتے تھے۔ دستور یہ تھا کہ کسی علاقہ کی مجموعی مالگذاری کی سرسری طور پر عددی تشخیص کر دی جائے اور پھر اسکے حکمران کو وہ عہدہ عطا کیا جائے جس کی معینہ تنخواہ اس عدد کے مساوی ہو[1] ان میں بعض سے اور تقریبًا دیگر تمام (شاہی ملازمت کے باہر کے) سرداروں سے عمومًا ایک معینہ سالانہ رقم بطور خراج یا 'پیش کس' طلب کی جاتی تھی جسے اطاعت کی علامت اور اصل تصور کرتے تھے[2]۔ بہت سے سرداروں کے علاقوں پر مختلف رقمیں بطور جمع تشخیص کی جاتی تھیں اور یہ ان اشخاص کو سالانہ واجب الادا ہوتیں جنہیں یہ علاقے بطور جاگیر دیے ہوں گے (یا علاقہ کے خالصہ ہونے کی صورت میں شاہی خزانہ کو)[3] لہٰذا یہ رقم پیش کش سے جو صرف شاہی خزانہ میں جمع ہوتی تھی مختلف ہوا کرتی اور

---

[1] راجہ اندر سنگھ کی طرف سے اورنگ زیب کے نام عرضداشت میں اسی اصول کا حوالہ ملتا ہے۔ "وطن کے مالکوں کی وفات پر (ان کے ورثا کو) ان کے وطن کی تشخیص شدہ مالگذاری (رد آ جائے) کے مطابق منصب عطا کیے جاتے ہیں۔" خود اس کے وطن کی جمع اس کی تنخواہ سے بقدر 40 لاکھ روپیہ زائد ہو گئی تھی۔ اس کے استدعا ہے کہ یا تو اضافہ کے لحاظ سے اس کا عہدہ بڑھا یا جائے یا پھر اس عدد کو گھٹا دیا جائے (تاکہ اس کا کوئی جزو کسی دوسرے کو جاگیر میں نہ دیا جا سکے) چنانچہ اس کے منصب میں اضافہ کر دیا گیا ہے Documents of Aurangzeb s Reign بقول مورلینڈ مندرجہ Agririan System 267 اس اصول کی پوری وضاحت لاہوری۔ 2 صـ 360-61 کی اس عبارت میں ملتی ہے جس میں بہار میں پلاموکے زمیندار مسمی پرتاپ کی اطاعت قبول کرنے اور شاہی ملازمت اختیار کرنے کا ذکر آیا ہے۔ وطن کی اصطلاح کے استعمال کی مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو تزک جہانگیری '192' ، 336 ، لاہوری ا صـ 161 (ا ج 2) صـ 951 ادب عالمگیری ورق 65 الف رقعات عالمگیری صـ 8-167 Documents of Aurangzeb s Reign) 121 - 84

[2] ملاحظہ ہو مثلاً اکبرنامہ۔ 3 صـ 533 (کمایوں) لاہوری 2۔ صـ 560 (پلامو) ادب عالمگیری ورق 179 الف، رقعات عالمگیری صـ (دیوگڑھ) معموری ورق 179، 1 الف، خافی خاں۔ 2 صـ 377 دلکشا ورق 139 ب، مراۃ۔ ا صـ 25 وغیرہ۔

[3] اندر کے حکمران چنائیری دیشکھ پر تشخیص شدہ جمع کی تفصیل حالات کے لیے جیسا کہ مختلف برسوں میں جاگیرداروں اور خالصہ کو ادا کی گئی (ادب عالمگیری، اوراق 161 ب 162۔ ب) اعظم گڈھ کے راجاؤں کے متعلق انیسویں صدی کی ایک دلچسپ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ہمارے علم میں یہ کبھی بھی بطور جاگیر نہ دی جاتی تھی۔ یہ ضرور ممکن تھا کہ ایک ہی سردار پر جمع اور اس کے علاوہ پیش کش، دونوں رقمیں عائد کی جائیں [1]

شاہی حکومت، ان سرداروں سے فوجی خدمت یا یہ رقم حاصل کرنے کے بعد انہیں اپنے اندرونی معاملات کے انتظام میں آزاد چھوڑ دیتی تھی، شاذ تحریروں سے کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان سرداروں کی رعایا نے شاہی دربار میں کبھی کوئی شکایت پہونچائی ہو۔ وہ خود اپنی مقررہ شرحوں کے مطابق اپنے علاقوں سے گذرنے والی تجارت پر محصول عائد کرنے کے معاملہ میں بالکل آزاد ہوا کرتے تھے [2] ان کے نظام مال کے قاعدے شاہی ضابطوں کے پابند نہ تھے۔ چند مذکورہ ذیل مستثنیات کو چھوڑ کر آئین اکبری میں سرداروں کے علاقوں کی مالگذاری کی شرحیں یا آراضی پیمودہ کے اعداد و شمار قلم بند نہیں کیے گئے ہیں۔ البتہ اس موضوع پر ہمارے دو ماخذ زیادہ مثبت شہادتیں فراہم کرتے ہیں۔ ان میں کوچ بہار کے معزول شدہ حکمران کی موافقت میں ایک عوامی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ عموماً زمینداروں کے مالگذاری وصول کرنے کے طریقے بمقابلہ شاہی حکومت کے زیادہ لچکدار تھے [3]

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

راجہ ہربنس سنگھ کو بذریعہ فرمان پرگنہ نظام آباد و ٹپہ دولت آباد کی زمینداری بلغ ساٹھ ہزار روپیہ کی مقررہ جمع پر عطا کی۔ چونکہ یہ جاگیر خانخاناں (عبدالرحیم) کی تھی لہٰذا اس نے اس رقم کو پہلے تو اسی کو ادا کیا مگر اس کے بعد وہ اور اس کے ورثاء کوس رقم کو اس شخص کو ادا کرتے رہے جسے اس کی جاگیر ملی (Edinbergh 138 ورق کے نمبرات درج نہیں ہیں)

[1] سنہ 18 جلوس اکبری میں راجہ نگرکوٹ کے ساتھ یہ شرائط طے ہوتے: "دوئم یہ کہ وہ ایک معقول رقم بطور پیش کش ادا کرے گا۔ چہارم، چونکہ یہ علاقہ راجہ بیربر کی جاگیر ہے' لہٰذا وہ ایک بڑی رقم کے لیے اسے جوابدہ ہوگا... (اکبرنامہ 3۔ 36 - 37) جب اس پر عائد شدہ جمع میں کافی اضافہ ہوگیا تو اندر کے چنانیری نے خواہش کی کہ اسے اس اضافہ کو جمع کے ایک جزو پر نہیں بلکہ علیحدہ سے بطور پیش کش ادا کرنے کی اجازت دی جائے (ادب عالمگیری حوالہ سابقہ)

[2] ملاحظہ ہو Factories 1624 -29 ، ص 176 ، بگلانہ کے لیے، منڈی 5 ہنڈیہ (مالوہ) کے لیے ایضاً 260 - Factories 1646-50 ، ص 193 صوبہ اجمیر کے لیے اور فیکٹریز 1637-41 ، ص 138 جیسلمیر کے لیے۔

[3] فتیحۂ عبریہ، اوراق 47 ب۔ 48 الف، کلکتہ ایڈیشن، 1265 ھ ص 80 عالمگیر نامہ ص 781-2

بعض راجپوت ریاستیں بظاہر مغلیہ نظم ونسق کے عمومی ڈھانچہ سے بیحد متاثر تھیں، مثلاً ریاست جودھپور میں ایک قسم کی جاگیرداری کا نظام رائج تھا۔ راجہ ہر پرگنہ کے چند مواضعات کو سرکاری خزانہ کے لیے محفوظ رکھ کر بقیہ کو بذریعہ پٹہ جات جو بمنزلہ جاگیر ہوتے تھے اپنے افسران کو تنخواہ کے طور پر دیدیا کرتا۔[1] ٹوڈ کے بیان کئے ہوئے حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قسم کا نظام میواڑ میں بھی رائج تھا۔[2] آئین اکبری سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض راجپوت ریاستوں، مثلاً ان پر اور جودھپور میں تشخیص مالگذاری کے نظام ضبط کو جو شاہی علاقوں میں رائج تھا نقل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔[3] لیکن ریاستوں میں مغلیہ نظام کی نقل خود اپنی مرضی سے کی جاتی تھی اور وہ نقل بھی کبھی پوری سو فیصدی نہ ہوا کرتی مثلاً جودھپور میں قانون گو جو نظام جاگیرداری کے اہم رکن ہوا کرتے نہ رکھے جاتے تھے[4] اور نہ ہی یہاں نظم ضبط، نافذ تھا اور باوجودیکہ مالگذاری کی نقد شرحیں مقرر تھیں، لیکن زمین کی پیمائش کا کوئی انتظام نہ تھا اور آئین اکبری میں اس علاقہ کے رقبہ کے شماریات نہیں ملتے۔[5] بہرحال، مذکورہ ریاستیں، مستثنیات میں تھیں اور عمومی طور پر سرداران کے ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوئی سند نہیں ملتی۔

آئین اکبری میں مختلف صوبوں کے بیان کے تحت اکثر بڑے زمینداروں اور بومیوں کے تحتی علاقوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور دیگر ذرایع سے اخذ کی ہوئی اطلاعات سے اس میں

---

[1] وقائع اجمیر ص 14، 83 میں راجہ جسونت سنگھ کی طرف سے جاگیروں اور پٹوں کے دیے جانے کے حوالے ملتے ہیں موازنہ بہ نیز میراۃ احمدی۔ ا ص 325، 1690 - 91ء میں مغلوں کے مارواڑ پر تسلط کے ایک دور میں شجاعت خاں نے "ان کے مورثوں کی قدیم روایات کے مطابق بیشتر راجپوتوں اور پٹاوتوں کو جاگیر کے بجائے پٹے" عطا کرنا قرین مصلحت تصور کیا۔

[2] The Annals & Antiqnities of Rajasthan ا ص 133 و فٹ نوٹ

[3] آئین اکبری میں ان پر اور جودھپور دونوں کے دستور یا نظام ضبط کے تحت نقد مالگذاری کی شرحیں درج ہیں۔ لیکن اعداد و شمار کے گوشوارہ میں اجمیر کی آراضیات پیمودہ کے اعداد تو دیئے گئے ہیں لیکن جودھپور کے نہیں۔

[4] وقائع اجمیر 163، 171

[5] ملاحظہ ہو فٹ نوٹ - 15۔

اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ خود[1] آئین اکبری کے شماریات سے ہم مختلف محالوں میں ایسے سرداروں کے وجود کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ چنانچہ جہاں مالگذاری پورے پورے اعداد میں درج ہے، وہاں جمع کے کسانوں پر نہیں، بلکہ کسی درمیانی شخص پر تشخیص کیے جانے کے قوی امکانات پائے جاتے ہیں[2]۔ اس کے علاوہ جہاں رقبۂ پیمودہ اور 'سیورغال' کے اعداد نہ دیئے گئے ہوں، وہاں یہ امر تقریباً یقینی ہو جاتا ہے کہ محال متعلقہ کسی باجگذار سردار کے علاقہ میں واقع تھا۔

ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہم اس نہج پر اپنے مطالعہ کے نتائج کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ پیش کر سکیں لیکن، ان میں جو زیادہ اہم ہیں وہ ذیل میں درج ہیں۔ لاہور سے بہار تک کے ضبطی صوبوں کی وسیع پٹی میں ان کے بیرونی حدود کو چھوڑ کر، ان سرداروں کی موجودگی کا پتہ نہیں چلتا: جموں تا کمایوں، ہمالیہ پہاڑوں[3] پر اور اس کے دامن میں اور پھر مزید مشرق کی طرف ترائی میں کہیں کہیں چھوٹی حکومتوں کا ایک سلسلہ پایا جاتا تھا[4]۔ صوبۂ ملتان میں دریائے چناب کے مغرب میں بلوچی سردار تھے[5]۔ میدانوں کے جنوبی سرے پر ہریانہ کا جزوی

---

[1] Agrarian System، 268-9۔

[2] یاد رہے کہ متعدد ایسے محالوں کی جمع جنہیں واضح طور پر سرداروں کی حکومت کے تحت بتایا گیا ہے، پوری پوری رقموں میں نہیں دکھائی گئی ہے۔ ممکن ہے تھوڑے بہت فرق کو واضح کرنے کی غرض سے ایسا کیا گیا ہو، مگر ہمیں اس کی کوئی اطلاع نہیں۔

[3] ملاحظہ ہو، اکبرنامہ۔ 3۔ ص 533، 588۔ آئین اکبری میں سرکار کمایوں کو صوبۂ دہلی میں دکھایا گیا ہے اور اس کے صرف جمع کے اعداد دیئے گئے ہیں جو سب کے سب پوری رقموں میں اور صریحی طور پر برائے نام ہیں۔ موازنہ ہو نیز Manucci 2 ص 438

[4] سرکار سنبھل اور محالات کانت اور گولا اپنے طاقتور اور سرکش زمینداروں کے لیے خاص طور پر مشہور تھے (عباس خان، اوراق 107 ب 108 الف، صادق خان، Or. 174 ورق 183 ب، Or. 167، ورق 90 الف)۔ آئین اکبری میں اس علاقہ کی مکمل اعداد و شمار دیئے گئے ہیں اور ممکن ہے کہ مقامی زمینداروں کو حکام مغلیہ بطور اپنے ماتحت سرداروں کے نہ تسلیم کرتے ہوں۔ سرکار گورکھپور کے چند محال بظاہر باجگذار سرداروں کے قبضہ میں معلوم ہوتے ہیں۔

[5] سوجان رائے، 63، Manucci 2 ص 426

راجپوت سرداروں کے زیرنگیں تھا۔ اسی طور پر صوبجات آگرہ، الہ آباد اور بہار کے وہ جنوبی حصے جو وندھیاچل پہاڑ کے سلسلوں کے محاذ میں تھے شاہی حکومت کی حدود کے باہر تھے[1] لہٰذا عمومی طور پر مستثنیات کا لحاظ رکھتے ہوئے[2] ہم پلسارٹ اور منوچی کی ہمنوائی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ خاص ہندوستان میں راجہ اور بڑے زمینداروں کے زیرنگیں خطے معمولاً صرف پہاڑوں اور جنگلوں کے عقب میں[3] واقع تھے۔

آئین اکبری میں بنگال کے اعداد و شمار اس شکل میں مندرج نہیں ہیں جس سے معمولی زمینداروں اور واقعی سرداروں یا باجگذار حکمرانوں کے محالوں کے درمیان تفریق ممکن ہو سکے لیکن ہمارے علم میں ہے کہ اس صوبہ کے بڑے بڑے ٹکڑے چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے تسلط

---

[1] آئین اکبری میں اوڑیسہ کی بندیلہ سلطنت کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ بتھ گھورا، حقیقتاً اپنی جگہ پر خود ایک باشاہت تھی۔ (موازنہ ہو 4-123 Saran, Provincial Govt.& c) روہتاس اور بہار کی سرکاروں کے متعدد محالوں کے اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے میدان کے جنوب میں تمام علاقے سرداروں کی حکمرانی میں تھے (موازنہ ہو بیمیں، کوبے، اے ایس بی میں ز 54' Beams in JASB ، ز 85 18) خود روہتاس کے لیے 167 Mundy اور پلامو کے لیے لاہوری سے $\frac{360}{}$ – 61 ملاحظہ ہو $\frac{181\ \ 169}{}$ مونگیر میں جو تنگ ساحل پہاڑیوں سے شروع ہو کر کوہ ہمالیہ کے دامن تک پھیلی ہوئی تھی سرسری طور پر تشخیص کیے گئے محالوں کی کثرت تھی۔

[2] ممکن ہے کہ کسی محال کے رقبہ اور سیورغال دونوں ہی کے اعداد دیے گئے ہوں اور پھر بھی اس کا ایک جز کسی ایسے چھوٹے راجہ کے جو ایک مقررہ رقم ادا کرتا ہو، زیرحکومت ہو ایک روایت کی رو سے جس کا پہلے حوالہ آ چکا ہے اور جس کی صداقت پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ راجہ ہربنس کو 40,000 روپیہ کی جمع پرگنہ نظام آباد اور پٹہ دولت آباد (سرکار جونپور میں) عطا کیا گیا تھا (Edinburgh 238) وہ ایک گوتمی فصل کا راجپوت تھا اور آئین اکبری میں نظام آباد کے زمینداری کے خانہ میں گوتم نسل کے راجپوتوں کا اندراج ملتا ہے لیکن اس میں ساتھ ساتھ رحمت الٰہی نام کے لوگوں ("رحمت الٰہی") اور برہمنوں کو بھی بطور زمیندار دکھایا گیا ہے اور داموں کو روپیوں میں تحویل کر کے) محال کی جمع 515 و 50' و ا روپیہ سے کم نہیں آتی۔ لہٰذا ہربنس کے زیرحکومت محال کا صرف ایک مختصر ہی جز در رہا ہوگا۔

[3] Pelseart 98 59، Manuccie 2 444

ین رہے ہوں گے[1] شمال میں کوچ بہار[2] اور مشرق میں کامروپ اور آسام واقع تھا۔[3] ڈیلٹا کے اندر دو چھوٹی عملداریاں[4] اور آگے کی طرف جنوب مشرق میں قزاقوں سے بھری ہوئی اراکان کی بادشاہت تھی۔[5] آئین اکبری میں مندرج محالوں کی فہرست سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اڑیسہ میں شاہی حکومت صرف ایک تنگ ساحلی پٹی اور مہاندی کے ڈیلٹا تک محدود تھی۔[6]

صوبۂ اجمیر کے متعدد محال، شاہی حکمرانی میں تھے لیکن اس کے بیشتر حصہ پر مشہور راجپوت راجاؤں کی فرمانروائی تھی۔[7] مالوہ میں سرکار مندسور اور گجرات (کاٹھیاوار) میں سرکار سورٹھ مسلم باجگذار ریاستوں پر مشتمل تھا۔ صوبہ گجرات میں شاہی علاقہ چاروں طرف ریاستوں کی ایک

---

[1] موازنہ بہ، رے چودھری، بنگال انڈر اکبر اینڈ جہانگیر (Bengal under Akbar and Jahangir)

[2] آئین اکبری۔ ا۔ ص 387 اسے 1661ء میں مملکت میں شامل کیا گیا۔

[3] ایضاً۔ میر جملہ کے حملے کے نتیجہ میں کامروپ بھی فتح ہوا۔

[4] ایضاً Fitch Reley Early Travels 118، 27 - 28۔

[5] آئین اکبری۔ ا۔ ص 388 فارسی تحریروں میں اراکان کا نام رخنگ آتا ہے۔ چاٹگاؤں (چٹگانگ) اس کا خاص بندرگاہ تھا۔ آئین اکبری کے شماریات میں سرکار چاٹگاؤں کو اس طور پر دکھایا گیا ہے کہ یہ باضابطہ شاہی انتظام کے تحت تھا۔ نتیجۂ مرید ورق 164 الف کی ایک عبارت سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ اس میں تحریر ہے کہ بنگال کے سلطانوں نے اس علاقہ کو ایک بار اپنے زیرنگیں کر لیا تھا اور اس کے بعد سے اس کی مالگذاری کے اعداد فہرست قانون گوئی میں درج کیے جانے لگے۔ اس کے محالوں نے اس علاقہ کو ایک بار اپنے زیرنگیں کر لیا تھا اور اس کے بعد سے اس کی مالگذاری کے اعداد فہرست قانون گوئی میں درج کیے جانے لگے۔ اس کے محالوں کو اصطلاحاً پائی باقی غیر عملی یعنے، مالگذاری نہ ادا کرنے والا علاقہ جو کسی کی جاگیر نہ ہو کہا جاتا تھا۔ شائستہ خان نے آخری بار 1666ء میں چٹگانوں فتح کیا۔

[6] آئین اکبری میں سرکار کلنگ ڈانڈ پٹ اور راج مہندرا کے محال وار اعداد شمار نہیں ملتے اور غالباً یہ صرف کاغذی اعتبار سے مملکت کا حصہ تصور کیے جاتے۔ دیگر تین سرکاروں یعنی جلیسر، بھدرک اور کٹک میں بیشتر کے جمع کے اعداد پوری رقموں میں درج ہیں اور ان میں قلعوں کے مسلسل حوالے ملتے ہیں۔ موازنہ بہ Manusci، ص 427 اور نیز ملاحظہ ہو، Saran, 'Provincial Govt. & c. ص 152 - 3

[7] موازنہ بہ سرن، حوالہ سابقہ ص 126 - 147،

پٹی سے گھرا ہوا تھا جس کا سلسلہ جنوب میں ریاست بگلانہ پر پہونچ کر ختم ہوتا تھا۔[1]

آخر میں وسطی ہندوستان، میں گڈھ سے ریاستوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو کر جس کا مرکز جبلپور کے قریب واقع تھا نیچے کی طرف تلنگانہ میں اندر تک پھیلا ہوا تھا۔[2] دورِ شاہجہانی کے متعلق موجود تحریروں سے[3] مغربی برار اور صوبجات خاندیش اور اورنگ آباد میں کسی بڑی یا اہم باجگزار ریاست کی موجودگی کا پتہ نہیں چلتا۔

مذکورہ بالا خاکہ سے واضح ہوگا کہ ہر چند کہ ملک کے سب سے زیادہ زرخیز اور گنجان علاقے عموماً شاہی انتظامیہ ہی کے تحت تھے لیکن سرداروں اور باجگزار حکمرانوں کے زیرنگیں علاقہ کا رقبہ بھی کسی طور پر ناقابل لحاظ تھا۔ جغرافیائی رکاوٹیں، مثلاً پہاڑیاں، جنگلات، دریائیں اور ریگستان ان تمام خطوں پر ان کے تسلط کے قیام میں معاون تھے۔ ان ریاستوں کے وجود کا مطلب یہ تھا کہ سلطنت مغلیہ کی عظیم طاقت اور ایک مرکوز نظام حکومت کے باوجود بھی اس کے حدود میں دو حکمران طبقے پائے جاتے تھے اور ان ریاستوں کو دیکھ دیکھ کر متعدد زمینداران جن کی حیثیت کو شاہی حکومت نے گھٹا کر اپنے ملازمین کا درجہ دے رکھا تھا اپنے گذرے ہوئے دنوں کی یاد تازہ کرنے کے علاوہ اپنے قلوب میں سیاسی مستقبل کو بہتر بنانے کے حوصلہ کی پرورش کرتے تھے۔

---

[1] آئین اکبری۔ ا صفحہ 486-93۔ مرآۃ ضمیمہ 188 اور صفحات مابعد خصوصاً صفحات 211، 221، صفحہ 224، 236 کچھ بھی ایک جداگانہ بادشاہت تھی اور بگلانہ 38، 16 میں فتح ہوا تھا۔

[2] آئین اکبری۔ ا۔ صفحہ 477-82

[3] یہاں جو ماخذ خاص طور پر میرے ذہن میں ہیں وہ وقائع کے علاوہ ادب عالمگیری اور سلکٹڈ ڈوکو منٹس آف شاہجہاں رین (Selected Documents of Shajonan's Reign) ہیں۔

باب: 6

مالگذاری زمین

فصل ۔ ا ۔ مالگذاری زمین کی مقدار

کسی پچھلے باب میں بحث آچکی ہے کہ کسانی زندگی کے حالات بالعموم معاش کی نچلی ترین سطح کے قریب پہونچے ہوئے تھے مغلیہ ہندوستان کے زرعی نظام کی یہ مرکزی خصوصیت تھی کہ حکومت کسان سے اس کی پیداواری بچت (یعنی اس کی بقاو کی ضرورت سے زائد پیداوار) کو بیشتر زمین کی مالگذاری (مال) کے نام پر وصول کرلیتی تھی[1] گیلن سن (Gelcynssen) کے قول کے مطابق مطالبہ مالگذاری کی زیادتی کے باعث "کسان اپنی بقا کی ضروریات سے زائد کا پاتا تھا" وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ان کے لیے اس قدر کم چھوڑا جاتا ہے کہ "ان کا حصہ معمولاً (پیداوار کے) جمع کرنے کے قبل ہی ختم ہوجاتا تھا[2] پلسارٹ، جاگیروں کے متعلق بتاتا ہے کہ "کسان کو اس قدر نچوڑ دیا جاتا ہے کہ اسے اپنے پیٹ کے لیے خشک روٹی بھی بدقت میسر آتی ہے"[3] یہ درست ہے کہ مالگذاری زمین کا پیداواری بچت کے مساوی ہونا کوئی ایسا سرکاری نظریہ نہ تھا جو انتظامی تحریروں میں درج ہو، لیکن ابوالفضل جسے ان معاملات میں حکومت کے نقطہ نگاہ کا مستند ترین ترجمان

1۔ آئین اکبری ۔ ا ص 294

2۔ گیلنس ترجمہ مورلینڈ JIH (Golcjmssen to, M re] ndJIH رام ص 78-9 یہ بیان خاص طور پر گجرات کے متعلق ہے۔

3۔ Pelsacrt ‎-54

تصور کیا جا سکتا ہے صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ رعایا پر حکمران کے مالی مطالبات کی کوئی اخلاقی حد بندی نہیں کی جا سکتی۔ اگر اس کی زندگی و آبرو کا محافظ اس کے جملہ سلوکات بھی طلب کرے تو رعایا کو شکر گذار ہونا چاہیے[1] ایسی صورت میں، اگر مطالبۂ مالگذاری فاضل پیداوار سے معمولاً زائد نہ ہوا کرتا تو اس کا سبب محض یہ تھا کہ ایسا کرنے سے مالگذاری ادا کرنے والے کلیتہً نیست و نابود ہو جاتے اور نتیجتہً سرکاری محاصل کی میزان بجائے بڑھنے کے کم ہو کر، اصل مقصد ہی کو فوت کر دیتی[2]

ہمارے پاس مغلیہ ہندوستان میں پیداواری بچت کی اوسط شرح (بمقدار مجموعی پیداوار) معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ زمین کی پیداوار اور کسان کی بقا کی ناگزیر ضرورت کو متعین کرنے والے عناصر مثلاً آب و ہوا و سماجی حالات میں فرق کی وجہ سے یہ شرحیں مختلف خطوں میں ضرور مختلف رہی ہوں گی[3]۔ ہر علاقہ میں غالباً یہ عام طور پر معلوم رہتا تھا کہ کسان کے وجود کو خطرہ میں ڈالے بغیر اس سے پیداوار کا کونسا حصہ وصول کیا جا سکتا ہے اگر ہمارا یہ قیاس درست ہے کہ زمین کی مالگذاری عموماً فاضل پیداوار سے زائد نہ ہوا کرتی تو پھر یہ یا تو مسلمہ مقامی شرحوں کے قریب قریب برابر یا ان سے کم ہوتی رہی ہو گی۔ ہمارے مآخذ میں یہ بات متعدد بار بیان کی گئی ہے کہ مالگذاری، مجموعی پیداوار کا ایک معین جزو ہوتی تھی۔ یہ بیانات

---

[1] آئین اکبری۔ ا ص 391 وہ یہ بھی کہتا ہے کہ گو کہ "انصاف پسند بادشاہ" اپنی ضروریات سے زائد نہیں وصول کرتے مگر اس کا تعین یقیناً انھیں کو کرنا ہے۔

[2] لیکن قحط سالی کے دنوں میں جانوں کے کثیر اتلاف (ملاحظہ ہو باب 3 کی فصل 2) سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان دنوں کسان کی ناگزیر ضروریات کے لیے پیداوار کا حصہ معین کرتے وقت صرف عام دنوں کو پیش نظر رکھا جاتا تھا اور کوئی ایسی بچت (کسانوں کے پاس غلہ کے محفوظ ذخیرہ کے طور پر) جو دوران قحط اس کے اور اس کے گھر والوں کے کام آسکے نہ چھوڑی جاتی تھی۔

[3] یہاں کرناٹک میں زمین کی انتہائی زرخیزی کے باوجود وہاں کے لوگوں کی غیر معمولی عسرت کے متعلق بھیم سین کے قول کو یاد رکھنا چاہیے بقول اس کے اس صورت حال کی وجہ سے وہاں کے راجاؤں نے اس قدر کافی دولت جمع کر لی تھی کہ ان کے لیے ان شاندار مندروں کو جنہیں اس نے وہاں دیکھے تھے تعمیر کرانا ممکن ہو سکا (دلکشا، اوراق 112 ب۔ 113 ب)

اس لحاظ سے بیحد قابل قدر ہیں کہ ان سے ہمیں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ کسان کو اپنی پیداوار کے کس قدر حصّہ سے بغیر کسی معاوضہ کے محروم ہونا پڑتا تھا۔ لیکن اس شہادت کا ہر پہلو واضح نہیں ہے، خصوصًا جیسا کہ نظام ضبط کے معاملہ میں، جہاں مطالبۂ مالگذاری کی مقدار اور واقعی پیداوار کے درمیان براہِ راست کوئی تعلق نہ پایا جاتا تھا۔ اگلی دو فصلوں میں مذکورہ نوعیت کے امور کے متعلق ہم جن نتائج پر پہونچے گے، ان کے حوالے آنے والے پیراؤں میں پیشتر ہی سے آزادی کے ساتھ دیے گئے ہیں، تاکہ تشخیص و وصولیٔ مالگذاری کے مختلف طریقوں پر بحث کرتے وقت طویل گریز سے بچا جاسکے۔

ابوالفضل کے بیان کے مطابق شیرشاہ نے پیداوار کی تین شرحیں قائم کرنے کے بعد ہر پیداوار پر مطالبہ کو ان شرحوں کے اوسط کے ایک تہائی پر مقرر کیا۔[1] یہ عمل نظام ضبط کی تشخیص

---

[1] آئین اکبری ۱۔ 300-297 جیسا کہ مورلینڈ نے اس موضوع پر اپنی تفصیلی بحث میں واضح کیا ہے، اس امر کا قوی امکان پایا جاتا ہے کہ اکبر نے مطالبۂ مالگذاری کی ایک تہائی شرح کی شیرشاہ کی حکومت سے وراثت میں پایا تھا۔ (JRAS, 1926 PP. 451-4) لیکن بعض اشخاص اس "بدعقیدہ" کو مطعون کرنے کے بیحد مشتاق نظر آتے ہیں اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی یہ جدت آفرینی ہے کہ اکبر نے مطالبہ مالگذاری کو ایک چوتھائی سے بڑھا کر ایک تہائی کر دیا تھا۔ (Administration of The Sultan of Delhi, 2nd, Ed. PP-118-19) ڈاکٹر قریشی کا ثبوت نمبر ۱: "اکبر کا مورث تیمور اپنی مملکت کے صرف تھوڑے حصّہ (صرف تھوڑے ہی حصّہ میں) پیداوار کا ایک تہائی وصول کرتا تھا" ایسی صورت میں تو پھر یہ ایک موروثی خصلت ہوئی۔ ثبوت نمبر 2، ایک ایسا پُر اسرار قول ہے جس کی ریاضی واضح نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس عبارت کا مالگذاری زمین یا پیداوار سے کوئی تعلق نہیں۔ 1529ء میں لودھیوں کا خزانہ ختم کرنے کے بعد بابر وظیفہ خواروں (وجہ داروں) کے گذارہ کی فیصد رقم کو اپنے فوج کے اخراجات پورا کرنے کی غرض سے وصول کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ Baburamae tr. Beveridge, ii, P.617 آخری ثبوت نمبر 3 ابوالفضل اکبر کے Heiderabad Codex f. 345 اس عمل کو یہ کہہ کر جائز قرار دینا ضروری تصور کرتا ہے کہ اس نے بہت سے محصولوں کو مع جزیہ کے بند کر دیا تھا۔۔" گویا کہ جزیہ کا بند کرنا فراخدلی کے باعث نہ تھا۔ لیکن چونکہ ابوالفضل "اس ضابطہ" (یعنی مالگذاری کو بڑھا کر پیداوار کا ایک تہائی کر دینے) کا کہیں بھی ذکر نہیں کرتا، لہٰذا اس کی طرف سے اسے جائز قرار دیئے جانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ کہنا کہ اس کے متن میں اس کا کہیں بھی ذکر نہیں آیا، چنداں ضروری نہیں معلوم ہوتا۔

کا ایک جزو تھا، لہٰذا اسے صرف ہندوستان کے صوبوں یعنی علاقہ لاہور تا الہ آباد میں نافذ کیا جا سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں پیداوار کی یہ شرحیں من مانی طور پر متعین کی گئیں، اگرچہ بعد میں ان کا تعین زیادہ حقیقی یعنی مختلف علاقوں میں مختلف شرحوں کے اصول پر ہوا اور بالآخر ان شرحوں کو علیٰحدہ علیٰحدہ ہر علاقہ کی پیداوار کے اوسط کی بنیاد پر مرتب کیا گیا۔[1] لیکن مالگذاری کو جنس میں نہیں بلکہ نقد میں مقرر کیا گیا۔ یہ بالکل قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ قیمتوں کی جن نرخوں یا قیمتوں کے جن اندراجات کی بنیاد پر سرکاری مطالبہ کو نقد کی شکل دی جاتی تھی وہ وہی ہوتی تھیں جن پر کسان بوقت فصل بحالت افراط اپنی پیداواروں کو فروخت کرتا تھا۔ ایسا ہونے کی صورت میں مطالبۂ مالگذاری اوسطاً بھی پیداوار کے ایک تہائی سے بہت زیادہ ہوتا ہوگا۔[2] یاد رہے کہ چونکہ نظام ضبط میں مطالبۂ سرکاری اولاً پیداوار کی ایک مستقل شرح پر اور اس کے بعد بالآخر نقد کی ایک مستقل شرح پر مبنی ہوا کرتا، لہٰذا فصل کے جملہ نقصانات کسان ہی کو بھگتنا پڑتا تھا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ نظام ضبط میں مطالبہ کا تناسب اس قدر زیادہ نہ ہوتا ہوگا جس قدر کہ مثلاً بٹائی غلہ میں کیونکہ آخرالذکر صورت میں فصل کے نقصانات کو کسان اور حکومت دونوں ہی کو برداشت کرنا ہوتا تھا۔ ابوالفضل کی تحریروں سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ ضبطی کے صوبوں میں غلہ بٹائی اور کنکوت کا طریقہ اختیار کیے جانے کی صورت میں بھی ایک تہائی کا ہی تناسب رہتا تھا۔

ان صوبوں کے باہر کشمیر میں اکبر کی حکومت کو معلوم ہوا کہ سرکاری مطالبہ گوکہ کاغذ پر تو پیداوار کا صرف ایک تہائی ہے مگر درحقیقت وصولی دو تہائی کے مساوی ہے۔ لہٰذا اکبر نے اسے گھٹا کر ایک نصف کر دیا۔[3] صوبۂ ٹھٹھہ میں پیداوار کا ایک تہائی وصول کرتے تھے۔[4] لیکن سندھ کے نظم ونسق

---

[1] جیسا کہ ہم اگلی فصل میں دیکھیں گے کہ نقدی فصلوں پر مالگذاری کی شرحیں عموماً اس سے زیادہ من مانی طریقہ پر قائم کی جاتی تھیں۔

[2] خافی خاں۔ ا، ص 156۔ واضح طور پر کہتا ہے کہ ٹوڈرمل نے قدرتی بارش پر منحصر فصلوں کی پیداوار کا نصف اور مصنوعی ذرائع آبپاشی کی زمینوں پر غذائی غلوں کے کاشت کی صورت میں ایک تہائی اور نقدی فصلوں کی صورت میں اس سے کم تناسب مقرر کیا تھا۔ لیکن مورلینڈ کی وضاحت کے مطابق یہ بظاہر مرشد قلی خاں کی اصلاحات وکن پر مبنی ایک بعد کی روایت ہے (Agrarian System, 255-8)

[3] آئین اکبری۔ ا، ص 570 موازنہ بہ نیز تزک جہانگیری 315۔

[4] آئین اکبری۔ ا، ص 556

پر 34-16ء کی ایک تصنیف موسومہ مظہر شاہجہانی کے قول کے مطابق ترخان قبیلہ کے افراد جو آئین اکبری کی تصنیف کے وقت ٹھٹھہ کے جاگیر دار تھے "کسانوں کی پیداوار کا نصف سے زائد نہیں اور بعض مقامات پر تہائی یا چوتھائی بھی وصول کرتے تھے۔"[1] اس طور پر وصولی کا واقعی معیار پیداوار کا نصف معلوم ہوتا ہے۔[2] صوبہ اجمیر کے غالباً صرف ریگستانی خطوں میں وصولی پیداوار کا محض ایک بٹہ سات ایک بٹہ آٹھ ہوتی تھی۔[3]

اگلی صدی کے لیے ہمارے پاس اوّل تو حساب کتاب کے ایک ضوابط نامہ کی سند موجود ہے۔ جو غالباً دورِ شاہی کے اواخر میں دہلی میں مرتب کی گئی تھی۔ اس میں کھاتہ تشخیص کا جو نمونہ درج ہے، اس میں ربیع کی تمام فصلوں (یعنی کپاس، جو، چنا، سرسوں) کے لیے شرح بطرز کنکوت پیداوار کا نصف اور گیہوں کے لیے ایک تہائی اور فصل خریف (چاول، دال، تل اور موٹھ) کے لیے بطرز غلہ بٹائی ایک تہائی درج ہے۔[4] اورنگ زیب کے راسک داس کے نام فرمان کے دیباچہ میں جو قیاساً مملکت کے وسطی خطوں کے حالات سے مناسبت رکھتا ہے درج ہے کہ جب حکام کو غلہ بٹائی کی شکل میں مفلس و نادار کسانوں سے وصول کرنا پڑتا تھا تو "نصف یا تہائی یا دو بٹہ پانچ یا اس سے کم و بیش" تناسب اختیار کیا جاتا تھا" اواخر عہد عالمگیری کے ایک ضوابط نامہ میں مندرج لاہور کے ایک قریبی پرگنہ کی تشخیص کے حسابات میں بتایا گیا ہے کہ وہاں کنکوت اور غلہ بٹائی دونوں ہی صورتوں میں گیہوں اور جو کے لیے شرح مروجہ پیداوار کی نصف تھی۔ ضوابط نامہ مذکور میں ان غلّوں کے علاوہ چنے کے نقدی دستور (شرح مالگذاری) بھی درج ہیں۔[5] ان کا آئین اکبری میں مندرج انہیں حلقوں کے

---

[1] مظہر شاہجہانی ص 5-2 سرکار سیہوان میں ختیار بیگ کے متعلق جو صوبہ اکبری (1593 - 99) میں یہاں کا جاگیر دار تھا کہا جاتا ہے کہ وہ "فصل کا نصف اور بعض حصوں میں صرف ایک تہائی اور ایک چوتھائی و دو بٹہ پانچ وصول کرتا تھا۔" (ایضاً 101 ایک دوسرے جاگیر دار کی طرف سے جو خود مصنف کا باپ تھا' اسی قسم کے انتظامات کے لیے ملاحظہ ہو زیریں ص)

[2] اس صوبہ کے بیشتر زرخیز حصے ضبط کے تحت تھے۔ آئین اکبری میں ان کے مندرج دستور یا شرح مالگذاری عموماً اتنے ہی زیادہ ہیں جتنے دوسری جگہوں پر۔

[3] آئین اکبری (1) ص 505

[4] دستور العمل نویسندگی' اوراق 183 ب - 185 الف

[5] خلاصۃ السیاق اوراق 75 الف 76 ب، Or. 2026 اوراق 24 ب۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

دستوروں سے موازنہ کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مقامی بیگھوں کے تفاوت کا لحاظ رکھتے ہوئے[1] موجودہ دستور آئین اکبری کے دستوروں کے علی الترتیب 2/6، 2/2، 3/2 اور 9/2 رہ گئے ہیں۔ لیکن چونکہ اس درمیانی مدت میں غلّہ کی قیمتوں میں عام اضافہ ہوا تھا اور لاہور میں گیہوں کی قیمتوں میں ضوابط نامہ مذکور میں مندرج ایک دوسرے دستاویز کی رو سے یہ اضافہ تقریباً 9/2 گنا تھا[2]۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ مالگزاری کے معیار میں کوئی خاص فرق رونما نہیں ہوا۔

منظر شاہجہانی کے مصنف کا قول ہے کہ اس کے زمانہ (1634ء) میں ٹھٹھہ کا علاقہ آباد ہو سکتا تھا بشرطیکہ "جاگیرداران نصف سے زائد غلہ بطور بٹائی کے وصول نہ کرتے"[2الف] اس نے سرکار سہوان کے بعض حصّوں کے لیے اس سے بھی کم شرح تجویز کیا ہے اور نصف کی اس نے صرف اس صورت میں اجازت دی ہے، جب کسان اطاعت شعار اور پہاڑیوں کی طرف کے حملوں سے محفوظ ہوں[2ب]

ان کے علاوہ صرف گجرات اور دکن وہ علاقے ہیں جن کے متعلق ہمارے پاس اس قسم کی اطلاعیں موجود ہیں۔ گیلنس، 1629ء میں تحریر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ گجرات کے کسان سے اس کی پیداوار کا تین چوتھائی وصول کیا جاتا تھا[3]۔ اس کے بعد کی دہائی کے دو مصنفین اس بیان میں تھوڑی سی

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

28 الف اس ضوابط نامہ کے نقدی دستور خاص طور پر قابل اعتماد ہیں کیونکہ یہ مع تاریخ (فصل ربیع، سنہ 41 جلوس عالمگیری) اور متعلقہ موضع و پرگنہ کے نام کے درج ہیں۔ دستور العمل کے دستوروں کے متعلق ایسا نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس میں نمونۂ تشخیص کے کاغذات بالکل فرضی ہیں اور نہ تو ان کی تاریخ ہی درج ہے اور نہ مقام کے بارے میں کچھ لکھا ہوا ہے۔ اس میں مندرج شرحیں گنّے، تمباکو اور بیگن کی ہیں جو صریحی طور پر فرضی معلوم ہوتی ہیں۔

[1] خلاصۃ السیاق، میں جو بیگھہ استعمال ہوا ہے وہ نہ تو بیگھۂ الٰہی ہے اور نہ بیگھۂ دفتری بلکہ وہ بیگھہ ہے جو 40 انگل کے ایک درعہ کا ہوتا ہے (ورق 75 الف، ۱۳۰، 2026، ورق 24، ب) لہٰذا یہ بیگھۂ الٰہی سے بقدر 37 فیصدی بڑا رہا ہوگا۔ (ملاحظہ ہو ضمیمہ الف)

[2] ملاحظہ ہو باب 2 کی فصل 3

[2الف] منظر شاہجہانی ص 51

[2ب] ایضاً ص 204، 207، 214-16، 219، 225، 229، 230 کم شرحوں کے لیے اور ص 209-10، 220-23، 227، 229 پیداوار کے نصف کے لیے

[3] JIH, IV, P.78-9

ترمیم کرتے ہیں[1] لیکن عہد عالمگیری کے آٹھویں برس، بقول ایک شاہی فرمان کے جاگیرداروں کا مطالبہ نام کے لیے تو نصف لیکن عملاً پوری پیداوار سے بھی زائد تھا[2] اس کے تھوڑے ہی بعد فرایئر کے مشاہدہ کے مطابق سورت کے قریب کے کسانوں کو اپنے ایک چوتھائی نصیب ہوتا تھا[3]

عہد شاہجہانی کے اختتامی زمانہ میں جب مرشد قلی خاں نے دکن میں غلہ بٹائی کا نظام رائج کیا تو وہ معمولی زمینوں کے پیداوار کا نصف لیکن کنوؤں سے آبپاشی والی زمینوں کا ایک تہائی اور اعلیٰ قسم کی پیداوار کا اس سے بھی کم (ایک چوتھائی تک) وصول کرتا تھا[4]

ہمیں اس قول پر کہ ہر جگہ مالگذاری کو پیداوار کا نصف ہونا چاہئے، جس سے کہ دور عالمگیری کی مالی تحریریں، عام ہدایات اور نیز مخصوص معاملات میں صادر شدہ احکام بھرے پڑے ہیں مذکورہ بالا واضح اور عملی مثالوں کی روشنی میں غور کرنا چاہیے۔ بعض مواقع پر اسے انتہائی حد لیکن زیادہ تر اسے ٹھیک وہ رقم بتایا گیا ہے جس سے زائد نہیں وصول کیا جاسکتا تھا[5] غالباً نصف شرح کے بارے میں مسلسل تاکیدی احکام جیسا کہ واقعتہً بعد کی تحریروں میں صاف طور پر واضح کیا گیا ہے[6]

---

[1] "تقریباً تین چوتھائی" (Delnet) "نصف یا بعض اوقات تین چوتھائی" (Van Twist) ملاحظہ ہو، مورلینڈ 64، JIH,xiv میں

[2] مرآۃ (ا) ص 263

[3] Fryer i, PP. 301

[4] ملاحظہ ہو باب ہذا کی فصل 3

[5] مرآۃ (ا) ص 263 فرمان بنام محمد ہاشم دفعات 4، 6، 9، 16۔ نگارنامہ منشی اوراق 77 ب 78 الف، 102 ب 119 الف، 126 الف۔ب 127 ب۔ 128 الف 188 ب، ۔ Bodl. اوراق 56 ب 78 الف، 92 الف، 98 الف۔ب، 150 الف مطبوعہ 80، 92، 98، 144، 5 ودرالعلوم اوراق 42 ب۔ 43 ب 51 الف 55 الف، خلاصۃ الانشاء Or 1750 ورق 111 الف۔ب، دستورالعمل آگاہی، ورق 28 الف، احکام عالمگیری ورق 224 الف۔ب، خلاصۃ السیاق ورق 73 ب Ir 20.26، ورق 21 ب۔ ملاحظہ ہو، Ovington ص 120 بھی جس میں ہندوستان کا مجموعی ذکر آیا ہے۔

[6] نگارنامہ منشی، ورق ب، Bodl. ورق 78 الف اور خلاصۃ الانشا، حوالہ سابقہ محمد ہاشم کے نام فرمان (خصوصاً دیباچہ ملاحظہ ہو) سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب اپنے شعبۂ مال کے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

شریعت (فقہ اسلامی) کے رسمی اقدام پر مبنی تھے جو خراج (زمین کے محصول) کو پیداوار کا نصف قرار دیتا ہے۔

اس امر کا تعین کہ ان شرحوں کے نفاذ سے پچھلے حالات کس درجہ میں تبدیل ہوئے دشوار ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ گجرات کے ان حصوں میں جہاں زمین غیر معمولی طور پر زرخیز تھی وہاں مالگزاری شاہی نکتہ چینیوں کے باوجود اس نئی شرح پر چلتی رہی کشمیر، سندھ اور دکن میں اورنگ زیب کی تخت نشینی کے قبل سے معمولی زمینیں پیداوار کی نصف شرح پر مالگزاری ادا کر رہی تھیں چنانچہ نئی شرحوں سے ان علاقوں میں مروّجہ دستور کو محض برقرار رکھا گیا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا مملکت کے وسطی صوبوں میں نئی شرحیں مطالبۂ مالگزاری میں کسی اضافہ کا سبب ہوئیں۔ مورلینڈ کی یہ قطعی رائے ہے کہ یہاں اس قسم کا اضافہ واقع ہوا اور مالگزاری، پیداوار کے ایک تہائی سے بڑھکر نصف ہوگئی[1] لیکن اس نے یہ قیاس کیا ہے کہ عہد اکبری میں ضبط کے تحت مطالبہ واقعی پیداوار کے ایک تہائی سے زائد نہ تھا۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ درحقیقت عملاً ایسا نہ تھا کہ اصل شرحیں ایک تہائی سے بہت زیادہ رہی ہوں۔ علاوہ اس کے، اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اورنگ زیب نے ضبط کی شرح مالگزاری کو پیداوار کے نصف پر از سر نو ترتیب دینے کی کوشش کی قانون شریعت کا تعلق، اصل پیداوار سے تھا نہ کہ اوسطاً یا من مانی طور پر معین کی ہوئی کاغذی مقدار سے۔ اس کے علاوہ، صرف ایک علاقہ (لاہور) کے متعلق عہد عالمگیری کے اواخر اور آئین اکبری میں مندرج نقدی شرحوں کا موازنہ کرنے کے بعد درمیانی مدت میں قیمتوں کے اضافہ کا لحاظ رکھتے ہوئے، ہمیں کوئی حقیقی اضافہ نہیں ملتا۔ عہد اکبری میں کنکوت اور غلہ بٹائی کے مقررہ تناسب نامعلوم ہیں، لیکن

(باقی حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

انتظامات کو رسمی طور پر قانون شریعت کے مطابق مرتب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ابو الفضل کے ذہن میں بھی شریعت کا یہی قانون رہا ہو کیونکہ "ایران و توران" کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ "ایام قدیم سے لوگ (پیداوار کا) ایک بٹہ دس حصہ وصول کیا کرتے تھے، لیکن کبھی کبھی ان کی وصولی ایک نصف سے بھی زائد ہو جاتی تھی اور شقی القلبی کے باعث یہ انہیں بری نہ معلوم ہوتی تھی۔" (آئین اکبری (۱)، صفحہ 293)

[1] Agrarian System، 135۔ وہ اپنی ایک دوسری تصنیف Akbar to Aurangzeb، 260-61 میں کہتا ہے کہ مطالبہ کے داموں کی شکل میں ہونے کی صورت میں مالگزاری کا بار اور بڑھ جاتا ہے کیونکہ سترھویں صدی میں اس کی قیمت بمقدار چاندی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس مسئلہ پر باب ہذا کی فصل ۵ میں بحث آئی ہے۔

عہد شاہجہانی کے ایک ضوابط نامہ میں گیہوں کو چھوڑ کر بقیہ تمام پیداواروں کے لیے کنکوت کے ذریعہ سے تشخیص کی صورت میں 2:1 کا تناسب بیان کیا جاتا ہے۔ اس ضوابط نامہ میں غلہ بٹائی کی صورت میں حکومت کا حصہ ایک تہائی درج ہے لیکن فرمان عالمگیری بنام راس کہ اس میں غلہ بٹائی کے لیے بھی یہی تناسب رکھا گیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر مورلینڈ جس اضافہ کا دعویٰ کرتا ہے وہ حقیقی سے زیادہ ظاہری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتاً شروع ہی سے مطالبہ اس قدر زیادہ رکھا گیا تھا کہ اس میں کسی مزید اضافہ کی ضرورت بمشکل ہی نکل سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر دیگر محصولوں اور حکام و دیگر اشخاص کی ضابطہ و بے ضابطہ وصولیوں کو بھی ذہن میں رکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ کسانوں پر محصولوں کا بار کس قدر تھا۔ اگر حکام کسانوں سے اپنی وصولیوں کو صرف جائز مطالبات اور پچھلے بقایوں ہی تک محدود رکھنے کے ساتھ ساتھ مناسب مواقع پر ان کی دستگیری سے پہلوتہی کرتے تو بھی ان کی وصول کی ہوئی رقم خطرہ کے نشان سے تجاوز کر جاتی اور ان کے پاس اس قدر نہ بچتا جو انکی ناگزیر کفالت کے لیے کافی ہو سکے۔ لیکن اس سے فوری طور پر ہمارا کوئی تعلق نہیں اور اس بحث کو کہ اس نوعیت کے مظالم میں اضافہ ہوا یا نہیں ہم آخری باب کے لیے ملتوی کر سکتے ہیں۔

فصل 2 تشخیص مالگذاری کے طریقے

عہد مغلیہ میں انتظامات مالگذاری محصولات کے کسی بھی باضابطہ نظم کی طرح دو مرحلوں پر مشتمل تھے پہلا تشخیص، دوسرا واقعی وصولی (تحصیل)، رقم تشخیص شدہ کو 'جمع' اور اس کے بالمقابل رقم وصول شدہ کو 'حاصل' کہتے تھے[1] ہندوستان میں زرعی سال کی دو بڑی موسمی تقسیموں کے مطابق خریف اور ربیع کی فصلوں پر علیحدہ علیحدہ تشخیص کی جاتی تھی۔ تشخیص ہو جانے پر حکام ایک تحریری دستاویز جسے پٹہ یعنی قول و قرار کہا جاتا تھا جاری کیا کرتے جس میں مطالبہ لگان کی رقم یا شرح درج رہتی تھی۔ ساتھ ساتھ شخص الیہ (وہ شخص جس پر مالگذاری تشخیص کی جاتی) مطالبہ کی قبولیت داخل کرتا جس میں مطالبہ کو قبول کرنے کے علاوہ یہ بھی درج رہتا کہ وہ اسے کب اور کیسے ادا کرے گا[2]

---

[1] حساب کتاب میں آمدنیوں کے لیے 'جمع' کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ 'خرچ' یعنی خرچ کے بالمقابل ایک مد ہوئی۔ موازنہ ہو مورلینڈ Agrarian system 212-15۔

[2] فرہنگ کاروانی اوراق 34 الف۔ دراصلوم ورق 35 الف، سیاق نامہ 29-30 (باقی حاشیہ آئندہ پر)

تشخیص مختلف طریقوں سے کی جاتی تھی جو انتہائی غائرانہ مطالعہ کے مستحق ہیں۔ اس فصل میں ان طریقوں کے بعض خصوصی پہلوؤں کی علیٰحدہ علیٰحدہ وضاحت اور ان کا بیان اور اگلی فصل میں مملکت کے مختلف علاقوں میں ان کے اطلاق کا جائزہ لیا جائے گا۔

منفی طور پر شروع کرتے ہوئے، ہماری بحث کا آغاز تشخیص کے کسی طریقہ سے نہیں بلکہ بغیر تشخیص کے کسی طریقہ سے نہیں، بلکہ بغیر تشخیص کے وصولی کے ایک طریقہ سے ہوگا۔ یہ غلہ بٹائی کا طریقہ ہے جسے فارسی میں غلہ بخشی اور ہندی اور اس کی متعلقہ زبانوں میں 'بٹائی' اور 'بھاولی' کے نام سے پکارتے تھے۔ آئین اکبری میں تین قسم کی بٹائی کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اول طریقہ کے تحت غلہ کاٹنے کے وقت پیداوار کی تقسیم تھی جو معاہدہ کے مطابق دونوں فریقین کی موجودگی میں "عمل میں آتی تھی معلوم ہوتا ہے کہ اسے بٹائی کا ایک صحیح طریقہ تصور کرتے تھے۔ دوسرا طریقہ کھیت بٹائی کا تھا جس میں کھیتوں یا کھڑی فصلوں کی تقسیم عمل میں آتی تھی اور تیسرا طریقہ 'لانگ بٹائی' کا تھا جس میں فصل کو گٹھروں میں انبار کرکے تقسیم کرتے تھے[1] سرکاری کاغذات میں غلہ بٹائی کو "وصولیٔ مالگذاری کا بہترین طریقہ" بتایا گیا ہے[2] غالباً کسان کے لیے یہ عام طور پر اس لیے قابل ترجیح تھا کہ اس طریقہ کے تحت خرابیٔ فصل

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) سیاق نامہ 29 - 30، خلاصۃ السیاق اوراق 73 ب 75 الف . Or. 2026 اوراق 22 ب، 24 ب۔ فرہنگ کاردانی، سیاق نامہ اور خلاصۃ السیاق میں بھی ان دستاویزات کے نمونے نقل ہیں۔ الہ آباد 177، 897، 12.06 اور 12.23 پٹے یا قول و قرار ہیں اور ان کو انہیں عنوان کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ الہ آباد 12.20 کا کوئی عنوان نہیں ہے، لیکن یہ ایک قبولیت ہے۔ یہ سب عہد عالمگیری کے ہیں۔

آئین اکبری (۱) ص 286 میں عملگذار (شعبۂ مال کا افسر) کے تشخیص کے وقت کسانوں سے کاغذات کے لینے اور دینے کا تو ذکر کیا گیا ہے مگر اس میں تفصیلی اندراجات قلمبند نہیں ہیں۔

[1] آئین اکبری (۱) ص 286 آخری طریقہ سے غالباً مراد یہ ہے کہ کسان اپنی پیداوار کی برابر ڈھیریاں لگا دیتا تھا اور محصل مالگذاری حکومت کے حصہ کے مطابق ان میں سے ڈھیریاں لے لیتا تھا۔

فرہنگ کاردانی ورق 33 الف (Edinburgh 83، ورق 55 الف) میں ایک طریقہ کو جسے وہ 'پولا بندی' کہتا ہے 'غلہ بخشی' سے مختلف بتایا گیا ہے۔ لیکن یہ غلہ کی بٹائی کا صرف ایک مخصوص طریقہ معلوم ہوتا ہے جس میں حکام فصل کی کٹائی اور گاہنے کا انتظام کرکے گاہے ہوئے غلہ میں سے حکومت کا حصہ لے لیا کرتے تھے۔

[2] نگارنامہ منشی اوراق 97 ب 98 الف، Bodl. ورق 73 ب، مطبوعہ 76۔

میں اس کے ساتھ حکومت بھی شریک رہا کرتی۔ غیر معمولی آفات میں مبتلا مواضعات یا کاشتکاروں کے لیے یہ طریقہ سب سے زیادہ مناسب خیال کیا جاتا ہے[1] مسلمہ تشخیص کے مشتبہ ہونے کی صورت میں انتظامیہ کے لیے کسی موضع کی پیداواری صلاحیت کی جانچ کے لیے بھی یہ طریقہ اچھا تھا[2] اور غلہ کے بازار میں گراں ہونے کی صورت میں بھی یہ حکومت کے لیے نفع بخش ثابت ہوا کرتا[3] مگر بقول ابوالفضل، حکومت کے نقطۂ نگاہ سے اس کا خاص نقص یہ تھا کہ "اس میں زیادہ تعداد میں چوکس نگرانی کرنے والوں کی ضرورت ہوا کرتی، ورنہ بدبخت اپنے بے ایمان ہاتھوں کو تصرف بیجا سے ملوث کر لیتے"[4] لہٰذا یہ طریقہ خرچ طلب اور بقول اورنگزیب اسے جب دکن میں رائج کیا گیا تو محض نگرانی اور پیداوار کے انتظامات کے باعث مالگذاری کی وصولی کے اخراجات دوگنا ہو گئے[5]

تشخیص مالگذاری کے سلسلہ میں سب سے زیادہ سرسری طریقہ وہ تھا جسے 'ہست وبود' کہتے تھے۔ تشخیص کنندہ موضع کا معائنہ کرکے "اچھی وبری دونوں طرح کی زمینوں کو ایک ساتھ دیکھ کر ان کی مجموعی پیداوار کے تخمینہ کی بنیاد پر مالگذاری مقرر کرتا تھا"[6] ایک دوسرا ایسا ہی سرسری طریقہ محض ہلوں کو شمار کرکے علاقہ کے لحاظ سے مقررہ شرحوں کے مطابق مالگذاری کو معین کرنا تھا[7]

---

[1] تمہید فرمان بنام راسکلاس۔

[2] دونوں صورتوں میں یعنی جب یہ بہت زیادہ (نگارنامۂ منشی ورق 126 الف۔ب، Bodl. ورق 98 الف مطبوعہ 98) یا بہت کم ہوتی تھی (احکام عالمگیری ورق 244 الف۔ب)

[3] فرہنگ کاروانی ورق 32 ب Edinburgh 83 ورق 35 الف

[4] آئین اکبری (1)، ص 286 موازنہ بہ نگارنامۂ منشی اوراق 97 ب 98 الف 126 الف۔ب Bodl اوراق 73 ب 98 الف، مطبوعہ 76، 98؛ فرہنگ کاروانی حوالۂ سابقہ بعکس ورق 7 ب میں ایک ہندی کہاوت بیان کی گئی ہے 'بٹائی لوٹائی ہے' یعنی غلہ کی بٹائی لوٹ کی دعوت دیتی ہے۔

[5] ادب عالمگیری، ورق 118 الف۔

[6] فرہنگ کاروانی، ورق 32 ب Edinburgh 83 ورق 35 الف، Add 6603 ورق 84 الف میں 'ہست وبود' کی تعریف اس طور پر بیان کی گئی ہے، "وہ چیز جو فی الوقت بوئی اور پیدا کی جاتی ہو۔ جب حاکم (مالگذاری کا دعویدار) لائق ہوتا ہے تو زمیندار کہتا ہے کہ ہماری زمین کو ہست وبود کے مطابق تشخیص کر دو"

[7] یہ طریقہ دکن میں رائج تھا اور اسے صادق خاں، Or. 174 ورق 185 الف۔ب۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

مذکورہ بالا دونوں طریقوں کی خرابیاں بالکل واضح ہیں۔ پہلے میں سب کچھ تشخیص کنندہ کی ذاتی صلاحیت اور دیانتداری پر منحصر ہوتا اور دوسرے کے تحت مطالبۂ مالگزاری کی تقسیم انتہائی غیر مساوی ہوتی۔ ان سے زیادہ ترقی یافتہ طریقہ کنکوت یا دانہ بندی ان خرابیوں سے ایک حد تک پاک تھا۔[1] اس طریقہ کو آئین اکبری اور دیگر ماخذ میں بہت وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو مرحلوں پر مشتمل تھا۔ پہلے مرحلہ میں زمین کو رسی (جریب) سے ناپتے تھے[2] اس کے بعد رقبہ کی فی اکائی پر ہر فصل کی پیداوار یعنی شرح پیداوار کا تخمینہ قائم کرکے اسے پورے رقبہ زیر فصل پر عائد کیا جاتا تھا۔ اگر تشخیص کنندہ کو محض مشاہدہ کی بنا پر پیداوار کی شرح مقرر کرنے میں مشکل پیش آتی تو اسے اچھی، درمیانی اور خراب زمینوں کے تین نمونہ کی فصلوں کو کاٹ کر ان کی بنیاد پر اپنا تخمینہ قائم کرنا ہوتا تھا۔[3] بقول ابوالفضل کنکوت کی ایک اہم خصوصیت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

671 اور ق 90 ب، خافی خان (۱) صفحہ 732 (دفٹ) میں بیان کیا گیا ہے۔

[1] ابوالفضل اس لفظ کی اس طور پر وضاحت کرتا ہے، "کن" بمعنی غلہ اور "کوت" بمعنی اندازہ یا تخمینہ (آئین اکبری (۱) صفحہ 285) یعنی اس طریقہ میں غلہ کی پیداوار (بلکہ شرح پیداوار) کا تخمینہ قائم کیا جاتا تھا۔ "دانہ" بمعنی غلہ اور "بندی" جب کسی مرکب لفظ کے ایک جزو کے طور پر شعبۂ مال کی تحریروں میں استعمال ہو تو اس کا عمومی مفہوم کسی چیز کا معین یا مقرر کرنا ہوتا ہے جیسے "جمع بندی"۔

[2] آئین اکبری (۱) صفحہ 285، خلاصۃ السیاق 76 الف، Or. 2026 ورق 27 الف، بکس ورق 70 الف۔ ب۔ موازنہ بہ Add. 6603 ورق 71 ب۔ یہ امر کہ رقبہ کی پیمائش اس طریقہ کا جزو لازم تھی، دستورالعمل نویسندگی ورق 182 الف، خلاصۃ السیاق اوراق 79 الف۔ 76 ب، Or. 2026 اوراق 24 ب۔ 28 الف میں مندرج گوشوارۂ تشخیص کے نمونوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اول الذکر میں رقبہ کو بیگھوں میں درج کیا گیا ہے۔ خلاصۃ السیاق میں "پیمائش کی ہندوستانی اکائیاں" (ضبط ہندی) یعنی "کنال" کا استعمال بتایا گیا ہے۔ لیکن یہ محض پنجاب میں استعمال ہوا کرتے تھے۔

[3] آئین اکبری (۱) صفحہ 6-285 میں کہا گیا ہے کہ تجربہ والی نگاہیں دیکھ کر بالکل صحیح تخمینہ کر دیتی تھیں۔ موازنہ بہ خلاصۃ السیاق ورق 76 الف، Or. 2026 ورق 27 الف، بکس اوراق 70 ب۔ 71 الف میں شرح پیداوار کے تخمینہ کے دو طریقے بتائے گئے ہیں۔ اول تو تشخیص کرنے والے اور کسان کی تجربہ سے دو کھیت منتخب کرکے ان کی پیداواروں کے نمونہ کی بنیاد پر۔ دوئم، غلہ کی ایک ڈھیری (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

یہ تھی کہ مطالبہ کو اولاً نقد میں نہیں بلکہ جنس میں تشخیص کرتے تھے[1] چنانچہ کنکوت کے کاغذات کے نمونہ میں ہمیں پہلے پوری پیداوار کی تشخیص (پیداوار کی شرحوں کی بنیاد پر) ملتی ہے اس کے بعد اس میں سے کسان کے حصہ کو گھٹا دیتے ہیں۔ بالآخر باقی حصہ کو جو مالگذاری کا حق ہوتا ہے مختلف پیداوار کے ایک نرخنامہ کے مطابق نقد میں تبدیل[2] کر دیتے ہیں۔

آپ دیکھیں گے کہ طریقۂ کنکوت، فصل کی واقعی پیداوار پر مبنی ہونے کے باعث غلہ بٹائی کے طریقہ کا مشابہ تھا۔ لیکن چونکہ کنکوت میں پیداوار کے کاٹنے اور گاہنے میں نگرانی کا

(باقی حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

کو وزن کرنے کا ہے (پھر جس کھیت سے یہ ڈھیری لگائی گئی اس کے رقبہ کا حساب لگانا؟)

پچھلے فٹ نوٹ میں مذکورہ دو ضابطہ ناموں میں دیے ہوئے کنکوت کے گوشواروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر پیداوار ان کے رقبوں پر شرح پیداوار کس طور پر منطبق کی جاتی تھیں۔ دستورالعمل نویسندگی میں کسی بھی پیداوار کو دوبارہ نہیں لکھا گیا ہے۔ لیکن خلاصۃ السیاق کے گوشواروں میں گیہوں کے دو کھیتوں کی مختلف شرح پیداوار پر تشخیص کی گئی ہے یعنی ۹ اور ۶ ۹ے من فی کنال، کے حساب پر۔ اس کا بظاہر یہ مفہوم ہوا کہ اگر بعض کھیتوں کی زمین زرخیزی اور آبپاشی کے معاملہ میں دوسری زمین سے بہتر ہے تو یہ ضروری نہ تھا کہ پورے موضع کے لیے پیداوار کی ایک ہی شرح مقرر کی جائے۔

کنکوت کے ان گوشواروں کا دوسرا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ضبط کے تمام گوشواروں کی طرح ان میں نابود یعنی فصل کی تباہی کی وجہ سے مجموعی رقبۂ پیمودہ سے منہائی کا کوئی خانہ نہیں ہے۔ ایسا غالباً اس لیے ہے کہ کنکوت میں ہر موضع (بلکہ ہر کھیت) کے لیے شرح پیداوار فصل ہی کے وقت معین کر دی جاتی تھی اور توقع کی جاتی تھی کہ شرح پیداوار ہی میں فصل کے نقصانات کے لیے گنجائش رکھی گئی ہوگی۔

[1] آئین اکبری (۱) ص 285-6 مالگذار کو "ہمیشہ نقد وصول کرنے کی عادت نہ ڈالنی چاہیے بلکہ غلہ بھی وصول کرنا چاہیے اور اس کے مختلف طریقے ہوتے ہیں (ہر چند گنا بود) کنکوت ۔۔۔۔ بٹائی ۔۔ وغیرہ

[2] دستورالعمل نویسندگی اوراق 182 الف 183 الف و خلاصۃ السیاق اوراق 75 الف، 76 ب، 0پ 20 26 اوراق 24 ب۔ 28 الف میں مندرج گوشوارے ملاحظہ ہوں قیمتیں نرخ بازاری کے مطابق تھیں (یا تصور کی جاتی تھیں) موازنہ بہ آئین اکبری (۱) ص 286 "اگر کسانوں کے لیے بار نہ ہو تو اس (مالگذار) کو چاہیے کہ وہ نرخ بازاری کے مطابق پیداوار کے حصہ کو نقد میں تبدیل کر دے۔" سیاق عبارت (ملاحظہ ہو پچھلا فٹ نوٹ) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بیان کا اطلاق بٹائی اور کنکوت دونوں ہی پر تھا۔

کوئی سوال نہ ہوتا، لہٰذا اس میں خرچ بہت کم آتا تھا۔ تشخیص مالگذاری کے مذکورہ بالا دونوں طریقوں کے مقابلہ میں یہ طریقہ بہتر اور زیادہ صحیح تھا مگر اس میں چونکہ تشخیص کنندہ ہی پیداوار کی شرحوں کا بھی تعین کرتا، لہٰذا اس کے اختیارات بہت وسیع ہوتے تھے بھکر کے گورنر نے غالباً اس کے اسی اختیار کو ختم کرنے کی خواہش کے تحت 1575ء–6ء میں کنکوت کے تحت مالگذاری کو من فی بیگھہ کی یکساں شرح پر مقرر کیا تھا[1] یہ صورت پیداوار کے تخمینہ کی ضرورت کو بالکل ختم کرکے ہمیں اگر نظام ضبط کے حدود کے اندر نہیں تو اس کے قریب تک ضرور پہنچا دیتی تھی۔

ہندوستانی کاغذات مال میں لفظ ضبط کا ایک مخصوص اصطلاحی مفہوم معین ہے جو لغت کی کتابوں میں نہیں پایا جاتا[2] یہ جریب یا عمل جریب کا مترادف تصور کیا گیا ہے اور اس سے مراد اس پر مبنی پیمائش و نیز تشخیص ہوتی تھی[3] چنانچہ ضبط کو ضبط کنکوت کہتے تھے کیونکہ اس طریقہ میں تشخیص کی ہوئی زمین کے رقبہ کا لحاظ رکھا جاتا تھا[4] لیکن ضبط خود اپنی جگہ پر ایک مخصوص اور دور مغلیہ میں تو تشخیص کا نسبتاً ایک زیادہ اہم طریقہ تھا[5]

---

[1] معصوم، تاریخ سندھ ص 245

[2] موازنہ بہ Prof. lambton's 'Landlord and Penesrt in Pessie'- Agrarian System, P. 235 میں اصطلاحات مال کی فرہنگ میں لفظ 'ضبط' درج نہیں ہے لیکن (ص 443) پر 'ضابطہ' کی تعریف بطور لگان کے محصل، مہتمم اور کارندہ کے کی گئی ہے جو 'ضبط' کے لفظی مفہوم یعنی 'ضبطی' علیحدگی وغیرہ سے ماخوذ ہے۔

[3] ابوالفضل کے مختلف مواقع پر اس لفظ کے استعمال سے یہ مفہوم نکلتا ہے Moreland' Agrarian System' میں ص 235 پر اور جا بجا ملاحظہ ہو، خلاصۃ السیاق ورق 75 الف .Or 2026 ورق 24 ب مختلف ناپ کے کھیتوں کے رقبہ کا حساب لگانے کے متعلق ایک عبارت میں اسے مسلسل پیمائش کے محدود مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ .Add 6603 ورق 70 ب 'ضبط' کو براہ راست "کسی چیز کے رقبہ کی پیمائش (محیط بندی)" بتاتا ہے۔

[4] دستورالعمل نویسندگی ورق 189 الف، دستورالعمل عالمگیری ورق 105 ب، بیکس ورق 70 الف 'کنکوت' کی تعریف، خلاصۃ السیاق ورق 76 الف .Or 2026 ورق 27 الف میں بھی ملاحظہ ہو جہاں تشخیص کرنیوالے کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ "(پہلے) زمین کو ضبط کے تحت لائے الخ"

[5] ضبط اور کنکوت کے بحیثیت دو مختلف طریقوں کے حوالے، آئین اکبری (1) ص 285 (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اس طریقہ کے اہم پہلوؤں کے ارتقاء کو بہترین طور پر آئین اکبری سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ شیرشاہ اور اسلام شاہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے نظام ضبط کو ہندوستان میں رائج کیا تھا[1]۔ ہماری اطلاع ہے کہ شیرشاہ نے ایسی زمینوں کے لیے جو مسلسل زیر کاشت رہیں (پولج) یا بہت ہی شاذ بلا جوتی ہوئی پڑی رہتی ہوں ایک ریع یا پیداوار کی شرح قائم کی[2]۔ 'ریع' تین شرحوں یعنی اچھی، درمیانی اور کم پیداواروں پر مبنی ہوتا تھا۔ ان کے اوسط پر پیداوار کی ایک عام شرح نکالی جاتی تھی اور اس کا ایک تہائی "بادشاہی کا معاوضہ" یا زمین کی مالگذاری تصور کی جاتی تھی۔ ہمیں ربیع اور خریف کی مختلف پیداواروں کی فی بیگھہ شرحوں کا ایک طویل گوشوارہ ملتا ہے[3] جسے ہم شیرشاہ کی

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

خلاصۃ السیاق 74 الف Or 2026 ورق 22 ب، فرہنگ کاردانی ورق 32 ب Edinburgh 83 ورق 35 الف میں آتے ہیں۔ فرمان عالمگیری بنام راسکداس (دیباچہ) میں 'عمل جریب' اور 'کنکوت' میں امتیاز برتا گیا ہے۔

[1] آئین اکبری (۱) ص 296

[2] لفظ 'ریع' کی لغوی تعریف مثلاً غیاث اللغات میں اس لفظ کے تحت اس طور پر کی گئی ہے "کاشتکاری سے بادشاہ کی آمدنی (محصول)، قابل ٹیکس مقبوضات پر محصول کی شرح"۔ لہٰذا اس کے معنی پیداوار اور مالگذاری دونوں ہی کی شرحیں ہو سکتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابوالفضل نے اسے دونوں ہی مفہوم میں استعمال کیا ہے لیکن آخر الذکر مفہوم کو اس نے مالگذاری کی شرح جنس تک محدود رکھا ہے۔ اس نے اپنے ذہن میں بدا ہتہً اول الذکر مفہوم کو رکھتے ہوئے نوشیروں کے متعلق یہ کہا ہے کہ ایک آراضی کو ایک جریب کے برابر مقرر کرنے کے بعد اس نے "اس کی 'ریع' کو ایک قفیز (جسامت کا پیمانہ) بہ قیمت تین درہم مقرر کیا اور وہ اس کا ایک تہائی بطور مالگذاری وصول کرتا تھا" آئین اکبری (۱) ص 292-3 لیکن ایک دوسری جگہ مال یا زمین کی مالگذاری کی تعریف کرتے ہوئے وہ واضح کرتا ہے کہ یہ "مزروعہ رقبہ پر بطور ریع معین کی جاتی ہے" (آئین اکبری (۱) ص 294) اور یہاں 'مالگذاری کی شرح' کا مفہوم زیادہ چسپاں ہوگا۔ اس کے بعد پھر ایک دوسری جگہ وہ کشمیر کی 'ریع' کے ضابطہ کا ذکر کرتا ہے جس سے اس کا مفہوم بمقدار جنس مالگذاری کی اس شرح کا معلوم ہوتا ہے جو زمین کے ہر پٹہ سے مختلف پیداواروں پر وصول کی جاتی تھی (اکبرنامہ (3) ص 548-9)

[3] آئین اکبری (۱) ص 297-300

ریع فرض کر سکتے ہیں۔[1] اکبر نے اپنے عہد حکومت کے آغاز پر ان شرحوں کو بنا بر اپنی پوری مملکت میں رائج کیا تھا اور آئین اکبری کے اس کے بعد کے ایک بیان کا یہ مفہوم ہے کہ صرف شرح پیداوار ہی نہیں بلکہ اس میں مالگذاری کا مقررہ حصہ بھی اکبر کو سوریوں کی حکومت سے ورثہ میں ملا تھا۔[2]

بہر حال شرح بالجنس مطالبۂ مالگذاری کو براہ راست ظاہر نہ کرتی تھی بلکہ اسے "فوج کے فائدہ" یعنی جاگیرداروں کے لیے نقد میں تبدیل کیا جاتا تھا۔[3] بقول ابوالفضل عہد اکبری کے ابتدائی برسوں سے مملکت کے ہر علاقے سے ہر سال قیمتوں کی تفصیلی اطلاعات بھیجی جاتی تھیں اور دربار میں جانچ کے بعد انہیں منظور کیا جاتا تھا اور ریع کو منظور شدہ قیمتوں کے مطابق نقدی شرحوں میں تبدیل کیا جاتا تھا جنہیں 'دستور العمل' یا صرف 'دستور' کہتے تھے۔[4] آئین اکبری میں "انیس برسوں" یعنی عہد حکومت کے چھٹے برس سے چوبیسویں برس تک کے (اجمیر و بہار کے علاوہ) تمام ضبطی صوبوں میں سے ہر ایک کی مختلف پیداواروں کے سالانہ دستور مفصل طور پر درج ہیں۔[5] ان گوشواروں میں مالوہ کو

---

[1] موازنہ بہ مورلینڈ JRAS 1926، 454 اور مابعد صفحات میں۔

[2] آئین اکبری (۱)، ص 300 ریع کے گوشوارہ کے خاتمہ پر لکھا ہوا ہے کہ روشن خیالی بادشاہ نے مذکورہ بالا مالگذاری منظور کی اور رجہات (محاصل) میں ایک بٹہ دس حصہ معاف کر دیا۔

[3] آئین اکبری (۱)، ص 297

[4] آئین اکبری (۱)، ص 303، 347 اکبر نامہ (۲)، ص 282-3 ریع کی بعض پیداواروں مثلاً خربوزہ، اجوائن، پیاز اور دیگر ترکاریاں اور خریف کی پیداواروں میں نیل، پوستہ، پان، ہلدی، سنگھاڑہ، بھنگ وغیرہ کے لیے کوئی ریع تیار نہ کی جاتی تھی بلکہ دستور العمل کو براہ راست رقم میں متعین کر دیتے تھے (آئین اکبری (۱) ص 298، 300)

'دستور العمل' کے لفظی معنی انتظامی کاموں کا ضابطہ ہونا چاہیے۔ (موازنہ بہ Add. 6603 اوراق 61 ب-62 الف) چنانچہ بہت سے انتظامی ضوابط ناموں کو دستور العمل کہتے تھے لیکن عمل کا مفہوم مالگذاری کا وصول کرنا بھی ہوتا ہے (جس سے عامل بمعنی محصل مالگذاری ہے) لہٰذا اس اصطلاح کو شرح مالگذاری کے لیے استعمال کیا جانا مناسب نہیں ہے۔

[5] آئین اکبری (۱)، ص 303-47 میں "آئین نوزدہ سالہ" یہ آئین صوبجات آگرہ، الہ آباد، اودھ، دہلی، لاہور، ملتان اور مالوہ کے متعلق ہیں۔ اجمیر کے گوشواروں کو خالی چھوڑ دیا گیا ہے۔ باوجودیکہ صوبۂ بہار کے (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

چھوڑ کر) بقیہ تمام صوبوں کے چھٹے سے نویں برس تک کی ہر پیداوار کے اعداد ایک دوسرے کے بالکل یا تقریباً مماثل ہیں۔ علاوہ اس کے دستوروں میں سال بہ سال فرق بالکل نہیں یا بہت معمولی ملتا ہے[1] اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شروع میں مملکت کے لیے صرف ایک 'واحد زیع' ہی نہ تھی بلکہ علاً تمام علاقوں میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ قیمتوں کی ایک شرح بھی رائج تھی۔

یہ قیاس میں نہیں آتا کہ یہ یکساں شرح لاہور سے الہ آباد تک پھیلے ہوئے ایک وسیع علاقہ کے کسانوں پر بیک وقت کیونکر نافذ کی جا سکتی تھی۔ لہٰذا ہم انہیں لازمۃً صرف کاغذی شرحوں کا درجہ دے سکتے ہیں۔ ابوالفضل کو یہ تسلیم ہے کہ عہد حکومت کے ابتدائی برسوں میں دستوروں کے نفاذ سے "بے حد مصائب پیش آتے تھے۔" اس کے فوراً ہی بعد وہ یہ وضاحت کرتا ہے کہ 'جمع' یا عام تشخیص کو جو ان دنوں 'جمع رقمی' کے نام سے موسوم تھی بہت بڑھا کر دکھایا گیا تھا اور منفرد صورتوں میں جاگیریں بہت زیادہ یا کم پر تشخیص کی گئی تھیں[2] مورلینڈ جس کا اس جمع کی نوعیت پر تبصرہ بنیادی طور پر صحیح ہے بظاہر اس میں اور دستوروں میں براہِ راست کوئی تعلق نہیں محسوس کرتا[3] اگر دستوروں کے سلسلہ میں ابوالفضل کا اس جمع کا حوالہ ایک بے موقع گریز نہیں ہے تو پھر یہ قدرتی طور پر فرض کیا جا سکتا ہے کہ محض غیر حقیقی شرحوں پر مبنی ہونے کی وجہ سے ہی جمع تھوڑا بہت ضرور زیادہ ہوتی ہوگی اکبری حکومت کو سور بادشاہوں کے محافظ خانوں سے بیہودہ رقبوں کے کچھ پرانے کاغذات ضرور ملے ہونگے اور دستوروں کو ان سے بہ سہولیت ضرب کرکے ہر علاقہ کی جمع کو حاصل کیا جا سکتا تھا۔ لیکن چونکہ خود دستور ہر جگہ کے لیے یکساں تھے اور وہ مقامی پیداواری صلاحیتوں یا قیمتوں کے نشیب و فراز سے ہم آہنگ نہ تھے، لہٰذا کسانوں کی مالگذاری ادا کرنے کی واقعی صلاحیت اور اس جمع میں جس پر جاگیریں دی جاتی تھیں بہت زیادہ فرق رہتا ہوگا۔ اس کے علاوہ معلوم ہوتا ہے کہ رقبہ کے اعداد و شمار میں مصلحتاً رد و بدل کیا جا سکتا تھا کیونکہ بقول ابوالفضل جمع کو بیک جنبش قلم تنخواہ کے مطالبات کو پورا کرنے

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

بیشتر حصّہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ضبط کے تحت تھا لیکن آئین اکبری میں اس کے دستوروں کا کوئی ذکر نہیں آیا ہے۔

[1] اعداد کی یکسانیت عام طور پر بمقابلہ بلاک مین ایڈیشن کے Add. 7652 اور Add. 6552 کے جدولات کے متن میں اور بھی زیادہ ملتی ہے۔

[2] آئین اکبری (۱) ص 347 جمع رقمی، اور اس کے بعد کی عام تشخیصوں پر باب ۷ میں بحث کی گئی ہے۔

[3] Agrarian System, ص 242

غرض سے بڑھایا جا سکتا تھا[1]

مالگذاری کی قابل نفاذ شرحوں اور رقبہ کے قابل اعتماد اعداد و شمار کی اس غیر موجودگی کو ان کارروائیوں کی نوعیت کی توجیہہ کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جو عہد حکومت کے گیارہویں سال مظفر خاں اور ٹوڈرمل کے زیر اہتمام عمل میں آئیں[2] انھوں نے قانون گوؤں سے ملک کے مقامی رقبہ اور مالگذاری کے اعداد و شمار[3] (تقسیمیں) حاصل کیں۔ محصول (پیداوار یا مالگذاری)

---

[1] آئین اکبری (۱) ص 347

[2] آئین اکبری (۱) ص 347 میں پندرہواں سال درج ہے۔ اس خواندگی کی تصدیق بہترین مخطوطات سے بھی ہوتی ہے لیکن فارسی میں پانزدہم (پندرھواں) کو بہ آسانی یازدہم (گیارھواں) پڑھا جا سکتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی ابتدائی دور میں اس کتاب کو نقل کرتے وقت یہ غلطی ہو گئی۔ اس مسئلہ پر ہمیں اکبر نامہ کی شہادت کو فیصلہ کن تصور کرنا چاہئے کیونکہ اس میں واقعات پابندی کے ساتھ تاریخ وار درج ہیں اور اس واقعہ کو اگیارہویں سال کا بتایا گیا ہے (اکبر نامہ (2) ص 270) مورلینڈ Agrarian System 246-7 میں اس دلیل کی معقولیت کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ ان دو متناقض شہادتوں کی یوں توجیہہ کرتا ہے کہ یہ کام گیارہویں سال میں شروع ہو کر پندرہویں سال میں ختم ہوا لیکن اس کے اس خیال کی تائید ان دونوں ماخذمیں سے کسی کے بھی متن سے نہیں ہوتی۔

[3] "تقسیمات ملک" کاغذات موسومہ تقسیم (جمع تقسیمات) کا حوالہ سترھویں صدی کے انتظامی اور حساب کتاب کے ضوابط ناموں میں ملتا ہے۔ انہیں وہی کاغذات بتایا گیا ہے جو موازنہ دہ سالہ کے نام سے موسوم تھے (دستور العمل عالمگیری ورق 38 ب، سیاق نامہ 100 خلاصۃ السیاق ورق 74 الف، Or 2026 ورق 23 الف) دستور العمل عالمگیری میں "موازنہ دہ سالہ کے عنوان کے تحت جسے تقسیم سنوات (برسوں کی) ایک مدت کی تقسیم)" بھی کہا گیا ہے وہ تمام اہم اطلاعات درج ہیں جو ان کاغذات میں موجود تھیں۔ اس میں مجمل یعنی مالگذاری وصول شدہ کے سرسری حسابات اور مقامی خرچ (موازنہ بہ خلاصۃ السیاق ورق 82 ب 2026 ورق 38 ب) مالگذاری اور دیگر محاصل کی تفصیلات (مال و سائر) پرگنہ کے مواضعات کے اعداد کی تفصیلات اور آخر میں رقبہ کے اعداد و شمار شامل ہیں۔ آخر الذکر میں غیر مزروعہ زمین کا رقبہ (آبادی، تالاب، باغات، نالے اور جنگل کے علیحدہ علیحدہ) اور پھر مزروعہ زمین کا رقبہ شامل ہے۔ اس کے بعد ایک دوسری تحریر "تقسیم یک سالہ" یعنے (متصلاً تیل کے) ایک سال کی تقسیم کے عنوان کے تحت درج ہے۔ اس کے تحت کسانوں کی مزروعہ زمین کی مالگذاری، باغات اور کاروبار پر محصول" تا نکار اور (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

کو[1] تخمینہ و اندازہ پر چھوڑتے ہوئے ایک نئی جمع مرتب کی گئی۔[2] نئی جمع میں نقائص کا سبب واقعی پیداوار یا شرحِ پیداوار کے تعین کا یہ سرسری طریقہ تھا جس کے متعلق خیال کیا جاتا تھا کہ اب بھی اس میں اور واقعی وصول شدہ مالگزاری (حاصل) میں "بیحد فرق" تھا لیکن ساتھ ساتھ آئینِ اکبری کے 'نوزدہ' گوشوارہ میں دسویں برس اور اس کے بعد سے تبدیلی رونما ہونا شروع ہوتی ہے مختلف صوبوں کی شرحوں میں اور نیز ایک ہی صوبہ کے مختلف برس کی شرحوں میں نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ صرف اسی قدر نہیں، بلکہ یہ شرحیں اکثر و اعداد یعنی زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم میں ملتی ہیں جو صوبوں کے مختلف علاقوں میں نافذ کی ہوئی شرحوں کے درمیانی فرق کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ پیداوار کی جدید مقامی شرحیں اب معین کی جا چکی تھیں اور اس کے بعد سے ہر علاقہ کے لیے ہر برس علیحدہ علیحدہ قیمتوں کے گوشوارے مرتب کیے جانے لگے تھے۔ ایسا قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ تبدیلیاں مظفر خاں اور ٹوڈرمل کی ان کارروائیوں کے نتیجہ میں ظہور میں آئیں جو انھوں نے ایک نئی جمع مرتب کرنے کی غرض سے مالگذاری کی نئی شرحوں کو قائم کرنے کے سلسلہ میں اختیار کی تھیں۔[3] جیسے جیسے دستور صحیح حالات کے قریب تر آتے گئے، انتظامیہ کو انھیں غالباً ایک حد تک

---

[1] ابوالفضل اور دیگر مصنفین نے لفظ 'محصول' کو دو مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اوّل تو پیداوار کے مفہوم میں مثلاً آئینِ اکبری (1) ص 286 میں کسانوں کے 'محصول' کو اٹھا کر لے جانے کے حوالے میں اور اس سے زیادہ واضح طور پر شیر شاہ کی ریع کے متعلق عبارت میں (ایضاً' 297 - 8) محمد ہاشم کے فرمان کے دفعات 11، 10 میں بھی یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اس کا دوسرا یعنی مالگذاری کا مفہوم 'بتکچی' کے نام اس ہدایت سے کہ وہ ہر کسان کی جمع کو تحریر کر کے پھر ان کی میزان کر کے موضع کے محصول کو معلوم کرے بالکل واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے (آئینِ اکبری (1) ص 288) ٹوڈرمل کے ضابطے (اکبر نامہ (3) ص 382) بھی ملاحظہ ہوں۔ یہ لفظ اسی طور پر عباس خاں، ورق 10 ب، فرمان بنام راسکداس کے دیباچہ اور رخانی خاں (1) ص 156 میں استعمال ہوا ہے۔ موازنہ بہ Agrarian Sytem ص 249

[2] آئینِ اکبری (1) ص 347

[3] یہ تعبیر بعض پہلوؤں سے مورلینڈ کی Agrarinn System 86 -7 ' 245 -7 میں ظاہر کی ہوئی رائے سے معنوی طور پر مختلف ہے۔ وہ اس کارروائی کا تعلق پندرہویں سال کی شرحوں میں تبدیلیوں سے قائم کرتا ہے اور اس سال اور اس کے بعد کی شرحوں کو "قانون گو کی شرحیں" بتاتا ہے۔

کسانوں پر مطالبۂ مالگذاری قائم کرنے کی غرض سے نافذ کرنے کا موقع ملا۔ ابوالفضل اس کے بعد ریکھ کو ہر سال نقدی شرحوں میں تبدیل کرنے سے پیدا ہونے والی پریشانیوں پر تبصرہ کرتا ہے۔ بقول اس کے مملکت اب بہت وسیع ہوگئی تھی اور مقامی قیمتوں کی اطلاعات کی موصولگی اور پھر دربار شاہی سے سالانہ شرحوں کی منظوری میں بے حد تاخیر ہونے لگی تھی۔ نتیجۃً بعض اوقات کسان یہ شکایت کرتے کہ (درمیانی مدت میں) ان سے آخری منظور شدہ رقم سے زیادہ وصول کیا گیا تھا اور بعض اوقات جاگیرداران غالباً اس بنا پر کہ منظور شدہ شرحیں بہ تاخیر موصول ہوئیں، مالگذاری کے غیر وصول شدہ بقایوں پر احتجاج کرتے ہیں[1] علاوہ اس کے، اس بات کی شہرت ہوگئی تھی کہ قیمتوں کی اطلاع بھیجنے والوں میں سے بعض راستبازی کے طریقہ سے ہٹ گئے تھے[2]۔

بالآخر اس صورتحال کا علاج، آئین اکبری و اکبرنامہ دونوں کے قول کے مطابق عہد حکومت کے چوبیسویں برس جمع دہ سالہ یعنی اس سال کی جمع کو تیار کرکے کیا گیا تھا۔ حالانکہ مناسب ہوتا کہ اس عام تشخیص پر ساتویں باب میں بحث آتی لیکن اس کا ان دستوروں سے جنہیں ہم آخری دستور کہہ سکتے ہیں اس قدر گہرا ربط ہے کہ اس کے متعلق یہیں پر کچھ لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مورلینڈ کے خیال کے مطابق جمع دہ سالہ پچھلے دس برس میں کسانوں پر واقعی عائد کئے گئے مجموعی مطالبۂ مالگذاری کے محض اوسط پر قائم کیا گیا تھا[3] مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کیونکہ ابوالفضل کا یہ واضح بیان موجود ہے کہ "اس جدید طریقہ کا لب لباب یہ ہے کہ ہر پرگنہ کے دس برس کے اقسام کاشت اور قیمتوں کی سطح (حال دہ سالہ) کی حالت کا تیقن کرنے کے بعد اس کے دسویں حصہ کو بطور سالانہ مالگذاری (مال ہر سالہ) کے مقرر کیا جاتا تھا"[4]۔ اگر مقصد صرف پچھلے دس برسوں میں مالگذاری

---

[1] آئین اکبری (1)، صفحہ 348 اکبرنامہ (3)، صفحہ 282۔ آئین اکبری میں 'افزوں خواہی' یعنے جائز مطالبہ سے زائد وصولی کے خلاف انصاف طلبی کا ذکر آیا ہے۔ اکبرنامہ میں اس کا متقابل لفظ 'فاضل' (میزان جمع) ہے جاگیرداروں (جنہیں یہاں 'اقطاع دار' کہا گیا ہے) کو بقایہ کی جو کاغذات مال میں کسانوں کے ذمہ بقایۂ مالگذاری کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے شکایت رہا کرتی تھی۔

[2] اکبرنامہ، حوالہ سابقہ۔

[3] Agrarian System، 96-7، 249-54۔

[4] اکبرنامہ (3) صفحہ 2-3

کی واقعی وصولیوں کو معلوم کرنا تھا تو پیداوار اور قیمتوں کے متعلق معلومات کی فراہمی بالکل غیر ضروری تھی۔ اس مقصد کے لیے مالگذاری کے معمولی حسابات مثلاً "تقسیمیں" ہی کافی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مورلینڈ نے خاص طور پر آئین اکبری کی اس عبارت پر اعتماد کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ طریقہ یہ تھا کہ پہلے محصول دہ سالہ کو معلوم کیا جائے اور پھر اوسط نکال کر (محصول ؟) ہر سالہ معین کیا جائے۔[1] بہرحال 'ابوالفضل' نے محصول کو مالگذاری اور پیداوار دونوں ہی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔[2] بعد کے ایک ضوابط نامہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کاغذات میں جو دہ سالہ کہے جاتے تھے، ہر حال کے رقبہ کے اعداد و شمار ہوتے تھے اور ہر سالہ کاغذات میں مندرج رقبے انہیں پر مبنی تھے۔[3] لہٰذا غالباً تحقیقات کو محض پچھلی وصولیوں ہی تک محدود نہ رکھا جاتا تھا بلکہ اس کے دائرے میں مختلف اضلاع کے رقبے اور زرخیزی کے متعلق معلومات کی فراہمی بھی شامل تھی۔ چونکہ قیمتوں کی اطلاعات بھی ضروری تھیں، لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ کسی علاقہ کی پیداوار کی پچھلی شرحوں کو ہر سال معلوم کرنے کے ساتھ ساتھ قیمتوں کا ایک متوازی گوشوارہ بھی تیار کر لیا جاتا تھا تاکہ پچھلے ہر سال کی نقدی شرح مالگذاری کو معین کیا جا سکے۔ بمقابلہ وصولیٔ مالگذاری کی معلومات کے ان معلومات کو فراہم کرنا قطعی طور پر زیادہ زحمت طلب تھا۔ ہمارے علم میں آیا ہے کہ "بیسویں سے چوبیسویں برس تک کی اطلاع واقعی واقفیت کی بنیاد

---

[1] آئین اکبری (۱) صـ 348

[2] لفظ 'محصول' کے متعلق فٹ نوٹ 36 ملاحظہ ہو۔

[3] ہدایت القواعد، ورق ۱۰ ب، علیگڈھ مخطوطہ اوراق 27 ب 28 الف۔ اس ضوابط نامہ کے 'دہ سالہ' اور 'ہر سالہ' بظاہر موازنہ دہ سالہ' (یا تقسیم سنوات) اور تقسیم یک سالہ کے علی الترتیب مماثل ہیں۔ اسی تصنیف میں خود ایک موقع پر دہ سالہ کی جگہ لفظ 'تقسیم' استعمال کیا گیا ہے۔ فٹ نوٹ بالا بتہ 'تقسیم' ملاحظہ ہو جس میں اس کی موازنہ دہ سالہ سے مماثلت اور اس کی مالگذاری اور رقبہ کے کاغذات کی نوعیت پر بحث آئی ہے۔

آئین اکبری (۱) صـ 288 میں 'موازنہ دہ سالہ نقدی و جنسی' کا ذکر آیا ہے۔ اس سے کم از کم یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں مالگذاری رقمی (نقدی) کے علاوہ مالگذاری بہ شکل پیداوار (جنسی) کے متعلق بھی کچھ اطلاعات ہوتی تھیں۔ یہ بھی بہت ممکن ہے کہ آخر الذکر سے مختلف پیداواروں کے تحت رقبوں کے متعلق اطلاع مقصود ہو۔

(تحقیق)، پر اور پچھلے پانچ (برسوں) (پندرہویں۔ انیسویں) کی صادق القول اشخاص کی شہادتوں سے حاصل کی گئی تھی"[1] اس میں بدیہی طور پر ان تبدیلیوں کا حوالہ آیا ہے جو انیسویں برس رونما ہوئیں یعنی جب (بہ استثنائے بہار) پورے ہندوستان کو خالصہ میں شامل کرکے (جس میں شاہی خزانہ کے لیے مالگذاری کی وصولی براہ راست ہوتی تھی) مکمل طور پر ضبط کے تحت لایا گیا۔ مشہور تھا کہ مالگذاری کے نئے محصلوں (کڑوڑیوں) کے سپرد خاص طور پر کاشت کی توسیع کا کام کیا گیا ہے۔[2] یہ بعید قیاس نہیں کہ ایسا اس لیے ہوا کہ انہیں زراعت کے متعلق تفصیلی اطلاعات فراہم کرنا ہوتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ ہماری شہادتوں سے یہ اندازہ لگتا ہے کہ پچھلے دس برسوں کی پیداوار کی واقعی شرحوں کے اوسط پر پہلے ہر علاقہ کے لیے ایک نئی شرح پیداوار یا 'ریع' مقرر کی گئی[3] اور اس کے بعد اس نئی شرح اور معلومہ قیمتوں کی بنیاد پر پچھلے دس برسوں کی نقدی شرحوں کے نکالے ہوئے اوسط سے قطعی یا مستقل 'دستور العمل' معین کیے گئے۔ ابوالفضل کے آخری دستوروں کے گوشواروں کے باب کو آئین دہ سالہ یعنی دس برس کے آئین کے زیر عنوان رکھنے کی غالباً یہ بہترین توجیہہ معلوم ہوتی ہے۔ رقبہ کے اعداد کے اوسط کو ان دستوروں سے ضرب کرنے پر جمع دہ سالہ کے اعداد حاصل ہوتے تھے۔[4]

---

[1] آئین اکبری (1) ص 348

[2] عارف قندھاری ص 177، طبقات اکبری (2) ص 300-1، بدایونی (2) ص 189

[3] ابوالفضل کے ذہن میں شیر شاہ کی 'ریع' کے متعلق یہ کہتے وقت کہ "ان (نوں) وہ کسی بھی صوبہ کی ریع سے کم نہیں ہیں" غالباً پیداوار کی وہ شرحیں رہی ہوں گی جو مختلف علاقوں میں اس طور پر قائم کی گئیں۔ (آئین اکبری (1) ص 297)

[4] مورلینڈ کو یقین ہے کہ جبکہ جمع دہ سالہ کی بنیاد پچھلے دس برسوں کی واقعتہً وصول شدہ مالگذاری کا اوسط تھی، دستوروں کو غالباً ان نقدی شرحوں کے اوسط پر جو فی الواقعی پچھلے دس برسوں میں نافذ تھیں مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن مارلینڈ کے آئین دہ سالہ کے متن کی تعبیر کی بنیاد پر ہمیں یہ تصور کرنا ہوگا کہ اس معاملہ میں ابوالفضل کا قول حیرت انگیز طور پر غیر مربوط اور بے موقع ہے۔ اس کے خیال کے مطابق ابوالفضل ان خرابیوں کا بار بار تذکرہ کرتا ہے جن کا ازالہ ایک مستقل نقدی شرح کو قائم کرکے کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ وہ ان خرابیوں کا علاج بیان کرتے وقت صحیح راستہ سے ہٹ کر ایک بالکل ہی مختلف چیز یعنی 'جمع دہ سالہ' کا ذکر کرتا ہے۔ Agrarian System 87-289, 251-4.

باب 'آئین دہ سالہ' کی اختتامی عبارت میں بتایا گیا ہے کہ بعض پیداواروں کے آخری دستوروں کو متعین کرتے وقت عام ضابطے سے استثناء برتا جاتا تھا۔ اس عبارت کے مختلف ترجمے اور تعبیریں کی گئی ہیں لیکن حسب ذیل ترجمہ ان اسباب کی بنا پر جو فٹ نوٹ میں ظاہر کیے گئے ہیں سب سے زیادہ معقول معلوم ہوتا ہے: "اور اعلیٰ (یا "نقدی") جنسوں پر بھی مالگذاری معین (یا فرض) کی جاتی تھی۔ زیادہ مالگذاری والا برس لیا جاتا تھا۔ گوشوارہ میں اسی کے مطابق دکھایا گیا ہے۔[1] آخری جملہ کا تعلق، فوراً بعد میں آنے والے دستوروں کے گوشواروں سے ضرور ہوگا۔ پوری عبارت

---

[1] آئین اکبری (۱) ص 34 مورلینڈ نے متعدد مخطوطات سے موازنہ کرنے کے بعد بلاکمین کے متن میں ترمیمات کی ہیں ترمیم شدہ متن اس طور پر ہے "و نیز مال جنس کامل اعتبار نمود۔ سالے کہ افزون بود برگرفتند۔ چنانچہ جدول انرا بر گذاردہ"۔ بلاکمین نے پہلے تین الفاظ کو 'و بر سال' پڑھا ہے اور جہاں تک مخطوطات کا سوال ہے ان کے متن میں قطعاً اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن ان میں بہترین مخطوطات مورلینڈ کی عبارت کی تائید کرتے ہیں۔

Add. 6552 اور اتنا ہی قدیم مخطوطہ برلن، سپرنگر (۱) دونوں اس سے کلیتہً متفق ہیں (مخطوطہ برلن کے متعلق مجھے یہ اطلاع مسٹر بی۔ آر۔ گروور نے مرحمت فرمائی تھی)۔ Add. 7652 اور اس کی نقل I.O. میں الفاظ 'و ہر مال' وغیرہ تحریر ہیں جس سے کم از کم 'مال' کی موجودگی قطعی ثابت ہے۔

ابوالفضل اور دیگر حلہ ماخذ میں 'جنس کامل' کو اعلیٰ قسم کی جنسوں کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے (آئین اکبری (۱) ص 286، فرمان بنام راسکداس کا افتتاحیہ Add. 6603 ورق 57 الف) فقرہ 'اعتبار نمود' بادی النظر میں بھونڈا معلوم ہوتا ہے اور بہار عجم کے ایسی لغات میں اس کے ہم معنی محاورے نہیں ملتے۔ لیکن آئین (۱) ص 26 کی ایک عبارت میں اسی طرح کے ایک اور فقرہ سے اس کا جواز ملتا ہے جس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ گو کہ "دام" کی بمقدار روپیہ شرح "کبھی 40 داموں سے زیادہ اور کبھی کم ہو جاتی ہے لیکن تنخواہوں کی ادائیگی کے سلسلہ میں اسی قیمت کو اختیار کیا جاتا ہے (ایں قیمت اعتبار رود)۔

Jarret کے ترجمہ کو نظر انداز کرتے ہوئے جسے اب بہرحال کلیتہً متروک تصور کیا جانا چاہئے، ہمارے پاس ان تینوں جملوں کا مورلینڈ کا یہ ترجمہ موجود ہے: "اور (اعداد موسم)، 'مال جنس کامل' کا بھی لحاظ رکھتے ہوئے وہ لوگ اس سال کو لیتے تھے جو گوشوارہ کی رو سے سب سے بڑا ہوتا (Agrarian System P. 249) بقول اس کے، فقرہ 'مال جنس کامل' کا مفہوم اعلیٰ قسم کی جنس پر مطالبہ تھا یعنی پیداواروں پر عائد کی ہوئی شرح مالگذاری نہیں بلکہ ان کے تحت رقبہ پر عائد کی ہوئی مالگذاری کی رقم۔ لفظ مال کے مسلمہ طور پر دو معنی یعنی 'مالگذاری' اور شرح مالگذاری' ہوتے ہیں، لیکن 'افزون' کا ترجمہ 'سب سے بڑا' (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کو آئین اکبری کے اس سابقہ بیان کے ساتھ پڑھنا چاہیئے کہ نیل، پوستہ، پان، ہلدی، بھنگ وغیرہ قسم کی پیداواروں کے لیے کوئی 'ریع' مقرر نہیں کی گئی تھی بلکہ ان کی مالگذاری کی شرحوں کو رقموں میں براہِ راست معین کیا گیا تھا[1] اس کے علاوہ موٹا گنا یعنی پونڈا 'ریع' کی فہرست میں شامل نہیں

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اور سب سے بڑے سال کی وضاحت 'سب سے زیادہ مالگذاری کے سال سے کرنا جس کے لیے 'سال کامل' یا 'سال حاصل کامل' کی ایک قطعی اصطلاح موجود تھی، تھوڑی کھینچ تان معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ، ابوالفضل یہاں جو بات کہہ رہا ہے اس کا تعلق اگر دستور سے نہیں بلکہ جمع سے ہے تو پھر گوشوارہ کا حوالہ بے معنی ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے بعد کے گوشوارے جمع کے نہیں بلکہ دستور کے ہیں۔ مورلینڈ اسے یہ فرض کرتے ہوئے مسترد کرتا ہے کہ آئین اکبری کے پہلے مسودہ کی تیاری کے بعد اس کے مدیر نے مواد کی ترتیب میں بے حد تبدیلیاں کیں اور یہ کہ پہلے یہاں جمع کے گوشوارے تھے جنہیں بعد میں ہٹا دیا گیا (ایضاً 251 - 3) لیکن یہ تو بالکل مایوسی کا فیصلہ معلوم ہوتا ہے۔ آئین اکبری کے متعلق یہ کہنا کہ یہ "عجلت میں مرتب کی گئی" قرین انصاف ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے مضامین انتہائی احتیاط کے ساتھ ترتیب دیئے گئے ہیں اور مورلینڈ جس قسم کی سنگین غلطی اس سے منسوب کرتا ہے، اسے آسانی سے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

آخر میں ہمارے استفادہ کے لیے ڈاکٹر قریشی کی "مختصر ترین اور سب سے زیادہ سیدھی سادی تعبیر ہے" (Jour, Pak-Soc. Vol. 1, Pt. iit 215 - 6) موصوف اس سلسلہ میں "مصنفین کے بلاوجہ ٹھوکر کھانے کی مذمت کرنے کے بعد (خاموشی سے) متن کے متعلق مارلینڈ کے اٹھائے ہوئے مسائل کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ بلاکمین کے متن کے ابتدائی الفاظ 'ہر سال' کو اور اس کے قبل کی عبارت میں مندرج 'ہر سالہ' کو ایک ہی قرار دیتے ہیں۔ وہ 'جنس کامل' کے معنی "پوری فصل جو آفات دخسارہ سے متاثر نہ ہوئی ہو" تصور کرتے ہیں۔ اس کا یہ مفہوم آج تک مال کی تحریروں میں کہیں نہیں سنا گیا۔ وہ آخری لفظ 'افزوں' کے معنی 'زائد' قرار دیتے ہیں۔ اس طور پر وہ یہ تعبیر قائم کرتے ہیں۔ پچھلے دس سال کی کل جمع کی ہوئی پیداوارے محصول یا درمیانی درجہ کی پیداوار (وہ اس کے یہی معنی لیتے ہیں) کا ہر سال اوسط نکالا جاتا تھا چنانچہ ہر نئے سال کے شروع ہونے پر دوسرے سرے کا ایک یعنی پیچھے کی طرف شمار کرنے پر گیارہواں سال زائد ہو کر خارج کر دیا جاتا تھا۔ اس کی تائید میں وہ فرہنگ کاروانی علی گڈھ مخطوطہ کا حوالہ دیتے ہیں لیکن اس کتابچہ کا یا نسق کے تحت تشخیص کی ہوئی 'جمع' کے سلسلہ میں ہے جبکہ زیادہ قیاس ہے کہ ڈاکٹر قریشی کے ذہن میں ضبط کے تحت شرح مالگذاری ہے۔

[1] آئین اکبری (ا) ص 298-300

معلوم ہوتا[1] غالباً ان اشیاء کی پیداواریں ہر فصل میں اس قدر کم و بیش ہوا کرتی تھیں[2] کہ ان کی شرح پیداوار کے یقین میں کوئی عملی فائدہ متصور نہ تھا۔ ایسی صورت میں ابوالفضل کے بیان کا غالباً یہ منشا معلوم ہوتا ہے کہ ایسی پیداواروں کو مستقل دستوروں کو معین کرنے میں اوسط کے اصول پر پیداوار کی شرح مقرر نہ کی جاتی تھی بلکہ صرف بعض اچھی فصلوں کو منتخب کرکے ان کی معینہ مالگذاری کی شرحوں کو تسلیم کر لیا جاتا تھا۔

یہ بات بالکل واضح نہیں کہ آیا نوزدہ سالہ گوشواروں میں، پندرھویں سے چوبیسویں برس تک کے تحت دیئے ہوئے اعداد واقعتہً وہ دستور ہیں جو ہر سال نافذ کئے گئے تھے یا وہ ہیں جو جمع دہ سالہ کے سلسلہ میں پچھلے برسوں کے لیے معین کئے گئے تھے۔ لیکن کچھ ایسے اشارات ملتے ہیں جو آخرالذکر صورت کے حق میں ہیں۔ پندرھویں (اور بعض صورتوں میں چودھویں) برس سے صوبجاتی اور سالانہ شرحوں کے درمیانی فرق کے بہت زیادہ نمایاں ہونے کے علاوہ گوشواروں میں بہت سی نئی پیداواریں بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ سرکاری قیاس کے مطابق انیسویں سال میں بانس کی پیمائش جریب کا استعمال شروع ہونے سے بیگھہ کا ناپ بقدر 15 فیصدی بڑھ گیا تھا[3] لیکن انیسویں یا بیسویں سال کی شرحوں میں کسی متناسب اضافہ کا پتہ نہیں چلتا۔[4] اس کی بہترین توجیہ

---

[1] اس فہرست میں گنّے کو قند سیاہ کے تحت جس کے واقعی معنی گڑ ہوتے ہیں دکھایا گیا ہے (آئین اکبری (1) ص 299) ممکن ہے۔ جبکہ سیاہ یا موٹے گنے یا پونڈے کے بجائے یہ سہواً لکھ دیا گیا ہو۔ لیکن اگر ایسا ہے تو پھر فہرست میں معمولی گنّے کا کوئی اندراج نہیں تھا۔

[2] پیداوار کے حاصل کے متعلق عدم یقین، بعض نقدی فصلوں کی گرانی کا خاص سبب تھا۔ چنانچہ نیل کی کاشت کو "بمقابلہ اور فصلوں یا پیداواروں کے آفات اور حادثات کا زیادہ خطرہ لاحق رہا کرتا تھا۔" Pelsaert, P-13

[3] آئین اکبری (1) ص 296 میں بتایا گیا ہے کہ پہلے جو بیگھہ استعمال میں تھا وہ اپنے صحیح ناپ سے بقدر 13 فیصدی چھوٹا تھا۔ 1757ء کے ایک پروانہ میں جو بٹالہ کے زمرۂ دستاویزات مدد معاش میں ملتا ہے 1567ء کی ایک معافی کی توثیق کے ساتھ ساتھ اس کی تصدیقی عبارت کی بھی نقل ملتی ہے جس سے طناب (پیمائشی ڈنڈے) کی وجہ سے معافی کے رقبہ میں 13/03 فیصدی کی تخفیف کا پتہ چلتا ہے (I.O. 4438 : J 55) ضمیمہ الف بھی ملاحظہ ہو۔

[4] یہ صورت یکساں یا تقریباً یکساں رہنے والی نرخوں کی پیداواروں مثلاً خشخاش، (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ ہم یہ خیال کریں کہ یہ وہ اعداد تھے جو چوبیسویں برس جبکہ رقبہ کی اکائی کا ناپ یکساں تصور کیا گیا تھا نکالے گئے تھے۔

آخری دستور جن کی تفصیل نقل آئین اکبری میں موجود ہے[1] نوزدہ سالہ شرحوں کی جدولاتی شکلوں میں ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ خانوں کے سروں پر برسوں کے بجائے محالوں کے مجموعوں کا اندراج ہے اور اس کے اندراجات اب صرف واحد اعداد پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ محالوں کے ہر مجموعہ کے لیے جو تشخیص کا ایک حلقہ تصور کیا جاتا تھا ہر پیداوار کا ایک نرخ یا دستور ہے۔ آئین اکبری میں ان حلقوں میں شامل متعدد محالوں کی مکمل فہرست موجود ہے[2] بقول مارلینڈ ان میں کا ہر حلقہ معمولاً زراعت کے حالات کے اعتبار سے ایک ہم جنس علاقائی ٹکڑا ہے[3]

ابوالفضل کی تحریر اور نیز گوشواروں کی نوعیت سے بداہتہً تو نہیں مگر اشارۃً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قطعی دستور مستقل ہوا کرتے اور موجودہ پیداوار کے حاصل یا ان کی قیمتوں کا لحاظ کئے بغیر نافذ کئے جاتے تھے جس سے ہر سال شرح مالگذاری کو رقموں میں تبدیل کئے جانے کے باعث جو الجھن اور پریشانیاں پہلے لاحق ہوا کرتی تھیں وہ اب ختم ہو گئیں[4] یہ بہرحال ممکن ہے کہ وقتاً فوقتاً نظر ثانی کی جاتی رہی ہو اور آئین اکبری میں جو قطعی دستور درج ہیں وہ بعینہٖ چوبیسویں برس کے قائم کئے ہوئے دستور نہیں بلکہ چالیسویں یا اس کے قریبی برس کے دستور رہے ہوں۔ سنگھاڑہ اور ہلدی کے دستور جو قطعی گوشواروں میں تقریباً یکساں ہیں بمقابلہ نوزدہ سالہ شرحوں کے اعداد کے اکیسویں برس میں گز الٰہی کے رائج ہونے کے باعث بیگھہ کے ناپ میں اضافہ کے تناسب سے بڑھے ہوئے ہیں[5] مورلینڈ نے بتایا ہے کہ دونوں گوشواروں کے اندراجات کے فرق کے سبب سے خود ان اعداد سے یہ جانچ کرنا مشکل ہے کہ آخری دستور پندرھویں سے چوبیسویں برس کی شرحوں کے اوسط پر قائم کئے گئے تھے

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

خربوزہ (وسط ایشیائی اور ہندوستانی) پیاز، پونڈا، اگنا، ہلدی، سنگھاڑہ وغیرہ کے متعلق سب سے زیادہ واضح ہو۔

[1] آئین اکبری (۱) صفحہ 85-348

[2] اس وجہ سے Elliot کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ دستور، سرکار اور پرگنہ کے درمیان کی کوئی علاقائی اکائی ہے (Memoirs, &c.) موازنہ بہ مورلینڈ 'JRAS' 1918 صفحہ 3 و 12 میں۔

[3] Agrarian System 88 [4] Agrarian System 899

[5] آئین اکبری (۱) صفحہ 297 میں بیگھہ کے اضافہ کو بمقابلہ سابق رقبہ کے 10/41 بتایا گیا ہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

یا نہیں[1] مگر اب بھی کچھ ایسے آسان طریقے موجود ہیں جن سے اس قسم کی جانچ کی جا سکتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیگھہ کے ناپ میں اضافہ کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی نقدی پیداواروں کے بعض آخری دستوروں کا جو اوسطوں کے ذریعہ معین نہیں کئے گئے تھے۔ پندرھویں سے چوبیسویں برس[2] کی دس سال کی مدت کی شرحوں میں سے کسی پر بھی مبنی ہونا ممکن نہ تھا جبکہ دوسری پیداواروں کے معاملہ میں آخری دستوروں میں سے کم از کم چند کے اوسط ان برسوں کی شرحوں پر نہ نکالے جا سکتے تھے[3] اگر ہم اس نقطۂ نگاہ سے متفق ہوں کہ آخری دستوروں کو ان برسوں کی پچھلی شرحوں کے اوسط پر معین کیا گیا تھا تو ان منفی نتائج کی توجیہہ صرف دو طریقوں پر کی جا سکتی ہے۔ یا تو جو کہا گیا ہے اس کے باوجود

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

لیکن زمرہ بٹالہ کی مدد معاش کی معافیوں (I.O. 4438 نمبر 7، 25 اور 55) اور نیز الہ آباد 879 و 1177 میں نئے گز کے باعث سابقہ عطیات کے رقبہ میں 5 ,10 فیصدی کی کمی محسوب کی گئی ہے جس سے پیمانہ کی اکائی میں 7 ,11 فیصدی کے اضافہ کا پتہ چلتا ہے (ضمیمہ الف بھی ملاحظہ ہو) نوزدہ سالہ شرحوں میں سنگھاڑہ اور ہلدی کا نرخ مسلسل طور پر 100 دام بتایا گیا ہے۔ لیکن آخری دستوروں میں محض چند مستثنیات کو چھوڑ کر یہ عدد بڑھا کر 111 دام 20 جیتل دکھائی گئی ہے مگر نقطوں کے غلط استعمال سے بعض صورتوں میں اس عدد کو 111 دام یا 115 دام 8 جیتل، یا 115 دام 20 جیتل پڑھا جا سکتا ہے۔

[1] Agrarian System, 89

[2] پونڈے یا موٹے گنے کی پندرھویں سے چوبیسویں برس تک 200 دام کی یکساں شرح اودھ، لاہور اور ملتان میں قائم رہی، حالانکہ اودھ کے لیے آخری دستور 230 دام 8 جیتل سے 240 دام 9 جیتل تک اور ایک دستور میں 180 دام $12\frac{1}{2}$ جیتل سے (چھ دستوروں میں بشمول ایک کے جو لاہور کے لیے 240 دام $12\frac{1}{2}$ جیتل بتاتا ہے) 240 دام 12 جیتل تک ہیں۔ ملتان میں بھی دو دستوروں میں 240 دام $12\frac{1}{2}$ جیتل کی عدد ہے۔ لاہور اور ملتان کی دس برس کی شرحوں میں نیل کے لیے سب سے زیادہ عدد 136 دام کی ہے۔ لیکن ان دونوں صوبوں میں مستقل دستور بڑھا کر علی الترتیب 158 دام 19 جیتل اور 159 دام 22 جیتل تک پہنچے ہیں

[3] جانچ کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ اگر آخری دستوروں کو پندرھویں سے چوبیسویں برس کی مدت کی شرحوں کے اوسط پر معین کیا گیا ہے تو پھر بیگھہ کے ناپ میں 11 فیصدی کے اضافہ کا لحاظ رکھنے کے بعد ان میں سے کسی ایک کو بھی اس صوبہ کی انتہائی سالانہ شرحوں کے اوسط سے زیادہ اور کم از کم شرحوں سے کم نہ ہونا چاہئے۔ غالباً حسب ذیل گوشوارہ سے صورت حال خود واضح ہو جائے گی۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

آئین اکبری کی پندرہویں سے چوبیسویں برس تک کی شرحیں پچھلی شرحیں نہیں بلکہ وہ شرحیں ہیں جو واقعۃً عائد کی گئیں یا پھر زیادہ معقول بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ مستقل شرحوں کی ابتدائی ترتیب کے سولہ برسوں کے دوران دستوروں میں بہت زیادہ تبدیلیاں کی گئیں۔

مستقل دستوروں کے نفاذ کا یہ مطلب تھا کہ شرح مالگذاری کو ہر برس کی اچھائی یا برائی سے بالکل بے نیاز کر دیا جائے فصل کے خراب ہونے کی صورت میں راحت رسانی کی غرض سے شرحوں

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

گوشوارہ نمبر ایک

صوبہ	پیداوار	الف: تیج مابعد (زیادہ سے زیادہ شرحوں کا اوسط)	ب: قطعی دستوروں میں انتہائی	ب : ل
الہ آباد	کابلی چنا	56٫40 دام	دام 14 جیتل (5 دستوروں میں)	126 فیصدی
″	کسم	70٫00 دام	83 دام 21 جیتل (4 ″)	6 اا فیصدی
″	تل	47٫00 دام	101 دام (1 ″)	215 فیصدی
اودھ	عدس، مسور	22٫70 دام	35 دا 20 جیتل (1 ″)	156 فیصدی
″	مٹر	27٫35 دام	38 دام (1 ″)	135 فیصدی
دہلی	اجوائن	71٫20 دام	89 دام 15 جیتل (1 ″)	122 فیصدی
			89 دام 12 جیتل (1 ″)	

گوشوارہ نمبر دو

صوبہ	پیداوار	الف: کم از کم شرحوں کا اوسط	ب: الف × $\frac{11}{100}$	ج: آخری دستوروں میں کم از کم
الہ آباد	چنا ارزاں (ربیع)	15٫20 دام	16٫87 دام	15 دام 19 جیتل (ایک دستور)
اودھ	″	15٫10 دام	16٫76 دام	7 دام 22 جیتل (ایک دستور)
				15 دام 3 جیتل (ایک دستور)

ان اعداد کا استعمال بلاک مین کے متن کو .Ain 7652 اور 52 65 سے موازنہ کرنے کے بعد مشتبہ اندراجات کو نظر انداز کرتے ہوئے کیا گیا ہے کابلی چنے اور اجوائن کے علاوہ بقیہ سب پیداواریں شیر شاہ کی 'ریئ' میں درج ہیں۔

میں تخفیف نہیں بلکہ آراضی پیمودہ میں نابود (لفظاً، برباد) کے تحت کمی کر دی جاتی تھی[1] قیمتوں کے گر جانے کی صورت میں، امداد رسانی کا کوئی انتظام نہ تھا اور پیداوار کے غیر معمولی طور پر زیادہ ہونے کی صورت میں دربار شاہی سے خصوصی چھوٹ کے احکام صادر ہوا کرتے تھے[2] دوسری طرف قیمتوں کے چڑھنے کی صورت میں مطالبات میں اضافہ کی بھی ایک مثال ملتی ہے[3]

سترھویں صدی کے دوران نظام ضبط، بنیادی طور سے انہیں خطوط پر چلتا رہا، مثلاً 1679ء کے ایک ضوابط نامہ میں اسے تشخیص کا ایک ایسا طریقہ بتایا گیا ہے جس میں ہر فصل پر زمین کی پیمائش کرنے کے بعد اس پر دستور العمل کو منطبق کر کے جمع معلوم کی جاتی تھی[4] اس سے اور بھی زیادہ واضح نمونۂ تشخیص کے وہ کاغذات ہیں جو اس میں اور اسی دور کے دیگر ضوابط ناموں میں محفوظ ہیں ان میں

---

[1] پیمائش مکمل ہو جانے کے بعد پیداوار کے نقصان کی اطلاع موصول ہونے کی صورت میں، عمال مال کے لیے ضروری ہوتا تھا کہ وہ کھڑی فصل کا معائنہ کر کے 'نابود' کا تعین کریں اور فصل کٹنے کے بعد اطلاع ملنے کی صورت میں پڑوسیوں اور نیز کاغذات پٹواری کی شہادت پر رقبہ میں تخفیف کرنا ہوتا تھا (آئین اکبری (1)، ص 286-8) ٹوڈر مل نے ستائیسویں سال کی اپنی تجاویز میں زرخیز علاقوں کے لیے کثرت بارش کی صورت میں بحد 'نابود' $2\frac{1}{2}$ بسوہ فی بیگھہ (یعنی آراضی پیمودہ کا $12\frac{1}{2}$ فیصدی) کی انتہائی تخفیف کی سفارش کی تھی۔ جنگل اور ریگستان زمین کے لیے 3 بسوہ 15 فیصدی کی تخفیف کی اجازت تھی (اکبر نامہ (3)، ص 382 ملاحظہ ہو .Add 27247 ورق 332 الف میں تجاویز کی اصل عبارت)

[2] اکبر نامہ (3)، ص 463، 494، 533.4، 577-8 یہ (چھوٹیں) تیسویں، اکتسویں، اور پینتسویں برس میں کی گئی تھیں اور ان کا اطلاق صوبہ جات الہ آباد، اودھ، آگرہ اور دہلی پر کیا گیا تھا۔ یہ کل مطالبہ کے بقدر $\frac{1}{10}$ سے لے کر $\frac{1}{10}$ تک تھیں۔

[3] جب اکبر نے اپنا دربار لاہور منتقل کیا تو پنجاب کا مطالبۂ مالگزاری بڑھا کر دربار شاہی کی وہاں موجودگی کے باعث قیمتوں کے اضافہ کے پیش نظر دس سے بڑھا کر بارہ کے تناسب میں کر دیا گیا۔ جب اکبر تینتالیسویں برس لاہور سے منتقل ہوا تو یہ اضافہ واپس لے لیا گیا (اکبر نامہ (3)، ص 747)

[4] فرہنگ کاردانی ورق 32 ب Edinburgh 83 ورق 34 ب مالگذاری (عمل) عائد کرنے کے "نظام کے تحت سفید باری (موسم خزاں) اور سبز باری (موسم بہار) کی پیداواروں پر دستوروں کے اطلاق کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو، مظہر شاہجہانی ص 13، 14 بھی۔

ہیں پہلے خسرۂ ضبط یعنی وہ کاغذات ملتے ہیں جن میں پیمائش کی تفصیلات درج ہیں[1] اس میں چھ خانے ہیں (۱) آسامی یعنی کاشتکار کا نام اور اس کی پیداوار۔ اس کے بعد کے دو خانوں میں اس کے کھیت کی چوڑائی اور (3) لمبائی درج ہے (4) اراضی یا رقبہ (5) نابود اور (6) باقی یعنی جو آخی سے نابود کو وضع کرنے کے بعد بچے۔ ہر پیداوار کے خالص رقبہ کو علیحدہ علیحدہ دوسرے کاغذ پر لکھ کر متعلقہ پیداوار کی نقدی شرح فی بیگھہ کو ان پر تشخیص شدہ مالگذاری (زمع) کی میزان معین کرنے کی غرض سے منطبق کیا کرتے تھے[2]

انتظامی نقطۂ نگاہ سے نظام ضبط میں کچھ بدیہی خوبیاں تھیں۔ اس میں پیمائش کی ہمیشہ از سرنو جانچ کی جا سکتی تھی اور دستوروں کے مستقل ہونے کی وجہ سے مقامی عمال اپنے بیشتر اختیارات تیزی سے جنہیں بصورت دیگر وہ بیجا طور پر استعمال کر سکتے تھے محروم ہو جاتے تھے مستقل دستوروں کے نفاذ کی وجہ سے مطالبات کی سالانہ تشخیص کی عدم یقینیاں اور تغیرات بھی کافی حد تک ختم ہو جایا کرتے

---

[1] ملاحظہ ہو آئین اکبری (۱) ص 288 "ضبط کے کاغذات (نسخۂ ضبط) جو ہندی میں خسرہ کہلاتا ہے"

[2] دستور العمل نویسندگی، اوراق 182 الف 185 الف، فرہنگ کاروائی ورق 33 ب، سیاق نامہ 32-34 خلاصۃ السیاق اوراق 75 الف، 76 ب، Or. 2026 اوراق 24 ب 28 الف۔ فرہنگ کاروائی، سیاق نامہ کے خسروں کے نمونہ میں 7 خانے ہیں۔ پہلا (آسامی) جس میں کسانوں کے صرف نام درج ہیں۔ پیداوار (جنس) آخری خانہ میں درج ہے۔ دستور العمل نویسندگی، عہد شاہجہانی کی تصنیف ہے اور غالباً سرکار سنبھل میں لکھی گئی تھی۔ اس میں ضبط کے تحت تین پیداواریں درج ہیں یعنی تمباکو، گنا اور بینگن۔ آئین اکبری (۱) ص 286 میں آیا ہے کہ اعلیٰ قسم کی یا نقدی پیداواروں پر تشخیص ایسی صورت میں بھی کہ وہ ایسی زمینوں پر جو پہلے دیگر نظاموں کے تحت تھیں بوئی جائیں ضبط ہی کے تحت کی جائیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ایسی زمین پر جو پہلے غلہ بٹائی پر رہی ہو اعلیٰ قسم کی پیداواروں کے بوئے جانے کی صورت میں پہلے سال مالگذاری معمول کے دستور سے ایک چوتھائی کم وصول کرنا چاہئے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مغلوں کے نظام 'ضبط' کی موجودہ واحد علامت یعنی لگان ضبطی کو جو اس وقت پنجاب، بالائی دوآبہ اور روہیلکھنڈ میں پائی جاتی ہے ایسی نقدی لگان بتایا گیا ہے جو مخصوص طور پر نقدی پیداواروں پر بہ اعتبار رقبہ عائد کی جاتی ہوں، حالانکہ یہ چارہ اور ایسی دوسری پیداواروں پر بھی عائد کی جاتی تھیں جو روز کی روز بیچ کی جاتی تھیں۔ (Princep, History of the Punjab &c.) (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اس کے ساتھ ساتھ اس نظام میں کچھ خرابیاں بھی تھیں۔ غالباً اسے ان مقامات پر جہاں کی زمینیں بہ اعتبار پیداوار کی ایک قسم کی نہ ہوں اور نیز ایسے مقامات پر بھی جہاں کی پیداوار بہت زیادہ غیر یقینی ہو بہ سہولیت نافذ نہ کیا جا سکتا تھا کیونکہ اس میں تمام تر خطرات کسان ہی کو بھگتنا پڑتے تھے[1] اس کے علاوہ اس کا طریقہ کسی طور پر بھی کم خرچ طلب نہ تھا (کیونکہ اس میں فی بیگھہ ایک دام کا محصول بطور 'ضابطیانہ' پیمائش کروانے کے مصارف کے لیے وصول کیا جاتا تھا[2]) لیکن اس طریقہ کے عمل میں اس سے بڑھ کر خرابیوں کی گنجائش تھی۔ پیمائش کے اندراجات میں بھی زیادہ دھوکہ کا امکان پایا جاتا تھا[3]

اکبر کے تیرھویں سال کے قبل کے 'ضبط ہر سالہ' یا سالانہ پیمائش کے سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ "بیحد مصارف

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ج ا۔ لندن 46 :18ء، صـ167 Meerut District Guzettier 1912، صـ109 Saharanpur District Gazatteer 1921، صـ132 ، JRAS 1918، صـ26 Agrarian System 169 (نوٹ)

[1] ابوالفضل اپنے قندھار کے باب میں یہ کہتے ہوئے کہ کسان میں "ضبط" کے برداشت کی طاقت نہ ہونے کی صورت میں 'پیداوار کا ایک تہائی (سہ کوہ عمل) بطور مالگذاری وصول کیا جاتا تھا' اس بات کا ضمناً اعتراف کرتا ہے۔
(آئین اکبری (1) صـ587)

[2] آئین اکبری (1) صـ300-301 سے ہمیں اطلاع ملتی ہے کہ پہلے پیمائش کرنے والی جماعت کو 58 دام یومیہ بطور "ضابطیانہ" ملا کرتا تھا (خزانہ سے یا گاؤں سے؟) پھر اسے ایک دام فی بیگھہ کے محصول کی شکل دی گئی۔ ٹوڈر مل کے ضابطوں میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ پیمائش کرنے والے عملہ کے یومیہ گذارہ کو بہ شکل نقد وجنس اسی محصول سے پورا کرنا چاہیے (اکبر نامہ (3) صـ383) پیمائش کرنے والے عملہ کے گذارہ کی ترمیم شدہ شرح میں آئین اکبری (1) صـ286 میں درج ہیں۔ ٹوڈر مل کے ضابطوں میں عملہ کو یومیہ پیمائش کرنے کے لیے رقبہ کی کم از کم مقدار معین کی گئی ہے۔ اکبر نامہ کے متن میں فصلوں کو آپس میں ادل بدل دیا گیا ہے۔ آئین اکبری (1) صـ301 میں صحیح عبارت ملتی ہے۔ فصل خریف میں جب دن بڑا ہوتا ہے تو 250 بیگھوں کی پیمائش ضروری تھی اور ربیع میں دن کے چھوٹے ہونے کے باعث 200 بیگھہ کافی تھا۔ بدقسمتی سے ٹوڈر مل کے ضابطوں کے اصل متن Add. 27247، ورق 332 ب میں یہ عبارت بے حد تصحیف شدہ ہے۔

[3] ملاحظہ ہو کندرام کا دیا ہوا ایک حوالہ جس میں کسی جاگیردار کے اہل کے افسر کے مظالم کا بیان ہے: "آراضی کی لمبائیوں کو اتر کی طرف سے ناپتے تھے۔ ایک بیگھہ کو 20/15 نہیں) کٹھے تصور کیا جاتا تھا اور لوگوں کے احتجاج پر توجہ نہ دی جاتی تھی"[4] 'Sukumar Sen, 'History of Bengali Literature'

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کی ضرورت پیشوائی" اور "خالصہ کے لوگوں نے تصرف بیجا کیا۔[1] انیسویں برس کے تجربہ کروڑی کا
اہم پہلو ہندوستان کے تمام صوبوں کو زیر پیمائش لانا تھا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر سن کی رسی کے بجائے
جس کے استعمال میں فریب کاری کا امکان تھا، زیادہ صحیح طریقہ یعنی بانس کی جریب مع آہنی حلقوں کے
رائج کی گئی۔[2] اس کے باوجود بھی بقول بدایونی، کروڑی، کسانوں پر دلخراش مظالم ڈھاتے تھے[3] اور
ہم ان مظالم کو قدرتی طور پر اس قدر وسیع و عریض علاقہ پر ایک ناگہانی عمل پیمائش کے مسلط کیے جانے
سے متعلق کر سکتے ہیں۔ ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب ادنیٰ درجہ کے ملازمین پر مشتمل پیمائش کرنے
والوں کی کوئی ٹولی مواضعات پر مسلط ہو کر اپنے لیے بالائی رقوم اور صحیح اور نیز غلط اندراجات کرنے
کے لیے روپیہ پیسہ کی وصولی شروع کر دیتی تھی تو ان مواضعات میں کیسا تشویشناک ہنگامہ برپا ہوتا ہوگا
تشخیص کے اس طریقہ کی، جسے نسق کہتے تھے، صحیح نوعیت حد درجہ نزاعی رہی ہے۔ ابوالفضل نے اس کا
متعدد مقامات پر حوالہ تو دیا، مگر اس کی تشریح کہیں نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس اصطلاح کی تعبیریں
کی تعداد اس کے تمام حوالوں کی تعداد سے غالباً زائد ہے اور باوجودیکہ ان کی فہرست طویل ہے مگر
ان میں سے کوئی بھی معقول نہیں معلوم ہوتی۔[4] اس سلسلہ میں ابھی تک جو مختلف نقطہ نگاہ سامنے

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)

1960، ص 124 (عبارت کے متن کے لیے نیز ص 393) ملاحظہ ہو T. Rev Chandhvi, 'Bengali under Akbar and Jahangir' ص 35

[1] اکبرنامہ (2)، ص 333

[2] (3)، ص 117-18، آئین اکبری (1)، ص 296 سن کی رسی بھیگنے پر سکڑ کر چھوٹی اور خشک ہونے پر بڑی ہو جاتی تھی۔ لہٰذا عمال رسی کو کسی نہ کسی "بہانے" سے بھیگا رکھتے تھے

بدایونی (2)، ص 189

[3] بدایونی (2)، ص 187

[4] ذیل میں "نسق" کے متعلق تقریباً پچھلے ایک سو برس کی مدت میں جس قدر بھی نقطہ نگاہ پیش کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ (جو غالباً جامع نہیں ہے) پیش کیا جاتا ہے۔ نجف علی خاں نے 1851ء میں آئین اکبری کی شرح میں اس کے معنی "انگزاری کے ٹھیک کے لیے ہیں (شرح آئین اکبری" 16.67 اوراق 177 الف، 178 الف 193 الف) بلاکمین اپنے ترجمہ میں اسے ایک ایسا طریقہ بتاتا ہے کہ جس کے ذریعہ محصل، رعیت کے ساتھ زمین کا محصول طے کرتا ہے (JASB (42) 1873ء، ص 219 نوٹ) مورلینڈ اور یوسف علی نے اس کی کوئی قابل اطمینان تعریف بیان کرنے سے بالاتفاق معذوری ظاہر کی ہے۔ لیکن مورلینڈ کا خیال تھا کہ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

آئے ہیں ان پر بحث کی طوالت سے بچتے ہوئے، ہم نے یہ مناسب خیال کیا ہے کہ ہم براہِ راست ابوالفضل کی شہادت پر متوجہ ہوں۔

ابوالفضل کے تمام حوالوں کو یکجا کرنے کے بعد نسق کے متعلق جو پہلا تاثر پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ سرے ہی سے تشخیص کا کوئی جداگانہ طریقہ نہیں بلکہ دیگر طریقوں کا ایک محض ضمیمہ تصور کیا جاتا ہے، مثلاً یہ ہندوستان میں ضبط کا اور کشمیر میں غلہ بٹائی کا ایک تحتی طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ مالگذاری کی تشخیص و وصولی کا بنیادی مروّجہ طریقہ خواہ کوئی بھی ہو، یہ ایک ایسا طریقہ یا ضابطہ تھا جو اختیار کیا جا سکتا تھا۔

نسق کے ضبط کے تحت اختیار کیے جانے کی صورت میں، اس کے مفہوم کو بظاہر بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے سب سے ابتدائی حوالہ میں بتایا گیا ہے کہ عہد اکبری کے تیرھویں برس خالصہ کی زمینوں میں شہاب الدین خاں نے "ضبط ہر سالہ" کو ختم کر کے نسق (کا ایک نظام یا اس کی ایک ایک شکل) (نسقے) قائم کیے۔[1] یاد رہے کہ جس شکل میں 'نسق' نافذ کیا گیا وہ عام ضبط کی جگہ نہیں بلکہ صرف "سالانہ ضبط" کی جگہ تھا۔ ضبط کے دو اجزا ہوتے تھے۔ مالگذاری کی مستقل نقدی شرحیں اور زمین کی پیمائش، ہمیں یہ قطعی طور پر معلوم ہے کہ مالگذاری کی شرحیں چوبیسویں برس تک سالانہ مقرر کی جاتی رہیں، لہٰذا تیرھویں برس میں 'نسق' نے جس چیز کو بے دخل کیا وہ صرف سالانہ پیمائش ہی ہو سکتی تھی۔ یاد رہے کہ بہرحال ضبط کے صحیح اصطلاحی معنی زمین کی پیمائش کے تھے اور مدد معاش کے کاغذات میں الفاظ

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

یہ عام طور پر بمقابلہ رعیت واڑی کے ایک زمینداری انتظام تھا (JRAS 1918، ص 29-30) اس کے بعد اس نے اس کے معنی موضع یا کسی بڑے رقبہ کی ایک اکائی پر سرسری تشخیص خیال کیے ہیں (JRAS 1926، ص 47) اور بالآخر اس نے اسے اُس طریقہ کا مرادف تصور کیا ہے جسے وہ مجموعی تشخیص کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ (Agrarian System 234-37) ڈاکٹر آر۔ پی۔ ترپاٹھی اس کا سرسری تشخیص ترجمہ کیے جانے سے مطمئن نہیں ہیں اور ساتھ ساتھ انہوں نے خود بھی اس کا کوئی مفہوم بتانے سے معذوری ظاہر کی ہے (Muslim Administration 357-60) ایس۔ آر شرما کے خیال کے مطابق یہ ایک ایسا طریقہ تھا جس میں سابقہ مطالبہ کے اوسط پر مالگذاری کی تشخیص کی جاتی تھی (Indian Culture، 1، ص 43-5) اور آخر میں ڈاکٹر سرن اسے کنکوت کا مرادف بتاتے ہیں (Provincial Govt. &c. 301-9، 453-7)

[1] اکبرنامہ 2، ص 333

'ضبط ہر سالہ' سے زمین کی سالانہ پیمائش مراد ہوتی تھی[1] شہاب الدین خاں نے جو کچھ تیرھویں برس میں کیا، ٹوڈرمل نے ستائیسویں برس میں دوبارہ انہیں کی سفارش کی۔ وہ کہتا ہے کہ "معلوم ہے کہ خالصہ کے پرگنوں میں رقبہ (مندرجہ (آراضی) ہر سال کم ہو جاتا ہے (لہٰذا) زمین مزروعہ کی ایک بار پیمائش ہونے کے بعد ان لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اسے (رقبہ) سال بہ سال بڑھا کر" جزوی نسق (نسق جزو) قائم کریں[2] یہاں یہ بات بالکل واضح کی گئی ہے کہ گو کہ نسق کا مفہوم سالانہ پیمائش کو بے دخل کرنے کا تھا پھر بھی تشخیص کا کام کسی پچھلے ایک سال کی پیمائش کے اندراجات ہی کی بنیاد پر انجام پاتا رہا۔ آئین اکبری میں اس کا بیان اس کی جس آخری شکل میں ملتا ہے وہ اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ محصل مالگذاری کے لیے لازم تھا کہ "پیمائش کے کام میں دور اندیشی اور انصاف سے کام لے اور ہر جگہ کاشتکار کی صلاحیت (زیرو) میں اضافہ کرے اور معاہدہ (قرارداد) کا پاس کرتے ہوئے مزروعہ (آراضی) سے کچھ بھی زائد (فزون کاشتہ) نہ طلب کرے[3]۔ اگر کچھ لوگ پیمائش اور کچھ لوگ نسق چاہیں تو اسے اس کو منظور کر لینا چاہیئے[4]۔ اس عبارت کا ایک ہی مفہوم ہو سکتا ہے یعنی یہ کہ حکام مال کو پہلے سے متعین شدہ آراضی کو تسلیم کر کے اسے قیاساً اندازہ سے بڑھانا ہوتا تھا۔ اگر بعض کسان اسے قبول نہ کر کے دوبارہ پیمائش کے خواہشمند ہوتے تو اسے ان کی اس خواہش کی تعمیل کرنی ہوتی تھی ورنہ 'نسق' نافذ کیا جاتا تھا۔ بالفاظ دیگر، ان عبارتوں میں 'نسق' کا ضبط کی سالانہ پیمائش کی ایک متبادل صورت کے طور پر بیان کیا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ رقبوں کے انہیں اعداد کو جنہیں پہلے سے واقعی پیمائش کر کے

---

[1] عمال مال کے نام میاری تاکید میں اسے استعمال کیا گیا ہے۔ "معافی کے رقبہ کے حدود کے تعین کے بعد 'ضبط ہر سالہ' پر اصرار نہ کرنا چاہیئے"۔ 'ضبط ہر سالہ بعد از تشخیص یک "( ) (عہد حکومت کے آٹھویں سال کا فرمان جہانگیری ملاحظہ ہو نیز I.O. 4438 (3) I.O. 4435)

[2] اکبرنامہ (3) 381-2 تجاویز ٹوڈرمل کے اصل متن کی متقابل عبارت (Add. 27247، ورق 331 ب) کا مفہوم عملاً یہی ہے سوائے اس کے کہ اس میں 'نسق جزو' کے بجائے "نسق" درج ہے۔

[3] یہاں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ بوائی اور کٹائی کے درمیان 'واقعی پیمائش کے تحت' زائد مزروعہ" کی کوئی آراضی نہ ہو سکتی تھی۔ یہ زائد مزروعہ صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا تھا جبکہ مالگذاری تشخیص کی ہوئی آراضی کا کاغذ پر تعین سابقہ پیمائشوں کی بنیاد پر ہوا ہو۔

[4] آئین اکبری (1) ص 285،

معین کرلیا گیا تھا بعد کے آنے والے برسوں میں مالگذاری کی تشخیص کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

اندراج آراضی سے 'نابود' یا نقصان فصل کی آراضی کو منہا کرنے کے بعد مابقی کے نسخۂ نسق یا 'دستاویز نسق' کے قطعی مفہوم میں استعمال کیے جانے کو غالباً ہم اعداد آراضی کے تکرار اور 'نسق' کے درمیان پائے جانے والے اس تعلق ہی سے بہترین طور پر سمجھ سکتے ہیں۔[1] آئین اکبری کے اسی باب میں نسق کا ایک اور حوالہ ملتا ہے۔ یہ ایک عمل گذار کے نام ہدایت میں ہے جس میں اسے "موضع کے بڑے لوگوں کے ساتھ نسق کرنے سے منع کیا گیا ہے۔"[2] نسق کا اجتماعی تشخیص کے مرادف ثابت ہونا تو درکنار، یہ (ہدایت) تو یہ ظاہر کرتی ہے کہ نسق اپنی مستند شکل میں اجتماعی تشخیص نہ تھا۔ ضبط کے تحت 'نسق' کے متعلق ہماری دیگر اطلاعات کی روشنی میں اس ممانعت کا غالباً مخصوص مفہوم یہ ہے کہ عمال مال کو اجازت نہ تھی کہ وہ گاؤں کے سربرآوردہ لوگوں سے معاملہ کر کے آراضی کے معیاری اعداد میں ترمیمات یا اضافہ کریں۔

ضبط کے تحت نسق بہرحال نسق کی صرف ایک شکل ہوتی تھی۔ لہٰذا ابوالفضل اسے 'نسقے' یعنی ایک نسق (کی شکل) اور 'نسق جزو' یعنی ادھورے نسق کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ گجرات میں گو وہ صحیح معنوں میں ایک ضبطی صوبہ نہ تھا مگر غالباً اسی نوعیت کا 'نسق' رائج تھا۔ آئین اکبری میں "اس کے بیشتر حصے کو نسقی (زیر نسق) بتایا گیا ہے۔" یہاں "پیمائش" کا بہت ہی کم رواج تھا۔[3] جیسا کہ ہم اگلی فصل میں دیکھیں گے وہ پیمائش جس کے بالمقابل نسق کو بتایا گیا ہے۔ اصل میں سالانہ پیمائش تھی اور پیمائش شدہ زمین کے اعداد و شمار کا نہیں بلکہ اسی سالانہ پیمائش کا استعمال بظاہر گجرات میں تشخیص مالگذاری کے سلسلہ میں بہت کم رائج تھا۔

لیکن برار، بنگال اور کشمیر میں نسق ضرور مختلف صورتوں میں رائج رہا ہوگا۔ ہماری اطلاع ہے کہ برار ایام قدیم سے "نسقی" تھا۔[4] چنانچہ یہاں نسق کی اصطلاح کا اطلاق ایک ایسے طریقہ پر

---

[1] "نسخۂ نسق کے دربار بھیجدیئے جانے کے بعد کھیتی کو اگر کوئی نقصان پہونچے تو ضروری ہوتا کہ وہ فوراً تحقیقات کرے" (آئین اکبری (۱) صفحہ 286-7)

[2] آئین اکبری (۱) صفحہ 286

[3] ایضاً صفحہ 485

[4] ایضاً صفحہ 478

ہوتا تھا جو مغلوں کی جدت سے متاثر نہ ہوا تھا۔ یہ صادق خاں کے بیان کے مطابق مغلیہ دکن میں مالگزاری عائد کرنے کے قدیم طریقہ کے ضرور متماثل تھا۔ اس طریقہ کے تحت آراضی زیر کاشت یا واقعی فصل کا لحاظ کئے بغیر شرح معمول کو گاؤں میں ہلوں کی تعداد پر عائد کیا جاتا تھا۔[1] بنگال میں جہاں غلہ بٹائی کا رواج نہ تھا اور پیمائش ایک استثنائی صورت میں تھی مطالبات مالگزاری نسق پر مبنی ہوا کرتے تھے۔[2] ہم ایک دوسرے سلسلہ میں بنگال میں نظام مالگزاری پر بحث کر چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم جس نتیجہ پر پہونچے تھے وہ یہ ہے کہ وہاں زمینداروں پر تشخیص مالگزاری (جمع) کی بنیاد نیم مستقل نوعیت کی تھی، حالانکہ اسے بعض اوقات من مانی طور پر بڑھایا جا سکتا ہے۔ لیکن کشمیر میں ابو الفضل نسق کی ایک مخصوص شکل کے رواج کا تفصیلی تذکرہ کرتا ہے۔[3] اس صوبہ کو "نسقی غلہ بخشی" یعنی غلہ بخشی کے نسق کے تحت بتایا گیا ہے۔[4] یہاں کے نظام مالگزاری کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ مختلف پیداواروں پر ریاں (شرح جنسی) معین کر کے اسے ہر موضع کی آراضی پر عائد کرتے تھے اور اس کے مطابق وہ لوگ ہر موضع پر چاول کے چند خروار (گدھے کا بوجھ) کا تخمینہ کر کے، نئی معلومات حاصل کئے بغیر، ہر سال

---

[1] صادق خاں، Or 174 ورق 185 الف، Or 1671 ورق 90 ب، خافی خان (۱) ص 132؛ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ پروفیسر لیمبٹن اپنی تصنیف 'Landlord and Peasant in Persia' P. 436 میں نسق کو ایک ایسی فنی اصطلاح کی فہرست میں رکھتی ہے جو اراک (عراق) میں قابل کاشت زمینوں کے معاملہ میں کسی موضع کی استعداد کے مفہوم میں مستعمل تھی۔

[2] آئین اکبری (۱) ص 289

[3] ملاحظہ ہو باب 5 کی فصل 3۔

[4] آئین اکبری (۱) ص 570 بلاکمین نے 'نسقی' اور 'غلہ بخش' کے درمیان ایک وقفہ (ڈیش) لگایا ہے لیکن متن پر ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ 'غلہ بخش' کے بعد اگر 'و' (اور) لگا ہوا ہوتا تو پھر اس کا تعلق اگلے جملہ سے ہو جاتا، لیکن ایسا ہے نہیں۔ مورلینڈ اور یوسف علی کو 'نسقی' کی خواندگی پر اس لیے اعتراض ہے کہ مخطوطہ I.O. 265 میں اس کی جگہ 'نصقی' لکھا ہوا ہے (JRAS 1918ء ص 10-9) لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کاتب نے 'نسقی' کو 'نصقی' غلط پڑھا ہے کیونکہ آئین اکبری کے بہترین اور قدیم ترین مخطوطہ Add. 7652، Add. 6552 اور I.O. 6 سب ہی بلاکمین کی اصل عبارت کی (علاوہ اس وقفہ (ڈیش) کے جو اس نے تدوین کرتے وقت لگا دیا ہے) تائید کرتے ہیں۔

اسی قدر وصول کرتے رہے ہو ںتے ہیں[1] چنانچہ یہاں پر بٹائی غلّہ کی یہ خصوصیت تھی کہ پیداوار کی جو مقدار بطور مالگذاری معین کی جاتی وہ مستقلاً سال بہ سال یکساں رہا کرتی۔

ابو الفضل نے جن طریقوں کو 'نسق' کے نام سے موسوم کیا ہے ان کے متعلق جملہ موجود معلومات کو یکجا کرنے کے بعد ہم دیکھ سکتے ہیں کہ شکلوں کی گوناگونی میں حقیقتاً ایک ایسی اہم خصوصیت پوشیدہ ہے جو ان سب میں مشترک ہے، یعنی یہ کہ تشخیص کلی یا جزوی طور پر ہر سال از سر نو عمل میں نہیں لائی جاتی تھی بلکہ ایک بار کی تشخیص کے نتائج کو سال بہ سال دہرایا جاتا تھا۔ اس سے کوئی مطلب نہ ہوتا کہ ابتدائی تشخیص کے طور پر کی گئی تھی یا یہ کہ اعداد رقبہ، نقدی رقمیں، غلّہ کی مقدار یا غالباً ہلوں کی تعداد میں سے کون سی چیز دہرائی جا رہی ہے۔ تشخیص واقعی کے عمل سے احتراز کرتے ہوئے کسی ایسی چیز کو قبول کر لینا جو پہلے سے مقرر یا معین ہو، دراصل 'نسق' تھا۔

یہ دیکھا گیا ہوگا کہ ہم نے ابھی تک اپنی تحقیقات کو صرف ابو الفضل کی تحریروں میں 'نسق' کے حوالوں تک محدود رکھا ہے۔ ایسا اس لیے عمداً کیا گیا ہے تاکہ اس دلیل کو بے اثر کیا جا سکے کہ درمیانی مدت کے دوران اس کے مفہوم میں تبدیلی کے امکان کے پیش نظر، بعد کی شہادتیں اس امر کو متعین کرنے کے لیے کہ عہد اکبری میں اس سے واقعتہً کیا مراد تھی ناقابل قبول ہیں[2] حالانکہ بعد کی جو کچھ بھی شہادتیں ملتی ہیں وہ ہمارے پچھلے پیرا میں اخذ کیے ہوئے نتیجہ سے کلیتہً ہم آہنگ ہیں۔ دور عالمگیری میں تحریر کیے گئے ایک ضوابط نامہ میں نسق کی اس طور پر تعریف کی گئی ہے "تشخیص کنندہ، موازنہ دہ سالہ (پچھلے دس سال کی مالگذاری و رقبہ کے اندراجات) اور اس کے فوراً ایک سال پہلے (کے اندراجات) کو ذہن میں رکھتے ہوئے یا دس بارہ سال کے جمع کا اوسط نکال کر جمع تشخیص کرتا ہے"[3]

---

[1] اکبر نامہ ج 3، ص 548

[2] Saran, Provincial Govt. ص 57 - 453

[3] فرہنگ کاردانی، ورق 32 ب، Edinburgh 83 ورق 34 ب میں اس تعریف کی نقل کی گئی ہے لیکن اس کا مرتب یا کاتب بدیہی طور پر لفظ 'نسق' کو شناخت کرنے سے بالکل ہی قاصر رہا۔ اس میں 'اوسط نکال کر' کے قبل لفظ 'یا' کو بھی حذف کر دیا گیا ہے۔ مسٹر ایس آر شرما نے 'Indian Culture' ج (3) ص 544 - 5 میں 'نسق' کی اس تعریف کا حوالہ دیا ہے جو رامپور اسٹیٹ لائبریری کے ایک ضوابط نامہ میں درج ہے مگر تعجب ہے کہ انہوں نے نہ تو اس تعریف کا متن نقل کیا اور نہ اس کا ترجمہ، بلکہ صرف (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

اس طور پر تشخیص سابقہ کی بنیاد پر تشخیص حاضرہ معین ہوتی ہے۔ عہد مذکور کے تقریباً اختتامی دور کے ایک اور ضوابط نامہ میں 'نسق' بالکل اسی شکل میں ملتا ہے جو اس کی سولہویں صدی میں تھی جب یہ ضبط سے متعلق تھا یعنی اس سے مراد وہ رقبہ ہوا کرتا جو بغرض تشخیص حکام مال کاغذ پر معین کر دیتے تھے[1]

فصل 3 مختلف خطوں میں تشخیص مالگذاری کے طریقے

بقول ابوالفضل شیر شاہ اور اس کے لڑکے اسلام شاہ کے عہد حکومت میں بٹائی غلہ اور مقطعی (مقررہ مطالبۂ مالگذاری کا عائد کرنا) کے بجائے ہندوستان میں ضبط کا نظام رائج ہو چکا تھا[2] عباس خاں اس کی تائید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ شیر شاہ نے بار اوّل تشخیص کے سلسلہ میں جریب کا استعمال کیا[3] اس نے اپنے ابتدائی ایام میں، اپنے باپ کی جاگیر بہار میں کسانوں کو یہ موقع دیا

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اس کا لفظ بہ لفظ ترجمہ دیا ہے۔ اس سے بھی یہ تقریباً یقینی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے الفاظ دہی میں جو فرہنگ کارروائی میں استعمال ہوئے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اس میں مسٹر شرما نے ادھطوں کے اصول پر جو خصوصی زور رہا ہے وہ شامل نہ ہو۔

[1] خلاصۃ السیاق، اوراق 79 ب 80 الف، Or. 2020 ورق 34 الف۔ ب۔ کروڑی کو "کاشتکاری کو ترقی دینے (اور) کسانوں کے حسب حال 'نسق' مقرر کرنے کے بعد جسے عام بولی میں اسر (دیاسی) کہتے ہیں، چاہیے کہ سوار اور پیادے تعینات کر دے تاکہ کاشتکاران حسب قرار داد تخم ریزی کر سکیں اور ایک بھی قابل کاشت بگھہ یا بسوہ بغیر کاشت نہ رہنے دے۔" میں اس ہندی مرادف کا پتہ نہ چلا سکا۔ موازنہ بہ ابوالفضل کی تحریر جس میں فقرہ 'نسخۂ نسق' بالکل اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

[2] آئین اکبری (1)، صفحہ 296، 'مقطعی' کے لیے ملاحظہ ہو اگلی فصل۔

[3] عباس خاں، ورق 106 الف۔ غالباً نظام ضبط شیر شاہ کی ایک جدت تھی لیکن تشخیص کے سلسلہ میں معمولی پیمائش کا طریقہ جیسا کہ 'کنکوت' میں ہوتا ہے، ہندوستان میں ایام قدیم سے ضرور رائج رہا ہوگا۔ چودھویں صدی میں علاؤ الدین خلجی نے پیمائش کی بنیاد پر تشخیص کا ایک نظام قائم کیا تھا (بحکم ساحت وو فائے بسوہ) (برنی تاریخ فیروز شاہی، بب۔ انڈ، صفحہ 287) اس کو اور نیز اس کے گھوڑوں کو داغ دینے کے طریقہ کو بنیاد بنا کر ابوالفضل نے شیر شاہ کو اس بات کا طعنہ دیا ہے کہ اس نے سلطان علاؤ الدین کے متعدد طریقوں میں سے بعض کو جن کی تفصیل تاریخ فیروز شاہی میں درج ہے رائج کیا۔" (اکبر نامہ (1) صفحہ 196)

تھا کروہ جریب یا غلہ بٹائی میں سے کوئی ایک طریقہ پسند کرلیں[1] لیکن بادشاہ ہونے پر اس نے بظاہر ضبط کو تشخیص کے واحد طریقہ کے طور پر اختیار کرنے کی کوشش کی۔ وقائع نویس کی اطلاع ہے کہ پنجاب کی پہاڑیوں (نگر کوٹ وغیرہ) کے لوگوں سے بھی مالگذاری کی وصولی میں جریب ہی کا استعمال تھا[2] اور شہر سنبھل کے اطراف کے لوگوں کو بھی اسی طریقہ پر تشخیص کی گئی مالگذاری کی ادائیگی پر مجبور کیا گیا۔[3] غالباً مالوہ میں بھی نظام ضبط رائج کیا جا چکا تھا کیونکہ عہد اکبری کے ابتدائی برسوں میں جو دستور اس صوبہ میں نافذ کیے گئے وہ آئین اکبری کے گوشوارہ "نوزدہ سالہ" میں درج ہیں۔ صرف ملتان کو مستثنیٰ تصور کیا گیا اور وہاں 'ننگاہ'، لوگ جس طریقہ کو استعمال کرتے تھے اسی کو برقرار رکھتے ہوئے جریب کو استعمال میں نہیں لایا گیا بلکہ ایک قسم کی غلہ بٹائی کا طریقہ رائج کیا گیا۔[4]

جیسا کہ آئین 'نوزدہ سالہ' سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہد اکبری کے اوائل میں ہندوستان کے بیشتر صوبوں (آگرہ، الہ آباد، اودھ، دہلی لاہور اور مالوہ) میں نظام ضبط رائج رہا۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ اسی عہد کے دوران اس کے رواج میں کمی واقع ہوئی ہو۔ تیرھویں برس، خالصہ کی زمینوں پر سالانہ پیمائش کے بجائے 'نسق' کی ایک شکل عائد کی گئی[5] اور انیسویں برس ہندوستان کے تمام صوبے بہ استثنا بہار خالصہ میں شامل کرکے ضبط کے تحت لائے گئے۔[6] ملتان[7] اور صوبہ اجمیر[8] کے کچھ حصوں میں بھی اسی نظام کو رائج کیا گیا۔ آئین اکبری کی تدوین کے وقت تک، صوبہ بہار کے

---

1. عباس خاں، ورق، 11 الف۔
2. ایضاً ورق 107 الف،
3. ایضاً، ورق 108 الف،
4. ایضاً، اوراق 93 ب۔ 94 الف
5. اکبرنامہ (3) ص 333 اقبالنامہ (2) مخطوطہ 233
6. اکبرنامہ (3) ص 117-18 عارف قندھاری 177 — 78، بدایونی (2) ص 189-190
7. آئین نوزدہ سالہ کے تحت ملتان کے اندراجات محض پندرھویں برس سے شروع ہوتے ہیں لیکن چونکہ ممکن ہے کہ پندرھویں برس سے چوبیسویں برس تک کی مقررہ شرحیں پچھلے برسوں پر بھی اثرانداز رہی ہوں، لہٰذا غالباً ملتان ضبط کے تحت محض انیسویں برس یا اس کے بعد آیا۔
8. آئین نوزدہ سالہ میں اجمیر کا خانہ چھوڑا گیا ہے لیکن آخری دستورالعمل محالوں کے نو مجموعوں کے لیے درج ہیں۔

بیشتر پرگنے جن کی جمع کل کی تین چوتھائی سے زائد تھی ضبط کے تحت آچکے تھے[1] لیکن غالباً کسی بھی صوبہ کی تمام زمینیں ضبط کے تحت نہ تھیں[2] تجربۂ کرڑوڑی کا مقصد جس کی ابتدا انیسویں برس ہوئی تھی، غالباً یہ تھا کہ صرف ایک بار یا چند برسوں کی ایک مدت کے لیے حتی الوسع زیادہ پیمائش کر کے اسی عملی نسق[3] اور جدید تشخیص عام یعنی دہ سالہ کی ترتیب کے لیے بطور بنیاد کے استعمال کیا جائے۔ آئین اکبری میں عمل گذار کے نام ہدایت میں درج کیا گیا ہے کہ اسے کسان کو موقع دینا چاہئے کہ وہ 'نسق' کو قبول کرے یا پھر از سر نو پیمائش کرائے۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی ہدایت ہے کہ وہ اپنے کو صرف انہیں دو طریقوں تک محدود نہ رکھے جس میں مطالبۂ مالگذاری رقم میں معین ہوتا ہے بلکہ مطالبہ کو جنس میں معین کئے جانے والے طریقے یعنی کنکوت اور غلہ بٹائی بھی اختیار کرے[4] آئین اکبری

---

[1] آئین اکبری (1) ص 417

[2] باب ایک کی فصل ایک میں ہم نے دیکھا ہے کہ دور عالمگیری کے شماریات میں آراضیات پیمودہ آئین اکبری کے اعداد کے مقابلہ میں بے حد زیادہ ہیں۔ ان سے یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ بیشتر صوبوں میں مواضعات کی ایک کثیر تعداد غیر پیمودہ تھی۔ ان اعداد و شمار کے موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے آئین اکبری میں صرف صوبہ جات آگرہ و دہلی کی آراضیات پیمودہ کے اعداد کسی حد تک مکمل تھے۔

غلام حضرت 1810ء میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے چکلۂ اعظم گڑھ کے بعض قانون گوؤں کے پاس عہد اکبری کے چند کاغذات موازنہ دیکھے تھے۔ اس کے بعد بقول ان کے "اس (اکبر) کے عہد میں چکلۂ گورکھپور کے مواضعات کی پیمائش (ضبط پیمائش) عمل میں نہ آئی تھی"۔ (کوائف گورکھپور۔ علی گڑھ مخطوطہ 15 ب) آئین اکبری میں سرکار گورکھپور (اودھ) کے متعدد محالوں کے اعداد رقبہ میں زیادہ کمی کا یہ ایک سبب ہو سکتا ہے۔

[3] 984ھ (21 جلوس اکبری) میں مالوہ کی سرکاری اجیّن کے شعبۂ مال کے فرائض بایزید کے سپرد کئے گئے تھے۔ بقول اس کے "اس کے فرائض میں "پیمائش (جریب) تشخیص (جریب بندی) اور (تعین) نسق شامل تھے (بایزید ص 353) پہلے ذکر آیا ہے کہ ٹوڈرمل کی ستائیسویں برس کی یہ تجویز تھی کہ خالصہ میں سالانہ پیمائش کی ضرورت نہیں بلکہ ایک قسم کا مقامی 'نسق' قائم ہونا چاہئے (اکبرنامہ (3) ص 2-381)

[4] آئین اکبری (1) ص 6-285 عجیب بات ہے کہ مورلینڈ اس عبارت کی جس کا مفہوم وہی ہے جو فرمان عالمگیری بنام راسکداس میں بیان کیا گیا ہے کوئی تشریح نہیں بیان کرتا۔ پھر بھی اسے دیباچہ کو اس امر کی ایک "فیصلہ کن" شہادت کے طور پر قبول کرنے میں پس و پیش نہ ہوا۔ اس وقت تک اکبر کا طریقہ "تقریباً بالکل متروک ہو چکا تھا" (Agrarian System ص 124)

ہی میں ایک دوسری جگہ یہ تحریر ہے کہ "جو (تین یا چار سال سے بلا جوتی بوئی زمین پر حسب موقع مذکورہ طریقوں میں سے کوئی ایک نافذ کرنا چاہئے اور اس سے زیادہ مدت کی بنجر زمینوں کے متعلق کسان کو حق انتخاب حاصل رہنا چاہئے"[1] برخلاف اس کے معلوم ہوتا ہے کہ زمینیں جو پہلے غلہ بٹائی کے تحت تھیں وہ نقدی فصلوں کے زیر کاشت آجانے کی صورت میں ضبط کے تحت آجائیں گی[2]

پندرھویں صدی کے دوران یہ نظام اپنے بنیادی اجزاء کے ساتھ بغیر کسی تبدیلی کے رائج رہا۔ 8ء جلوس عالمگیری کے فرمان بنام راسکداس کے دیباچہ[3] میں اس وقت کے مروجہ نظام کو اس طور پر بیان کیا گیا ہے۔

"مملکت شاہی کے پرگنوں کے تشخیص کنندگان (آمنا) سال کے شروع میں، سال کامل[4] (سب سے زیادہ مالگذاری کے برس) اور سال سابقہ کی مالگذاری (حاصل) اور قابل زراعت رقبہ اور کسانوں کی صلاحیت اور دیگر خصوصیات کا لحاظ رکھتے ہوئے، پرگنہ کے بیشتر مواضعات کے جمع کی تشخیص

---

[1] آئین اکبری (1)، ص 301، 303

[2] ایضاً 286 کسی پچھلے فٹ نوٹ میں اس پر بحث آچکی ہے۔

[3] اس امر کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا، لیکن قوی ترین گمان ہے کہ اس فرمان میں خاص طور پر ہندوستان کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ راسکداس کے سرکاری عہدہ کے یا اس کی تقرری کے صوبہ کے متعلق کچھ نہیں معلوم۔ Add. 503, 19 ورق 62 الف۔ 63 ب میں فرمان کی جو نقل محفوظ ہے اس میں اس کے نام کی جگہ میر محمد معز بہار کے خالصہ کے دیوان کا نام ملتا ہے۔ لہذا ممکن ہے کہ اس فرمان کی نقل متعدد سرکاری عہدہ داروں کے پاس بطور گشتی مراسلہ کے بھیجی گئی ہو۔

[4] "سال کامل" کی اصطلاح اولاً تجاویز میر فتح اللہ شیرازی کی اصل عبارت میں جو 30ء جلوس اکبری میں ترتیب دی گئی تھی ملتی ہے (اکبر نامہ (3)، ص 457)۔ "کامل" کے لفظی معنی "بالکل ٹھیک" ہوتے ہیں مگر یہ لفظ یہاں مالگذاری کی انتہا وصول شدہ رقم کے اصطلاحی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ جمع کامل کی تعریف Add. 6603 ورق 57 ب میں ملاحظہ ہو۔ 1776ء کی صورت کی صلح میں یہ اصطلاح جس مفہوم میں استعمال ہوئی ہے اس کے متعلق انگریز حکام اور مرہٹوں کے درمیان ایک نزاع رونما ہوئی تھی۔ مرہٹوں کا اصرار تھا کہ اس کا بالکل وہی مفہوم سمجھنا چاہئے جیسا کہ ان کی تحریروں میں آیا ہے موازنہ کریں 'Grant Deptt., 'A History Of the Marpattas', London 2 (2)، ص 333

کرتے ہیں اور اگر بعض مواضعات کے کسان اس طریقۂ کار (عمل) سے متفق نہ ہوتے تو یہ لوگ جمع کی تشخیص بطریقہ جریب یا کنکوت بوقت تیاری فصل کرتے اور بعض مواضعات میں جن کے کاشتکاروں اور کسانوں کے مصائب و افلاس کا انہیں علم ہوتا غلہ بٹائی بشرح نصف یا ایک تہائی یا دو بٹہ پانچ یا اس سے کم و بیش کا طریقہ (بطور مالگذاری) اختیار کیا جاتا۔"

چنانچہ، ہمیں پہلے نسق کی وہ شکل ملتی ہے جو ضبطی کے علاقوں میں رائج تھی۔ اس کے بعد پیمائش خواہ 'ضبط' (جریب) یا کنکوت کے تحت اور صرف خاص صورتوں میں غلہ بٹائی۔ یہی بات پنجاب میں لکھی ہوئی عہد عالمگیری کے اختتامی زمانہ کے قریب کی ایک تصنیف خلاصۃ السیاق میں بھی بیان کی گئی ہے[1] عہد عالمگیری کے شماریات آراضی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آراضی کی بنیاد پر خواہ اس کی پیمائش واقعتہً سال بہ سال ہو یا وہ 'نسق' میں درج ہو تشخیص کا عام رواج تھا۔ بلاشک ان شماریات میں مندرجہ آراضی' عام طور پر آئین اکبری کے بالمقابل بہت زیادہ ہے۔ ان شماریات میں مندرج مواضعات غیر پیمودہ کی تعداد کا تناسب صوبہ جات بہار' اودھ اور ملتان کے مواضعات کی مجموعی تعداد میں بہت زیادہ ہے۔ لیکن یہ صوبہ جات الٰہ آباد' آگرہ' دہلی و لاہور میں نسبتًا ناقابل لحاظ ہے[2]

انتظامی زبوں حالی کے باوجود' اٹھارہویں صدی میں مغلوں کی تشخیص مالگذاری کے نظام چلے آ رہے تھے۔ 1788ء کے کچھ قبل بنگال کے انگریز حکام کے لیے دیگر صوبوں کے نظام مالگذاری کے متعلق مرتبہ رپورٹ میں وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ عام طور پر پنجاب میں زمینداران' کاشتکاروں پر مطالبہ کی تشخیص کے سلسلہ میں پیمائش کا استعمال کرتے تھے' حالانکہ بعض زمینداران' غلہ بٹائی

---

[1] امین یا تشخیص کرنے والے کو اپنی واقفیت کی بنیاد پر سال کے شروع میں ہر موضع کے کسانوں کی استعداد کے بارے میں' ہر دو فصل کے متعلق علیحدہ علیحدہ جمع یا 'دول' تیار کرنا ہوتا تھا جب فصل پکنا شروع ہو جائے تو اسے از سرِ نو کسانوں سے قبولیت (تشخیص شدہ مطالبہ کو قبول کرنے کا معاہدہ) حاصل کرنا ہوتا تھا۔ اگر کوئی کسان اتفاقی صورت میں تشخیص کی ہوئی جمع کو ادا کرنے سے مجبور ہو اور فی الواقعی تشخیص (عمل) کا مستدعی ہو تو ایسی صورت میں 'ضبط' یا 'بٹائی غلہ' یا کنکوت میں سے کوئی ایک طریقہ جو سرکار کے لیے نفع بخش ہونے کے ساتھ ساتھ کسانوں کے لیے بھی پریشان کن نہ ہو اختیار کرنا چاہیے (خلاصۃ السیاق' اوراق 73 ب۔ 74 الف؛ Or 2026 ورق 22 ب موازنہ بہ ییز بیکس 70 الف۔ ب)۔

[2] ان شماریات پر باب اوّل کی فصل اوّل میں بحث آچکی ہے۔

کے طریقے پر عمل کر رہے تھے (صوبۂ شاہجہان آباد (دہلی) کے بعض مواضعات میں مالگذاری کی ادائیگی بطریق غلہ بٹائی اور بعض میں بحساب بیگھہ تھی۔ اودھ اور الہ آباد کے دو صوبوں میں بطریق پیمائش یا بہرحال بحساب بیگھہ مالگذاری کی ادائیگی کا عام رواج تھا[1] اور بہار میں نظامت کے ابتدائی دور میں بعض محالوں میں تشخیص استمراری لیکن بعض میں معمولاً کنکوت کے طریقہ کا رواج تھا[2]۔

مملکت کے دیگر منطقوں میں ہم پہلے کشمیر کے طریقہ کو بیان کرتے ہیں۔ وہاں کے مروجہ طریقہ کا ایک سرسری تذکرہ پہلے آچکا ہے اس کے متعلق ابوالفضل کے قدرے تفصیلی بیان کے خلاصہ کو اس طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہر موضع کے متعلق خیال تھا کہ وہاں آراضیات کا رقبہ معین ہے۔ ہر پٹہ یعنی رقبہ کی مقامی اکائی کی اہم پیداواروں کے لیے ایک 'ریع' مقرر تھی اور پیداوار کا ایک تہائی مالگذاری کا حصہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس طور پر معینہ مقدار (بمقدار چاول کے خرباز کے) ہر سال بغیر کسی تبدیلی کے وصول کی جاتی تھی۔ اکبر کے حکام کو عہد حکومت کے چونتیسویں سال تفصیلی تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ حکومت کو جس 'ریع' کی اطلاع دی گئی ہے اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں اور مالگذاری زیادہ بڑھی ہوئی ریع کے مطابق وصول کی جارہی ہے، مثلاً گیہوں پر چار گنا زائد اور چاول پر ڈیڑھ گنا ریع رائج ہے[3] چنانچہ پیداوار کی ایک تہائی نہیں بلکہ اس کی دو تہائی سے بھی زائد وصول کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ اکبر نے حکومت کے حصہ کو پیداوار کے آدھے پر مقرر کیا، مگر نئی ریع کا کہیں اندراج نہیں ملتا[4] اٹھارہویں صدی کے آخری زمانہ میں غلہ بٹائی بظاہر اپنی خالص شکل میں کشمیر میں رائج تھی[5] مگر درمیانی مدت کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی۔

بھکر، صوبۂ ملتان کی ایک سرکار تھی۔ ہماری اطلاع ہے کہ 1575 — 96 میں وہاں ایک

---

[1] Add. 6586 ورق۔ 164 الف ب۔

[2] رائے رایان اور قانون گوؤں کی انگریزوں کے قبل کے انتظام حکومت کے متعلق 1777ء کی رپورٹ Add. 6592 ورق 112 ب Add. 6586 ورق 71 ب۔ اس میں کنکوت کو غلہ بٹائی (بھاولی) کی ایک شکل بتائی گئی ہے، حالانکہ یہ صاف طور پر واضح کیا گیا ہے کہ جریب کا استعمال ہوتا تھا۔

[3] اکبرنامہ (3) ص 549-50،

[4] آئین اکبری (1) ص 570 اکبرنامہ (3) ص 727،

[5] Add. 6586 ورق 164 الف۔

یکساں نوعیت کے دستور العمل (مطالبہ بمقدار جنس) کی کنکوت کے طریقہ پر پیوندکاری کی گئی اور اس نئے طریقہ سے بے حد ظلم اور ہنگامے پیش آئے[1] اس پر بھی وہاں یہ طریقہ کسی نہ کسی شکل میں غالباً قائم رہا۔ چنانچہ باوجودیکہ آئین اکبری میں اس سرکار کے لیے کوئی دستور معین نہ کیا گیا[2] لیکن صوبجاتی شماریات کے تحت اس کے رقبہ کے اعداد ملتے ہیں۔ بقول منظر شاہجہانی جو 1664ء میں تصنیف ہوئی، سرکاری بھکر کے آٹھوں پرگنے تشخیص مالگذاری کے "ضبطی" نظام کے تحت تھے اور فصل خزاں و بہار دونوں کی پیداواروں کے دستور مقرر تھے[2 الف] بہار گلشن میں اس کے یا سرکار ملتان کے اعداد رقبہ نہیں دیئے گئے ہیں[3] اور قیاس کیا جا سکتا ہے کہ سترھویں صدی کے دوران سرکار ملتان میں بھی ضبط کا سلسلہ ختم کر دیا گیا تھا۔ بسمت جنوب سرکار سہوان میں "ضبطی" اور غلہ بٹائی دونوں طریقے ساتھ ساتھ چلتے رہے[3 الف] منظر شاہجہانی میں بہرحال، مختلف پیداواروں کے دستور بیشتر رقم میں نہیں بلکہ جنس میں مقرر کیے گئے ہیں جن سے بھکر میں پچھلی صدی میں مروجہ کنکوت کی ترمیم شدہ شکل کی یاد تازہ ہوتی ہے[3 ب] صوبۂ ٹھٹھہ عہد اکبری اور نیز اس کے بعد بھی مسلسل غلہ بٹائی کے تحت چلتا رہا[4] اور صوبۂ اجمیر کے زیادہ حصہ میں بھی یہی طریقہ رائج رہا[5]

---

[1] معصوم تاریخ سندھ ص 245

[2] یہ بلاکمین کی اصل عبارت میں واضح طور پر درج نہیں ہے حالانکہ اس کی کمی بھی Add. 6552 سے پوری ہو جاتی ہے بھکر کو ان محالات کی فہرست میں جن کے دستور دیئے گئے ہیں یا خود دستوروں ہی کے گوشوارہ میں شامل نہیں کیا گیا ہے صوبۂ ملتان کی شماریات مالگذاری کے گوشواروں کے ماقبل کی عبارت میں بتایا گیا ہے کہ اس کی تین سرکاریں رقباتاً ملتان، دیپالپور و بھکر اور جس میں سے ٹھٹھہ خارج ہے) ضبطی تھیں (آئین اکبری (۱) ص 550) لیکن غالباً بے احتیاطی سے یہاں ضبط میں کنکوت کو جس میں پیمائش بھی ہوتی تھی شامل کر دیا گیا ہے۔

[2 الف] الف۔ منظر شاہجہانی، 13-14

[3] ملاحظہ ہو باب ایک کی فصل ایک۔

[3 الف] الف منظر شاہجہانی 155، 182-5، 203-30،

[3 ب] ب ایضاً 183-4

[4] آئین اکبری (۱) ص 556 منظر شاہجہانی 51،

[5] ایضاً 505۔ پرگنات میرتہ و فینوا کے لیے وقائع اجمیر ص 114، 448 بھی ملاحظہ ہو۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

گجرات میں صورت حال کے متعلق کچھ دقیق نظر آتی ہیں۔ بقول آئین اکبری یہ "بیشتر نسقی" تھا اور یہاں پیمائش کا رواج بہت شاذ تھا[1] اس کے ساتھ ساتھ سورتھ اور بعض دیگر علاقوں کے محالوں کو چھوڑ کر بقیہ پورے صوبہ کے رقبہ کے تفصیلی اعداد و شمار موجود ہیں۔ اس کے علاوہ، شہاب الدین احمد خاں، صوبیدار گجرات (1577 — 83ء) کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ "اس نے احمد آباد کے نواحی (حویلی) علاقوں اور دیگر پرگنوں کے کسانوں کی شکایت پر قابل زراعت اراضی کی دوبارہ پیمائش کرائی۔[2]" عہد شاہجہانی کے ابتدائی دور میں گیلس کا بیان ہے کہ مالگذاری کے لیے پیداوار کی "پیمائش اور مالیت کرائی گئی۔"[3] اس کی توجیہہ صرف اس طور پر کی جا سکتی ہے کہ گجرات میں ضبطی صوبوں کی نوعیت کا نسق رائج تھا۔ ابوالفضل کے الفاظ سے جو فرق اخذ کیا جا سکتا ہے وہ محض یہ تھا کہ گجرات کے مالی نظم و نسق کے معمولات میں کسی بھی باضابطہ نظم کی طرح دوبارہ پیمائش کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ شہاب الدین کے کام کے تذکرہ میں اس بیان کا بھی کہ اس کے قبل صرف ایک بار پیمائش کا کام ہوا تھا اور جب تک عام شکایات نہ تھیں دوبارہ پیمائش کا سوال نہ پیدا ہوتا تھا یہی مفہوم ہے۔

گجرات میں 1630 ـ 32ء کی قحط سالی سے شدید تباہی ظاہر ہوئی اور اس کے بعد کی دہائی میں حکومت کو احساس ہوا کہ وہاں کے کسان شدید مظالم اور مصائب کا شکار ہو رہے ہیں۔ مرزا عیسیٰ ترخان کو وہاں کے حالات کی اصلاح کی غرض سے صوبیدار مقرر کیا گیا (1652 ـ 64ء) اور اس نے وہاں "غلہ بٹائی کا طریقہ رائج کر کے تھوڑے ہی عرصہ میں ملک کو خوشحالی پر لگایا۔"[4] اس کا امکان ہے کہ

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

جانوسکی ایک رپورٹ (ایضاً 451 ـ 2) منظہر ہے کہ وہاں غلہ بٹائی، اول بار عہد عالمگیری کے تیسویں برس رائج کی گئی تھی

[1] آئین اکبری (1) ص 485 یہاں پہلا لفظ 'mostly' اصل متن کے لفظ 'بیشتر' کی جگہ پر ہے۔ موریلینڈ اور یوسف علی (JRAS 1918ء، ص 29 ـ 30) اس امر کے اعتراف کے ساتھ کہ مختلف مخطوطات کی عبارت میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ہمیں اس کے بجائے 'پیشتر' (سابقہ) پڑھنا چاہیے اور جملہ کی تعبیر اس طور پر کرنی چاہیے کہ اس میں پچھلے حالات کا حوالہ آیا ہے، لیکن اس صورت میں آخر کے الفاظ 'کم رود' کو تبدیل کر کے 'کم رفتہ' کرنا ہوگا تاکہ ماضی کا مفہوم پیدا ہو سکے مگر ایسا کرنا یقیناً حد سے تجاوز کرنا ہوگا۔

[2] مرآۃ (1) ص 141،

[3] JIH (4) ص 79،

[4] مرآۃ (1) ص 217 ـ 18،

پیمائش کو کلیتہً بے دخل نہ کیا گیا ہو، کیونکہ عہد عالمگیری کے شماریات میں یہاں کے کل مواضعات کے تقریباً $\frac{2}{5}$ کو پیمودہ دکھایا گیا ہے[1] خود غلہ بٹائی کسانوں کے لیے ایک دیرپا نعمت ثابت نہ ہوتی۔ ایک شاہی حکم ہے جو 8 ء جلوس عالمگیری میں جاری ہوا ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طریقہ غیر معمولی طور پر مسخ کر دیا گیا تھا اس میں درج ہے کہ عہد حکومت کے ابتدائی برسوں میں "غلہ کی گرانی کے سبب سے 'جمع' اپنی انتہائی حد (کمال) کو پہونچ گئی تھی" اس کے بعد قیمتیں گھٹیں لیکن جاگیرداران من مانی طور پر تشخیص کر کے پچھلی ہی رقم کا مطالبہ کرتے رہے۔ چنانچہ رسمی طور پر غلہ بٹائی ہی کا نام رہا لیکن پیداوار کو 100 کی جگہ 250 من فرض کرتے ہوئے' اس مفروضہ مقدار کے نصف پر مطالبہ کو قائم کر کے پوری پیداوار پر قبضہ کر لیا جاتا تھا اور 25 من کی کمی کے معاوضہ میں کسانوں سے پورے سال کا کام لیا جاتا تھا۔[2] یہ امر مشتبہ ہے کہ مطالبۂ مالگذاری کو واقعی پیداوار پر منحصر کرنے کے متعلق جدید احکام کی کہاں تک پابندی کی گئی۔ 74 16 ـ 5ء میں فرائیر کے مشاہدہ کے مطابق علاقہ سورت میں کسانوں کو اپنی پیداوار کا تین چوتھائی حکام کو سپرد کیے بغیر اپنی فصل کو کھیت سے اٹھانے کی[3] اجازت نہ تھی۔

مغلیہ دکن کے متعلق آئین اکبری میں سوائے اس کے کہ برار 'نسق' کے تحت تھا کوئی اور مفید طلب اطلاع نہیں ملتی[4] مگر بقول صادق خاں دکن میں "زمانہ قدیم سے" پیمائش یا غلہ بٹائی میں سے کوئی طریقہ بھی رائج نہ تھا بلکہ اس کے برخلاف "مروجہ دستور یہ تھا کہ ہر کسان جس قدر زمین کی کاشت ایک عدد ہل اور ایک جوڑی بیل سے ممکن تھی کرتا تھا اور اپنی مرضی کی فصل' غلہ خواہ کھانے کی سبزی اگاتا تھا اور ہر ہل پر حکام (سرکار) کو تھوڑی سی رقم ادا کرتا تھا جو علاقہ اور پرگنوں کے لحاظ سے کم و بیش ہوا کرتی تھی اور پیداوار کی مقدار کے متعلق نہ تو کوئی (مزید) تحقیقات ہوتی اور نہ اس کا لحاظ رکھا جاتا[5] ممکن ہے یہی عام دستور رہا ہو' لیکن 42 16 ـ 63ء کی ایک تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم

---

[1] ملاحظہ ہو باب ایک کی فصل ایک۔

[2] مرآۃ (1) ص 268 یہ عبارت ایک فرمان جس میں صوبۂ احمد آباد میں غیر قانونی محصولوں (ابواب ممنوعہ) کی وصولی کو وضاحت کے ساتھ منع کیا گیا تھا' کی شرح ضمن دپشت پر تشریح) سے ماخوذ ہے (ایضاً ص 259)

[3] Fryer (1) ص 300 - 301

[4] آئین اکبری (1) ص 478

[5] صادق خاں' .Or 174 ورق 185 الف۔ب .Or 1671 ورق 90' ب' خافی خاں (1) ص 732

بعض پرگنوں میں ایک طرح کا پیمائش پر مبنی نسق رائج تھا۔[1] ممکن ہے اس کو اور دیگر طریقوں کو مغل انتظامیہ نے فتوحات اکبری کے بعد کی پانچ یا چھ دہائیوں کے دوران مختلف علاقوں میں رائج کیا ہو۔

1653ء میں اورنگ زیب نے دکن میں لکھتے ہوئے واضح طور پر بتایا ہے کہ حکام مال کے مختلف طریقے (ضوابط گوناگوں) اس ملک کی تباہی کا سبب ہوئے ہیں۔[2]

1652ء میں اورنگ زیب کے دکن میں دوبارہ نائب سلطنت مقرر ہونے پر وہاں کی مالگذاری زمین کے نظم کی اصلاح کا کام خاص طور پر اس کے سپرد کیا گیا تھا۔[3] یہ اصلاحی کام زیادہ تر مرشد قلی خاں نے انجام دیا تھا اور اس کام میں ملتفت خاں نے بھی تھوڑے عرصہ تک اس کی مدد کی تھی۔[4] اصلاح کا کام غلہ بٹائی کے مستند طریقہ کو اختیار کر کے شروع ہوا اور اورنگزیب کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے زیر انتظام تمام و نیز جاگیرداروں کے علاقوں میں یہی طریقہ نافذ کیا گیا۔[5] بٹائی غلہ کی جو مخصوص شکل اختیار کی گئی اس کے متعلق خیال ہے کہ وہ خود مرشد قلی خاں کی اختراع تھی۔[6] اس نظام کے تحت مطالبۂ مالگذاری کا تناسب ایک تفریحی پیمانہ پر مبنی تھا جو پیداوار میں

---

[1] اس کا عنوان 'یادداشت بابتہ تخمینہ زمین دیا دداشت تجویز زمین) ہے۔ یہ 20 پرگنوں کے متعلق ہے لیکن ان میں سے تین کے گوشوارے موصول نہ ہوئے تھے۔ رقبہ کی میزان 6 19000 بیگھہ 13 بسوہ تھی۔ ان میں ہر پرگنہ کے لیے زمین کا ایک مقررہ رقبہ بطور معمولی مزروعہ اور بطور زباغات معین کیا گیا تھا اور دکن میں فقط 'باغات' کنوؤں سے سیراب ہونے والے مزروعوں کے لیے استعمال ہوتا تھا (موازنہ ہو خافی خاں ii، ص 735) بعض اعداد کے قبل فقرہ 'تجویز حال' یعنی موجودہ تجویز لکھا ہوا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ انہیں سابق کے معینہ رقبوں میں شامل کیا جا رہا تھا۔ یہ واضح نہیں ہے کہ یہ تجویز خالصہ کی زمینوں کے بارے میں ہے یا اورنگزیب کی جاگیروں کے بارے میں 'Selected Documents of Shah Jahan's Reign' 101-107

[2] ادب عالمگیری، ورق 36 الف، رقعات عالمگیری، ندوی ایڈیشن ص 77

[3] ادب عالمگیری ورق 28 ب رقعات عالمگیری ص 69

[4] ابتداً مرشد قلی خاں بالاگھاٹ کا اور ملتفت خاں پائین گھاٹ کا دیوان تھا۔ بعد میں ملتفت خاں کو دوسرے کام پر تبدیل کر دیا گیا۔ اور مرشد قلی خاں پورے مغلیہ دکن کا دیوان مقرر رہا۔

[5] ادب عالمگیری، اوراق 35 الف، 36 الف۔ ب، 38 ب، 43 الف 118 الف، رقعات عالمگیر 97، 99، 102، 113، 7 ا

[6] اس اہم بیان کو جو مرشد قلی خاں کی اصلاحات کے متعلق صادق خاں کے تذکرہ میں موجود ہے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

قدرتی طور پر کلیتہً منحصر ہوا کرتیں ان کا نصف اور کنوؤں سے آبپاشی کی فصلوں پر ایک ثلث الیکن گنّے، پھل اور مصالوں پر اخراجات آبپاشی کے پیش نظر اور (پھلوں کے سلسلہ میں) پھلوں کے آنے کی مدّت کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک تہائی سے لے کر ایک چہارم تک وصول کیا جاتا تھا۔ نالیوں اور نہروں سے آبپاشی کی پیداواروں کی شرحیں مختلف ہوا کرتیں۔ صادق خاں کا یہ بھی بیان ہے کہ بعض علاقوں میں ہلوں کی تعداد پر تشخیص مالگذاری کا پرانا طریقہ قائم رکھا گیا اور بعض میں پیمائش کا طریقہ نافذ کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ مرشد قلی خاں نے پیمائش کے لیے ہر پیداوار کی 'ریع' اور قیمتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے فی بیگھہ کے حساب سے دستور مقرر کیے[1] اورنگزیب کے یہاں پیمائش کا کوئی ذکر نہیں ملتا لیکن بقول اس کے چونکہ غلہ بٹائی کا طریقہ بے حد خرچ طلب تھا[2] لہٰذا وہ اسے مستقل طور پر اختیار کرنے کی نہ سوچ سکتا تھا۔ صادق کا تو یہ بیان ہے کہ مرشد قلی خاں نے بیشتر پرگنوں کے رقبہ کی پیمائش کرائی[3] برار کے پرگنوں کے رقبہ کی پیمائش کرائی۔ برار کے پرگنہ پیل کے تقریباً 1679ء کے کاغذات مال میں اس کے پیمائش شدہ رقبہ کی تفصیلات درج ہیں[4] لیکن اس کے بابت فیصلہ کن شہادت عہد عالمگیری کے مواضعات اور رقبہ کے گوشواروں ہی سے فراہم ہوتی ہے۔ ان گوشواروں سے پتہ چلتا ہے کہ برار اور اورنگ آباد کے تقریباً نو بٹہ دس اور خاندیش کے تقریباً نصف مواضعات کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

خافی خاں نے نظر انداز کر دیا ہے۔ لہٰذا مورلینڈ کو اس کا علم نہ ہو سکا کہ اس بات کو ایک ہمعصر مورخ پہلے ہی لکھ چکا ہے وہ بتاتا ہے کہ اس قسم کی "تقریبی بٹائی" کا ہندوستان میں رواج نہ تھا اور یہ غالباً مرشد قلی خاں کے ایران کے نظم ونسق کے تجربات سے ماخوذ تھا۔ (Agrarian System ص 186)

[1] صادق خاں، .Or 174 اوراق 185 ب 186 الف، .Or 1671 ورق 91 الف خافی خاں (1) ص 733-4 نوٹ کہا جاتا ہے کہ مرشد قلی خاں کو ریع کے معیّن کرنے سے اس قدر دلچسپی تھی کہ اس خیال سے کہ کہیں کوئی غلطی نہ رہ جائے وہ رسّی کا ایک سرا خود اپنے ہاتھ میں لے لیتا تھا۔ یہ حوالہ غالباً تشخیص کی غرض سے کی جانے والی عام پیمائش کے لیے نہ ہوگا بلکہ شرح حاصل، فی بیگھہ یعنی 'ریع' یا شرح پیداوار معیں کرنے کی غرض سے کسی ایسے نمونہ کے رقبہ کی پیمائش کے متعلق ہوگا جن کا مجموعی حاصل پہلے سے معلوم ہو۔

[2] ادب عالمگیری، اوراق 38 ب، 118 الف، رقعات عالمگیر، 117

[3] صادق خاں، .Or 174 ورق 185 ب .Or 1671 اوراق 90 ب 91 الف خافی خاں (1) ص 733 نوٹ

[4] ملاحظہ ہو، IHRC 1929، ص 84-86

پیمائش کی گئی تھی[1] لہٰذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرشد قلی خاں کی اصلاحات کا جزو اعظم پیمائش کے اجرا سے متعلق تھا اور بٹائی غلّہ کو ابتداءً مختلف پیداواروں کے لیے ایک قابل عمل ریٹ مقرر کرنے کے سلسلے میں صرف بطور امداد کے اختیار کیا گیا تھا[2]

بقول ابو الفضل بنگال میں "کسان فرمانبردار اور مالگذاری کو پابندی سے ادا کرنے والا (رہے) ہر سال آٹھ مہینہ کے اندر وہ لوگ مالگذاری کو قسطوں میں ادا کردیتے ہیں۔ وہ لوگ خود روپیوں اور مہروں کو مقرر جگہ پر پہونچا دیتے ہیں۔ غلّہ بٹائی رائج نہیں ہے۔ ہمیشہ قیمتیں کمی کی حالت (ارزانی) میں رہتی ہیں۔ ان کو اس کی پیمائش میں کوئی عذر نہیں ہوتا[3] مطالبۂ مالگذاری 'نسق' پر مبنی ہے۔ دنیا کے فرمانروا نے اپنی فیض گستری سے اس نظام (آئین) کو برقرار رکھا ہے[4]۔" پچھلے باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ بنگال میں حکّام مطالبۂ مالگذاری کو کسان پر نہیں بلکہ زمیندار پر عائد کرتے تھے لیکن ابو الفضل کی مذکورہ عبارت سے بروقت سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس میں کہاں کسانوں کا زمینداروں کو اور کہاں زمینداروں کا حکومت کو مالگذاری ادا کرنے کا ذکر کر رہا ہے۔ ابتدائی بیانات میں چونکہ کسانوں کا واضح طور پر حوالہ موجود ہے، لہٰذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف انہیں کے

---

[1] ملاحظہ ہو باب ا فصل ا۔

[2] لازمی طور پر یہ وہی طریقۂ کار ہوگا جسے گرانٹ ڈف (Grant Buff) نے ملک عنبر سے منسوب کیا ہے یعنی "واقعی پیداوار جنس کے ایک مناسب حصّہ کی قیمت کو جو متعدد فصلوں کے تجربہ کی بنیاد پر ہر سال کی پیداواروں کے مطابق متعین کر کے وصول کرنا History of the Marathas 1926ء ج (1) ص 95 جس کا حوالہ Shore's Minutes ص 182 میں آیا ہے)

[3] اس جملہ کا کسی طور پر بھی ترجمہ کرنا آسان نہیں۔ بلاکمین کے متن کی عبارت اس طور پر ہے: "و در پیمودن آن بازنہ گویند" وہ لوگ اس کی پیمائش کے لیے دوبارہ تقاضہ یا حقّ اصرار نہیں کرتے۔ لیکن .Add اور .Add 6552 دونوں مخطوطات شروع کے 'و' کو حذف کرنے اور 'در' کے بجائے 'از' پڑھنے پر متفق ہیں اور مذکورہ بالا متن میں اس خواندگی کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے۔ درحقیقت ضمیر 'آں' کا تعلق ارزانی یا سستائی سے ہونا چاہیے اس طور پر کوئی مطلب نہ نکلے گا، لہٰذا ہمیں مورلینڈ سے اتفاق کرتے ہوئے JRAS 1926 ص 45) یہ فرض کرنا چاہیے کہ یہاں 'اس' زمین کے لیے استعمال ہوا ہے۔

[4] آئین (ا) ص 389،

متعلق ہوگا۔ حکومت انگلشیہ کے ابتدائی دور میں بھی "رعیت" "لگان" عموماً نقد ادا کرتی تھی اور غلہ بٹائی کا صرف "بعض مقامات" پر رواج تھا۔[1] لیکن پیمائش کے متعلق جو جملہ ہے اس میں قدرے اشکال محسوس ہوتا ہے۔ آئین اکبری کے شماریات بنگال میں رقبہ کے اعداد بالکل نہیں ملتے اور عہد عالمگیری کے شماریات میں بھی پیمودہ مواضعات کا کل میں تناسب انتہائی قلیل ہے۔[2] برخلاف اس کے، بنگال کا سولہویں صدی کا ایک شاعر افغانوں کے عہد حکومت میں پیمائش کے سلسلہ میں ایک جاگیردار کے ملازم مال کی دھوکہ بازی کا ذکر کرتا ہے۔[3] عہد جہانگیری میں بھی "پیمائش" کا ایک حوالہ کسی جاگیر کی جمع کو جانچنے کے ایک ذریعہ کے طور پر ملتا ہے۔[4] بعد کے ایک تذکرہ میں بیان کیا گیا ہے کہ عہد عالمگیری کے اواخر میں مرشد قلی خاں نے بنگال اور اڑیسہ کا نائب صوبیدار مقرر ہونے پر مالگذاری کے پورے نظام کی از سر نو ترتیب دی اور اپنے ملازمین مال سے ہر موضع کی مزروعہ اور ویران زمینوں کی پیمائش کرائی۔[5] غالباً حکام بعض اوقات زمیندار پر مقرر کی ہوئی پرانی جمع کے کلیتہً متروک ہو جانے کی صورت میں پیمائش کراتے تھے۔ وسط اٹھارہویں صدی کے ایک ضوابط نامہ میں اسے بنگال کا ایک مستند طریقہ بتایا گیا ہے۔[6] ابوالفضل کے اس مبہم بیان کا بھی کہ یہاں پیمائش پر کسی کو اعتراض نہ ہوتا، حقیقتاً یہی مفہوم ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ چونکہ اس قسم کی پیمائش بہت شاذ اور وہ بھی مقامی معیار کے مطابق ہوتی تھی،[7] لہٰذا ان کی بنیاد پر رقبہ کے باضابطہ گوشوارے

---

[1] Shore's Minuts مورخہ جون 1789، پیرا 226 پانچویں رپورٹ، مدراس 1883ء ج (1) ص 190

[2] ملاحظہ ہو باب اول کی فصل ایک (عہد عالمگیری کے گوشوارے)

[3] مکند رام کی تصنیف 'چنڈی منگل' جس کا حوالہ 'Sukumar Sen, 'History of Bengali Literature میں آیا ہے۔ موازنہ ہو Ray Chaudhari, 'Bengal under Sukumar & Jahangir ص 25

[4] بہارستان غیبی، ترجمہ بورہ (2) ص 741-2 افسوس کہ میں اس عبارت کی اصل سے جانچ نہ کر سکا جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ یہ نادر مخطوطہ Bibliotheque. National, Paris میں موجود ہے۔

[5] ریاض السلاطین، بب۔ انڈ ص 252 [6] رسالۂ زراعت، اوراق 9 ب۔ 10 الف۔

[7] اٹھارھویں صدی کے اواخر میں بعض علاقوں میں زمیندار پیمائش کی بنیاد پر کسانوں پر لگان عائد کرتے تھے لیکن شور لکھتا ہے کہ مقامی معیاروں میں بے حد فرق ہوتا تھا (جون 1789ء کی Minutes پیرا 230 و 231 پانچویں رپورٹ، حوالہ سابقہ (1) ص 140-41)

مرتب نہ کیے جا سکتے تھے۔ ابوالفضل کا یہ بیان کہ مطالبہ مالگذاری 'نسق' پر مبنی تھا، زمینداروں پر عائد کیے ہوئے مطالبہ کے متعلق بھی ہونا چاہیے۔ جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے: اس امر کا کافی شہادتیں ملتی ہیں کہ بنگال میں یہ مطالبہ معمولاً طویل مدتوں تک بغیر کسی تبدیلی کے قائم رہا کرتا تھا۔[1]

فصل 4 تشخیص کی بنیادی اکائی: کسان کی انفرادی آراضی و موضع

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، سرکاری بیانوں میں یہ بات مسلسل کہی جاتی رہی ہے کہ موضع کے با اقتدار لوگوں کی یہ ہمیشہ کوشش رہا کرتی تھی کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو اپنے کمزور بھائیوں کے کاندھوں پر منتقل کردیں۔ کم از کم 'ہندوستان' میں جہاں نظام ضبط غالب تھا، مغلیہ انتظامیہ کا مطمح نظر یہ رہا کرتا کہ وہ ہر کسان سے مطالبۂ مالگذاری کے تعین یا وصولی کے سلسلہ میں علیحدہ علیحدہ معاملہ کرے۔ آئین اکبری کی ہدایت کے مطابق عمل گذار کو "موضع کے بڑے لوگوں کے ساتھ ساتھ 'نسق' نہ کرنا چاہیے کیونکہ اس سے رعایت اور بے خبری کے لیے راہ پیدا ہوتی ہے اور ظالمانہ رجحان رکھنے والے مقتدر اشخاص اس سے طاقت حاصل کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اسے چاہیے کہ ہر کاشتکار کے پاس انفرادی طور پر پہونچ کر اسے خوش اخلاقی کے ساتھ ایک تحریر دے اور ایک تحریر اس سے حاصل کرے۔"[2] ایک ضوابط نامہ میں بھی جو اس کے ایک صدی بعد مرتب ہوا 'انفرادی تشخیص تجویز کیے جانے کے بالکل یہی اسباب بیان کیے گئے ہیں۔[3]

آئین اکبری کی مذکورہ عبارت میں جن دو تحریروں کا حوالہ آیا ہے وہ علی الترتیب پٹہ اور قبولیت ہیں۔ ایک ضوابط نامہ میں ایک منفرد کسان کو دیئے جانے والے پٹہ کی نقل کا ایک نمونہ محفوظ ہے[4] ایک دوسری جگہ ایک منفرد کسان کی اس شکایت پر کہ اس کے پٹہ کی پابندی نہیں کی جارہی ہے جو حکم ہوا وہ بھی موجود ہے۔[5]

---

1. ملاحظہ ہو باب 5 کی فصل 3 ۔
2. آئین اکبری (1) ص 286
3. خلاصۃ السیاق، ورق 78 الف، .Or 20:26 ورق 30 الف۔
4. فرہنگ کاردانی، ورق 35 الف۔
5. درالعلوم ورق 62 الف۔

آئین اکبری میں تبکچی یا محاسب کے نام ہدایت ہے کہ وہ ہر کسان اور اس کے مورث کا نام[1] اسکی بوئی ہوئی فصل اور تشخیص شدہ جمع کا اندراج کرے اور پھر انفرادی تشخیصوں کی میزان کو موضع کی مالگذاری (محصول) کے طور پر دکھائے[2]۔ عالمگیر کے راس کدا س کے نام فرمان کے دفعہ 8 میں مندرج ہدایت میں مختصراً مگر یہی بات کہی گئی ہے کہ ہر موضع کی جمع کا تعین کسانوں کی انفرادی تشخیص (آسامی وار) کے بعد ہونا چاہیئے۔ اسی طور پر اس دور کے دوضوابط ناموں کے کاغذات تشخیصی کے نمونوں میں ہر کسان (آسامی) کے متعلق علیحدہ علیحدہ تمام تفصیلات یا تو درج ہیں یا ان کے درج کرنے کی ہدایت ملتی ہے[3]۔

عالمگیر کے فرمان میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ آفات سماوی کے برے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تشخیص کنندہ کوئی یکشت چھوٹ کے طور پر نہ دے جسے چودھری، قانون گو، مقدم اور پٹواری کسانوں میں تقسیم کریں بلکہ اسے چاہیئے کہ وہ خود کھیتوں کے معائنہ کے بعد ہر کسان کے لیے انفرادی چھوٹ کی رقم کا تخمینہ کرے[4]۔

آخر میں یہ معلوم کرنے کی غرض سے کہ وصولی تشخیص کے مطابق ہوئی ہے یا نہیں، مالگذاری کی وصولی کے بعد تبکچی کو سرخطوں یعنی رسیدوں یا یاداشتوں کو جو مقدم اور پٹواری نے کسان

---

[1] ابو الفضل 'مورث' کے لیے بجائے معمول کے لفظ 'نیا' کے 'نیاگی' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ غالباً مورث کے نام کا اضافہ شناخت کے لیے ضروری تھا۔ لیکن 'بھیاچارہ' مواضعات میں اس سے کسان کی حیثیت متعین کرنے میں بھی مدد ملتی تھی۔

[2] آئین اکبری (1) ص 288

[3] دستور العمل نویسندگی' اوراق 182 الف - 185 الف' فرہنگ کاروائی' ورق 33 ب' سیاق نامہ 32 - 33 خلاصتہ السیاق اوراق 75 الف - 78 ب' Or. 2626' اوراق 24 ب 28 الف۔

[4] فرمان بنام راسکداس کا دفعہ 9 ' آئین اکبری میں عملگزار کے نام یہ ہدایت بھی کہ اُسے نابود یعنی اس زمین کے لیے جس کی فصل کسی آفت کے نتیجہ میں خراب ہوگئی ہو گنجائش نکالنا چاہیئے یہ ظاہر کرتی ہے کہ اسے ہر کاشتکار کے نقصان کا علیحدہ علیحدہ تخمینہ لگانا ہوتا تھا۔ اسے اپنے تخمینہ کو تحریری طور پر "کاشتکار" کو دینے کی ہدایت تھی اور فصل کٹنے کے بعد آفت سماوی واقع ہونے کی صورت میں اسے پڑوسیوں کی "گواہی" لینا ضروری تھا۔" (آئین اکبری (1) 286)

کو دی ہیں جانچ کرنی چاہیئے۔[1] پہلے گذر چکا ہے کہ انتظامیہ تصرف بیجا کی روک تھام کی غرض سے موضع کے حسابات (کاغذات خام) کی وقتاً فوقتاً جانچ کرایا کرتا تھا۔ کسان جو رقوم ادا کرتے تھے ان کی تفصیل جانچ ہوا کرتی تھی اور یہ واضح ہدایت ہے کہ اگر واجب سے زائد وصولی کا پتہ چلے تو اسے واپس لے کر متعلقہ کسانوں کے کھاتہ میں جمع کر دی جائے۔[2]

اصل سوال یہ ہے کہ یہ ضابطے عملی اعتبار سے کس حد تک موثر تھے۔ ہر کسان پر علیحدہ سالانہ تشخیص کرنے میں جو زحمت ہوتی تھی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ غلّہ بٹائی کی اصل شکل میں یہ مسئلہ غالباً از خود حل ہو جاتا تھا، کیونکہ اس طریقہ میں مالگذاری کا حصّہ براہِ راست کسان کے کھیت سے یا پیداوار کے گٹھر سے وصول کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ طریقہ بجائے خود حکام کے لیے بے حد زحمت کا باعث اور خرچ طلب تھا۔ کسی دوسرے طریقہ کے تحت ہر منفرد آراضی کے بالمقابل مسلم موضع کی تشخیص بے حد آسان ہوا کرتی۔ ایک ضوابط نامہ میں اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ناپسندیدہ ہونے کے باوجود مواضعات کی اجتماعی (سربستہ) تشخیص کا عام رواج تھا۔[3] ایک دوسرے ضوابط نامہ میں مواضعات کی تشخیص کا تفصیلی طریقۂ کار تو بتایا گیا ہے، لیکن اس میں آراضیات کی انفرادی تشخیص کی ضرورت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔[4] گوکہ راسکداس کے نام عالمگیر کے فرمان میں انفرادی تشخیص کی ہدایت ملتی ہے، لیکن اس کے دیباچہ میں تشخیص و وصولی مالگذاری کے مروّجہ طریقوں کے سلسلہ میں کسانوں کے بجائے موضع ہی کو تشخیص کی ابتدائی اکائی قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ فرمان کے دفعہ ۵ میں دیوان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ جن مواضعات کا دورہ کرے وہاں دیکھے کہ جمع موضع کی قوت برداشت کے مطابق ہے یا نہیں اور جمع کی کاشت پر انفرادی تقسیم (تفریق جمع) کے سلسلہ میں چودھری، مقدم یا پٹواری نے کوئی ظلم تو نہیں کیا ہے لہٰذا یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ عام طریقہ یہ رہا ہوگا کہ امین یا تشخیص کنندہ موضع کی تشخیص تو خود کر لیتے تھے، لیکن اس کی کاشتکاروں پر تفصیلی تقسیم کا کام موضع کے چودھریوں کے سپرد رہتا ہوگا۔ عہدِ اکبری

---

[1] آئینِ اکبری (۱) صفحہ 288

[2] تجاویز فتح اللہ شیرازی، اکبر نامہ (3) صفحہ 452۔ 8۔ کاشتکار متعلقہ کے ذمہ سن رواں میں کوئی بقایہ واجب الادا ہونے کی صورت میں اس رقم کو سال آئندہ کے مطالبہ میں مجرا کیا جاتا تھا۔

[3] خلاصۃ السیاق ورق 78 الف، .Or 2026 ورق 30 الف،

[4] ہدایت القواعد، اوراق 10 الف۔ 11 الف۔

کے ضابطوں میں ایسی مثالیں مل سکتی ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ مالگذاری کی تشخیص "اسامی" پر نہیں لیکن اصلاً موضع پر ہوتی تھی۔ ٹوڈرمل کی یہ تجویز کہ خالصہ کی زمینوں کی ہر سال پیمائش نہ کرنی چاہیے بلکہ اسکے رقبہ کو ہر سال اندازاً ایک طرح کے نسق کے تحت بڑھاتے رہنا چاہیے۔ اس بات کا قوی ثبوت فراہم کرتی ہے کہ رقبہ کا ہر اضافہ ہر آراضی کی تفصیلی جانچ پر نہیں بلکہ مسلم موضع کے ایک سرسری جائزہ پر مبنی ہوتا تھا۔[1] ان امور کے پیش نظر یہ ناممکنات میں نہ تھا کہ سرکاری کاغذات تشخیص میں جہاں آسامی وار اندراجات ملتے ہیں وہ یا تو سرنے سے فرض ہوں یا گوؤں کے محاسب یا چودھریوں کے کاغذات کی نقل۔

اگر رعیتی یا کسانوں کے زیر قبضہ مواضعات میں یہ صورت تھی تو پھر زمینداروں کے زیر قبضہ مواضعات کے متعلق یہ قوی طور پر گمان کیا جا سکتا ہے کہ عمال مال محض مسلّم موضع پر یکجائی تشخیص کرکے زمیندار سے وصول کرتے تھے اور کسانوں پر انفرادی تقسیم سے انہیں کوئی بحث نہ ہوتی ہوگی۔ مگر اس کا بہرحال کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ یہ کوئی قانونی طریقہ تھا۔ جیسا کہ باب ۵ میں گذر چکا ہے، سرکاری نقطۂ نگاہ سے زمیندار کی حیثیت صرف ایک درمیانی شخص کی ہوا کرتی اور تشخیص کو واقعی کسان پر ہونا چاہیے تھا۔[2]

لیکن بعض طریقے ایسے تھے جن میں کسانوں سے انفرادی طور پر معاملہ کرنے کا دعویٰ کاغذی طور پر بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ بقول ابوالفضل، سور بادشاہوں نے غلہ بٹائی کے ساتھ "مقطعی" کے طریقہ کو بھی موقوف کر دیا تھا۔[3] ہندوستان کے اندر و باہر، مال کی تحریروں میں عربی مادہ "قطع" سے مشتق الفاظ مختلف معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں۔[4] مظہر شاہجہانی میں مختلف مقامات پر "مقطعی" کو ایک مقررہ رقم کے بدیہی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔[5] الف حقیقت میں یہ ایک مرکب لفظ ہے

---

[1] اکبر نامہ (3) ص 2 - 381

[2] ملاحظہ ہو باب 5 کی فصل 3۔

[3] آئین اکبری (۱) ص 296۔

[4] مثلاً "اقطاع" یعنی جاگیر اور "مقاطعہ" یعنی لگان کا ٹھیکہ۔ مورلینڈ کو یقین نہیں کہ ابوالفضل کی اصطلاح کو ان میں کس سے منسوب کرنا چاہیے (Agrarian System, 74) "مقاطعہ" کے اجارۂ مالگذاری کے مفہوم کے لیے ملاحظہ ہو، برنی، تاریخ فیروز شاہی 487 - Add 8 7721 ورق 14 ب، F. Lokkegeard, 'Islamic Taxation in the Classic Perisl' Copenhagen, 1950 PP.102-8. Lanbton, Land Lord and Peaserts in Pesia, P-435.

[5] الف مظہر شاہجہانی 134

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

جس کے معنی ایک ایسا نظام ہے جس میں 'مقطع' کو فوقیت تھی۔ سترھویں صدی کی مال کی تحریروں میں لفظ 'مقطع' کبھی بھی تنہا نہیں بلکہ ہمیشہ فقرہ 'بالمقطع' کے ایک جزو کے طور پر استعمال ہوا ہے اس کے لغوی معنی معینہ کے ہیں[1] لیکن ہماری تحریروں میں اسے مسلسل طور پر ایک مقررہ رقم کے مفہوم میں جو معیاری طور پر ادا کی جائے استعمال کیا گیا ہے' یہ عمال کی تنخواہ کے سلسلہ میں جو ایک مقررہ شرح پر ادا کی جائے استعمال ہوا ہے[2] اور محمد ہاشم کے نام عالمگیر کے فرمان کے دفعہ ۱۴ میں اسے مالگذاری کی ایک مقررہ شرح فی بیگھہ کے مفہوم میں استعمال کیا گیا۔ لیکن دیگر تحروں میں یہ خاص طور پر ایک مسلم موضع یا اس سے بڑے علاقہ کے مقررہ مطالبۂ مالگذاری کو مقررہ مطالبۂ مالگذاری کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے[3] دستاویزات اجارہ (ٹھیکۂ مالگذاری) میں اس لفظ کو یہ ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے کہ اجارہ دار کے لیے لازم تھا کہ وہ جاگیردار کو ایک معینہ رقم ادا کرے خواہ اسے کسانوں سے کتنا ہی وصول ہو[4] اسی طور پر متعدد مواضعات کی تشخیص مالگذاری کو جو اس کے مالکوں پر عائد کی جاتی تھی 'بالمقطع' کہتے تھے اور اس کے فی الواقعی مندرج اعداد ظاہر کرتے ہیں کہ تشخیص شدہ رقم مسلسل دو برسوں کے لیے مستقل رہتی تھی[5] عہد عالمگیری کی تحریروں کے ایک مجموعہ میں محمد ہاشم کے نام

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

"بارسیچہ کے بلوچ جو پرگنہ بوب کان کی پہاڑیوں میں رہتے ہیں ہر فصل پر سیوان کے جاگیردار کو اونٹ اور بھیڑ کی ایک معینہ تعداد پیش کرتے ہیں (شمشیر خاں کے تحت) انہوں نے مذکورہ "مقطعی" سے کم دینا شروع کر دیا۔ وغیرہ۔" ملاحظہ ہو نیز ص 28، 29، 69، 85،

[1] ملاحظہ ہو Steingass, 'Persian English Dictionary' اور Elhirt, Memoirs, & c. (2) ص 29 مجھے اس کا یقین نہیں ہے کونسا املا درست ہے۔ مقطع (Steingass) یا مقطع (Elliot) غالباً 'مقطع' ہندوستانی تلفظ کی بہتر نمائندگی کرتا ہے لہذا میں نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

[2] Selected Documents of Shahjahan's Reign pp 64, 179 وقائع دکن 49

[3] ملاحظہ ہو Elliot حوالہ سابقہ۔ وہ کہتا ہے کہ 'بالمقطع' کے معنی "فی ہل یا فی بیگھہ پر کچھ مقدار" کی مقررہ شرح اور "اراضیات زیر کاشت پر ایک مقررہ رقم بطور لگان ادا کرنے کا معاہدہ"۔ وہ آخر میں یہ بھی بتاتا ہے کہ "یہ اکثر یکمشت رقم 'یا فی الجملہ کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔"

[4] الہ آباد 884، Add. 6606 ورق 51 ب' اور 49 ب

[5] الہ آباد 1224۔ اس دستاویز کے اعداد مالگذاری کا مقابلہ سن سابقہ کی تشخیص مندرجہ الہ آباد سے کرنی چاہیے۔

فرمان کی ایک منسلکہ عبارت میں اندازہ ہوتا ہے کہ کسانوں کے زیر قبضہ بھی ایسے مواضعات تھے جن میں صرف ایک مقررہ زر مالگذاری کی ادائیگی پر اصرار کیا جاتا تھا اور اس سے زیادہ کچھ نہیں "اگر کسی پرگنہ یا موضع میں سرکشی (زور طلب) کا رجحان پایا جاتا ہو اور اگر اس موضع کے کسان کچھ رقم صرف بالمقطع ادا کرتے ہوں اور صحیح حالات کے مطابق تشخیص مالگذاری پر رضامند نہ ہوں اور اس نوعیت کی تشخیص کو نافذ کرنا ممکن نہ ہو اور (نفاذ کی صورت میں) اس پرگنہ یا موضع میں نزاع اور تباہی کا خطرہ ہو تو پھر وہاں کی مالگذاری کو حسب سابق وصول کرنی چاہیئے اور کوئی بات ایسی نہ کرنی چاہیئے جو نزاع کا سبب بنے"[1] چنانچہ یہ ایک ایسا طریقہ تھا جو عام طور پر ناپسند کیا جاتا تھا اور صرف مخصوص حالات میں اس کی اجازت تھی۔ ان حالات میں بہت زیادہ ممکن ہے کہ یہ بالکل وہی طریقہ ہو جسے ابوالفضل مقطعی کہتا ہے اور جو سور بادشاہوں میں یا اس کے قبل وصولی مالگذاری کے جو تین طریقے بتائے جاتے ہیں، ان میں سے پہلا وہ تھا جس کے تحت ایک "مقررہ رقم" موضع کی چودھری پر عائد کی جاتی تھی جو اسے بقیہ لوگوں سے وصول کرتا تھا۔[2]

اجارہ یا ٹھیکہ: مالگذاری اپنی اصل شکل میں بحیثیت ایک عام رواج کے سرکاری طور پر ناپسند کیا جاتا تھا۔[3] لیکن واتفاقی اعتبار سے حکام مال بعض اوقات منفرد مواضعات کی مالگذاری کو اجارہ پر اٹھاتے تھے۔[4] لیکن اس موضوع پر جو احکام صادر ہوئے ہیں، ان میں اس امر پر اصرار کیا جاتا ہے کہ

---

[1] درر العلوم ورق 141 ب۔ مقطعی کے انتظامات جن کا ذکر مظہر شاہجہانی، 28-9، 83، 134 میں آیا ہے اکثر قبیلے کے افراد اور غیر مطیع کسانوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ منچھر جھیل کے نواحی مواضعات کے باشندے بھی اپنی جمع کی ہوئی مچھلی و گھاس پر "مقطعی" ادا کرتے تھے (ایضاً 69) ظاہر ہے کہ اس قسم کی پیداواروں پر کوئی اور طرح کا انتظام ممکن نہ تھا۔

[2] حسن علی خان کی "دولت شیر شاہی" ترجمہ ڈاکٹر آر۔ پی ترپاٹھی Medieval India Cuarterly, Vol.1.No.-1P 62 (بدقسمتی سے اس تصنیف کے نادر مخطوطہ کے اجزا ڈاکٹر ترپاٹھی کے استعمال اور ترجمہ کرنے کے بعد دوبارہ لاپتہ ہوگئے اور اصل کا صرف ایک جزو محفوظ ہے ترجمہ میں ایک نقص بھی ہے یعنی یہ کہ "نظام ال کے تین طریقوں" کا ذکر کیا گیا ہے مگر ان میں سے صرف ایک یعنی پہلے کا بیان ملتا ہے۔

[3] خالصہ اور جاگیروں دونوں میں اجارہ کی قطعی ممانعت کے لیے ملاحظہ ہو مرآۃ (1) ص 292 (گجرات) اور اخبارات 37/38 (کشمیر)

[4] اس مضمون کے بیان کے لیے اور موعودہ رقم مالگذاری ادا کرنے کے متعلق اجارہ دار کے معاہدہ کے مسودہ کے لئے ملاحظہ ہو، فرہنگ کاروانی، ورق 35 الف۔ ب۔

صرف تباہ شدہ مواضعات اور وہ جن کے کسانوں کے پاس ضروری وسائل نہ رہ گئے ہوں اجارہ پر اس شرط کے ساتھ اٹھائے جائیں کہ اجارہ دار انہیں بحال کریں گے[1] اور کسی صورت میں بھی کسی اہلکار مال یا چودھری یا قانون گو یا مقدم یا ان میں کسی سے تعلق رکھنے والے شخص کو کسی موضع کے اجارہ پر لینے کی اجازت نہ تھی[2] علاوہ اس کے مالگذاری کے اجارہ دار کو کسان سے معینہ مالگذاری سے زائد وصول کرنے کی ممانعت تھی[3] حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ اس ممانعت کی شاید ہی کبھی پابندی کرتے ہوں[4] یہ ضمنی طور پر بتا دینا مناسب ہوگا کہ ہم یہاں صرف منفرد مواضعات کی مالگذاری کی اجارہ داری کا ذکر کر رہے ہیں نہ کہ اس علانیہ یا خفیہ اجارہ داری کا جو جاگیروں یا خالصہ کے نظم ونسق کے سلسلہ میں اونچی سطحوں پر رائج تھی[5]

---

[1] نگارنامۂ منشی، اوراق 126 ب، 195، الف۔ب، Bod. اوراق 97 ب۔ 198 الف، 154 اب۔ 155 الف، مطبوعہ 97 - 8 - 49 -

[2] مرآۃ (۱) ص 292 نگارنامۂ منشی ورق 195 الف۔ب، Bodl. اوراق 154 ب۔ 155 الف مطبوعہ 149، Fryer 86 ۔ ورق 93 ب، نگارنامۂ منشی، میں مالک کی رضامندی پر بھی زور دیا گیا ہے۔

[3] نگارنامۂ منشی، اوراق 19اب، 195 ب Bodl اوراق 92 الف، 15 5 الف، مطبوعہ 92، 149 .

[4] درالعلوم ورق 65 الف میں مندرج ایک حسب الحکم میں، مالگذاری کے ایک اجارہ دار کے کئے ہوئے مظالم کے ایک مخصوص واقعہ کا ذکر آیا ہے: "اس وقت حدود دیلّوں کے موضع حسن پور کے کاشتکاران سیماؔ وسوندھی، سیام، اور سپلاد وغیرہ نے دربار عالمپناہ میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ اس مقام کے چودھری مسمی بھیا نے اس محال کے محصل مالگذاری (عامل) سے سازش کرکے اس موضع کی اجارہ داری کو جو پہلے دوست محمد کے پاس بھی خود لے لیا ہے۔ اس نے زور وزبردستی سے فصل خریف کے دوران 800 روپیہ چھین لیا ہے اور فصل ربیع پر رکاوٹ پیدا (قرق) کرکے انہیں ہر طرح سے تنگ و پریشان کرتا ہے، علاوہ اس کے پانچ سال کے دوران وہ درخواست کنندگان کے مال واسباب سے علاوہ قانونی مالگذاری (مال واجب) کے 1300 روپیہ اپنے ذاتی تصرف میں لا چکا ہے اور وہ موضع کے حسابات (کاغذ خام) کو چھین کر ان پر خود قابض ہو گیا ہے . . . ." اس نے یہ آخری عمل غالباً اپنی ناجیز وصولیوں کو گرفت کئے سے بچانے کی غرض سے اختیار کیا ہے۔

[5] ملاحظہ ہو باب 7 کی فصل 2 ۔

یہ تعین کرنا کہ عہد زیر مطالعہ میں مقطعی اور اجارہ داری کا رواج کس قدر پھیلا ہوا تھا آسان نہیں[1]۔ تشخیص مالگذاری کے عام ضابطے اور یہ واضح اطلاع کہ مقطعی کو بے دخل کر دیا گیا تھا اور سرکاری احکام میں اجارہ داری کی مذمت، ان سب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طریقے ضبطی صوبوں اور گجرات اور (مرشد قلی خاں کی اصلاحات کے بعد) مغلیہ دکن ایسے علاقوں میں زیادہ عام نہ رہے ہوں گے[2]۔ بلکہ اجتماعی تشخیص کی متعدد درمیانی شکلیں رہی ہوں گی، مثلاً موضع کے بڑے لوگوں کے ساتھ "نسق" کرنا مقدموں کو مالگذاری کی اجارہ داری دینے کے عمل سے حقیقتاً بہت زیادہ مختلف نہ رہا ہوگا۔

فصل 5 ادائیگی کی شکلیں

شمالی ہندوستان یا کم از کم ملک کے وسطی خطوں کا کسان تیرھویں صدی ہی سے لگان نقد کی شکل میں ادا کیا کرتا تھا[3]۔ دور مغلیہ میں خاص طور پر ہندوستانی میں تشخیص کے طریقے یعنی "ضبط" اور "نسق" کی وہ شکل جو اس پر مبنی ہوتی تھی کے تحت مالگذاری کے مطالبہ کو براہِ راست رقموں میں معین کیا جاتا تھا۔ کسی حالت میں بھی رقم کو جنس میں تبدیل کرنے کے کسی قاعدہ کا اندراج نہیں ملتا۔ برخلاف اس کے "غلہ بٹائی" اور "کنکوت" کے طریقوں کے اختیار کیے جانے کی صورت میں جن میں مطالبہ کو جنس میں مقرر کیا جاتا تھا اس بات کی اجازت تھی کہ اسے نرخ بازاری کے مطابق رقم میں "بشرطیکہ یہ کسانوں کے لیے بار نہ ہو" تبدیل کیا جائے[4]۔ حقیقت میں، اس دور کے دو ضوابط ناموں میں مندرج

---

[1] یہ ایک ایسا معاملہ تھا جس سے خود مغلیہ انتظامیہ اچھی طرح واقف تھا۔ راسکد اس کے نام عالمگیر کے فرمان کے دیباچہ میں اس امر کی شکایت ملتی ہے کہ ہر موضع کے کاشتکاروں کی تعداد اور "مستاجروں (اجارہ داران مالگذاری) اور کسانوں (رعایا) کی علیحدہ علیحدہ تقسیم (تفریق)" مرکز کو فراہم نہ کی جاتی تھی۔

[2] عہد عالمگیری میں برار کے پرگنہ بیل کے کاغذات میں باضابطہ نظم و نسق کی تحتی زمین کی خالص مالگذاری بقدر 25077 ٹنکوں کے بالمقابل ایک ہنڈی ساری، (ٹھیکہ) موضع کی آمدنی صرف 800 ٹکے دکھائی گئی ہے (I. H. R. C. 1929، ص 86)

[3] موازنہ بہ ص 37-8

[4] آئین اکبری ص 286

دونوں حسابات کے نمونہ میں، مطالبۂ کنکوت کو اور ان میں سے صرف ایک میں دوسرے میں نہیں مطالبۂ غلہ بٹائی کو رقم میں تبدیل کیا گیا ہے[1] یہ ایک خاص بات ہے کہ اکبر نے ہر بیگھہ پر دس سیر غلہ مالگزاری کے جزو کے طور پر وصول کر کے قحط کے خیال سے جمع کرنے کے لیے خصوصی احکام صادر کئے تھے۔ لیکن اس کا خاص مقصد غالباً شاہی اصطبل کے جانوروں کی ضروریات کا پورا کرنا تھا[2] اس سے صاف ظاہر ہے کہ جنس میں مالگزاری صرف استثنائی صورت میں وصول کی جاتی تھی۔ اودھ کے ایک علاقہ کی ابتدائی تحریروں میں مسلّم مواضعات کے مطالبۂ مالگزاری کا رقم میں عائد کیا جانا درج ہے[3] ایک خطے جس میں ہریانہ میں دی ہوئی ایک جاگیر کے تین مواضعات میں وصولیٔ مالگزاری کے صحیح واقعات درج ہیں، ضبطی صوبوں کے عام حالات کی وضاحت ہوتی ہے۔ ان میں سے دو مواضعات میں مالگزاری کی تشخیص اور طریقۂ ادائیگی کو نقد میں مقرر کیا گیا تھا۔ تیسرے موضع کی مالگزاری جو بٹائی غلہ کے تحت تھا، جنس میں وصول کی گئی تھی۔ اس طور پر منجملہ جنس وصول شدہ کے باجرہ کو موقع پر "کچھ دن گذر جانے کے بعد بقیمت مناسب" فروخت کرنے کی اور بقیہ جنس کو جس میں موٹھ، تل اور کپاس شامل تھی صدر مقام یعنی حصار تک گاڑی پر ڈھو کر لانے کی ہدایت تھی[4] چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب مالگزاری جنس میں وصول کی جاتی تو بعض اوقات اسے فوراً فروخت کر کے اس کی قیمت نقد وصول کر لی جاتی تھی۔

کشمیر میں غلہ بٹائی کے 'نسق' کا اپنا ایک مخصوص طریقہ رائج تھا۔ زمین کی مالگزاری کو چاول کے 'خربار' (گدھے کے بوجھ) کی مقدار میں معین کیا جاتا اور یہ کبھی بھی نقد وصول نہ کی جاتی تھی یہاں تک کے محصولوں سے جو رقم وصول ہوتی اس کا تخمینہ بھی تشخیص کے اغراض کے تحت چاول کی مقداروں ہی میں کیا جاتا تھا[5] کہا جاتا ہے کہ جب جاگیرداروں نے "غلہ بٹائی کی اس سرزمین سے سونے و چاندی کا مطالبہ

---

[1] دستور العمل نویسندگی اوراق 183 ب۔ 185 الف، خلاصۃ السیاق، ورق 76 ب۔ Or. 2026 ورق 28 الف، Add. 6603 ورق 62 الف میں 'دماؤ' کی اصطلاح کو بٹائی غلہ کے تحت مالگزاری جنس کو رقم میں تبدیل کرنے کے عمل کو بتایا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ "وہ لوگ ہمیشہ اس (زر نقد) کو نرخ بازاری سے زیادہ پر وصول کرتے تھے۔"

[2] آئین اکبری (ا) ص 199-200

[3] الٰہ آباد 897، 1206، 1220، 1223

[4] بالکرشن برہمن ورق 63 الف۔ ب مواضعات پرگنہ سرسا کے تھے۔ [5] آئین اکبری (ا) ص 570،

کرنا شروع کیا تو بے حد مظالم پیش آئے۔ لیکن اکبر نے اپنے عہد کے بیالیسویں برس اس جدید طریقہ کو سختی سے روکا۔[1]

غلہ بٹائی، ٹھٹھہ اور اجمیر کے بعض حصوں میں رائج تھی اور بعد میں اسے ملتان اور بھکر کی سرکاروں میں بھی پھیلایا گیا۔ اگر مطالبہ بالجنس کو نرخ بازاری کے مطابق نقدی تبدیل کرنے کا طریقہ معمولات میں تھا تو پھر 44ء جلوس عالمگیری میں ملتان کے صوبیدار شاہزادہ معزالدین کی شکایت کو بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کی شکایت یہ تھی کہ چونکہ اچھی فصل کی وجہ سے قیمتیں بہت گھٹ گئی ہیں، لہٰذا اسکی جاگیروں کی جمع میں بے حد کمی واقع ہو گئی ہے۔[2]

یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ گجرات میں پیمائش اور نسق کے سابقہ طریقہ کے تحت مطالبہ کو رقم میں لیکن غلہ بٹائی کے تحت جنس میں معین کیا جاتا ہوگا۔ لیکن یہاں بھی ہمیں جنوری 1703ء میں یہ شکایت ملتی ہے کہ زر مالگذاری (زر محصول) کو پرگنہ پلید میں اس لیے وصول نہ کیا جا سکا کہ غلہ ارزاں تھا اور راستہ کے ناجائز جبری محصولوں کی وجہ سے انہیں احمد آباد تک برآمد کرنے میں رکاوٹ تھی۔[3]

مغلیہ دکن میں ایک پیدہ سرسری تشخیص پر مبنی مالگذاری کی نقدی ادائیگی کو وہاں کا پرانا رواج بتایا گیا ہے۔[4] مرشد قلی خاں کی رائج کی ہوئی غلہ بٹائی کے تھوڑے عرصہ تک قائم رہنے کے بعد وہاں

---

[1] اکبرنامہ (3) ص 726

[2] اخبارات 44/162 یہ مسئلہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اور اس کی جو شکل ضبطی صوبہ میں ہوا کرتی تھی۔ ان دونوں میں غالباً ایک باریک سا فرق ہے، ضبط کے تحت قیمتوں میں تخفیف خود جمع پر اثر انداز ہوا کرتی حالانکہ اس حالت میں یہ واقعۃً وصول نہ کی جاتی رہی ہوگی۔ غلہ بٹائی کی صورت میں چونکہ مطالبہ کو رقم میں خود تشخیص کرنیوالا نرخ بازاری کے مطابق تبدیل کرتا تھا، لہٰذا نرخ کی تخفیف سے خود بخود کم ہو جاتی تھی۔

وقائع اجمیر، 114 کی ایک اطلاع کے مطابق پرگنہ میرتہ کے 23 مواضعات سے جہاں سرکاری ملازمین نے غلہ بٹائی رائج کیا تھا 5,000 من غلہ بطور مالگذاری وصول ہوا۔ لیکن اسی علاقہ کے پرگنہ جودھپور میں مالگذاری زمین کو براہِ راست نقد میں وصول کیا گیا تھا یا اسے کسی منزل پر نقد میں تبدیل کیا گیا تھا کیونکہ یہاں کے مواضعات پر 13,400 روپیہ 13 بطور مطالبہ مالگذاری تشخیص ہوا تھا (ایضاً 184)

[3] اخبارات (ا ے) 77۔

[4] صادق خاں۔ Or. 174 ورق 185 الف۔ ب، Or 1671 ورق 90 ب، خافی خاں (1) ص 732 نوٹ

نقدی ادائیگی کا سلسلہ دوبارہ قائم ہوا حالانکہ اس کی بنیاد اب پیمائشی تشخیص تھی[1]
وسطی ہندوستان کے علاقہ گڈھ میں، آئین اکبری کے بیان کے مطابق، کسان سونے کی مہروں اور تانبہ کے سکوں میں لگان ادا کرتے تھے[2] لیکن مشرق کی طرف اڑیشہ میں کسان دھات کے سکوں سے نا آشنا اور اس کی جگہ کوڑیاں استعمال کیا کرتے[3] مگر ان کے لگان ادا کرنے کے طریقہ کا ہمیں صحیح علم نہ ہو سکا۔

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، بنگال میں کسان عام طور پر لگان نقد میں ادا کیا کرتے تھے اور غلہ بٹائی کا رواج بہت شاذ تھا۔ جہانگیر کے قول کے مطابق سلہٹ میں کسان اپنے لڑکوں کو بطور خواجہ سرا، لگان کے عوض میں دیدیا کرتے تھے[4] مسلمان رؤسا کے حرم میں ان کی غیر معمولی مانگ کے باعث، وہ حقیقتاً نقد سیال ہی کی حیثیت میں تھے۔

مذکورہ بالا اطلاعات سے غالباً یہ نتیجہ بجا طور پر اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کشمیر اور اڑیسہ ایسے دور افتادہ یا راجپوتانہ کے ویران علاقوں کو چھوڑ کر مملکت کے بقیہ تمام حصوں میں نقدی رشتوں کا رواج مستحکم طور پر قائم تھا۔ اس رواج کا صرف یہ مفہوم تھا کہ کسان مطالبۂ مالگذاری کو ادا کرنے کی غرض سے اپنی پیداوار کے اچھے خاصے حصہ کو اور بہت سی صورتوں میں تو بیشتر حصہ کو فروخت کرنے پر معمولاً مجبور رہتا۔ باب دوئم میں ان حالات پر بحث آچکی ہے جن کے تحت کسان بازار سے اپنے تعلق کو قائم رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ مطالبۂ مالگذاری کی نقدی شکل نے کسان کی فاضل پیداوار میں ایک اور طبقہ یعنی گاؤں کے مہاجن اور بیوپاری کو دخیل کر کے اس میں اس کے حصہ کا اضافہ کر دیا

---

[1] ملاحظہ ہو باب 3 اگر بمبئی اور جزیرہ سالسٹ کے متعلق شہادت کی رو سے فیصلہ کیا جائے تو کوکن (جو مرشد قلی خاں کے زمانہ میں مغلیہ دکن میں شامل نہ تھا) کی ایک استثنائی صورت ہوگی کیونکہ وہاں زمین کی مالگذاری چاول کی 'موریوں' میں ادا کی جاتی تھی (Factories 1668-9 صفحہ 216-7 Careri 179)

[2] آئین اکبری (1) صفحہ 456 اصل عبارت میں 'مہر دپیل' ہے لیکن میرا خیال ہے کہ 'پیل' کو غلطی سے 'پل' کی جگہ لکھا گیا ہے۔ Jarret (سرکار ایڈیشن (2) صفحہ 207) میں بلا کسی جھجک و تردد کے اس جملہ کا اس طور پر ترجمہ کیا گیا ہے: "کاشتکاران لگان کو مہر اور ہاتھیوں کی شکل میں ادا کیا کرتے تھے۔"

[3] Master (2) صفحہ 85، Bowerez 199۔

[4] تزک جہانگیری 71-2 بقول جہانگیر اس نے اس رواج کی ممانعت کر دی تھی مگر یقین ہے کہ یہ ممانعت برائے نام رہی ہوگی۔

تھا۔ برخلاف اس کے زرعی تجارت میں کافی ترقی ہو جانے کے بعد جب کسان منڈی کی مانگ کے مطابق اپنی فصل پیدا کرنے لگا تھا تو حکام کا کسان سے اس کی ہر پیداوار میں بمقدار جنس اپنے حصہ پر اصرار کرنا اس کے لیے قطعاً دشواریوں کا سبب بنتا رہا ہوگا۔[1]

نقدی رشتوں نے جو خود ایک نسبتاً ترقی یافتہ تجارتی معاشرہ کی پیداوار ہوتی ہے مغلوں کے شاہی نظام کے لیے جن میں حکمران طبقہ کے افراد زمین پر قبضہ کے بجائے وصولیٔ مالگذاری کے حق پر زیادہ زور دیتے تھے حقیقی بنیاد فراہم کی تھی۔ اس سے اس امر کی بھی توجیہہ ہوتی ہے کہ مغلیہ ہندوستان کے زرعی پیداوار کے نظام میں زرعی غلامی (Serfdom) اور جبری محنت کے عناصر اس پیمانہ پر کیوں رائج نہ تھے جس قدر کہ یورپ کے جاگیردارانہ (Fendal) نظام میں۔ چنانچہ اس دور میں جو غلامی بھی پائی جاتی ہے۔ وہ گھریلو نوعیت کی ہے اور جو جبری کام یعنی بیگار لیا جاتا ہے وہ بالعموم کسی پیداواری کام کے ایک باضابطہ عنصر کے طور پر نہیں بلکہ وہ محنت کی ایک استثنائی شکل ہوتی تھی جو حکام بعض باشندوں سے لیتے تھے۔[2]

فصل ہٰذا کے اختتام پر مور لینڈ کے قائم کیے ہوئے ایک سوال پر جس کا خود اس نے نامکمل جواب دیا ہے کچھ لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا سترھویں صدی کے دوران کسان پر مطالبہ بمقدار داموں (تانبہ کے سکوں) کے معین کیا جاتا تھا یا بمقدار روپیوں کے اور یا اس کی ادائیگی داموں میں ہوتی تھی یا روپیوں میں۔[3] اس سوال کا قدرے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ عہد زیر مطالعہ میں بمقدار چاندی تانبہ کی قیمت میں بے حد اضافہ ہوا[4] اور اگر یہ ثابت کیا جا سکے کہ اب بھی مالگذاری داموں

---

[1] مثال کے طور پر اگر فرض کر لیا جائے کہ کوئی کسان اپنی زمین کے ایک حصہ پر فصل خریف میں کپاس بازار میں فروخت کرنے کے لیے اور جوار اپنے کنبہ کے خرچ کے لیے بوتا ہے تو نقد لگان ادا کرنے کی صورت میں وہ مطالبہ کو محض کپاس سے پورا کر دے گا لیکن دونوں پیداواروں سے حصہ لینے کی صورت میں اس کے پاس کھانے کی کمی ہو جائے گی اور اسے حکام سے ان کی مانگی ہوئی قیمتوں پر اسی غلہ کو خریدنا ہوگا۔ اس قسم کے طریقے بظاہر کورومنڈل کے کسانوں سے ناجائز وصولیوں کے مزید ذرائع کے طور پر اختیار کیے جاتے تھے۔ Ray Chaudhari, (Dutch in Coromonded 3-332)

[2] حکام جن شکلوں میں بیگار لیتے تھے ان کے لیے باب ۶ ملاحظہ ہو۔

[3] Akbar to Aurangzeb صفحہ 61-260 [4] ملاحظہ ہو ضمیمہ 'ج'۔

میں ادا کی جاتی تھی تو اس کا یہ مطلب ہوا ہے کہ بمقدار چاندی کسان پر جو بار پڑتا تھا اس میں اضافہ ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ آئین اکبری میں دستور دام و جیتل میں درج ہیں، لیکن اس کے مابعد عہد کی شہادتیں مظہر ہیں کہ اکبر کی معین کی ہوئی تانبہ اور چاندی کی باہمی نسبت کے متروک ہو جانے کے بعد کسانوں پر مطالبہ کا تعین بلا استثنا روپیوں میں ہونے لگا۔ اور اس کی کسروں کو آنوں میں دکھاتے تھے[1] یہ طریقہ نقدی شرحوں اور کسانوں پر تشخیص شدہ جمع کے اور آمد و خرچ کے حسابات یہاں تک کہ موضع کے حسابات[2] اور نیز ہمعصر تحریروں میں کسانوں پر مقرر کیے ہوئے جمع کے تمام ضمنی حوالوں میں ملتا ہے[3] راسکد اس کے نام فرمان کے دفعہ 8 میں کسانوں سے ادائیگی مالگذاری کے سلسلہ میں قابل قبول سکوں کے ضمن میں روپیہ کے علاوہ کسی اور اکائی کا ذکر نہیں آتا۔ عطیات جاگیر میں جو جمع استعمال میں آتی تھی محض انہیں ہمیشہ داموں میں دکھاتے تھے (اور اسی لیے انہیں جمع دامی کہتے تھے) لیکن جیسا آگے ذکر آئے گا، ایسا صرف اس لیے تھا کہ منصبداروں کی تنخواہیں بمقدار دام دکھائی جاتیں اور وہ بھی محض حساب کتاب کی غرض سے۔ حقیقتاً جہاں کہیں بھی وصول کی ہوئی مالگذاری جو حاصل کہلاتی خواہ وہ جمع دامی کے ساتھ ہی کیوں نہ درج ہو ہمیشہ روپیوں میں دکھائی جاتی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحیح معنوں میں سکہ رائج الوقت یہی تھا[4]

---

[1] بہار میں غالباً مقامی ٹکا یا ٹنکا استعمال ہوتا رہا۔ لیکن یہ کلیتہً حساب کتاب کی رقم تھی۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ (ج)،

[2] دستاویزات کی ان مختلف قسموں کو سترھویں صدی کے حساب کتاب کے ضوابط ناموں میں دیکھا جا سکتا ہے، مثلاً خلاصتہ السیاق، جو پنجاب میں، دستور العمل نویسندگی جو سرکار سنبھل (صوبہ دہلی) میں، سیاق نامہ جو صوبہ الہ آباد میں دستور العمل عالمگیری جو بہار میں اور فرہنگ کاروانی جو بنگال میں مرتب ہوئی۔

[3] موازنہ بہ بالکرشن برہمن، ورق 63 الف۔ ب (بہر پانہ) و دارالعلوم، اوراق 54 ب 55 الف Add. 24 039 ورق 36 ب (بنگال)

[4] موازنہ بہ لاہوری (2) صفحات 330، 397 ادب عالمگیری، اوراق 31 ب۔ 32 الف، 49 الف۔ ب رقعات عالمگیر ندوی ایڈیشن صفحات 88، 163-4، دستور العمل عالمگیری، ورق 179 الف۔ ب ضوابط عالمگیری، Add. 6598 اوراق 131 الف، 132 الف، Or. 1641 اوراق 44 الف، 6 ب Fr ser 86 اوراق 57 ب۔ 61 ب۔ انتخاب دستور العمل بادشاہی اوراق 1 ب۔ 3 ب، 8 الف۔ 11 ب کے مالگذاری کے گوشواروں میں جمع دامی کے اعداد کے بعد حاصل کو روپیوں میں دکھایا گیا ہے۔

فصل ۵ مالگذاری زمین کی وصولی

غلہ بٹائی کے علاوہ دیگر طریقوں میں مالگذاری کی وصولی اور اس کی تشخیص بالکل مختلف عمل ہوا کرتے تھے۔ غلہ بٹائی میں چونکہ حکومت کا حصہ بوقت تقسیم کھیت یا کھلیان سے براہ راست اٹھایا جاتا تھا، لہٰذا تشخیص کا کوئی سوال ہی نہ پیدا ہوتا۔ دیگر طریقوں کے تحت تشخیص تخم ریزی اور فصل جمع کرنے کے درمیان کسی وقت بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن وصولی، خواہ نقدی ہو یا جنس میں ہمیشہ فصل کاٹنے کے وقت کی جاتی تھی۔

بقول ابوالفضل مالگذاری کے محصل (عمل گذار) کو "(فصل) ربیع کی وصولی ہولی (مارچ میں تہوار کے دن) سے اور خریف کی وصولی دسہرہ (اکتوبر) سے شروع کرنی چاہئے۔" یہ بھی ہدایت تھی کہ "اسے کاٹی ہوئی فصل پر پابندی سے مالگذاری وصول کر لینا چاہئے اور اس کام کو اگلی فصل پر نہیں اٹھا رکھنا چاہئے۔"[1] فصل خریف میں چونکہ مختلف پیداواریں مختلف اوقات میں کاٹی جاتی ہیں، لہٰذا مالگذاری تین مرحلوں میں وصول کرنا ہوتا تھا۔[2] چنانچہ کم از کم فصل خریف میں مالگذاری کی وصولی صرف قسطوں ہی میں ممکن ہو سکتی تھی جس کے راسکد اس کے نام عالمگیر کے فرمان کے دفعہ ۸ میں عمومی الفاظ میں گنجائش رکھی گئی ہے۔

فصل ربیع بہت ہی مختصر وقت میں جمع کی جاتی تھی اور حکام اس بات کی فکر رکھتے تھے کہ وہ فصل کے کٹنے اور اس کے کھیتوں سے منتقل کیے جانے کے قبل ہی مالگذاری وصول کریں۔[3] اس فکر کی وجہ سے یہ طریقہ رائج ہوا کہ بغیر مالگذاری ادا کئے ہوئے فصل کو کاٹنے سے منع کر دیا گیا۔ جبر کا یہ طریقہ جو در اصل، عہد عالمگیری[4] کے دو انتظامی ضوابط ناموں میں تجویز کیا گیا ہے،

---

[1] آئین اکبری (۱) صہ 287،

[2] پہلے ساونیں (شالی) پر پھر باجرہ پر اور آخر میں گنے پر (سیاق نامہ 48-9)

[3] سیاق نامہ، 49.

[4] سیاق نامہ 49 میں یہ طریقہ صرف فصل ربیع کے لیے تجویز کیا گیا ہے، لیکن خلاصۃ السیاق ورق 80 الف، Or. 2026 ورق 35 الف میں بغیر فصل کی تخصیص کے یہ درج ہے کہ "جب فصل پک جائے تو اس (محصل مالگذاری) کو چاہئے کہ وہ نگرانی کے لیے سوار اور پیادے تعینات کرے تاکہ کسان سال رواں کی مالگذاری، قرضہ تقاوی اور بقایہ سابقہ ادا کئے بغیر فصل کو نہ اٹھا سکیں۔"

غالباً سترھویں صدی میں زیادہ عام ہوگیا تھا۔ منڈی میں صوبۂ آگرہ میں کول (موجودہ علی گڈھ) کا دورہ کرتے وقت معلوم ہوا کہ یہ ایک نیا طریقہ تصور کیا جاتا تھا۔" یہاں اس وقت اس قلعہ میں ان (گاؤں والوں) میں سے 200 قید ہیں کیونکہ وہ اپنے محصولوں کو ادا نہ کر سکتے تھے جو اس کے قبل تک ان کے غلّوں کو فروخت ہونے کے بعد ادا کیا جاتا تھا۔ مگر اب انہیں محصول غلّہ کے کھیت میں موجودگی کی حالت میں ادا کرنا ہوتا ہے۔ اب تک ہندوستان کے ہندوؤں یا اصلی باشندوں کی ایسی ہی زندگی ہے۔"[1] عہد عالمگیری کی تحریروں میں اس طریقہ کے خلاف ہمیں دو شکایتیں ملتی ہیں۔ اول ایک چودھری کے خلاف ہے جو "فصل ربیع کے کاٹنے پر رکاوٹ پیدا کرکے ان (کسانوں) کو طرح طرح کی اذیتیں پہونچاتا تھا۔"[2] دوئم، مالگذاری کے ایک محصل کے خلاف ہے جس نے "مدعی (جو زمیندار تھے) کے لڑکوں اور مویشیوں کو ایسے وقت پر جبکہ فصل ابھی ہری تھی فروخت کرکے" ایک کثیر رقم وصول کی۔[3] ان حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ فصل کی تیاری کے قبل جبکہ کسانوں کے پاس کچھ بھی پساندہ نہ رہتا ہو ان سے مالگذاری طلب کرنا کس قدر ظالمانہ عمل تھا مگر ساتھ ساتھ یہ عمل ایک منظّم نقدی معیشت کی موجودگی کا بھی مظہر تھا، کیونکہ اگر حکام کو یہ توقع نہ ہوتی کہ کسان اپنی فصلوں کو تیاری کے قبل ہی غلّہ کے بیوپاریوں اور ساہوکاروں کے پاس رہن کرکے سرکاری مطالبہ کو ادا کر دیں گے تو اسے اختیار کرنا ناممکن ہوتا۔

مالگذاری عموماً خزانہ میں عامل یا محصل مالگذاری کے معرفت جمع کی جاتی تھی، حالانکہ اکبر کا انتظامیہ کسان کے براہِ راست ادا کرنے کی بہت افزائی کرتا تھا۔[4] کسان، بلکہ ان کے نمائندوں

---

[1] Munny 73-4 چونکہ اس کا سفر علی گڈھ دسمبر میں ہوا تھا، لہٰذا مطالبۂ مالگذاری فصل ربیع کا رہا ہوگا۔

[2] درالعلوم، ورق 65 الف۔ب۔

[3] بالکرشن برہمن، اوراق 63 ب 64 الف۔

[4] تجاویز ٹوڈرمل، دفعہ 6: "قابل اعتماد مواضعات کے کسانوں کے لیے جن کا قول و عمل یکساں ہو، حکام مال (عمال) کو چاہیئے کہ خزانہ میں مالگذاری جمع کرنے کے لیے وقت کی ایک حد مقرر کر دیں تاکہ وہ خود وقت مقررہ کے اندر اندر اپنی مالگذاری خزانہ میں جمع کرکے رسید حاصل کر سکیں۔ محصل (تحصیلدار) کو (ایسے مواضعات میں بھیجے جانے) کی ضرورت نہیں۔" (اکبر نامہ Add. 27247 ورق 332 ب۔ ب انڈ (3) صفحہ 382 میں اس تجویز کا خلاصہ شائستہ عبارت میں ملتا ہے۔

یا عمال موضع کو خواہ وہ خود ادا کریں یا کسی کے معرفت، یہ حق حاصل ہوتا تھا کہ وہ اپنی ادائیگیوں کی باضابطہ رسید حاصل کریں۔ دوسری طرف خزانچی کے لیے ہدایت تھی کہ وہ اپنے رجسٹر پر ہر موضع کے محاسب یعنی پٹواری سے ادا شدہ رقم کی تصدیق کرائے[1] ان ضابطوں کی نوعیت بیشتر ان احتیاطی تدابیر کی ہوا کرتی جنہیں انتظامیہ اس مقصد سے اختیار کرتا کہ حکومت اور اس کے ساتھ ساتھ ضمناً غالباً مالگذاری ادا کرنے والے بھی فریب اور غبن سے محفوظ رہ سکیں۔

فصل ۷ مالگذاریٔ زمین کے علاوہ دیگر دیہی محصولات و ناجائز وصولیاں

ہر موضع کو جو مالی بار برداشت کرنا ہوتا وہ کسی طور پر بھی محض زمین کی مالگذاری تک محدود نہ تھا۔ متعدد دیگر محصولات بھی تھے جو 'وجوہات' کہے جاتے[2] یہ 'جہات'، بعض تجارتوں پر محصولات[3] اور 'سائر جہات'، محصولات بازاری ورا ہداری[4] میں منقسم تھے۔ ان دونوں کا عملی فرق غیر واضح معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ایک فہرست میں محصولات سائر کے تحت، علاوہ مالگذاریٔ زمین کے دیگر تمام بڑے محصولات درج کیے گئے ہیں[5] ان کے علاوہ دیگر ناجائز مطالبے اور بالائی رقمیں

---

[1] پچھلے فٹ نوٹ میں ذکر آیا ہے کہ ٹوڈرمل کی تجاویز کی اصل عبارت (Add. 27، 247، ورق 332 الف ب) کے دفعہ 8 میں کہا گیا ہے کہ کسان کے براہ راست خزانہ میں جمع کرنے کی صورت میں، انہیں رسید دی جانی چاہیے۔ اس عبارت کے دفعہ 9 میں ہدایت ہے کہ عامل (محصل مالگذاری) کو "چاہیے کہ اپنی وصول کی ہوئی مالگذاری کو خزانہ میں جمع کرے اور خزانچی کو اس کی رسید کسانوں کو دینی چاہیے۔ اگر محاسب (کارکن) یا خزانچی رسید دینے یا کسان رسید لینے میں قاصر رہے تو ہر حال میں ذمہ داری عامل کی ہوگی اور اگر کسان بقایہ کی رقم کے متعلق شکایت کرے تو عامل کی نہ سنی جائے گی۔" اس کے مماثل عبارت لیکن بہت مختصراً اور اہم تفصیلات کے بغیر اکبرنامہ (3) صفحہ 282-3 بب اندا میں ملتی ہے۔ آئین اکبری (1) صفحہ 289 میں بھی کسان کو رسید دیئے جانے کی ہدایت مگر اس دفعہ کے اضافہ کے ساتھ ملتی ہے کہ پٹواری، خزانچی کے رجسٹر پر تصدیق کرے گا۔

[2] آئین اکبری (1) صفحہ 294، و صفحہ 301

[3] آئین اکبری (1) صفحہ 294

[4] ایضاً خلاصۃ السیاق، ورق 77 الف، Or. 2026 ورق 28 الف۔ ب۔

[5] دستور العمل عالمگیری اوراق 23 ب۔ 24 الف، دستور العمل نویسندگی، (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

بھی ہوا کرتی تھیں جو عمال اور زمینداروں وغیرہ کے ذاتی مصرف میں آیا کرتی تھیں لہٰذا انہیں جمع میں شامل نہ کیا جاتا۔ انہیں 'فروعات'[1] کہتے تھے، لیکن یہ 'اخراجات'[2] اور 'ابواب' اور 'وجوہات'[3] کے ناموں سے زیادہ مشہور تھے۔

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ورق 185 الف میں جو 'سائر جہات' دیئے گئے ہیں وہ کلیتہً عمال کے مختلف نذرانے ہیں لیکن اس اصطلاح کا یہ استعمال جائز معلوم ہوتا۔

ضوابط ناموں اور دوسری جگہوں پر دیئے ہوئے حسابات مالگذاری میں جمع کو معمولاً 'مال وجہات' اور 'سائر جہات' میں تقسیم کیا گیا ہے اول الذکر میں خاص طور پر زمین کی مالگذاری اور آخر الذکر میں دیگر محصول شامل ہیں۔ ملاحظہ ہو خاص طور پر خلاصۃ السیاق، ورق 77 الف، .Or 2026 ورق 28 الف، ب۔

[1] آئین اکبری (1) ص 294

[2] مدد معاش کے فرامین کا مطالعہ جن کی عبارت عموماً یکساں نمونہ کی ہیں، مال کی تحریروں میں لفظ 'اخراجات' (اس کے عام معنی 'مصارف' کے ہوتے ہیں) کے مفہوم کو متعین کرنے کا بہترین ذریعہ ہوگا۔ ان میں معمولاً فقرہ 'اخراجات مثلاً...' استعمال کیا گیا ہے اور اس کے بعد وصولوں کی جو فہرست درج ہے اس میں تمام ناجائز غیر مالی وصولیاں شامل ہیں

تجاویز ٹوڈرمل کے دفعات 1 و 9 (مال و جہات پر متزاد 'طبہ' و 'اخراجات') اور دفعہ 2 (ایک پرگنہ میں دو محاسب کی موجودگی کے باعث اخراجات میں اضافہ) (اکبرنامہ، .Add 27247 اوراق 331 ب، 332 ب کی اصل عبارت) یادداشت میر فتح اللہ شیرازی (" طبہ جسے اہل قلم 'استصوابی' اور 'اخراجات' کہتے ہیں" اور جو عمال سے وصول کیا جاتا ہے) (اکبرنامہ (3) ص 458) 'اخراجات' (اسکداس کے نام عالمگیر کے فرمان دفعہ 11 میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اصطلاح 'طبہ' کے مفہوم کے متعلق باب 4 کی فصل 2 کی ایک فٹ نوٹ میں بحث آئی ہے۔ اس کا مفہوم علاوہ ادائیگی مالگذاری زمین کے موضع کے تمام اخراجات کا ہوتا تھا۔ لہٰذا اس میں عمال اور زمینداروں کی ناجائز وصولیاں اور 'اخراجات موضع' سبھی شامل تھے اور یہی 'اخراجات' 'طبہ' کا ایک جزو ہوا کرتے لیکن ایسا انتظام حکومت جن کی نگاہ صرف اس کے عمال کی ناجائز وصولیوں پر رہتی ہو قدرتی طور پر 'طبہ' کو اخراجات کے محدود مفہوم میں استعمال کر سکتی تھی

'اخراجات' کے اس مفہوم کے سلسلہ میں مجھے پروفیسر شیخ عبدالرشید سے رہنمائی حاصل ہوئی ہے۔

[3] موازنہ ہو .Add 6603 اوراق 49 ب، 59 ب۔ اسی مفہوم میں 'ابواب' 'طبہ' کے استعمال کے لیے ملاحظہ ہو نگارنامۂ منشی، اوراق 175 ب، 189 الف، .Bodl اوراق 140 ب، 150 الف، مطبوعہ 245. خلاصۃ الانشاء، .Or 1750 ورق 111 ب۔

عام مواضعات میں علاوہ آراضیات مزروعہ کے دو اہم چیزیں جو محصول کی زد میں آیا کرتیں غالباً مویشی اور باغات تھے۔ بقول آئین اکبری اگر کوئی شخص ایسی اراضی کو جس پر بصورت دیگر مالگزاری واجب الادا (خراجی) ہوتی بطور چراگاہ کے استعمال کر رہا ہو تو اس پر 6 دام فی بھینس اور 3 دام فی گائے (یا بیل) محصول عائد کرنا چاہیے۔ لیکن کوئی کاشتکار جس کے پاس 4 بیل، 2 گائے اور ایک بھینس فی ہل کی حد تک ہو وہ اس محصول سے مستثنیٰ ہوگا۔ علاوہ اس کے گؤشالوں یا مویشیوں کے ان گلوں پر بھی جو مذہبی یا خیراتی مقصد کے تحت رکھے جاتے کوئی محصول واجب نہ ہوتا۔[1] تعجب ہے کہ اکبر نے جن محصولوں کو معاف کیا تھا، ان میں گؤشاری (محصول گائے) شامل ہے۔[2] یہ بتانا ناممکن ہے کہ گؤشاری مذکورہ محصول سے مختلف تھا یا کہ یہ دونوں ایک ہی محصول تھے اور ابوالفضل نے محض اس لیے کہ کسانوں کو مذکورہ حد تک اس محصول سے معاف کر دیا گیا تھا لہٰذا اس محصول کو (کلیتہً) معاف شدہ محصولوں کی فہرست میں شامل کر دیا۔[3] اس محصول کو دوبارہ جہانگیر نے معاف کر دیا تھا اور یہ معافی کم از کم 1634ء تک برقرار رہی۔[3 الف] علاوہ اس کے چراگاہ کا ایک محصول موسومہ 'کاہ چرائی' تھا جو عام چراگاہوں میں چرنے والے مویشیوں پر عائد کیا جاتا۔[4] ہمارے بعض مآخذ کے مطابق، اورنگ زیب نے گئوشاری اور 'کاہ چرائی' دونوں ہی کو معاف کر دیا تھا۔[5] لیکن کم از کم موخرالذکر

---

[1] آئین اکبری (۱) ص 297

[2] ایضاً 301

[3] 33ء جلوس اکبری میں خانخاناں کے ایک مخصوص حکم کے ذریعہ موضع ساری وغیرہ کی چراگاہوں پر جو گوبردھن کی گایوں اور سانڈوں کے استعمال میں تھیں، گؤشاری عائد کرنے کی ممانعت کی گئی ہے وغیرہ (Jhaveri دستاویز نمبر 13ے)

[3 الف] 'مظہر شاہجہانی' 155 میں عہد شاہجہانی کے ابتدائی دور میں سیوان کے ایک جاگیردار کے اس غیر قانونی محصول کے عائد کرنے پر احتجاج کیا گیا ہے۔

[4] 14 مارچ 1658ء کو جاری کئے ہوئے ایک دلچسپ حکم میں جس پر دو طغرے بنے ہوئے ہیں اور جو اسے بیک وقت شاہجہاں کا فرمان اور دارا شکوہ کا نشان عالیشان ظاہر کرتے ہیں، گوبردھن کے دیو الاسے متعلق گایوں کے گلوں سے جو ایک چراگاہ میں چرا کرتے تھے، محصول 'کاہ چرائی' وصول کرنے کی ممانعت درج ہے۔ Jhaveri Doc. XII

[5] مراۃ (۱) ص 275، ص 286 ضوابط عالمگیری، ایتھے 415 ورق 181 الف، Or. 1641 ورق 136 الف Add. 6598 ورق 189 الف۔ وقائع اجمیر 63 - 4، 173۔

کے متعلق ایک حسب الحکم میں مقامی عمال کو حسب ضابطہ وصول کرنے کی تاکید ملتی ہے[1]
جہانگیر نے پوری تاکید کے ساتھ باغات کو محصولوں سے مستثنیٰ قرار دیا تھا اور اس استثناء کا اطلاق اس صورت میں بھی ہوا کرتا جب کسی سابقہ مزروعہ پر بعد میں بھی پھلدار درخت نصب کئے گئے ہوں اور اس "ابدی مملکت" (دولت ابد پیوند) میں کبھی بھی پیڑوں پر محصول موسومہ سر درختی، عائد نہ کئے گئے[2]۔ یہ محصول اکبر کے معاف کئے ہوئے محصولوں کی فہرست میں بھی شامل ہے[3] مگر عہد عالمگیری کی متعدد تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان باغوں کو چھوڑ کر جن میں تزئین ہوں یا جو غیر نفع بخش ہوں، بقیہ تمام پر محصول عائد کیا جاتا تھا۔ ہر پیڑ کی پیداوار کو تشخیص کر کے ہندوؤں سے $\frac{1}{5}$ اور مسلمانوں سے $\frac{1}{6}$ وصول کیا جاتا تھا[4]
اورنگ زیب[5] کے 1679ء میں غیر مسلموں پر عائد کئے ہوئے ایک عام محصول یعنی جزیہ کی وجہ سے دیہی محصولوں کی مقدار میں معتد بہ اضافہ ہوگیا تھا۔ اس مقصد کے لیے محصلوں (آمنا) کا ایک خصوصی نظم قائم کیا گیا[5]۔ یہ محصول شہری باشندوں سے منفرد براہ راست وصول کیا جاتا۔ مواضعات[6] کے لیے پہلے تو یہ فرمان جاری کیا گیا کہ اس محصول کو (غالباً رجع کے) ایک لاکھ داموں پر ایک سو روپیہ کی یکساں شرح سے یعنی مجموعی تشخیص شدہ مالگذاری کے ۴ فیصدی کے حساب سے خالصہ کے عمال اور جاگیردار ادا کریں اور اس کے بعد وہ اسے قانونی شرح کے مطابق کسانوں سے وصول کرلیں[6]۔ عہد

---

[1] درالعلوم، ورق 53 الف۔ ب۔
[2] تزک جہانگیری، 251۔ 2
[3] آئین اکبری (ا) ص 301
[4] مرآۃ (ا) ص 263-4، نگارنامۂ منشی، اوراق 127 الف۔ ب 200 الف۔ Bodl اوراق 98 الف۔ ب، مطبوعہ 98، درالعلوم اوراق 55 ب۔ 56 الف۔
[5] البدراس ورق 74 ب، مرارۃ (ا) ص 296، Manucio (2) ص 291، وسعتا، ورق 139 ب
[6] مرآۃ (ا) ص 298 لیکن خاص طور پر نگارنامۂ منشی، ورق 98 الف۔ ب، Bodl ورق 74 الف، مطبوعہ 77 (برٹش میوزیم کے مخطوطہ میں اس دستاویز کی متعدد اہم ابتدائی سطریں حذف کردی گئی ہیں)
1683ء میں بنگلی کے "چیف کمشنر" یا "بنگلی وقاسم بازار کے صوبیدار بلجز کے کارپرداز" پرسوداس نے ان تمام لوگوں کو جنہیں وہ اپنا بقایہ دار کہتا تھا اپنے یہاں بلا کر تین سال کا جی ابھیا، (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

عالمگیری کے اواخر میں مرتب کیے ہوئے ایک ضوابط نامہ سے، ظاہر ہوتا ہے کہ شہروں اور نیز دیہاتوں میں ایسے تمام لوگوں کی جو اس محصول کی ادائیگی کے متوجب تھے ایک مردم شماری تیار کی گئی[1] ان میں حسابات کے جو نمونے نقل کیے گئے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس محصول کا بار کسی طور پر ہلکا نہ تھا ایک گاؤں کے 280 مردوں میں 185 اس کی تشخیص کی زد میں آتے تھے جن میں سے 137 نے 3 روپیہ 2ء کی کم از کم سالانہ شرح پر اسے ادا کیا[2] جو اس وقت کے ایک غیر فنی شہری مزدور کی ایک ماہ کی مزدوری رہی ہوگی[3] جزیہ ایک انتہائی رجعت پسندانہ محصول تھا اور غریب ترین طبقہ اس سے سب سے زیادہ متاثر ہوا کرتا[4] ایک سند کے نمونہ نقل سے ظاہر ہوتا ہے کہ شدید آفات کی صورت میں کسی

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

(جزیہ) یا مطالبہ فی کس طلب کیا اور اس کی وصولی کے سلسلہ میں اس نے انتہائی وحشیانہ تشدد سے کام لیا۔ (Hedges (1) صفحہ 136) اس طور پر ہم ایک ہندو جاگیردار کے ایک ہندو گماشتہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ جزیہ ایسے محصول کو وصول کرنے کا غیر متوقع فرض انجام دے رہا ہے جو نظری طور پر مسلمانوں کے کافروں پر برتری کا مظہر تھا۔

[1] خلاصۃ السیاق، علی گڑھ مخطوطہ اوراق 39 ب۔ 41 ب، Or. 2026 اوراق 53 الف۔ 56 ب اور موازنہ بہ نیز نگارنامۂ منشی ورق 98 الف۔ب Bodl ورق 74 الف۔74 مطبوعہ 76 بھی ملاحظہ ہو۔

[2] خلاصۃ السیاق، علی گڑھ مخطوطہ اوراق 40 الف۔ 41 ب Or. 2026 ورق 54 الف۔ شریعت نے جزیہ کی تینوں کو درہم میں معین کیا ہے اور اورنگزیب کی حکومت نے اسے روپیوں میں تحویل کیا۔ ماخذ میں جو مساوات درج ہیں ان میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے مثلاً حسابات مذکورہ کی کم از کم شرحوں کا ایسروائس ورق 74 ب کی تین روپیہ 4ء کی شرح اور Manucia (2) صفحہ 234 کی تین روپیہ کی شرح سے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔

[3] تقریباً اسی مدت کے دوران، سورت میں شرح اجرت چار روپیہ Ovington صفحہ 229) احمد آباد میں دو روپیہ 10ء (مرآۃ (1) صفحہ 291) اور بنگال میں دو روپیہ 13ء سے تین روپیہ 12ء تک کی (Master (2) صفحہ 41) شہادت ملتی ہے۔

[4] اس کا اس امر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امیروں سے جو دس ہزار درہم یا اس سے زائد کے مالک تھے 48 درہم سے زائد نہ لیا جاتا تھا جبکہ غرباء جن کے پاس 200 درہم سے زائد نہ ہو انہیں 12 درہم ادا کرنا ہوتا تھا (مرآۃ (1) صفحہ 296 - 7 اور موازنہ بہ نیز ایسروائس، ورق 74 الف۔ب)

مخصوص علاقہ کے کسانوں کو اس سے مستثنیٰ کیا جا سکتا تھا[1] 1704ء میں قحط سالی اور مرہٹوں سے مسلسل جنگ کے پیش نظر اورنگ زیب نے جنگ کی مدت کے دوران پورے دکن میں جزیہ کو موقوف کر دیا تھا[2] مگر اورنگ زیب کی عام پالیسی جزیہ کی موقوفی کے خلاف تھی[3] دیگر ماخذ میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ اس کی وصولی میں انتہائی جبر سے کام لیا جاتا تھا اور عمال وصول شدہ رقم کے بیشتر حصہ کو غبن کر لیتے تھے، جس کے باعث سرکاری خزانہ میں اس کا بہت تھوڑا حصہ پہونچ پاتا تھا[4]

آمدنی کا دوسرا ذریعہ ایسے لوگوں کی جائداد تھی جو کوئی وارث چھوڑے بغیر فوت ہو جاتے تھے[5] بنگال میں اس قاعدہ کا دائرہ عمل قدرے زیادہ وسیع تھا اور اگر کوئی کسان یا پردیسی بغیر اولاد نرینہ چھوڑے مر جاتا تو اس کے تمام مملوکات کو بیوی اور لڑکوں سمیت بحق خالصہ جاگیر دار یا "سربرآوردہ زمیندار" جیسا بھی علاقہ ہوتا ضبط کر لیا جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ شائستہ خاں نے "اس مکروہ طریقہ" کو جسے 'انکورہ' کہتے موقوف کر دیا تھا[6]

---

[1] نگارنامۂ منشی، ورق 180 الف۔ب، Bodl. اوراق 143 ب۔ 144 ب، مطبوعہ 139 اس تحریر کو سید سلیمان ندوی مرحوم نے 'معارف'، جلد 40 (1937ء) نمبر 4 ص 294-6 میں بعد کے ایک مجموعہ منشی لالچند کے 'نگارنامہ' سے اخذ کر کے طبع کیا تھا۔ مطبوعہ متن کی ابتدائی چند سطروں میں ایک فاش غلطی ملتی ہے۔ اس میں اصل کے "ذمی نادار" یعنی "مفلس غیر مسلم" کی جگہ 'زمینداران' چھپا ہوا ہے۔ سفر میں ایک دیوان کو مخاطب کرتے ہوئے مفلسوں سے جزیہ وصول کرنے کی ممانعت کی گئی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ چونکہ غریب کسان (ریزہ رعایا) زراعت پیشہ ہوتے تھے اور وہ بیج اور مویشی کی خریداری تک کے لیے مقروض رہا (معارف' میں مطبوعہ عبارت اس سے مختلف ہے) لہٰذا کاشتکاران کو جزیہ کی ادائیگی سے مستثنیٰ کرنا چاہیے لیکن اسے بہرحال، تعلقداروں، چودھریوں، قانون گوؤں، طرف داروں اور قصبوں اور موضعوں کے دیگر باشندوں سے وصول کرنا چاہیے۔

[2] اخبارات 48/36 اور 245 (اے) موازنہ بہ نیز اخبارات 47/323

[3] موازنہ بہ معموری ورق 179 الف، خافی خاں (2) ص 377-8

[4] دلکشا ورق 139 ب، Manucle (2)، ص 291۔

[5] دستور العمل عالمگیری، ورق 23 ب۔

[6] فتحیۂ عبریہ، ورق 131 ب۔

عمال مال کے نذرانے اور بالائی رقمیں زیادہ ہوا کرتیں۔ ان عمال کو ان کی خدمات کا معاوضہ وصول شدہ رقم سے ایک مقررہ شرح پر یا فیصدی کے حساب سے ادا کیا جاتا اورنگ زیب کے ایک فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو وصولیٔ مالگذاری اور حفاظت فصل کی خدمات پر مامور کیا جاتا وہ اپنے اخراجات مواضعات سے پاتے تھے۔ لیکن ان اخراجات کو مطالبۂ موضع سے وضع کر دیا جاتا تھا[1] لیکن جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے پیمائش کرنے والی جماعت کے لیے ایک دام فی بیگھہ کا محصول جو 'ضابطانہ' کے نام سے موسوم تھا وصول کیا جاتا تھا۔ لیکن غالباً ایسے عمال کی تعداد جو اپنے جائز گذارہ کی رقموں ہی پر قناعت کرتے ہوں بہت تھوڑی رہی ہوگی۔ بہرحال، سرکاری عمال کسی کسانوں سے ناجائز وصولیاں شاہی ممانعتوں کا مسلسل موضوع رہا کرتیں جو نمایاں نتیجہ ثابت ہوا کرتی تھیں۔ ان ممنوعہ ناجائز وصولیاں میں مروجہ جبری تحفے مثلاً سلامی، بھینٹ[2] رشوتیں اور جرمانے جو فی الجملہ 'بالادستی' کہے جاتے تھے، سرکاری عمال کو مخصوص کاموں کی انجام دہی پر ادائگیاں مثلاً پٹہ داری، عطائے پٹہ پر، 'بل کٹی'، فصل کاٹنے کی اجازت دینے پر، تحصیلداری، قبالۂ مالگذاری قبول کرنے کے موقع پر اور آخر میں، خرچ صادر و وارد، عمال کے گاؤں میں آنے پر ضروری اخراجات شامل تھے[3] ان کے علاوہ دیگر وصولیاں بھی

---

[1] مراۃ (۱) ص 275-6

[2] آئین اکبری (۱) ص 287 - 301 ابوالفضل کی تشریح کے مطابق 'سلامی' لفظ سلام کرنے کی رقم، ایک دام کے سکہ کی نذر کو کہتے تھے جو پٹواری، مقدم، عملگذار کو ہر ملاقات پر پیش کیا کرتے۔ علاوہ اس کے اکبر کے ممنوعہ محصولوں کی فہرست (ایضاً 301) میں ایک اور وصولی 'قنالغہ' نام کی تھی یہ کاغذات مدد معاش میں مندرج محصولوں کی اس فہرست میں بھی جس کے متعلق عمال کو معافیداران سے وصول کرنے کی ممانعت تھی مسلسل ملتا ہے۔ یہ ایک ترکی الاصل لفظ ہے اور چارلس ایلیٹ کی تحقیقات کے وقت اس کا مفہوم لا معلوم تھا Chronécles of Doneol ص 119 لیکن اسے Add. 6603 ورق 75 الف میں وہ نذر بتایا گیا ہے جو حاکم کو دی جاتی تھی، مخصوصاً وہی کی ہانڈی، جسے زمیندار کو حاکم سے ملاقات کے موقع پر لے جانا چاہئے تھا۔

[3] 'سلامی' اور 'بل کٹی' کو چھوڑ کر بقیہ ان تمام وصولیوں کو بیک وقت، مراۃ (۱) ص 304، نگارنامۂ منشی اوراق 102 الف 175 ب، 189 الف، 189 الف، Bodl اوراق 78 الف، 140 ب، 150 الف مطبوعہ 80، 136، 145، خلاصۃ الانشاء Or. 1750 ورق 111 ب میں منع کیا گیا ہے۔ بل کٹی کے لیے ملاحظہ ہو آئین اکبری (۱) 287، 301 اور آئین اکبری (۱) 301 میں تحصیلداری (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

تھیں جنہیں یہاں درج فہرست کرنا غالباً لاحاصل ہوگا۔[1] ان وصولیوں کی صحیح شرحوں کو معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ قیاس ہے کہ وہ کسی حال میں بھی یکساں نہ رہتی ہونگیں لیکن بعض اوقات ان کی مجموعی میزان اچھی خاصی ہوتی ہوگی۔ اس کی صراحت ایک گاؤں کے باشندوں کی اس شکایت سے ہوتی ہے کہ حکام مال (عمال) نے ان پر جو "پٹواری، بھینٹ اور دیگر ابواب ممنوعہ" عائد کر رکھے ہیں ان کی میزان موضع کی مجموعی مقررہ جمع کا تقریباً ایک تہائی ہے۔[2]

ابوالفضل بظاہر اظہار ناپسندیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ قدیم رواج کے مطابق کشمیر میں زعفران کے جو پھول مالگذاری میں وصول کیے جاتے تھے وہ کسانوں کو دوبارہ تقسیم کر دیئے جاتے تھے اور ان سے بیجوں کی چنائی کا کام مفت لیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں دور دراز مقامات سے لکڑیاں بھی ڈھو کر لانا ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اکبر نے ان دونوں رواجوں کو موقوف کیا[3] جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بیگار یا جبری محنت ہندوستان کے نظام مالگذاری کے معمولات میں شامل نہ تھی لیکن برخلاف اس کے دورہ کرنے والے سرکاری ملازمین کا سامان ڈھونے کے سلسلہ میں اب جو جبری محنت لی جاتی ہے وہ بظاہر دور حاضر کی جدت نہیں معلوم ہوتی ہے۔[4] ایک سرکاری تحریر میں ایک آبادی کے

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

کا بھی ذکر آیا ہے۔ بھینٹ اور پٹواری کی تعریف کے لیے ملاحظہ ہو Elliot Chronieles of Donao' صفحہ 21-120 اور دستی کے لیے Add. 6603 ورق 57 ب۔

[1] ان کی فہرست آئین اکبری (1) 287، 301 اور دستور العمل نویسندگی ورق 185 الف میں درج ہے دو دیگر مدوں "چیٹیانہ" (چٹھی، خطوط) اور "فصلانہ" (فصل، پیداوار) سے کا نگار نامہ منشی ورق 189 الف Bodl. ورق 150 الف میں اضافہ ملتا ہے۔

[2] جمع کی رقم 1350 روپیہ اور ناجائز وصولیوں کی 400 روپیہ تھی (درالعلوم، اوراق 54 الف 55 الف) دستور العمل عالمگیری اوراق 41 ب 42 ب میں حسابات برآمد کا جو نمونہ نقل کیا گیا ہے اس میں 4427 روپیہ خزانہ سرکار کی مجموعی آمدنی کے بالمقابل مختلف عمال کی وصولی 172 روپیہ ہے۔ خلاصۃ السیاق، اوراق 91 ب 94 الف، Or. 2026 اوراق 59 الف 64 الف میں موضع حمید پور کے لیے ان رقموں کو علی الترتیب 11-1 روپیہ اور 92 روپیہ 12 درج کیا گیا ہے اور سیاق نامہ، 77-79 میں 106 روپیہ اور 27 روپیہ درج ہیں بہرحال، جانچ کرنے والوں (آڈیٹروں) کو دیئے گئے حسابات کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ وہ کس حد تک صحیح تھے مشکل ہے۔

[3] اکبر نامہ، 3 ص 727، 734

[4] تشریح الاقوام، اوراق 181 ب 182 الف سے ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ چماروں سے

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

باشندوں کی ہمیں یہ شکایت ملتی ہے کہ عمال مال کی طرف سے ان پر جو ناپسندیدہ بار عائد کیے جاتے اس میں "بیگار اور کھاٹ ڈھونے کا کام بھی شامل تھا"[1] دستاویزات مدد معاش میں معافیداران کو جن وصولیوں کی اجازت دی گئی ہے ان کی مستند فہرست میں "بیگار اور شکار" شامل تھا[2] آخر الذکر لفظ سے مراد شکار کا تعاقب اور ہنکوا ہوتا ہے لیکن اس سے مراد وہ خدمت ہے جو کسانوں کو کسی بڑے آدمی یا کسی اور شخص کے شکار کے سلسلہ میں انجام دینا ہوتا تھا۔ ایک واحد شکار کی تیاری میں، جنگلوں کو کاٹنا راستہ کی صفائی، خیمہ کے سامان کی بار برداری اور جانوروں کی ہنکائی یہ سب کام پیش آتے رہے ہوں گے[3]

فصل ۸۔ راحت رسانی اور زرعی ترقی کے طریقے

حکومت مغلیہ کا بنیادی مقصد روز افزوں پیمانہ پر محصولوں کا وصول کرنا تھا۔ لیکن مختلف قدرتی حالات پر منحصر ہونے کے باعث زرعی پیداوار ہر سال اس قدر کم و بیش ہوا کرتی ہے کہ پیداوار کی بحث جس میں غالب حصہ زمین کی مالگذاری کا ہوتا تھا، کی شرح رفتار تو درکنار، اس کی مقدار بھی کبھی یکساں نہ رہتی تھی۔ یہ درست ہے کہ نقدی رشتہ نے مذکورہ کمی و بیشی کو بمقدار رقم بہت کم کر دیا تھا کیونکہ عام طور پر قیمتوں کا اتار و چڑھاؤ اور مقدار پیداوار میں نسب معکوس کا تعلق پایا جاتا تھا۔ لیکن

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

جبری طور پر مفت باربرداری کا کام لیے جانے کے باعث 'بیگاری' کہتے تھے۔ موازنہ ہو، Charles Elliot, 'Chronicles of Donas ص 119، Elliot, Menoins & c. ص 232

[1] دار العلوم ورق 53 الف۔ ب۔ یہ آباری مراد آباد کی تھی جو اب ایک مشہور شہر ہے۔ اس وقت یہ سرکار سنبھل میں شامل تھا۔

[2] موازنہ ہو 'Chroniolcs of Donao' ص 119،

[3] شاہزادہ کی گجرات میں شکار کی مہم کے سلسلہ میں جاگیرداروں اور عمال کے 'جنگل باری' (جنگل کی صفائی) کے کام کرنے کا ذکر اس کے صدر مقام کے 'اخبارات' میں اکثر آتا ہے (اخبارات 49 (اے) اور جا بجا) اور نگار نامۂ منشی ورق 196 الف، ب Bodl. ورق 155 ب، مطبوعہ 150 میں منقول ایک پروانہ میں شاہزادہ (معظم) کے شکار کے دورہ کے سلسلہ میں پہاڑ کے دامن کے قریب دہلی سے خضر آباد تک تمام چھوٹی چھوٹی دریاؤں پر پل بندی کا حکم ملتا ہے اور پرگنات متعلقہ کے حکام کو ہدایت کی گئی ہے کہ جو حکام اس کام پر مامور ہوں انہیں سامان و مزدور فراہم کیا جائے۔

ساتھ ساتھ اس نے اپنے خود و مسائل بھی پیدا کر دیے تھے اور سرمایہ داری کے بحران اور کاروبار کی کساد بازاری کے دور کے بہت قبل ہی سے مغلیہ انتظامیہ کے لیے قیمتوں کی غیر معمولی تخفیف کا مسئلہ وقتاً فوقتاً پریشانی کا سبب بن رہا تھا جس کے باعث سرکاری ضابطوں میں "قیمتوں کی کمی" کا تخفیف پیداوار، خشک سالی، غلہ کے سڑنے، (اور) آفات" سماوی کے ساتھ ساتھ ذکر شروع ہوگیا[1]

جیسا کہ ہم قدرے تفصیل کے ساتھ پہلے دیکھ چکے ہیں، تشخیص مالگذاری کے سبھی طریقوں کے تحت فصل کے نقصان کی صورت میں راحت رسانی کا تھوڑا بہت التزام رکھا جاتا تھا۔ غلہ بٹائی اور کنکوت میں تو ایسا خود بخود عمل میں آجاتا تھا کیونکہ کسی سال حکومت کا حصہ بہ اعتبار پیداوار گھٹ اور بڑھ جاتا تھا۔ سرکاری مطالبہ کو بازاری قیمتوں کے مطابق نقد میں تحویل کرنے سے حکومت خود بھی قیمتوں کے نشیب و فراز میں شریک ہو جاتی تھی۔ 'ضبط' اور 'نسق' کی جو شکل اس سے متعلق تھی کے تحت 'نابود' کو تشخیص شدہ رقبہ سے وضع کرکے فصل کے نقصان کے لیے مد گنجائش نکالی جاتی تھی، لیکن مالگذاری کا قیمتوں میں غیر معمولی تبدیلیوں کے مطابق کم و بیش کیا جانا دربار شاہی کے خاص احکام ہی کے تحت عمل میں آسکتا تھا۔

ایک بار آخری تشخیص ہو جانے کے بعد محصل مالگذاری یا عامل کے لیے لازم تھا کہ وہ بغیر کسی رقم (باقی) کو چھوڑے ہوئے پورا مطالبہ وصول کرے۔[2] شیر شاہ کے احکام کے تحت تشخیص کے وقت تو رعایت ہو سکتی تھی، لیکن وصولی کے وقت بالکل نہیں۔[3] عالمگیری راسکداس کے نام فرمان کے دیباچہ میں یہ شبہ ظاہر کیا گیا ہے کہ تشخیص شدہ مطالبہ میں فرضی خساروں کو بنیاد بنا کر جو لمبی لمبی چھوٹیں دی جاتی تھیں وہ بیشتر جعلی ہوتی تھیں اورنگ زیب کے دوسرے فرمان میں فصل کٹ جانے کے بعد کسی قسم کی چھوٹ دیئے جانے کی ممانعت ملتی ہے۔[4] پھر بھی، عملاً پوری رقم کی وصولی ہمیشہ ممکن نہ ہوتی ہوگی اور بقایہ کو بغرض وصولی سال آئندہ کے مطالبہ میں شامل کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک سال کی فصل خراب ہو جانے کے نتیجہ میں کسانوں پر بقایوں کی شکل میں ایک

1۔ عالمگیر کے راسکداس کے نام فرمان کا دیباچہ۔

2۔ تجاویز ٹوڈرمل۔ اکبرنامہ (3) صفحہ 382 راسکداس کے نام فرمان کا دفعہ 4۔

3۔ عباس خان، ورق 12 الف۔

4۔ محمد ہاشم کے نام فرمان کے دفعات 10 و 18۔

ناقابل برداشت بار جمع ہو جایا کرتا تھا۔[1] ان بقایوں میں اضافہ کا ایک قدرتی رجحان پایا جاتا تھا جس کی وجہ سے ایک سال قبل کے بقائے جنہیں سن رواں میں پورا وصول کرتا ہوا اور اس کے قبل کے برسوں کے بقایوں میں جو اصطلاحاً ستوات باقی کہے جاتے امتیاز برتا جاتا تھا۔[2] ایک ضوابط نامہ کی تجویز کے بموجب آخر الذکر کو زیادہ سے زیادہ جمع رواں کے 5 فیصدی کی سالانہ قسطوں میں دھیرے دھیرے وصول کرنا چاہیے۔[3] مفرور یا مرے ہوئے کسانوں کے ذمہ جو بقائے رہ جاتے انہیں پڑوسیوں سے طلب کرنے کا بھی عام رواج معلوم ہوتا ہے ایک حسب الحکم کے ذریعہ جو عہد عالمگیری کے سولہویں برس جاری ہوا تھا، خالصہ اور نیز جاگیرداروں کے علاقوں میں اس طریقہ کو رد کیا گیا۔ کوئی کسان کسی دوسرے کے بقایہ کا ذمہ دار نہ ہوتا اور صرف ایک سال پہلے کے بقایہ کی وصولی ضروری ہوا کرتی۔ پچھلے تمام بقائے معاف کر دیئے جاتے۔[4]

قحط کی حالت میں بعض اوقات بڑے پیمانہ پر چھوٹ دینی پڑتی جو زیادہ تر حالات میں مفت کرم داشتن کے مصداق ہوا کرتا۔ ان میں سب سے بڑی چھوٹیں جن کا تحریروں میں ذکر آیا ہے، عہد شاہجہانی کے چوتھے اور پانچویں برس 2-1630ء کے بڑے قحط کے سلسلہ میں گجرات و دکن میں منظور کی گئی تھیں۔ 80 کروڑ دام کی جمع کے خالصہ پر چھوٹ بقدر ستر لاکھ تھی۔[5] جاگیرداروں

---

[1] سورت کے قریب نوساری کے کروڑی نے ایک مقدم اور گاؤں کے لوگوں کو جنہوں نے 'وہیل' نامی انگریزی جہاز کے ملبہ کی چوری کی تھی سزا دینے میں تاخیر کا یہ سبب بتایا گیا کہ "اب ان کی فصل کا خاص زمانہ ہے اور مقدم نے پچھلے برسوں کا محاصل ادا نہیں کیا ہے۔" اس کے بعد یہ بھی کہا گیا ہے کہ کروڑی ان لوگوں کو اس خوف سے مار پیٹ نہیں رہا ہے کہ وہ لوگ اس کے مقروض ہیں اور وہ دغا دے کر بھاگ جائیں گے۔

Factories 3 -1622، ص 4 - 253

[2] راسکو اس کے نام فرمان کا دفعہ 5۔

[3] خلاصۃ الانشاء Or. 1750 ورق 112 الف۔

[4] نگارنامہ منشی، اوراق 194 ب - 195 الف .Bodl ورق 154 الف - ب، مطبوعہ 149؛ مرآۃ (1) 91-290

[5] لاہوری (1) ص 364 جمع کے اعداد کی میزان بظاہر پوری مملکت کے خالصہ کی معلوم ہوتی ہے قزوینی Or. 20,734 ص 444 اور 173، ورق 223 الف - ب میں خالصہ میں چھوٹ کی رقم کو اس سے کم (50 لاکھ) بتایا گیا ہے اور مجموعی جمع کے لیے کچھ بھی نہیں۔

کو بھی اسی قسم کی چھوٹ دی جاتی تھی اور ایسی صورت میں جمع رآمی میں تخفیف کرکے ان کو مدد فراہم کی جاتی جو صرف دکن میں بقدر 30 کروڑ دام تھی۔[1] اسی عہد حکومت میں جب کشمیر میں قحط پیش پڑا تو کسانوں پر تشخیص کی ہوئی جمع کو کم کرنے کا حکم جاری ہوا[2] اور صوبۂ لاہور میں ایک بار قلت کے نتیجہ میں خاص طور پر خالصہ کی زمینوں کی جمع کم کی گئی تھی۔[3]

غیر معمولی آفات کے مواقع پر کسانوں کی امداد کی غرض سے راحت رسانی کی جو تدابیر اختیار کی جاتی تھیں انہیں علیحدہ رکھتے ہوئے یہ ایک واضح حقیقت تھی کہ دیگر زرعی ترقیاتی کاموں کی بنیاد پر سرکاری محاصل میں اضافہ کیا جا سکتا تھا۔ زرعی ترقی کے سلسلہ میں مغلوں کے نقطۂ نگاہ کا اکثر تحریروں میں ذکر آتا ہے۔ یہ محض دو مقاصد پر مشتمل تھا۔ زیر کاشت اراضی کے رقبہ میں توسیع اور نقدی پیداوار (جنس کامل) کے رقبہ میں اضافہ۔[4] پہلے مقصد کا محرک غیر مزروعہ آراضیات کی بہ افراط موجودگی تھی اور دوسرا اس لیے کشش رکھتا تھا کہ نقدی پیداواروں کی آراضیات پر شرح محصول زیادہ تھی اور ان کی کاشت میں اضافہ قدرتی طور پر سرکاری محاصل میں اضافہ پر منتج ہوتا۔

مغلیہ انتظامیہ کے پاس جو بھی شماریاتی معلومات موجود تھیں انھیں جمع کرنے کا کم از کم جزوی مقصد یہ تھا کہ زراعت میں توسیع و ترقی کے امکانات کا جائزہ لے کر یہ متعین کیا جا سکے کہ اس سمت

---

[1] صادق خاں، Or. 171 اوراق 31 ب 32 الف، Or. 1671 ورق 18 ب، خافی خاں (۱) ص 449 میں 30 یا 40 لاکھ درج ہے۔ جاگیرداروں کی دی ہوئی چھوٹ کا عمومی انداز میں قزوینی اور لاہوری مذکورہ بالا میں حوالہ ملتا ہے۔ "جمع دامی" میں چھوٹ کی بناء پر جسے اصطلاحاً "تخفیف دامی" کہتے تھے متاثرہ جاگیرداروں کے مساوی جمع کی دوسری جاگیر پانے کا حق حاصل ہو جاتا تھا۔

[2] صادق خاں، Or. 174، ورق 99 ب، Or 1671 ورق 54 الف۔

[3] وارث (اے) ورق 445 الف (بی) ورق 78 الف۔ب۔

[4] انشاء ابوالفضل 60، اور مرأۃ (۱) ص 165، آئین اکبری (۱) ص 285-6، زمان بنام رامنگر اس کے دیباچہ اور دفعہ 2 وغیرہ نگارنامۂ منشی اوراق 98 ب، 104 الف۔ب، Bodl. اوراق 74 الف ب، 79 ب 80 الف، مطبوعہ ص 77، 91 میں سرکاری عمال کے نام اکبر کا عام حکم (دستور العمل) ملاحظہ ہو محمد بن تغلق نے ان دونوں مقاصد کو تسلیم کیا تھا اور انہیں کے پیش نظر اس نے اپنے آخری دس برس کی مدت میں علاقۂ دوآبہ کے زرعی نظام کی از سر نو تشکیل کرنے کی کوشش کی تھی (برنی فیروز شاہی ص 498-9

میں کس قدر کام ہو رہا ہے۔ عہد اکبری کے تجربہ کرڑوڑی کو جس میں زمینوں کی وسیع پیمانہ پر پیمائش کی جاتی تھی تین ہمعصر ماخذ میں غیر مزروعہ زمین کو زیر کاشت لانے کی ایک خاص کوشش سے تعبیر کیا گیا ہے[1] شاہجہاں کو ذاتی طور پر خالصہ اور نیز جاگیروں کے علاقوں میں کاشتکاری کے حالات کی اطلاع فراہم کی جاتی تھی[2] اور ایک قلمی تحریر سے جو اب تک موجود ہے معلوم ہوتا ہے کہ جدید بندوبستی مواضعات اور ان میں کسانوں کی تعداد کے متعلق صدر دفاتر کیفیت طلب کیا کرتے تھے[3] لیکن عہد عالمگیری میں حکومت کو اس امر کی شکایت رہا کرتی تھی کہ قانون گو اور چودھری، انتظامیہ کو واقعتاً زیر کاشت زمینوں کی تفصیلات و نیز نقدی پیداواروں کی حالت کے متعلق معلومات بلکہ صرف قابل زراعت زمینوں کے اعداد فراہم کرتے ہیں۔ لہٰذا نہ تو ترقی ہی کی رفتار کی جانچ کی جا سکتی تھی اور تنزلی کی[4]

مغلیہ انتظامیہ نے اپنی تسلیم کردہ دونوں سمتوں میں ترقی کے لیے مالگذاری کی چھوٹ کو خاص ذریعہ بنایا تھا، مثلاً ایسی زمینوں پر جو چند برسوں تک زیر کاشت نہ رہی ہوں کاشت کے پہلے سال معیاری شرح کا نصف یا اس سے کم مالگذاری وصول کی جاتی تھی۔ اس کے بعد اس شرح کو سالانہ بڑھاتے ہوئے پانچویں برس تک پوری مالگذاری کی رقم پر پہونچا دیتے تھے[5] اگر کوئی کسان حکام مال کی

---

[1] عارف قندھاری، 177، طبقات اکبری (2) صفحہ 300-301، بدایونی (2) صفحہ 189-90

[2] چار چمن برہمن، (اے) ورق 32 الف-ب (بی) 26 الف-ب۔

[3] 'Selected Documents of Shahjahan's Reign' صفحہ 244۔

[4] راسکراس کے نام فرمان کا دیباچہ نگارنامہ منشی ورق 99 الف، Bodl. اوراق 74 ب 75 الف مطبوعہ 77 غالباً حسابات مال میں بھی 'اصلی (ابتدائی) اضافہ (زائد جدید بندوبستی) اور 'داخلی' (جدید موضع جس کی جمع ابھی تک کسی اصلی موضع کے جمع کا جزو تصور کی جاتی تھی) کے درمیان باریک سے امتیاز کو اسی مقصد کے تحت برقرار رکھا گیا تھا۔ (ملاحظہ ہو خلاصۃ السیاق ورق 77 الف، Or. 2026 اوراق 28 الف 29 ب اور Add. 6603 ورق 80 الف)

[5] 'پولج' اور 'پرو تی' زمینوں کے لیے شیر شاہ کی 'ریع' درج کرنے کے بعد آئین اکبری میں بتایا گیا ہے کہ 'چچر' (زمین جس پر 3 یا 4 برسوں سے کاشت نہ کی گئی ہو) پر پہلے برس معیاری مطالبہ کا $\frac{2}{5}$ دوسرے برس $\frac{3}{5}$ تیسرے برس $\frac{4}{5}$ اور پانچویں برس پورا وصول کرنا چاہیے۔ بنجر زمین (جس پر پانچ برس یا اس سے زائد مدت سے کاشت نہ کی گئی ہو) کے لیے مالگذاری کی مختلف شرحیں بمقدار جنس مختلف (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

رشتی کے تحت) پورے سال کے لیے مقرر کی ہوئی زمین سے زائد کاشت کرے تو اس زائد زمین پر کوئی مالگذاری وصول نہ کی جاتی تھی[1] کسی موضع میں کنوؤں کے خراب ہو جانے کی صورت میں شاہی احکام کے تحت ہدایت تھی کہ ان کی مرمت کرنے والے سے مالگذاری وصول نہ کی جائے، بلکہ ہر کنویں پر یکساں شرح کے مطابق محصول وصول کیا جائے۔ اس میں پانچویں برس تک سالانہ اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس کے بعد دسویں برس تک یہی محصول برقرار رہے گا تب بالآخر معمول کے مطابق مالگذاری عائد کی جائے گی[2] 2 30-1630ء کے قحط کے بعد دوبارہ آبادکاری کی ہمت افزائی کے خیال سے بعض متاثرہ علاقوں میں غیر معمولی طور پر کم شرحوں کا نافذ کیا جانا بتایا جاتا ہے[3] اسی طور پر نقدی پیداواروں کے

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

برسوں اور مختلف پیداواروں کے لیے دی گئی ہیں۔ لیکن پوری رقم (پولج کی معینہ رقم) پانچویں برس واجب الادا ہوتی ہے۔ ابتدائی شرح برائے نام مثلاً گیہوں کے لیے پولج کی $\frac{1}{8}$ ہوتی ہے (آئین اکبری (۱) ص 301-3) یہ امر واضح نہیں ہے کہ آیا مذکورہ تناسب کی آخری نقدی دستوروں کے عائد کرنے کے وقت بھی پابندی کی جاتی تھی یا نہیں۔ 77ء جلوس اکبری میں ٹوڈرمل کی تحریر کے مطابق ایسی زمینیں جن پر 3 یا 4 برسوں سے کاشت نہ کی گئی ہو ان پر پہلے برس معیاری شرح کا نصف، دوسرے برس تین چوتھائی اور تیسرے برس پوری مالگذاری عائد کرنی چاہیے۔ (اکبرنامہ .Add 47 272 ورق 231 ب۔ ب انڈ (3) ص 282) کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ بنجر زمینوں کے سابقہ منظور شدہ تناسبوں کو تبدیل کر رہا تھا کشمیر میں اس زمین پر جس پر دس برسوں تک ہل نہ چلا ہو پہلے سال فصل کا $\frac{1}{6}$ اور جس زمین پر چار سے دس برس تک ہل نہ چلا ہو $\frac{1}{5}$ اور جو زمین دو سے چار برس تک پرتی چھوڑ دی گئی ہو اس پر $\frac{1}{3}$ طلب کرنا چاہیے۔ نصف کے انتہائی تناسب پر ترتیب وار چوتھے تیسرے اور دوسرے برسوں میں پہونچنا چاہیے (اکبرنامہ (3) ص 727)

[1] آئین اکبری (۱) ص 285 ہدایت القواعد ورق، 10 ب۔

[2] ایک کنوئیں پر پہلے برس مالگذاری 10 روپیہ ہوتی تھی، پھر سالانہ 15۔ 23۔ 32 روپیہ کے حساب سے بڑھتی ہوئی پانچویں برس 50 روپیہ تک پہونچ جاتی تھی (نگارنامۂ منشی اوراق 187 الف۔ 188 الف .Bodl اوراق 148 ب۔ 149 الف، مطبوعہ 144)

[3] صادق خاں ہمیں بتاتا ہے کہ سید خاں جہاں بارہہ کے عامل گنگا رام نے سرکار ندربر اور سلطانپور میں نئے کسانوں کو سابقہ 1,000 یا 2,000 ٹنکوں کے بجائے 100 یا 200 ٹنکوں کی لگان کے قول پر آباد کیا (.Or 174 اوراق 31 ب۔ 32 الف، .Or 1671 اوراق 18 ب (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

سلسلہ میں حکم تھا کہ ان کے زیر کاشت نئی زمینوں پر ابتدائی معمول سے کم شرحوں کے مطابق مالگزاری وصول کی جائے[1] چنانچہ ایسی زمین پر جو پہلے غلہ بٹائی پر تھی اعلیٰ قسم کی پیداوار کی کاشت ہونے کی صورت میں پہلے برس کی مالگزاری اس پیداوار کے مروجہ دستور سے ایک چوتھائی کم ہو جائے گی[2]

زرعی ترقی کی ہمت افزائی کے خیال سے متعدد غیر رقمی رعائتیں بھی دی جاتی تھیں۔ بنجر زمینوں کے کاشتکار کو اپنے لیے تشخیص کا طریقہ منتخب کرنے کا اختیار دیا جاتا تھا[3] کسی گاؤں میں بنجر زمینوں کے ختم ہو جانے پر بھی اگر وہاں کے کسانوں میں زیر کاشت کرنے کی صلاحیت پائی جاتی تو عملگذار یا افسر مال اسے کسی دوسرے موضع میں زمین دیتا تھا[4] کسی سال کے دوران، پیداواروں کے بڑھ جانے مگر مجموعی رقبۂ زیر کاشت کے گھٹ جانے کی صورت میں بشرطیکہ جمع پر کوئی اثر نہ پڑا ہو، عملگذار کو اعتراض کرنے کا حق نہ ہوا کرتا[5]

کاشتکاروں کی ہمت افزائی کا دوسرا طریقہ کسانوں کو تقاوی (لفظاً: قوت پہونچانا) کے قرضہ کی منظوری ہوا کرتی۔ اس سلسلہ میں ابو الفضل محض یہ کہتا ہے کہ عملگذار کو تہیدست کسانوں کو قرض دے کر امداد پہونچانا چاہیے[6] ٹوڈرمل کی تجاویز میں زیادہ صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ تقاوی پریشان حال کسانوں کو جن کے پاس نہ بیج ہوں اور نہ مویشی دینا چاہیے[7] اس کے بعد کے ایک

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ٹنک کے بجائے بیگھ پڑھنا ممکن ہے) لیکن ایک انگریزی خط سے گجرات میں مختلف صورت حال واضح ہوتی ہے۔ قحط ختم ہو گیا تھا لیکن "گاؤں دھیرے دھیرے آباد ہوتے ہیں" اور " اگر غریب لوگوں کو طرح طرح کے نکام کے انتہائی ظلم و طمع سے صرف ایک سال سر اٹھانے کی مہلت میسر آ جائے تو وہ مویشیوں کو رکھ لیں اور زمین کی افراط پیداوار کو بڑھا سکیں۔ الخ" (Factortes 34-16 36، ص 65)

[1] آئین اکبری (۱)، ص 285

[2] ایضاً۔ 286 - [3] ایضاً 303۔

[4] ایضاً۔ 285۔

[5] ایضاً 286۔

[6] آئین اکبری (۱)، ص 285، موازنہ بہ فرمان بنام محمد ہاشم کا دفعہ 2۔

[7] اصل عبارت .Add 27247 ورق 231 ب میں بھی ملاحظہ ہو۔ اکبرنامہ (۳) ص 382 کے مکمل نسخہ کے متن میں تفصیلات نہیں ہیں۔

ضوابط نامہ کی تجویز کے مطابق تشخیص کنندہ (امین) کو معلوم کرنا چاہیے کہ ہر موضع میں قابل کاشت زمینوں کے رقبہ کے مطابق ہلوں کی تعداد کافی ہے یا نہیں۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں انھیں چاہیے کہ کاشتکاروں کو بیل و بیج کی خریداری کے لیے تقاوی دیں[1] اس نوعیت کے مقاصد کے لیے تقاوی کی تقسیم، دکن میں مرشد قلی خاں کی اصلاحات کا بھی اہم جزو تھی[2] اس کے شریک کار ملتفت خاں کے متعلق ہمارے علم میں ہے کہ اس نے صوبہ جات خاندیش اور برار کے (پائین گھاٹ) خطہ میں باندھوں کی تعمیر کے مصارف کے لیے شاہی خزانہ سے 40 ہزار سے 50 ہزار روپیہ تک بطور تقاوی" جاگیروں اور نیز قیاساً خالصہ میں تقسیم کیے جانے کا حوصلہ مندانہ منصوبہ تیار کیا تھا[3]

تقاوی کے قرض کو چودھریوں (یا دیش مکھوں) اور مقدموں (یا پٹیلوں) کے معرفت دیے جانے کا قاعدہ تھا جو اسے کسانوں میں انفرادی طور پر تقسیم کرتے تھے اور اس کی واپسی کی ضمانت لیتے تھے[4] گانوں کے مکھیا جو کسانوں کو اپنی طرف سے قرض دیتے تھے وہ بھی تقاوی ہی کہی جاتی تھی[5]

ابوالفضل کی تجویز کے مطابق قرض کو "دھیرے دھیرے" وصول کرنا چاہیے[6] اس کے برخلاف ٹوڈرمل کی ہدایت تھی کہ پہلی فصل پر قرض کا ایک جزو اور دوسری پر بقیہ وصول کر لینا چاہیے[7] بعد

---

[1] ہدایت القواعد، ورق 10 ب۔

[2] "بیلوں، بھینسوں اور زراعت کی دیگر ضروریات کی خریداری کے لیے" (صادق خاں، Or 174 ورق 185 ب، Or. 1671 ورق 91 الف خافی خاں (1) ص 733 نوٹ)

[3] ادب عالمگیری ورق 53 الف۔ ب رقعات عالمگیری ص 131-2

[4] تجاویز ٹوڈرمل کا دفعہ (Add. 27,247 ورق 231 ب میں مندرج اصل عبارت میں: تقاوی کے قرض کی واپسی کے لیے" مقدموں سے مچلکہ لینا چاہیے" اکبرنامہ (3) ص 382 میں تجاویز مذکور کی عبارت میں الفاظ "تقاوی" "مچلکے" اور "مقدموں" حذف کر دیے گئے ہیں اور ان کی جگہ "یا وری" "نوشتہ" اور "مردم شناس" ملتے ہیں)، ادب عالمگیری ورق 23 اب، صادق خاں اور خافی خاں، حوالہ سابقہ۔ فرہنگ کاروانی ورق 35 ب۔ ہدایت القواعد ورق 10 ب۔

[5] درالعلوم، اوراق 43 الف، 55 ب۔

[6] "بہ آہستگی" آئین اکبری (1) ص 285۔

[7] تجاویز کا دفعہ 3 (اکبرنامہ۔ Add 27 247، ورق 231 ب، بب انڈ (3) - 382)

کی شہادتوں سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ درحقیقت پوری رقم کو پہلی ہی فصل پر اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو سال کے اندر ہی اندر وصول کرنے کا عام رواج تھا[1] ملتفت خاں کا وعدہ تھا کہ اگر اس کی تجویز منظور کر لی گئی تو قرض کی پوری رقم دو سال کے اندر اندر وصول کی جا سکتی ہے[2] لیکن بعض اوقات سالانہ قسطوں میں بھی وصول کرنے کی اجازت تھی[3] اور ایک ضوابط نامہ میں یہ واضح ہدایت ملتی ہے کہ تقاوی کے بقایوں کو 'سنوات باقی' میں شامل کر کے مالگزاری کے ان بقایوں کے طور پر وصول کرنا چاہئے[4] تقاوی کے قرض پر سود کی وصولی کا کہیں بھی کوئی حوالہ نہیں ملتا اور غالباً شرعی ممانعت کی وجہ سے حکام اسے بدنامی کا سبب تصور کرتے تھے۔ پھر بھی یہ بالکل ممکن ہے کہ چودھری اور مکھیا جو کسانوں کی ضمانت لیا کرتے تھے وہ اس کے عوض میں اپنا کمیشن وصول کرتے رہے ہوں۔

کسی کسان کے مرنے یا مفرور ہو جانے کی صورت میں ان دونوں ضمانت لینے والے عہدہ داروں سے قرض وصول کیا جاتا، لیکن کم از کم ایک ہدایت نامہ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر کسان موجود ہوں مگر اپنی انتہائی زبوں حالی کے باعث قرض واپس کرنے سے معذور ہوں تو پوری رقم کالعدم قرار دیدی جائے[5]

غالباً یہ کہنا صحیح معنوں میں درست نہ ہوگا کہ زراعت کو ترقی دینے کی غرض سے مغلوں کے اقدامات محض مالی دائرہ کے اندر محدود رہا کرتے، مثلاً عمال مال کو کاشتکاری کی توسیع اور ترقی کی غرض سے کنوؤں کی مرمت اور کھدائی کے متعلق ہدایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود حکومت کو آبپاشی کے کاموں کی تعمیر کے سلسلہ میں اپنے فرائض کا احساس تھا[6] صوبۂ ملتان میں مہتمم نہر (میر آب) کو نہروں

---

[1] خلاصۃ الانشاء، Or. 1750 ورق 112 الف، فرہنگ کاروانی ورق 35 ب، ہدایت القواعد، ورق 10 ب مرشد قلی خاں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ فصل کے وقت قرض کی واپسی کا مطالبہ کرتا تھا، لیکن دو قسطوں میں (صادق خاں، حوالہ سابقہ) یہی اسی طور پر ہے۔ خافی خاں میں بعد کا فقرہ نہیں ہے۔

[2] ادب عالمگیری، ورق 53 الف۔ ب، رقعات عالمگیر 131-2

[3] ادب عالمگیری، ورق 123 ب۔

[4] خلاصۃ الانشاء، حوالہ سابقہ۔

[5] ادب عالمگیری، ورق 123 ب۔

[6] راس کد اس کے نام فرمان کا دیباچہ۔

اور باندھوں کی تعمیر کی ہدایت کی گئی تھی[1] مزید برآں، ہمارے پیش نظر وہ اہم یادداشت بھی ہے جس میں چھٹنگ کو ہانسی تک آبپاشی کی سہولیت فراہم کرنے کی غرض سے زیادہ گہرا کرنے کی تجویز کی گئی تھی[2] اس کے علاوہ عہد شاہجہانی میں نہروں کی کھدائی کے جو کام واقعی میں انجام پائے وہ کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا مگر اس کے باوجود یہ کوئی ایسا پہلو نہ تھا جس پر حقیقتاً زیادہ توجہ دی جاتی ہو۔ شاہجہاں کی دو بڑی نہروں کا بظاہر مقصد کھیتوں کو پانی فراہم کرنا نہ تھا بلکہ ان میں سے ایک کا لاہور کے شاہی باغ کی آبپاشی اور دوسری کا قلعۂ شاہجہاں آباد تک پانی کی فراہمی تھی۔ امر فیصلہ کن یہ ہے کہ دو یا تین مثالوں کو چھوڑ کر جس میں حکومت نے آبپاشی کے کام میں تھوڑی بہت دلچسپی ظاہر کی تھی، اس عہد کی کثیر مالی تحریروں میں اس موضوع پر مکمل سکوت اختیار کیا گیا ہے۔ باوجود مارکس کی رائے کے، ہمارے لیے یہ یقین کرنا ناممکن ہے کہ حکومت کی طرف سے آبپاشی کے کاموں کی تعمیر اور نگرانی مغلیہ ہندوستان کی زرعی زندگی کا کوئی اہم جزو تھی[3]

1۔ نگارنامۂ منشی، اوراق 198 الف۔ 199 الف، .Bodl ورق 157 الف۔ ب، مطبوعہ 151۔ 2 سرکار بھکر میں کسانوں کے خود یا جاگیرداروں کے نہریں تعمیر کرنے کی ضرورت کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو مظہر شاہجہانی، 17 — 18 بھی۔

2۔ بالکرشن برہمن، اوراق 107 الف۔ 109 ب۔

3۔ مارکس نے ہندوستان میں برطانوی حکومت پر 1853ء میں لکھے ہوئے اپنے پر مغز مقالوں میں جو Marx & Engles Selected Works', Moscow 1951, Vol. 1, PP 315-4 میں دوبارہ طبع ہوا ہے، یہ خیال ظاہر کیا ہے۔ وہ دوبارہ اسی مسئلہ پر 'Capital 1, P.523n' میں اس طور پر لکھتا ہے: ہندوستان میں پیداوار کے چھوٹے چھوٹے غیر مربوط نظاموں پر اقتدار حکومت کی مادی بنیادوں میں سے ایک پانی کی فراہمی کا باضابطہ نظم تھا۔ بمقابلہ اپنے برطانوی جانشینوں کے ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کو اس کی اہمیت کا زیادہ احساس تھا۔ 1866ء میں اڑیسہ وغیرہ کے قحط کی یاد کو تازہ کر لینا ہی کافی ہوگا" ممکن ہے دکن میں تالابوں کے نظم اور فارس اور وسطی ایشیاء کے عہد وسطیٰ میں وسیع آبپاشی کے کاموں کے متعلق اطلاعات سے مارکس نے دھوکہ کھایا ہو۔

باب 7

جاگیریں

فصل-۱- جاگیریں اور خالصہ

دورِ مغلیہ ہی میں نہیں بلکہ پورے دورِ وسطیٰ میں حکومت کی یہ نمایاں خصوصیت تھی کہ وہ صرف استحصال کرنے والے طبقہ کی دست محافظ ہی نہیں، بلکہ بذاتِ خود بھی استحصال کا خصوصی آلہ کار رہی ہے۔ پچھلے باب میں گذر چکا ہے کہ مطالبۂ مالگزاری، فاضل بچت یعنی کسان کی زندگی کی ناگزیر معاشی ضروریات سے کس قدر قریب رہا کرتا تھا۔ اس زرِ کثیر کا مصرف بادشاہ کی مرضی پر موقوف رہا کرتا۔ وہ اپنی مملکت کے بیشتر علاقوں کی مالگزاری اور دیگر محاصل کے حقوق کو اپنی رعایا کے بعض افراد کو منتقل کیا کرتا تھا۔ بادشاہ جن علاقوں کے محاصل کو اس طور پر منتقل کرتا انہیں جاگیر کہتے تھے[1]، 'بقول' اور 'اقطاع' جاگیر کے مسلّمہ مترادف الفاظ اس قدر عام

---

[1] مورلینڈ دورِ حاضر کا پہلا مصنّف ہے جس نے اپنی تصنیف 'Agranian System' میں نظامِ جاگیرداری کے اہم اجزاء کو صحیح طور پر سمجھا ہے۔ اس نے 'فائیف' (Fief) کا لفظ جو ابھی تک جاگیر کے مرادف کے طور پر استعمال ہوتا تھا مسترد کر کے اس کی جگہ 'ریونیو اسائینمنٹ' (Revenue Assignment) یا صرف 'اسائینمنٹ' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

'جاگیر' اصلاً دو فارسی الفاظ کا مرکب ہے اور اس کا صحیح املا 'جائے گیر' ہونا چاہیے لیکن بیشتر اسے اس طور پر نہیں لکھتے۔ اس کا لفظی مفہوم 'کسی جگہ پر قابض و متصرف (شخص)' کا ہوتا ہے۔ فارسی کی (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

استعمال میں نہ تھے[1] ان حقوق کے منتقل الیہ کو جاگیردار (تا لفین جاگیر) تیول دار اور اقطاع دار بھی کہتے تھے لیکن موخر الذکر دونوں اصطلاحوں کا بھی انہیں الفاظ کی طرح جن سے وہ مستخرج

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

مشہور لغت 'بہار عجم' میں جو ہندوستان میں 39. 17-40ء میں مکمل ہوئی تھی اس کے اصطلاحی مفہوم کو اس طور پر بیان کیا گیا ہے (ترجمہ ما بعد) "جاگیر۔ جائے گیر: علاقۂ زمین جسے بادشاہ امراء اور منصبداران اور اس قسم کے (اشخاص) کو عطا کرتے ہیں تاکہ اس کی کاشت کی پیداوار سے جو بھی آمدنی ہو (محصول) ہو اس سے (منتقل الیہم) استفادہ کرسکیں اور ہندوستانی بادشاہوں کے دفتری عملہ کی اصطلاح میں (اس کا مرادف) 'تیول' اور ماہواری تنخواہ (ماہانہ) کے عوض میں ملک کا جو حصہ بطور مشاہرہ (تنخواہ) دیا جاتے۔ حالانکہ بعض جدید ایرانی شعراء کے کلام میں یہ لفظ ملتا ہے لیکن یہ خود ان کے محاورے کا لفظ نہیں ہے (عوفی میں اسے 'اقطاع' کہتے ہیں" (مطبوعہ نولکشور ص 276 اور نیز ص 283) لفظ 'جاگیر' کا اس اصطلاحی مفہوم میں استعمال ہندوستان ہی تک محدود معلوم ہوتا ہے مثلاً Prof. Lambton's Landlord and Peasantsin Persia کی فہرست اصطلاحات میں اس کا ذکر نہیں تھا۔ ہندوستان میں بھی اس لفظ کا استعمال پندرھویں صدی سے شروع ہوا۔ برنی اور ابتدائی دور کے دوسرے مصنفین اس کی جگہ 'اقطاع' کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ برنی 'تاریخ فیروزشاہی ص 40 ' ب انڈیس لفظ 'جاگیر' صرف ایک مقام پر آتا ہے لیکن فوجی دستہ کے مفہوم میں۔ پروفیسر شیخ عبدالرشید، علی گڈھ ایڈیشن ص 48 میں اس لفظ کی جگہ 'چاکر' ملتا ہے اور اس سے اس کا مفہوم بالکل صحیح طور پر ادا ہو جاتا ہے۔

نوٹ مترجم: 'جاگیر' اصلاً ایک فارسی لفظ ہے جس کے عمومی مفہوم کے لیے نٹ نوٹ بالا ملاحظہ ہو لیکن مصنف نے اسے یہاں ایک ایسے علاقہ کے مفہوم میں استعمال کیا ہے جس کے محاصل کے حقوق استفادہ بادشاہ کسی شخص کو عارضی طور پر منتقل کر دیتا تھا۔

[1] 'اقطاع' تقریباً مذہب اسلام ہی کے اتنا قدیم ایک عربی لفظ ہے۔ ابتداءً اس سے مراد حکومت کی عطا کردہ زمینی جائداد ہوا کرتی تھی لیکن بتدریج یہ ایسے عطیات مالگذاری کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا" جس میں اصل حق ملکیت حکومت کو حاصل ہوا کرتا تھا" موازنہ ہو' Z.Zokkegoard, Islamic Tantion in the classic period 14 و صفحات ما بعد) یہ لفظ خالصتاً اپنے موخر الذکر مفہوم میں دہلی سلطنت کی تحریروں میں استعمال ہوتا تھا۔ لیکن دور مغلیہ کے شروع ہوتے ہوتے 'اقطاع' کا عام استعمال بالکل متروک ہو کر اس کی جگہ 'جاگیر' کا لفظ آ گیا اور اب 'اقطاع' کے لفظ کا استعمال بیشتر رسمی انداز بیان کے طور پر (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

تھیں زیادہ استعمال نہ تھا۔ مملکت مغلیہ کے حکمران طبقہ کی آمدنی کا خاص ذریعہ یہ جاگیریں تھیں۔ جاگیردار عموماً منصبدار ہوا کرتے اور ان کے منصب بادشاہ کے عطا کئے ہوئے ہوتے۔ یہ منصب عموماً دوہرے ہوتے یعنی ذات و سوار۔ اول الذکر خاص طور پر ذاتی تنخواہ کو ظاہر اور آخر الذکر سے اس فوج کا تعین ہوتا جس کی کفالت کا عہدہ دار ذمہ دار ہوا کرتا[1]۔ ان دونوں منصوبوں کی تنخواہیں جزوی تفصیلات کے ساتھ درج کی جاتی تھیں[2] اور منصبداروں کو تنخواہیں رقم میں خزانہ سے ملا کرتیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اور وہ بھی جب جاگیر ایسے ماہیانہ لفظ سے احتراز مقصود ہوتا کیا جانے لگا۔ پس "اقطاع" اگر متروک الاستعمال تھا تو "تیول" ایک غیر ملکی لفظ اس اصطلاح کو ملک فارس میں چودھویں صدی اور اس کے بعد سے شروع کیا گیا Lambton's, Landlord and Peasonts in Persia' ہندوستان میں غالباً "تیول" بمقابلہ "اقطاع" کے زیادہ مستعمل ہوا، لیکن پھر بھی اس کی حیثیت جاگیر کے ایک ثانوی مرادف ہی کی رہی۔

مصنف مرآۃ الاصطلاح ورق 26 الف "تیول" اور "جاگیر" کے صحیح اصطلاحی مفہوم میں فرق کی نشاندہی کرتا ہے۔ بقول اس کے تیول شاہی نسل کے شاہزادوں کے زیر تصرف عطیات کو اور "اقطاع امراء (منصب والے امراء) اور منصبداران کے زیر تصرف عطیات کو کہتے تھے۔ لیکن سترھویں صدی کی تحریروں میں اس قسم کے کسی فرق کا پتہ نہیں چلتا اور یہ دونوں اصطلاحیں بلا کسی امتیاز کے ہر قسم کے عطیات کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔ شاہزادوں کے عطیات کو عموماً "تیول (یا جاگیر) وکلائے سرکار اعلیٰ (یا سرکار دولت مدار وغیرہ) لکھا جاتا تھا۔ ملاحظہ ہوں خاص طور سے دستاویزات مندرجہ نگارنامۂ منشی، جن میں سے بہت سے شاہزادہ معظم کی جاگیر کے متعلق ہیں۔

[1] عبدالعزیز کی تصنیف 'The Mansabdari System & the Mughal Army' میں اس پر تفصیلی بحث آئی ہے۔ ملاحظہ ہو نیز Moreland, Rank (Mansab) in the Mughal State Service, TRAS, 1936, PP. 641-66

[2] عہد اکبری میں تنخواہ کی شرحیں آئین اکبری (۱) ص 178-185 میں اور جہانگیر کی تخت نشینی کے وقت کی شرحیں اقبالنامہ (2) ٹ 1834 ورق 233 الف میں درج ہیں۔ سنہ ۱۱ جلوس شاہجہانی میں جاری کی ہوئی افضل خاں کی دستخطی شرحیں، فرہنگ کاروانی، اوراق 21 الف۔ 24 الف Edinburgh نمبر 23 اوراق 19 الف 21 ب) میں اور چودھویں سال میں جاری کی ہوئی اسلام خاں کی دستخطی شرحیں Selected Documents of Shahjahan's Region ص 79-84 میں اور اس کے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

یا جیسا کہ زیادہ عام رواج تھا انہیں مخصوص علاقے جاگیریں دے دئے جاتے۔ ایسی زمینیں جن پر جاگیر ہی کی طرح قبضہ ہوتا مگر اس کے بالمقابل کوئی منصب یا ذمہ داری عائد نہ ہوتی، انعام[1] کہی جاتی تھیں۔ ایسے علاقے جو ابھی تک جاگیر میں دیئے نہ گئے ہوں، مگر دیئے جانے والے ہوں، پائی باقی کی اصطلاح سے موسوم تھے[2] اور آخر میں خالصہ جس کا زیادہ مناسب نام 'خالصہ شریفہ' تھا ان زمینوں اور محاصل پر مشتمل ہوا کرتا جو سرکاری خزانہ کے لیے مخصوص تھے[3]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)
مزید بعد کی سعد اللہ خاں کی دستخطی شرحیں دستور العمل عالمگیری' اوراق 121 الف۔ 123 الف میں درج ہیں۔ آئین اکبری اور اقبالنامہ کے برخلاف یہ شرحیں بمقدار دام دی گئی ہیں۔ دور عالمگیری کی شرحیں (مثلاً متدرجہ ضوابط عالمگیری Add. 6598 ورق 149 ب۔ 152 الف۔ Or 1641 اوراق 43 الف 47 ب) دور شاہجہانی کی شرحوں کے تقریباً مماثل ہیں۔

[1] شاہزادی جہاں آرا کے نام سورت کے انعامی عطیہ کے سلسلہ میں موازنہ بہ لاہوری (2) ص 397 اور عالمگیرنامہ ص 619 بھی جن میں یہ صراحت ملتی ہے کہ چونکہ چند کو زیادہ سے زیادہ منصب جو کسی امیر کو دیا جا سکتا تھا دیا جا چکا ہے لہٰذا اب اسے مزید اعزاز بطور انعامی عطیہ ہی ہے دیا جا سکتا ہے۔ مرآۃ الاصطلاح ورق 26 الف میں ہے کہ شاہزادیوں کے عطیات کو 'برگ بہا' کہتے تھے لیکن سترھویں صدی میں اس اصطلاح کے استعمال کی کوئی مثال مجھے نہ مل سکی۔ عام طور پر شاہزادوں کو ان کے مناسب کے لحاظ سے جاگیروں کے علاوہ بڑے بڑے انعامی عطیات بھی دیئے جاتے تھے۔

[2] 'پائی باقی' وہ لفظ ہے جسے محاسب اپنے حسابات کے آخر میں بچت کے لیے استعمال کرتا تھا۔ اس طور پر اس لفظ کی مصداق بظاہر وہ زمین ہوئی جو جاگیر میں دیئے جانے کے لیے موجود ہو یا ایک انتظامی ضوابط نامہ کی تحریر کے مطابق "وہ جاگیر جو کسی سے واپس لے لی گئی ہو اور تا انتظام ثانی اس کے محاصل شاہی حکومت کے تصرف میں آتے ہوں" (خلاصۃ السیاق' 89 الف۔ 90 الف' Or 2026 ورق 51 الف۔ 52 ب) اس اصطلاح کے اس مفہوم میں بدیہی استعمال کے لیے ملاحظہ ہو وقائع اجمیر 74' 375۔ 6 اخبارات $\frac{47}{167}$ دستور العمل آگاہی ورق 31 الف اور معموری اوراق 156 ب۔ 157 الف' 182 ب خافی خاں' Add. 6574 ورق 107 الف' بب انڈیا مطبوعہ (2) ص 396 – 7

[3] اس اصطلاح کی تعریف کے لیے ملاحظہ ہو' مرآۃ الاصطلاح' ورق 26 الف۔ حالانکہ یہ اصطلاح اس قدر معروف ہے کہ اس کے لیے کسی حوالہ کی ضرورت نہیں۔

اس کے منتقل الیہ کو جملہ سرکاری آمدنی کی وصولی کا اختیار ہوا کرتا تھا[1] اور گو کہ اس کا ایک بڑا جزو مالگزاری زمین پر مشتمل ہوتا لیکن اس میں وہ متعدد ابواب اور معمولی محصول بھی شامل رہا کرتے جو غالباً دور افتادہ ترین دیہی علاقوں تک میں وصول کیے جاتے تھے[2] عام طور پر بڑے شہروں اور بندرگاہوں کی بازاروں کے علیحدہ محال (پرگنات یا علاقائی محالوں سے مختلف) قائم کرکے انہیں بھی دیگر محالوں کی طرح اکثر بطور جاگیر دے دیا جاتا تھا[3]

جاگیریں تھوڑی تھوڑی مدت پر مسلسل تبدیل کی جاتی تھیں اور ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ کوئی بھی شخص کسی مخصوص جاگیر پر تین یا چار سال سے زائد قابض رہ سکے[4] اکبر نے بظاہر اپنے ذاتی فیصلہ

---

[1] جاگیر کے معیاری اصولوں کے تحت چودھری (یا دیشکھ) قانون گو (یا دیش پانڈیہ) اور مقدم (یا پٹیل) اور کسان و کاشتکار پورے مال واجب (مالگزاری) اور حقوق دیوانی (مالی مطالبات) کے لیے جاگیروں کو جوابدہ ہوتے تھے (موازنہ بہ ہرکرن، ص 53 - 54، Selected Documents & C. ص 5, 4, 17, 18, 21, 28, 147, 151, 158, 171, 175 '6 نگارنامہ منشی' اوراق 112 الف 121 ب Bold اوراق 91 الف / 92 الف' مطبوعہ 91 2)

[2] ملاحظہ ہو باب 6 کی فصل 7 کسانوں پر دیگر محصولات کے علاوہ، اہل حرفہ (محترفہ) بیوپاریوں اور راہداری کے محصول تھے جو سائر کی عمومی اصطلاح سے موسوم کیے جاتے۔ (موازنہ بہ دستور العمل عالمگیری، اوراق 23 ب۔ 24 الف)

[3] بالکرشن برہمن اوراق 103 ب۔ 104 ب میں مندرجہ ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ پرگنہ ہانسی اور حصار کے بازاری محصولات (محصول سائر) ان پرگنوں کی آمدنی کے علاوہ تھے۔ بازاری محصولات کو خالصہ میں شامل کرنے کے بعد عام آمدنی شاہزادہ معظم (؟) کو منتقل کردی گئی تھی۔ سورت کو بعض اوقات جاگیر میں اور بعض اوقات خالصہ میں رکھا جاتا تھا (Pelsarits 42) اور یہی حالت ہگلی کی تھی۔ کھمبات کے لیے موازنہ بہ Master (2) ص 79 - 80، Toster, Supp. Cal. 49۔

[4] اس دور میں تھوڑی تھوڑی مدت پر جاگیر کا تغیر یا تبادلہ ایک ایسا عام انتظامی طریقہ تھا کہ ہمارے ہندوستانی ماخذ اس کی موجودگی کو معمولاً تسلیم کرلیتے ہیں اور اس کا بیان بہت کم کرتے ہیں۔ ابوالفضل اپنی ایک عبارت میں اس کے فلسفہ کو بیان کرتے ہوئے اس طریقہ کی خوبیوں کو پودھوں کی منتقلی کے مثل بتایا ہے جسے باغبان پودھوں ہی کی بہتری کے لیے اختیار کرتا ہے۔ (اکبرنامہ (2) ص 253 - 5) (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

بر تحت، اپنے عہد حکومت کے تیرھویں برس، عسکری خاندان کے عہدہ داروں کو پنجاب کی جاگیر سے ہٹاکر اس طریقہ کی قطعی طور پر بنیاد ڈالی تھی[1] اس کے بعد سے زیر مطالعہ عہد کے ختم ہونے تک یہی طریقہ چلتا رہا۔ زمینداروں کے وطن کی جاگیریں[2] اور اس سے بہت مختصر پیمانہ پر "التمغا" جاگیریں جو ہندوستانی میں بار اوّل محض عہد جہانگیری میں اور اس کے بعد بہت شاذ سننے میں آتی ہیں مذکورہ طریقہ سے استثنا کی واحد صورتیں تھیں[3]

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ہمارے ہر قسم کے مآخذ مثلاً سرگذشتوں، خطوط کے مجموعوں اور قدیم کاغذات وغیرہ میں مخصوص جاگیروں کے تبادلہ کے حوالے اس کثرت سے آتے ہیں کہ ان سب کو احاطۂ تحریر میں لانا محال ہے۔ لیکن مظہر شاہجہانی سے ایک مثال بطور نمونہ پیش کی جا سکتی ہے۔ اس میں مندرج سرکار سیہوان کے نظم و نسق کی تفصیلی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سرکار کی جاگیر جو معمولاً معلّم جاگیرداروں کے قبضہ میں تھی 43 برس (1592 - 1634ء) کی مدت کے دوران سترہ بار تبدیل ہوئی، لہٰذا (بشمول خالصہ) ہر جاگیردار کے تصرف کی مدت کا اوسط ڈھائی سال آتا ہے (مظہر شاہجہانی ص 90 - 171) یورپی سیاحوں نے اس طریقہ سے متاثر ہو کر اپنی تحریروں میں بالعموم اس کا ذکر کیا ہے۔ ان میں ہاکنس اور گیلنس کے بیانات کسی جاگیر کے ایک شخص کے زیر تصرف رہنے کی مدت کے متعلق زیادہ قطعی ہیں۔ بقول ہاکنس "کوئی شخص آدھ برس بھی اپنی روزی پر قائم نہیں رہ پاتا کہ یہ اس سے لے جاتی ہے" (114, Early Trands) گیلنس اپنے بیان میں زیادہ اعتدال سے کام لیتے ہوئے کہتا ہے کہ "بعض جاگیریں" ہر سال، نصف سال یا ہر دو تین سال پر تبدیل کر دی جاتی ہیں" (JIH 4 ص 72) بظاہر جاگیر پر قبضہ کے قیام کی کوئی مدت معین نہ تھی۔ اگر ایک ذاتی غرض رکھنے والے غیر ملکی سیاح کی حیثیت سے برنیر کے اس بیان کو کہ جاگیرداروں کو جنہیں وہ تیمریٹش (Timariots) کہتا ہے "ہر لمحہ" اپنی جاگیر سے محرومی کا خطرہ رہتا تھا (227 Bernier) مبالغہ پر محمول کرتے ہوئے مسترد بھی کر دیا جائے تو ہمارے سامنے عہد عالمگیری کے اواخر کے ایک ملکی مصنف کا ایک ایسا ہی بیان موجود ہے۔ بقول بھیم سین "جاگیرداروں کے گماشتے بادشاہ کے دفتری عملہ (محرران حسنہ) کی تنگدلی ("شرم طبعی") سے جو کسی نہ کسی بہانہ سے (جاگیر) تبدیل کر دیتے تھے خائف رہا کرتے تھے اور انہیں اگلے برس کے لیے جاگیر کی بحالی کی بالکل امید نہ رہتی تھی۔ (دلکشا، ورق 139 الف)

[1] بایزید، 253 اکبرنامہ (2) ص 332 - 3 [2] ملاحظہ ہو باب 5 کی فصل 4

[3] بقول جہانگیر اس نے اپنے مورثوں کی طرح، "التمغا" یا خود اس کے الفاظ میں۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

چونکہ جاگیر معمولاً تنخواہ کے عوض میں دی جاتی، اس لیے ضروری تھا کہ ہر جاگیر کے ساتھ اس قدر رقبہ معین کردیا جائے کہ اس کے محاصل سے مقررہ تنخواہ پوری ہوسکے[1] لہٰذا ہر علاقہ کی ہراکائی یعنی موضع اور خاص طور پر ہر پرگنہ یا محال کے لیے ایک مستقل تشخیص یا 'جمع' طیار کی جاتی تھی[2] جو اس صورت میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

التمغا' اسی خصوصی مقصد سے قائم کیا کہ ہر امیر کے لیے اس کے وطن یا غالباً اس جگہ کی جہاں وہ اپنے کنبہ کے افراد کو رکھنا چاہے مستقل جاگیر مہیا ہوسکے۔ (تزک جہانگیری ص10 ترجمہ (1) ص23 و نوٹ) اس کے بعد دور عالمگیری میں ہمیں ایک ایسے افسر کی مثال ملتی ہے جس نے اس شبہ کی کھٹک کے تحت کہ اس کے کنبہ کے افراد ملک فارس میں شاہزادہ اکبر کے ساتھ سازش میں ملوث ہیں خواہش ظاہر کی کہ" اسے صوبۂ لاہور میں دس لاکھ دام کی جاگیر بطور 'التمغا' دی جائے تاکہ وہ اپنے اعزہ کو فارس سے بلاکر وہاں آباد کرسکے" (متن الانشاء اوراق 99 ب - 100 الف) انعام التمغاء کے لیے ملاحظہ ہو باب

فرہنگ رشیدی ب انڈ (1) 71 میں ہے کہ ترکی میں 'ال' سرخ مہر کو کہتے ہیں جو مالگزاری (تمغا) کی معافی کے عطیات پر ثبت ہوتی ہے لہٰذا اس مناسبت سے اسے 'التمغا' کہتے ہیں۔ جہانگیر نے اس نام کو تبدیل کرنے کی کوشش کی کیونکہ وہ سنہری (التون) مہر استعمال کرتا تھا۔ یٰسین اپنی اصطلاحات مال کی فرہنگ Add. 6603 اوراق 48 ب - 49 الف میں بتاتے ہیں کہ 'آل' کے معنی بیٹی کی اولاد کے ہوتے ہیں، لہٰذا ابتداءً 'التمغا' محض خواتین ہی کو دیا جاتا تھا۔ یہ تعبیر بلا پس و پیش مسترد کردیئے جانے کے قابل ہے۔

[1] 'The Selected Documents of Shahjahan's Region' میں جاگیروں کے متعلق افراط احکام ملتے ہیں۔ انہیں بلا استثناء منتقل الیہم کے منصب پہلے درج ہیں اور اس کے بعد منصبوں کی بمقدار دام معینہ تنخواہیں ہیں جو سب کی سب مجموعۂ مذکورہ کے ص64-79 پر مندرج شرح نامۂ تنخواہ کے مطابق ہیں آخر میں جاگیر یا جاگیرداروں کا اندراج ہے جن کی جمع معینہ تنخواہ کے بالکل مساوی ہے۔

[2] موضع وار جمع کو 'دیہہ بہ دیہی' کہتے تھے اور اس کا اندراج دربار شاہی میں رکھا جاتا تھا Fraser 86 ورق 63 الف، Manucci (2) ص70) قاعدہ یہ تھا کہ ایک موضع ایک سے زائد اشخاص کو نہ دیا جاسکتا تھا۔ Fraser 86 ورق 63 الف) لیکن اگر ایک موضع کی جمع چار جاگیرداروں کو دی گئی ہو تو ایک ضوابط نامہ میں اس موضع کے محاصل کو ان کے درمیان تقسیم کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے (دستورالعمل نویسندگی ورق 179 الف۔ ب) ایک ہی پرگنہ میں دو یا تین جاگیریں دیئے جانے کا یہ طریقہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہر جاگیر کی جمع لکھی جاتی تھی (فلاں پرگنہ سے اس قدر دام) اور اس کے بعد ہر جاگیر کی جمع کے مطابق پرگنہ کے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

مفید مطلب ہو سکتی تھی جیسے واقعی وصولی یا حاصل کے جہاں تک ممکن ہو قریب ہو جیسا کہ ابوالفضل نے بالکل واضح طور پر بیان کیا ہے اس قسم کے جمع کی طیاری اکبر کی مالی پالیسی کے اہم مقاصد میں تھی۔ پچھلی عہد حکومت کے جمع کے اعداد جو عہد اکبری کے شروع کے برسوں میں استعمال میں لائے گئے 'جمع رقمی' کہے جاتے تھے لیکن ان اعداد کو محض من مانی اضافوں کے ذریعہ بڑھا کر اصل سے بہت زیادہ دکھایا گیا تھا[1] اس عہد حکومت کے اگیارہویں برس، قانون گوؤں اور "واقف کاروں" سے معلومات حاصل کرکے ان پر نظر ثانی کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور نئی جمع کو پہلے سے زیادہ صحیح تصور کی جاتی تھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)
مواضعات کو ان میں تقسیم کرتے تھے۔ صوبجاتی دیوان کا دفتر کاغذات تقسیم کو جنہیں 'قسمت نامہ' یا 'چٹھی قسمت' کہتے مرتب کیا کرتا تھا (احکام عالمگیری ورق 242 الف، وقائع اجمیر 470، 437) الہ آباد 988 مورخہ 2 مارچ 1653ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاگیردار باہمی رضامندی سے اپنے اپنے حصہ کے مواضعات میں رد و بدل کر سکتے تھے پھر بھی بہترین طریقہ سمجھا جاتا تھا کہ واحد جاگیرداروں کو ان کی تنخواہ کی حد کے اندر مسلم (دربست) پرگنے دیدیئے جائیں (ادب عالمگیری ورق 117 الف، رقعات عالمگیر 126 ۔ 7 نقیحہ عبریہ ورق 117 الف ب)

[1] اکبرنامہ (2) ص 270 (Add. 27247 ورق 202 الف) آئین اکبری (1) ص 347، اقبالنامہ لکھنؤ ایڈیشن (2) ص 213 ابوالفضل اکبرنامہ کے مکمل نسخوں میں 'جمع' کو 'رقمی قلمی' اور Add. 27247 میں 'رقم رقمی' اور آئین اکبری میں لکھا ہے کہ "وہ لوگ (عمال وزارت مال) اپنے دل کی مرضی سے بیک جنبش قلم (بہ گلم افزودہ) اضافہ کرکے اسے تنخواہ میں دیدیتے تھے (تن نمودند)" اس طور پر یہاں 'قلمی' اپنے محاوراتی مفہوم یعنی انگریزی لفظ 'Paper' کے مرادف کے طور پر استعمال ہوا ہے یعنی 'جمع قلمی' محض کاغذی تشخیص تھی۔ برخلاف اس کے 'رقمی' ایک اصطلاح معلوم ہوتی ہے کیونکہ بابر کے ایک فرمان میں ایک موضع کی جس کی 'سیورغال' میں تصدیق کی گئی تھی "جمع رقمی 2000 ٹنکے معین کی گئی تھی" (I.O. 1:4438) رقم کے معنی رسم اعداد یا تحریر کے ہوتے ہیں اور کسی مخصوص مالی تحریر میں اس کے بطور ایک اصطلاح کے استعمال کیے جانے پر ہمیں حیرت نہ ہونا چاہیئے (موازنہ ہو Agrarian System ص 246، 41 دلچسپ بات یہ ہے کہ Bold. Jusely 390 9 الف میں مختلف صوبوں کے 'جمع رائی' محاسب کا ایک روپیہ = 40 دام کی شرح پر دوبارہ بمقدار روپیہ لکھے گئے ہیں اور ان اعداد کو 'جمع رقمی' کہا گیا ہے۔ 'رقمی' کے 'ریا۔ ریکھا۔ مارٹ' کی اصطلاح سے جس کے معنی ملکیت وجہ نگر میں تشخیص بذریعہ پیمائش کے ہوتے ہیں ماخوذ ہونے کے بارے میں سر رچارڈ برنس (Sir Richard Burns) کی توضیح بالکل ناقابل فہم ہے 'JRAS' 1943ء ص 260-61

مگر کہا جاتا ہے کہ یہ پھر بھی حاصل سے بہت زیادہ ہٹی ہوئی تھی[1] آٹھ سال بعد اکبر نے بیک وقت متعدد اصلاحات نافذ کیں جنہیں اس کے عہد کا غالباً سب سے زیادہ جرأتمندانہ اقدام کہا جا سکتا ہے[2] اس نے بنگال، بہار اور گجرات کو چھوڑ کر بقیہ ہر جگہ کی جاگیروں کو واپس لے کر مختلف پیداواروں کی مقامی نقدی شرحیں مستقلاً مقرر کیں اور تشخیص کی غرض سے نئی جمع بھی طیار کرائی پچھلے باب میں گزر چکا ہے کہ اس عہد میں بلحاظ سابق، معینہ سالانہ نقدی شرحوں کی بنیاد پر نکالی ہوئی سالانہ اوسط مالگزاری کو پچھلے دس برسوں (پندرہویں سے چوبیسویں برس تک) کے رقبۂ بیبودہ کے اعداد سے ضرب کر کے جمع دہ سالہ مقرر کی گئی تھی، لیکن جمع صرف ضبط کے صوبوں کے لیے طیار کی گئی تھی۔ ابوالفضل کی اطلاع کے مطابق کشمیر کی صحیح جمع معین کرنے کی بار بار کوشش کی گئی اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالآخر ان صحیح شرحوں کی جن پر مالگزاری معمولاً ادا کی جاتی تھی اور نیز قیمتوں کی ان سطحوں کی تحقیقات کر کے جن پر جاگیرداران اپنے ذخیروں کو فروخت کیا کرتے تھے معین کی گئی تھی[3] ٹوڈرمل کو دوبارہ (1574ء اور 1576ء-7ء) گجرات کی جمع معین کرنے پر مامور کیا گیا تھا لیکن اس سلسلہ میں اختیار کیے ہوئے طریقہ پر پردہ پڑا ہوا ہے[4] بنگال میں جمع بظاہر پچھلی حکومت کے "کاغذات قانون گوئی" سے براہِ راست نقل کردہ تھی[5] اور اس صوبہ کے جو حالات ہمارے علم میں ہو چکے ہیں ان کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کی "جمع" غالباً مقامی زمینداروں پر حکومت کے مقررہ سالانہ مطالبات پر مشتمل رہا کرتی تھی۔ صوبجات دکن میں بظاہر ایک بہت ہی سرسری طریقہ اختیار کیا گیا کیونکہ اکبر نے خاندیش کی جمع میں جو 50 فیصدی کا

---

[1] اکبرنامہ (2) صہ 270 (3) صہ 117، آئین اکبری (1) صہ 347-8

[2] مورلینڈ نے اپنی تصنیف Agrarian System صہ 98 میں جمع دہ سالہ کے قائم کیے جانے کی غایت بھی بیان کی ہے۔

[3] اکبرنامہ (3) ص 548-9، 595، 617-8، 620، 629-7، آئین اکبری (1) صہ 570-71

[4] اکبرنامہ (3) صہ 67، 68 طبقات اکبری (2) صہ 275، 330 مراۃ (1) صہ 131-2 و صہ 134-5 بقول عارف قندھاری 210، 1577-8ء میں حکم ہوا کہ مظفر خان "بکھ ملہ" کی ہمراہی میں "جانچ کرے کہ (مولزنہ نمودند) علاقہ گجرات میں واماندر کے زرحاصل کیا تھی" قیاس ہے کہ اس طور پر جو رقوم معین ہوں ان کی بنیاد پر اسے گجرات میں جاگیروں کا انتظام کرنا تھا۔

[5] ملاحظہ ہو "فتحیۂ عبریہ" اوراق 104 الف جس میں اس امر کی توضیح ملتی ہے کہ چٹگاؤں مغلیہ حکومت کے جمع کے کاغذات میں کیونکر شامل رہا حالانکہ وہ شائستہ خاں کے زمانہ تک فتح نہ ہوا تھا۔ موازنہ بہ نیز، مورلینڈ JRAS 1926، صہ 48-50 اور Agrarian System صہ 196-7،

اضافہ کیا، وہ اگر واقعی وصول شدہ آمد پر نظر رہی ہوتی تو ایسا سوچا بھی نہ جا سکتا تھا[1]

سترھویں صدی میں جو جمع، جاگیر کے حسابات میں استعمال کی جاتی وہ دستاویزوں میں ظاہر کیے جانے کے باعث 'جمع دامی'، یا 'جمع دامی' کے نام سے موسوم ہوتی۔ اس کے قدرے کثرت سے اعداد و شمار ملتے ہیں (ضمیمہ د) اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں علاوہ بنگال کے ہر جگہ مسلسل ردّ و بدل ہوتا رہا ہے۔ اس عہد کی انتظامی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ مرکزی حکومت معمولاً جاگیروں میں مالگزاری کی وصولی (حال حاصل) کے متعلق رپورٹیں طلب کرتی رہتی تھی اور مستقل جمع کی جانچ کے خیال سے دربار شاہی میں رقبہ اور مالگزاری کے دہ سالہ اندراجات (موازنہ دہ سالہ)[2] اور مختلف حالوں میں

---

[1] آئین اکبری (۱) صفحہ 474 برار کی جمع کے حالات مندرجہ ایضاً 478 سے بھی یہی تاثر پیدا ہوتا ہے کہ پچھلے دور حکومت کی جمع کے اعداد کی بنیاد پر مغلیہ انتظامیہ کا جمع میں اضافہ کرنا ایک من مانی عمل تھا۔

[2] اس بات کی سند کے لیے 'حاصل' کی رپورٹیں طلب کی جاتی تھیں ملاحظہ ہو۔ Selected Documents. & C. 88 ـ 90 ، 194 ـ 5 ادب عالمگیری، اوراق 31 ب۔ 32 الف، 43 الف، 49 الف ب، 104 ب۔ 105 الف، رقعات عالمگیری صفحہ 88 ـ 107 ، 163-4 بقول Fraser 86 ورق 142 ب، معلیات جاگیر کی ضرورت کے تحت مرکزی دفاتر میں "دس برسوں کی 'حاصل' اور عہد حکومت کی ابتداء سے سال رواں تک زیادہ سے زیادہ وصول شدہ مالگزاری کے رجسٹروں کو تیار کرنا ہوتا تھا۔" سیاق نامہ 82 (اس میں ہے کہ مملکت کے دفاتر دیوانی میں علاوہ دیگر کاغذات کے "سال بہ سال جمع متعین (معلوم) کرنے کی غرض سے موازنہ دہ سالہ" تیار کیا جاتا تھا" تاکہ وہ لوگ (اس کے) مطابق ہر شخص کی تنخواہوں کے متعلق اپنی سفارشات پیش کر سکیں۔" علاوہ اس کے "حال حاصل میں کمی و بیشی کے اندراجات" وغیرہ" کا بھی ایک رجسٹر تیار کیا جاتا تھا (ایضاً 101) مرآۃ (۱) صفحہ 326 ـ 7 میں ہمیں ضمناً یہ اطلاع ملتی ہے کہ 1691 ـ 2 ء میں دربار شاہی سے ایک منصبدار صوبہ گجرات کے پرگنوں کی مالگزاری کی وصولیوں (حال حاصل) کے حسابات اور موازنہ دہ سالہ کی دیسائیوں اور مقدموں کے حاصل کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔ لیکن اس نے یہ شکایت کی کہ جاگیردار ان دیسائیوں کو اس کے ساتھ تعاون کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ شاہجہاں کے نام اورنگزیب کے ایک خط (مندرجہ ادب عالمگیری، ورق 32 ب، رقعات عالمگیری صفحہ 118) سے معلوم ہوتا ہے کہ جاگیروں سے حاصل کے جو حسابات موصول ہوا کرتے انہیں ہمیشہ قابل اعتبار تصور نہ کیا جاتا۔ اورنگزیب نے اس یقین کے تحت کہ دربار شاہی میں اس کی جاگیر کے حسابات کے متعلق بھی اس قسم کے شکوک پائے جاتے ہیں یہ پیش کش کی کہ اس کی جاگیر کو خالصہ میں شامل کر کے اس کی تنخواہ نقد مقرر کر دی جائے۔

مالگذاری کی ابتدائی وصولی کے کاغذات بھی تیار کرائے جاتے تھے جو 'حاصل کامل' کے نام سے موسوم تھے[1] اکبری حکومت ان اندراجات کو کروڑیوں کی وصولیوں کی جانچ کی غرض سے استعمال میں لاتی[2] اور ممکن ہے کسی جگہ کی جمع پر نظرثانی کرتے وقت بھی انہیں ذہن میں رکھا جاتا ہو۔

مگر 'جمع دہ سالہ' یا 'جمع دامی' کے اعداد ہمیشہ اور ہر مقام پر واقعی وصولیوں کے بالکل مطابق نہ ہوسکتے تھے۔ عہد اکبری ہی میں صوبۂ دہلی کی ایک جاگیر کی 'جمع' کے متعلق حکومت اور مستقبل کے جاگیردار کے درمیان سودے بازی کی اطلاع ہمارے علم میں آتی ہے[3] اگلے عہد حکومت میں ہاکنس Hawkins نے اپنی باضابطہ منظور شدہ تنخواہ کے مقابلہ میں اپنی جاگیر کی کم آمدنی کی شکایت پیش کی تھی[4] اور بقول پلسارٹ جاگیردار عموماً فرضی تشخیص کا صرف نصف وصول کر پاتے تھے[5] آخرکار، ہم دیکھتے ہیں کہ عہد شاہجہانی میں مختلف جاگیروں کی جمع دامی اور وصول شدہ آمد میں فرق کی وجہ سے جو بے انصافیاں اور مشکلات پیش آتی تھیں ان کے ازالہ کے لیے ایک نیا طریقہ اختیار کیا گیا اور 'جمع دامی' کو حاصل کے بعینہ مطابق رکھنے کی کوشش نہ کی گئی، بلکہ برخلاف اس کے ان دونوں کے فرق کو بحیثیت ایک حقیقت کے تسلیم کرکے ہر محال کے لیے آمدنی اور مستقل تشخیص کے درمیان سالانہ بدلتی ہوئی نسبت کا حساب لگاکر اسے ماہانہ تناسب (ماہوار) کی مقدار میں دکھایا گیا۔ لہٰذا وہ اس حاصل کے جمع کے مساوی ہونے کی صورت میں جاگیر بارہ ماہہ (دوازدہ ماہہ) اور نصف کی صورت میں چھ ماہہ (شش ماہہ) اور علیٰ ہذا القیاس اسی طرح کے ناموں سے موسوم[6] ہوتی تھی۔ اس کے قدرتی نتیجہ کے طور پر 'ماہانہ تناسب' کا طریقہ اختیار

---

[1] Fraser 86 ورق 162 ب۔

[2] اکبرنامہ (3) ص 457

[3] بایزید 363 - 4 ، 372 - 3 یہ پرگنہ سنام تھا اور یہ واقعہ 1584ء میں پیش آیا تھا۔

[4] Hawkins, Early Travels ص 91 ، 93

[5] Pelsaert 54

[6] ہمارے علم میں کسی اور مصنف نے 'ماہانہ نسبتوں'، یا بقول مورلینڈ، 'مہینہ کے ضابطہ' کی اس طور پر وضاحت نہیں کی ہے انتظامی تحریریں جن کی سند پر یہ توضیح پیش کی گئی ہے اس قدر زیادہ ہیں کہ ان سب کو تحریر میں لانا ممکن نہیں، لیکن ان میں خاص یہ ہیں۔ Selected Documents & C. ص 64 ، 248 ادب عالمگیری، اوراق 8 الف، 31 ب، 32 ب، 40 ب، 42 ب، 43 الف، 49 الف، ب (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کیا گیا تاکہ تنخواہ کو نقد بھی ادا کیا جا سکے[1] چونکہ مساوی المنصب مگر مختلف ماہانہ نسبتوں کی نقد

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

51 الف، 52 ب 53 الف 58 ب، 104 ب 105 الف، رقعات عالمگیری ص 10، 89، 107، 18، 121، 2، 130، 131، 135، 163، 4 وارث (اے) ورق 497 الف (بی) ورق 43 ب، الہ آباد 884، 885 اخبارات $\frac{38}{145}$ (آمدنیوں میں فرق کی وجہ سے) ہر جاگیر کی ماہانہ نسبت میں سالانہ تبدیلی کے ملاحظہ ہو Fraser 86 ورق 162 ب جس میں یہ معین کیا گیا ہے کہ ہر سال کی ماہانہ نسبتوں (ماہوار سال بہ سال) اور نیز حاصل دہ سالہ، دسالہ کامل کے کاغذات دربار شاہی میں طیار کیے جائیں۔ یہی بات ا عالمگیری، ورق 104 ب میں بھی ملتا ہے۔ "عہد حکومت کے اٹھائیسویں برس پرگنہ بیر کی حاصل تقریباً ہشت ماہہ تھی اور انیسویں سال یہ اس سے بھی زیادہ کردی جائے گی"۔ اسی مجموعہ میں ایک دوسرے مقام پر (ایضاً ورق 8 الف، رقعات عالمگیر ص 10) میں ایک جاگیر کی اطلاع ملتی ہے جس کا "اس سال" کا پنج ماہہ سے زائد نہ تھا

جمع کے کاغذات میں جو دام استعمال کیا گیا ہے وہ محض ایک حسابی رقم تھی۔ لہٰذا اسے روپیہ کے چالیسویں حصہ کے برابر شمار کیا جاتا تھا۔ پس اگر کوئی جاگیر بارہ ماہہ ہوتی تو ایک لاکھ دام کی جمع کا مفہوم 2500 روپیہ ہوتا (ملاحظہ ہو مثلاً لاہوری۔ ا (2) ص $\frac{205}{}$ Selected Documents & C. ص 7، الہ آباد 885 884 (دونوں عہد عالمگیری کے متعلق) میں جاگیر کی جمع کے داموں اور ان روپیوں ا آنوں کی مقدار میں تعلق کو جو مالگزاری کا ٹھیکہ دار سالانہ جاگیردار کو ادا کرنے کا پابند ہوتا ماہانہ شرح میں اس طور پر بیان کیا گیا ہے: دام 000 440، 33 73 روپیہ 4 ماہانہ نسبت "ہشت ماہانہ" دام 0 210 00، 3162 روپیہ، ماہانہ نسبت "7 ماہ 7 یوم" یہ دونوں نسبتیں بہ اعتبار ریاضی صحیح ہیں۔ ادب عالمگیری 4 ب، رقعات عالمگیری ص $\frac{121}{2}$ میں مغلیہ دکن کے صوبوں کے متعلق اطلاع ہے کہ ان کی 88 لاکھ کی حاصل ان کی جمع کے "سہ ماہہ" کے مساوی نہ تھی جو ...... 49 14 دام تھی یعنی حاصل کے عدد کا عملاً چار گنا۔

حالانکہ معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کے نظم و نسق میں ماہانہ نسبتوں کا عام استعمال عہد شاہجہانی میں شروع ہوا تھا لیکن تاریخ طاہری سے جو عہد جہانگیری کے متعلق سندھ کی ایک تاریخ کی کتاب ہے پتہ چلتا ہے کہ اس کے رواج کی تاریخ پرانی تھی۔ 1605۔ 6ء میں سندھ کے گورنر مرزا غازی بیگ ترخان نے جس کی حیثیت عملاً ایک ماتحت حکمران کی تھی اپنی فوج کی تنخواہ کو ہشت ماہہ سے گھٹا کر شش ماہہ کر دیا تھا۔ یہ تخفیف اس کے افسروں کی ناراضگی کا سبب بنی کیونکہ بقول ان کے اس سے ان کی تنخواہیں بقدر ایک چہارم کم ہوگئیں (تاریخ طاہری، Or. 1685 اوراق 118 الف 119 ب)

[1] موازنہ Selected Documents & C ص 64، 76 ۔ 7، ادب عالمگیر (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

نقد تنخواہوں یا جاگیروں کے منصبداروں کی آمدنیوں میں بیحد فرق پایا جاتا تھا لہٰذا اس فرق کے ازالہ کی غرض سے ہر ماہانہ تناسب' کی رعایت سے فراہمی فوج کی علیحدہ علیحدہ ذمہ داریاں بھی عائد کی گئیں[1]

(باقی حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

اوراق 9 الف، 82 ب، 42 ب، 43 الف، 202 ب 328 ب 329 الف، رقعات عالمگیر 10 105 - 7، 117 - 8، 228، مآثر عالمگیری ص 88 دستور العمل علم نویسندگی اوراق 147 ب 148 الف، Bodl. 390 اوراق 40 الف۔ 41 الف، Or. 1840 اوراق 143 ب 144 ب اور فرہنگ کاروانی اوراق 24 الف۔ ب میں ہر ماہ کے لیے فی لاکھ داموں کے ہم قیمت روپیہ کی تعداد اس واضح اطلاع کے ساتھ درج کی گئی ہے کہ یہ منصبداروں کے' ذات' کے مناصب کی تنخواہیں معین کرنے میں استعمال کی جائیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نقدی منصبداروں کے سوار کے مناصب کی تنخواہ معین کرنے کا کوئی اور طریقہ تھا۔ اگلے نوٹ میں اس طریقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بہرحال ضوابط عالمگیری Add. 6598 ورق 149 الف ب، Or. 1641 'اوراق 142 الف۔ 43 ب میں مذکورہ بالا جدول کے مثل ایک دوسرا جدول درج ہے مگر اس کے اطلاق کو مخصوص طور پر ذات کے مناصب کی تنخواہوں تک محدود نہیں رکھا گیا ہے۔

[1] اسے مہمات بلخ و بدخشاں کے سلسلہ میں مختلف ماہانہ ضوابط کے تحت منصبداروں پر فوجی دستوں کی فراہمی کے متعلق عائد کی ہوئی ذمہ داری کی تفصیلات میں جنہیں لاہوری (2) ص 506 - 7 نے بیان کیا ہے سب سے زیادہ واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ایک خصوصی خدمت تھی جس پر پانچویں حصہ کے نام سے موسوم ضابطہ کا اطلاق ہوتا تھا، یعنی منصبداروں کو اس قدر سوار فراہم کرنا ہوتا تھا جو تعداد میں ان کے سوار کے مناصب کے $\frac{1}{5}$ کے برابر ہو۔ انتخاب دستور العمل پادشاہی' اوراق 7 الف۔ 9 ب اور خلاصۃ السیاق، علیگڑھ مخطوطہ میں دونوں طرح کے منصبداروں کو جملہ مہینوں کے تحت فوج کے جو دستے فراہم کرنا ہوتا تھا انہیں اس طور پر بیان کیا گیا ہے، یعنی منصبدار جو رکاب میں لازم تھے (اپنے جاگیر کے صوبہ کے باہر: سواروں کی تعداد ان کے سوار کے مناصب کے ایک چہارم کے برابر) اور جو تعینات کے طور پر تھے (جاگیر اور ملازمت ایک ہی صوبہ میں سوار منصب کا ایک تہائی Selected Documents, & C. ص 249 فرہنگ کاروانی Edinburg 83 'اوراق 22 الف 23 الف بھی ملاحظہ ہوں۔

سنہ 27 جلوس شاہجہانی کے ایک فرمان (مرآۃ (1) 227 - 9) اور بعض انتظامی ضوابط ناموں Bodl' Ouseley 390) اوراق 42 ب۔ 43 الف' اور 1840 'اوراق 143 ب۔ 144 ب فرہنگ کاروانی ورق 24 الف۔ ب' Edinburg 83 'اوراق 21 ب۔ 22 الف) میں نقدی منصبداروں (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

عام حالات میں بظاہر شاہی انتظامیہ جاگیردار کو وصولیٔ مالگذاری کے نشیب و فراز کے خطرات برداشت کرنے کے لیے چھوڑ دیتا تھا اور وصولی میں کمی کو نہ تو پورا کیا جاتا اور نہ زائد کو طلب کیا جاتا[1] بہرحال، بعض صورتوں میں جب جاگیردار کی طرف سے 'جمع دامی' کی زیادتی کے متعلق کوئی شدید شکایت سامنے آتی تو اسے کم کردیا جاتا جسے 'تخفیف دامی' کہتے تھے۔ اس تخفیف شدہ رقم کے لیے جاگیردار کا ایک حق (طلب) تسلیم کیا جاتا جسے خزانہ سے یا اس کے مساوی رقم کی جاگیر کے عطیہ سے پورا کردیا جاتا تھا۔[2]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

کے فوجوں کی تنخواہ ایک عجیب طریقہ پر درج کی گئی ہے، 40 روپیہ فی گھوڑا (یا اسپ سوار) 12 مہینوں کے تحت، 30 روپیہ 8 مہینوں کے تحت وغیرہ۔ سنہ 27 جلوس شاہجہانی کے ایک فرمان میں درج ہے کہ پہلے 7 اور 6 مہینوں کے منصبداروں کو بھی 30 روپیہ فی گھوڑا (سوار؟) ملا کرتا تھا اور اس حکم کا مقصد اسے تبدیل کرکے علی الترتیب $27\frac{1}{2}$ روپیہ اور 25 روپیہ کرنا تھا۔ دکن میں اس حکم کے اطلاق پر اورنگذیب کی ناپسندیدگی اور بظاہر صرف دکن کے لیے شاہجہاں کی ان احکام میں ترمیم کے لیے ملاحظہ ہو نیز ادب عالمگیری اوراق 38 الف۔ب، 45 ب 56 ب، 117 ب، 118 الف، رقعات عالمگیری 16 ۔ 17، 129 پس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نقش جاگیر داروں کے نقدی منصبداروں کو سوار کے منصب کی فی اکائی پر 8000 دام کی شرح سے نہیں بلکہ فی اسپ سوار کے حساب سے ادا کیا جاتا تھا اور شرح بدلی کے گھوڑوں کی نسبتاً کم تعداد اور نیز گھوڑوں اور ان کے سواروں کے کمتر معیار کے پیش نظر ماہانہ شرحوں کے ساتھ ساتھ کم ہوتی رہتی تھی۔

[1] جاگیروں کی آمدنی کے متعلق شکایتوں اور سرکاری احکام کے مطالبہ سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو مثلاً وقائع اجمیر 199 ایک عہدہ دار کی شکایت تھی کہ شاہی محصل (کرکوڑی) اس کی نئی جاگیر کی مالگذاری کو جو غالباً پہلے خالصہ میں شامل تھی پہلے ہی وصول کرچکا تھا۔ یہ وصول شدہ رقم اس کی تنخواہ کے مطابق نہ تھی، لہذا اس نے جاگیر کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ صوبیدار اجمیر نے بہرحال اسے جواب دیا کہ یہ "تقدیری معاملہ ہے۔ جاگیر کی واپسی اسے زیب نہیں دیتی، حالانکہ وہ (بہتر جاگیر کے لیے؟) شاہی دربار میں اپنی استدعا پیش کرسکتا ہے۔

جاگیردار کو اپنی جاگیر کی زائد وصولیوں کو خود استعمال کرنے یا واپس کردینے کا اختیار حاصل رہتا تھا جیسا کہ شائستہ خاں کے اس حکم سے ظاہر ہے کہ اس کی جاگیر کی 'جمع مقرری' سے زائد تمام وصولی کسانوں کو واپس کردیا جائے۔ لیکن اگر اس کا مالک بادشاہ ہوتا تو ایسا ممکن نہ ہوتا (ملاحظہ ہو نقیحۂ عبریہ ورق 127 الف۔ب)

[2] Seleoted Document & C. صـ 177، ادب عالمگیری، اوراق 31 ب 32 ب، 34 الف۔ب، 39 الف۔ب، 42 ب 43 الف، 47 ب 148 الف۔ رقعات عالمگیری

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اس کے ساتھ ساتھ واقعی آمدنی کے "جمع دامی" یا جاگیردار کی منظور شدہ جمع کی ماہانہ نسبت سے بہت زیادہ ہونے کی صورت میں یہ فاضل رقم اس سے براہ راست وصول کرلی جاتی یا مطالبہ یعنی اس کے ذمہ حکومت کے مالی حقوق میں جوڑ دی جاتی[1] بہرحال، اکبر نے یہ تجویز منظور کرلی تھی کہ جاگیرداروں کے حسنِ انتظام سے آمدنی میں جو اضافہ ہوا ہے ان کے مناصب میں متناسب ترقی دے کر ان کے پاس رہنا چاہیے[2]

جاگیروں کی میعادی تبدیلیاں جاگیرداروں کے لیے بجائے خود پیچیدگیوں اور زحمتوں کا سبب ہوا کرتیں، مثلاً جاگیروں کے سلسلہ میں یہ تصور کیا جاتا تھا کہ علاوہ بنگال اور اڑیسہ کے بقیہ ہر جگہ کی خریف اور ربیع کی فصلیں مساوی القیمت ہیں[3] لیکن صورتحال، حقیقتاً ایسی نہ تھی اگر کوئی جاگیردار کسی سال فصل خریف میں ایک جگہ کی اور فصل ربیع میں دوسری جگہ کی جاگیر پر قابض رہا ہو اور اگر یہ دونوں اپنے اپنے علاقہ کی اہم فصلیں نہ ہوتیں تو اس سال اس کے لیے شدید خسارہ کا امکان پیدا ہو جاتا کرتا تھا[4] علاوہ اس کے جاگیر کے تبادلے محض فصل کے شروع میں نہیں بلکہ کسی بھی مہینہ کے شروع میں ہوسکتے تھے۔ کسی فصل کے دوران تبادلہ کی صورت میں پرانے اور نئے جاگیرداروں کو (جن میں سے کوئی ایک خالصہ ہوسکتا تھا) اپنے اپنے قبضہ کے مہینوں کی تعداد کے لحاظ سے پوری فصل

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ص 88، 95 - 96، 98، 107 - 111 - 12، 136، اخبارات 38/30، احکام عالمگیری اوراق 92 ب 93 الف، کارنامہ، اوراق 208 ب - 209 الف۔

[1] ادب عالمگیری، اوراق 52 ب - 53 الف، رقعات عالمگیر ص 130-31، آثر عالمگیری ص 170، اخبارات 38/145 اکبر نے بدیہی طور پر بایزید کو 29 لاکھ داموں کے جمع کی سنام کی جاگیر معہ اس کی زائد آمدنیوں کے صرف میں لانے کی اجازت دے کر اس کے ساتھ خصوصی رعایت برتی تھی (بایزید، 363) جب بنگال میں متعدد جاگیرداروں کو ان کی معینہ تنخواہوں سے زائد جمع کی جاگیریں دی گئیں تو انہیں یہ ہدایت تھی وہ زائد رقوم خالصہ کو واپس کریں (زبدۃ، عربیہ، ورق 117 الف - ب) [2] اکبرنامہ (3) ص 459

[3] موازنہ ہو Selected Documents & C. ص 76-77 بنگال اور اڑیسہ کی استثنائی حیثیت کے لیے ملاحظہ ہو Qr. 1840، ورق 140 الف - ب، Traser 86، ورق 60 ب۔

[4] ادب عالمگیری ورق 58 ب. موازنہ ہو نگارنامہ منشی ورق 37 الف - ب Bodl. اوراق 28 ب 29 الف، مطبوعہ 29۔

کی آمدنی کو آپس میں تقسیم کرنا ہوتا تھا۔[1] جاگیرداروں کے جب اپنے پورے محاصل کی وصولی کے قبل
ناگہانی طور پر تبادلے ہو جاتے تو یہ ایک مزید پریشانی کی صورت ہوتی۔[2] اس کے ساتھ یہ بھی ممکن تھا کہ
کسی جاگیردار کو اپنے پیشرو کے ذمہ مالگذاری کا پچھلا بقایہ اصول کر کے خالصہ کو ادا کرنا پڑے۔[3]

جاگیر پر ایک شخص کے بجائے دوسرے کا قبضہ ہمیشہ بغیر نزاع برپا ہوئے عمل میں نہ آتا۔ معلوم
ہوتا ہے کہ حکومت اس بات کا لحاظ رکھا کرتی کہ کسی ایک علاقہ کی جاگیر ایک وقت میں کسی ایک ہی شخص
کو دی جائے۔[4] لیکن چونکہ تبدیلیوں کے احکام پہونچنے میں وقت درکار ہوتا، لہٰذا ہو سکتا تھا کہ
اسی اثنا میں کسی جاگیر کے کارندے دوسرے کا حق وصول کر لیں۔[5] بعض اوقات جاگیرداران آپس
میں جسمانی طاقت کا بھی استعمال کیا کرتے لیکن یہ صورت بظاہر عام طور پر اس وقت پیش آتی جب
ان میں سے ایک کی تبدیلی کا حکم موصول ہو چکا ہو اور دوسرے[6] کا نہیں۔

ایسا شخص جو اپنے منصب پر تقرری یا کسی بڑے منصب پر ترقی کی تاریخ ہی سے اپنی جاگیر پر
قبضہ پا جائے بہت خوش قسمت تصور کیا جاتا تھا۔[7] بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ کوئی شخص اپنی موجودہ

---

[1] ملاحظہ ہو خصوصاً خلاصۃ السیاق، اوراق 89 الف۔ 90 الف، Or. 2026، اوراق 51 الف۔ب
مرآۃ (۱) ص 305 دستور العمل نویسندگی ورق 180 الف۔ب اور Fraser 86 ورق 78 الف۔ب
فرہنگ کاروائی ورق 24 ب۔ 25 الف Edinburgh 86 ورق 19 الف الہ آباد 89

[2] تزک جہانگیری، 22 وقائع اجمیر 413

[3] ایضاً، فتحیہ عبریہ ورق 130 ب، مراۃ (۱) ص 305

[4] بقول معموری ورق 119 ب حکومت بیجاپور کی یہ فاش غلطی تھی کہ اس نے بیک وقت ایک ہی محال کی
جاگیر ایک سے زائد اشخاص کے پاس بذریعہ جنگ تصفیہ کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔

[5] نگارنامۂ منشی اوراق 186 ب۔ 187 الف، Bodl. ورق 148 الف۔ب مطبوعہ 143، وقائع اجمیر 109۔

[6] عرضداشتہائے منظفر Add. 16859 اوراق 3 ب۔ 4 الف، بالکرشن برہمن اوراق 64 ب
65 الف، وقائع اجمیر 37، 42، 187، حقین الانشاء اوراق 32 ب 33 الف، 44 ب۔ 145 الف،
احکام عالمگیری، ورق 169 الف۔

[7] بایزید 372۔74، وقائع اجمیر 405۔6۔ اورنگزیب کے بخشی کے پیشکار مرزا یار علی کا دربار شاہی میں یہ بیان مشہور
ہے کہ ایک شخص جو اپنے منصب کی تقرری کے وقت نوجوان ہوتا اپنی تنخواہ کی جاگیر لیتے پاتے اس کی داڑھی کے بال سفید
ہو جایا کرتے (خافی خاں (2) ص 379)

جاگیر کے تبادلہ کے فوراً بعد دوسری جاگیر نہ پاسکے[1] منصبدار اپنی بغیر جاگیر کی مدت کی تنخواہ کے مطالبہ یعنی 'طلب' کو خزانہ شاہی میں پیش کرسکتا تھا، لیکن عہد عالمگیری کے اواخر میں تو یہ حکم صادر ہوا کہ تقرری کے فوراً بعد کی مدت کے متعلق کوئی بھی مطالبہ قابل قبول نہ ہوگا اور عملی طور پر تو اس زمانہ میں اسکے علاوہ دوسری صورتوں میں بھی 'طلب' کبھی شاذ ہی ادا کی جاتی تھی[2]

جاگیرداروں سے اکثر سرکاری بقایوں یعنی 'مطالبہ' کی علت میں جاگیرداروں کے بحیثیت واپس لے لیا جاتا تھا[3] یہ مطالبات مختلف صورتوں میں باقی رہ جاتے ہیں، مثلاً غیر ادا شدہ قرضوں، (مساعدت) سے[4] جاگیرداروں کے بحیثیت منصبداروں کے اپنی مختلف ذمہ داریوں کے پورا نہ کرنے سے (مثلاً داغ کی غرض سے معیاری نسل کے گھوڑوں کی مطلوبہ تعداد کو[5] معینہ مدت[6] میں پیش نہ کرنے سے، شاہی اصطبل کے جانوروں کے لیے خوراک مہیا نہ کرنے سے[7]، وغیرہ) پچھلی مدت سے تخفیف تنخواہ اور جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں[8] زاید آمدنیوں اور پچھلے برسوں کی مالگذاری کے بقایوں سے۔

---

[1] معموری، ورق 182 ب، خافی خاں (2) 396، نگارنامۂ منشی، ورق 46 الف، مطبوعہ 35

[2] معموری، ورق 182 ب، خافی خاں (2) 396 ـ 7 موازنہ بہ احکام عالمگیری، ورق 19 الف۔

[3] وارث (واے) ورق 400 الف۔ب (پی) ورق 15 الف۔ب، ادب عالمگیری، ورق 58 ب، رقعات ص 122، دلکشا ورق 139 الف، متین الانشاء اوراق 49 الف۔ب، 49 ب، 50 الف، 50 ب، 53 ب

[4] آئین اکبری (1) ص 196 ـ 7 وقائع اجمیر 62، دلکشا ورق 139 الف، موازنہ بہ نیز Factories 16 55 ـ 60، ص 67

[5] تنات داغ Selected Documents & C. ص 195، ادب عالمگیری، اوراق 138 الف، ب 118 الف، رقعات عالمگیری 116 ـ 17

[6] ذیر تصحیح، ضوابط عالمگیری، Add. 6598 ورق 148 الف Or. 1641 ورق 39 ب Fraser 86 ورق 68 الف۔ب۔

[7] خوراک دواب، جانوروں کی تعداد اور اقسام کے لیے جنہیں خوراک فراہم کرنی ہوتی تھی، ملاحظہ ہو دستور العمل نویسندگی اوراق 146 الف، 147 الف Fraser 86 اوراق 75 ب، 76 الف۔ ایک ایسی صورت کے لیے جس میں واقعتہً خوراک طلب کی گئی ملاحظہ ہو، متین الانشاء اوراق 71 الف، ب 74 الف۔ب جس میں خوراک کے مطالبہ کو بعد میں نقدی محصول کی شکل دی گئی (اخبارات 46/267، خافی خاں (2) ص 602 ـ 3)

[8] موازنہ بہ، متین الانشاء ورق 55 الف۔ب۔

نظامِ جاگیرداری اس قدر سخت اور پیچیدہ ضابطوں پر مرتب کیا گیا تھا کہ اس کی انجام دہی محرّروں اور محاسبین کی ایک کثیر تعداد کی موجودگی کے بغیر ناممکن تھی۔ لہٰذا جاگیرداران شاہی انتظامیہ کے ان ادنیٰ دفتری ملازمین کو اپنی جملہ پریشانیوں کا سبب تصور کرتے تھے جو انہیں مسلسل نقصان پہنچانے کے درپے رہا کرتے، خواہ جاگیر کی حوالگی یا ان پر مطالبہ عائد کرنے کے وقت۔[1] اس کے ساتھ ساتھ نوکرشاہی کے تمہ کے طور پر رشوت کا تقریباً عام رواج تھا جس کے نتیجہ میں جانچ پڑتال کے وہ سخت ضابطے جو جاگیرداروں سے ان کی ذمہ داریوں کے پورا کرنے کے سلسلہ میں مقرر کیے گئے تھے، غالباً محض کاغذی حیثیت[2] رکھتے تھے۔

عہدِ عالمگیری کے اواخر میں جاگیرداری کا نظام ایک بحران سے دوچار ہوا۔ 1682ء سے شروع ہو کر اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اورنگزیب دکن میں مسلسل جنگوں میں مصروف رہا اور مملکتِ مغلیہ کی جملہ فوجی طاقت کے اجتماع کے باوجود اس کی کوششیں کامیاب نہ ہوئیں۔ اس مدت میں 'دکنیوں' یا دکنی سلطنتوں کے افسران اور مرہٹوں کو منصبداری کے بے شمار عہدے عطا کیے گئے تاکہ انہیں اس طور پر قابو میں لا کر کم از کم دشمن کی طرف داری سے روکا جا سکے۔ نتیجۃً منصبداروں کی تعداد اس قدر زیادہ ہو گئی کہ موجود جاگیریں ان کی تنخواہوں کے لیے ناکافی ثابت ہوئیں[3] اورنگزیب خود اپنے مکتوب میں 'پائی پائی کی قلت اور تنخواہ کے دعویداروں کی کثرت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہر چیز "گوشت اور ہڈی" تک تقسیم ہو چکی ہے اور اب مزید جاگیریں دیے جانے کی کسی تجویز پر دوبارہ غور نہیں کیا جا سکتا۔[4] معموری اور خافی خاں کے بھی اسی قسم کے بیانات ہیں ہماری اطلاع ہے کہ "کثیر تعداد (لفظاً: ایک دنیا) بغیر جاگیر کے ہو گئی ہو۔ مقرر شدہ منصبداروں کو برسوں جاگیریں نہ مل سکیں اور جن کی جاگیریں تبدیل ہوئیں وہ بھی دوسری جاگیر نہ پا سکے[5] نسبتاً پرانے امراء (المعروف خانہ زادان) دکنیوں کے مقابلہ میں

---

[1] موازنہ یہ فقیرہ بحریہ اوراق 129 ب، 131 الف، دلکشا اوراق 139 الف۔ 140 ب۔

[2] دلکشا، ورق 140 ب۔ داغ کے لیے لائے جانے والے گھوڑوں کی جانچ کے سلسلہ میں رشوت ستانی کے لیے ملاحظہ ہو Hamuec1 (2) 377 – 8، متین الانشاء اوراق 66 ب 67 الف، 70 الف، ب، 80 الف، ب۔

[3] معموری اوراق 15 ب۔ 157 الف، خافی خاں .Add 6574، اوراق 106 ب۔ 107 الف۔
یہ اہم عبارت جس میں دکنیوں کی تعداد کی کثرت کی مذمت کی گئی ہے، خافی خاں کے بب انڈ کے نسخہ سے حذف ہے۔

[4] دستور العمل آگاہی ورق 31 الف، .Add 18422، اوراق 17 ب۔ 18 الف۔

[5] معموری، ورق 57 الف، خافی خاں .Add 6574 ورق 107 الف،

اپنی حق تلفیوں پر بیحد کبیرہ خاطر تھے[1] لیکن اس بحرانی صورتحال کے حقیقی معنوں میں شکار وہ چھوٹے منصبداران ہوتے جو دولت ورسوخ سے محروم ہونے کے باعث حصول جاگیر کے سلسلہ میں درباری افسران تک پہونچنے سے معذور رہتے تھے[2]

خالصہ کو لازمی طور پر ایسی متعدد جاگیروں کا مجموعہ تصور کرنا چاہیے جو مغلیہ انتظامیہ کے براہ راست تصرف میں تھا، پائی باقی کے علاقوں کے علاوہ جو دوبارہ جاگیروں میں دیئے جانے تک[3] تھوڑی مدت کے لیے خالصہ میں شامل کر لیے جاتے تھے، ہمیں متعدد محالات کے خالصہ کی جاگیر سے خارج یا اس میں شامل کیے جانے کی مسلسل اطلاعات ملتی ہیں۔ بہرحال یہ ایک مسلمہ اصول معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ زرخیز اور بہ سہولیت قابل انتظام زمینوں کو خالصہ میں رکھا جاتے۔ چنانچہ اسی بنا پر

---

[1] معموری، ورق 182 ب، خافی خان (2) ص 379، 396-7،

[2] معموری، اوراق 156 ب۔ 157 الف، خافی خان، Add. 6574، اوراق 106 ب 107 الف اورنگزیب خود تسلیم کرتا تھا کہ اس صورتحال میں "چھوٹے لوگوں (ریزہ ہائے) کے ساتھ بیحد انصافی ہوتی ہے۔" (دستور العمل آگاہی، ورق 31 ب Add. 6574، ورق 107 الف)

[3] خلاصۃ السیاق، ورق 89 الف۔ب، Or. 2026 ورق 51 الف۔ب، موازنہ بہ وقائع اجمیر 375 - 6 بایزید جب 1576ء میں مالوہ کی سرکار سارنگ پور کے مالی انتظامات پر مامور ہوا تو اس نے مطلع کیا کہ یہ سرکار خالصہ میں شامل کیے جانے کے "قابل" نہیں ہے۔ لہٰذا یہ اسی کو جاگیر میں دیدیا گیا (ص 353) اسی طرح اورنگزیب نے بھی بعض پرگنوں کو اس بناء پر کہ وہ خالصہ کے "قابل" نہیں ہیں دوبارہ جاگیر میں دیئے جانے کا حکم صادر کیا (اخبارات 42/14) کسی علاقہ کے خالصہ میں شامل کیے جانے کی موزونیت کے خاص معیار کو ہاکنس کے اس قول سے کہ "بادشاہ" کسی بھی زمین کو "اپنے لیے لے لیتا ہے (اگر یہ زمین زرخیز ہو اور پیداوار کے زیادہ ہونے کا امکان ہو) (Early Travels, 114) اور نیز قزوینی کی اس امر کی مذمت سے کہ عہد جہانگیر کے اواخر میں خالصہ میں صرف ویران علاقے رہ گئے تھے (Or. 20734 ص 444، Or. 173 ورق 221 الف۔ب) قیاس کیا جا سکتا ہے۔ وقائع اجمیر 4 - 5 میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ قلعہ انتم بھور کے نواحی پرگنات کو خالصہ میں شامل کر لیا جائے کیونکہ انہیں قابو میں رکھنا آسان ہے اور ایک دوسرے پرگنہ کے متعلق اس کے "سیر حاصل" ہونے یعنی اس کی مالگذاری کی وصولی کو تشخیص کے کلیتہً مطابق ہونے کو اس کے خالصہ میں شامل کیے جانے کا معقول سبب قرار دیا گیا ہے۔ موازنہ بہ ریاض السلاطین 245 - 6 جس میں ذکر آیا ہے کہ عہد عالمگیری کے اواخر میں بنگال کی "سیر حاصل" جاگیریں خالصہ میں شامل کر لی گئیں۔

بعض پرگنے تقریباً مستقلاً خالصہ میں شامل رکھے جاتے تھے[1]

خالصہ کا رقبہ وقت پر کم و بیش ہوتا رہتا تھا۔ اکبر نے اپنے عہد حکومت کے اونیسویں برس، بنگال اور بہار، گجرات کو چھوڑ کر بقیہ اپنی پوری مملکت کو جیسا کہ یہ اس وقت تھی خالصہ میں شامل کر لیا[2] جیسا کہ پہلے ہی سوچا جا رہا تھا، یہ صرف ایک عارضی کاروائی ثابت ہوئی اور تھوڑی مدت بعد جاگیروں کی منظوری کا دوبارہ سلسلہ شروع ہو گیا[3] ایک ضمنی حوالہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ [31] ء

---

[1] Bernier 224 جب بنڈوں کو شاہزادہ معظم کی جاگیر سے تبدیل کیا گیا تو اورنگزیب نے مثل ایام قدیم کے اسے خالصہ میں شامل کیے جانے کا حکم دیا (اخبارات $\frac{47}{14}$)

[2] اکبرنامہ (3) ص $\underline{117}$ عارف قندھاری 177 - 8 غالباً اکبر کے پیش نظر اس کے پیش رو اسلام شاہ کی مثال تھی جو اپنی پوری مملکت کو براہ راست اپنے انتظام (خالصۂ خود) میں رکھ کر اپنے امراء کو تنخواہیں ادا کیا کرتا تھا (بدایونی (1) ص $\underline{384}$ تاریخ داؤدی 165)

[3] موازنہ بہ Agrarian System '96 - 8 جو عمل کیا گیا، وہ غالباً سرکار سارنگپور کی صورتحال سے بہترین طور پر واضح ہوتا ہے جس کا ابھی حوالہ آ چکا ہے۔ وہاں کے جاگیردار شہاب الدین خاں کو گجرات تبدیل کر کے اسے خالصہ میں شامل کر دیا گیا اور بایزید اس کے مالی انتظامات کی درستگی پر مامور ہوا۔ اس نے 1574ء کے اواخر یا عہد حکومت کے بیسویں برس اپنا عہدہ جب اس نے اسے خالصہ میں شامل کیے جانے کی مخالفت کی تو اسے دوبارہ جاگیر میں دے دیا گیا (بایزید 353) یہ سرکار اوجین کے حلقہ میں ملتی ہے اور اس کی آراضی بیہودہ کے اعداد آئین اکبری میں درج ہیں۔

بہر حال یہ ممکن ہے کہ 1580 - 81ء کے واقعات کی وجہ سے جاگیروں کی واپسی میں عجلت کی گئی ہو۔ اکبری حکومت کو تمام مشرقی صوبوں میں بغاوت اور مرزا حکیم کے شمال مغرب کی طرف سے حملہ کی وجہ سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا اس کے اعلیٰ ترین امراء نے اس موقع پر دیوان وقت اور تجربہ کار کروڑی کے ایک بانی شاہ منصور کے خلاف سازش کر کے اس بدنصیب دیوان کو مرزا حکیم کے خلاف اکبر کی روش کے دوران بے بنیاد الزام میں متہم کر کے پھانسی کے تختہ پر چڑھا دیا۔ بقول بدایونی (2) ص $\underline{296}$ اس اثنا میں شہباز خاں کمبو، میر بخشی نے جو "بادشاہ کی غیر موجودگی میں آگرہ کے انتظامات پر مامور تھا اپنے اختیار سے گڑھی سے لے کر پنجاب تک کی تمام جاگیروں کو لوگوں میں تقسیم کر دیا۔۔۔ جب (واپسی پر) بادشاہ نے اس کا سبب دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ اگر اس نے فوجوں (یعنی افسران) کو خوش نہ کیا ہوتا تو فوراً بغاوت ہو جاتی" ہمیں یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اکبر نے میر بخشی کے اس مفروضہ پر کہ اگر وہ مناسب خیال کرے تو ان تمام تقسیم کیے ہوئے مناصب اور جاگیروں کو واپس لے لے، عمل کیا یا نہیں بظاہر 1575 - 6ء میں کیے گئے عمل کی تکرار کو اب قرین مصلحت نہ تصور کیا گیا۔

جلوس اکبری میں صوبجات دہلی، اودھ اور الہ آباد کے خالصہ کی جمع ان کی مجموعی جمع کا ایک چہارم تھی[1] عہد جہانگیری میں خالصہ کا علاقہ اس قدر گھٹ گیا کہ اس کی جمع پوری مملکت کی جمع کے پانچ فیصدی سے بھی کم پر آگئی[2] بہرحال، شاہجہاں نے اس کے رقبہ اور محاصل میں اضافہ کی ایک سوچی سمجھی ہوئی پالیسی کی طرف قدم اٹھایا اور کہتے ہیں کہ اس کے عہد کے چوتھے برس تک اس کی جمع کل کا پندرھواں حصہ ہو گئی[3] غالباً اگلے چند برسوں ہی کی مدت میں یہ بڑھ کر 1/11[4] اور بیسویں برس تک تقریباً 1/7 ہو گئی[5] اکتیسویں

---

[1] کہا جاتا ہے کہ اکبر نے اس سال ان صوبوں میں جمع کا 1/2 حصہ معاف کر دیا تھا اور خالصہ کے متعلق اطلاع ہے کہ اس میں چھوٹ کی رقم بقدر 596 560 40 دام تھی (اکبرنامہ (3) ص 404) اس طور پر ان صوبوں میں خالصہ کی مجموعی جمع 243 00.00.00 دام سے زائد رہی ہو گی۔ آئین اکبری کے صوبجاتی شماریات میں ان تین صوبوں کی مجموعی جمع تقریباً 1016 00 00 00 دام درج ہے۔ اکبرنامہ میں مندرج مالگذاری کی چھوٹ کی دیگر مثالیں براہ راست موازنہ کا اس قدر بہتر موقع نہیں فراہم کرتیں۔

[2] قزوینی Add. 20734، ص 404-5 Qr. 173، ورق 221 الف۔ب کے قول کے مطابق یہ کم ہو کر 20 کروڑ رہ گئی تھی۔ 1627-29ء کے لگ بھگ مملکت کی مجموعی جمع 630 کروڑ تھی (مجالس السلاطین، اوراق 115 الف۔ب)

[3] قزوینی Add. 20734 ص 444 173، ورق 221 الف۔ب کا یہ بیان 50 لاکھ کی چھوٹ کے حوالہ سے ہے جو 1630-32ء کے بڑے قحط کے دوران دی گئی تھی۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ شاہجہاں نے اپنی تخت نشینی کے بعد یہ حکم صادر کیا کہ خالصہ کو اس قدر بڑھایا جائے کہ اس کی جمع 60 کروڑ ہو جائے۔

[4] لاہوری (1) ص 364 کا یہ بیان اسی سیاق میں ہے جس میں قزوینی کا بیان۔ لیکن وہ خالصہ کی چھوٹ اور نیز جمع کے اعداد کو بڑھا کر علی الترتیب 70 لاکھ اور 80 کروڑ دام بتاتا ہے۔ ان دونوں کے ماخذ کے اعداد کے فرق کی توجیہ غالباً محض اس مفروضہ کو تسلیم کرکے کی جا سکتی ہے کہ لاہوری نے بھی بعد کے برسوں ہی کی معلومات کو استعمال کیا ہے۔ ڈاکٹر سرن نے اپنی تصنیف Provincial Govt. & C. ص 432 میں پہلے ہی نشاندہی کی ہے کہ لاہوری میں 1/11 کے تناسب کا تعلق مالگذاری کی چھوٹ کی مقدار سے نہیں بلکہ مجموعی جمع اور خالصہ کی جمع کی باہمی نسبت سے ہے۔ واقعی لاہوری، بیسویں برس کی مجموعی جمع کو 880 کروڑ بتاتا ہے (2) ص 710) جو اسی تصنیف میں اس کے خالصہ کے متعلق بتائے ہوئے اعداد کا ٹھیک گیارہ گنا ہے۔

[5] مملکت کی 880 کروڑ کی جمع کے مقابلہ میں یہ اب 120 کروڑ دام ہو گئی (لاہوری (2) 701، 712-13)

برس، خالصہ کی مالگزاری کی تشخیص قدرے کم رقم پر کی گئی[1] لیکن اگلے عہدِ حکومت کے ابتدائی برسوں میں یہ دوبارہ بڑھی عہدِ عالمگیری کے دسویں برس تک اس کی جمع مملکت کی میزان کا پانچواں حصّہ ہوگئی[2] ہمارے پاس 35 سنہ جلوس عالمگیری کے خالصہ کی مالگزاری کی واقعی وصولیوں کے اعداد بھی موجود ہیں اور یہ پچھلی عہدِ حکومت کے اکتیسویں برس کی وصولیوں سے تقریباً 33 فیصدی زیادہ ہیں[3]

عہدِ عالمگیری میں اس کے بعد کے خالصہ کے رقبہ کے متعلق کوئی معلومات نہیں ملتیں لیکن غالباً اس کے عہدِ حکومت کے اواخر میں، موجودہ جاگیروں پر زبردست دباؤ کے باعث خالصہ کی کچھ زمینیں بھی جاگیروں میں دی گئیں جس نے اسے کم کر دیا۔

فصل 2 نظامِ مال کی مشینری

نظامِ جاگیرداری میں نظم و نسق کے انتظامات کو خاص طور پر دو مسائل سے نمٹنے کے کام آئے

---

[1] ضوابط عالمگیری، Add. 6598 ورق 187 ب، Or. 1641 ورق 133 الف میں اسے 118 کروڑ دام سے تھوڑا زیادہ بتایا گیا ہے۔

[2] مرآۃ عالم، Add. 6598 ورق 445 ب۔

[3] ضوابط عالمگیری Add. 6598، ورق 187 ب Or 1641، ورق 133 الف میں 31 سنہ جلوس شاہجہانی کے خالصہ کے حاصل کے اعداد 2 4 879 500 روپیہ کے بالمقابل 333 124 80 روپیہ دکھائے گئے ہیں۔ اورنگزیب نے اپنے عہدِ حکومت کے تیرھویں سال یہ ہدایت جاری کی کہ خالصہ کی آمدنی 4 کروڑ روپیہ سالانہ سے کم نہ ہونا چاہیے (ماثر عالمگیری ص 99-100) شاہجہان اور اورنگزیب کے عہدِ حکومت کے متعلق خالصہ کے تقابلی اعداد ضوابط عالمگیری ETRE 415 ورق 177 الف۔ب Or 1641 ورق 81 الف۔ب میں ایک دوسرے مقام پر دیئے گئے ہیں لیکن ان میں صحیح سنوں کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔

	محالات کے شمار	مواضعات کے شمار	جمع (داموں میں)	حاصل (روپیوں میں)
عہدِ شاہجہانی	407	78 000	13 446 603 245	281 212 27
	478	75 000	12 576 660 947	2471 698 3
عہدِ عالمگیری	950	958	1313 561 364	26 118 079
	787	938	1245 464 650	23 541 956 ـ 6 آنہ

پیش کیا جاتا تھا۔ اوّل مسئلہ شاہی نگرانی کا تھا۔ جاگیردار کو مالگزاری کی تشخیص اور وصولی کا تو اختیار حاصل رہا کرتا مگر ان دونوں معاملوں میں وہ سرکاری ضابطوں کا پابند تھا۔ حالانکہ خالصہ کے لیے بعض خصوصی احکام و قاعدے بنائے گئے تھے، لیکن بیشتر ضابطے جو اصلاً بنیادی حیثیت رکھتے تھے عمومی انداز میں مرتب کیے گئے تھے جن کے متعلق منشاء یہ تھا کہ ان کا اطلاق خالصہ اور جاگیر دونوں ہی پر ہو۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق عہد اکبری کی ابتداء ہی سے جاگیردار، دربار کی معینہ سالانہ نقدی شرحوں کے مطابق اپنے حصہ کی مالگزاری وصول کرنے کے پابند تھے[1] عہد حکومت کے ستائیسویں برس کے ٹوڈرمل کے مرتب کیے ہوئے ضابطوں کی ابتدائی دفعہ میں جاگیرداروں اور خالصہ کے ملازمین کو منظور شدہ شرحوں کی سختی سے پابند کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ان شرحوں سے زائد وصولیوں کو معہ تاوان کے واپس لے لیے جانے کا قاعدہ تھا[2] عہد شاہجہانی کے اواخر میں دکن کے مالی نظام کی اصلاح کے سلسلہ میں وہاں غلہ بٹائی کو صرف خالصہ ہی پر نہیں بلکہ جاگیروں پر بھی نافذ کیا گیا تھا[3] راسکداس کے نام فرمان عالمگیری کے پانے والوں کے نام ہدایت ہے کہ وہ تمام "جاگیرداروں کے محالات کے محصلین مالگزاری (عاملان) کو فرمان میں مندرجہ ضابطوں کی پابندی پر مجبور کریں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی ایسا نظم ضرور رہا ہوگا جو جاگیروں میں شاہی احکام کی بجاآوری کرا سکے[4]

دوسرا مسئلہ جاگیردار سے متعلق تھا جسے تھوڑی تھوڑی مدت پر نئی جاگیروں کے انتظامات کو سنبھالنا ہوتا تھا۔ جاگیردار یا اس کے ملازم کو یہ توقع نہ رہتی تھی کہ وہ ہر نئے علاقہ کی مالگزاری ادا کرنے کی صلاحیت اور وہاں کے مقامی رواجوں کی تفصیلات سے واقف ہوگا اور نہ ہی اس کے یا اس کے کارپرداز کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ ایک قلیل مدت کے دوران کسی نئی جاگیر میں ازسرنو کوئی

---

[1] آئین اکبری (1) صفحہ 348، اکبرنامہ (3) صفحہ 282 موازنہ ہو بنیز 'Agranian System' 91-2

[2] اکبرنامہ (3) (Add. 27247، ورق 331 ب)

[3] ادب عالمگیری، ورق 118 الف سے ایسا ظاہر ہوتا ہے۔

[4] مورلینڈ کو یہ تسلیم ہے کہ مالگزاری زمین کے شاہی ضابطے جاگیروں پر بھی اثرانداز ہوا کرتے تھے۔ مگر اس کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نفاذ بادشاہ کی شخصیت پر موقوف ہوا کرتا تھا۔ اکبر کے عہد میں "تشخیص کے متعلق اس کے احکام کی علانیہ خلاف ورزی غالباً ناقابل برداشت تھی۔" ('Agranian System' 92) لیکن اکبر کے پاس بھی بے ضابطگیوں کو معلوم کرنے اور اپنے احکام کی تعمیل کرانے کے لیے کوئی آلۂ کار رہا ہوگا۔

مقامی نظم قائم کر سکے۔ ہندا انتظام جاگیرداری کو ایک شدید انتشار سے محفوظ رکھنے کی غرض سے لازم تھا کہ مقامی کاغذات اور معمولات مال کے تسلسل کو قائم رکھا جاتے۔

ان دو مقاصد کو پورا کرنے کی غرض سے انتظامی ڈھانچہ کو تین واضح اجزا میں تقسیم کیا گیا تھا سب سے اوّل منتقل الیہ کو حکام اور کارندے تھے، منتقل الیہ خواہ خالصہ ہو یا کوئی جاگیردار۔ اس کے بعد مستقل مقامی ملازمین جو کچھ تو اپنے نسبی امتیاز سے اور کچھ شاہی اقتدار کے سہارے ان عہدوں پر فائز رہا کرتے اور جاگیر کی تبدیلیاں ان پر اثر انداز نہ ہوتیں اور آخر میں شاہی انتظامیہ کے وہ باضابطہ عہدہ داران تھے جنہیں جاگیرداروں کی امداد اور نیز ان کو قابو میں رکھنے کی غرض سے استعمال کیا جاسکتا تھا۔

خالصہ کے متعلق تفصیلی معلومات کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن یہاں اس کا محض ایک سرسری بیان مناسب ہوگا۔ شیر شاہ کے عہد میں ہر پرگنہ میں ایک شقدار مالگزاری کی وصولی اور قیام امن کے لیے مقرر کیا جاتا تھا[1] اس کا ایک اور معاون جو منصف یا امین[2] کہا جاتا ہوتا تھا جس کے فرائض منصبی

---

[1] مشتاقی، ورق 49 الف، عباس خاں، اوراق 106 الف۔ 113 ب۔ شیر شاہ کی مدد معاش کے فرمان، مطبوعہ، اورنٹیل میگزین ج (۹) نمبر شمار 3، مئی 1933ء ص 121 ۔ 2، 125 ۔ 8 میں موجودہ شقدار اور مستقبل کے عامل" کو مخاطب کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ شقدار اور عامل یا محصل مالگزاری متراد ف اصطلاحیں تھیں۔ موازنہ بہ تیز الہ آباد 319 اور عباس خاں اوراق 112 ب۔113 الف۔ مذکورہ دو فرمان میں (ایضاً ص 127) سے ایک عطیہ داران کے نام ہدایت ہے کہ بدامنی کی صورت میں وہ شقدار کی امداد کریں جس سے اس کی فوجی یا پولیس سے متعلق حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بایزید اکبر کے ایک بڑے امیر منعم خاں کی طرف سے (1561ء کے بعد سے) حصار کی شقداری کے عہدہ پر مامور رہا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے اس حیثیت میں مالگزاری میں بیحد اضافہ کیا اور ایک بار اس نے باغیوں سے حصار کی حفاظت بھی کی (بایزید 278 - 9، 299)

[2] مشتاقی، ورق 49 الف میں "مصنف" جبکہ عباس خاں، ورق 106 میں امین ہے۔ بدایونی (ا) ص 385 کی صراحت کے مطابق یہ مرادف اصطلاحیں تھیں۔ موازنہ بہ خلاصۃ السیاق، ورق 179 الف Qr. 2076 ورق 33 الف، لطائف قدوسی، جس کے اقتباسات کا سید نورالحسن نے ترجمہ کیا ہے مطبوعہ 'Medieval Indian Quarterly' ج (۱) نمبر ا ص 56 سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیر شاہ کے عہد میں مصنف کا عہدہ قدرے اہم تھا۔

کی صراحت ہمارے مآخذ میں نہیں ملتی لیکن بعد میں اس عہدہ کا نام کو جو اہمیت حاصل ہوئی اس کے پیش نظر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ تشخیص مالگذاری کا ذمہ دار تھا۔

مذکورہ بالا انتظامات غالباً اوائل عہد اکبری کے دوران قائم رہے اور اس مدت میں شقدار کے واضح حوالے ملتے ہیں[1] مگر پرگنہ کی سطح پر منصف یا امین کا اب کہیں ذکر نہیں آتا اور ممکن ہے کہ اس وقت تک ان عہدوں کی اہمیت کم ہو گئی ہو۔ عہد حکومت کے انیسویں برس، مملکت کے تین صوبوں کو چھوڑ کر بقیہ تمام کو خالصہ میں شامل کر لینے کے بعد خالصہ کے انتظامی نظم میں ایک انقلابی تبدیلی رونما ہوئی۔ پوری زمین کو ضلعوں میں تقسیم کیا گیا جن میں سے ہر ایک سے ایک کروڑ ٹنکوں کی آمدنی متوقع تھی۔ ہر ضلع میں ایک عامل یا عملگذار مقرر ہوا جسے کروڑی کا نام دیا گیا[2] مالگذاری کے ان محصلین کو بظاہر اختیارات کی انتہائی آزادی دی گئی کیونکہ ان کے شدید مظالم کی داستانیں سننے میں آتی ہیں[3] جب تجربہ کروڑی کو ختم کر کے دوبارہ جاگیروں کے عطیات شروع کیے گئے تب بھی کروڑی کا نام خالصہ کے ایک یا متعدد پرگنوں کے عامل یا عملگذار کے ساتھ منسلک رہا[4] آئین اکبری میں اس کے فرائض منصبی میں مالگذاری کی تشخیص اور وصولی دونوں ہی کام بتائے گئے ہیں[5] غالباً شقدار کی اصطلاح، عامل کے ایک مرادف کے طور پر استعمال ہوتی رہی[6] لیکن معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] مثلاً بایزید، 278، 303 میں۔

[2] اکبرنامہ (3) 117، عارف قندھاری 177 - 8، طبقات اکبری (2) ص 300 - 301، بدایونی (2) ص 189،

[3] بدایونی (2) ص 189

[4] ایسا واضح طور پر کہیں درج نہیں ہے۔ لیکن بعد کے کاغذات میں کروڑی کے متعدد حوالوں سے اس کا پتہ چلتا ہے۔

[5] آئین اکبری (1) ص 285 - 8،

[6] آئین اکبری میں شقدار کا بظاہر صرف دو مقامات پر ذکر معلوم ہوتا ہے۔ جلد (1) ص 300-301 پر غالباً پرانے شقدار کا حوالہ اس وقت آیا ہے جب کروڑی کا عہدہ قائم نہ ہوا تھا اور ص 289 پر یہ بداہتہً عامل کے متبادل نام کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ خزانچی کو شقدار اور کارکن کے مشورہ سے خزانہ قائم کرنے کی ہدایت کے ساتھ اسے عامل اور کارکن کے علم کے بغیر خزانہ کا دروازہ کھولنے سے منع کیا گیا ہے۔ اسی طور پر اسے بغیر حکم کے روپیہ کی تقسیم کی اجازت بھی نہ تھی اور ہنگامی صورت میں اسے کسی ادائیگی کے لیے شقدار اور کارکن کے تحریری احکام حاصل کرنا چاہئے۔ لیکن اس کے حسابات پر دستخط کرنے کا اختیار عامل کو حاصل تھا جسے کارکن کے کاغذات سے موازنہ کرنا چاہیے۔

بعد میں یہ کرڑوڑی کے ایک ماتحت محصل کے مفہوم میں استعمال ہونے لگی[1] امین کی حیثیت اب اس پیمائش (سروے) کرنے والی جماعت کے سرگروہ کی ہوگئی جسے کرڑوڑی مالگزاری کی تشخیص کی غرض سے پیمائش کے کام پر مامور کرتا تھا[2] وصولیِ مالگزاری میں سختی برتنے کی غرض سے کرڑوڑی مسلح ملازمین بھی رکھتا تھا جنہیں 'سربندی' کہا کرتے[3]

---

[1] خلاصۃ السیاق اوراق 91 ب۔ 94 الف، Or. 2026 ورق 59 الف۔ 64 الف میں منقول نمونۂ محاسبات برآمد میں شقدار اور کارکن کو کرڑوڑی کے تحتی معاونین (متعلقات) کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ Add. 6603 ورق 67 الف میں شقدار کو ایک ایسا کارپرداز بتایا گیا ہے جسے مالگزاری کی جبری وصولی کے لیے عامل مامور کرے۔

[2] موازنہ بہ اکبرنامہ 3 ص 383، آئینِ اکبری (1) ص 286 میں جہاں یہ بات بیان کی گئی ہے وہاں، لفظ امین کو اس کے قبل لکھے ہوئے لفظ 'آئین' کے ساتھ بظاہر گڈمڈ کرکے حذف کردیا گیا ہے۔ لیکن اس کا حوالہ ایضاً 304-305 پر اسی سیاق میں آیا ہے۔ اس اہلکار کو بھی جسے صدر مقام سے علاقہ اراکی آفاتِ سماوی کے نقصانات کے متعلق رپورٹ کو جانچنے کے لیے بھیجا جاتا، 'امین' ہی کہا کرتے تھے (آئینِ اکبری (1) ص 286-7 خلاصۃ السیاق، ورق 79 الف۔ Or. 2026، ورق 33 الف)

[3] اکبرنامہ (3) ص 458 سرگذشت اسد بیگ، Or. 1996، ورق 4 الف۔ ہدایت القواعد، ورق 11 الف، خافی خان، Add. 6573، ورق 83 الف، Add. 26226، ورق 60 الف؛ خلاصتالیاق اوراق 79 ب۔ 80 الف Or. 2026 ورق 34 الف۔ ب۔ میں نسق کے تحت مقررہ رقبہ میں کسان کو تخم ریزی پر مجبور کرنے اور مالگذاری کی وصولی پوری کرنے کے قابل کھلیان سے غلہ ہٹانے سے روکنے کی غرض سے کرڑوڑی کو "سوار و پیدل" تعنیات کرنے کی ہدایت ہے۔

صہ بندی، سے اصطلاحاً وہ مسلح ملازمین تھے جو وقت پر بہ اجرت رکھ لیے جاتے اور یہ مستقل سپاہیوں سے علیحدہ کرتے۔ ملاحظہ ہو، مثلاً اکبرنامہ مترجمہ Beveridge (2) ص 470 (مترجم اس لفظ کو بھی نہ پڑھ سکا۔ اور اسے انگریزی میں "b:d-hindi" سمجھا ہے) فرہنگ ولیسن میں اس اصلاح کے تحت (Add. 6603 ورق 66 الف) بتایا گیا ہے کہ سربندی، صاحبِ اختیار اشخاص کے ملازمین کو کہتے ہیں اور فوجداروں اور سرکاری عمال کا طریقہ صرف فصل کے موقع پر سواروں اور پیادوں کو اجرت پر رکھنے کا ہے۔ برسات کی آمد پر وہ انہیں ہٹا دیتے ہیں اور دسہرہ کے دن سے انہیں دوبارہ نوکر رکھ لیتے ہیں۔ لہٰذا دہلی میں یہ کہاوت (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

اس کے بعد دوسری اہم تبدیلی شاہجہاں کے تحت عمل میں آئی۔ اس کے دیوان اسلام خاں نے ہر محال میں ایک امین مقرر کیا اور کرڑوڑی سے مالگذاری کی تشخیص کا کام لے کر اس کے اس نئے شریک کار کے سپرد کیا۔[1] چنانچہ اب 'کرڑوڑی' کا کام امین کی تشخیص کی ہوئی مالگذاری کی صرف وصولی تک محدود رہا۔[2] اسلام خاں کے جانشین سعد اللہ خاں کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے ایک ہی شخص کو کرڑوڑی اور فوجدار مقرر کرنے کے طریقہ کو موقوف کر کے 'کرڑوڑی' کے اختیارات کو اور کم کیا۔ اب متعدد محالوں پر مشتمل علاقہ کی ایک نئی اکائی چکلا قائم کی گئی[3] اور ایک امین۔ فوجدار کو مقرر کر کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مشہور ہے کہ "کوئل بولے 'سہ بندی' ٹوٹے" واضح ہے کہ ہندوستان میں کوئل برسات کی آمد کا اعلان کرتا ہے اس لفظ کی ساخت پر پردہ پڑا ہوا ہے بلیسن کا خیال ہے کہ یہ لفظ 'سپاہ بندی' یعنی ہندوستانی سے ماخوذ ہے درست نہیں معلوم ہوتا۔

[1] خلاصۃ السیاق ورق 72 ب Or 2026، اوراق 33 الف۔ 34 الف۔

[2] ان دونوں عہدوں کی تقسیم کے بعد سے امین اور عامل (کرڑوڑی) کے فرائض منصبی کا بیان مختلف تحریروں میں ملتا ہے۔ لاحظہ ہو۔ ملاحظہ ہو دستور العمل عالمگیری ورق 33 الف، راجکراس کے نام فرمان کا دیباچہ، دستور العمل نویسندگی اوراق 153 ب الف، نگارنامۂ منشی اوراق 154 الف۔ 173 الف 187 اب 168 ب، 169 الف، Bodl. اوراق 140 ب 141 ب 149 ب۔ 150 ب مطبوعہ 135 ـ 7، ذہنگ کاروائی، ورق 29 الف، ب، Edinburgh نمبر 83 اوراق 39 الف۔ 40 الف، درالعلوم اوراق 136 ب۔ 137 الف، سیاق نامہ 26 ـ 28، 48 ـ 50، خلاصۃ السیاق اوراق 73 ب 74 الف Or. 2026، اوراق 21 ب۔ 22 ب، ہدایت القواعد اوراق 10 الف۔ 11 الف۔ امین کے تشخیص کے کام سے اور عامل کے وصولی کے کام سے تعلق پر مسلسل زور دیا گیا ہے۔

مغلیہ منتظلین ان عہدوں کی تقسیم کو ایک مذہبی اصول کی اہمیت دیتے تھے۔ جب سعد اللہ نامی شخص جو بیک وقت میرٹھ کا فوجدار، امین اور کرڑوڑی تھا، ایک کثیر رقم کے غبن کے سلسلہ میں مشتبہ ہوا تو اجمیر کے صوبیدار نے یہ خیال ظاہر کیا کہ جب ایک ہی شخص بیک وقت ان تینوں عہدوں پر مقرر ہوا تو ایسا ہی ہونا چاہیے (وقائع اجمیر، 311)

[3] خلاصۃ السیاق کے اس قول کی (حوالہ کے لیے ملاحظہ ہو ذیل کا فٹ نوٹ) کہ سعد اللہ خاں نے چکلے قائم کیے تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ اس علاقائی تقسیم کا ذکر سب سے پہلے عہد شاہجہانی کے تذکروں (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

"کروڑی" کو حقیقتاً اس عہدہ دار کا ماتحت کر دیا گیا[1]

مسلم پرگنوں یا وسیع علاقوں کو مالگذاری کے ٹھیکہ (اجارہ) پر دیئے جانے کا رواج بہت شاذ تھا اور کم از کم خالصہ میں تو ایسا محض ایک استثنائی صورت میں ہو سکتا تھا[2] پھر بھی وہ غیر ملکی مشاہدین کے اس دعوے کا پورا خالصہ اجارہ داروں کے تصرف میں تھا[3] محرک وہ عمومی تاثر ہو سکتا ہے جو نظام تعہد کی موجودگی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس نظام کے تحت مستقبل کے عہدہ دارو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اور دیگر تحریروں میں ملتا ہے: "چکلے" اور "سرکار" اکثر بعینہ ایک ہی ہوا کرتے مثلاً حصار اور سرہند کے چکلے (بالکرشن برہمن ورق 160 الف۔ ب و دیگر مقامات پر مندرج جغرافیائی اطلاعات کے بموجب۔ لیکن "چکلہ" عموماً "سرکار" سے چھوٹا ہوا کرتا تھا۔ (Add. 6603، ورق 65 ب) بنگال میں چونکہ منفرد سرکاریں بہت چھوٹی تھیں، لہذا ایک چکلہ میں متعدد سرکار ہوتے تھے (موازنہ بہ "دستور العمل خالصہ شریفہ" ورق 9 الف) مثلاً سرکار ستگم چکلہ ہگلی کا ایک حصہ تھا (Add. 24039 ورق 36 الف)

[1] خلاصۃ السیاق ورق 79 ب، QF. 2026 ورق 34 الف۔ ب۔ موازنہ بہ لاہوری (2) ص 247 پندرھویں برس کے تحت "چکلہ سرہند کے فوجدار اور امین" "رائے ٹوڈرمل کے حوالے کیے جو اس ضلع کے خالصہ کی زمینوں کا سپرد وار تھا" بقول "دستور عالمگیری" ورق 33 الف امین بہ لحاظ اختیارات کے عامل سے برتر ہوا کرتا تھا۔

[2] یہ قول سترھویں صدی کی تحریروں میں اس نوعیت کے اجارہ کے حوالوں کی انتہائی کمی پر مبنی ہے۔ وقائع اجمیر 209، 359 میں دو ایسے جاگیرداروں کی مثالیں ملتی ہیں جنہوں نے جاگیروں سے محروم ہونے کے بعد خالصہ کے انہیں علاقوں کو ٹھیکہ پر حاصل کیا یا حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اورنگزیب کے ایک حکم میں کہا گیا ہے کہ بنگال میں پرگنات خالصہ کو مالگذاری کے اجارہ داروں کو ٹھیکہ پر دے دیئے تھے۔ اس حکم میں اس طریقہ کو بالکل ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ ٹھیکہ داری کے لیے اجارہ کی معمول کی اصطلاح تھی لیکن اس حکم سے پتہ چلتا ہے کہ اسے بنگال میں "مالضامنی" کہتے تھے (احکام عالمگیری، ورق 207 الف۔ ب)

غالباً فرخ سیر کے عہد اور سید برادران کی سربراہی میں خالصہ کی زمینوں کو بار اوّل بڑے پیمانہ پر اجارہ پر دیا گیا (خافی خاں (3) ص 773) نظام الملک نے جو تجاویز محمد شاہ کو پیش کی تھیں ان میں اصلاحات کی پہلی ہی مد "خالصہ کے محالوں کی اجارہ داری" کو موقوف کرنے کے بابت تھی، "جس سے ملک تباہ و برباد ہو رہا تھا" (ایضاً 948) موازنہ بہ شاہ ولی اللہ، سیاسی مکتوبات، 23

[3] J. Xavier ترجمہ Hosten, JASB, N.S. 23 (1927) ص 121، Bernier 224۔

اپنی تشخیص یا وصولی رقم کا عہد لینا ہوتا تھا۔ چنانچہ ابتداءً کروڑیوں سے ان کے علاقہ میں ایک کروڑ ٹنکہ کی وصولی کی توقع کی جاتی تھی اور عہد اکبری کے تیسویں برس، بقول سرکاری بیان کے مروجہ طریقہ یہ تھا کہ عاملوں کو اپنے معاہدہ کی رقم (نسخہ کروڑی بندی) یا بہترین سال (دسالہ کامل) کی مالگذاری کے برابر وصول نہ کرنے پر جوابدہ ہونا پڑتا تھا۔ اب اس طریقہ کو نامناسب قرار دیا گیا اور طے کیا گیا کہ وہ صرف اس صورت میں کہ وصولی پچھلے برس سے کم ہو جوابدہ ہوں گی[1] امین اور کروڑی کے عہدوں کی علیٰحدگی کے بعد سے کروڑی صرف امین کی تشخیص کی ہوئی مالگذاری کی وصولی کا قرار پایا گیا[2] جبکہ امین اپنے کو معمولاً تشخیص میں اضافہ کرنے کا پابند کرتا تھا جس کے لیے قیاس ہے کہ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ زیادہ سخت اور بہتر طریقے اختیار کرے گا۔[3] کہا جاتا ہے کہ محض اپنے عہد کو پورا کرنے کی مجبوری کے تحت متعدد امینوں نے ابتداءً بہت بڑھا کر تشخیص کی اور پھر مختلف بہانوں سے اس میں بیحد کمی کر دی۔[4] علاوہ اس کے ایک تحریر سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خالصہ کے ضابطوں کی روسے نذر تعہد اور فی الواقعی وصول کی ہوئی مالگذاری کے فرق کو عامل سے وصول نہ کیا جاتا، گو

---

[1] اکبر نامہ (3)، ص 457 (تجاویز میر فتح اللہ شیرازی) تین سال قبل ٹوڈر مل نے احتیاطاً یہ اصول قائم کیا تھا کہ اگر کوئی عامل اپنے علاقہ کی جمع کی میزان میں اضافہ کر دے تو وہ اپنی سپردگی کے بعض منفرد حوالوں کی جمع میں کمی کے لیے جوابدہ نہ ہوگا (ایضاً۔ 382)

[2] سیاق نامہ 80 میں ایک کروڑی کے تعہد کی عبارت ملاحظہ ہو۔ اس عہدہ دار کے فرائض و ذمہ داریوں کے مآخذ مندرجہ نٹ نوٹ 17 مذکورہ بالا بھی ملاحظہ ہوں۔ ان میں سے بیشتر میں اس موضوع پر ایک واضح بیان ملتا ہے۔

[3] سیاق نامہ 28 میں امین کے تعہد کی عبارت میں کسی رقم کا ذکر نہیں ملتا بلکہ امین کا صرف یہ عہد درج ہے کہ وہ "صحیح حالات (موجودات) اور (معینہ) فصل کی شرحوں (ریع جنس)" کے مطابق تشخیص کرے گا۔

[4] راسکداس کے نام عالمگیر کے فرمان کے دیباچہ میں کہا گیا ہے کہ "عمال (متصدیان) معمولاً آفات سماوی کو جمع میں بھاری کمی کرنے کا بہانہ بناتے تھے۔ نگارنامہ منشی، اوراق 86 ب 87 الف، Bodl. ورق 64 الف مطبوعہ 69، میں عنایت خاں دیوان کے نام ایک خط ملتا ہے جس میں دو ایسے امینوں کی برطرفی کے خلاف شکایت ملتی ہے جنہوں نے اپنے عہد کو پورا کر دیا تھا۔ اس میں یہ بھی ہدایت ہے کہ "ایسے لوگوں کے قول کو قابلِ اعتماد نہ تصور کرنا چاہیے جو سال کے شروع میں اضافہ کا عہد کرنے کے بعد، سال کے ختم ہوتے ہوتے حسابات کو بالکل الٹ پلٹ دیتے ہیں۔" یہ بات واضح نہیں ہے کہ یہ خالصہ سے متعلق ہے یا شاہزادہ معظم کی جاگیر سے۔

عہد شکنی کی علت میں وہ اپنے عہدہ سے برطرف ہوسکتا تھا[1]

آئین اکبری میں 'مالگزار' کی تنخواہ کے متعلق کوئی اطلاع درج نہیں ہے، لیکن اس کے بعد کے ایک ماخذ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو تبدیلی شاہجہاں کے عہد میں ہوئی اس کے قبل کرڑوڑی کو کل آمد کا 8 فیصدی خود اس کے اور اس کے عملہ کی تنخواہ کے لیے ملتا تھا[2] امین کا علیحدہ عہدہ قائم ہوجانے پر اسے کم کرکے 5 فیصدی کردیا گیا جس میں ابھی مزید منہائیوں کا امکان باقی تھا۔[3] لیکن ان شرحوں میں علاقوں کے اعتبار سے بھی بظاہر فرق پایا جاتا تھا[4] تنخواہ سے پانچواں حصہ[5] یا جیسا کہ کسی اور جگہ بتایا

---

[1] نگارنامۂ منشی، Bodl. ورق 53 الف، مطبوعہ 58، اس خط میں شاہزادہ معظم کی سرکار کے عمال کے ایک امین کے خلاف تعہد اور وصولی کے فرق کے متعلق دعوے کے خلاف احتجاج کیا گیا ہے۔ اس کی یہ کہتے ہوئے مذمت کی گئی ہے کہ یہ "حسابات کی جانچ کا کوئی طریقہ نہیں" اور یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ "کسی عامل سے تعہد کے مساوی وصولی کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے۔" آخر میں یہ ہدایت ملتی ہے کہ خالصہ اور نیز شاہزادہ کی سرکار کے ضابطوں کی پابندی کی جائے اور ہم یہ قیاس کرتے ہیں کہ خالصہ کے ضابطے خط کے کاتب کے نقطۂ نگاہ کی تائید کرتے تھے۔

[2] خلاصۃ السیاق، ورق 79 الف میں 20 فیصدی لکھا ہوا ہے جو بظاہر بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ 2026 .Or ورق 33 الف میں 20 کے بجائے 8 درج ہے اور چونکہ فارسی میں ان دونوں اعداد میں آسانی سے ادل بدل ہوسکتا ہے، لہٰذا 8 کو تسلیم کیا گیا ہے۔ کرڑوڑی کے گزار کو اصطلاحاً "حقوق التحصیل" کہتے تھے۔

[3] خلاصۃ السیاق، اوراق 79 ب، 84 ب 86 ب، .Or 2026، اوراق 34 الف۔ب، 42 الف 45 ب۔ 46 ب، خاص منہائی کی مد سائر کے نام سے موسوم تھی جو عموی تنخواہ کا 17 فیصدی ہوتی تھی۔ ضوابط نامہ کے متن میں یہ بات اس قدر واضح نہیں ہے لیکن نمونۂ حسابات میں اسے صاف طور پر ایسا ہی بتایا گیا ہے۔ موازنہ بہ نیز نگارنامۂ منشی، Bodl. ورق 94 ب، مطبوعہ 94۔ خلاصۃ السیاق میں مندرج حسابات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کرڑوڑی کو جو چھوٹ ملتی تھی اس میں مالگزاری کا ایک فیصد اس کی ذاتی تنخواہ (ذات) کے لیے اور 4 فیصد اس کے ملازم عملے (رابیان) کے لیے تھا۔

[4] ایک مخصوص پرگنہ کی شرح کو 'رقم سائر' وضع کرنے کے بعد آمد کا 7 فیصدی بتایا گیا ہے (نگارنامۂ منشی ورق 122 الف .Bodl ورق 94 الف۔ب، مطبوعہ 94) اس شرح کو فرہنگ کاروانی Edinburgh نمبر 83، ورق 55 الف۔ب میں 3 روپیہ بطور $5\frac{1}{2}$ فیصدی دکھایا گیا ہے۔

[5] خلاصۃ السیاق، ورق 86 ب .Or 2026، ورق 46 الف،

گیا ہے مالگذاری کا ایک فیصدی[1] حسابات کے جانچ ہونے تک روک لیا جاتا تھا۔ عہد اکبری میں عامل کے گذارہ کا چوتھائی حصہ مالگذاری کے بقایوں کے وصول ہونے تک روکنے کا طریقہ تھا[2] لیکن اسکے بعد کے دور میں اس کے گذارہ کی پوری رقم ہی کو سابقہ بقایوں کی علت میں روک لینے کا طریقہ ہوگیا تھا[3] اس بات کا ٹھیک پتہ نہیں چلتا کہ امین کی تنخواہ کا کیا طریقہ تھا۔ ایک ضوابط نامہ میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اسے بھی وصول کی ہوئی مالگذاری کا ایک تھوڑا سا حصہ ملا کرتا تھا[4] لیکن اس کے قبل کی ایک تحریر میں ہے کہ خالصہ کے ضابطوں کی رو سے امین کو ایک معینہ ماہانہ تنخواہ ملا کرتی تھی[5]

بہت سی صورتوں میں، عاملوں اور ان کے کارندوں کی واقعی وصولیوں کے حسابات کی جانچ، پٹواری کے کاغذات کی مدد سے کی جاتی تھی[6] اس طریقہ کی میر فتح اللہ شیرازی نے عہد اکبری میں ناجائز وصولیوں کے انسداد کی غرض سے سفارش کی تھی[7] برخلاف اس کے شاہجہاں کے عمال کو بظاہر صرف یہ فکر رہا کرتی کہ جملہ وصولیاں (خواہ جائز ہوں یا ناجائز) خزانۂ شاہی میں پہونچ جائیں۔

---

[1] خلاصۃ الانشاء، ورق 112 الف موازنہ بہ نگارنامۂ منشی ورق 122 الف۔ب Bodl. ورق 94 ب مطبوعہ 94۔

[2] اکبرنامہ (3) صـ 458 فتح اللہ خاں شیرازی کی تجویز کے مطابق عملگذار کے ملازمین کی تنخواہوں کو سابقہ عاملوں کے بقایہ میں محسوب کرنا چاہیے کیونکہ ان کی وصولی مشکل تھی (ایضًا)

[3] خلاصۃ الانشاء ورق 112 الف میں صرف "بقائے" لکھا ہوا ہے لیکن نگارنامۂ منشی میں مندرج ایک سند میں مزید یہ کہا گیا ہے کہ تنخواہ کو پہلے تو پچھلے برسوں کے بقایوں سے (بقایائے سنوات) اور اس کے بعد ہی رواں بقایوں سے وضع کرنا چاہیے۔ اس طریقہ کو واضح طور پر خالصہ کے ضابطوں کے مطابق بتایا گیا ہے۔

[4] فرہنگ کاروانی، Edinburgh نمبر 83، ورق 55 الف۔ شرح کو ایک روپیہ $1\frac{1}{2}$ آنہ فیصدی بتایا گیا ہے

[5] Selected Documents, & c. صـ 179 تنخواہ 120 روپیہ) ماہانہ تھی جو "خالصہ شریفہ کے ضابطوں کے مطابق" تھا۔ خاصہ اور خالصہ کی اصطلاحیں اکثر ایک دوسرے کی جگہ استعمال کی جاتی تھیں۔

[6] یہ ہرگز نہ سوچنا چاہیئے کہ کاغذات ہمیشہ صحیح صورتحال کو واضح کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شیر شاہ کی تاکید تھی کہ جب کوئی شخص عامل کے حسابات کی جانچ پر مامور ہو تو چاہیے کہ مقدم کو اس کی اطلاع ہونے کے قبل وہ گاؤں کے کاغذات پر قبضہ کرے (عباس خاں ورق 18 الف۔ب) موازنہ بہ نیز 'Elliot, 'Chroicels of Osnas 108 – 9 نوٹ۔

[7] اکبرنامہ (3) صـ 457 – 8

کہا جاتا ہے کہ ہر صورت میں حساب کی جانچ چھے' بر آمد' کہتے تھے انتظامیہ کے معمولات میں تھی[1]
عامل کے حسابات کی اس کی برطرفی کے بعد ہمیشہ نہایت سختی کے ساتھ جانچ کرائی جاتی تھی'
لیکن چونکہ اس کام میں دیر لگتی تھی' لہٰذا اس اثناء میں ان بد نصیبوں کو اپنے ذمہ بقایوں کے تصفیہ
کے انتظار میں قید بھگتنی پڑتی تھی[2] اورنگزیب کے حکم کے رو سے تصرف بیجا کی صورت میں عاملوں
کی ذاتی تنخواہ پوری اور ان کے عملہ کی تین چوتھائی قابل ضبطی تھی[3]

کرڑوڑی اور امین کے علاوہ' ہر پرگنہ میں دو اور سرکاری ملازمین' فوتہ دار یا خزانہ دار
یعنی خزانچی[4] اور کارکن یا بتپکچی یعنی محاسب[5] مقرر کیے جاتے جو ان سے آزاد ہوتے تھے شیرشاہ
کے تحت دو کارکن ایک ہندی میں دو فارسی میں کاغذات طیار کرنے کے لیے رکھے جاتے تھے[6] ٹوڈرمل

---

[1] خلاصۃ السیاق' اوراق 79 الف' 91 ب' Or. 2026' اوراق 34 الف' 59 الف۔ ب موازنہ بینیز راسکداس کے نام فرمان کا دفعہ 11' سیاق نامہ 75 ـ 76' وقائع اجمیر 27 ـ 28' 32' 38' 44 ـ 45

[2] ٹوڈرمل کے ہاتھوں کرڑوڑیوں کی جو درگت بنی اس کے لیے ملاحظہ ہو' بدایونی (2) ص 189-90 (3) ص 279-80 فتح اللہ خاں شیرازی نے عہد حکومت کے تیسویں برس مطلع کیا کہ متعدد عمال مال گذاری کی انتہائی یا اپنے قرار کی رقم وصول کرنے کی علت میں قید خانہ میں بند تھے (اکبر نامہ (3) ص 457) سعد اللہ خاں کے انتقال کے بعد شاہجہاں نے بعض کرڑوڑیوں کو جن کی اسیری کی مدت بیس برس سے زائد ہو چکی تھی رہا کیے جانے کا حکم صادر کیا (چارچمن برہمن Add. 863 ،16' ورق 32 الف) اورنگزیب نے اپنے احکام میں تاکید کی تھی کہ جو عمال یا دیگر اشخاص زر خالصہ پر تصرف بیجا کے شبہ میں گرفتار ہیں ان کے مقدمات بہ عجلت فیصل کیے جائیں (در العلوم' اوراق 58 الف 59 ب' مرآۃ (1) ص 264' 2:82 ـ 3)

[3] مرآۃ (1) ص 264' در العلوم' ورق 83 الف۔ب۔

[4] اس کے فرائض منصبی کے لیے ملاحظہ ہو' آئین اکبری (1) ص 289' ہرکرن' 54' 56' نگار نامۂ منشی ورق 177 الف۔ب .Bodl اوراق 141 ب۔ 142 الف' مطبوعہ 137' در العلوم ورق 137 ب۔

[5] آئین اکبری (1) ص 289' ہرکرن 56' 58' در العلوم' ورق 137 الف۔ب۔

[6] مشتاق' Or. 1929' ورق 49 الف' عباس خاں' ورق 106 الف۔ب۔ شیرشاہ کے فرامین مدد معاش کی امتیازی خصوصیت جیسا کہ اورنٹیل میگزین ج۔ 9 نمبر شمار 3 مئی 1933ء میں مطبوعہ دو فرمانوں سے ظاہر ہوتا ہے یہ تھی کہ وہ فارسی کے ساتھ ساتھ ناگری رسم الخط میں نقل کیے گئے ہیں جس کا واضح مقصد غیر عربی داں طبقہ کے لیے سہولیت فراہم کرنا تھا۔

کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے فارسی کو حسابات کی واحد زبان قرار دیا[1] اور ۲۴ سنہ جلوس اکبری میں اس کے عامل کے ساتھ دو بتکچیوں کی تعداد کو گھٹا کر ایک کر دینے کو عمل کو اسی ضابطہ سے منسوب کر سکتے ہیں[2]

پائی باقی کی حیثیت جس میں وہ زمینیں شامل ہوتیں جو دوبارہ جاگیرداروں کو دیتے جانے کے لیے مخصوص رہا کرتیں لازمی طور پر خالصہ کے ایک جزو کی تھی، حالانکہ انتظامی سہولتیں کے پیش نظر یہ ایک علیحدہ مد کے طور پر رکھی جاتی تھی۔ اس کے لیے بھی، امین، کروڑی اور فوتہ دار کا متن خاص عملہ مقرر کیا جاتا اور اس کے جملہ اندراجات اور حسابات کی طیاری میں خالصہ کے ضابطہ کی پیروی کی جاتی تھی[3] اس کے علاوہ، 'پائی باقی' کے جملہ انتظامات مرکزی دیوان خالصہ کی نگرانی میں انجام پایا کرتے تھے[4]

بہ اعتبار وسعت، خالصہ شریفہ کے بعد شاہی نسل کے شاہزادوں کی جاگیریں ہوا کرتیں۔ ان شاہزادوں کے پاس اعلیٰ ترین مناصب تھے جو اکبر امراء کی انتہاء سے بھی کئی گنا بڑے ہوا کرتے۔ لہٰذا ان کی جاگیروں کی وسعت بھی قدرتاً بہت زیادہ تھی[5] عموماً شاہزادوں کی سرکار کا انتظامی ڈھانچہ

---

[1] سوجان رائے 409، خلاصۃ الانشا ورق 115 الف، خلاصۃ السیاق ورق 65 الف۔ Or. 2026 ورق ب

[2] اکبرنامہ (3) ص 381 (Add. 27247 ورق 331 ب) یہ اہم بات ہے کہ خلاصۃ السیاق حوالہ سابقہ میں فارسی میں کاغذات کی مکمل طیاری کی ابتدا ۲۴ سنہ جلوس اکبری سے اور خلاصۃ الانشا حوالہ سابقہ میں اٹھائیسویں برس سے بتائی گئی ہے۔

[3] خلاصۃ السیاق، ورق 69 ب، Or. 2026 ورق 51 الف، موازنہ بہ وقائع اجمیر 27 ۔ 28، 32، 401 جس میں ص 27، 28، 32 پر جو عہدہ داران پائی باقی کے کام کے ذمہ دار کی حیثیت سے درج ہیں وہی بغیر کسی فرق کے ساتھ ص 27 و 38 پر خالصہ کے عہدہ داران کے طور پر دکھائے گئے ہیں۔

[4] صوبۂ اجمیر کے بعض پائی باقی کے محالوں کے عہدہ داران مال کے معاملات کی جانچ صوبے کے جملہ عہدہ داران خالصہ کے حسابات کے جانچ کرنے والے (برآمد نویس) نے کی۔ پائی باقی کے عہدہ داروں کے طریقوں کو اطمینان بخش نہ پا کر اس نے مرکزی دیوان خالصہ کو مطلع کیا جس سے توقع تھی کہ وہ اس کی خبر بادشاہ تک پہنچا دے گا (وقائع اجمیر، 11 27 ۔ 28)

[5] ۲۰ سنہ جلوس شاہجہانی میں داراشکوہ کے پاس 20,000 ذات و 20,000 سوار (باقی صفحہ آئندہ پر)

خالصہ کے قریب قریب نمونہ پر مرتب کیا جاتا تھا[1] ان کے عامل کو عموماً کروڑی کہتے تھے[2] اس کے ساتھ بھی امین، فوتہ دار اور کارکن کا وہی تین عملہ ہوا کرتا[3] ایک شاہزادے کے انتظامی دفتر کی بعض تحریروں میں اس امر کے واضح بیانات ملتے ہیں کہ اس کی سرکار میں بعض مخصوص معاملوں کے سلسلہ میں خالصہ کے ضابطوں کا اطلاق ضروری تھا[4] باوجود اس کے کہیں کہیں خالصہ کے ضابطوں سے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

اور 10,000 دو اسپہ، تین اسپہ کا منصب تھا اور اس لحاظ سے اس کی تنخواہ 40 کروڑ دام تھی (لاہوری (2) ص 715) یعنی اس وقت کے خالصہ کی جمع کے ایک تہائی کے برابر۔ عہد حکومت کے تیسویں برس تک اس کا منصب بڑھ کر 40,000 ذات، 26,000 سوار اور 20,000 دو اسپہ سہ اسپہ ہو گیا اس وقت اس کے بھائی شجاع اور اورنگ زیب ہر دو کا منصب 20,000/15,000 اور 10,000 اور مراد کا منصب 15,000/12,000، 9,000 تھا (وارث (اے) ورق 523 ب (بی) ورق 200 الف) ایک امیر کا انتہائی منصب 70,000 ذات اور 7,000 سوار ہو سکتا تھا (لاہوری (2) ص 321، عالمگیر نامہ ص 618)

[1] زیر مطالعہ دور کے کاغذات میں لفظ سرکار کسی امیر یا شاہزادہ کے علاقہ انتظام کے لیے کثرت سے استعمال ہوا ہے (موازنہ ہو، مرآۃ الاصطلاح، ورق 167 ب) اسے وہ علاقائی اکائی جسے سرکار کہتے تھے نہ تصور کیا جائے۔

[2] ادب عالمگیری، ورق 169 الف، "Selected Documents & c." ص 121، نگار نامۂ منشی ورق 111 الف۔ 112 الف، Bodl. اوراق 85 ب۔ 86 ب، مطبوعہ 86 ـ 87 اور جا بجا۔ یہ بات یہاں ضمناً بتادی جائے کہ شاہزادوں کے جانب سے احکام "حسب الامر" کے فقرے اور بادشاہوں کی طرف سے "حسب الحکم" کے فقرہ سے شروع کیے جاتے تھے۔

[3] نگار نامۂ منشی اوراق 110 الف۔ 111 الف، Bodl. اوراق 53 الف۔ ب، 85 الف۔ ب، مطبوعہ 85 ـ 86، 98، امین کے لیے ایضاً ورق 114 ب، Bodl. ورق 68 ب، مطبوعہ 87، خزانچی کے لیے اور ایضاً ورق 116 ب، Bodl. ورق 90 ب، مطبوعہ 90 کارکن کے لیے۔ شاہزادوں کی جاگیروں میں بھی امین اور فوجدار کا علاحدہ عہدہ قائم کیا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو، ایضاً اوراق 101 الف۔ 102 الف Bodl اوراق 76 ب۔ 78 الف، مطبوعہ 79 ـ 80، دار العلوم اوراق 138 ب۔ 139 الف۔ شاہزادوں کی جاگیروں میں تھوتی کی وصولیوں کے لیے ملاحظہ ہو، نگار نامۂ منشی، Bodl. ورق 53 الف، مطبوعہ 58، متین الانشاء، اوراق 38 ب 39 الف

[4] نگار نامۂ منشی، اوراق 17 ب 122 ب، Bodl اوراق 53، 15 الف، 63 الف، 94 ب، مطبوعہ 58، 84، 94 ـ

باوجود اس کے کہیں کہیں خالصہ کے ضابطوں سے انحراف کی مثالیں بھی پائی جاتی ہیں۔ ہمیں مثلاً شاہ معظم کا ایک حکم ملتا ہے جس میں ہدایت ہے کہ اس کی جاگیر میں امین اور کڑوڑی کے عہدوں کو ملا کر محض ایک شخص مقرر کیا جائے۔[1]

بعض اوقات اپنے اپنے علاقوں میں شاہزادے بھی اپنے عہدہ داروں کو جاگیریں دیا کرتے تھے۔[2] یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ان ذیلی جاگیروں کے عطیات کے لیے بادشاہ کی منظوری ضروری ہو۔ شاہزادوں کی جاگیروں میں تبدیلی کے ساتھ غالباً یہ ذیلی جاگیریں بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل کرتی تھیں۔

مذکورہ ذیلی جاگیرداران اپنے اپنے علاقوں میں انتظامات کے جو طریقے اختیار کرتے ان میں مشکل ہی سے یکسانیت ہو سکتی تھی۔ چونکہ عموماً ان جاگیروں کے علاقے وقت وقت پر تبدیل ہوا کرتے اور وہ خود دوسرے مقامات پر تعینات کیا جا سکتا تھا، لہٰذا یہ معمولاً اپنے کارندوں یا گماشتوں کو اپنی طرف سے وصولیٔ مالگذاری کے انتظامات پر مامور کر دیتے تھے۔[3] جاگیرداروں کے لیے ایک یا ایک سے زائد متصل محالوں کی جاگیروں کے مقابلہ میں منتشر مقامات کی جاگیروں کا انتظام قدرتاً زیادہ دشوار اور مہنگا ثابت ہوا کرتا۔[4] حقیقتاً ایک واحد پرگنہ کا متعدد جاگیروں میں عطیہ جو متفرق عمل

---

[1] ایضاً اوراق 98 ب۔ 99 الف Bodl. ورق 74 ب مطبوعہ 77۔

[2] شاہزادہ شاہجہاں کو ایک پرگنہ کی جاگیر بطور انعام اس مقصد سے دیے جانے کے متعلق تاکہ وہ اسے "اپنے خاص ملازمین میں سے ایک" (بندگان عمدہ) یعنی راجہ بکرماجیت کو جاگیر میں دے سکے، ملاحظہ ہو تزک جہانگیری 12 38 اور جاگیروں کی منظوری اور منسوخی کے احکام کے لیے جو شاہزادہ معظم کی سرکار سے صادر ہوئی ملاحظہ ہو "نگار نگارنامۂ منشی اوراق 118 الف۔ 121 ب، Bodl. اوراق 91 الف۔ 93 الف، مطبوعہ 91۔ 93

[3] موازنہ بہ 'Early Travels' Hawkins, 91 ،Pelsaert 54

[4] موازنہ بہ فتحیۂ عبریۂ ورق 117 الف۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ شائستہ خاں کے بنگال میں تقرری کے وقت جاگیریں عموماً متعدد محالوں پر مشتمل تھیں اور زیادہ تعداد میں شقداروں اور عامل رکھنے کی وجہ سے زیر بار رہوتی تھی۔ جامع الانشاء'۔ Or. 702 اوراق 63 الف میں مندرج ایک خط میں مخلص خاں یہ امید ظاہر کرتا ہے کہ اس کی تنخواہ میں اضافہ کی وجہ سے جو جاگیر منظور کی گئی ہے وہ "کسی دوسری جگہ" پر نہ دی جائے گی ورنہ اسے متعدد مالوں کے رکھنے کی زحمت برداشت کرنا ہوگا۔

کے نام سے موسوم تھا، تباہ کن تصور کیا جاتا تھا اور جہاں تک ممکن ہوتا، حکومت پورے پرگنوں (دروبست) کو ایک ہی واحد جاگیردار کو دیئے جانے کے حق میں رہا کرتی[1] یہ قاعدہ بالعموم سرکش عناصر کے معاملوں کے متعلق تھا[2] اور نتیجۃً شورش زدہ اور سرکش علاقے چھوٹے جاگیرداروں کو نہ دیئے جاتے تھے[3]

جاگیردار کا خاص کارپرداز، عامل ہوتا جو شقدار کے نام سے پکارا جاتا تھا[4] ایسے جاگیردار بہت ہی کم ہوتے جو ملازموں کی تعداد کے معاملہ میں، خالصہ یا شاہزادوں کے ملازموں کی نقل کرسکیں۔ غالباً شقدار کو اکثر امین[5] اور یا خزانچی کے فرائض بھی سپرد کردیئے جاتے[6] ایک پروانہ کے نمونہ سے یہاں تک

---

[1] ادب عالمگیری، ورق 117 الف، رقعات عالمگیر ص 126-7، فیض جریہ ورق 117 الف۔

[2] کلمات طیبات، ورق 98 الف میں اورنگزیب کا ایک قول محفوظ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ چونکہ میرٹھ میں صرف راجپوت کسان تھے لہٰذا اسے کبھی بھی متفرقہ محل کے طور پر نہیں بلکہ ہمیشہ 'دروبست' جاگیر کے طور پر دیا گیا۔

[3] ہدایت القواعد، ورق 3 ب، میں کہا گیا ہے کہ ناظم یا صوبیدار کی ایک چوتھائی جاگیر 'زور طلب'، یعنی باغی محالات کی اور بقیہ درمیانی محالات کی ہونی چاہیے۔ دیوانوں، بخشیوں اور بڑے منصبداروں کی نصف جاگیر درمیانی اور نصف رعیتی محالات (یعنی جہاں کے باشندے بظاہر مطیع اور پابندی سے مالگزاری ادا کرنے والے ہوں) کی اور چھوٹے منصبداروں کی جاگیر کا چوتھائی درمیانی اور بقیہ رعیتی محالات کی ہونی چاہیے۔

[4] I.O. 4434 : نومبر 1658ء میں لشکر خاں کا اپنی جاگیر کے ایک پرگنہ میں شقدار کی تقرری کا ایک پروانہ ہے۔ موازنہ ہو نیز صدیقی، Royal 16 Br. M.، بی۔ 23، ورق 14 الف زیاض الوداد، ورق 137 الف۔ یہ تصانیف اور نیز وہ شہادتیں جو شقدار کی حیثیت کے متعلق پیش کی جاچکی ہیں بلاشک وشبہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ خاص طور پر شعبہ مال کا عہدہ دار تھا۔ لہٰذا ڈاکٹر سرن کا یہ دعویٰ کہ "وہ ایک انتظامی عہدہ دار تھا۔ جس کا کوئی تعلق" مالگزاری کی وصولی سے نہ تھا قابل قبول نہیں ہوسکتا (Provincial Govt. & C.، ص 291)

[5] صدیقی، حوالہ سابقہ، اوراق 15 الف۔ 16 الف۔ اس صورت میں شقدار یا عامل کے ساتھ ایک کارکن اور ایک فوتہ دار ہوا کرتا تھا۔ اس نے تشخیص کے کام کے لیے ایک امین کی تقرری کی استدعا کی لیکن اسے جواب دیا گیا کہ وہ اس کام کو خود ہی انجام دے۔

[6] ملاحظہ ہو I.O 4434 اس کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ شقدار کو تشخیص کرنے والے اور خزانچی دونوں کے فرائض انجام دینے ہوتے تھے۔

اطلاع ملتی ہے کہ ایک واحد شخص کو" ایک جاگیر کے معاملات کے امین، شقدار، کارکن اور فوجدار" کے عہدوں پر مقرر کیا گیا۔ اس کے علاوہ، اس کا شریک کار صرف ایک اور عہدہ دار خزانچی ہوا کرتا۔[1]

غالباً خالصہ کی طرح، جاگیرداران بھی اپنے گماشتوں سے مستقبل کی وصولیوں کا عہد نامہ لیا کرتے تھے۔ لیکن وہ ایک مزید رقم جو' قبض' کہی جاتی پیشگی وصول کر لیتے تھے اور یہ بظاہر ایک عام طریقہ تھا کہ کوئی شخص جاگیردار کو زیادہ بڑی رقم بطور' قبض' پیش کر کے اس کے موجودہ عامل کو برطرف کرا دے اور خود اس عہدہ پر قابض ہو جائے۔[2] دوسری طرف جاگیرداروں کو بعض اوقات خصوصاً جب وہ اپنی جاگیر کے علاوہ کسی اور صوبہ میں تعنیات ہوں اپنے' عاملوں' کو تصرف بیجا سے باز رکھنے میں بے حد دشواری پیش آتی تھی۔[3]

چنانچہ متعدد جاگیرداران اپنی جاگیروں کو ٹھیکہ پر اٹھانے میں سہولیت محسوس کیا کرتے تھے۔[4] یہ طریقہ جو اجارہ کے نام سے موسوم تھا۔ بے حد ظلم و زیادتی کا سرچشمہ تصور کیا جاتا، کیونکہ اجارہ داران ٹھیکہ کی لالچ میں" اونچی اونچی بولیاں بولنے کے بعد کسانوں سے بھی ہر ممکن طریقہ پر روپیہ وصول کر کے زیادہ نفع کمانے کی کوشش کرتے تھے۔[5] جاگیروں میں اجارہ داری کے رواج کی وسعت

---

[1] دستور العمل نویسندگی' اوراق 194 الف۔ 195 الف۔

[2] دلکشا' ورق 137 الف۔

[3] ایزد بخش رسا اپنے خطوط میں اپنے عاملوں کی بد دیانتی کا اکثر ذکر کرتا ہے۔ ریاض الوداد' اوراق 3 ب۔ 4 الف۔ 5 ب' 10 ب' 16 ب۔ ان میں سے ایک میں اس نے مخصوص طور پر شاہی فوج کے ساتھ تیاشادکن میں اپنی تقرری کی وجہ سے اپنی جاگیر کا انتظام کرنے سے معذوری کا ذکر کیا ہے (اوراق 3 ب۔4 الف) وہ ایک دوسرے خط میں لکھتا ہے کہ" اس کی جاگیر کی کشتی اس کے بے قابو عاملوں کے برپا کیے ہوئے تصرف بیجا کے سیلاب میں غرق ہو رہی تھی" (ورق 3 ب) وقائع اجمیر 679 ۔

[4] " بعض معافیداران (جاگیرداران) اپنی نمائندگی کے لیے اپنے بعض ملازمین کو بھیجتے ہیں یا اپنی جاگیروں کو کروڑیوں کو (کذا) کے سپرد کر دیتے ہیں اور انہیں کو اچھی یا بری فصل کے نفع و نقصان کا خطرہ برداشت کرنا ہوتا ہے۔" (54 'relsort)

شاہ ولی اللہ چھوٹے منصبداروں کو نقد ادائیگی کی سفارش کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ یہ لوگ" اپنی جاگیروں سے خود مالگذاری وصول نہیں کر سکتے، اس لیے مجبوراً اسے اجارہ پر دیدیتے ہیں"۔ (سیاسی مکتوبات' 42)

[5] صادق خاں Or. 174 ورق 11 الف Or. 1671 ورق 6 ب۔

کا تعین آسان نہیں۔ اس وقت کی انتظامی تحریروں میں اس کی مثالیں زیادہ نہیں ملتیں اور سلطنت گولکنڈہ ایسے حالات یقیناً مملکت مغلیہ میں نہ رہے ہوں گے[1] پھر بھی اودھ میں جاگیروں کی اجارہ داری کے چند دستاویزات ہم تک پہونچے ہیں[2] علاوہ اس کے یہ بھی ممکن ہے کہ بہت سی صورتوں میں یہ کام خفیہ طور پر کیا جاتا رہا ہو اور یہ کہ متعدد عمال اس نام سے نہیں مگر درپردہ ٹھیکہ داری ہی کا کام کرتے ہوں[3] غالباً جاگیرداروں کے لیے مالگذاری کا علانیہ نیلام قرین مصلحت نہ ہوتا، کیونکہ دربار شاہی میں اس طریقہ کو پسند نہ کیا جاتا تھا۔ اس کی وضاحت عہد عالمگیری کی درباری خبروں سے ہوتی ہے۔ بادشاہ کو اطلاع موصول ہوئی کہ منصبداران جن کے پاس کشمیر کی جاگیریں تھیں، انہیں مقامی لوگوں کو جو انتہائی ظالم ہیں ٹھیکہ پر دیدیتے تھے۔ چنانچہ اورنگزیب نے حکم صادر کیا کہ دیوانِ صوبہ منصبداران کو اس عمل سے باز رکھیں اور جاگیرداروں کو اپنے عاملوں کے معرفت مالگذاری وصول کرنے کی تاکید کریں[4]

جاگیردار کے لیے کوئی امر اپنے علاقہ کے ایک جزء کو اپنے کسی عہدہ دار یا فوجی کو بطور ذیلی جاگیر دینے میں مانع نہ تھا۔ ہم عہد جہانگیری میں سندھ کے ترخانی صوبیدار کو جس کی جاگیر میں صوبہ کا بڑا حصہ شامل تھا اپنے عہدہ داروں کو جاگیریں دینے کے بعد انہیں اپنی مرضی کے مطابق واپس لیتا ہوا

---

[1] گولکنڈہ میں مالگذاری کی ٹھیکہ داری کے رواج کے لیے ملاحظہ ہو Relations 10 - 19 / 57 / 61 - 62 و Factories 1665 - 67 و ص 245 ، Master (2) ص 113 کرناٹک میں مالگذاری کی ٹھیکہ داری کے متعلق دو دستاویزات کی نقل Sloane Br. M. 4092 اوراق 3 ب - 6 الف، 8 ب - 9 الف میں ملتی ہے۔ ان میں سے ایک 1653 ء کا اور دوسرا 677 - 79 ء کا ہے۔

[2] الہ آباد، 884 - 887 ، 889 - 90 اجارہ کے شرائط مندرجہ الہ آباد 884 اور 885 میں درج ہے کہ ٹھیکہ دار کو سالانہ ایک معینہ رقم دو فصلی قسطوں میں ادا کرنا ہوتا تھا۔ آفات سماوی کی صورت میں اسے دشاہی انتظامیہ کی) منظور شدہ پرگنہ کی شرحوں (شرح پرگنہ) پر چھوٹ ملتی تھی۔ دوسری طرف، اگر ٹھیکہ دار معینہ رقم سے زائد وصول کرے تو وہ اس کے پاس رہتی تھی۔

[3] اس سلسلہ میں خافی خاں کی اس عبارت کا مطالعہ جس میں اس فرق کو جو ٹوڈرمل اور اس کے زمانہ (عہد محمد شاہی) میں رونما ہو گیا تھا جب "اجارہ دار کے عمال یعنی وہ عمال جنہوں نے زمینوں کو اجارہ پر یا ٹھیکہ پر لیا تھا علاقہ کو تباہ کر رہے تھے بیان کیا گیا ہے دلچسپی سے خالی نہیں (خافی خاں (1) ص 157)

[4] اخبارات $\frac{37}{38}$

پاتے ہیں[1] اس عہد میں عبدالرحیم خانخاناں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ معمولاً اپنے کارپردازوں اور عہدہ داروں کو اپنی جاگیر سے نقدی گذارے اور نیز جاگیریں دیا کرتا تھا[2] اودہ کے متعلق عہد شاہجہانی کے متعلق دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ ایک امیر کو جب ایک موضع کی جاگیر بطور تنخواہ کے عطا کی گئی تو اس نے اسے اپنے چار فوجیوں میں تقسیم کر دیا[3] اگلے عہد حکومت کے ایک دوسرے ماخذ میں دکن میں تعینات ایک راجپوت عہدہ دار کا ذکر آیا ہے جس نے ایک پرگنہ کے تمام مواضعات کو جو اس کی جاگیر میں تھے اپنی راجپوت فوج کو 'تنخواہ' میں دیدیا۔ یہاں یہ بخوبی واضح کیا گیا ہے کہ اصل جاگیر کے تبادلہ کے بعد یہ ذیلی جاگیریں کالعدم ہو جاتی تھیں[4]۔

جاگیرداروں کی مالگذاری کے ٹھیکہ دار معمولاً مقامی افراد ہوا کرتے تھے[5] لیکن قاعدہ کی رو سے جاگیروں و خالصہ کے شعبہ مال میں ایسے ہی لوگ ملازم رکھے جاتے جنہیں مقامی معاملات سے

---

[1] تاریخ طاہری، Or. 1685، اوراق 102 ب، 103 ب، 118 الف، 119 ب۔
عہد شاہجہانی کے اوائل میں سہوان (سندھ) کے ایک جاگیردار کا حوالہ دیتے ہوئے مظہر شاہجہانی 164-5 میں کہا گیا ہے کہ اس نے "پورے علاقہ کو اپنے فوجیوں کی جاگیر میں دے دیا اور صرف چند محال اپنے خالصہ میں رکھے"۔ خالصہ سے یہاں مراد بادشاہ کی زمینیں نہیں بلکہ وہ زمینیں ہیں جو وہ اپنے لیے مخصوص کر لیتے

[2] آثر رحیمی (ج 3) میں مختلف مقامات پر ان شعراء موسیقاروں، فنکاروں، سپاہیوں وغیرہ کا تذکرہ ملاحظہ ہو جنہیں اپنے مربی کی سرپرستی ہو ملازمت حاصل تھی مثلاً ص 1634 پر ملاحظہ ہو جہاں خانخاناں کے ایک عہدہ دار کے متعلق بتایا گیا ہے کہ "وہ اس (سرکار) سے پورے سال ایک زر کثیر بطور جاگیر اور گذارہ کے حاصل کرتا رہتا تھا"

[3] الہ آباد، 789

[4] وقائع اجمیر، 359 مان سنگھ جاگیردار کی درخواست تھی کہ اس کے پرگنہ کی جاگیر کی جزوی واپسی سے اس کے آدمیوں کو جس نے اس نے تمام مواضعات دیئے تھے بیحد پریشانی کا سامنا ہوگا۔ لہٰذا اس کی تجویز تھی کہ اسے وہ علاقہ، اجارہ (مالگذاری کے ٹھیکہ) پر دے دیا جائے تاکہ اس کی دی ہوئی ذیلی جاگیریں برقرار رہ سکیں۔

[5] ایسا دستاویزات الہ آباد (884 - 7 اور 889 - 90) جن کا پہلے حوالہ آچکا ہے ظاہر ہوتا ہے محمد عارف پرگنہ حسام پور (سرکار بہرائچ، اودھ) کی جاگیر کی جہاں خود اس کی زمینداری (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کوئی دلچسپی یا تعلق نہ ہوتا[1] اس کا ایک سبب یہ تھا کہ ہر جاگیردار کے پاس خود اس کے متوزگماشتے ہوا کرتے جنہیں وہ اپنی جاگیروں پر خواہ وہ کہیں واقع ہو تعینات کر سکتا تھا[2] لیکن بہت سی صورتوں میں ان افراد کو غالباً سوچ سمجھ کر منتخب کیا جاتا تھا۔ مقامی تعلق رکھنے والے عاملوں کے بارے میں اس کا زیادہ امکان پایا جاتا کہ وہ زمینداروں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ جاگیردار کے خلاف سازباز کریں گے[3] چنانچہ جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے بعد ایک حکم صادر کیا جس میں ان عہدہ داروں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

کے چند مواضعات بھی تھے اجارہ داری لیتا ہے۔ اسی طور پر اخبارات $\frac{37}{38}$ میں "کشمیر کے لوگوں" کا تذکرہ آتا ہے جنہوں نے اس صوبہ کی جاگیروں کو اجارہ پر لیا تھا۔

[1] موازنہ ہو 'Elliot, Chronicles of Donas' ص 106 "عامل، کروڑی اور تحصیلدار (مالگذاری کا محصل) شاید ہی کبھی پرگنہ کے باشندے ہوتے ہیں"۔ ایلیٹ کے بیانات غالباً اس سبب سے کہ اس نے عہد مغلیہ کی کثیر تعداد میں سندوں، اور دیگر انتظامی تحریروں کی جانچ پڑتال کی تھی اور ساتھ ساتھ وہ مقامی تاریخ سے بھی قریبی واقفیت رکھتا تھا، بیحد قابل احترام ہیں۔ الہ آباد کے دستاویزوں کے مطالعہ سے بھی ہم اسی نتیجہ پر پہونچتے ہیں کیونکہ ایسی بہت ہی شاذ مثال ملتی ہے کہ ان مقامی لوگوں میں جن کے حالات ہمیں تحریروں کے ذریعہ معلوم ہوتے ہیں کوئی دسترہویں صدی میں) کسی جاگیر کا گماشتہ مقرر ہوا ہو۔

[2] ایسا ہم بایزید کے تذکرہ ص 248 - 50 ، 299 میں مندرج اس کے ذاتی حالات سے معلوم کر سکتے ہیں۔ اس نے منعم خاں کی ملازمت اختیار کی تھی جس نے اسے حصار فیروزہ کا جو اس کی جاگیر میں تھا شقدار مقرر کیا۔ جب اس کی جاگیر مشرقی صوبوں کو منتقل ہوئی تو اس نے بایزید کو سرکار بنارس کا شقدار مقرر کیا۔ بھیم سین (دلکشا ورق 80 الف۔ب) کی اطلاع ہے کہ گجرات کا ایک باشندہ سمی کیکا رام ناگر خان جہاں بہادر کے سرکار کی دیوانی کے عہدہ پر ترقی کر کے فائز ہوا۔ جب خانجہاں بہادر کو اورنگزیب نے اپنی حکومت کے چودھویں برس دکن روانہ کیا تو اس نے کیکا رام کو اپنی بہار کی جاگیر کے انتظام پر مامور کر دیا۔ دستاویزات الہ آباد میں جن عمال مال کے نام اکثر ملتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ہر نئے جاگیردار کے ساتھ وہ بھی تبدیل ہوتے رہتے تھے۔

[3] "رسالۂ زراعت"، جو تقریباً 1750ء کی تصنیف ہے، بنگال کے "پچھلے ناظموں" کے طریقوں کے سلسلہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ان کے تحت "خالصہ کے ملازمین (متصدیان) کے پاس کوئی تعلقہ یا زمینداری وغیرہ نہ ہوا کرتی تھی۔ اگر کسی ملازم کے پاس کوئی تعلقہ یا موضع ہوتا تو پچھلے زمانہ کے ناظم بہ خیال احتیاط مزید اسے خالصہ میں کسی عہدہ پر کبھی نہ مقرر کرتے کیونکہ چور کو چوکیداری کے کام پر مامور کرنا (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

(خالصہ اور جاگیرداروں کے، عاملوں) کو مقامی رشتہ داریاں قائم کرنے صراحتاً منع کیا گیا ہے[1]
پس جاگیروں کے نظم ونسق سے، مقامی عنصر کو تقریباً پورے طور پر خارج کر دیا گیا تھا۔
بہرحال اس کے انتظام میں دو عہدہ داران اس عنصر کی نمائندگی کرتے تھے جو دونوں جاگیرداروں سے آزاد تھے مگر ان کا وجود ان کے لیے ناگزیر ہوا کرتا۔ یہ قانون گو اور چودھری تھے اور باوجودیکہ یہ بیحد معروف اصطلاحیں تھیں، لیکن زمانۂ حال کی تحریروں میں ان کی حیثیت و فرائض منصبی کو بظاہر صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا ہے[2]

قانون گو (یا دیش پانڈیہ جیسا کہ وہ دکن میں کہا جاتا)[3] عموماً حساب کتاب کرنے والی ذاتوں (کائستھ، کھتری وغیرہ) میں سے کسی ایک ذات کا ہوا کرتا[4] یہ عہدہ معمولاً خاندان کے اندر ہی

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

عقل کے خلاف ہے۔ حقیقت میں تو وہ بنگال کے باشندوں ہی کو کبھی ان ملازمتوں پر نہ مقرر کرتے کیونکہ ان میں سے بیشتر زمینداروں کے رشتہ دار ہیں۔۔۔۔" (ورق 19 ب)

[1] حکم میں بلا اجازت (بے حکم) ایسا کرنے سے منع کیا گیا ہے (تزک جہانگیری، ص 4) تزک کے مطبوعہ متن کی تصدیق سنٹرل محافظ خانہ، حیدرآباد میں موجود تزک کے قدیم ترین قلمی نسخہ ورق 9 الف اور سترھویں صدی کے ایک مخطوطہ Add. 26215 سے ہوتی ہے۔ لیکن آثر جہانگیری، ص 171 ورق 25 الف میں 'بے حکم' کی جگہ 'بے تحکم' لکھا ہے۔ ان الفاظ سے حکم کا مفہوم سرے سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہانگیر کا منشا عاملوں کی مقامی آبادی کے ساتھ سازش کو نہیں بلکہ ان پر ان کے ظلم و زیادتی کو روکنا تھا مگر تزک کی عبارت کو آثر جہانگیری کی عبارت پر فوقیت حاصل ہونا چاہیے۔

[2] اس میں کوئی شک نہیں کہ چارلس ایلیٹ نے اپنی تصنیف 'Chronicles of Donas' ص 116 میں قانون گو اور چودھری" اور غیر مستقل عہدہ داران "عامل کروڑی اور تحصیلدار" کے درمیانی فرق پر زور دیا ہے لیکن اس کا یہ خیال غلط تھا کہ "قانون گو اور چودھری کے کاموں میں کوئی خاص فرق نہ تھا اور یہ دو سرے عہدے ایک دوسری کی روک تھام کے لیے تھے (ایضاً ص 112) مورلینڈ نے اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اکبر کے نظام ضبط کی جگہ (اس کے خیال کے مطابق) اجتماعی تشخیص کے رائج ہونے کے بعد ہی قانون گو اور چودھری کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا۔ (JRAS 1928، ص 521)

[3] آئین اکبری (1) ص 476، معلومات آفاق، ورق 174 الف

[4] Elliot, 'Chronicles of Donas' 112، آثر الامرا (2) ص 350 (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

رہا کرتا[1] لیکن ہر عہدہ دار کے حقوق کے لیے شاہی منظوری ضروری ہوتی[2] متوفی قانون گو کے ورثا کا یہ معمول معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی وراثت کے تائیدی حکم یا سند کے لیے دربار شاہی میں درخواست دیں[3] شاہی منظوری کے بعد عہدہ دار معمولاً اپنے دوران حیات اس پر قائم رہا کرتا[4] پھر حکم شاہی کے ذریعہ، قانون گو اپنے عہدہ سے برطرف کیا جا سکتا تھا۔ اس کے مختلف اسباب ہو سکتے تھے۔ پہلا

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)
کہا جاتا ہے کہ عادل شاہ سور کے وزیر ہیموں نے تمام قانون گوؤں و چودھریوں کو ہٹا کر ان عہدوں پر غلہ فروشوں کو جن سے اس کا بھی تعلق تھا مقرر کیا (تاریخ داؤدی، 200)

[1] چنانچہ بہار میں سہسرام کے قانون گو جو فرخ سیر کے عہد میں معزول کیے گئے تھے سنہ 3 جلوس محمد شاہی میں خود کو اس بنا پر بحال کرانے میں کامیاب ہوئے کہ اس پرگنہ کی قانون گوئی کا عہدہ "عرش آشیانی (اکبر) کے وقت سے ان کے مورثوں کا حق تھا" اور جدید سند کے ذریعہ انہیں یہ عہدہ "پہلے کی طرح بطور موروثی" عطا کیا گیا (I H R C 31، حصہ 2، 1954، 142/47 مترجمہ قیام الدین احمد) اورنگزیب کے ایک عہدہ دار اخلاص خاں کے متعلق ہماری اطلاع ہے کہ "اس کے مورث" قصبہ کلانور کی قانون گوئی پر فائز تھے (مآثر الامراء (2) ص 350)

[2] چار چمن برہمن Add. 4863، ورق 23، ب، Or. 1839، ورق 13 الف، نگارنامۂ منشی، اوراق 116 ب۔ 117 الف Bodl. اوراق 90 ب۔ 91 الف، مطبوعہ 90، 91 (I H R C) حوالہ سابقہ۔ اخبارات 44/13 میں ایک جاگیردار کے جانب سے ایک "غیر سند یافتہ" قانون گو کی اس کی جاگیر کے معاملات میں دخل اندازی کی شکایت درج ہے۔ موازنہ بہ نیز Add. 6603، ورق 75 ب۔

[3] موازنہ بہ احکام عالمگیری، ورق 216 ب جس میں ایک متوفی قانون گو کا پوتا "عہدۂ قانون گوئی میں اپنے حصہ کی سند" کی درخواست دیتا ہے۔

[4] ایک شاہی حکم میں ایک عرضداشت کے حوالے کہا گیا ہے کہ قانون گویان بہت سی بدعنوانیاں کرتے ہیں کیونکہ "انہیں اپنے تبادلہ یا معزولی کا خوف نہیں ہوتا" (نگارنامۂ منشی ورق 182 الف۔ Bodl. ورق 143 الف، مطبوعہ 40،) ملاحظہ ہو نیز Add. 6603، ورق 73 ب، اس فرہنگ میں جس کا تعلق اٹھارہویں صدی کے اواخر سے ہے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ پچھلے زمانہ میں قانون گوئی کا عہدہ فروخت نہ ہو سکتا تھا، حالانکہ یہ طریقہ اس کی تالیف کے دنوں میں رائج تھا۔

بدعنوانیوں اور اپنے فرائض میں کوتاہی[1] کی سزا کے طور پر، دوسرا اس عہدہ کے قابضین کی تعداد کو محض کم کرنے کی غرض سے جو وراثت کی تقسیم کے باعث مستقلاً زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ شیر شاہ اور اکبر کے تحت ہر پرگنہ میں صرف ایک قانون گو رہا کرتا تھا[2] اورنگزیب کے حکم کے بموجب ایک پرگنہ میں دو سے زائد قانون گو نہ رہ سکتے تھے اور اگر ہوں تو زائد کو برطرف کرنے کی ہدایت تھی[3] اسی بادشاہ نے ہندو قانون گو کی جگہ مسلمانوں کو دیئے جانے کا طریقہ شروع کیا تھا[4] لیکن اس سلسلہ میں روات کے دیوتا کا بھی عمل دخل شروع ہو گیا تھا اور خزانہ شاہی میں قیمتی تحفے (پیش کش) پہنچا کر بسا اوقات ایک عہدہ دار کو برطرف اور دوسرے کو مقرر کرایا جا سکتا تھا۔[5]

قانون گو، وصولیٔ مالگذاری، اعداد آراضی، مالگذاری کی مقامی شرحوں اور پرگنہ کے رسم و رواج کے متعلق معلومات کا مستقل مخزن ہوا کرتا تھا[6] وہ شاہی انتظامیہ کو معیاری تشخیصوں کے تعین

---

[1] نگارنامہ منشی، اوراق 103 الف، 182 الف Bodl. اوراق 78 ب، 145 الف مطبوعہ 140، خلاصۃ الانشاء اوراق 111 الف۔ 112 ب، اخبارات $\frac{39}{113}$

[2] عباس خاں، ورق 106 الف، آئین اکبری (1) ص $\underline{300}$

[3] مرآۃ (1) ص $\underline{263}$ (مطبوعہ متن میں 'دو' کے بجائے 'دس' تلفظاً غلطی سے چھپ گیا ہے) دراالعلوم، اوراق 66 ب،

کشمیر میں قانون گوؤں کی تعداد بظاہر اس قدر زیادہ ہو گئی تھی کہ ہر موضع کی قانون گوئی کے متعدد شریک داران (قانون گویان جزو) ہو گئے تھے۔ شاہجہاں کے حکم کے بموجب ہر موضع میں صرف ایک قانون گو کو تسلیم اور بقیہ کو برطرف کر دینا چاہیے (قزوینی، علیگڈھ، ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ، 310)

[4] موازنہ بہ احکام عالمگیری اوراق 216 ب۔ 217 الف۔ سہسرام کے معزول شدہ قانون گو کی بحالی کی درخواست میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ معزولی کی بنیاد "سوبھا چند کے خلاف مسجدوں اور مقبروں کے انہدام اور بے حرمتی کا غلط الزام ہے" (I H R C، حوالہ سابقہ، ص $\underline{143}$)

[5] اخبارات $\frac{39}{113}$

[6] موازنہ بہ وقائع اجمیر 143، 171، معلومات آفاق، ورق 174 الف، دستور العمل خالصہ تبریزی، ورق 32 الف Add. 6603، ورق 75 ب۔ آخر الذکر تصنیف میں ہے کہ اگر قانون گو سے پچھلے سو برسوں کے اندراجات مال طلب کیے جائیں تو اسے پیش کرنا چاہیے۔ سہسرام کے معزول شدہ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

میں کام آنے والے مالگذاری اور آراضی کے اعداد و شمار جن کی عطیۂ جاگیر کے سلسلہ میں ضرورت ہوا کرتی فراہم کیا کرتا[1] مگر اس کا اہم ترین فرض منصبی جاگیردار کے مامور کردہ امین (یا بطور تشخیص کنندہ کام کرنے والے کسی دوسرے عہدہ دار) کو اپنے کاغذات (خصوصاً سابقہ تشخیصوں کے حسابات یعنی موازنہ دہ سالہ وغیرہ) اور اپنی ذاتی معلومات کا مہیا کرنا تھا۔[2] امین کی طیار کردہ تشخیص پر قانون گو کی[3] اور قبولیت پر اس کی بشمول چودھری اور مقدم کی دستخط ثبت ہوتی تھی۔[4] عامل یا محصل مالگذاری کو اپنی وصولیوں، بقایوں اور آخراجات کے تفصیلی حسابات کی ایک نقل قانون گو کے پاس داخل کرنا ہوتا تھا جو یہ معلوم کرنے کی غرض سے کہ عامل نے اپنی تمام وصولیوں کا صحیح اندراج کیا ہے یا نہیں ان کی جانچ زمینداروں اور دوسرے لوگوں کے حسابات سے کیا کرتا تھا۔ عام طور پر شاہی انتظامیہ قانون گوؤں سے یہ توقع رکھتا تھا کہ وہ جاگیرداروں کے عمال کو سرکاری ضابطوں کی پیروی پر

(باقی حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

قانون گوؤں کے معاملہ کے کاغذات میں ان کی موافقت میں یہ بات درج ہے کہ ان کے پاس 1013 تا 1014 فصلی (1604 - 45ء) کے کاغذات موازنہ موجود تھے (I H R C ' حوالہ سابقہ، ص 144 - 45)

[1] اکبر نامہ (2) ص 270، آئین اکبری (1) ص 347، فرمان جہانگیری مندرجہ I H R C 18 (1942ء) ص 188 - 9، نگار نامۂ منشی' اوراق 116 ب - 117 الف Bodl. اوراق 90 ب - 97 الف' مطبوعہ 91، ہدایت القواعد' ورق 10 ب' علیگڈھ مخطوطہ ورق 64 الف - ب

[2] آئین اکبری (1) ص 288 (میں قانون گو کا کام تکچی کو کاغذات موازنہ کی فراہمی تھی) دستور العمل عالمگیری' ورق 36 الف - ب خلاصۃ السیاق' اوراق 74 الف' 78 الف ۔ Or. 2026 اوراق 22 ب' 30 الف ہدایت القواعد' ورق 10 الف - ب' آخر الذکر تصنیف میں امینوں سے سفارش کی گئی ہے کہ وہ قانون گو کے فراہم کردہ اعداد و رقبہ کو موقع پر مقدموں سے تحقیقات کر کے جانچیں۔

[3] راجکراس کے نام فرمان کا دیباچہ' دستور العمل علم نویسندگی' ورق 153 ب' خلاصۃ السیاق' اوراق 74 الف' 78 ب ۔ Or. 2026 ' اوراق 22 ب' 131 الف' فرہنگ کاروانی' ورق 29 الف' Edinburgh نمبر 83 ورق 54 ب' سیاق نامہ 28 ۔

[4] موازنہ یہ فرہنگ کاروانی' ورق 134 الف (نمونۂ قبولیت)

[5] ہدایت القواعد' اوراق 18 ب - 19 الف

مجبور کریں گے اور خود "کسانوں کے خیر خواہ" کی حیثیت سے کام کریں گے[1] اسے عامل کی ناجائز وصولیوں کی اطلاع دینا ہوتا ورنہ اس کا عہدہ معرض خطرہ میں پڑ جاتا تھا[2] اس کے برعکس، ایک شاہی حکم میں مالگزاری کی زیادہ سے زیادہ تشخیص (جمع کامل و اکمل) کی طیاری میں سہولیت کی فراہمی اس کے عہدہ کا خاص مقصد بتایا گیا ہے[3]

عام طور پر جاگیرداروں کے عمّال مقامی حالات سے ناواقف ہونے کے باعث، معمولاً قانونگو کی فراہم کردہ اطلاعات پر عمل کرتے تھے۔ لہٰذا قانون گو کے لیے اکثر ایسے حالات پیدا ہوتے رہتے جنہیں وہ ناجائز طور پر اپنی ذاتی منفعت کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ اورنگزیب کے جاری کیے ہوئے ایک حکم کے مطابق قانون گو، عموماً عامل سے سازباز کر کے جعلی حسابات طیار کرتے اور ناجائز رقموں کو آپس میں تقسیم کر لیا کرتے۔ اگر کوئی عامل ان سے اشتراک عمل نہ کرتا تو وہ بہ ترغیب زمینداروں کو اسے مالگزاری ادا کرنے سے روک دیا کرتے اور پھر یہ ان کے درمیان ثالث بن کر لمبی لمبی رقمیں وصول کیا کرتے تھے۔ آخر میں وہ زمینداروں پر تشخیص کی گئی مالگزاری میں بھاری بھاری چھوٹوں کی بھی سفارش کیا کرتے[4] کیونکہ ان کا اکثر عمل انہیں کی موافقت میں ہوا کرتا۔ ایک دوسرے مقام پر ایک پرگنہ کے قانون گوؤں کے متعلق اطلاع ہے کہ انہوں نے فوجدار سے ملکر جمع کو ناجائز

---

[1] آئین اکبری (۱) ص 300 مگر مظہر شاہجہانی 189 کے مصنف کو اس امر میں شبہ ہے کہ قانون گو اس توقع کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتے تھے کیونکہ "قانون گوؤں کی کوئی غربت نہ تھی۔ وہ کسی جاگیردار کو ظلم کرنے سے باز نہ رکھتے بلکہ خود با اقتدار جاگیرداروں کے مظالم میں شریک رہا کرتے تھے" اسے یہ تسلیم ہے کہ شاہی انتظامیہ جاگیرداروں کی وصولیٔ مالگزاری کے سلسلہ میں بدعنوانیوں کو روکنے کی غرض سے قانون گوؤں کے کاغذات کو استعمال کرتا تھا (ص 51)، لیکن وہ ایک ایسی مثال کا بھی ذکر کرتا ہے جس میں سہوان کے ایک جاگیر دار نے قانون گوؤں کو مع کاغذات دربار شاہی میں طلب کیے جانے پر حاضر ہونے سے باز رکھا (ص 177)

[2] نگارنامۂ منشی، ورق 103 الف، Bodl. ورق 78 ب، مطبوعہ 80، خلاصۃ الانشا، اوراق 111 ب - 112 الف۔

[3] نگارنامۂ منشی، ورق 181 ب، Bodle ورق 144 ب، مطبوعہ 140۔

[4] ایضاً، اوراق 181 الف - 182 ب، Bodle اوراق 144 ب - 145 الف، مطبوعہ 140۔ موازنہ بہ وقائع اجمیر 108، 218۔

طور پر[1] کم کر دیا ہے۔

بقول ابو الفضل، قانون گوؤں کو ابتداءً مالگزاری سے ایک فیصد بطور گذارہ دیا جاتا تھا لیکن اکبر نے بجائے اس کے ان کی تنخواہیں مقرر کر دیں اور تنخواہوں کے عوض انہیں جاگیریں دی جانے لگیں جن کے متعلق قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ مالگزاری سے مستثنیٰ زمینیں رہی ہوں گی[2] بعد کی تحریروں کے مطابق کم از کم بعض قانون گوؤں کی نقدی گذارے بھی ملا کرتے تھے جنہیں 'نانکار' کہتے تھے اور یہ ان کی انعام کی زمینوں کے علاوہ ہوتے تھے[3]۔

چودھری جو گجرات میں دیسائی اور دکن میں دیش مکھ کہا جاتا تھا[4] انتظامیہ کے لیے غالباً اتنا ہی اہم عہدہ دار تھا جتنا قانون گو۔ وہ ہمیشہ زمیندار ہی نہیں[5] بلکہ بیشتر صورتوں میں علاقہ کا

---

[1] اخبارات $\frac{38}{113}$

[2] آئین اکبری (۱) ص 300 میں ہے کہ گذارہ صدہ دوئی (2 فیصدی) میں پٹواری اور قانون گو نصف نصف پاتا تھا۔ دستاویزات مدد معاش میں مندرج ان محصولوں کی فہرست میں جنہیں عمال کو جاگیرداروں سے وصول کرنے کو منع کیا گیا تھا، صدہ دوئی قانون گوئی (یا بعض اوقات صدہ دوئی و قانون گوئی) کا مسلسل اندراج ملتا ہے۔ اکبر نے تین درجے کے قانون گوؤں کی شرح تنخواہ ترتیب وار 50، 30 اور 20 روپیہ ماہانہ مقرر کیا تھا

[3] بقول مظہر شاہجہانی 106، سرکار سیوان (سندھ) کے قانون گوؤں کو کاشتکاروں سے مالگزاری کا ایک فیصدی بطور رسوم یا دستوری محصول کے وصول کرنے کا اختیار تھا۔
موازنہ ہو دستور العمل نویسندگی، ورق 40 ب اور کاغذات پرگنہ چپل جس کا تجزیہ I H R C 1929، 84 - 86 میں کیا گیا ہے۔

[4] چودھری اور دیسائی کا ایک دوسرے کا مرادف ہونا ایک اخذ کیا ہوا اطلاق ہے۔ ہمعصر تحریروں میں اس کی کوئی براہ راست سند نہیں ملتی جس کا میں حوالہ دوں۔ ان کے اور دیش مکھ کے ہم معنی ہونے کی سند کے لیے ملاحظہ ہو آئین اکبری (۱) ص 476 اور معلومات آفاق، ورق 174 الف۔
مظہر شاہجہانی میں چودھری کا نہیں بلکہ ایک عہدہ دار موسومہ ارباب' کا حوالہ ملتا ہے جو حقیقتاً سندھ میں چودھری کا مثنیٰ معلوم ہوتا ہے (ص 19-21، 101-2، 182، 185-6، 188، 199) 'Arbabs' اور 'Chief men' کے حوالہ کے لیے موازنہ ہو 'Factories 1646 - 50، ص 118 - 9

[5] Add. 6603 ورق 58 الف، چودھری کا عہدہ زمینداروں میں کسی قابل اعتماد (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

سربرآوردہ زمیندار ہوا کرتا[1] مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ ایسی صورت نہ ہوا کرتی تھی[2] ہوسکتا تھا کہ سب سے زیادہ بااثر زمیندار کی وفاداری مشتبہ ہو[3] ایسی حالت میں یہ عہدہ کمتر درجہ کے لوگوں کو دیا جاتا تھا۔ یہ عہدہ معمولاً موروثی ہوا کرتا[4] لیکن ہر عہدہ دار کے لیے شاہی سند کا حاصل کرنا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

شخص کو دیا جاتا ہے "خسرو کی بغاوت کو فرو کرنے کے بعد جہانگیر نے دریائے چناب کے کنارے کنارے کے علاقہ کی چودھرائی ان زمینداروں کو عطا کی جنہوں نے خیر خواہی کی خدمات انجام دی ہیں۔ (تزک جہانگیری ص 32)، I H R C (18) (1942ء) ص 188-9 میں مطبوعہ جہانگیر کے ایک فرمان کے ذریعہ بعض پٹنوں کی خدمت (عہدہ) زمینداری اور چودھرائی بیک وقت ایک ہی شخص کو دی گئی۔ Malda Diary & Consul tations میں انگریز راپا رسے کو جس سے انہوں نے اپنی نئی فیکٹری کے لیے زمین خریدی تھی باری باری سے 'چودھری' اور 'جمیدار' کہتے ہیں۔ (J A S B (14) ص 61، 74، 122، 162، 196، 202) موازنہ بہ نیز Elliot, 'Chronicles of Donas' ص 112

مظہر شاہجہانی، 191 میں ہے کہ "زمیندار ارباب اور مقدم کے عہدوں پر بھی تابعین (لفظاً، تعلق رکھتے) ہیں" 'ارباب' کے متعلق پچھلے فٹ نوٹ میں واضح کیا گیا ہے کہ یہ غالباً سندھ میں چودھری کا مرادف ہے۔

[1] موازنہ بہ 'Elliot' حوالہ سابقہ۔ دکن میں دیشکھ اپنے علاقہ کا قطعی طور پر با اقتدار زمیندار ہوا کرتا تھا جیسا کہ چانیری دیشکھ کے معاملہ سے ظاہر ہوتا ہے جس کا ذکر باب 5 کی فصل 4 میں آچکا ہے۔

[2] دستور العمل خالصہ شریفہ، بنگال میں لکھی ہوئی اٹھارہویں صدی کے اواخر کی ایک تصنیف ہے۔ اس کی بہر حال جو بھی قدر و قیمت ہو، اس میں چودھری کے معنی "چھوٹا زمیندار" بتایا گیا ہے (ورق 32 ب)۔ برخلاف ایلیٹ کے جس نے اودھ کے نواحی اضلاع پر تحقیقات کی تھی بینٹ اپنی تصنیف 'Chief Clans of the Roy Bareilly District' ص 58-9 میں وثوق کے ساتھ کہتا ہے کہ چودھری کے عہدہ پر "مسز لیکن قطعی طور پر دوسرے درجہ کے خاندان قابض تھے۔"

[3] ہدایت القواعد، ورق 7 الف میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ گویا یہ ایک کلی حقیقت تھی کہ "باقی زمیندار، زمینداروں کا سرغنہ ہوتا ہے۔"

[4] 'Elliot' حوالہ سابقہ ص 112 بذریعہ فرمان جہانگیری مطبوعہ I H R C (18) 1942ء ص 188-89 بہار کے بعض پٹنوں کی 'زمینداری' اور 'چودھرائی' "مسمی ہیرا نند کو" مع اس کے بچوں کے عطا کی گئی۔ عہدۂ دیشکھ کی موروثی نوعیت کے مورلینڈ کا مقالہ مطبوعہ 'JRAS' 1938ء ص 516 (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

لازمی ہوتا ہے[1]

چودھری بھی اپنے عہدہ سے شاہی حکم کے ذریعہ محروم کیا جا سکتا تھا۔ اور نکذیب کا حکم تھا کہ اگر کسی پرگنہ میں چودھریوں کی تعداد بہت زیادہ ہو تو دو کو چھوڑ کر بقیہ ہٹا دیئے جائیں[2] اسے عاملوں کی ناجائز وصولیوں کی اطلاع نہ پہونچانے[3] اور نیز دیگر بے عنوانیوں کی علت میں بھی معزول کیا جا سکتا تھا۔

ایک طرف قانون گو کی خاص ذمہ داری تشخیص مالگذاری کی طیاری سے متعلق تھی تو دوسری طرف چودھری کا خاص کام اس کی وصولی تک محدود رہا کرتا جب جاگیرداروں کے عمال جمع مرتب کر لیتے تھے تو چودھری اس پر اور اس کے علاوہ ایک اور دستاویز پر جسے قبولیت کہتے اپنی دستخط ثبت کرتا تھا۔[4] مقدموں سے بھی ان کے متعلقہ مواضعات کے متعلق ایسی ہی قبولیتیں لی جاتیں[5] ان دستاویزات میں دستخط کنندگان کی طرف سے تشخیص شدہ رقوم کو وصول کرنے کا عہد درج رہتا تھا۔ چودھری چھوٹے زمینداروں کی ضمانت بھی لیتا تھا[6] غالباً چودھری، عموماً مقدموں اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

جو اس دور کے بعض قدیم دستاویزات کے مطالعہ پر مبنی ہے، ملاحظہ ہو۔ اس مفہوم کی دستاویزی شہادتیں، ادب عالمگیری، اوراق 161 ب ۔ 162 ب Khasa کی تصنیف Persian Sources of Indian History (2) 10937ء، 12-11 'IHRC' 1948ء ص 15 - 17 میں ملتی ہیں۔

[1] چارچن برہمن، حوالہ سابقہ، اخبارات 44/13 ، 47/337 ،

[2] مرآۃ (۱) ص 263 دراالعلوم، ورق 65 ب، موازنہ بہ ای بادشاہ کا ایک حکم جس کا حوالہ، بلند شہر ڈسٹرکٹ گیزیٹر 1922ء ص 148 میں آیا ہے۔

[3] نگارنامہ منشی، ورق 103 الف Bodl. ورق 78 ب، مطبوعہ 80، خلاصۃ الانشا اوراق 111 ب، 112 الف۔

[4] وہ قانون گو کے ساتھ دستخط کرتا تھا۔ ملاحظہ ہوں وہ ماخذ جن کا اس عہدہ دار کے متعلق اسی بیان کی سند کے طور پر حوالہ دیا گیا ہے۔

[5] فرہنگ کاروانی، ورق 34 الف ۔ ب، خلاصۃ السیاق، اوراق 74 الف ۔ 75 الف Or. 2036 اوراق 23 الف ۔ 24 ب

[6] Add. 6603 ورق 58 الف ۔ ب۔

زمینداروں سے مالگذاری وصول کرتا تھا۔ اس کے بعد یہ عامل کے سپرد کر دی جاتی[1] جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، آفات سماوی کے باعث نقصان فصل کے لیے جمع میں اکثر چھوٹ دی جاتی تھی[2] لیکن اس کے علاوہ اگر چودھری مالگذاری وصول نہ کرے یا کسی طور پر بھی انکار کرے تو وہ سخت ترین سزا کا متوجب قرار پاتا۔ چنانچہ، ہمیں یہ اطلاع ضمناً ملتی ہے کہ ایک جاگیردار کے عہدہ دار کی یہ تجویز تھی کہ اس کے مالک کی موت کو بصیغۂ راز رکھا جائے، جس کا بظاہر مقصد یہ تھا کہ وہ ایسے طریقوں کے ذریعہ جنہیں تشدد آمیز کہتے ہیں "بعض سرکش چودھریوں کو قلعہ (چنار) میں طلب کر کے بقائے وصول کر سکے"[3] اگلی (سترھویں) صدی میں ایک یورپی سیاح نے اسی صوبۂ الہ آباد میں مشاہدہ کیا کہ "ایک فوجدار بعض چودھریوں یا گاؤں کے سربراہوں کو اپنے ساتھ اس وجہ سے قید کر کے کی جارہی ہے کہ وہ بادشاہ کے محصول کو یا تو ادا نہیں کرتے یا ادا نہیں کر سکتے"[4]

وصولی مالگذاری کی خصوصی ذمہ داری کے علاوہ، چودھری کے کچھ ذیلی فرائض بھی ہوا کرتے، مثلاً مقدموں کے تعاون سے وہ تقاوی کے قرضوں کی تقسیم اور ان کی واپسی کی ضمانت کرتا تھا[5] ان سے قانون گوؤں کو قابو میں رکھنے کا کام بھی لیا جاتا، کیونکہ وہ قانون گوؤں کے دستخطی کاغذات موازنہ اور مقامی رسم و رواج کے متعلق اطلاعات کو دربار شاہی میں بھجوانے کے ذمہ دار تھے[6] چودھریوں کے معاوضوں کے شرحوں میں غالباً بہت زیادہ فرق ہوا کرتا تھا۔ بقول مرآۃ،

---

[1] دستورالعمل نویسندگی، اوراق 41 ب۔ 12 ب میں نقل کیے ہوئے نمونۂ حسابات برآمد میں پہلے چودھریوں کی رقوم کے تحت وصولیوں سے منہائی کی مختلف مدیں دکھائی گئی ہیں اور پھر مقدموں کی رقوم کے تحت ان کی تفصیلی تقسیم کی گئی ہے Pryer (1) صفحات 1-300 سورت کی نواحی مواضعات کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جاگیرداران جو ان پر بطور " Jaggea " (جاگیر) قابض ہیں "سال میں ایک بار منافع وصول کرنے کے لیے بھیجنے میں کوتاہی نہیں کرتے جو انہیں دیسی، (دیسائی) یا ٹھیکیدار کے ہاتھوں وصول ہوتا ہے جو گاؤں والے کو چوس لیتا ہے"۔ وغیرہ۔

[2] ملاحظہ ہو باب 6 کی فصلیں 4 و 8

[3] بایزید 350۔ یہ واقعہ 1574 - 5ء کا ہے جب بایزید چنار میں منعم خاں کے گماشتہ کی حیثیت سے تعینات تھا۔

[4] Mundy صفحہ 183

[5] ملاحظہ ہو باب 6 کی فصل 8 ۔

[6] ایسا جہانگیر کے فرمان میں درج ہے، I H R C (8) 1942ء، صفحات 168-89

اکبر کے زمانہ میں دیسائیوں کو پہلے مالگذاری کا 2 1/2 فیصد ملتا تھا جو بعد میں کم ہوکر 1 1/4 اور بالآخر 5/8 فیصد کر دیا گیا۔[1] ایک دوسری تصنیف کے حسابات کے نمونہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ چودھریوں کو مالگذاری سے جو گذارہ یا 'نانکار' کی چھوٹ ملا کرتی وہ زیادہ نہ ہوتی تھی۔[2] لیکن اس کا امکان ہے کہ اس کے قبضہ میں مالگذاری سے مستثنیٰ (انعامی) زمینوں کے وسیع رقبے رہتے ہوں۔[3] اس کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ وہ جب دوسرے زمینداروں کی ضمانت کرتا تو ان سے (مالگذاری کا) 5 فیصدی کمیشن لیا کرتا تھا۔[4]

قانون گوؤں اور چودھریوں کی تقرری اور برطرفی کے اختیارات کو اپنے پاس محفوظ رکھ کر شاہی انتظامیہ نے اپنے ہاتھ میں ایک ایسا اہم آلہ رکھ چھوڑا تھا جس کے ذریعہ وہ خالصہ کے باہر کی جاگیروں کے نظم و نسق کو تھوڑا بہت اپنے قابو میں رکھ سکتا تھا۔ لیکن ان مقامی عمال کے علاوہ جن کی ملازمتیں کم و بیش مستقل ہوتیں، دیگر شاہی عمال بھی ہوا کرتے جن کے حدود فرائض میں جاگیروں کے اندرونی حالات کی نگرانی شامل تھی۔

اولاً 'مالیات کا شعبہ تھا جس کا ہر صوبہ میں نمائندہ 'دیوان' کہلاتا۔ اس کے فرائض میں کسانوں پر جاگیرداروں کے مظالم کی روک تھام تھی۔[5] وہ کسی بھی جاگیر میں ہونے والی بدانتظامی کی اطلاع دربار شاہی کو بھیج سکتا تھا۔[6] خود اس کے ذمہ، جاگیرداروں یا ان کے عمال سے بادشاہ

---

[1] مراۃ (۱) ص 173 ، ضمیمہ ص 228 ،

منظر شاہجہانی' 185 میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ سہوان (سندھ) میں 'ارباب' کے گذارہ میں بھی ایسی تخفیف کی گئی تھی۔ اکبر کے آخری زمانہ میں ایک جاگیر کے تحت ارباب اور مقدم مالگذاری سے 5 فیصدی کا گذارہ پاتے تھے۔ عہد جہانگیری کے اوائل میں ایک جاگیردار نے اسے کم کرکے 2 فیصدی کر دیا۔

[2] دستور العمل عالمگیری، ورق 40ب میں مالگذاری کی مجموعی آمدنی 4038 روپیہ بیان کی گئی ہے جس میں سے دو چودھریوں کو صرف 120 روپیہ بطور نانکار دیا گیا۔

[3] I H R C، 1929، ص 83 - 86 میں پرگنہ بیل کے کاغذات کا تجزیہ ملاحظہ ہو۔

[4] Add. 6603 ورق 58 الف۔

[5] خاندیش کے دیوان کا مرسلہ پروانہ ملاحظہ ہو جس میں اس نے سربکلانہ میں اپنے گماشتہ کی تقرری کا اعلان کیا ہے (سنہ 2 جلوس عالمگیری) (دفتر دیوانی و مال ملکی ص 186)

[6] موازنہ بہ اخبارات 36/15 برار کے نائب دیوان کی مرسلہ ایک اطلاع کے لیے۔

کے جاری کیے ہوئے کسی بھی حکم کی تعمیل کرانے کا کام کیا جا سکتا تھا۔[1] چونکہ جاگیرداروں کے اپنے عاملوں پر دعوے بھی اسی کی کچہری میں فیصل ہوتے،[2] لہٰذا جاگیرداران اس کے بیحد دباؤ میں رہا کرتے۔

معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات اکبر اور جہانگیر کے تحت صوبہ کے دیوان کے ساتھ ساتھ ایک اور عہدہ دار مقرر کیا جاتا جس کی خصوصی ذمہ داری یہ ہوتی کہ وہ یہ دیکھیں کہ جاگیرداران اور ان کے عمال وصولیٔ مالگزاری کے معاملہ میں شاہی ضابطوں کی تعمیل کرتے ہیں۔ سنہ 24 جلوس اکبری میں جن عہدہ داران کی تقرری کی اطلاع ملتی ہے ان کی فہرست میں اس قسم کے کسی عہدہ دار کا اندراج نہیں ملتا۔[2 الف] لیکن چار سال بعد صوبیداران دیوان کے ساتھ ساتھ گجرات میں ایک اور اعلیٰ عہدہ دار امین کے نام سے مقرر کیا گیا۔[2 ب] ابوالفضل نے اس عہدہ کے حدود اختیارات و فرائض منصبی کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن اس کے فرائض واقعی میں کیا ہے، مظہر شاہجہانی کی ایک طویل عبارت اور دیگر متفرق حوالوں میں واضح طور پر درج ہیں۔ اس میں تجویز کیا گیا ہے کہ اس عہدہ دار کو کسی سرکار میں اپنی تقرری کے بعد اپنے گماشتوں کو ہر پرگنہ میں یہ معلوم کرنے کی غرض سے بھیجنا چاہیے کہ جاگیرداران یا مقامی عمال کسانوں سے معینہ شرحوں (دستور العمل) سے زائد تو نہیں وصول کر رہے ہیں۔ اگر اسے شاہی ضابطوں کی خلاف ورزی کی کہیں اطلاع ملے تو اسے اولاً جاگیردار کے گماشتوں کو مطلع کرنا چاہیے اور اگر وہ توجہ نہ کریں تو جاگیردار سے شکایت کرنی چاہیے اور اگر وہ بھی اس کے سدباب کا معقول انتظام نہ کرے تو اس کی خبر دربار شاہی کو بھیجنا چاہیے اور بادشاہ کے لیے یہ واجب ہوگا کہ وہ اطلاع پر سخت کارروائی کرے۔ مذکورہ تصنیف کی تحریر کے وقت (1634ء) بظاہر یہ تصور کرتے ہوئے کہ قانون گویان اس مقصد کے لیے کافی تھے (جو بقول مصنف غلط تھا) امین کے عہدہ پر تقرریوں کا سلسلہ بند ہو چکا تھا۔[2 ج] عہد شاہجہانی میں امین کے نام پر محصل مالگزاری کا عہدہ قائم ہو جانے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس آسامی پر فائز سابق عہدہ دار کی یاد اور بھی دھندلی

---

[1] اخبارات $\frac{37}{38}$

[2] موازنہ بہ ریاض الوداد، اوراق 3 ب۔ 4 الف، رقعات عالمگیری کانپور ایڈیشن، ص 141-42

[2] الف۔ اکبرنامہ (3) ص 282

[2] ب۔ اکبرنامہ (3) ص 403، طبقات اکبری (2) ص 368

[2] ج۔ مظہر شاہجہانی 187-90 دنیز 21-22، 51-2، 244۔

ہوگئی اور اس کے بعد بظاہر اس عہدہ کے دوبارہ تجدید کرنے کی کوشش نہ کی گئی۔

فوجدار شاہی حکومت کی فوج یا پولیس کی طاقت کا مظہر ہوا کرتا۔ اس کے خصوصی فرائض میں ایسے جاگیرداری یا خالصہ کے عاملوں کو امداد پہونچانا ہوتا جو مقامی شورش پسندوں، یعنی ادائے مالگذاری کے منکر زمینداروں اور کسانوں سے از خود نہ نمٹ سکیں۔[1] بظاہر بڑے جاگیرداروں کو شروع ہی سے اپنی جاگیریں کے حدود میں فوجدار کے اختیارات تفویض کیے جانے کا رواج تھا۔[2] عہد عالمگیری میں تو قطعی طور پر یہی عام روش تھی۔[3] اس طریقہ سے شاہی فوجدار کے اختیارات زیادہ کم ہوگئے تھے کیونکہ وہ ان جاگیروں کے معاملات میں دخیل ہونے کا مجاز نہ ہوا کرتا۔[4]

پوری مملکت مغلیہ میں وقائع نویسوں اور سوانح نگاروں وغیرہ کی ایک جماعت کا جال سا بچھا ہوا تھا، جنہیں ہم بجا طور پر خبر نویس کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔[5] بدعنوانیوں اور مظالم کے واقعات کی خبروں کا پہونچانا ان کے خصوصی فرائض میں تھا اور ان کے اس فرض کی واقعی انجام دہی کی مثالیں تحریروں میں ملتی ہیں۔[6] لیکن ان کے خلاف رشوت ستانی کی شکایتیں عام تھیں اور ان کے اندر محض اپنی ذاتی اغراض کے خاطر خبروں کے چھپانے یا شکایات کو پہنچانے کا میلان پایا جاتا تھا۔[7]

---

[1] آئین اکبری (۱) صفحہ 283، درالعلوم، ورق 57 ب، اخبارات 37/25 انشاء روشن کلام، اوراق 9 الف۔ب 31 الف۔ب، 40 ب، سیاق نامہ 67 ۔ 68 ۔

[2] اکبر اور جہانگیر کے عہد حکومت میں جاگیرداروں کے مامور کردہ فوجداروں کے حوالہ کے لیے ملاحظہ ہو بدایونی (3) صفحہ 94 ۔ 5 و مآثر رحیمی (3) صفحہ 43 16

[3] اورنگزیب "کلمات طیبات" ورق 125 الف میں کہتا ہے کہ "کسی جاگیر کی فوجداری چند محالوں کے جاگیردار کا مستقل حق ہوتی ہے"۔ جاگیرداروں کو فوجداری کے اختیارات کی منظوری کی مخصوص مثالیں ملاحظہ ہوں، انشاء روشن کلام، ورق 24 ب، اخبارات 36/15، 36/37، 39/24، 38/242، 47/321، 47/367، 48/207، احکام عالمگیری ورق 43 الف، ب میں۔

[4] موازنہ ہو، اخبارات 43/113، انشائے روشن کلام ورق الف۔

[5] تزک جہانگیری، 120 — 21۔

[6] منظر شاہجہانی 16، 174، 176 ۔ 7، اخبارات 37/38، انشاء روشن کلام اوراق 38 ب۔ 39 ب۔

[7] Bernier صفحہ 231 Manucci (2) صفحہ 452 برار کے نائب دیوان کی ایک اطلاع کا حوالہ اخبارات 36/15 میں ملتا ہے جس میں یہ الزام لگایا گیا ہے کہ "واقعہ نگار جاگیرداروں کے گماشتوں (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

حالانکہ نظری اعتبار سے کسان اور زمیندار، دونوں دربار شاہی، صوبیدار یا دیوان تک جاگیروں کے مظالم کے خلاف اپنی شکایت پہونچا سکتے تھے[1] لیکن ان کے ملازمین کا یہ ایک عام طریقہ تھا کہ وہ کسانوں کو دربار شاہی میں شکایت لے جانے سے بہ جبر باز رکھتے تھے[2]

شاہی حکومت جب کسی جاگیردار کی بدعنوانیوں پر سخت قدم اٹھانے کا فیصلہ کرتی تو یہ عام طور پر اس کی جاگیر کا تبادلہ کر سکتی تھی[3] یا کوئی متبادل جائداد دیئے بغیر اسے واپس لے سکتی تھی[4] جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے جاگیرداران اپنے عمال کی تقرری اور برطرفی کے معاملہ میں آزاد ہوا کرتے لیکن پھر بھی جاگیر کی تبدیلی یا ضبطی کے دباؤ کے تحت انہیں اپنے عمال کو تبدیل کرنے کی ہدایت دی جا سکتی تھی[5]

پس جاگیرداروں کو ان کے انتہائی مظالم کی جو سزائیں دی جاتیں وہ ہلکی تھیں۔ مصنف مظہر شاہجہانی اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ کسی جاگیردار کا اس کے مظالم کی بنا پر سہوان سے ملتان کا تبادلہ کوئی سزا نہ تھی۔ بلکہ اپنے غضب سلطانی کے بجائے اس کے لطف و کرم کی علامت تصور کرنا چاہیئے[6] وہ اس امر پر ماتم کرتا ہے کہ "آج بھی سہوان کے مظلومین اسی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

سے لے کر کچھ صحیح واقعات کی خبریں نہیں پہونچاتے" انشاء روشن کلام، حوالہ سابقہ میں رعد انداز خاں کا یہ بیان نقل ہے کہ لکھنؤ کے واقعہ نگار نے صرف اس سبب سے کہ اس کا "ایک سرکش" زمیندار اور اس نواح کے ایک جاگیردار کے گماشتہ سے ساز باز تھا خبر دی کہ ایک سوانح نگار نے ناجائز محصول وصول کیا ہے اور ان دونوں کو آخر الذکر عہدہ دار سے رنجش تھی۔

[1] مظہر شاہجہانی 174، ادب عالمگیری، ورق 33 الف، رقعات عالمگیری ص 119 بالکرشن برہمن، اوراق 55 ب۔ 57 ب، 63 ب 64 الف۔ وقائع اجمیر 217 ـ 19، رقعات عالمگیری، کانپور ایڈیشن ص 40-41)

[2] بالکرشن برہمن ورق 60 الف۔

[3] مظہر شاہجہانی 64، 177، Selected Documentis R C. ص 133، انشاء روشن کلام، ورق 12 الف۔

[4] رقعات عالمگیر، کانپور ایڈیشن، ص 40، 41

[5] بایزید، ص 248 ـ 50 وقائع اجمیر، 219، رقعات عالمگیر، کانپور ایڈیشن، ص 40 ـ 11

[6] مظہر شاہجہانی، 177۔

حال میں ہیں، جبکہ احمد بیگ خاں (جاگیردار) اور اس کا ذظالم (بھائی دولت (تنعم) اور عیش و عشرت (تلذذ) میں مستغرق ہیں۔[1]"

حکومت کے جاگیرداروں کے ساتھ اس نرم رویّہ کے ہوتے ہوئے، ان کے ظالمانہ رویّہ میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ مصنف مذکور لکھتا ہے کہ "اگر سہوان کا جاگیردار کا ایک سو انسانوں کو بھی ناحق ذبح کرڈالے یا انہیں لوٹ لے تو ایک متنفس بھی اسے منع کرنے والا نہیں۔ اور اگر کوئی غریب دربار شاہی ایسے دور دراز مقام کے سفر کی مشقت برداشت کرنے کے بعد وہاں اپنی شکایت پہونچ کر کوئی شاہی فرمان حاصل بھی کرلے تو اسے یہاں نہ قبول کیا جاتا ہے اور نہ اس کی تعمیل ہی ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے بیچارہ یہاں کی خبر پہونچانے والوں ('چغلان') کا شکار (لفظاً دشمن) ہوجاتا ہے جو اسے جلد ہی جاگیردار کے ہاتھوں تباہ کرادیتا ہے۔ اور یہاں ایک بھی عہدہ دار (صاحب صدستان) ایسا نہیں خواہ صدر، قاضی، قانون گو یا (تصحیح مابعد)، ارباب (چودھری) جو جاگیردار کو بروقت صحیح بات بتائے۔ برعکس اس کے ہر شخص اپنی غرض سے واسطہ رکھتا ہے۔ پس بلاشبہ ہرطرف نفسی نفسی کا شور و غل ہنگامۂ محشر کا منظر پیش کرتا ہے۔"[2]

---

[1] ایضاً، 180

[2] ایضاً، 173 _ 4

باب 8

مالگذاری کی معافیاں

ایسی معافیاں جن کے ذریعہ بادشاہ ایک مخصوص علاقہ میں اپنے مالگذاری زمین ودیگر محصولوں کے حقوق کو کسی معافیدار کے جانب اس کی حیات تک یا استمراراً منتقل کردیتے ہندوستان میں اپنی ایک پرانی تاریخ رکھتی ہیں[1] عہد مغلیہ میں ان معافیوں کو بعض اوقات 'ملک' اور 'املاک' (جو سلطنت دہلی کی اصطلاحیں تھیں)[2] اور 'سیورغال' (جسے مغل وسط ایشیا سے لائے

---

[1] گپتا بادشاہوں کے عہد حکومت اور اس کے مابعد دور میں اس قسم کی معافیوں کے لیے ملاحظہ ہو۔ آر ایس شرما کی تصنیف 'The Origin of Feudalism in India' (تقریباً 400 ـ 654) در 'Journal of Economics & Social History of the Orient', (1) حصہ 3 اکتوبر 1958، جس کی دوبارہ طباعت مصنف مذکور کی تصنیف 'Aspects of Political Ideas and Institutions in Ancient India' 202 وصفحات مابعد میں ہوئی ہے مسٹر شرما ان معافیوں کو عہد مغلیہ کی جاگیروں سے موازنہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر حقیقتاً یہ مدد معاش کی معافیوں کے مثل تھیں۔

[2] آئین اکبری (1) ص 196 میں معافی کی زمینوں کو مفہوم میں 'ملک' کے استعمال کا حوالہ ملتا ہے۔ تاریخ داؤدی، 44 بھی ملاحظہ ہو۔ املاک جو اس لفظ کے جمع کا صیغہ ہے زیادہ عام استعمال (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

تھے[1]) کہا جاتا۔ لیکن سرکاری و نیز دیگر تحریروں میں معمولاً استعمال ہونے والا اصطلاحی نام 'مدد معاش' (لفظاً :روزی کا سہارا) تھا[2]۔ ایک اور نام جو بعد میں استعمال ہوا 'ایمہ' امام کے جمع کا صیغہ تھا جس کے لفظی معنی تو (مذہبی) پیشوا کے ہوتے ہیں لیکن زبان کے بڑھے سے اس کا اطلاق معافی کی زمین پر ہونے لگا[3]۔ حکومت کا ایک علیٰحدہ شعبہ ان معافیوں کی دیکھ بھال کا ذمہ دار تھا۔ دربار شاہی میں اس شعبہ کا سربراہ اعلیٰ 'صدر' یا 'صدر الصدور' کہلاتا اور اس کی ماتحتی میں صوبائی 'صدر' (صدر جز) اور اس سے نچلی سطح پر وہ عہدہ داران جو 'متولی' کہلاتے ہوا کرتے تھے[4]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

تھا۔ ملاحظہ ہو عارف قندھاری 177 "تاریخ داؤدی، 38 ، بیکس ورق 31 ب۔ سلطنت دہلی کے زمانہ میں 'ملک' کے اسی مفہوم میں استعمال کی ایک مثال، برنی، تاریخ فیروز شاہی، بب، انڈ مطبوعہ ص 283 میں ملاحظہ ہو۔

[1] ملاحظہ ہو آئین اکبری (1) ص 198 وغیرہ۔ ابوالفضل اسی لفظ کو بار بار استعمال کرتا ہے حالانکہ سترھویں صدی میں یہ شکل ہی سے سننے میں آتا ہے۔ بابر کے ایک فرمان (I. O. 4433 (1) میں یہ لفظ بیشک استعمال ہوا ہے لیکن اس کے دو دیگر مشہور فرمانوں میں (ایک جو علیگڑھ یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے اور دوسرا جو The Oriental College Magazine ج (9) نمبر شمار 3 مئی 1933ء ص 121-2 میں طبع ہوا ہے) محض مدد معاش کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔

[2] ملاحظہ ہو آئین اکبری (1) 198 اکبر بادشاہ اور دوسروں کی معافیوں کے تقریباً تمام فرمانوں اور دیگر سرکاری تحریروں میں صرف اسی اصطلاح کو استعمال کیا گیا ہے۔

[3] معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً 'ایمہ' کی اصطلاح معافیداران کے لیے غالباً ان کے اعزاز کے طور پر استعمال کی جاتی تھی (عارف قندھاری، 177 ، بدایونی (1) ص 384 ، (2) ص 204 - 254 ، عباس خاں، ورق 112 ب، تزک جہانگیری 5 ، منظر شاہجہانی، 146 - 7 ، 158، 180 ، 190 ، فرمان عالمگیری، الہ آباد (2) 53 ، 55) بعد میں جبکہ 'ایمہ' کا لفظ معافی کی زمین کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا تو معافی داران کے لیے ایمہ داران (ایمہ پر قابض) کی اصطلاح گڑھ لی گئی (صادق خاں Or 174 ، ورق 186 الف، Or 1671 ، ورق 91 الف ، خافی خاں، (1) ص 735 نوٹ، فتوحِ عبریہ، اوراق 117 ب - 121 الف ، دستور العمل خالصہ شریفہ اوراق 59 ب - 60 الف Add. 6603 ورق 48 الف)

[4] اس محکمہ کی نوعیت اور تاریخ کا اس وقت تک بہترین مطالعہ Ibne Hasan, Central Structure of the Mughal Empire باب 9 میں ملتا ہے منظیہ انتظام (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

مدد معاش کے معافیداران کے نام جو فرمان جاری کیے جاتے ان میں عموماً ان کے حقوق اور مراعات درج رہتے تھے۔ اکبر کے ابتدائی عہد اور اس کے بعد کے بادشاہوں کے زمانہ تک اس اندراج کے لیے عبارت کا تقریباً ایک ہی ساختن مخصوص کر دیا گیا تھا اور وہ اس طور پر تھا: معافیداران زمین کی آمدنیوں (حاصلات) سے مستفید ہوں اور وہ مالگذاری زمین (مال وجہات) و نیز عمال سرکاری کے عائد کیے ہوئے چھوٹے چھوٹے محصول یعنی 'اخراجات' جن کی آگے تفصیل ہوا کرتی غرضیکہ جملہ "مالی ذمہ داریوں اور شاہی مطالبوں" (حقوق دیوانی اور مطالبات شاہی) کی ادائیگی سے مستثنیٰ تھے[1] بالفاظ دیگر، انہیں مالگذاری زمین کی وصولی اور اس کو اپنے پاس رکھنے کے جملہ حقوق عطا کیے جاتے تھے[2]

پس، معافیداران کو مدد معاش کی معافیوں کے ذریعہ کوئی ایسا حق جو خود حکومت کو پہلے

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

حکومت کی درمیانی تعاینعف میں صدر جزو اور متولی کے نام کے اندراجات عموماً نہیں ملتے۔ الہ آباد 1167 (عہد شاہجہانی) سے صدر جزو کا صوبجاتی صدر ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ موازنہ بہ نیز لاہوری (2) 365 ـ 66 متولی پرگنہ کی سطح پر ایک عہدہ دار ہوتا تھا جس کے ذمہ معافیوں کی نگرانی تھی (ملاحظہ مثلاً الہ آباد 851)

[1] جن ذمہ داریوں سے معافیدان مستثنیٰ تھے اس کی پہلی مستند فہرست اکبر کے 1567ء کے فرمان (جو علیگڑھ یونیورسٹی کی لائبریری میں بغرض نمایش موجود ہے) میں ملتی ہے۔ اس وقت سے مغلوں کے سرکاری دفاتر کے آخری زمانہ تک زمانوں میں اسی فہرست کو معمولی فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔

بہرحال، یہ تصور نہ کرنا چاہیے کہ معافیداران محصولوں سے کلیتہً مستثنیٰ تھے۔ انہیں 'مقرری اگر' نام کا ایک محصول جاگیردار کو ادا کرنا ہوتا تھا۔ اودھ کے علاقہ میں یہ واقعی کاشت کیے ہوئے ہر بیگھہ پر نصف روپیہ کے حساب سے تھا (الہ آباد۔ 5 ـ 1950ء) اورنگزیب نے اپنے عہد کے اوائل میں بعض دیگر محصولوں کے ساتھ اس کی وصولی کو بھی ممنوع قرار دیا تھا (راجہ رگھوناتھ کا پروانہ، الہ آباد۔ (2) 284 اور مرآة (1) 287 اور نیز ملاحظہ ہو الہ آباد 117) صدر ایک محصول 'صدرانہ' کے نام سے معافیداران پر عائد کرتا تھا۔ (الہ آباد، 1204 اور 1230) متولی کی بھی اپنی بالائی رقمیں ہوا کرتیں۔ الہ آباد (1) ان کے علاوہ کچھ اور محصول ہوا کرتے (الہ آباد 1204 اور 1230) ان دستاویزوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض اوقات وصول کرنے والے عمال ہی معافیداران کو ان محصولوں سے مستثنیٰ کر سکتے تھے۔

[2] ملاحظہ اودھ کے 1764ء کے ایک بیعنامہ میں شاہی حکم (سند) کے ذریعہ حاصل کی ہوئی (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

سے حاصل نہ ہو عطا نہ کیا جاتا تھا۔ وہ معینہ مالگذاری سے زائد طلب کرنے کا مجاز نہ ہوا کرتا۔ اکبر کے ابتدائی دور کے ایک فرمان میں کاشتکاروں کو "پیمائش (از قرار ساحت) کی رو سے اپنی زمین کی مالگذاری ادا کرنے کی "خصوصی ہدایت ملتی ہے[1] نہ ہی مدد معاش کا معافی دار کسانوں کے حقوق دخیلکاری میں مداخلت کرسکتا تھا۔ چنانچہ بعض فرمانوں اور ضمنی دستاویزوں میں 'رعیتی' (بصیغۂ کسان) اور خود کاشتہ ' (معافیداران کے بذات خود زیر کاشت) زمینوں کے اندراجات جداجدا ملتے ہیں[2] اور آئین اکبری میں محصل مالگذاری کے لیے ہدایت ہے کہ وہ معافیداران کو رعیتی زمینوں کو خود کاشتہ زمینوں کو تبدیل کرنے سے باز رکھیں[3] ہماری سترھویں صدی کی تحریروں میں از راہِ سرکشی کسانوں کے جانب سے معافیداران کو ادائے مالگذاری سے انکار کرنے کی چند مثالیں درج ہیں جن کی وجہ سے حکومت ان کی معافیوں کو دوسرے مواضعات میں منتقل کرنے پر مجبور ہوئی[4] گاؤں کا مکھیا یا مقدم بھی بظاہر معافیدار کا ماتحت نہ ہوا کرتا تھا، خواہ وہ ملی ہی موضع کا معافیدار کیوں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

ائمہ کی معافی اور مالگذاری زمین کی وصولی کے حق (حق انذخراج) کو ایک ہی چیز قرار دیا گیا ہے (الہ آباد 457)

[1] فرمان مورخہ 3 اکتوبر 1567ء جو علیگڈھ یونیورسٹی کی لائبریری میں بغرض نمائش موجود ہے۔

بقول مصنف مظہر شاہجہانی ص 180، معافیداران برخلاف جاگیرداروں کے کسانوں کے ساتھ نرمی برتا کرتے تاکہ وہ اپنی زمینوں کی کاشت کرسکیں۔ وہ انہیں قرضے بھی دیا کرتے اور اپنے حصّہ کی پیداوار کا تھوڑا حصّہ چھوڑ دیتے تھے۔ لیکن مصنف مذکور کی معافیداروں کے متعلق خوش خیالی کا یہ سبب بھی ہوسکتا ہے کہ وہ خود بھی ایک معافیدار تھا (ص 122)

[2] ملاحظہ ہو 966۔ 983ھ کا فرمان اکبری (الہ آباد (2)، 23 جس کی Or 1757، اوراق 39 الف۔ 51 ب، ایک نقل ہے) اور 983ھ کا فرمان (جو علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کی ریسرچ لائبریری، شعبۂ تاریخ میں عاریتاً موجود ہے) اور مودی کی تصنیف 'Parsees at the Court of Akbar' کا دستاویز نمبر (دستاویز کا متن نہیں بلکہ فوٹو پرنٹ، ملاحظہ ہو جس میں وہ حصّہ جس سے یہاں ہمارا تعلق ہے۔ حذف کردیا گیا ہے) آخر الذکر 27 نومبر 1596ء کی ایک سرکاری رپورٹ ہے۔ اس میں رعیتی زمینوں کا صرف رقبہ ہی نہیں بلکہ کسانوں کے نام اور ان کے زیر کاشت مختلف فصلوں کے رقبے بھی درج ہیں۔

[3] آئین اکبری (1)، ص 287۔

[4] الہ آباد 873 اور 1213 (دونوں عہد شاہجہانی کے)

نہ ہو۔[1]

اسی طور پر مدد معاش کی معافیوں زمینوں کے حقوق و زمینداری یا ملکیت پر کسی نہج سے بھی اثر انداز نہ ہوا کرتیں۔ یہ بات ان دستاویزات سے ظاہر ہوتی ہے جن میں معافیداران کو مذکورہ حقوق میں مداخلت سے منع کیا گیا ہے۔[2] ان میں سے درحقیقت ایک سرکاری حکم میں معافیداران کو ہدایت ہے کہ وہ مالکوں کو ان کا حق ملکیت لفظاً، حق مالکانہ ادا کرتے رہیں لیکن اس سے بظاہر مفہوم فصل میں مالک کے مقررہ حصہ کا ہے۔[3] معافیداران بعض اوقات، مالکوں کی مخالفت سے عاجز آکر اپنی معافیوں کو دوسرے مقامات پر منتقل کرا لیتے تھے۔[4]

مدد معاش کی معاشیوں کے بیگھوں کے متعین رقبوں میں دیئے جانے کا قاعدہ تھا۔[5] عہد اکبری

---

[1] فیضی سرہندی اوراق 148 الف۔149ب میں مندرج ایک واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقدم، معافیدار کی لاعلمی میں جبر رسانی کیا کرتے تھے۔ جب اکبر کا فیضی سرہندی کے موضع سے گذر ہوا تو اس نے وہاں رک کر مقدم سے اس موضع اور وہاں کے معافیدار کے متعلق تفصیلات معلوم کیں۔ وہ معافیوں کے متعلق ذاتی طور پر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ فریب یا رسوخ کے ذریعہ تو حاصل نہیں کی گئی ہیں۔ بیکس ورق 31 ب میں مقدم کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ معافیدار کو بغیر منظوری کاغذات (اسناد) حاصل کیے ہوئے کھیتوں سے کچھ نہ ہٹانے دیں۔ الہ آباد۔ 881 ، میں مقدم اور معافیداران میں تعلقات کی ناخوشگواری کی بنا پر ایک موضع کی معافی کو دوسری جگہ منتقل کرا لینے کا ذکر آیا ہے۔

[2] الہ آباد 782 اور 1203۔

[3] الہ آباد 1203۔ ان دونوں حقوق میں فرق کو اٹھارہویں صدی کی ایک تحریر، الہ آباد، 457 (1764ء) میں نمایاں طور پر ظاہر کیا گیا ہے جس میں" ملکیت اور زمینداروں یعنی ستارہی" اور اسی دو بیگھہ زمین میں حقوق" معافی ائمہ" کے تحت مالگذاری زمین کی وصولی کے حقوق کے مختلف اوقات میں فروختگی کا حوالہ ملتا ہے۔

[4] الہ آباد، 1190۔

[5] بہرحال کچھ کچھ استثنائی صورتیں بھی ہوا کرتیں۔ بابر کے دو فرامین (I.O. 4438 (ا) اور علیگڈھ) میں صرف موضع کا نام ملتا ہے اور اول الذکر میں "جمع رقمی" (تخمینہ شدہ مالگذاری) بھی درج ہے۔ جالندھر کے متعلق اکبر کے 1567ء کے فرمان (یونیورسٹی لائبریری، علیگڈھ) میں رقبہ نہیں مگر موضع کا نام اور رقبہ کی صراحت ملتی ہے۔ گجرات میں حویلی پٹن کے ایک موضع کے ایک قاضی کے نام معافی کے متعلق (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کے دوران، گز الٰہی کے رائج ہونے کے وقت ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ معافی کے بیگھوں کو ناپنے کے لیے مسلسل یہی گز استعمال ہونے لگا[1] جب بھی کسی نئی معافی کا اجراء ہوتا تو فرمان میں مقامی افسر کے نام معمولاً یہ ہدایت ہوا کرتی کہ فلاں موضع یا پرگنہ میں جس کی صراحت فرمان میں ہوتی "مذکورہ رقبہ کی پیمائش کر کے اس (یعنی معافی کی زمین) کا چک بنا دیا جائے۔"[2] جاگیرداران اور عمال مال کو قدرتاً یہ فکر رہا کرتی کہ معافیداران اپنے حقوق کو اپنی معافی کے رقبہ کے اندر محدود رکھیں اور اس سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

35 جلوس عالمگیری کے فرمان میں رقبہ کو نظر انداز کرتے ہوئے موضع کے صرف 'جمع' اور 'حاصل' (مالگزاری کی واقعی وصولی) درج کیے گئے ہیں (1698 I.O.) بعض صوبوں میں معافی کے رقبوں کو بیگھوں میں نہیں بلکہ دوسری اکائیوں میں دکھایا گیا ہے، مثلاً دکن میں، چوا‌ہ کی اکائی استعمال کی گئی ہے۔ (Selected Documents of Shahjahan's Region, 189-90) اور کابل میں 'قطبۂ' (ہل کی زمین) (قطعہ آراضی جسے پورے سال میں آٹھ بیل جوت سکیں۔ مترجم) (I H R C (19) 1942 ، 242 - 3

[1] پچھلی معافیوں کے رقبہ میں اکبر نے بانس کے 'طناب' کے رائج ہونے پر (بقدر 3 /133 فیصد) اور گز الٰہی کے رائج ہونے پر (5 /10 فیصد) کمی کر دی۔ یہ بات I.O. 4430 : مبران 7 / 25 اور 55 پر مندرج عبارت ظہری سے ظاہر ہوتی ہے۔ الہ آباد' 154 ' 879 اور 1177 بھی ملاحظہ ہو۔ بقول صادق خاں (Or. 174 ورق 186 الف ' Or. 167 ورق 91 الف، خافی خاں (1) ص 734 - 5 نوٹ) حالانکہ سترھویں صدی کے وسط تک مدرۂ شاہجہانی (دو دہا ئے گز) پر مبنی بیگھۂ دفتری عام زمینوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا لیکن "ائمہ داروں کے نام شاہی معافیوں کے فرامین میں بیگھۂ الٰہی کا ذکر آیا ہے۔" حقیقت میں شاہجہاں اور اورنگزیب کے عہد حکومت کی تحریروں میں معافی کے بیگھوں کی پیمائش کے لیے گز الٰہی کے ہدایت مسلسل طور پر ملتی ہے (الہ آباد 783 ' 881 ' 1190 وغیرہ دار العلوم ورق 138 الف۔ ب' بیکس اوراق 140 الف 41 الف تھی) ملاحظہ ہو نیز ضمیمہ الف۔

[2] لفظ 'چک' کے لیے ملاحظہ ہو ایلیٹ، "Memoirs & C." (2) ص 79 اس کا عام مفہوم زمین کی اراضی کا ہے۔ عمال' معافیدار کی زمین کی پیمائش کرنے کے بعد ایک تحریر چک نامہ مرتب کرتے جس میں پیمائش کی ہوئی زمین کا رقبہ اور حدود اربعہ درج کیا جاتا۔ سترھویں صدی کی ایسی چند تحریریں ابھی تک محفوظ ہیں۔ الہ آباد' 36 ' 869 ' 873 ' 874 ' 879 ' 881 ' 1190 I.O. 4438 (59) موازنہ بہ نیز 6603 ورق 58 ب۔

زائد پر قبضہ (توفیر) نہ کریں[1]

اکبر کو معلوم ہوا کہ مدد معاش کی معافیوں کو دور دور منتشر مواضعات میں دیئے جانے کا طریقہ میں زیادہ خرابیوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔ ایسی صورت میں بعض اوقات معافیداران دھوکہ دے کر ایک ہی معافی کے تحت دو یا زائد مقامات پر زمینیں حاصل کر سکتے تھے اور ساتھ ساتھ کسی معمولی گاؤں کے چھوٹے معافیداران اور خالصہ اور جاگیرداروں کے ملازمین کے مظالم کے شکار ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اکبر نے 1578ء میں موجود معافیوں کو مخصوص مواضعات میں مرکوز کر دینے کا فیصلہ کیا اور حکم دیا کہ جملہ معافیاں انہیں مواضعات کی زمینوں سے دی جائیں[2] اس امر کی کچھ سند ملتی ہے کہ اگلی صدی میں مدد معاش کی معافیوں کے لیے بعض مواضعات کو مخصوص کرنے کا طریقہ مستقل ہو گیا[3]

---

[1] الہ آباد 179 - ملاحظہ ہو الہ آباد 36 بھی۔

مظہر شاہجہانی 7-146 میں عہد جہانگیری کے اواخر میں سیوان کے ایک جاگیردار کے ملازمین کے ظالمانہ طریقوں کا ذکر آیا ہے جس نے زمین کی از سر نو پیمائش کر کے مالگذاری طلب کی (یعنی معافی سے زائد زمین کی) معافیداران نے اس کی شکایت دربار تک پہونچائی اور جاگیردار نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے اپنے عمال کے نام احکام (پروانچے) جاری کیے کہ پہلے سے معافی کے جو حدود چلے آ رہے ہیں ان کا احترام کیا جائے۔

[2] اکبر نامہ (3) 240، آئین اکبری (1) 198، بدایونی (2) ص 254 خوش قسمتی سے اکبر کے حکم کی اصل عبارت الہ آباد، 24 میں محفوظ ہے۔ یہ 13 جون 1578 کو جاری کیا گیا تھا۔ اس میں درج تھا کہ وہ تمام مواضعات جنہیں معافیداران" مساجد، چاہات، مکانات، چوپال (پنچایتی سائبان)، باغات وغیرہ کے مالک ہوں، معافیوں کے لیے مخصوص کر دیئے جائیں تا کہ معافیداران کو اپنے غیر منقولہ مقبوضات سے ہاتھ نہ دھونا چاہیے۔ لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ اس پر ہمیشہ توجہ دی جاتی تھی یا دی بھی جا سکتی تھی یا نہیں۔ کم از کم بدایونی کے قول کے مطابق یہ قاعدہ معافیداروں کے لیے سخت پریشان کن تھا۔

[3] پس بعض انتظامی ضوابط ناموں میں مثلاً سیاق نامہ، 40 وغیرہ اور خلاصۃ السیاق، اوراق 78ب 82ب میں متعدد مواضعات کو "در وبست" ائمہ نظام، یعنی کلیۃً شاہی ائمہ کی معافیوں کے زمرہ میں شامل کر کے مالگذاری کی تشخیص والے مواضعات کی فہرست سے خارج کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ مرآۃ (1) ص 26 بھی جس میں گجرات کے 103 مواضعات کو مدد معاش کی معافیوں سے متعلق بتایا گیا ہے۔

بقول ابوالفضل، مستقل قاعدہ یہ تھا کہ معافی کی نصف زمین پہلے سے زیر کاشت زمین پر اور بقیہ نصف قابل کاشت ویرانوں پر مشتمل ہو۔ قابل کاشت ویرانے موجود نہ ہونے کی صورت میں معافی کے رقبہ میں ایک چوتھائی کی کمی کر دی جاتی تھی۔[1] متعدد دستاویزات میں یہ واضح صراحت ملتی ہے کہ معافی کا کس قدر رقبہ قابل کاشت ویرانہ اور کس قدر کاشت کی ہوئی زمین پر مشتمل ہوگا۔[2] لیکن بعض دستاویزوں میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ مسلّم معافی کو ایسے قابل کاشت ویرانوں پر مشتمل ہونا چاہیے جن پر پہلے سے مالگذاری ادا نہ کی جا رہی ہو۔[3]

غالباً معافیداران، اپنی معافی کے ویرانوں پر عموماً اپنی 'خودکاشتہ' اراضیات قائم کیا کرتے۔ اس زمرہ کی (خودکاشتہ) آراضیات کا اصل معافیوں میں نہیں بلکہ صرف تصدیقی احکام میں ذکر آتا ہے۔[4]

---

[1] آئین اکبری (۱) ص 199

[2] ان کے لیے علی الترتیب 'افتادہ' اور 'مزروعہ' کی اصطلاحیں تھیں۔ خاص طور پر ملاحظہ ہو شیر شاہ کا فرمان مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین (۹) نمبر شمار ۳، ص 121-2 اور الٰہ آباد 318، اکبر کا فرمان، الٰہ آباد (2) 23 (Or 1757 اوراق 39 الف۔ 51 ب) اور اسی بادشاہ کا 983ھ کا فرمان (ریسرچ لائبریری، شعبہ تاریخ، مسلم یونیورسٹی میں عاریتہً موجود) الٰہ آباد 869 وغیرہ۔

[3] معیاری فقرہ "زمین افتادہ لائق زراعت خارج جمع" تھا۔ ملاحظہ ہو J.O. 4438 (3) Or 11697 الٰہ آباد 874، 881، نگارنامۂ منشی اوراق 117 الف 118 الف، Bodl. ورق 91 الف J.O. 4435، دارالعلوم، ورق 38 الف۔ ب، بیکس ورق 31 ب (افتادہ کے لیے 'بنجر' استعمال ہوا ہے)۔ ویران زمینوں کی معافیوں پر یہ اصرار کوئی مغلوں کی جدت نہ تھی۔ موازنہ بہ فیروز شاہ تغلق کے ہمعصر عین الملک ملتانی کے خطوط انشا ماہرو، جس کا ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے حوالہ دیا ہے۔ I H R C 21 (1944ء) ص 61
معلوم ہوتا ہے کہ عہدہ داران بھی اس بات کی فکر رکھتے تھے کہ معافیداران کاشتکاروں کو مالگذاری ادا کرنے والی زمینوں سے ہٹا کر خود اپنی کاشت کو نہ بڑھائیں۔ چنانچہ بیکس ورق 31 ب پر ایک مقدم کا یہ اقرار موجود ہے کہ جب تک بقیہ زمینوں پر ہل نہ چل جائے گا وہ 'املاک' (یا مدد معاش) کی زمینوں کی تخم ریزی نہ ہونے دے گا۔

[4] مثلاً اکبر کا فرمان، الٰہ آباد (2) 23 (Or 1757، اوراق 39 الف۔ 51 ب) اور 983ھ کا فرمان (جو ریسرچ لائبریری شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی میں عاریتہً موجود ہے) ان میں معافی کی زمین کو 'افتادہ' اور 'مزروعہ' میں تقسیم کیا گیا ہے اور پھر 'مزروعہ' کو رعیتی اور 'خودکاشتہ' میں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ 'خود کاشتہ' زمینیں بیشتر معافیداران کے نصب کردہ باغات پر مشتمل رہتی ہوں[1]
اورنگزیب کے ایک فرمان میں مدد معاش کو ایک مستعار شئے (عاریت) بتایا گیا ہے[2] یعنی یہ معافیداران کو مکمل مالکانہ قبضہ کے ساتھ نہ دی جاتی بلکہ جب تک بادشاہ کی مرضی ہوتی یہ ان کے تصرف میں رہ سکتی تھی۔ کسی بھی فرمان میں کبھی اس کی مدت کی صراحت نہیں کی گئی لیکن معمولاً معافیداران پوری مدت حیات تک بلا کسی مزاحمت کے قابض رہا کرتا لیکن بادشاہ کو اسے کسی وقت بھی واپس لینے کا اختیار رہتا تھا۔ عہد اکبری میں مکمل طور پر معافیوں کی واپسی اور تخفیف کا عمل دیکھنے میں آیا ایسا یا تو اس شبہ کے تحت کیا گیا کہ معافیوں رشوت یا دھوکہ سے حاصل کی گئی ہیں یا محض اس سبب سے کہ حکومت کی عام پالیسی بعض زمروں کے معافیداروں کے خلاف تھی[3] یہ حق جہانگیر کے اپنے باپ کی دی ہوئی تمام معافیوں کی

---

[1] ابوالفضل ہمیں یقین دلاتا ہے کہ امن وامان کی موجودگی کے باعث "معافیداران نے "اپنی زمینوں میں باغ نصب کیے اور نفع کثیر حاصل کیا" (آئین اکبری (1) ص 199) مودی کی تصنیف 'Parsees at the Court of Akbar' کے دستاویز نمبر میں 'خود کاشتہ' زمین کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ان میں سے بیشتر پر کھجور ناریل اور دیگر اقسام کے درخت نصب تھے۔

[2] فرمان جو چونتیسویں سال جاری ہوا، الہ آباد (3) 53 اور 55

[3] آئین اکبری (3) ص 231 - 4 آئین اکبری (1) ص 198 - 9 بدایونی (1) ص 204 - 5، 274-7، 315، 343، 168/ فیضی سرہندی اوراق 147 الف۔ 149 الف، 185 الف 186 الف۔ عباس خاں ورق 86 الف۔ ب۔

40ء جلوس اکبری میں خانخاناں کے جاری کیے ہوئے ایک حکم سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکم شاہی اس سال گجرات میں مدد معاش کی معافیوں کو بقدر نصف کم کر دیا گیا تھا (مودی کی تصنیف 'Parsees at the Court of Akbar' کا دستاویز نمبر 3)

ضمناً تحریر ہے کہ معافیوں کے حصول، خصوصاً منظوری سے زائد کے سلسلہ میں معافیداران میں رشوت و فریب کا رواج اس قدر عام ہو گیا تھا کہ شیر شاہ کو فرامین میں جعل سازی کے نقصانات سے حکومت کو محفوظ رکھنے کی غرض سے خاص اقدامات کرنے پڑے۔ (عباس خاں، اوراق 112 ب۔ 113 الف) اورنگزیب کو یہ اطلاع دی گئی کہ معافیوں کے سرکاری کاغذات (یاداشت ائمہ مدد معاش) میں بھی جعل سازی کی گئی ہے (اخبارات $\frac{47}{323}$

تصدیق کرنے کے عمل میں بھی مضمر تھا[1] دورشاہجہانی میں واقعتۃً اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ اس وقت تک جتنی معافیاں دی جاچکی ہیں ان کی جانچ کرکے غیرمستحق لوگوں سے معافیاں واپس لے لی جائیں[2]۔ منظرِشاہجہانی سے پتہ چلتا ہے کہ صدروں کو ہدایت تھی کہ وہ ایسے لوگوں کی تمام معافیوں کو جو فوت یا معذور ہوگئے ہوں جنہوں نے ایک ہی معافی کی بنیاد پر دوسری جگہ زمینوں پر قبضہ کرلیا ہو یا جنہوں نے ابتداءً ہی معافی کو فریب و جعل کے ذریعہ حاصل کیا ہو ضبط کرکے خالصہ میں شامل کرلیں[2] الف مگر اس کے ساتھ ساتھ اس میں یہ بھی مطالبہ ہے کہ دوسرے معافیداروں کو جاگیرداران کی زیادتی سے محفوظ رکھنے کی تدابیر اختیار کی جائیں جو اکثر ان کی معافیوں کو ضبط کرتے ہیں اور ان پر مختلف بہانوں سے لگان عائد کرتے ہیں[2] ب

مدد معاش کی غیرمالکانہ نوعیت کا ایک مزید ثبوت یہ ہے کہ اس کے حقوق قبضہ کو معافیدار نہ تو منتقل کرسکتا تھا اور نہ فروخت[3] اسی طور پر بغیر شاہی احکام کے یہ حقوق ورثاء کو نہ پہونچ سکتے تھے

---

[1] تزکِ جہانگیری ص 21 اورنگزیب نے بھی ایسا ہی حکم جاری کیا تھا جس کا حوالہ ملاحظہ ہو راجہ رگھوناتھ پرشاد کے پروانہ مندرجہ الہ آباد (2) 284 میں۔

[2] لاہوری (2) 365–6، صادق خاں، 174 Or. 10، اوراق 103 ب 104 ب، Or. 1671 ورق 56 ب - 57 الف۔ یہ کارروائی عہد حکومت کے سترھویں برس تجویز کی گئی تھی مگر کامیاب نہ ہوئی۔ شاہجہاں کی منظورِ نظر بیٹی جہان آرا آگ سے بری طور پر جل گئی۔ توہم پرست باپ نے اس سانحہ کو معافیداروں کی بددعاؤں کا نتیجہ تصور کرتے ہوئے اپنے حکم کو عملاً منسوخ کردیا۔

[2] الف۔ منظرِشاہجہانی، 192 -

[2] ب - ایضاً 191 - 2 اور 158 بھی

[3] ایک عدالتی فیصلہ (جنوری 1666ء) میں واضح طور پر درج ہے کہ "قانون کی رو سے (شرعاً) مدد معاش کی زمین قابل انتقال نہیں (قابل تملیک نیست)" (الہ آباد 1189) سرکاری ضابطہ کی رو سے ائمہ کی زمینیں فروخت نہیں کی جاسکتیں " (Add. 6603، ورق 48 الف) اٹھارہویں صدی میں مغلیہ انتظامیہ کے انحطاط کے بعد قدرتاً اس ضابطہ کی تکمیل نہ کرائی جاسکی اور حقوق مدد معاش کے بیعنامے آزادی سے کیے جانے لگے (ملاحظہ ہو مثلاً الہ آباد، 457، 1769ء کا۔

لیکن گو کہ معافیداران اپنے حقوق کے (قطعی) انتقالنامے نہ کرسکتے تھے لیکن (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اکبر اور جہانگیر کے زمانوں میں ان حقوق کی وراثت کا کوئی ضابطہ نہ تھا اور ورثاء کو معافی کی تجدید کرانے کے لیے درخواست دینا ہوتا اور انہیں معمولاً سابقہ معافی کا صرف ایک جزو ہی منظور ہوا کرتا۔[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

انہیں ان زمینوں کو خود اپنے قبضہ کی مدت تک کے لیے کسی کو منتقل کرنے میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ چنانچہ ایک اتنے پرانے یعنی 1596ء کے دستاویز الہ آباد، 296 میں مدد معاش کے معافیداروں کی ایک جماعت کا یہ اعلان ملتا ہے کہ انہوں نے منجملہ اپنی کل معافی کے 29 بیگھہ زمین مسمی میاں حمید الدین کو 'خصمانہ' کی خدمات کی انجام دہی کے قرار پر یعنی ان کے باقی زمین کی نگہداشت کے معاوضہ میں منتقل کیا۔ میعاد انتقال وہی تھی جو منتقل کنندگان کی موضع میں مدد معاش کی مدت تھی۔" (موازنہ بہ، الہ آباد، 279 اور 280) چنانچہ حمید الدین نے اس زمین پر مالکانہ حقوق نہ قائم کیے۔ معافیداران اپنے حقوق کو ایک سال یا اس سے زائد مدت کے لیے پٹہ یا ٹھیکہ پر بھی اٹھانے کے مجاز تھے (الہ آباد 892 اور 1230) لیکن معافی کی واپسی یا تبادلہ کی صورت میں قیاس ہے کہ پٹہ یا اجارہ کالعدم ہو جاتا تھا۔

[1] آئین اکبری (1) صفحہ 287 میں محصل مالگذاری کو متوفی یا معذور کی معافی کو منسوخ کرنے (بازیافت) کی ہدایت ہے۔ اس میں اس فیصلہ کی بھی اطلاع ہے (1) صفحہ 199) "اگر کوئی معافی متعدد اشخاص کے نام ہو اور ضمن میں ان کے حصوں کی صراحت نہ کی گئی ہو تو ان میں سے کسی ایک کے فوت ہو جانے کی صورت میں 'صدر' اس کے حصہ کا تعین کر کے اسے خالصہ میں اس وقت تک کے لیے شامل کرلے جب تک کہ متوفی کے پسماندگان (ورثا) خود (یا اپنے معاملہ) کو عدالت میں نہ پیش کریں"۔ ملاحظہ ہو فیضی سرہندی کا بیان کہ اپنے باپ کے انتقال کے بعد اس نے اس کی معافی کو از سر نو کیونکر حاصل کی (اوراق 139 ب - 141 ب) اکبر کو بظاہر اس بات پر تعجب تھا کہ باپ کی پوری معافی بیٹے کے نام کر دی گئی (اوراق 148 الف - 149 الف) میر فتح اللہ شیرازی کے شقدار کے معافیداران کے "لاپتہ" ہونے (یعنی موت) کی بنیاد پر) "بیواؤں اور یتیموں" سے معافیوں کو واپس لے لینے کے سلسلہ میں موازنہ بہ نیز بدایونی (2) صفحہ 368۔ جہانگیر کے ایک فرمان میں بہار کی 3500 بیگھوں کی ایک معافی کا جس کا قابض مر چکا تھا ذکر آیا ہے اس میں سے محض 1000 بیگھہ کی معافی دوبارہ منظور ہوئی 700 بیگھہ بیوہ کو 300 بیگھہ بیٹے کو جو دربار میں موجود تھے۔ دوسرے لڑکے کے متعلق جس نے ابھی تک اپنا حق پیش نہ کیا تھا کوئی فیصلہ نہ ہوا (I H R C (26) (2) صفحہ 3 - 4) سنہ 3 جلوس شاہجہانی کے ایک پروانہ کا تعلق ایک ایسی معافی سے ہے جو 1571ء میں ابتداءً پنجاب کے پرگنہ بٹالہ میں دی گئی تھی۔ جن اشخاص کے نام یہ دی گئی تھی وہ سب اب فوت ہو چکے تھے۔ لہٰذا سابقہ صدروں نے منجملہ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

شاہجہاں کے عہد میں پہلی بار ایسے ضابطے سننے میں آتے ہیں جن کی رو سے وارث کو براہ راست ترکہ کے ایک جزو میں وراثت پانے کی اجازت ملی۔ راجہ رگھوناتھ دیوان نے اپنے ایک پروانہ میں جو [3] جلوس عالمگیری میں جاری کیا گیا، شاہجہاں اور اوائل عہد عالمگیری کے احکام کا خلاصہ بیان کیا ہے[1] شاہجہاں نے اپنے عہد حکومت کے پانچویں برس ایک حکم جاری کیا جس کے تحت تیس بیگھہ یا اس سے کم کی تمام معافیاں معافیدار کی وفات پر اس کے ورثاء میں مسلم طور پر تقسیم کی جانے لگیں اس سے زائد کی معافی ہونے کی صورت میں رقبہ کا نصف ورثاء میں تقسیم ہوتا اور بقیہ نصف اگر ورثاء دربار میں اس کے متعلق اپنی اہلیت (استحقاق) ثابت کر کے اس حصہ کی بھی سند نہ حاصل کریں تو واپس لے لیا جاتا۔ اٹھارھویں سال کے ایک حکم کے بموجب صرف اس صورت میں کہ معافیدار کے نام کے بعد "معہ اس کی اولاد" کے الفاظ درج ہوں، ورثاء کو نصف معافی دی جاتی تھی ورنہ پوری معافی واپس لے لی جاتی تھی[2] اورنگزیب نے اپنے عہد حکومت کے شروع میں اس شرط کو منسوخ کر کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

107 بیگھوں 8 بسوؤں کے 49 بیگھہ کو واپس لے کر بقیہ کو متوفی کے ورثاء میں دوبارہ تقسیم کر دیا تھا۔ ورثاء نے اب دوبارہ عرضداشت پیش کی۔ چنانچہ ان کے لیے واپس لیے ہوئے حصہ (اصطلاحاً: بازیافت متوفی) کی بھی منظوری کا حکم دیا۔ (7) 4438 J:O.

[1] الہ آباد (2) 284 مورخہ 10 رجنوری 1661ء

[2] اس کی مزید تائید ادب عالمگیری ورق 155 ب سے ہوتی ہے۔ لاہوری (2) ص 366 میں بظاہر اسی حکم کے حوالہ سے بتایا گیا ہے کہ کسی معافی کے فرمان میں الفاظ "معہ اولاد" کی موجودگی کی صورت میں گویا کہ پوری معافی لڑکوں کے نام بحال کرنا ضروری ہوتا تھا۔ لیکن ایسا غالباً سہو کتابت کی وجہ سے ہے۔ فرامین میں الفاظ "معہ اولاد" نسبتاً بہت کم استعمال ہوئے ہیں۔ یہ الفاظ ہمارے مطالعہ کی حد تک اکبر کے 163ھ کے فرمان، جہانگیر کے اکیسویں برس کے فرمان (متن مطبوعہ، ہودی والا کی تصنیف Studies in Parsi History ص 175 جلد کے خاتمہ پر فوٹو کاپی) مجموعہ صدیقی، Br. M. Royal 168 (23) ورق 17 الف۔ ب میں مندرج ایک معافی پر حکم کے نمونہ، اور سنہ 40 جلوس عالمگیری کے سنگم نشان (IHRC 19، 1942، ص 9-242) میں استعمال کیے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں کے حکم کے سخت شرائط کی تعمیل سے عام طور پر گریز کیا گیا ہے کیونکہ رگھوناتھ پرشاد کے پروانہ میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ مقامی صدروں (صدر جزو) نے بعض صورتوں میں ورثاء کو اصل معافی کا نصف سے زائد اور بعض اوقات (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اپنے تیسرے سن جلوس میں شاہجہاں کے پانچویں سال کے حکم کو نافذ کیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ورثاء کو پوری معافی دیئے جانے کی حد اب 20 بیگھہ مقرر کی گئی۔ اس سے زائد کی تمام معافیوں کا نصف بجز اس صورت میں کہ ورثاء دربارسے اس کے متعلق ازسرنو معافی حاصل کرلیں، بدستور سابق واپس لے لیا جانے لگا۔

عالمگیر کے چونتیسویں برس (1690ء) کے ایک فرمان کے ذریعہ، مدد معاش کی معافیاں کلیتہً موروثی قرار دی گئیں۔ اس میں اعلان کیا گیا ہے کہ اب سے قدیم اور جدید معافیداروں (ائمہ عظام) کی زمین جو باضابطہ فرمانوں کے ذریعہ دی گئی ہوں، بغیر کسی خسارہ یا تخفیف کے مکمل طور پر متوفی معافیداران کے ورثاء کے زیر تصرف نسلاً رہے گی۔" لیکن فرمان میں تاکیداً کہا گیا تھا کہ چونکہ مدد معاش ملکیت نہیں بلکہ صرف ایک شے مستعار (عاریت) ہے، لہٰذا اس کی وراثت شاہی احکام کے تابع ہوگی نہ کہ احکام شریعت کے چنانچہ مدد معاش کی وراثت براہ راست پوتے کو اس کے دادا کے پہلے باپ کے فوت ہوجانے کی صورت میں پہونچتی تھی اور لڑکی اپنی شادی کے بعد یا ایسی صورت میں کہ اس کی کفالت کا کوئی اور ذریعہ ہو محجوب الاثاث ہوجاتی تھی اور یہ بھی قاعدہ تھا کہ بیوہ اپنے متوفی شوہر کی معافی کو تاحیات اپنے پاس رکھ سکتی ہے۔ اس کے مرنے پر یہ اس کے متوفی شوہر کے ورثاء[1] کو منتقل ہوگی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

مسلم منظور کیا۔ بعد کے صدروں نے اس نوعیت کی معافیوں کو واپس لینے کی کوشش کی لیکن اورنگزیب نے اپنے عہد حکومت کے تیسرے برس اس کی ممانعت کردی۔

[1] الہ آباد (2) 53 اور 55 (زمانوں کی دو نقلیں) ایسے لڑکے کے بچوں کو جو اپنے باپ کے پہلے مرگیا ہو ترکہ میں حصہ دینا شریعت ہی کے نہیں بلکہ دستور سابقہ کے بھی خلاف تھا۔ سنہ 18 جلوس شاہجہانی کے حکم کے تحت جس کا خلاصہ راجہ رگھوناتھ کے فرمان میں موجود ہے پوتے کی وراثت صرف اس صورت میں کہ پہونچنے کا مفہوم نکلتا ہے جب فرمان میں معافیدار کے بعد "معہ اولاد" کے الفاظ موجود ہوں۔ ایک ایسے معاملہ کی تحریر ملتی ہے جس میں ایک شخص نے جو شاہجہاں کے زمانہ میں اپنے دادا کی معافی کے ترکہ سے محروم کردیا گیا تھا 1697ء میں اپنے حق کا دعویٰ کیا۔ یہ دعویٰ بظاہر اس بناء پر منظور نہ کیا گیا کہ اورنگزیب کے 1690ء کے حکم کا نفاذ پچھلے زمانہ سے نہ تھا (الہ آباد 1228 و 1229)

نظری طور پر مدد معاش کی حیثیت "خدا کی غریب و مسکین (مخلوق) کے گذران" کے لیے کارِ خیر کی تھی[1] اہل ملازمت و تجارت جن کے پاس معاش کے دیگر ذرائع موجود ہوا کرتے وہ اصولاً ان معافیوں کو نہ پا سکتا تھا[2] بقول ابوالفضل یہ معافیاں چار زمرہ کے لوگوں کے لیے مخصوص تھیں، اہل علم، (آگہی جویاں) "عبادت گذار در رنج کشان خویشتن گداز" معذورین" (درماندگان تہی دست") جو کسب معاش کی صلاحیت نہ رکھتے ہو اور عالی نسب اشخاص (بزرگ زادگان") جو اپنی بے عقلی ("کم دانشی") سے کوئی کام نہ کرتے ہوں[3] مسلم شرفاء کی خواتین کو بھی اکثر یہ معافیاں ملا کرتی تھیں[4] لیکن وہ غالباً ابوالفضل کے معینہ تیسرے زمرہ میں آتی تھیں۔ مذکورہ چار زمروں کے علاوہ بھی کچھ معافیداران ہوا کرتے جن کی تعداد غالباً بہت مختصر تھی۔ گجرات کی ایک معافی سے متعلق

---

[1] فرمان عالمگیری 1690، وکار یا چہ ملاحظہ ہو الہ آباد (2) 53 و 59)

[2] اگر معافیدار کے متعلق معلوم ہو کر وہ ملازم (نوکر) ہے تو اس کی معافی قابل ضبطی ہوتی (آئین (1) صـ 287) 18 سنہ جلوس شاہجہانی کے ایک حکم کی رو سے معافیدار "کاسب (تجارت پیشہ) یا نوکر (ملازم پیشہ) نہ ہو سکتا تھا" یہ راجہ رگھوناتھ پرشاد کے پروانہ میں مندرج حکم کے خلاصہ کا مطابق ہے۔ لاہوری (2) صـ 366 اس حکم کے حوالہ سے زیادہ قطعی طور پر لکھتا ہے کہ صرف فوجیوں اور اہل حرفہ کی معافیاں قابل ضبطی تھیں۔

[3] آئین اکبری (1) 198، منظر شاہجہانی 19 - 91 میں تین زمرہ کے اشخاص کو مدد معاش کی معافیوں کا جائز حقدار قرار دیا گیا ہے۔ (1) افسران جو اپنی تنخواہوں کے عوض میں معافیاں پاتے ہوں (2) علماء و حفاظ (قرآن) (3) "سید، شیخ اور مغل نسل کے افراد جنہوں نے زیادہ ترقی کے مواقع ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہو اور تھوڑی بہت شاہی امداد پر قانع ہوں اور اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی اور ذریعہ معاش نہ ہو" ذیل میں سرکاری عہدہ داران (مثلاً قاضیوں) کی معافیوں کے متعلق ملاحظہ ہو۔

[4] جہانگیر نے اپنے باپ کی ایک دودھ شریکی بہن کو خواتین کی معافیوں کا خصوصی نگران مقرر کیا تھا (تزکِ جہانگیری۔ 21) ابوالفضل بھی "ایرانی اور تورانی خواتین" کی معافیوں کا ذکر کرتا ہے (آئین اکبری (1) صـ 198 - 9) خواتین کی ابتدائی معافیوں کی چند مخصوص مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو تزک جہانگیری 83، الہ آباد 15 اور 874، I.O. 4435، دارالعلوم، ورق 138 الف - ب وغیرہ منظر شاہجہانی، 158 میں ایک کے دو قسم کے چکوں (زمینوں) کا ایک ضمنی حوالہ ملتا ہے۔ 'چکہائے مساتی' (خواتین کی زمینیں) اور 'مذکراتی' (مردوں کی زمینیں)

متعدد دستاویزات کے ایک سلسلہ میں ایک خاص مقصد کے تحت دی جانے والی معافی کی نشاندہی ہوتی ہے جن کے عطیہ داران علاقہ کے "غربا و مسکین" کے معالج ہوا کرتے تھے[1] پیرانہ سالی یا کسی اور سبب سے جو افسران اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی سے معذور ہو جاتے انہیں مدد معاش کی معافیاں دے کر پنشن پر بھیج دیا جاتا تھا[2] ان کے علاوہ بعض اوقات کمتر درجہ کے ملازمین اور دیگر اشخاص کو بھی بطور لطف و کرم یا ان کی سابقہ خدمات کے عوض معافیاں دی جاتی تھیں[3]

لیکن بظاہر مدد معاش کی معافیوں کے بیشتر حصہ سے وہ لوگ استفادہ کیا کرتے جن کا تعلق حقیقتاً یا بہ زعم خویش ابوالفضل کے مذکورہ پہلے اور دوسرے زمروں میں تھا۔ عملیت اور دینداری مسلمانوں کے ایک مخصوص طبقہ کی اجارہ داری میں تھی اور اس طبقہ کا یہ محکم خیال تھا کہ مدد معاش کی معافیاں صرف اس کے افادہ کے لیے مخصوص تھیں[4] اس تصور کا امر واقعہ سے بہت زیادہ بعید

---

[1] ملاحظہ ہو 'Studies in Parsi History' ص 188 - 167 کے دستاویزات (متن اور ترجمے) خصوصاً اس بات کی بین شہادت جو عہد عالمگیری کے ایک دستاویز میں ملتی ہے (ص 6 - 185 پر متن، جلد کے خاتمہ پر فوٹو کاپی اور ص 188 پر خود ہوڈی والا کا تبصرہ)

[2] لاہوری (2) ص 9 - 308 ادب عالمگیری ورق 153 ب، وارث (اے) ورق 499 الف (بی) اوراق 148 ب - 149 الف

[3] طبقات اکبری (2) ص 336، تزک جہانگیری ص 32 اکبر نے تمام چودھریوں کو ان کے 'سیورغال سے محروم کر دیا تھا (آئین اکبری (1) ص 198)

بقول منظر شاہجہانی، 191 ، معافی کے تین جائز مستحقین کے علاوہ جن کا اس میں ذکر آیا ہے (ملاحظہ ہو فٹ نوٹ 39) ایک چوتھا زمرہ "زمینداروں کا بھی تھا جو 'ارباب' (چودھری اور مقدم بھی تھے۔" اس میں بتایا گیا ہے کہ اکبر اور جہانگیر کی اس زمرہ کے لوگوں کی معافیاں دینے کی اجازت نہ تھی لیکن نورجہاں کے زمانہ میں ان لوگوں نے رقمیں دے کر معافیوں کے فرمان حاصل کیے۔ اس تصنیف میں اس طریقہ کی مذمت کی گئی ہے کیونکہ مذکورہ مقامی ملازمین اپنے اختیارات کو استعمال کرکے بہترین زمینیں حاصل کر لیتے تھے اور کسانوں سے ان پر جبریہ کاشت کراتے تھے اور خود کچھ نہ کرتے تھے۔

[4] عباس خاں، ورق 113 الف، جو خود بھی ایک معافیدار کا لڑکا تھا شیر شاہ کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ "بادشاہ کے لیے واجب ہے کہ وہ ائمہ کو مدد معاش کی معافیاں دے کیونکہ ہندوستان کے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

نہ ہونا' اس بات سے ظاہر ہے کہ سرکاری تحریروں تک میں معافیداران کے لیے عموماً ائمہ' اور 'مخادیم'
کے الفاظ جنہیں سے دونوں کے معنی مذہبی پیشوا کے ہوتے ہیں، استعمال کیے جاتے تھے[1] فیضی سرہندی
ہمیں مدد معاش کے لیے اپنا حق قائم کرنے کا ایک بہترین نسخہ بتاتا ہے اور وہ یہ تھا کہ شریعت کے کسی
بھی معمولی سے معمولی غیر واضح مسئلہ پر اپنے علم کا مظاہرہ کیا جائے[2] لیکن غالباً علمیت ہمیشہ معافی کے
حصول کے لیے شرط لازم نہ ہوا کرتی۔ درویشوں یا مذہبی مشائخ کی اولادیں اور تارکین دنیا خصوصاً
ایسے خاندان کے افراد جو صرف اپنی علمیت اور راسخ الاعتقادی کے لیے مشہور تھے یا جن کا محض معززین
میں شمار تھا اپنی ذاتی صلاحیتوں کا لحاظ کیے بغیر ان معافیوں کے حقدار تصور کیے جاتے تھے[3] یہ طفیلی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

شہروں کی رونق انہیں مذہبی پیشواؤں (ائمہ و مخادیم) سے ہے۔" یہ امر کہ واقعتہً شیر شاہ کا ایسا ہی خیال تھا قرین
قیاس نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس کا ایک معتمد حسن علی خاں اس کے متعلق کہتا ہے کہ وہ تمام "ملاؤں" کو پھانسی کے
تختہ پر چڑھانا چاہتا تھا (ترجمہ ترپاٹھی 'Medieval Indian Quarterly' ا) نمبر شمار ا (جولائی
1950ء صفحہ 65) اس عقیدہ کے لیے کہ صرف علمائے دین ان معافیوں کے مستحق تھے' بدایونی (2) 5-204
بھی ملاحظہ ہو۔ بقول اس کے "ہدایہ" (اسلامی فقہ کی معروف درسی کتاب) اور دیگر اونچے پایہ کے معلمین "مدد
معاش کی معافیوں کے بہترین حقدار تھے"۔ وہ اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ جب 1575ء میں ان معافیوں
کی جانچ کی گئی تو معلوم ہوا کہ مذکورہ زمرہ کے اشخاص کو زیادہ سے زیادہ ایک سو بیگھہ اور وہ بڑی زحمتوں سے
مل پائے تھے۔

[1] لفظ ائمہ کے استعمال پر ایک پچھلے فٹ نوٹ میں بحث آچکی ہے۔ اسی مفہوم میں لفظ 'مخادیم' کے استعمال
کے لیے ملاحظہ ہو اکبر کا حکم جس کے ذریعہ اس نے معافیوں کو چند مواضعات کے حدود میں مرکوز کر دیا تھا۔
(الہ آباد' 24) موازنہ کیجیے عباس خاں' اوراق 112 ب 113 الف۔

[2] فیضی سرہندی نے اپنے باپ کے انتقال پر اس کی مسلم معافی کو ایک رسالہ 'صیدیہ اکبریہ' لکھنے کے بعد اسے
صدر شیخ عبدالنبی کی خدمت میں پیش کر کے حاصل کیا۔ اس تصنیف میں اس نے دربار اکبری کے علماء کے درمیان
ایک مابہ النزاع موضوع پر احکام شریعت کو واضح کرنے والی "قابل اعتماد کتابوں سے مستند احادیث
یکجا تھیں۔ موضوع یہ تھا کہ ایک ہرن جس کی گردن کو چیتے نے پکڑ لیا ہو' شرعی طریقہ پر کیسے ذبح کیا جائے۔
(فیضی سرہندی' اوراق 139ب - 141ب)

[3] ملاحظہ ہو' مظہر شاہجہانی' 191 میں معافیداران کے تیسرے زمرہ کا بیان (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کا ایک ایسا طبقہ تھا جو ملازمت اور تجارت کے پیشوں سے خارج اور دینی علوم پر اپنا پورا وقت لگانے سے مجبور صرف ان معافی کی زمینوں ہی کو اپنے حوصلوں کا منتہا تصور کرتا تھا۔ اودھ کے سترھویں صدی کے تحریری حالات سے واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ مدد معاش کے بڑے بڑے معافیداران زمینداریوں کے حصول کے علاوہ علانیہ طور پر مالگذاری کے اجارہ کا بھی کام کیا کرتے تھے[1] ان دنیاوی مشاغل میں پھنسے ہونے کے باعث، جب بھی کوئی تجویز ان کے اسناد معافی کی تحقیقات کے سلسلہ میں سامنے آتی تو یہ طبقہ قدرتی طور پر اپنے لیے شدید خطرہ محسوس کیا کرتا[2]

اس طبقہ کے قیام سے خود حکومت کا اپنا مفاد بھی وابستہ تھا۔ جہانگیر اسے "لشکر دعا" کہا کرتا[3] اور اس سے یہ بیان بھی منسوب کیا جاتا ہے کہ مملکت کے لیے اس فوج کا وجود اسی قدر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

(نوٹ 39 بالا ملاحظہ ہو) نسب کی بنا پر معافی کے لیے الہ آباد، 8 اور ایسے لوگوں کی معافی کے لیے جن کے متعلق خیال تھا کہ یہ تارک الدنیا ہیں O. J. 33 44 اور الہ آباد، 1117 ملاحظہ ہوں۔ شیخوں اور سیدوں کو بظاہر کثیر تعداد میں معافیاں دی گئی تھیں۔ ان معافیوں کے لیے ان میں کافی 'اہلیت' (استحقاق) کا ہونا بیان کیا گیا ہے لیکن دستاویزات میں ان کے اوصاف کی تفصیل نہیں ملتی۔ معمولاً ان کے اوصاف غالباً محض ان کی خاندانی شرافت ہوا کرتی۔ ایک پرگنہ کی مالگذاری سے نقدی معافی کی بحالی کی ایک اپیل میں جو واحد دلیل پیش کی گئی تھی وہ یہ ہے کہ "معزز لوگوں (شرفا) خصوصاً شخص مذکور کو اس ویران مقام (یقیناً مجازی مفہوم میں) پر بلکہ اس پورے ضلع میں آباد کرنا فضل (خداوندی) کے لیے شرط اور اس کی رحمت کی علامت ہے۔" محمد جعفر، انشائے عجیب، مولفہ، 1706 - 7، مطبوعہ نولکشور، کانپور، 1910ء، ص 18

[1] یہ سید محمد عارف کا خاندان ہے جس کی زمینداری کی آراضیات کا جو اودھ کی سرکار بہرائچ کے ایک یا دو پرگنوں میں خصوصاً پیناجٹ اور اس کے متعلقہ مواضعات میں واقع تھی، باب 5 میں ایک سے زائد بار ذکر آچکا ہے۔ لہذا ان کا دوبارہ تفصیلی بیان فضول ہوگا۔ الہ آباد، 886، 889 اور 890، اجارہ کے دستاویزات ہیں جن کے ذریعہ سید محمد عارف نے مختلف جاگیرداروں سے مختلف سنوات میں مسلم یا جزو پرگنہ کی مالگذاری کا ٹھیکہ لیا۔ اس کے تصرف میں نواح بہرائچ کے مدد معاش کی زمینیں تھیں (الہ آباد، 879، 1206، 1217، 1228۔30)

[2] دور شاہجہانی میں معافیوں کی دوبارہ جانچ کی صادق خاں کی طرف سے شدید مذمت ملاحظہ ہوں۔ Or. 174، اوراق 103 ب 104 الف Or. 1671، اوراق 56 ب۔ 57 الف)

[3] تزک جہانگیری، -

ضروری تھا جس قدر اصل فوج کا۔[1] معافیداران حکومت کے ساختہ و پرداختہ ہونے کے باعث اس کے قدرتی حامی اور طرفدار ہوا کرتے۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ رجعت پسندی کے پیکر بھی تھے کیونکہ اس وصف کے علاوہ، وہ حکومت کی فیاضی سے استفادہ کا کوئی اور استحقاق نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ اکبر نے جب ہندوستان میں جدید نظریات پر شہنشاہیت کی تشکیل کا آغاز کیا اور ایک مذہبی رواداری کی پالیسی پر عمل پیرا ہوا تو اس کا مذکورہ طبقہ سے متصادم ہونا امر لازم تھا۔ اس نے اب اپنے ابتدائی دور کی شاہانہ فیاضیوں کو خیرباد کرکے، مسلم علماء کی مدد معاش کی معافیوں میں تخفیف کی طرف یکے بعد دیگرے سخت قدم اٹھائے۔[2]

---

[1] انتخاب جہانگیر شاہی، ۳۰ه 48 16، اوراق 182 الف۔ب، 'لشکر دعا' کی اصطلاح مناسب تھی کیونکہ مدد معاش کی معافیوں کے فرامین میں معمولاً معافیداروں کو سلطنت کی دائمی خوشحالی کے لیے دعا مانگنے کا پابند کیا جاتا تھا۔

[2] بدایونی (2)، ص 71، 204۔5، 74، 315، 343، فیضی سرہندی 105 الف۔ 106 الف۔ اکبر اور مخادیم یا علماء کے درمیان مخاصمت کی ایک مخصوص مثال بیان کرتا ہے۔ اکبر کا جب 50 15ء میں سرہندی سے گذر ہوا تو اس کے نواحی پرگنوں کے مخادیم اس کی خدمت میں آداب بجا لانے کی غرض سے حاضر نہ ہوئے۔ اکبر نے غصہ میں ان کی مدد معاش کی معافیوں کی فوری واپسی کا حکم صادر کردیا۔ تب ان میں سے بعض حاضر آئے لیکن بہرحال، ابوالفضل کی سفارش پر ان میں سے بیشتر کی معافیاں بحال کردی گئیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سرہند کو شیخ احمد کے مولد ہونے کا بھی شرف حاصل ہے جو اپنے عقیدتمندوں میں، مجدد الف ثانی کے لقب سے معروف ہیں اور جنہوں نے عہد جہانگیری میں بیک وقت اکبر، ہندوؤں اور شیعوں کے خلاف اپنی شدید ملامتی مہم کا آغاز کیا۔ دینی امور میں قول فیصل ہونے کے اپنے ادعا کے ساتھ ساتھ ان کا یہ بھی نظریہ تھا کہ نظام شریعت کی ترویج، بادشاہ کی حمایت پر منحصر ہے۔ لہٰذا وہ مخادیم کے ایک نمائندہ کی حیثیت سے جن کی نخوت پسندی حکمران طبقہ پر ان کے کلی انحصار سے کسی طور پر بھی کم نہ تھا۔ ممتاز ہوئے۔ (یہ بات خود ان کے خطوط سے صاف ظاہر ہوتی ہے جسے نولکشور نے 'مکتوبات امام ربانی' کے نام سے تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔ لیکن شیخ اور ان کے پوتوں کے نظریات اس وقت کے ایک معروف طنز نگار کی قلم سے وقائع نعمت خاں عالی، مطبوعہ نولکشور، لکھنؤ، 1928ء صـ 25 – 30 میں ملاحظہ ہوں) جہانگیر نے جب شیخ کو قلعہ گوالیار میں ایک راجپوت افسر کی نگرانی میں قید کرکے اظہار ندامت ربانی (حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

دوسری طرف غیر مسلم مذہبی پیشواؤں کو بھی معافیاں دی گئیں[1] جہانگیر نے ان معافیوں کی فیاضانہ بخششوں کے لیے شہرت حاصل کی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے غالباً اس معاملہ میں اکبر کے سخت رویہ کو کسی قدر سے نرم کیا[2] لیکن اورنگ زیب نے اکبر کے بالکل برعکس طریقہ پر عمل کرتے ہوئے، 1672ء میں ہندوؤں کی تمام معافیوں کی واپسی کا حکم صادر کیا[3] جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، اس نے 1690ء میں معافیوں کو کلیتہً موروثی قرار دے دیا اور یہ ایک ایسا عمل تھا جو غالباً معافیداروں کے ساتھ ممکنہ مراعات کی آخری حد ہو سکتی تھی۔

چونکہ مدد معاش کی معافیاں بعض طبقوں کی محض امداد کی غرض سے قائم کی گئی تھیں لہٰذا یہ بیشتر معافیداروں پر کوئی ذمہ داری عائد کیے بغیر دی جاتیں۔ لیکن بعض معافیاں مشروط بھی ہوا[1]

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)

پر مجبور کیا (تزک جہانگیری 272 - 3، 308) تو اسے یہ احساس ہوا کہ وہ کس درجہ کی شخصیت کے مدمقابل ہے۔ ایسے شخص کا موجودہ ہندوستان کے فرقہ پرست مسلمانوں کے امام کے درجہ پر فائز ہونا، بہرحال کوئی اتفاقی امر نہیں ہے۔

[1] بدایونی (2) 205 ملاحظہ ہو وہ دستاویزات جن کی نقل اور جن پر بحث، مودی کی تصنیف، 'Parsees at the Court of Akbar' اور ہودی والا 'Studies in Parsi History' صفحہ 167-188 میں کی گئی ہے (ان میں سے بعض کے کتاب کے آخر میں فوٹو بھی لگے ہوئے ہیں) موازنہ بہ تیز Jhaveri's Docs. V-VII & XI حالانکہ صحیح معنوں میں یہ مدد معاش کی معافیاں نہیں ہیں۔

[2] انتخاب جہانگیر شاہی، O.T.، 1648، اوراق 181 ب - 182 ب۔

[3] مرآۃ (1) صفحہ 288 (موازنہ بہ تیز Bernier 341) ایسا بظاہر حکومت کی ایک عام پالیسی یا ایک ترجیحی طریقۂ کار کے طور پر رہا ہوگا نہ کہ ایک ایسے حکم کی حیثیت سے جس پر بلا استثناء سختی سے عمل کیا جاتا ہو۔ اول تو جن زمینوں کی معافیاں خدمات کے معاوضہ کے طور پر دی جاتی تھیں وہ اس حکم سے متاثر نہ ہوا کرتیں۔ ملاحظہ ہو مرآۃ حوالہ سابقہ اور اعظم کے نشان کا ترجمہ 'IHRC' 1945، صفحہ 53-55 میں گجرات میں نوساری کے پارسی حکیموں کے ایک خاندان کی مدد معاش کی معافی کی اورنگ زیب کے اسناد مجریہ 1664ء اور 1712 کے ذریعہ تصدیق کی گئی ہے (ہودی والا 'Studies in Parsi History' صفحہ 178) بمبئی کے چغان چندر نے مضامین کے ایک سلسلہ میں جو 'Journal of Pakistan Historical Society' (5) حصہ 4

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کرتیں، مثلاً قاضی کے عہدہ سے ہمیشہ مدد معاش کی معافی منسلک رہا کرتی جو عہدہ کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی تھی[1] شیر شاہ کی بعض معافیوں میں معافیدداران کو تیر اندازی کی مسلسل مشق کرتے رہنے کے ساتھ سرکاری عمال کی مقامی متمردین کے خلاف مدد کرنے کا بھی پابند کیا گیا تھا[2] بدایونی کو ایک فوجی دستہ کی فراہمی کی شرط پر معافی دی گئی تھی[3] لیکن سترھویں صدی کے فرامین میں کبھی بھی اس نوعیت کی فوجی خدمات کی کوئی شرط نہیں ملتی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طریقہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

(6) حصہ 1 (7) حصے 1 و 2 میں طبع ہوئے ہیں غیر مسلموں کے نام ایسی ہی متعدد نقدی اور زمینی معافیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو عہد عالمگیری میں یا تو جاری ہوئیں یا جن کی توثیق ہوئی۔

[1] Selected Documents of Shahjahan's Region 11697 Or. 90. ؛ نشی، اوراق 106 الف۔ب .Bodl اوراق 82 الف 145 ب، 146 الف، سیاق نامہ، 86 4370، اور 11698 "قاضیوں کے زیر قبضہ معافیوں کے بارے میں ابوالفضل کا حوالہ ملاحظہ ہو" یہ عامہ پہننے والے بدنیت ("خراب دروں") اور کم عقل، ("کوتاہ خرد") کے لمبی آستینوں والے ("دراز آستینان") (آئین اکبری (1) ص 199-9) الہ آباد 782 اور 1203 میں قاضیوں کا جو نمونہ پیش کیا گیا ہے اگر وہ واقعتہً عام صورت حال تھی تو ابوالفضل کی مذمت کو برحق تصور کرنا چاہیے۔ اس شخص کو 750 بیگھوں کی معافی دی گئی تھی لیکن اس کا قبضہ 5,375 بیگھوں پر تھا موازنہ ہو Charles Elliott 'Chronicle of Gonao, P.115

علاوہ قاضی کے دیگر نیم عدالتی اور نیم مذہبی عہدہ داروں مثلاً "مفتیوں، صدروں اور محتسبوں" کو بھی مدد معاش کی معافیاں دی جاتی تھیں (منظر شاہجہانی، 190)

[2] الہ آباد، 318 اور فرمان مطبوعہ اورنٹیل کالج میگزین، (9) نمبر شمار 3، (مئی 1933ء) ص 127 (اس رسالہ میں مطبوعہ شیر شاہ کے دوسرے فرمان میں یہ شرائط نہیں ملتے) تیر اندازی کی مشق کی شرط بھی عجیب انداز میں عائد کی گئی ہے۔ معافیداران پنجوقتہ با جماعت نماز مسجد میں ادا کرنے کے پابند تھے اور روزانہ ظہر (بعد دوپہر) کی نماز کے بعد انہیں دس تیر چلانا ہوتا تھا۔ موازنہ ہو چالس ایلیٹ 'Chronicles of Gonao' ص 95

[3] اسے ایک ہزار بیگھے ایک فوجی دستہ جس کی تعداد بیس سوار کے منصب کے معیار کے مطابق ہو فراہم کرنے کی شرط کے ساتھ عطا کیے گئے تھے۔ وہ اس ذمہ داری کو بالکل ہی پورا نہ کرسکا (بدایونی (2) ص 206 - 7، 275 - 6

اب متروک ہو چکا تھا۔

بعض ایسی معافیاں بھی ہوا کرتیں جو 'مدد معاش' کے نام سے تو موسوم نہ تھیں لیکن حقیقتاً ان سے بے حد مشابہ ہوا کرتیں۔ جہانگیر کی قائم کی ہوئی 'التمغا' جاگیروں نے ترقی کر کے سرکاری عمّال کے خاندان والوں کے لیے موروثی معافیوں کو جو 'انعام التمغا' کہی جاتیں شکل اختیار کر لی تھی[1] پھر مالگذاری سے مستثنیٰ زمینیں بھی تھیں جن پر لوگوں بطور انعام قابض رہا کرتے۔ ہمارے علم میں اس قسم کی ایک ایسی مثال گجرات کے ایک موضع کی ہے جس پر 'چارن' ذات کے لوگ پولیس کے فرائض کی انجام دہی کی شرط پر قابض تھے[2] اور اسی طور پر مالوہ کے ایک موضع کو 'نگر سیٹھ' (شہر کے ملک التجار) کے موروثی عہدہ سے وابستہ رکھا گیا تھا۔[3] اس کے بعد مالگذاری کی خالصتہً غیر مشروط چھوٹ کی ایک مثال ہے جس کی وضاحت دو مواضعات کی ان متعدد سندوں سے ہوتی ہے جو اکبر اور شاہجہاں کے عہد میں ہندو مذہبی پیشواؤں کے خاندان والوں کے نام جاری کی گئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمینیں ان سے استفادہ کرنے والوں کے قبضہ میں پہلے سے چلی آرہی تھی بلکہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حقیقتاً مواضعات میں سے ایک کو تو زمینداروں سے خریدا تھا۔ فرمان میں انہیں مطالبۂ مالگذاری اور دیگر جملہ محصولوں سے انہیں الفاظ میں مستثنیٰ کیا گیا تھا جو معمولاً مدد معاش کی معافیوں میں استعمال کیے جاتے تھے۔ البتہ ایک خاص فرق یہ تھا کہ اس معافی میں یہ اعلان تھا کہ اس سے صرف پہلا استفادہ کرنے والا ہی نہیں بلکہ اس کی اولادیں بھی نسلاً بعد نسلاً مفید ہوں گی۔[4]

---

[1] 'التمغا' جاگیروں کے لیے ملاحظہ ہو باب 7 کی فصل ایک۔ سوجان رائے، 74 کی اطلاع ہے کہ علی مردان خاں (کا خاندان) ابراہیم آباد میں اس امیر کی باغ و عمارات کی مرمت کے مقصد سے سودھرا کے ایک قریبی موضع کی انعام التمغا پر قابض تھا۔ بہادر شاہ اول کا انعام 'التمغا' کی جاگیر کے متعلق ایک فرمان اب تک محفوظ ہے (Or. 2285) جس میں معافی کے موضع کا حاصل (مالگذاری) جو مدد معاش کی معافیوں میں معمولاً نہیں ملتا ہے۔

[2] مرآۃ (1) ص 288

[3] IHRC 22 (1945ء) ص 53 - 59

[4] Jahareri's Docs V-VII & XI عجیب بات ہے کہ چھوٹ کا اصلاحی نام درج نہیں کیا گیا۔ شاہ عالم ثانی نے اس معافی کی توثیق کرتے وقت اسے انعام التمغار کے نام سے موسوم کیا ہے (دستاویزات 14 و 15)

علاوہ ان کے ایک اور زمرہ کی معافیاں بھی تھیں جو اوقاف (وقف کے جمع کا صیغہ) کہلاتیں[1]
ان سے استفادہ کرنے والے براہِ راست افراد نہیں بلکہ ادارے ہوا کرتے تھے۔ بعض زمینوں
کے محاصل مذہبی درگاہوں، مقبروں اور مدرسوں کی کفالت، مرمت ملازمین کے گذارہ اور ان
کے ذریعہ تقسیم کی جانے والی خیرات کے لیے مستقلاً وقف کردیے جاتے تھے۔[2]

بادشاہ کی عطا کردہ معافیوں کے رقبہ یا آمدنی کی صحیح میزان قائم کرنا دشوار ہے۔ بادی النظر
میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئین اکبری میں اس کے شماریات فراہم کیے گئے ہیں، کیونکہ اس کے صوبجاتی
جدولات میں (بمقدار دام) ایک خانہ موسومہ 'سیورغال' درج ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ 'سیورغال'
کے ان اعداد میں مدد معاش (اور غالباً وقف) کی معافیوں کے علاوہ خزانہ سے ادا کیے جانے والے
نقدی گذارے (وظائف) بھی شامل ہوں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا
کہ ان میں 'مدد معاش' کے علاوہ مالگذاری کی تمام چھوٹ کی رقمیں اور انعام کی معافیاں وغیرہ
شامل ہوں گی۔ علاوہ اس کے یہ بھی صاف طور پر واضح نہیں کہ معافیوں کے اعداد کیونکر معین
کیے گئے۔ مذکورہ اعداد، غالباً ان معافیوں کی تخمینی آمدنی نہیں ظاہر کرتے بلکہ بالکل قدرتی طور پر

---

[1] 'اوقاف'، اور 'مدد معاش' کے ساتھ ساتھ حوالہ کے لیے ملاحظہ ہو، دیوانی (2) 17 ص 204۔ برنی نے بھی اسے
'ملک'، اور انعام کے ساتھ استعمال کیا ہے (تاریخ فیروز شاہی، ص 283)

[2] وقائع اجمیر 30 - 32، ونیز 436 میں مندرج خواجہ معین کی اجمیر میں مشہور درگاہ میں خیرات کی تقسیم
کے حالات سے کم از کم بڑے اوقاف کے نظم کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ بادشاہ نے درگاہ کے نام متعدد مواضعات
مخصوص کردیے تھے۔ متولی کے کارندے ان کے محاصل کو جمع کرکے وصول شدہ رقم میں سے ان لوگوں کو
جو خیرات کے صحیح یا غلط طور پر دعویدار ہوتے تھوڑا تھوڑا تقسیم کردیا کرتے تھے۔ سجادہ نشین (درگاہ کے
روحانی پیشوا) کو اس سے کوئی تعلق نہ ہوتا۔ حالانکہ یہ بات تحریر میں نہیں آئی ہے لیکن متولی غالباً بادشاہ کا
نامزد کیا ہوا شخص ہوا کرتا۔ بقول لاہوری (2)، 330 - 31 تیس مواضعات اور بازار کی دکانیں اور سرائے
جو اس کے قریب تعمیر کی گئی تھیں ان کے محاصل، تاج محل پر وقف تھے جن کی تین لاکھ روپیہ سالانہ سے زائد آمدنی
تاج محل کی مرمت، ملازمین کی تنخواہ اور علما و فقرا و مساکین کی خوراک پر صرف ہوا کرتی تھی۔ اس کا متولی بذاتہ
خاص بادشاہ تھا۔ بایزید، 310 - 11 نے اس سے کمتر حیثیت کے ایک وقف کا ذکر کیا ہے۔ بایزید نے بنارس
کے ایک ویران مندر کو مدرسہ میں تبدیل کیا اور بادشاہ (اکبر) نے شہر کے دو قریبی مواضعات کو اس مدرسہ کے
معلمین کے گذارہ کے لیے منظور کیے۔

انہیں مالگذاری ادا کرنے والی زمینوں کو معافی میں دیئے جانے کی وجہ سے جمع یا تشخیص شدہ مالگزاری میں ہونے والے نقصان کی میزان ہونی چاہیے[1] یعنی یہ کہ ان اعداد میں ان ویران زمینوں کی آمدنیوں کا نا قابل لحاظ نہ رکھا گیا ہوگا جنہیں معافیدار ان اپنی کاشت میں لاتے تھے۔ ان لا معلوم اجزاء کے باوجود ان اعداد سے تخمینی اندازے قائم کیے جاسکتے ہیں۔ مجموعی محاصل کی نسبت سے دریائے گنگا کے بالائی صوبوں میں یہ اعداد سب سے زیادہ ہیں؛ دہلی میں 4ر5 فیصد، الہ آباد میں 2ر3، اودھ میں 2ر4 اور آگرہ میں 9ر3 اور لاہور گجرات میں یہ گھٹ کر 0ر8 فیصد ہو جاتے ہیں[2] گجرات کو چھوڑ کر جس کے کچھ اعداد مرآۃ احمدی میں درج ہیں، بقیہ پوری مملکت کے لیے سترھویں صدی کے متعلق ان معافیوں کے اعداد نہیں ملتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آئین اکبری کے دور تصنیف اور اوائل عہد محمد شاہی کے درمیان معافی کے ذریعہ منتقل شدہ مالگذاری کے تناسب میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہ ہوئی[3] اس سے یہ نہ تصور کرنا چاہیئے کہ مجموعی محاصل میں

---

[1] ایک پرگنہ کے حسابات ان جس کی نقل دستور العمل عالمگیری، اوراق 126 ا ب۔ 128 ب میں ملتی ہے منظر ہیں کہ ان منہائیوں کے اندراجات رکھے جاتے تھے۔ پرگنہ کی جمع 6058 روپیہ درج ہے منجملہ جس کے 'ایمہ معاف' کے تحت 20 روپیہ منہا کیے گئے۔ یاد رہے کہ آئین اکبری کے شماریات میں 'سیورغال' کا خانہ نقدی یا تشخیص کی ہوئی مالگذاری کے فوراً بعد آتا ہے۔

[2] آئین اکبری میں صوبجات آگرہ و گجرات کے شماریات کے اعداد اور 'سرکاروں' کے اعداد بالکل بے ربط ہیں، لہٰذا ہم نے دونوں صورتوں میں 'سرکار' ہی کے اعداد استعمال کیے ہیں۔

کیا دریائے گنگا کے صوبوں اور صوبجات لاہور و گجرات میں فرق کا سبب آخر الذکر صوبوں میں ویران زمینوں کی بکثرت موجودگی ہے؟ چونکہ ویران زمینوں کی معافیوں سے معمولاً مالگذاری ادا کرنے والی زمینیں متاثر نہ ہوا کرتیں، لہٰذا ان صوبوں میں جہاں قابل کاشت ویرانے نسبتاً زیادہ پائے جاتے تھے، معافیوں کے عطیات سے جمع کا نقصان کم ہوتا رہا ہوگا۔

[3] مرآۃ (1)، ص 23-26 "سرکاری عمال کے اپنی جاگیروں سے دیئے ہوئے انعاموں کو چھوڑ کر 120 00 000 دام، 50،000 بیگھے زمین اور 103 مواضعات اور 40،000 روپیہ نقد خزانہ سے بطور مدد معاش اور انعام دیئے گئے ہیں۔ شاہی فرامین کے بموجب" وغیرہ 12 00 00 001 داموں کا آئین اکبری کے اعداد سرکار کی میزان یعنی 761 9974 داموں سے موازنہ کیا جا سکتا (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

معافیوں کا تناسب یکساں طور پر قائم رہا، کیونکہ ہمارے علم میں ہے کہ اکبر نے آئین اکبری کے اعداد شمار کی ترتیب کے چند برسوں بعد گجرات کی معافیوں کو بقدر نصف کم کیے جانے کے احکام صادر کیے تھے[1] پس حقیقتاً اگلی صدی کے دوران ان معافیوں کی مکمل بحالی عمل میں آئی

اس یقین کا کہ گجرات میں استثنائی صورتحال تھی، کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا اور اسی طور پر یہ قیاس کرنا مناسب نہ ہوگا کہ اکبر کے بعد کے زمانہ میں معافیوں کے رقبہ میں زیادہ اضافہ ہوا۔ پس آئین اکبری کے اعداد مجموعی محاصل کی نسبت سے دیکھے جانے پر غالباً پورے زیر بحث مدت کے لیے قابل اعتماد تصور کیے جاسکتے" ہیں۔ مختلف صوبوں میں اس نسبت کی فیصدی کی کمی ظاہر کرتی ہے کہ معافیاں مملکت کے مجموعی زیر کاشت رقبہ کی ایک بہت مختصر فیصد رہی ہوں گی۔ تناسب کے اس اختصار کے پیش نظر اس باب میں زیر بحث تفصیلات ہمیں سے اس مغالطہ میں نہ مبتلا ہونا چاہیے کہ معافیداروں کا طبقہ کاشتکاری کی توسیع وغیرہ میں زیادہ حصہ لے کر

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

لیکن درمیانی مدت میں 'جمع' میں اضافہ ہوگیا تھا' لہٰذا مرآۃ کے اعداد میں اس (مراۃ) میں مندرج پورے صوبہ کے 'جمع دامی' کے 5ر1 فیصد ہوئے۔ چونکہ آئین اکبری کے 'سیورغال' کے شماریات میں غالباً نقدی گذارے بھی شامل تھے، لہٰذا صحیح موازنہ مراۃ کی زمین کی معافیوں کے اعداد میں نقدی معافیوں کا اضافہ کرنے کے بعد ہی ممکن ہوسکے گا اور یہ دونوں مل کر جمع دامی کے 7ر1 فیصد سے قدرے زائد تھے۔ جہاں تک رقبہ کا تعلق ہے، اگر یہ تصور کرلیا جائے کہ مرآۃ میں معافیوں کا رقبہ بیگھۂ الٰہی میں اور قابل زراعت زمینوں کا بیگھۂ دفتری میں درج ہے تو اول الذکر اور آخر میں 00ر: 100 سے قدرے کم کی نسبت آتی ہے۔ معافی کے مواضعات کا پورے صوبہ کی میزان یعنی 10465 سے موازنہ کرنے کے بعد تقریباً دہی فیصدی نکلتی ہے جو رقبہ کی ہے لیکن ان اعداد کا مطالعہ کرتے وقت یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جبکہ ایک طرف مرآۃ کے قابل زراعت رقبہ سے بعض اضلاع جو غلہ بٹائی کا طریقہ رائج ہونے کے باعث غیر پیمودہ تھے، خارج تھے تو دوسری طرف گجرات میں ایسی معافیاں تھیں (مثلاً ملاحظہ ہو Or 11698) جن کے رقبے غیر مندرج تھے۔ اسی طور پر مددمعاش کے مواضعات کی تعداد غالباً ایسے مواضعات (دروبست) کی ہے جن پر مسلم طور پر معافیداران قابض تھے' لہٰذا ان میں وہ مواضعات شامل نہیں ہیں جن میں معافیاں تو تھیں لیکن وہ زیادہ تر یا جزاً مالگذاری ادا کرنے والے تھے

[1] 48ھ جلوس اکبری کا فرمان کا ایک حکم ملاحظہ ہو؛ مودی کی تصنیف 'Parsees at the Court of Akbar' میں دستاویز نمبر 3

ان دنوں کی زرعی معیشت میں کوئی بہت اہم مقام رکھتا تھا یا یہ کہ ان کا وجود مالی نظم و نسق کے عام ڈھانچہ میں بہت زیادہ دخل انداز ہوا کرتا تھا۔

باب ہذا کے ختم کرنے کے قبل ان معافیوں کو بھی مختصراً بیان کر دینا مناسب ہوگا جو بادشاہ کے علاوہ دیگر با اختیار اشخاص عطا کرتے تھے۔ کوئی بھی جاگیردار اپنی جاگیر سے معافی دے کر اسے مالگذاری سے 'مستثنےٰ' قرار دے سکتا تھا۔ یہ معافیاں بھی 'مدد معاش' یا 'ایمہ' ہی کہی جاتی تھیں۔[1] لیکن چونکہ جاگیردار صرف اپنی جاگیر کی مدت ہی تک کے لیے معافی دے سکتا تھا جو شاذ ہی کبھی تین یا چار برس سے تجاوز کرتی تھیں،[2] لہٰذا اس طبقہ کے معافیداران انتہائی غیر یقینی حالات میں رہا کرتے۔ نئے جاگیردار کے لیے لازم نہ تھا کہ وہ اپنے پیشرو کی عطا کی ہوئی معافی کو بحال رکھے لیکن غالباً رواج انہیں بحال رکھنے ہی کا تھا۔[3] ہماری اطلاع ہے کہ میر جملہ کے احکام کے تحت جب بنگال میں جاگیروں اور خالصہ کی وہ تمام معافیاں جو شاہی فرمانوں کے ذریعہ حاصل نہ کی گئی تھیں واپس لے لی گئیں تو وہاں بیحد پریشانی پیش آئی۔ سابقہ معافیداروں کو ہدایت کی گئی کہ وہ تمام عام کسانوں کی طرح زمینوں کی کاشت کریں اور مالگذاری ادا کریں۔ مگر بالآخر، اگلے صوبیدار شائستہ خاں نے فیصلہ کیا کہ ہر جاگیردار ان لوگوں کو اپنی اپنی معافیوں پر قابض ہونے کی اجازت دے دے، بشرطیکہ ایسا کرنے سے ان کی جاگیر کے جملہ محاصل کا $2\frac{1}{2}$ فیصد سے زیادہ نقصان نہ ہو۔[4] اس کے بعد عہد عالمگیری میں ہمیں ایک ایسا حوالہ ملتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سورت (گجرات) کے عمال مال صوبیداروں اور جاگیرداروں کی دی ہوئی تمام معافیوں

---

[1] J.o. 4438 ایک جاگیردار کا اپنے شقدار کے نام پروانہ ہے جس میں عہد اکبری میں پرگنہ سندیلہ میں قابل زراعت اور ویران زمینوں کے معینہ رقبوں کی معافی کا حکم درج ہے۔

[2] مثلاً بقول منوچی، اس نے کرناٹک کے مغلیہ نائب صوبیدار سے "اس کی پوری صوبیداری کی مدت کے لیے دو مواضعات اور اس کے مشتملات کی آمدنی کی معافی حاصل کی (Manucci 3 ص 288)

[3] ایزد بخش رسا کی تصنیف ریاض الوداد (Or. 1725، ورق 12 الف) میں اس کا ایک جاگیردار کے نام خط درج ہے جس میں اس نے اپنے ایک دوست کی مدد معاش کی معافی کو جو مکتوب الیہ کی جاگیر میں تھی بحال کرنے کی سفارش کی ہے۔

[4] فتحیۂ عبریہ، اوراق 117 ب 121 الف۔

کو واپس لے رہے تھے اور اس امر پر زور دے رہے تھے کہ صرف شاہی سند کے ذریعہ دی گئی معافیاں ہی قابل تسلیم ہو سکتی ہیں[1]

خود مختار سرداران بھی اپنے اپنے علاقوں کے حدود میں مالگذاری کی معافیاں دینے کے معاملہ میں آزاد تھے۔ جودھپور کا راجہ جسونت سنگھ برہمنوں 'چارنوں (بھاٹوں) اور باز کے شکاریوں کی کاشت کی زمینوں پر مالگذاری نہ وصول کرتا تھا[2] معمولی زمینداران بھی اس قسم کی معافیاں 'قیا تًا اپنے 'مالکانہ' یا 'نانکار' کی مالگذاری سے مستثنیٰ زمینوں سے دیا کرتے تھے بعض معافیاں خدمت کے صلہ[3] میں اور بعض محض بطور 'دان' کے دی جاتی تھیں اٹھارہویں صدی کے اواخر کے ایک مال کی فرہنگ میں خیراتی معافیوں کو دو زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے؛ ایک 'پیر پال' یعنی وہ معافیاں جو زمینداران اپنے پرانے ملازمین کو اور دوسرے 'برہموتر' یعنی وہ جس پر برہمن قابض رہا کرتے تھے[4]

---

[1] مرآۃ (ا) ص 319

[2] وقائع اجمیر 318 - یہ پرگنہ میرٹھ کے متعلق ہے۔ راجہ کے انتقال کے بعد جب اورنگزیب نے اس کے علاقہ پر قبضہ کرنے کا حکم صادر کیا تو شاہی عمال نے راجہ کی دی ہوئی مالگذاری کی چھوٹ کا لحاظ نہ کیا۔

[3] چنانچہ ایجس، ورق 52 ب میں زمینداروں کے ملازمین کو معافی کے ذریعہ یا نقد ادا کیے جانے کا ذکر آیا ہے۔ اودھ کے دو دستاویزات (الہ آباد' 279 اور 280) میں معافیدار کے ایک موضع کے 'خصمانہ' (معافی دینے والوں کے حقوق میں ناجائز مداخلت) کی نگرانی کرنے کے صلہ میں 50 بیگھہ زمین کی بطور 'خدمتانہ' (خدمت سے) معافی کا ذکر آیا ہے۔ نہ تو دونوں ابتدائی عطا کنندۂ معافی اور نہ ان میں سے ایک کی بیوہ جس نے دوسرے دستاویز کے ذریعہ ان کی معافی کی توثیق کی ہے موضع میں اپنے حقوق کی نوعیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ غالباً موضع کے زمیندار تھے' لیکن ممکن ہے کہ وہ مدد معاش کے معافیدار رہے ہوں (موازنہ ہو الہ آباد 296)

[4] Add. 66.03 ورق 51 الف۔ ب سے ہمیں اطلاع ملتی ہے کہ زمینداران کی خیرات میں دی ہوئی زمینوں کو 'بھومی زمین' کہتے تھے۔ اس کے مصنف کو دہلی اور بنگال کے مالی نظم و نسق کا تجربہ تھا، لہٰذا 'برہموتر' (جو برہمن موتر بھی لکھا جاتا ہے) اور 'پیر پال' کی اصطلاحیں غالباً دونوں علاقوں میں استعمال ہوتی تھیں یہ اس لیے اور بھی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ مصنف 'بشن بریت' (زمیندار جس زمین کو وشنو کے نام چڑھا کر برہمنوں کو دیتے تھے) کی وضاحت کرتے ہوئے بنظر احتیاط لکھتا ہے کہ یہ اصطلاح صرف بنگال میں رائج تھا۔ (ورق 51 ب)

باب ۹

مملکتِ مغلیہ کا زرعی بحران

زیر مطالعہ عہد کی ڈیڑھ سو سالہ مدت کے بیشتر حصہ میں سلطنت مغلیہ نے اپنے قبضہ میں ایک پورے برصغیر کو ایک انتہائی مرکوز نظام حکومت کے تحت متحد رکھا۔ اس سلطنت کی نمایاں کامیابی کا کیا راز تھا؟ بعض ماخذ میں سولہویں اور سترھویں صدی کے دوران، آتشیں اسلحہ جات میں ترقی کو عظیم ایشیائی مملکتوں کی تشکیل کا بنیادی سبب بتایا جاتا ہے[۱] مگر جہاں تک ہندوستان میں مغلوں کی کامیابی کا تعلق ہے، اس توجیہہ کا کافی ہونا محل نظر معلوم ہوتا ہے، کیونکہ توپ خانہ حقیقتاً ان کی فوج کا فیصلہ کن بازو نہ تھا اور نہ وہ اسے کبھی بھی واقعتہً مستحکم قلعوں کے خلاف کامیابی کے ساتھ استعمال کر سکے۔ ان کی طاقت کا حقیقی سرچشمہ ان کی سوار فوج تھی اور وہ میدانی جنگوں اور بہ سرعت نقل و حرکت میں اس وقت تک ناقابل تسخیر رہے جب تک کہ مرہٹوں نے اس کا ایک فیصلہ کن جواب منتشر اور غیر مرکوز طرز جنگ میں تلاش نہ کر لیا۔ منصبداروں کی اہم ترین ذمہ داری معیاری نسل کے گھوڑوں کی سوار فوج کی فراہمی تھی لہٰذا مغلوں کی فوجی طاقت اور ان کے جاگیرداری کے نظام میں ایک گہرا ربط پایا جاتا تھا۔ اس

---

[۱] مثلاً Barthold, Iran مترجمہ جی۔ کے نریمان، Posthuman's Works of G. K. Nariman جمبئی والا ایڈیشن، صفحہ 142-3 میں۔

نظام کا ایک بڑا وصف یہ تھا کہ یہ منصبداروں کو بادشاہ کی مرضی کا کلیتہً پابند رکھتا تھا، تاکہ شاہی حکومت انہیں اور ان کے فوجی دستہ کو یکجا کر کے جس وقت اور جہاں کہیں بھی ضرورت ہو بھیج سکے۔ کسی علاقہ میں ابتداءً پیر جما لینے کے بعد مغلیہ طاقت کے مجتمع دباؤ کے خلاف کسی بھی صوبائی حکومت کے لیے کامیاب ہونے کا کوئی سوال نہ ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ اکبر نے سُوریوں کو قائم کردہ بنیادوں پر اپنے مالی نظام کی تعمیر کی ہو، لیکن وہ تیموریوں کو شخصی حکومت کی روایات کا امین ہونے کے ساتھ ساتھ قبائلی حکومت کے افغانی تصوّر کی الجھنوں سے آزاد تھا۔ اس نے جاگیرداری اور منصبداری نظاموں کے اہم اجزا کی تدریجی تشکیل کے ساتھ ایک 'نیم خداوندی' حکومت کے نظری تخیل کو عملی جامہ پہنایا۔[1] امرا اور دینی طبقوں نے احتجاجاً صرف ایک بار 1580ء میں علم بغاوت[2] بلند کیا۔ لیکن اس کے ایک بار فرو کر دیے جانے کے بعد سلطنت کو پھر کبھی بھی اس کے پروردہ طبقہ کے جانب سے کسی سنگین بغاوت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اہم تغیرات جو پیش آئے ان کا سبب تخت نشینی کی جنگیں تھیں لیکن یہ خود اپنی جگہ پر مغلیہ تخت کے لیے کسی خطرہ کا سبب نہ بن سکتی تھیں۔ حقیقت میں یہی امر کہ 1658ء-9 یا 1707ء-9 میں سے کسی ایک موقع پر بھی دعویداران تخت کے لیے مملکت کی تقسیم قابل قبول نہ ہوئی تھی ظاہر کرتا ہے کہ مملکت مغلیہ کے بنیادی ڈھانچہ میں کس قدر زیادہ وحدت پائی جاتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ مغلیہ امیروں کے طبقہ کے مختلف نسل اور ذات کی بنیاد پر بٹے ہوئے عناصر کے درمیان آویزشیں اور کشمکش چلتی رہتی تھیں[3] اور اورنگزیب کی مذہبی تفریق کی پالیسی کی وجہ سے 1679ء-80ء میں راجپوتوں نے

---

[1] بادشاہی (پادشاہی) خدا ('داورِ بے ہمتا') کی روشنی ('فروغ')، اور دنیا کو روشن کرنے والے سورج ('مہرِ عالم افروز') کی ایک کرن ('پرتو') ہے۔ ابوالفضل "آئین اکبری (1) ص2"

[2] بنگال اور بہار کی بغاوت کا سبب گھوڑوں کو داغ لگانے کے ضابطوں کا نفاذ اور وہاں پر تعینات افسروں کو گھوڑوں کی انحطاط نسل کے سلسلہ میں جو مراعات منظور کی گئی تھیں انہیں تخفیف کیا جانا تھا۔ (اکبرنامہ (3) ص 284 - 6، 291 - 3، طبقات اکبری (2) ص348-50، Monserrate 68-69)

[3] مرزا حکیم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ 1582ء میں ایرانی اور تورانی امراء کی غداری اور اکبر کے افغان، راجپوت اور شیخ زادہ (ہندوستانی مسلمان) ملازمین کی بزدلی پر بھروسہ کیے ہوئے تھا۔ (اکبرنامہ (3) ص366) خان اعظم، جہانگیر کی چغتائی (تورانی) اور راجپوت امراء (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

بھی علم بغاوت بلند کیا لیکن اس کے اثرات جلد ہی زائل ہو گئے اور راجپوتوں نے عموماً شاہ سابق کے دوبارہ اطاعت اختیار کر لی[1]

مغلوں کے تحت جاگیرداری کا نظام جس نہج پر قائم ہو کر چل رہا تھا وہ خود ایک مخصوص معاشی نظم کی موجودگی کو پہلے سے تسلیم کرتا تھا۔ حتی الامکان، جاگیروں کو زمین کے کسی بھی حق سے وابستہ نہ رکھا جاتا تھا۔ یہ لازمی طور پر محاصل کے عطیات ہوا کرتے جنہیں تشخیص کر کے نقد میں واضح کر دیا جاتا تھا۔ ایسا صرف اسی معاشرہ میں ممکن العمل تھا جہاں نقدی نظام بخوبی قائم ہو لیکن اس کا یہ بھی مفہوم تھا کہ اس معاشرہ میں زرعی تجارت خوب فروغ پا چکی ہو۔ پچھلے ابواب میں گذر چکا ہے کہ مغلیہ ہندوستان میں یہ دونوں صورتیں پائی جاتی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تجارتی کاروبار صرف ایسے شاہی نظام میں فروغ پا سکتا تھا جس میں محصولوں کی وصولی، نظم و نسق اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

کے مقابلہ میں خراسانی (ایرانی) اور شیخ زادوں کے ساتھ ترجیحی سلوک کی مذمت کرتا ہے' (منشآت مظفر، ورق 19 الف۔ ب اور موازنہ پہ نیز: ہاکنس 'Early Travels' ص 106-7) شاہجہاں کو بظاہر افغانوں کی وفاداری پر شک تھا (ادب عالمگیری، ورق 154 الف، دیکھنا، ورق 84 الف) اور وہ اورنگ زیب کی ایام شاہزادگی میں اس کی راجپوت دشمنی پر معترض رہ چکا تھا (ادب عالمگیری، اوراق 37 ب، 38 الف، رقعات عالمگیری ص 114-5)

[1] دبستان مذاہب (تقریباً 1653ء) ص 431-2، ایسی قدیم اور مشہور تصنیف میں ذکر آیا ہے کہ اکبر کی مذہبی پالیسی کا جزوی محرک اس کی یہ خواہش تھی کہ امراء کے مختلف عناصر متحد رہیں اور ان میں سے کوئی بھی بہت زیادہ طاقتور نہ ہو سکے۔ مسٹر آر۔ ایس۔ شرما کی تصنیف 'Religious Policies of Mughal Emperors' کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غیر مسلم منصبداروں کے مسلسل حوالے آتے ہیں۔ نہ تو سب ہی اور نہ ہی بیشتر راجپوت گھرانے 1679-80 کی بغاوت میں شریک ہوئے تھے، بلکہ دکن میں تو راجپوتوں نے مغلوں کی قابل ستائش فوجی خدمات انجام دی تھیں۔ یہ بھی فراموش کر دیا جاتا ہے کہ اورنگ زیب کی وفات اور بہادر شاہ اول کے ساتھ ابتدائی مناقشوں کے بعد راجپوتوں کی سابقہ حیثیت بیشتر بحال کر دی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں سید برادران کی پالیسی جنہوں نے جزیہ کو منسوخ کر دیا تھا، خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ ملاحظہ ہو، ایس۔ چندرا کی 'Parties & Politics at the Mughal Court' 1707ء 1740ء ص 128-29، 166

اور راستوں کی حفاظت کے متوازی طریقے رائج ہوں۔ لہٰذا انتظام جاگیرداری کا شاہی اقتدار کو طاقت فراہم کرنا خود اپنے وجود کی معاشی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے مترادف تھا۔ مغربی یورپ کے فیوڈلی امراء (Feudal lords) کے برخلاف مغلیہ دور کے جاگیرداروں کو روپیہ پیسہ اور تجارت کے "تحلیلی اثرات" سے خائف ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

فصل 2 کسانوں پر مظالم

بادشاہ کا اقتدار اعلیٰ، مغلیہ حکمران طبقہ کی یکجہتی اور اتحاد باہمی کا عملی مظہر تھا۔ حکمران طبقہ کے ایک فرد کی حیثیت سے جاگیردار کو بادشاہ کے تفویض کردہ اختیارات کے علاوہ کوئی اور حقوق حاصل نہ ہوا کرتے۔ جاگیردار محض اپنی مرضی کے مطابق جاگیر کا انتظام کرنے کا مجاز نہ ہوتا بلکہ اسے شاہی ضابطوں کی پابندی کرنی ہوتی۔ شاہی انتظامیہ مطالبۂ مالگذاری کی شرح اور اس کی تشخیص و وصولی کے طریقے سب کچھ معین کیا کرتا[1] بادشاہ یہ بھی فیصلہ کرتا کہ مالگذاری کے علاوہ اور کون کون سے محصول وصول کیے جا سکتے تھے[2] جاگیردار اور اس کے کارپردازوں کے طور طریقوں کی نگرانی قانون گو، چودھری، فوجدار اور وقائع نویس ایسے عہدہ داران کے ذمہ تھی[3]

حکومت کی مالی پالیسی دو بنیادی امور کے پیش نظر مرتب کی جاتی تھی۔ اولاً، چونکہ منصبداران اپنی جاگیروں کے محاصل سے اپنے فوجی دستوں کی کفالت کیا کرتے، لہٰذا مطالبۂ مالگذاری کو زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک بڑھا کر رکھا جاتا تھا تاکہ مملکت کے لیے زیادہ فوجی طاقت حاصل کی جا سکتی۔ لیکن ثانیاً، یہ بات بھی ضرور واضح رہی ہوگی کہ اگر شرح مالگذاری اس قدر زیادہ بڑھا دی گئی کہ کسان کی بچت اس کے زندہ رہنے کے لیے ناکافی ثابت ہوئی تو مالگذاری کی آمدنی قطعی طور پر گھٹ جائے گی۔ انہیں امور کے باعث شاہی حکام اپنے مطالبۂ مالگذاری کو اس طور پر معین کرتے جو معمولاً کسان کی پیداواری بچت کے تقریباً برابر اور اس کے لیے محض اس قدر چھوڑ دیتے جو اس کی زندگی کی ناگزیر ترین ضروریات کے لیے کفایت کر سکے[4]

[1] باب 2 کی فصل 2۔
[2] باب 6 کی فصل 7۔
[3] باب 7 کی فصل 2۔
[4] باب 6 کی فصل ایک۔

کسان کی پیداواری بچت کا یہی تصرف، مغل حکمراں طبقہ کی دولت کی فراوانی کا سبب تھا۔ ہندوستانی تاریخ کے پورے دور میں شاید ہی "امیروں کی فراوانی اور عوام کی انتہائی محکومیت و افلاس" میں اس قدر نمایاں فرق رہا ہو جس قدر کہ مغلوں کے دور میں پایا جاتا تھا[1]

اس کے باوجود بظاہر مطالبۂ مالگزاری میں اس سے بھی زیادہ اضافہ کرنے کے رجحان کا پتہ چلتا ہے جس کے اثرات وقت کے ساتھ بڑھ رہے تھے۔ اس رجحان کا اصل محرک، نظام جاگیرداری کی اپنی مخصوص نوعیت تھی۔ شاہی انتظامیہ جو مملکت اور حکمران طبقہ کے طویل المیعاد مفاد کو اپنے پیش نظر رکھ سکتا تھا، غالباً مطالبۂ مالگذاری کو ایک مناسب حد کے اندر رکھنے کی کوشش کیا کرتا۔ کسی پچھلے باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ تخیل کہ شاہی انتظامیہ نے سترھویں صدی کے دوران مطالبۂ مالگزاری میں زیادہ اضافہ کیا تھا متعلقہ شہادتوں کی بیحد سطحی تعبیر پر مبنی ہے اور اس امر کے اشارات ملتے ہیں کہ نقدی شرحوں میں جو اضافہ ہوا وہ زرعی پیداواروں کی قیمتوں میں اضافہ کے تقریباً متناسب تھا[2] لیکن شاہی انتظامیہ اور منفرد جاگیردار کے مفاد میں قدرے تضاد پایا جاتا تھا۔ جاگیردار جس کی جاگیر کسی لمحہ بھی تبدیل کی جا سکتی تھی اور جو کسی جاگیر پر کبھی بھی زیادہ سے زیادہ تین یا چار سال سے زائد قابض نہ رہتا، ترقی کاشت کی کسی دور رس پالیسی پر کبھی بھی عمل پیرا نہ ہو سکتا تھا[3] دوسری طرف خود اس کے ذاتی مفاد کا

---

[1] elsaent 'x 60 موازنہ یہ Berior 230 "ملک ایک لمبے چوڑے دربار کی شان و شوکت کو قائم رکھنے اور عوام کو محکوم بنانے کی غرض سے ایک بڑی فوج کی کفالت کے باعث ویران ہو گیا ہے۔ عوام کے مصایب کو مکمل طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ڈنڈا اور کوڑا انہیں دوسروں کے نفع کی خاطر مسلسل محنت پر مجبور کرتا ہے"

[2] باب 6 کی فصل ایک۔

[3] میر فتح اللہ شیرازی کی تجاویز میں سے ایک کا مقصد بظاہر جاگیرداروں کو اپنے علاقہ کی ترقی پر راغب کرنے کی خواہش تھی۔ تجویز یہ تھی کہ اگر کوئی جاگیردار اپنے اقطاع کو آباد کرے اور اس کے محاصل کو بڑھائے تو اس کا منصب بڑھا دیا جائے تا کہ اضافۂ تنخواہ کی وجہ سے وہ اپنی کوششوں کا ثمرہ حاصل کر سکے۔ (اکبرنامہ (3) صفحہ 459) اسی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ اورنگ زیب نے راؤ کرن کی ترقی کی سفارش اسی بنا پر کی کہ اس نے اپنی سابقہ جاگیر کو بہت بہتر حالت میں چھوڑا تھا (ادب عالمگیری، اوراق 36 ب۔ 37 الف، رقعات عالمگیر 3-112) یہ ایک واضح امر ہے کہ اگر کسی جاگیردار کو ترقی نہ ملے تو پھر اسے اپنی جاگیر کو بہتر بنانے سے کیا حاصل۔

تقاضا اسے ہر اس ظلم کے کرنے پر مجبور کرتا جو اس کے لیے فوری طور پر نفع بخش ہو خواہ اس کے نتیجہ میں کسان تباہ اور اس علاقہ کی مالگزاری ادا کرنے کی صلاحیت ہمیشہ کے لیے برباد ہی کیوں نہ ہو جائے۔

برنیر منفرد جاگیرداروں کے مطمح نظر کو اپنی ایک مشہور عبارت میں یوں بیان کرتا ہے۔

"تیمرئیٹس[1] (Timariots) (جاگیرداران کے لیے برنیر کی اصلاح) صوبیداران اور مالگزاری کے اجارہ داران اپنے طور پر اس طرح توجیہہ کرتے ہیں؛ اس ملک کی خستہ حالی سے ہم کیوں پریشان ہوں! اسے سرسبز بنانے پر ہم اپنا وقت اور دولت کیوں صرف کریں؟ ہم چشم زدن میں اس سے محروم کیے جاسکتے ہیں اور ہماری محنت، ہمیں یا ہماری اولادوں کو فائدہ نہ پہنچائے گی۔ کیوں نہ ہم زمین سے زیادہ سے زیادہ کھینچ لیں، خواہ کسان فاقہ کریں یا بھاگ جائیں اور جب چلے جانے کا حکم ہو تو ہم اسے ایک سنسان ویرانہ کی شکل میں[2] چھوڑ کر چلدیں۔"

برنیر نے حالات کا بیحد تفصیلی جائزہ دیا ہے، لیکن سینٹ زیویئر (St. Xavier) ہاکنس (Hawkins) اور مینریق (Manrique) اس کے قبل ہی اس طرح کے مشاہدات قلمبند کر چکے ہیں۔[3] ہندوستانی مصنفین میں بھیم سین کا واضح بیان ہے کہ جاگیروں کے مسلسل اور ناگہانی تبادلوں کے باعث جاگیرداران نے، کسانوں کی مدد کرنے (رعیت پروری) یا مستقل انتظامات (استقلال) کے طریقوں کو خیرباد کر دیا ہے۔ علاوہ اس کے جاگیرداروں کے عمال چونکہ خود اپنی ملازمتوں کی مدت کے متعلق بھی غیر مطمئن رہا کرتے، لہٰذا وہ "ظالمانہ طریقے اختیار کرتے ہوئے مالگزاری وصول کرنے میں سنگدلی سے باز نہ آتے"[4] جب جاگیرداران وصول

---

[1] یہ برنیر کی گڑھی ہوئی ایک ایسی ترکی اصطلاح ہے جسے استعمال کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ وہ ص 224 پر "جاگیر" کو واضح طور سے "تمار" کا مرادف سمجھتا ہے۔

[2] Bernier، 227

[3] زیویئر (Xavier) اس قدر قبل یعنی 1609 میں تحریر کرتا ہے کہ چونکہ جاگیروں پر قبضہ بادشاہ کی مرضی پر موقوف ہوا کرتا، لہٰذا "زمین کا قابض اسے اپنے قبضہ کی مدت کے دوران جس قدر ممکن ہوتا چوس لیتا تھا، یہاں تک کہ بیچارے مزدور اسے چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔" (مترجمہ Hosten, JASB, N. S. (23) 1927 ص 121)

ملاحظہ ہو نیز، ہاکنس، Early Travels' 114 'Manrique (2)، ص 372۔

[4] ونکشا ورق 139 الف۔

کرنے کی غرض سے اپنے آدمی مقرر کرنے کے بجائے اپنی جاگیر کو اجارہ پر اٹھا دیتا تو یہ خرابیاں اور بھی شدت اختیار کر لیا کرتیں۔ بقول صادق خاں، عہد شاہجہانی میں رشوت ستانی اور مالگذاری کی اجارہ داری زمین کو ویران کر رہی تھی، جس کے نتیجہ میں کسان لوٹے اور برباد کیے جا رہے تھے[1]

مذکورہ بیانات ظاہر کرتے ہیں کہ سترھویں صدی میں یہ تصور مستحکم ہو چکا تھا کہ جاگیروں کے تبادلوں کے نظام کے باعث کسان بڑی بیدردی کے ساتھ استحصال کا شکار ہوا۔ یہ ایک ایسی صورتحال تھی جس کی روک تھام شاہی انتظامیہ تھوڑے عرصہ کے لیے تو کر سکتا تھا لیکن اسے کلیتہً ختم کرنے پر قدرت نہ رکھتا تھا۔ شاہی ضابطوں کے تحت یہ جیسے کہ اس وقت تھے، جاگیرداروں کے اختیارات تمیزی کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ موسم کی خرابی سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وہ کسانوں کو چھوٹ یا قرض یا دیگر امداد فراہم کرتے یا نہ کرتے مگر وہ فصل کٹنے کے قبل ہی مالگذاری کی وصولی پر اصرار کر سکتے تھے[2] اس کے علاوہ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جن میں عملاً ضابطوں کی عدم تعمیل یا ان سے پہلوتہی کی جاتی۔ اورنگ زیب کے ایک فرمان کے مطابق اگر گجرات کے جاگیردار سیدھے سیدھے، اصل پیداوار کے ڈھائی گنے پر فصل کا تخمینہ[3] کر کے معلم پیداوار سے زائد مالگذاری میں طلب کر سکتے تھے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اکثر سرکاری ضابطے ضرور کاغذی حیثیت رکھتے تھے۔ اسی طور پر یہ ایک تسلیم شدہ امر تھا کہ جاگیرداروں کی متعدد وصولیوں کے متعلق اورنگ زیب کا امتناعی حکم بالکل بے اثر ثابت ہوا[4]

---

[1] صادق خاں، Or. 174، ورق 10 ب اور 1671 ورق 6 ب، ملاحظہ ہو نیز خافی خاں (1) صفحہ 157-8۔ خود اس کے زمانہ (اٹھارھویں صدی کی تیسری دہائی) میں عمال کے مظالم کے لیے بعض اوقات تو جاگیرداروں کے گماشتے گرد و نواح میں لوٹ مار کرنے والے عام ڈاکوؤں سے بہتر نہ ہوا کرتے۔ چنانچہ ہم بیسواڑہ کے فوجدار کو "عزیز خاں کی جاگیر میں جس کا گماشتہ محمود ڈاکوؤں کی ایک فوج کا سرغنہ تھا" لاقانونیت کی شکایت کرتا ہوا پاتے ہیں۔ (انشاء روشن کلام، ورق 24 ب اور سا اوراق 11 ب۔ 12 ب، 40 ب۔ 41 ب بھی) موازنہ بہ نیز احکام عالمگیری، ورق 90 ب۔

[2] باب 6 کی فصل 6۔

[3] مرآۃ (1) صفحہ 623 [4] خافی خاں (2) صفحہ 88-89

ان حالات میں، امر لازم تھا کہ بعض علاقوں کے کسانوں پر مطالبے، انہیں قوت لایموت سے محروم کر دینے کی حد تک زیادہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسے کسانوں سے جن کے پاس "ادا کرنے کا کوئی ذریعہ از قسم جایداد یا اثاثہ[1] نہ ہوتا، اس قدر کثیر مالگذاری کی وصولی بطریق شایستہ ممکن نہ ہو سکتی تھی۔ بقول مینرق، جب "اریتوڑس (Arraytos) (رعیت، کسان) مالگذاری کی ادائیگی سے قاصر رہتے تو انہیں بے دردی کے ساتھ زد و کوب اور (ان کے ساتھ) ناروا سلوک کیا جاتا"[2] منوچی اس موقع پر حکمرانوں کے نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ "روپیہ کی غیر موجودگی کے عذر پر کسانوں کی مالگذاری ادا نہ کرنے کی مستقل عادت ہے۔ سزائیں اور (ایذا رسانی کے) طریقے بیحد شدید ہیں۔ انہیں بھوک اور پیاس تک کی تکلیف پہنچائی جاتی وہ اپنے کو مرا ہوا ظاہر کرتے (جیسا کہ فی الواقعی بعض اوقات پیش آجاتا) لیکن اس ترکیب پر بھی ان کے ساتھ رحم نہ کیا جاتا"[3]

لہٰذا کسان اکثر مطالبۂ مالگذاری کو پورا کرنے کی غرض سے اپنی عورتوں، بچوں اور مویشیوں کو فروخت کرنے پر مجبور ہوتے[4] لیکن اس طرح از خود اپنی عورتوں کے بچوں کو غلام بنانا اس قدر عام نہ تھا جس قدر کہ زبردستی غلام بنایا جانا۔ ہماری اطلاع ہے کہ "پیداوار کی کچھ کمی کے باعث اجارۂ مالگذاری کی پوری رقم ادا کرنے سے معذور رہنے والے مواضعات کو ان کے مالکان اور حکام گویا کہ مال غنیمت تصور کرتے ہیں اور بغاوت کے فرضی الزام میں عورتوں کو فروخت کر دیتے ہیں"[5] انہیں (کسانوں کو) وزنی لوہے کی زنجیروں میں باندھ کر مختلف بازاروں اور میلوں میں (بغرض فروختگی) لے جاتے اور ان کی لاچار و غمگین عورتیں چھوٹے بچوں کو گود میں لیے ہوئے پیچھے پیچھے ان کی زبوں حالی پر ماتم کیا کرتیں"[6]

---

[1] Manrique (2) ص 272

[2] Manrique (2) ص 272

[3] Manucci (2) 450 - 51

[4] بدایونی (2) ص 189، Manucci (2) ص 451، مظہر شاہجہانی، 21۔

[5] Pelsaert 47

[6] Manrique (2) ص 272، موازنہ برنیر Bernier، 205۔

لیکن، کسان محض مالگذاری کی عدم ادائیگی کی علت ہی میں ایسی سزاؤں کے متوجب نہ قرار پاتے، بلکہ مملکت مغلیہ کا یہ ایک عام ضابطہ تھا کہ کسی جاگیردار کے علاقہ یا فوجدار کے حدود اختیار میں ڈاکہ پڑنے پر اسے یا تو مجرم کا سراغ لگا کر مال برآمد کرنا ہوتا یا بصورت دیگر وہ معاوضہ ادا کرتا[1] اس ذمہ داری کی انجام دہی غالباً کوئی ناخوشگوار کام نہ رہا ہوگا کیونکہ اس طور پران سربراہوں کو کسی بھی موضع کو جس پر وہ شبہ کرنا چاہیں لوٹنے کا موقع ہاتھ آجاتا تھا۔ بقول منڈی ایسی صورت میں مرد قتل کیے جاتے اور" ان میں سے بچی کھچی عورتیں و بچے سب بھگا کر بطور غلام کے بیچ ڈالے جاتے۔"[2] شاہی دربار کے نام ایک درخواست میں کہا گیا ہے کہ ایک ایسا موضع جہاں کبھی تشدد کا کوئی واقعہ پیش آیا تھا اس کے بعد سے مسلسل فوجدار کے مظالم کا شکار ہوتا رہا جو وہاں کے مویشیوں اور کسانوں کو بھگا لے جاتا[3] ابوالفضل واضح طور پر کہتا ہے کہ اکبر کا جنگ میں لڑنے والوں کی عورتوں اور بچوں کو پکڑنے اور فروخت کرنے کے متعلق امتناعی حکم اس سبب سے جاری کیا گیا تھا کہ بہت سے بد طینت اور حریص انسان محض بے بنیاد شبہ یا غداری کا غلط الزام عائد کر کے یا صرف بر بنائے طمع (دیہاتیوں کے مواضعات اور مکانوں میں داخل ہو کر انہیں لوٹتے اور جواب طلب کیے جانے پر ہزار طرح کے بہانے بناتے اور (معقول جواب دینے میں۔ مترجم) تاخیر یا گریز سے کام لینے کی کوشش کرتے ہیں"[4]

---

[1] ملاحظہ ہو باب 2 کی فصل ا۔

[2] بقول Mandy. 73 ـ 4 مواضعات بیشتر صورتوں میں چوروں کو اپنے یہاں پناہ گزیں ہونے سے باز نہ رکھ سکتے تھے اور اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ فوجدار جن لوگوں کے خلاف تادیبی کارروائی کرتے تھے وہ "کبھی کبھی بے قصور" ہوا کرتے۔ یہ بیان دوآبہ کے دوران سفر کا ہے۔ Factories ' 1646 - 50 ، ص 127 میں شائستہ خاں کی گجرات میں" ان بے مثال مظالم کے لیے جو وہ انتہائی غریب لوگوں کے مسلّم مواضعات کو اس الزام پر کہ گاؤں کے لوگ چوروں اور بدمعاش کو پناہ دیتے ہیں، ویران کرنے کے سلسلہ میں ڈھاتا تھا، مذمت کی گئی ہے۔ (حالانکہ جو واقعتہً ایسے ہیں" وہ بغیر کسی روک ٹوک کے دن دوپہر گھوم پھر سکتے ہیں")

[3] دررالعلوم، ورق 56 الف۔ب۔ یہ صحیح ہے کہ یہ موضع لکھی جنگل کے نواح کے ایک شورش زدہ علاقہ میں واقع تھا اور وہاں کے کسان ڈوگر ذات کے سرکش لوگ تھے۔

[4] اکبر نامہ (2)، ص 159 ـ 60 (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ہمارے مآخذ میں اس امر کی بہت زیادہ اطلاعات ملتی ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کسانوں پر مظالم میں اضافہ ہوا، کاشتکاری میں تنزلی ہوئی اور مفرور کسانوں کی تعداد بڑھی۔ سینٹ جے زیویئر کے بیان کے بموجب مغلوں کے گجرات اور کشمیر کو فتح کرنے کے بعد دیہی آبادی کی زبوں حالی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ "زمینیں بہ کثرت ویران ہو گئی ہیں جن پر اس کے قبل کی مدت میں 'موگورس' (مغلوں) نے قبضہ کر لیا تھا کیونکہ وہ اپنے مظالم سے ہر چیز کو برباد کر ڈالتے ہیں۔"[1] کہا جاتا ہے کہ مملکت کے وسطی خطوں میں 'نظام کڑوڑی' کے تجربے سے ایسی مصیبت نازل ہوئی کہ کسان 'مختلف سمتوں' میں منتشر ہو گئے جس کے نتیجہ میں آمدنی گھٹ گئی۔[2]

عہد جہانگیری میں کسان "ایسی بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ مظالم کے شکار ہوتے" کہ کھیت بلا کاشت کے ویرانوں میں بدل رہے ہیں۔"[3] ایک دوسرا مشاہدہ اس طور پر رقمطراز ہے "غریب مزدور (زمینوں) کو چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں جو ان کی کم آبادی کا سبب ہے۔"[4]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

سیاق نامہ، 88 میں ایک دلچسپ تحریر اس طرح کی دوش میں ایک عورت کے غلام بنائے جانے سے متعلق ہے۔ اسے ایک فوجدار نے کسی ایسے موضع میں جسے باغی بتایا گیا تھا گرفتار کر لیا تھا۔ اسے فوجدار کے ایک لازم یا سپاہی نے اپنی تنخواہ کے معاوضہ میں قبول کر کے 40 روپیہ میں فروخت کر ڈالا تھا۔

[1] ایسا 1615ء میں گجرات کے متعلق کہا گیا ہے (مکتوب ترجمہ Hosten, JASB, N.S. 23, 1927، صفحہ 125) اس نے 1597ء میں اپنے کشمیر کے سفر کے موقع پر لکھا ہے کہ "جب سے اس بادشاہ (اکبر) نے اس پر اپنا قبضہ کر کے یہاں پر اپنے عہدہ داروں کے ذریعہ حکومت شروع کی ہے جو یہاں کے لوگوں پر ظلم اور ناجائز وصولیاں کر کے ان کا خون بہاتے ہیں یہ بہت زیادہ غیر مزروعہ بلکہ غیر آباد ہو گیا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ اس بادشاہ کے پہلے انہیں کافی مقدار میں کھانا ملتا تھا۔ اور اب ہر چیز کی کمی ہے کیونکہ کسان ان مظالم کے باعث اب موجود نہیں ہیں (ایضاً 116)

1634ء میں مصنف، مظہر شاہجہانی صفحہ 52 پر اپنا یہ یقین ظاہر کرتا ہے کہ ٹھٹھہ (سندھ) ترخانیوں کے تحت بمقابلہ ان کے جانشین جاگیرداروں کے جو مغلوں کے مقرر کیے ہوئے تھے زیادہ خوشحال تھا۔

[2] بدایونی (2) صفحہ 187

[3] Pelsaert, 47

[4] سینٹ زیویئر کا آگرہ سے 1609ء میں لکھا ہوا خط، حوالہ سابقہ صفحہ 121۔

اگلے عہد کا مورخ بیان کرتا ہے کہ "آفات سماوی، سرکش زمینداروں کی بغاوت اور بدبخت عمّال کے مظالم کی وجہ سے "زمین کے وسیع قطعات بالکل غیر آباد ہوگئے اور بادشاہ اور اسکے لایق وزیروں کی کوششوں کے باوجود" بمقابلہ عہد جنت مکانی (جہانگیر) کے زمینیں زیادہ ویران دکھائی پڑتی ہیں[1] ایک ولندیزی سیاح کا 1629ء میں گجرات کے متعلق مشاہدہ ہے کہ کسانوں پر بمقابلہ پہلے کے زیادہ مظالم ہوتے ہیں (اور) وہ اکثر مفرور ہوجاتے ہیں" جس سے محاصل گھٹ گئے ہیں[2] 1631ء میں ایک ہندوستانی مصنف نے چیخ کر کہا کہ "جاگیرداروں کے مظالم سے سیوان (سندھ) "کسمپرسوں (نا پرسان) ظالموں اور بیکسوں کی جگہ ہوگئی ہے"[2 الف] دکن میں اورنگزیب کی دوسری نیابت سلطنت کے قبل کے دنوں میں "صوبیداروں کے مظالم اور غفلت کی وجہ سے "زمین ویرانی کے عالم میں تھی اور کسان "منتشر" ہوگئے تھے[3]

مملکت مغلیہ کی خرابیوں پر برنیر کے ایک طویل مقالہ سے اوائل عہد عالمگیری کے حالات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کا بھی بیان ہے کہ "اچھی زمین کا ایک معتدبہ حصہ مزدوروں کی قلت کے باعث غیر مزروعہ رہتا ہے" جن کی زیادہ تعداد "صوبیداروں کے ناروا سلوک کے باعث ختم ہوتی جاتی ہے" یا ان کے لیے "علاقہ کو چھوڑ دینے "کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں رہتا[4]

آخر میں خافی خاں عہد محمد شاہی کے اوائل میں جو حکومت مغلیہ کے دم واپسیں کے دن تھے تحریر کرتے ہوئے کسانوں کی حالت اور کاشتکاری کی تنزلی کا حسب ذیل نقشہ کھینچتا ہے:

"دانشمندوں اور واقف کاروں پر روشن ہے کہ اب زمانہ کی وضع کچھ ایسی ہے کہ امور ملکی میں غور وخوض نہیں کیا جاتا (اور) کسانوں کی نگہداشت اور ملک کی خوشحالی اور پیداوار کے

---

[1] صادق خاں، OZ. 174 ، ورق 10 الف۔ب، OZ. 1671، ورق 6 ب

[2] Geleynssen ترجمہ Moreland, JIH (4) ص 78

[2 الف] مظہر شاہجہانی، 173 ۔ 4

[3] ادب عالمگیری، اوراق 26 ب، 30 ب، 31 الف، 34 الف، رقعات عالمگیر ص 69، 70، 84، 91 ۔

[4] Bernier 205 و 226 ۔ 27 بھی Agrarian System 147 نوٹ میں مندرج مورلینڈ کی وضاحت کے مطابق اس ترجمہ میں لفظ 'labourers' اصل کے لفظ 'laboureurs' کی جگہ استعمال کیا گیا ہے جس کا زیادہ صحیح ترجمہ 'کسان' ہوگا۔

اضافے (کے طریقے) سب رخصت ہو چکے ہیں۔ محصلین مالگذاری جو مالگذاری کو اجارہ پر لیتے ہیں (اسے حاصل کرنے کے لیے) دربار میں کافی رقمیں خرچ کرنے کے بعد اپنے اپنے محالوں پر پہونچتے ہیں اور جن کسانوں پر مالگذاری واجب الادا ہوتی، ان کے لیے وبال بن جاتے ہیں۔ چونکہ انھیں اگلے سال کے لیے تو درکنار سن رواں کی پوری مدت تک کے لیے بھی اپنے عہدہ کے قیام کا بھروسہ نہیں رہتا، لہٰذا وہ پیداوار کے دونوں (حکومت کے اور کسان کے) حصے زبردستی وصول کر کے بیچ ڈالتے ہیں۔ اگر وہ اسی قدر ظلم پر اکتفا کرتے ہوئے (کسانوں کے) بیلوں اور گاڑیوں کو فروخت نہ کر ڈالیں جن پر ان کی کاشتکاری کا دارومدار ہوتا ہے یا دربار میں اپنی خرچ کی ہوئی رقم یا اپنے سپاہیوں کے اخراجات یا اپنے معاہدہ کی کمی کی وصولی پر قناعت نہ کرتے ہوئے، کسانوں کے باقیماندہ مال واسباب بلکہ میوہ دار درختوں اور ان کی موروثی و مالکانہ زمینوں کو فروخت نہ کرا لیں تو یہ ان کی بڑی خداترسی کا ثبوت ہوگا۔ بیشتر پرگنے و قصبات جو پوری مالگذاری ادا کرنے والے تھے عہدہ داروں (حکام) کے ظلم و تعدی سے اس درجہ تباہ و برباد ہو گئے ہیں کہ ان میں مثل جنگلوں کے چیتوں اور شیروں نے بود و باش اختیار کر لی ہے۔ کتنے ہی دیہات اس درجہ ویران و بے چراغ ہو گئے ہیں کہ اس طرف کے آبادی راستوں کی کوئی علامت نہیں ملتی گو کہ حرص اور ایسے برے زمانہ کے طریقوں سے ملک روز بروز تباہ ہوتا جا رہا ہے اور کسان بد انجام محصلیں مالگذاری کے جور و جفا سے پس رہے ہیں (جبکہ) مظلوم کسانوں کے اہل و عیال کی آہوں کا وبال (روحانی) ان جاگیرداروں پر ہے نا خداترس حکام کی بے رحمی ان کے مظالم اور بے انصافیاں اس حد پر پہونچ چکی ہیں کہ اگر کوئی اس کا عشر عشیر بھی بیان کرنا چاہے تو ممکن نہیں[1]

۱؎ خافی خان (۱) 157 - 9 خافی خاں نے غالباً اس حصہ کو 1720 - 21ء میں یا اس کے قبل لکھا تھا حالانکہ اس نے تصنیف کو 1731ء میں مکمل کیا۔ ملاحظہ ہو (Storey, 'Persian Literature' - A Bio - bibliographical Survey', Sec. 2 Facs, 3, p. 468 & n.)

یہاں ترجمہ کی ہوئی عبارت کا مطبوعہ متن نقائص اور ابہام سے پاک نہیں مثلاً آخری جملے کے شروع میں لفظ 'Greed' کے بعد الفاظ 'and Peasants' درج ہے۔ اس کا سبب غالباً اصل کا غلط پڑھا جانا ہے، لیکن چونکہ میں نے اس عبارت کے سلسلہ میں مخطوطات سے رجوع نہیں کیا، اس لیے صحیح عبارت کے تعین کے سلسلہ میں کوئی رائے نہیں ظاہر کر سکتا۔

مذکورہ بیانات کی تصدیق جہاں تک ان کا تعلق کاشتکاری کی تنزلی کی نشاندہی سے ہے، آراضی کے اعداد و شمار کے حوالے سے نہیں کی جا سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ عام طور پر بمقابلہ آئین اکبری کے عہد عالمگیری کے آراضی کے اعداد بہت زیادہ ہیں، لیکن اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ واقعتہً زیادہ زمینوں کی کاشت کی گئی ہے بلکہ اس کا مطلب جیسا کہ باب اوّل میں ذکر آ چکا ہے محض یہ ہے کہ پہلے کی غیر پیمودہ زمینوں کی درمیانی مدت میں پیمائش کی گئی۔ یہ بھی ہمارے علم میں ہے کہ مغلوں کے زمانہ میں بعض علاقوں مثلاً بنگال کے ڈیلٹا کے مشرقی حصوں اور ترائی کے کچھ حصوں میں بڑے پیمانہ پر زمینوں کی بازیابی عمل میں آئی۔[1] لیکن یہ رقبہ پوری مملکت کے مزروعہ علاقہ کے ایک ناقابل لحاظ حصہ سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ علاوہ اس کے یہ بھی ممکن ہے کہ ایک علاقہ کی ترقی کے ساتھ دوسرا علاقہ ویران ہوا ہو۔

پوری سترھویں صدی کے 'جمع دامی' (تشخیص شدہ مالگذاری) کے اعداد جو کثرت سے ملتے ہیں بے حد اضافہ ظاہر کرتے ہیں۔ مگر جیسا کہ منسلکہ گوشوارے سے معلوم ہوتا ہے اسی مدت میں قیمتوں کے زیادہ اضافہ نے اس زیادتی کو تقریباً بالکل کالعدم کر دیا تھا ہم کسی پچھلے باب میں یہ امر مسلم کر چکے ہیں کہ بمقدار پیداوار، مالگذاری زمین کے بارے میں کوئی فرق نہ ہوا۔[2] چنانچہ اگر بڑھتی ہوئی قیمتوں کی نسبت سے 'جمع دامی' اپنی جگہ قائم رہی تو یہ قیاس درست ہوگا کہ کاشتکاری میں بالکل ہی اضافہ نہ ہوا یا اگر ہوا بھی تو بہت معمولی۔ اس کے علاوہ اگر یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہو سکتا ہے کہ 'جمع دامی' کو مصنوعی طور پر بڑھانے کا رجحان پایا جاتا تھا۔ تو پھر بظاہر زیر کاشت رقبہ میں حقیقتاً کمی واقع ہوئی ہوگی۔

---

[1] ملاحظہ ہو باب ا کی فصل ایک۔ بنگال میں زمینوں کی بازیابی کا سلسلہ شائستہ خاں کے اراکان کی کامیاب مہم کے بعد شروع ہوا اور جہاں تک ترائی کا تعلق ہے دور مغلیہ میں جنگلوں کی سب سے زیادہ صفائی غالباً کانت اور گولا کے محالوں میں ہوئی۔

[2] ملاحظہ ہو باب ۶ کی فصل ایک۔

گوشوارے

ا۔ قیمتوں میں اضافہ

آئینِ اکبری کی قیمتوں کی بنیاد پر

سال	ٹکسالی سونے کی قیمت	ٹکسالی تانبہ کی قیمت	زرعی پیداوار کی قیمت (معمول کی فصلیں)	بیانہ کے نیل* کی قیمت
1595 - 6	100	100	100	100
1609	111	100 گجرات		150
1614	119	95-105 گجرات		
1615			64 تا 70 یا 78 تا 86	
1621	111		مابین آگرہ و لاہور	
1626	156	123 آگرہ		
1627				200
1628		161 گجرات		
1633	138	160 گجرات		
1636		149 گجرات		
1637		133 آگرہ		
1638		138 آگرہ		
1639			164 شکر، لاہور	281
1640	144			
1641 - 2	166			
1644 - 5	156			

* آئینِ اکبری میں مندرج 16 روپیہ کی انتہائی قیمت بطور بنیاد پر فرض کیا گیا ہے۔

نوٹ۔ یہ گوشوارہ باب 2 کی فصل 3 اور ضمیمہ ج کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔

سال	ٹکسالی سونے کی قیمت	ٹکسالی تانبے کی قیمت	زرعی پیداوار کی قیمت و محصول کی فصلیں	بیانہ کے نیل کی قیمت
1646			141 شکر، آگرہ	263
1651			141 شکر، آگرہ	
1653	156			
1656		179 سندھ		200
1658	183			
1659		167		
1661	161 تا 163	267 دکن		
1662	167	250 دکن		
		276 دکن		
1666	178	235 گجرات		
1667		250 گجرات		325
1670			288 گیہوں، آگرہ	
1671		267 (؟) پٹنہ		
1676	167			
	133 و 122			
1677	153			
1680	138 -144			
1684	138			
1690 -93	156	200 گجرات		
1695	147	222 گجرات (؟)		
1697	146			
1702			286 گیہوں، لاہور	

‡ جمع دامی میں اضافہ

(اعداد آئین اکبری کی بنیاد پر)

سن	مجموعہ مملکت (بغیر دکن)	بنگال	اڑیسہ	بہار	اودھ	الہ آباد	آگرہ و دہلی	مالوہ	گجرات	اجمیر	لاہور	ملتان و ٹھٹھہ	کشمیر
1595 -96	* 100	100	100	100	100	100	100	100	100	100	100	100	100
1605	110	70		114	115	145	122	107	107	107	120	96	
قبل 1627	119	83		136	116	146	129	115	115	145	155	148	
1628 -36	123	92	118	132	130	144	124	107	107	107	120	+	
38 1633	142	100	100	168	130	172	146	82	105	186	159	126	193
47 1649	162	116	118	174	160	191	166	121	120	207	164	133	242
تقریباً 1656	168	107	74	236	182	251	254	198	197	224	198	158	184
1667	145 ‡	122	116	314	160	208	193	102	102	220	165	119	344
1709 1687	169	122	84	177	161	217	205	104	104	225	163	106	371

* یہ اس رقم کو نہیں جو آئین اکبری میں مملکت کے لیے درج ہے، بلکہ صوبہ جات دکن کو چھوڑ کر مختلف صوبوں کی میزان کو ظاہر کرتا ہے۔

+ یہاں عدد کو مخطوطہ میں نقل کی بین غلطی کے باعث استعمال نہیں کیا گیا۔

‡ ایسا اس مدت کے چار گوشواروں میں سے دو میں ہے۔ 1687 تا تقریباً 91 ء اور 1687 تا تقریباً 95 ء کے دیگر گوشواروں میں آئین اکبری سے مطابقت کرنے کے بعد علی الترتیب 181 اور 167 کے اعداد آتے ہیں۔

نوٹ: یہ گوشوارہ ضمیمہ د کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔

جیسا کہ ابھی ذکر آیا ہے خاص بات جس کی متعدد معاصر مآخذ سے تائید ہوتی ہے یہ ہے کہ زیر مطالعہ عہد میں اپنی زمینوں سے فراری کسانوں کے معمولات میں داخل تھی اور بظاہر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس عمل کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے قبل اس بات پر بحث

آچکی ہے کہ غیر مزروعہ زمینوں کی بہ افراط موجودگی کے باعث کسانوں کی انتقال مکانی ہمارے عہد کی زرعی زندگی کا عام شیوہ تھا۔[1] قحط سالی کی صورت میں مسلم آبادیوں کے ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کا قاعدہ تھا[2] لیکن کسانوں کی نقل مکانی میں بجائے کسی اور امر کے خود انسان کے بنائے نظام کو زیادہ دخل تھا۔ بقایہ مالگذاری کی ادائیگی کسان کی بساط کے باہر ہونے کی صورت میں وہ اپنی زمینوں سے بھاگ کر ہی اپنی جان کو محفوظ رکھ سکتا تھا۔[3] یہ بھی ممکن تھا کہ نئے مقام پر آباد ہوتے وقت اچھوتی زمین کو زیر کاشت لانے کے صلہ میں اسے کچھ مراعات حاصل ہوجاتیں۔[4] بظاہر ان صورتوں کے سد باب کی غرض سے بعض سرکاری تحریروں میں تاکید کی گئی ہے کہ غیر مزروعہ زمینوں پر صرف وہی کسان بسائے جائیں جو 'غیر جمعی' یعنی اس کے قبل وہ کسی اور جگہ مالگذاری نہ ادا کرتے ہوں۔[5] اس طور پر کچھ کسان کاشتکاری کا مشغلہ بالکل ترک کر دیتے تھے۔ بقول برنیر، مثلاً بعض "گاؤں" چھوڑ کر بوجھ ڈھونے، پانی پہونچانے یا سائیس کے قسم کی نسبتاً زیادہ آسان ذریعہ معاش کی تلاش میں شہروں یا چھاؤنیوں کو چلے جاتے تھے۔[6] مغلوں کے زمانہ میں شہری آبادی نسبتاً بہت زیادہ تھی۔

---

[1] ملاحظہ ہو باب 4 کی فصل ایک۔

[2] ملاحظہ ہو باب 3 کی فصل دو۔

[3] 1623ء میں بعض گاؤں والوں پر نوساری کے قریب ایک انگریزی جہاز کے ٹوٹے پھوٹے حصّوں کی چوری کا شبہ کیا گیا۔ انگریزوں کو معلوم ہوا کہ نوساری کا کروڑی ان کے خلاف کاروائی کرنے میں اس سبب سے پس و پیش کر رہا تھا کہ وہ لوگ اس کے مقروض تھے اور سختی کیے جانے پر وہ "غالباً بھاگ جائیں گے"۔ (Factories 1622 - 23، صفحہ 253 - 4) سرکاری احکام ایسے کسانوں کی کثیر تعداد میں موجودگی کے شاہد ہیں جو بقایہ مالگذاری یا قرضہ تقاوی کی ادائیگی سے بچنے کی غرض سے بھاگ جاتے تھے۔ موازنہ ہو 'ادب عالمگیری' ورق 123 ب، 'نگارنامہ منشی' اوراق 194 ب۔ 195 الف۔ Bodl. 145 الف، ب، مرآۃ (1) صفحہ 290 - 91)

[4] ملاحظہ ہو باب 6 کی فصل 8۔

[5] نگارنامہ منشی' اوراق 103 ب۔ 104 الف، 187 الف۔ 188 الف، Bodl. اوراق 79 الف ب۔ 148 الف۔ 149 الف۔

[6] 'Eernier 205

اور دیہاتی علاقے، چھوٹے درجہ کے ملازموں، غیر فنی مزدوروں اور غلاموں کی وہ بے شمار تعداد فراہم کیا کرتے جن سے ان دنوں شہر بھرے ہوئے تھے[1]

پھر بھی جیسا کہ منی[2] کا دکھنی ہندوستان کے متعلق بیان ہے، ہر جگہ مظالم کا وہی عالم تھا اور ادھر ادھر مارے مارے پھرنے والے تارکین وطن خوش زندگی نہ بسر کرتے تھے[2] مظالم کے حد سے گذر جانے پر کسان فاقہ کشی یا غلامی اور مسلح مزاحمت کے درمیان اپنے لیے کوئی راہ منتخب کرنے پر مجبور ہوا کرتا[3]

---

[1] شہروں کی جسامت کے لیے ملاحظہ ہو باب دو کی فصل دو

[2] Manucci (3) صفحہ 47، 51

[3] اٹھارہویں صدی کے مصنفین میں شاہ ولی اللہ دہلوی مظالم کی زیادتی اور عوامی بغاوت کے درمیان پائے جانے والے رشتہ سے بہت زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق ان کے زمانہ میں "دیہاتیوں (قصبوں) کی تباہی" کا پہلا سبب سرکاری خزانہ سے کاہل الوجود لوگوں کے ایک بڑے طبقہ کی کفالت تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ "اس کا دوسرا سبب کسانوں، تاجروں اور اہل حرفہ پر محصولوں کی گرانباری تھی اور اس کے بعد ان پر ڈھائے جانے والے مظالم تھے جن سے کمزور تو معز ور برباد اور طاقتور آمادہ بہ بغاوت ہو جاتے ہیں۔" بلاشک دیہات (یا قصبہ) میں امن محصولوں میں تخفیف ہی سے قائم ہو سکتا ہے۔" (حجۃ اللہ البالغہ عربی متن اور اس کا ابو محمد عبد الحق حقانی کا متوازی خانوں میں کیا ہوا اردو ترجمہ۔ کراچی، ن ع (ا) صفحہ 94) اسی تصنیف میں ایک دوسرے مقام پر بھی اور بازنطینی درباروں کی عیش پسندیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ان کے زمانہ کے دیگر "ملکوں کے حکمرانوں" میں بھی یہی بات دیکھی جا سکتی تھی۔ ایسی عیش پرستیاں محض ناعاقبت اندیشانہ مظالم ہی کے سہارے چل سکتی ہیں اور "اس قدر زیادہ دولت کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ تاجروں اور اہل حرفہ پر کثیر محصول عاید کیے جائیں اور ان کے ساتھ سختی کا سلوک ہو۔ وہ اگر ادائیگی میں کوتاہی کرتے تو قتل کیے جاتے اور انہیں مختلف طریقوں سے گزند پہونچایا جاتا ہے اور فرمانبرداری کی صورت میں وہ گدھوں اور بیلوں کی طرح پانی نکالنے، ہل جوتنے اور فصل کاٹنے کے مصرف میں لائے جاتے ہیں۔" (ایضاً (ا) صفحہ 225)

یہ امر کہ شاہ ولی اللہ جیسے مذہبی صاحب قلم بھی مملکت مغلیہ کے زوال کے اسباب کا تجریہ کرتے وقت مظالم اور بغاوت کے درمیان علت و معلول کا رشتہ تصور کرتے ہیں (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

فصل 3 کسانوں کی مسلح مزاحمت

اس امر کا اظہار بے ضرورت معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں کے عوام کے رجحانات خواہ کچھ رہے ہوں مگر جنگجویانہ نہ تھے۔ مالوہ میں کسان اور اہل حرفہ کے اسلحہ بند رہنے کے رواج کو وہاں کی ایک خصوصیت بتائی گئی ہے۔[1] پلسارٹ (تقریباً 1626ء) نے یہ بات خاص طور پر لکھی ہے کہ باوجود اس قدر فلاکت اور تنگ حالی کے " لوگ اس بات کے اعتراف کے ساتھ کہ وہ اس سے بہتر کے مستحق نہیں۔ صبر کے ساتھ برداشت کرتے رہتے ہیں"[2]

لیکن، بہرحال برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ کسان اپنی سرکشی کا مظاہرہ اپنے مخصوص روایاتی طرز پر مالگذاری زمین کی ادائیگی سے انکار کی شکل میں کیا کرتا۔ لیکن ان پر کیے گئے بعض مخصوص مظالم بھی انہیں بغاوت پر آمادہ کر سکتے تھے۔[3] کہا جاتا ہے کہ وہ ڈاکے بھی مارتے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

غالباً یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ تخیل کس قدر عام تھا۔ مگر (اس نظریہ کی بنیاد پر) خود شاہ ولی اللہ کے متعلق یہ اعلان کرنا جائز نہ ہوگا کہ وہ " ایک صاف ذہن رکھنے والے سیاسی مفکر تھے" جن کی تحریریں مشرق میں جمہوری محرکات کی رفتار کو تیز کر سکتی تھیں" اور جنہوں نے "مزدوروں، اہل حرفہ اور کسانوں کی حمایت میں آواز اٹھائی (خلیق احمد نظامی، A History of Freedom Movement (پاکستان) (1) ص 512 - 41)
انھوں نے اس مسئلہ پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے انہیں اس سے زیادہ واقعاتی تفصیلات کے ساتھ پچاس برس قبل بھیم سین مرہٹوں کے عروج کے متعلق اپنی عبارت میں ظاہر کر چکا ہے (جو باب ہذا کی فصل 5 میں نقل کیا گیا ہے) علاوہ اس کے اس بات کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ شاہ صاحب کی ہمدردیاں غایت درجہ محدود تھیں۔ وہ کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ بشرطیکہ وہ غیر مسلم ہوں ساسانیوں اور بازنطینیوں پر کیے گئے ایسے مظالم کو قابل تقلید تصور کرتے ہیں۔ وہ واضح طور پر کہتے ہیں کہ ایک مثالی اسلامی نظام میں امام "کافروں کو مطیع اور ذلیل کر کے ان سے کھیتی اور باربرداری کے جانوروں کے مثل فصل کی اگائی، غلہ کی مالش اور ہنر کے (مختلف) کام لے سکتا تھا" (حجۃ البالغہ (1) ص 257)

[1] آئین اکبری (1) 455، تزک جہانگیری 172۔

[2] Pelsaert، 60

[3] Manucci (2) ص 451۔

لیکن کم از کم بعض مواقع پر وہ محض ایک کو لوٹ کر دوسرے کا پیٹ بھرا کرتے تھے[1]

اس طرح بغاوت یا محصولوں کی ادائیگی سے انکار کرنے والے مواضعات وعلاقے "مواس" وزور طلب، اور اس کے برخلاف مالگزاری ادا کرنے والے مواضعات 'رعیتی' کہے جاتے تھے[2] بمقابلہ

---

[1] رعد انداز خاں، فوجدار بیسواڑہ اس بات کا شاکی ہے کہ ایک پرگنہ میں پرامن کسانوں کے مواضعات کو باغی راہزنوں نے لوٹ کر ان کی زمینوں پر کاشت شروع کر دی ہے۔ وہ جب بھی انہیں نکالتا تو وہ کارندوں کی ملی کی وجہ سے دوبارہ آجاتے تھے جو ان کی موجودگی کو اپنے لیے سودمند تصور کرتے (انشاء روشن کلام، ورق 38 الف۔ ب)

[2] لفظ 'مواس' لغات میں نہیں ملتا لیکن ہمارے ماخذ میں اس کا مفہوم کافی واضح ہے مثلاً ایک محصل مالگزاری کا اپنے جاگیردار کے نام ایک خط کی عبارت اس طور پر ہے: "ہم لوگ پرگنہ میں پہونچے۔ رعیتی مواضعات سے چند چودھری، قانون گو اور کاشتکار حاضر آئے مگر وہ جو 'مواس' سے متعلق (یا ان کی سرحد پر) ہیں (ادائیگی) پر آمادہ نہ ہوئے۔ جنابعالی! یہ پرگنہ سرکش (زور طلب) ہے۔ ایک حصہ 'رعیتی' تین حصے 'مواس'، کسانوں اور باغیوں کو قابو میں رکھنے (اور) پوری مالگزاری وصول کرنے کے لیے ایک فوج کی ضرورت ہے۔" الخ (خط لیقی 15 الف۔ ب) ملاحظہ ہو 'اخبارات (ا ے) 233 بھی جس میں درج ہے کہ ایک پرگنہ "بے حد مواس اور زور طلب ہے" چنانچہ وہاں پر متعینہ دستہ کے سپاہیوں کا دوسری جگہ بھیجا جانا منسوخ کیا گیا۔ ان دونوں عبارتوں میں 'مواس' کو 'زور طلب' کے مرادف کے طور پر سرکش علاقہ کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ تاریخ طاہری، ورق 128 ب میں 'مواسہا' غیر ذی روح کے لیے جمع کا صیغہ بمعنی سرکش علاقے ہے لیکن 'مواس' کے معنی صرف 'ایک باغی' کے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ عباس خاں، ورق 107 سرکار سنبھل کے کسانوں کو 'سرکش' اور 'مواس' بتاتا ہے۔ اسی طور پر بدایونی (2) ص 219 'مواسان' (مواس کا ذی روح کے لیے جمع کا صیغہ) اور باغی " جو کبھی مالگزاری نہ ادا کرتے" کا ذکر کرتا ہے۔ Sandy، 90 بھی اس اصطلاح کو "ایک چھوٹے قصبہ ... جو 'مناسے' یا باغی تھے" کے بارے میں استعمال کرتا ہے۔ حالانکہ اس نے "مناسے" کے بجائے واقعتہً "مواسے" لکھا نہیں ہے لیکن یہ تقریباً یقینی ہے اس کا مدعا اسی لفظ سے تھا (اس کے مدیر کا 'مناسے' کو 'مینا' راجپوت کے مرادف قرار دینا ایک بے بنیاد قیاس آرائی ہے)

'مواس' قدرے تفصیلی وضاحت کا خاص طور پر اس لیے مستحق ہے کہ امیر خسرو اور برنی کے قارئین کے درمیان اس کے معنی کے متعلق قیاس آرائی چلی آرہی ہے۔ پروفیسر شیرانی 'اورینٹل کالج (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کھلے میدانوں کے ان مواضعات میں جو کسی درجہ میں گھاٹیوں یا جنگلوں یا پہاڑوں سے گھرے ہوئے ہوتے، حکام سے سرکشی کرنے کا زیادہ رجحان پایا جاتا تھا[1] منڈی اپنے بیان میں کہ "اس قسم کے جھگڑے (حکام و کسان کے درمیان) ہندوستان کے کسی نہ کسی حصہ میں چلتے رہتے ہیں" اس بات کا اضافہ کرتا ہے کہ گوار لیس، (گنواروں، دیہاتیوں) میں حالانکہ زیادہ مقابلہ کی تاب نہ رہتی مگر وہ کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے[2] یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مغلوب ہونے کے بعد ان کی کیا درگت بنتی رہی ہو گی۔ ہر شخص جو ہاتھ آتا مار ڈالا جاتا اور ان کی عورتیں، لڑکے، لڑکیاں اور مویشی بھگا لیے جاتے۔"[3]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

میگزین، 12 نمبر شمار ۲، (فروری 1936ء) ص 37-9 میں ان دونوں مصنفین کے حوالہ سے بتاتے ہیں کہ یہ ایک ہندی لفظ تھا جس کے معنی "پناہ اور حفاظت کی جگہ" کے ہوتے ہیں اور وہ اسے ایک چھوٹے قلعہ یا گڑھی کے مرادف قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنی اس تعبیر کی تائید میں کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیتے لیکن انہوں نے جن دو عبارتوں کا حوالہ دیا ہے ان میں اس لفظ کا استعمال اوپر قائم کیے گئے مفہوم سے بالکل ہم آہنگ ہے۔

رعیتی کے فرمانبردار یا مالگذاری ادا کرنے والے کے مفہوم کے لیے ملاحظہ ہو ہدایت القواعد، علیگڈھ مخطوطہ وصدیقی حوالہ سابقہ 65 الف۔ب۔ جس میں اسے 'زور طلب' کا ضد بتایا گیا ہے۔

[1] میدانوں کے بہت سے حصوں میں خاردار جنگل اگ آتے ہیں جس کے اوٹ میں پرگنہ کے لوگ بیعد سرکشی کی راہ اختیار کرتے ہیں اور مالگذاری (مال) نہیں ادا کرتے، بابرنامہ، ترجمہ Beveridge (2) ص 487، I.O. 3714، ورق 378 ب۔

[2] Mundy 172-3،

[3] Manucci (2) ص 451 ابوالفضل فوجداروں کو، کسان یا خالصہ یا کسی جاگیردار کے محصل مالگذاری جو بغاوت کا مظاہرہ کرتا ہے، کے خلاف کارروائی کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے لڑنے والوں یا ان کے کنبہ کے افراد کے انجام کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ وہ صرف اس قدر کہتا ہے کہ گاؤں میں جو کچھ بھی ہاتھ آئے اسے مال غنیمت تصور کرتے ہوئے اس کا پانچواں حصہ خالصہ کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ اگر موضع کے ذمہ مالگذاری کا کوئی بقایہ واجب ہو تو پہلے اسے مال غنیمت سے وصول کیا جائے (آئین اکبری (1) ص 283) اورنگزیب نے اپنے حکم میں جو جون 1671ء میں جاری ہوا باغی جماعتوں کو جو عموماً سزا دی جاتی تھی اس میں تشدد کو بظاہر کم کرنے کی کوشش کی۔ جملہ گرفتار یا زخمی باغیوں کو اگر دشمن (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

زیادہ تر کسانوں کی سرکشی کی یہ وارداتیں صرف کہیں کہیں پیش آتی تھیں۔ غالباً مصائب کی شدت موضع موضع میں عائد شدہ محصولوں کے بار کے اعتبار سے کم و بیش رہا کرتی تھیں۔ لہٰذا ایسا ممکن تھا کہ ایک گاؤں کے کسان علم بغاوت بلند کریں اور تہہ تیغ کر ڈالے جائیں مگر ان کے پڑوسی اس کا کوئی اثر قبول نہ کریں لیکن ان دنوں کسانوں کے اندر دو ایسی سماجی قوتیں کارفرما تھیں جو ان کی اس نوعیت کی سرکشی کے دایرہ کو وسیع کرنے میں معاون ثابت ہوئیں۔

اوّل تو ذات کی بنیادوں پر بڑی بڑی برادریاں قائم تھیں۔ موجودہ ہندوستان میں کسانوں کی تحریک کے ایک ممتاز رہنما نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ذات کی بندھنوں کا کسانوں اپنے مفاد کی اجتماعی حفاظت پر ابھارنے میں ایک اہم حصہ رہا ہے[1] ظاہر ہے کہ قدرتاً تین سو برس پیشتر کسانوں کی زندگی پر ذات پات کی گرفت اب سے کہیں زیادہ ہی رہی ہوگی۔ خون اور رسم رسوم کے ہزاروں رشتے کسانوں کو دور دراز مواضعات میں رہنے والے اپنی ہم ذات لوگوں سے میل جول کا موقع فراہم کیا کرتے۔ اگر وہ بغاوت کرتے تو یہ خاموش نہ رہ سکتے تھے۔ جاٹوں کی بغاوت، غالباً اس بات کا واضح ترین مثال فراہم کرتی ہے کہ ایک شورش جو بنیادی طور پر کسانوں سے متعلق تھی کیونکر ذات و برادری کے خطوط پر آگے بڑھی۔ میواتیوں و توؤں اور ڈدگردن ایسی سرکش ذاتوں کی غیر قانونی سرگرمیوں میں بھی ذات و برادری کے ایسے ہی اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

مگر زیر مطالعہ عہد میں کسانوں کی ایک بڑی تعداد کو برادری کی ایک نئی بنیاد جو ذات پات کی تقسیم کی امدادی نہیں بلکہ اصلاً اس کے منافی تھی فراہم ہو رہی تھی۔ اس کی تشکیل پندرھویں صدی کے اواخر کی مذہبی تحریکوں سے پیدا شدہ فرقوں کے ہاتھوں ہوئی۔ ان میں سے بیشتر کے خاص اصولوں میں یکسانیت پائی جاتی تھی جو اس طور پر تھے: کٹر وحدانیت پرستی، رسمی

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

میدان سے بھاگ نہ چکا ہو تو قتل کر دینا چاہیے۔ لیکن جب باغیوں کی فوج منتشر کی جا چکی ہو تو قیدیوں کی جان بخشی کر دینی چاہیے اور اگر وہ توبہ کا اظہار کریں تو انہیں مال غنیمت واپس کر دینا چاہیے (مرآۃ دا؛ ص 280) مگر یہ امر کہ ان ہدایات پر کبھی بھی عمل ہو سکا مشتبہ ہے۔

[1] E.M.S Namboordripad, 'The National Question in Kerala' بمبئی 1952ء ص 102-3

عبادات سے کنارہ کشی، ذات پات کی تمام بندشوں اور مذہبی تفریقات کی نفی۔ غالباً ان کے عقائد کی طرح ان کی تبلیغ کے طریقے بھی مخصوص تھے چونکہ ان کے اصل مخاطب عوام تھے، لہٰذا ان نئی تعلیمات کو دیسی زبانوں کے جامہ میں پیش کیا گیا اور ان کے پیغمبر، واعظ اور پیرو سب ہی بیشتر نچلے طبقہ کے افراد تھے۔ کبیر (تقریباً 1500ء) بیراگیوں کا پیغمبر اعظم، ایک جولاہہ تھا[1] داود داکبر کا ہمعصر) داد دپنتھیوں کا گرو گاؤں کا ایک دھنیا،[2] ہدید آس (متوفی 1645ء) نرنجیوں کا معلّم، ایک جاٹ غلام[3] اور گرونانک، غلہ کا ایک تاجر تھا۔[4] ان میں سے کوئی بھی خصوصاً کبیر اور گورونانک فروتنی و توکل کے علاوہ اور کوئی تعلیم نہ دیتے تھے اور ان کے یہاں جنگجوئی اور جسمانی تشدد کا سبق تو قطعاً نہیں ملتا۔ مگر مذکورہ مذہبی فرقوں میں سے بیشتر نے غالباً کبھی بھی سماجی تحریکوں کی شکل نہ اختیار کی۔ لیکن جب ایک جدید اور اطمینان بخش مذہبی مسلک کے زیر اثر اس قسم کے انقلابی تصورات، مثلاً ذات پات سے تنفر اور باہمی اتحاد کا شعور عوام کے ذہنوں اور قلوب میں بخوبی پیوست ہوگیا تو یہ فرقے ہمیشہ اپنے سابقہ صوفیانہ خول کے اندر مقید نہ رہ سکے۔

لیکن جہاں ایک طرف ذات و عقاید کے بندھنوں نے کسانوں کی شورشوں کے دایرہ کو وسیع کیا وہاں ساتھ ساتھ انہیں بندھنوں نے ان کے طبقاتی وصف پر پردہ بھی ڈال دیا یا ماند کر دیا۔ پھر بھی صحیح معنوں میں کلی تغیر اس وقت پیش آیا جب زمیندار طبقہ کے لوگ بھی خود اپنی اغراض کے تحت مغل حکمران طبقہ کی مخالفت میں شریک ہوگئے۔ یہ امر کہ کسانوں کی بغاوتیں اپنی ارتقا کی کسی منزل پر پہونچ کر زمینداروں کی قیادت میں آگئیں (یا انہیں کے رہنما زمیندار بن گئے) یا یہ کہ کسانوں نے مایوس ہو کر شروع ہی سے بغاوت کرنے والے زمینداروں کو سپاہی فراہم کیے، مظلوموں کی شورش کو دو ظالم طبقوں کی باہمی جنگ میں مدغم کرنے میں ایک فیصلہ کن اہمیت کا حامل معلوم ہوتا ہے۔

---

1. دبستان مذاہب، ص 246
2. ایضاً، ص 267-8
3. ایضاً، ص 267
4. ایضاً، ص 274

فصل ۵ زمینداروں کا سیاسی کردار

پانچویں باب میں ذکر آیا ہے کہ لفظ زمیندار کا مفہوم بہت وسیع تھا اور اگر ایک طرف اس لفظ کا مصداق ایک بڑی بادشاہت کا حکمران تھا تو دوسری طرف یہ کسی موضع کے صرف ایک جزو میں تھوڑے بہت حقوق کے مالک کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ پھر بھی عمومی طور پر زمینداروں کو حکمرانوں کے ایک مخصوص طبقہ سے تعبیر کیا جا سکتا تھا جن میں بہت سی خصوصیات بطور قدر مشترک تھیں اوّل تو ان کے حقوق بادشاہ کے عطا کردہ نہ ہوتے تھے، حالانکہ اس معاملہ میں بعض استثنائی صورتیں بھی ہوا کرتیں۔ دوسرے یہ کہ اسلحہ بند لازمین پر قابو ان کے حقوق کے ضروری لوازمات میں تھا اور اکثر زمینداران، ذات کی گروہوں کے سربراہ ہوا کرتے شاہی حکام اور ان میں نزاع کا خاص مسئلہ یہ رہا کرتا کہ زمین کی مالگذاری یا کسان کی پیداوار بچت میں اس کے حصہ کا تناسب کس قدر ہونا چاہیے۔ شاہی علاقوں میں زمیندار حکومت اور جاگیرداروں کی طرف سے صرف محصولوں کا وصول کرنے والے تصور کیا جاتا تھا اور انھیں بطور معاوضہ خدمت اس کا کچھ حصہ دے دیا جاتا تھا۔ کسانوں سے ان کی ناجائز وصولیوں میں سرکاری مفاد بطور سے بہت زیادہ یہ امر مانع رہا کرتا کہ سرکاری مالگذاری کی گرانباری کسانوں کے پاس کچھ پسماندہ نہ چھوڑتی جسے کوئی دوسرا لے سکے۔ ایسی صورت میں زمینداروں کے لیے یہ ایک دشوار طلب امر تھا کہ وہ اپنے مفاد کو ضرور پہونچائے بغیر مالگذاری وصول کر کے حکام کے سپرد کر دیں۔ خودمختار سرداران بھی اسی مخمصہ میں مبتلا رہتے تھے کیونکہ انہیں بھی مالگذاری یا خراج یا دونوں ہی ادا کرنا ہوتا تھا۔ علاوہ اس کے ان کی ریاستیں کبھی بھی شاہی مملکت میں شامل کیے جانے کے خطرہ سے محفوظ نہ رہ سکتی تھیں[1] اس کے ساتھ ساتھ زمینداران خواہ وہ مالگذاری جمع کرنے والے کی حیثیت میں ہوں یا سرداروں کی حیثیت میں چونکہ وہ اسلحہ بند سپاہیوں کو اپنی ملازمت میں رکھا کرتے تھے، لہٰذا حکومت ان سے اپنی مرضی کے مطابق بہ سہولیت نہ نمٹ سکتی تھی اور یہ حکومت کی نگاہ میں کانٹے کی طرح کھٹکا کرتے تھے۔

---

[1] مثلاً اورنگزیب کی تخت نشینی کی چار سال کی مدت کے اندر تین بڑی ریاستوں کو مملکت میں شامل کر دیا گیا، کوچ بہار (1661ء)، پلاموز (1661ء) اور نوانگر (1663ء)

چنانچہ سرکاری وقایع نویسوں کے بیانات حکومت کے جانب سے زمیندار طبقہ کے خلاف مخاصمانہ رویّہ کے مظہر ہیں۔ بقول ابوالفضل "ہندوستان کے بیشتر زمینداروں کا یہ وطیرہ ہے کہ وہ یک سوئی کی راہ کو ترک کرکے چاروں طرف نگاہ دوڑاتے رہتے ہیں اور جو بھی زیادہ طاقتور یا شورش پسند نظر آتا ہے اس کا ساتھ پکڑ لیتے ہیں[1]"۔ ایک دوسرے مقام پر وہ کہتا ہے کہ راجہ بھارامل نے "بہ سبب دانشمندی و خوش بختی زمینداروں کے زمرہ سے اپنے کو خارج کر کے دربار کے منتخبین میں شامل ہونے کا حوصلہ کیا۔" گویا کہ یہ دونوں حیثیتیں بے میل تھیں[2] اورنگزیب کاروباری مورخ ابوالفضل کی تقلید میں لفظ 'زمیندارانہ' کو موقع پرستی یا غدّاری کے مفہوم میں استعمال کرتا ہے[3]

سرکاری نقطۂ نگاہ سے لکھی ہوئی تحریروں میں یہ بات معمولات میں تصور کی گئی ہے کہ امن دامان کے لیے سب سے بڑا خطرہ ایسے زمینداروں کا وجود تھا جنہیں مالگذاری کی عدم ادائیگی کی علت میں بذریعہ فوجدار بہ جبر زیر یا پست کرنا ضروری ہوا کرتا[4]۔ کسی زمیندار کا قلعہ تعمیر کر لینا ہی حکام کی بدظنی اور بظاہر اس کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے کے لیے کافی تصور کیا جاتا[5]۔ رعد انداز خاں، فوجدار بیسواڑہ کے خطوط (م ـــــ 1702ء) اس صورتحال کی خاص طور پر وضاحت کرتے ہیں۔ ان خطوط میں ہم فوجدار مذکور کو وسط مملکت کے ایک بالکل قریبی میدانی علاقہ کے زمینداروں کے خلاف مسلسل مہموں کی سربراہی کرتا ہوا یا کبھی کبھی مہموں کو بھیجتا ہوا پاتے ہیں۔ زمینداروں کا خاص تصور ان کا مالگذاری ادا کرنے سے انکار بتایا جاتا ہے؛

---

[1] اکبرنامہ (2) ص 63

[2] ایضاً، 156 ـ

[3] کہا جاتا ہے کہ بیکانیر کا راجہ بھوز نیہ، دربار عالمگیری میں بہ سبب "بدنیتی اور زمیندارانہ رجحانات" حاضر نہ ہوا (عالمگیرنامہ، ص 517) ابوالفضل کے اس اصطلاح کے استعمال کے لیے ملاحظہ ہو اکبرنامہ (2) ص 63

[4] ہدایت القواعد، ورق 7 الف ۔ ب (فوجدار کے فرایض)، بیاض ایزدبخش رسا، ہلا یو. I. 4014، ورق 2 الف ۔ ب (خدا کے نام ایک نیم ظریفانہ عرضداشت میں ایک جاگیردار کے معرکے)

[5] احکام عالمگیری، ورق 205 الف ۔ ب، انشاء روشن کلام، ورق 6 ب ۔ قلعوں کو ہندی میں "گڑھیاں" کہتے ہیں (اس اصطلاح کے استعمال کے لیے موازنہ بہ 'دُرّ العلوم'، ورق 73 ب)

حالانکہ یہ الزام تقریباً ہمیشہ ہی ڈاکہ و لوٹ مار کے الزام کے ساتھ وابستہ رہا کرتا تھا[1] ممکن ہے کہ شاہی فرمانوں کے ذریعہ زمینداروں کی تقرری کا خاص مقصد جن کا رواج عہد عالمگیری میں زیادہ عام ہوا، نئے مقامی اثرات کو قایم کرکے سابقہ زمینداروں کی طاقت کا توڑ کرنا رہا ہو[2]۔

مذکورہ بالا شہادتوں سے فاناہم خود ہی یہ کلیہ قایم کر سکتے ہیں کہ شاہی انتظامیہ اور زمینداروں کے درمیان کش مکش جو اکثر مسلح صف آرائی کی شکل بھی اختیار کر لیتی تھی اس دور کے سیاسی حالات کا ایک اہم پہلو تھا۔ اس کی تائید میں ہمارے پاس منوچی کے بیان کی ایک واضح سند موجود ہے۔ وہ 1700 ویا اس کے قریبی زمانہ میں لکھتا ہے کہ "نائبین سلطنت وصوبیداران اور ہندو راجہ و زمینداروں کے درمیان معمولاً ایک مسلسل مناقشہ کی صورت رہا کرتی ہے۔ بعض سے اس لیے کہ وہ ان کی زمینوں پر زبردستی قابض ہونا چاہتے اور بعض سے اس لیے کہ معمول سے زاید مالگذاری کی جبریہ وصولی مقصود ہوتی ہے[3]" وہ ایک دوسری جگہ بھی یہ لکھتا ہے کہ "مملکت مغلیہ میں معمولاً کہیں نہ کہیں راجاؤں اور زمینداروں کی بغاوت کا سلسلہ چلتا رہتا ہے[4]"۔

شاہی طاقت کے خلاف اس غیر مساوی نزاع میں اپنی بیچارگی کا احساس، زمینداروں کو اپنے کسانوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھنے پر مجبور کرنے کا غالباً سب سے بڑا محرک تھا کیونکہ ان کی حمایت، مقابلہ اور سبز زاری دونوں صورتوں میں ان کے لیے ناگزیر تھی۔ علاوہ اس کے مقامی اشخاص ہونے کے باعث، زمینداران کسانوں کے حالات و رسم و رواج سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے۔ لہٰذا بمقابلہ خالصہ یا جاگیروں کے ملازمین کے جو اجنبی اور مقامی حالات سے ناواقف ہوا کرتے اور جن کی دلچسپیاں تشخیص مالگذاری کے فوری اضافہ تک محدود رہا کرتیں، زمیندار اپنے ماتحت کسانوں کے ساتھ زیادہ نرمی کے ساتھ معاملات کیا کرتے۔

چنانچہ ایسا واحد برنیری کا خیال نہیں ہے کہ کسانوں کو "کسی راجہ کے علاقہ" میں "ظلم کم اور آرام زیادہ ملتا تھا"[5] دربار عالمگیری کا مورخ بھی واضح طور پر تسلیم کرتا ہے کہ "ملک

---

[1] انشاء روشن کلام، اوراق 12 الف، 5 الف، 6 الف۔ب۔

[2] ملاحظہ ہو باب 5 کی فصل 3۔

[3] Manucci (2) 431-2

[4] ایضاً، 462۔ [5] Bernier، 205

ہندوستان کے زمینداران بطور حکمت عملی کے کسانوں کے قلوب کو جیتنے اور انہیں راضی و خوشی رکھنے کی غرض سے تاکہ وہ مالگذاری کی ادائیگی اور اس کی فرمانبرداری سے گریز نہ کریں اپنی زمینداریوں کے محالوں کی مالگذاری وصول کرنے میں نرمی سے کام لیتے ہیں اور شاہی مملکت کے ضابطوں اور قانون کو نافذ نہیں کرتے[1]

لہٰذا ایسا اکثر پیش آتا کہ شاہی حکومت کے براہِ راست زیر انتظام علاقوں کے مفرور کسانوں کو زمینداروں کی زمینیں اپنی طرف مائل کیا کرتیں۔ پلسارٹ اور برنیر نے مذکورہ صورتحال کا عمومی انداز میں تذکرہ کیا ہے[2] لیکن 1714ء کے ایک ضوابط نامہ میں یہ بات اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ منصبداران، تیا تا وہ جن کے پاس جاگیریں ہوا کرتیں "کسانوں پر (اپنی جبریہ وصولیوں کا) بار (لفظاً: ہاتھ) ڈالتے ہیں اور کسان کے لیے کوئی سہارا نہیں رہتا۔ کسان اپنی زندگی سے عاجز آکر رعیتی علاقہ سے فرار ہوکر باغی زمینداروں کے علاقہ کی راہ اختیار کرلیتے ہیں۔ اس طور پر باغی زمینداروں کے علاقہ کی آبادی میں اضافہ ہوتا ہے اور باغیوں کی طاقت روز بروز بڑھتی رہتی ہے۔[3]"

---

[1] عالمگیرنامہ ص 781، موازنہ بہ نیز فقرہ عربیہ اوراق 47 ب۔ 48 الف

[2] Pelsaert 47 Bernier 205

[3] ہدایت القواعد، علیگڑھ مخطوطہ، ورق 56 الف۔ ب کا مصنف منصبداروں کے کسانوں پر بڑھتے ہوئے مظالم کا یہ سبب بیان کرتا ہے کہ چونکہ ان کے منصب زیادہ اونچے نہ تھے، لہٰذا شورش پسند عناصر کو قابو میں رکھنے کے لیے ایک بڑی فوج رکھنے کا انہیں مقدور نہ تھا۔ لہٰذا انہیں روپیہ کی ضرورت رہا کرتی تھی اور چونکہ وہ طاقتور زمینداروں سے کچھ نہ لے سکتے تھے، لہٰذا کسانوں پر مظالم ڈھاتے تھے۔

اس عبارت میں لفظ "رعیتی" یا کسانوں کے زیر قبضہ براہ راست شاہی انتظام کے علاقے کے یا صرف مالگذاری ادا کرنے والے علاقے کے معنی میں ہے۔

منکر شاہجہانی (20۔ 21) میں بھی یہی بات کہی گئی ہے۔ جب 'اربابوں' (سندھ میں چودھریوں کے مرادف عہدہ داران جو بیشتر زمیندار تھے) پر مالگذاری کا مطالبہ بہت زیادہ بڑھ جاتا تو وہ بغاوت کردیتے تھے ایسی صورت میں، کسان ہمیشہ ان کی تقلید کرتے اور اپنی زمینوں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے، کیونکہ اگر وہ اپنی زمینوں پر لگے رہتے تو حکام کا عائد کردہ زیادہ مطالبہ انہیں (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

سترھویں صدی کی چند مخصوص مثالوں سے ان عمومی بیانات کی وضاحت ہوتی ہے مثلاً گجرات کے صوبیدار اعظم خاں کے زمانہ (1632 - 42ء) میں کسان مظالم سے عاجز آکر" ان میں سے بیشتر بھاگ گئے اور دور دراز علاقوں کے زمینداروں کے علاقوں میں پناہ گزین ہوئے"[1] اس پر اعظم خاں نے نوانگر کے زمیندار کو اس بات پر مجبور کرنے کی غرض سے کہ وہ ان کسانوں کو اپنے علاقہ سے نکال دے تاکہ وہ اپنے پرانے گھروں کو واپس ہوسکیں۔ اس پر حملہ کیا[2] اسی طور پر مالوہ میں کنور کے زمیندار (بلکہ اس کے سرپرست) کے خلاف ایک مہم بھیجنے کا صرف یہی سبب نہ تھا کہ" اس نے بطریق مناسب مالگذاری ادا نہ کی" بلکہ یہ وجہ بھی تھی کہ" صوبیدار کی جاگیر کے بعض محالوں کے کسانوں نے جو کنور کے علاقہ میں بھاگ کر چلے گئے تھے ان کافروں کے اشارہ پر مالگذاری بھی ادا کرنے سے گریز کیا"[3] عہد عالمگیری میں ہمیں تالکوکن کے فوجدار کی ایک شکایت ملتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ پہلے تو کثیر تعداد میں کسان زمینداروں کے علاقہ میں بھاگ گئے اور پھر جب اس نے ان کو بزور طاقت واپس لاکر چھ سو مواضعات میں بسادیا تو سالسیٹ کے پرتگیزی ان کو بہ ترغیب بھگا لے گئے[4]

چنانچہ اس طور پر کسان اور زمیندار مغلیہ حکام کی مخالفت پر اکثر متحد ہو جایا کرتے کوچ بہار کا واقعہ مثالی نہ صحیح مگر اس کی اپنی ایک مخصوص نوعیت ہے 1661ء میں جب یہ ریاست مملکت میں شامل کی گئی تو مغلیہ حکام نے یہاں "شاہی علاقہ کے محالوں کی مالگذاری کی تشخیص اور وصول کا" طریقہ رائج کیا۔ اس سے وہاں کے کسانوں میں فاتحین کے خلاف نفرت کا شدید جذبہ پیدا ہو۔ ہماری اطلاع ہے کہ معزول شدہ راجہ بیم نرائن ان کے ساتھ عام زمینداروں کی طرح نسبتاً بہت زیادہ نرمی سے پیش آتا تھا۔ اس وجہ سے کسانوں نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ادا کرنا ہوتا اور 'ارباب' واپس آکر انہیں قتل کر ڈالتے۔ اس تصنیف میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہموطن ہونے کے سبب سے بھی 'کسان' 'اربابوں' کی تقلید کیا کرتے۔

[1] مرآۃ (1) ص 216

[2] لاہوری (2) ص 232، مرآۃ (1) ص 214

[3] لاہوری (2) ص 370

[4] نگار نامہ، اوراق 243 ب - 244 الف۔

ہنگامہ برپا کر کے مغل فوجوں اور حکام کو وہاں سے بھگا دیا۔[1] چنانچہ اسی طرح جب مغلیہ حکام، زمینداری کے علاقوں سے اپنے بھاگے ہوئے کسانوں کو واپس لانے میں طاقت کا استعمال کرتے تو بیشتر صورتوں میں اس کا یہی نتیجہ ہوا کرتا کہ ان کسانوں کی انتقالی مکانی کا رخ بقول پلسارٹ "باغی راجاؤں" کی طرف موڑ دیا جائے جو مغلیہ حکومت سے ٹکر لینے کی طاقت رکھتے تھے۔[2]

یہ کسان اپنے زراعتی مشغلوں سے زمینداران کے صرف وسائل ہی میں اضافہ نہ کرتے بلکہ ان کے مسلح دستوں میں سپاہیوں کا کام بھی کیا کرتے تھے۔ ایسی قدیم وضع کی فوجیں غالباً مغلیہ فوج کے پیشہ ور گھوڑ سواروں سے لوہا نہ لے سکتی تھیں۔ پھر بھی زمینی محل وقوع اور تعداد کی کثرت بجائے خود اہم امور تھے، جیسا کہ مرہٹوں نے اس قدر نمایاں طور پر ثابت کر دکھایا۔ عہد عالمگیری میں یہ نئی صورت سامنے آئی کہ زمینداروں نے مغلوں کے خلاف جنگ میں خود کو صرف دفاعی کاروائیوں ہی تک محدود نہ رکھا بلکہ جب فاقہ کشی اور خانماں بربادی کی شدت نے کسانوں کو میدان میں اترنے پر مجبور کر دیا تو زمینداروں نے ان کے بڑے بڑے جتھے بلکہ فوجیں قایم کر کے ان کو خود اپنی زمینداریوں یا علاقۂ اقتدار کی توسیع کی غرض سے لوٹ مار کی جنگ پر لگا یا۔

اگلی فصل میں اس موضوع پر قدرے تفصیلی بحث آئے گی کہ مغلیہ اقتدار کے خلاف وسیع بغاوتوں میں کسان عنصر کا کس قدر حصہ تھا جیسا کہ ہم اس وقت دیکھیں گے کہ کسانوں کی بغاوت کی قیادت ہمیشہ زمینداروں ہی کے ہاتھ میں نہ رہا کرتی اور نہ ہی یہ باور کرنے کے ہمارے پاس وجوہ ہیں کہ ہر موقع پر زمینداروں کے باغیانہ اقدامات کو کسانوں کی حمایت حاصل رہا کرتی۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ مرہٹوں اور جاٹوں کی بغاوتوں کو جو تمام بغاوتوں میں سب سے زیادہ کامیاب تھیں ایسے لوگوں کی رہنمائی حاصل رہی جو یا تو زمیندار تھے یا زمیندار بننے کا حوصلہ رکھتے تھے اور ان بغاوتوں کے تاریخی نتائج پر غور کرتے وقت یہ حقیقت بڑی اہمیت حاصل کر لیتی ہے۔

---

[1] عالمگیر نامہ ص 2 - 781، "رقعۂ جبریہ" اوراق 47 ب - 48 الف۔

[2] Pelsaert ص 47

فصل ۵ سلطنت مغلیہ کے خلاف بغاوتوں کے زرعی پہلو

ان بغاوتوں کے جو مملکت مغلیہ کی تباہی کا سبب ثابت ہوئی مختلف اسباب بتائے جاتے ہیں۔ اس فصل میں جو جائزہ پیش کیا جا رہا ہے اس کے متعلق نہ تو جامعیت کا دعویٰ ہے اور نہ اس امر کا کہ وہ ان بغاوتوں کے ہر پہلو پر حاوی ہے اور نہ ہی یہاں ان نظریات کی تردید مقصود ہے جو "ہندو ردّ عمل" یا "قومی بیداری" کو اورنگ زیب کی مخالفت کا اصل محرک قرار دیتے ہیں۔ لیکن بہرحال اس حقیقت کا واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان نظریات کے حامی بمقابلہ ہمعصر شہادتوں کے عہد حاضر کے تخیلات کو زیادہ قابل اعتماد تصور کرتے ہیں۔ اس کے آگے قارئین خود ان نظریات کے حامیوں کی تحریروں کی روشنی میں ان کے موقف کے متعلق فیصلہ کریں۔ یہاں ہمارا خاص تعلق صرف ان اطلاعات سے ہے جو موضوع متعلقہ پر سترھویں اور اوایل اٹھارہویں صدی کے مآخذ فراہم کرتے ہیں اور یہ دیکھا جائے گا کہ یہ مآخذ بہرحال ان بغاوتوں کے معاشی اور انتظام حکومت سے متعلق اسباب کو اہم ترین قرار دیتے ہیں اور ان میں مذہبی ردّ عمل یا قومی شعور کا کوئی ذکر نہیں آتا۔

۱۔ آگرہ کے علاقہ میں بغاوتیں اور جاٹ

صوبۂ آگرہ کے حالات کے ضمن میں ابوالفضل کہتا ہے کہ "یہاں کی آب و ہوا کی خاصیت کی وجہ سے یہاں کے عام کسان (عموم رعایا) ہندوستان کے وسیع و عریض ملک میں اپنی سرکشی اور شجاعت و مردانگی کے لیے مشہور ہیں[1]"۔ دریائے جمنا کے دونوں طرف کے علاقے باغی کسانوں کے خلاف جنگی اقدامات کے مسلسل جولانگاہ رہے ہیں۔ ایک موقع پر خود اکبر نے اس علاقہ کے ایک موضع پر حملہ کی سربراہی کی تھی[2]۔ ورآگرہ کے ایک قریبی پرگنہ کے راجہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ڈاکہ زنی اس کا خاص مشغلہ تھا اور جب اس پر حملہ کیا جاتا تو وہ گنواروں

---

[1] اکبرنامہ ۱، ۳، ص 231

[2] ایضاً ۲، ص 163 یہ موضع پرگنہ سکیٹا (سرکار قنوج) میں واقع تھا اور حملہ عہد حکومت کے ساتویں سال میں کیا گیا تھا۔ موازنہ بہ بنیر Manucci (۱) ص 132-4

یا کسانوں کی مدد سے اپنی مدافعت کرتا[1] اگلے عہد حکومت میں دربار شاہی میں اطلاع موصول ہوئی کہ دریائے جمنا کے مشرق میں متھرا کے قریبی علاقہ کے "گنوار اور کاشتکار راہزنی سے باز نہیں آتے اور گھنے جنگلات اور گڈھیوں کے اوٹ میں باغیانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ انہیں کسی کا خوف نہیں اور جاگیرداروں کو مالگذاری نہیں ادا کرتے۔" چنانچہ ان کے خلاف ایک مہم بھیجی گئی جس کے نتیجہ میں "ان میں سے متعدد مارے گئے، ان کی عورتوں اور بچوں کو قید کیا گیا اور فاتح فوج کو غنیمت کثیر ہاتھ آئی ہے"[2] یہ واقعہ 18 جلوس جہانگیری کا ہے اور پھر بارہ سال بعد ہی (1634ء) دریائے جمنا کے دونوں طرف کے "بدمعاشوں" کے خلاف جو آگرہ سے دہلی جانے والے راستہ پر ڈاکہ مارتے تھے اس سے زیادہ بڑے پیمانہ پر مہم کا انتظام کیا گیا۔ "ان میں سے دس ہزار انسان نما جانور" قتل کیے گئے اور "بے حساب" عورتیں، بچے اور مویشی گرفتار ہوئے[3] 18ء جلوس شاہجہانی میں متھرا کے قریبی علاقہ کے باغی بظاہر بے قابو تھے[4] سعد اللہ خاں کی 1656ء میں وفات پر "آگرہ کے متعدد قریبی مواضعات (یعنی اس کی جاگیر کے مواضعات) کے گنواروں (کسانوں) نے مسلح بغاوت کی لیکن اس کے فوجدار عبدالنبی نے ان پر ناگہانی چھاپہ مار کر مواضعات کو لوٹا اور ان میں سے جو بھاگنے سے رہ گئے قتل ہوئے یا قیدی بنا لیے گئے۔"[5]

یہ تھی اس علاقہ کی پچھلی تاریخ جو آگے چل کر عہد عالمگیری میں جاٹوں کی باغیانہ سرگرمیوں کا مرکز بنا۔ یہ دیکھا جائے گا کہ پچھلی بغاوتوں کے بیان میں باغی کسانوں کو جاٹ نہیں بتایا گیا ہے۔ ان کے لیے معمولاً 'گنوار' یا 'دیہاتی' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے اور کم از کم ایک

---

[1] بدایونی (2) ص 151-6 پرگنہ کا نام جلیسا غالباً جلیسر کی جگہ سہواً لکھ گیا ہے۔

[2] تزکِ جہانگیری، 375-6

[3] قزوینی، Add. 20734، ص 679-80، Or 173، اوراق 237 ب، 239، لاہوری (ا) (2) ص 71-2، 76 آخر الذکر میں 7000 فوج بہ سمت مشرق اور 5,000 بہ سمت مغرب کل 12,000 فوج کا باغیوں کے خلاف استعمال کیا جانا بھی درج ہے۔

[4] لاہوری (2) ص 425

[5] Factories 1655-60، ص 65

یادداشتوں میں ان کی رہنمائی غالباً راجپوت زمینداروں نے کی تھی[1] پھر بھی منوچی جو ان بغاوتوں کا قدرے تفصیلی تذکرہ کرتا ہے، عہد عالمگیری کے باغی جاٹوں کو محض کسانوں کے نام سے موسوم کرتا ہے اور ان کو انہیں لوگوں کے مفاد کا حامی تصور کرتا ہے جن پر اکبر نے مظالم کیے تھے[2] جاٹ بدرجۂ غایت "کسان ذات" کے لوگ ہیں[3] اور یہ دہلی و آگرہ کے درمیانی علاقوں میں آباد تھے[4] انہیں آئین اکبری میں دوآبہ اور جمنا پار کے میدانی علاقوں کو بہت سے محالوں کا زمیندار بتایا گیا ہے۔ لہٰذا یہ بعید قیاس نہیں یہ لوگ حکام کے خلاف متعدد تصادموں میں شریک رہے ہوں۔

صحیح معنوں میں جاٹوں کی بغاوت کی ابتدا اس وقت ہوئی جب متھرا کے قریب تلپٹ کے زمیندار گوکلا جاٹ نے "جاٹوں اور دیگر دیہاتیوں کی ایک بڑی فوج جمع کرکے علم بغاوت بلند کیا۔[5]" وہ 1669ء میں مار ڈالا گیا[6] لیکن ان کی سربراہی پہلے راجہ رام جاٹ کو اور پھر چورامن جاٹ کو جو اگارہ مواضعات کا زمیندار بتایا جاتا ہے منتقل ہوئی[7] ایک

---

[1] Manucci (۱) صـ 132 میں غالباً مقامی روایات کی بنیاد پر جن گاؤں والوں کے خلاف خود اکبر نے فوج کشی کی تھی انہیں راجپوت کہا گیا ہے اس اطلاع کے صحیح ہونے کا بہت امکان پایا جاتا ہے، کیونکہ آئین اکبری (۱) 446 میں پرگنہ (سکیٹا) کے زمینداروں کو چوہان اور اس طرح جلیسر میں جہاں ایک راجہ نے ایک بغاوت منظم کی تھی، زمینداروں کو (گو ہیلوٹ، سورج (بنی) اور (باتہرہ) بتایا گیا ہے (ایضاً 443)

[2] Manucci (۱) 134 کے بیان کے مطابق 'دیہاتیوں' نے اکبر کی قبر کی 1691ء میں بے حرمتی کرکے اس سے انتقام لیا (صحیح سن 1688ء ہے)

[3] تشریح الاقوام، ورق 155 الف، کرک 'The Tribes & Castes of North Western Provinces & Oudh' کلکتہ 1896ء (3) صـ 40

[4] "دہلی اور اکبرآباد (آگرہ) کے درمیانی علاقہ کے مواضعات کے کاشتکاران جاٹ ذات کے لوگ تھے (شاہ ولی اللہ، سیاسی مکتوبات، صـ 48)

[5] ایسر داس، ورق 53 الف۔

[6] مآثر عالمگیری، صـ 93-94

[7] سید غلام علی خاں، عماد السعادت، نولکشور ایڈیشن، 1897ء صـ 54-55

وسیع علاقے کے کسانوں نے سرکاری مالگذاری کی ادائیگی سے انکار کے بعد ہتھیار باندھ لیے۔ متھرا کے قریب پچیس مواضعات کی زمینداری کی ایک معافی سے ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ اس معافی کے جملہ مواضعات میں "بداطوار باغی" آباد تھے اور اس کے معافیدار کو انہیں علاقہ بدر کرکے وہاں نئے مالگذاری ادا کرنے والے کسانوں" کو بسانے کا کام سپرد کیا گیا تھا۔[1] 1681ء میں آگرہ کے نواحی اضلاع کا فوجدار ملتفت خاں ایک ایسے موضع پر حملہ کی سربراہی کرتے ہوئے جس کے کسان مالگذاری ادا کرنے سے منحرف ہو گئے تھے مارا گیا۔[2] اسی دہائی کے اواخر میں ہم ایک جاگیردار کی یہ شکایت بھی سنتے ہیں کہ اسے آگرہ کے قریب اپنی جاگیر سے "بوجہ بغاوت" تین برسوں سے کچھ بھی وصول نہ ہو سکا۔[3]

جاٹوں کی بغاوت کی سربراہی بظاہر زیادہ تر جاٹوں ہی کے ہاتھوں میں رہی۔[4] پس بظاہر ان سربراہوں کے لیے دوسروں کی زمینداریوں پر جبریہ قبضہ کر لینا ان بغاوتوں کے خاص مقاصد میں ہوا کرتا۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں جب جاٹوں کی طاقت اپنے انتہائی عروج پر تھی تو کہا جاتا تھا کہ "جاٹوں نے جن زمینوں پر اپنا قبضہ جما لیا ہے وہ خود ان کی نہیں بلکہ دوسروں سے غصب کی ہوئی ہے۔ ان مواضعات کے (جائز) مالکان کا ابھی پتہ لگانا باقی ہے۔" چنانچہ اگر سابق مالکان کو کسی عادل بادشاہ کی تھوڑی سی حمایت حاصل ہو جائے تو انہیں جاٹوں سے جنگ پر آمادہ کیا جا سکتا تھا۔[5] جاٹوں کی بغاوت کے اہم نتائج میں ایک یہ تھا کہ ان کی زمینداریاں خصوصاً وسطی

---

[1] نگارنامۂ منشی، اوراق 199 الف۔ 200 الف، Bodl اوراق 157 ب۔ 158 الف، مطبوعہ ص 152، یہ معافی حسن علی خاں، فوجدار متھرا کی سفارش پر جس نے گوکلا کو شکست دے کر گرفتار کیا تھا دی گئی۔

[2] Manucci (2)، ص 223 ـ 4 مآثر عالمگیری ص 209

[3] ریاض الوداد، ورق 16 ب۔ یہ خط بظاہر غالباً بیجاپور اور حیدرآباد کی مہم سے فوراً بعد لکھا گیا تھا۔

[4] جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، گوکلا ایک زمیندار تھا اور چورامن ایک زمیندار کا لڑکا۔ چورامن کے پوتے سورج مل کے متعلق جس کی سربراہی میں جاٹ اپنے انتہائی عروج کو پہونچے کہا گیا تھا کہ "حالانکہ وہ برنج بھاشا بولتا اور زمینداروں ایسا لباس پہنتا، لیکن اس کی ذہانت کی وجہ سے لوگ اسے ایک عالم تصور کرتے تھے (عماد السعادت، ص 55)

[5] شاہ ولی اللہ، سیاسی مکتوبات، 50 ـ 51

دو آبہ میں بہت بڑھ گئیں۔ اسے آئین اکبری میں جاٹوں کی زمینداری کے رقبہ کا اس رقبہ سے موازنہ کر کے جن کے جاٹ غدر کے قبل (1844ء) زمیندار تھے دیکھا جا سکتا ہے[1]

جاٹوں کی بغاوت لوٹ مار کی ایک بہت بڑی تحریک تھی۔ یہ (غارتگری) نما لیا کسانوں میں ذات پات کی تنگ تقسیموں اور ان کے زمیندار سربراہوں کی لوٹ مار کی جبلت کے باعث ناگزیر تھی۔ ان کی غارتگری کے علاقے گوکلا[2] کے ٹوٹے ہوئے سعد آباد کے ایک پرگنہ اور راجہ[3] رام کی غارتگری کے شکار آگرہ کے نواحی پرگنوں سے شروع ہو کر چورامن کی سربراہی میں اپنی انتہائی وسعت کے پہونچے، جبکہ آگرہ اور دہلی کے تمام پرگنات لوٹ مار کا شکار ہوئے اور عذاب جہنم کے اس متلاشی کی فتنہ پردازی سے تمام راستے مسدود ہو گئے۔[4]

ہمارے علم کی حد تک جاٹ باغیوں کا (باوجودیکہ ہر یداس جاٹ تھا) کسی خاص مذہبی تحریک سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ برخلاف اس کے ستنامیوں اور سکھوں کی بغاوت میں باغیوں کے درمیان اتحاد کا رشتہ فراہم کرنے میں ذات کے بجائے مذہب نے تقریباً کلیۃً جگہ لے لی تھی۔

2 ستنامی

ستنامی بیراگیوں کا ایک فرقہ تھا۔ نارنول کے ایک باشندے کے ہاتھوں اس فرقہ

---

[1] ملاحظہ ہو Elliot's Maps in Memoirs & C. (2) صفحہ 203 یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ وسطی دو آبہ میں توسیع بہت نمایاں تھی، لیکن بالائی دو آبہ میں ایسا نہ تھا بلکہ وہاں جاٹوں کی زمینداری گھٹی ہے اس کا سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جاٹوں کی بغاوت درحقیقت برج دیش کے جاٹوں کی بغاوت تھی جس نے بالائی دو آبہ کو بالکل متاثر نہ کیا۔

[2] مآثر عالمگیری، 93 ۔

[3] ایسرداس، اوراق 98 ب، 131 ب۔

[4] ایضاً، ورق 135 ب۔ 1690 ۔ 91ء میں ایک منظم فوج کشی نے چورامن کی طاقت کو بالکل توڑ دیا (ملاحظہ ہو ایضاً، 136 الف۔ 137 ب) اور عہد عالمگیری کی بقیہ مدت کے دوران ان کی بغاوت بغیر کسی بڑی شورش کے اندر اندر سلگتی رہی۔ اورنگزیب کی وفات کے بعد اس بغاوت نے دوبارہ خود چورامن کی سربراہی میں زور پکڑا اور بالآخر جاٹوں کی ایک سلطنت کا قیام جس کا دار الحکومت بھرتپور میں تھا عمل میں آیا۔ سورج مل (1756 ۔ 63) نے اس سلطنت کو اپنی انتہائی وسعت پر پہونچا۔

کے قیام کا روایاتی سال 1657ء ہے ستنامیوں کے عقیدہ کی بنیاد جیسا کہ اس فرقہ کی مذہبی کتابوں میں درج ہے خالص وحدانیت پر تھی۔ یہ مذہبی رسوم اور توہم پرستی دونوں ہی کی مذمت کرتے تھے۔ اس فرقہ کا پیغام ایک معاشرتی پہلو بھی رکھتا تھا۔ اس کے ماننے والوں کے لیے ذات پات کی تفریق اور نیز دوسروں سے خیرات کا قبول کرنا ممنوع تھا۔ اس قسم کے احکام سے غریبوں کے ساتھ ہمدردی کا رویہ اور اقتدار و دولت سے تنفر کے رجحانات ظاہر ہوتے ہیں۔ "غریبوں کو مت ستاؤ۔ غیر عادل بادشاہ اور دولت مند اور بے ایمان انسان کی صحبت سے پرہیز کرو۔ ان سے یا بادشاہوں سے کوئی تحفہ نہ قبول کرو۔"[1]

ایسا مذہب نچلے طبقہ کے افراد کے لیے سب سے زیادہ پرکشش ہو سکتا تھا۔ ایک ہمعصر مورخ اس کے پیروؤں کا حسب ذیل نقشہ پیش کرتا ہے۔

"ہندو درویشوں کا ایک طبقہ ستنامیوں کے نام سے موسوم ہے۔ ان کو 'منڈیا' بھی کہتے ہیں[2] یہ پرگنہ نارنول اور میوات میں چار یا پانچ گھرانوں پر مشتمل ہیں۔ حالانکہ یہ منڈیتے'

1ـ یہ پوری عبارت رایل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن کے دارالمطالعہ میں موجود ان کی مذہبی کتاب موسوم بہ 'ستنام سہائے' ("پوتھی گیان بانی سادہ ستنامی") کے مخطوطہ (ہند۔ ۱) سے ماخوذ ہے۔ یہ برج بھاشا میں لکھی ہوئی ہے۔ متن ناگری اور عربی دونوں زبانوں میں ہے۔ عربی متن میں ایک منظوم تمہید کا اضافہ ہے (جس کا سلسلہ ورق 34 ب تک ہے)

یہ اقتباس ورق 44 ب سے ماخوذ ہے (موازنہ بہ نیز ورق 38 الف)۔

تمہیدی حصہ کے آغاز میں ورق ۱۔ الف پر بانی فرقہ کا وطن نارنول میں بجھاسر نامی مقام پر بتایا گیا ہے۔ نارنول مشرقی پنجاب کے مہندر گڑھ ضلع میں واقع ہے۔ صحیفہ کا متن جو عربی رسم الخط میں ہے اس کے آخر میں فارسی زبان میں جو خاتمہ کلام درج ہے اس میں فرقہ کا آغاز بیساکھی سمبت 1714 سے بتایا گیا ہے۔ میں نے اس سن کو اس وجہ سے بلا تامل قبول کر لیا ہے کہ تمباکو کی ممانعت (ورق 39 ب) کی وجہ سے اس مذہبی کتاب کا اس کے قبل لکھا جانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسی بناء پر 1543ء کا بانی فرقہ کا سال پیدائش ہونا جیسا کہ دور حاضر کی بعض تصانیف میں بیان کیا گیا ہے (تارا چند Influence of Islam on Indian Culture الہ آباد، 1954ء صـ192، سرکار 'History of Aurangzeb's (3) 1928ء صـ297) ناممکن ہو جاتا ہے جب تک کہ یہ فیصلہ نہ کر لیا جائے کہ یہ مذہبی کتاب اسی کی تصنیف نہیں۔

2ـ موازنہ بہ، دبستان مذاہب صـ251 "بیراگیوں کو منڈیا بھی کہا جاتا ہے۔"

فقیروں کے ایسا لباس پہنتے ہیں لیکن ان کا ذریعہ معاش اور پیشہ معمولاً کاشتکاری ہے اور یہ تھوڑے سرمایہ سے غلہ فروشوں کی طرح کاروبار کرتے ہیں[1] وہ خود اپنے فرقہ کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہوئے نیکنام جو 'ستنام' کے معنی ہوتے ہیں بننے کی تمنا رکھتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص اپنی شجاعت یا اقتدار کے گھمنڈ میں ان پر مظالم کرنا چاہے تو وہ اسے برداشت نہیں کرتے۔ ان میں سے بیشتر اسلحہ بند اور ہتھیار بند رہتے ہیں۔"[2]

ایک دوسرا مورخ اس فرقہ کے لوگوں کی "انتہائی گندگی کے باعث ان کے گھناؤنے نجس اور ناپاک" ہونے کی سخت مذمت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ "اپنے فرقہ کے ضابطوں کے تحت ہندو اور مسلمان میں تفریق نہیں کرتے اور سور کا گوشت اور دوسری ناپاک چیز کھاتے ہیں"[3]

ستنامی اپنی عام بغاوت کے قبل بھی بظاہر حکام کے زیادہ مطیع نہ تھے۔ عہد عالمگیری کے اوائل میں شعبۂ مال کے ایک عہدہ دار کا بیان ہے کہ گوکہ پرگنہ بھٹیر کے ایک گاؤں میں چند کاشتکاران اپنے عورتوں، بچوں، سامانوں اور مویشیوں سمیت بہ شکل بیراگی رہتے تھے لیکن یہ لوگ "باغیانہ اور قزاقانہ رجحانات سے مبرا نہیں معلوم ہوتے"[4] حقیقت میں ان کی بغاوت (1672ء) گاؤں کی ایک معمولی تنازع سے شروع ہوئی۔ ایک ستنامی جبکہ وہ اپنے کھیت میں کام کر رہا تھا اور ایک سرکاری پیادہ کے درمیان جو غلہ کے انبار کی حفاظت پر مامور تھا تکرار ہوگئی پیادہ نے اپنے ڈنڈے سے ستنامی کا سر توڑ ڈالا۔ اس پر ستنامیوں کی ایک ٹولی نے مل کر پیادہ کو اس قدر مارا کہ وہ تقریباً مردہ ہوگیا" اس پر شقدار نے ان کی سرکوبی کے لیے فوج کا رسالہ بھیجا اور اور اس طور پر جنگ شروع ہوگئی۔[5]

ان کی بغاوت کی عوامی نوعیت کا غالباً بہترین اندازہ ایک واقعہ نگار کے حسب ذیل حقارت آمیز الفاظ سے کیا جا سکتا ہے جو ان کے لیے استعمال کیے ہیں۔

---

[1] 'بقالان کم مایہ' (معموری، خافی خاں؛ غلہ فروشوں کے بجائے 'تاجران' درج ہے۔

[2] معموری ورق 148 الف۔ ب، خافی خاں (2) ص 252

[3] ایسرداس، ورق 61 ب

[4] بالکرشن برہمن، ورق 56 الف۔ ب۔

[5] معموری، ورق 148 ب، خافی خاں (2) ص 253

"کارخانہ فلکی کی نیرنگیوں کے تماشائی اس سانحہ کے پیش آنے پر حیران ہیں کہ ان باغی خونخوار اور تہیدست زورگردوں (کسانوں [1] تجاروں (درودگر) خاک رو بوں (کناس") دباغوں اور دستکار ذات (اضافہ محرفہ) کے دیگر رذیلوں و کمینوں کو آخر کیا سوجھی کہ ان کے خود پسند دماغ اس درجہ ابر آلود ہو گئے ؛ ان کے دماغوں میں باغیانہ نخوت کے داخل ہو جانے سے ان کے سروں کی گرانباری ان کے شانوں کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی۔ وہ خود اپنے، بیرول سے فنا کے پھندے کا شکار ہوئے۔ اس داستان کی تفصیل یوں ہے کہ علاقہ میوات کے شقاوت پسند مفسدوں کا یہ بڑا گروہ یک نا کارہ زمین سے چیونٹیوں کی طرح اوپر اٹھا (" جوشیدند") اور آسمان سے مثل ٹڈیوں کے نیچے آن پڑا۔"[2]

ان کی ابتدائی کامیابی اور افواج شاہی کی بار بار شکست اور نارنول اور بیرٹ پر قبضہ ہو جانے کے باوجود ایک کثیر التعداد شاہی فوج نے انہیں بالآخر بالکل تباہ کر ڈالا۔ لیکن انہوں نے اپنی شکست کے عالم میں بھی شجاعت کے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور مذکورہ الصدر مورخ کو اعتراف ہے کہ جنگی سامان کے نہ ہوتے ہوئے انہوں نے مہابھارت کی جنگ عظیم کے کارنامے دہرائے۔[3]

3 سکھ

جیسا کہ اسلام کو شہریوں کا مذہب[4] بتایا جاتا ہے، اسی طرح غالباً یہ کہنا کہ سکھوں کا مذہب کسانوں کا مذہب ہے غلط نہ ہوگا۔ گرونانک کے اشعار، سب کے سب پنجاب کے 'جٹوں' کی

---

[1] مطبوعہ متن میں 'زرگر' کا لفظ ملتا ہے جس کی تصدیق Add. 495 ر 19 ورق ۴۲ الف سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن یہاں 'سونار' کا لفظ قدرے بے محل معلوم ہوتا ہے ؛ لہٰذا زرگر کو 'برزگر' بمعنی 'کسان' تصور کرنے کا شدید داعیہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ دونوں الفاظ اگر فارسی میں بہ عجلت لکھے جائیں تو ایک ہی سے معلوم ہوتے ہیں۔

[2] مآثر عالمگیری ص 114-5

[3] ایضاً ص 115-6

[4] موازنہ ہو J. Lokkegaord, 'Islamic Tanation in the Classic Period', Copenhagen 1952، ص 2-3 و محمد حبیب 'Introduction to Elliot & Dawson's History of India' ج (2) علی گڑھ، طبع ثانی 1952، ص 2-3

زبان میں ہیں اور پنجابی بولی میں جٹ کے معنی دہقان یا اجڈ کے ہوتے ہیں[1] مصنف 'دبستانِ مذاہب' تقریباً 1655ء میں سکھوں کے مکمل احوال کے ضمن میں مزید لکھتا ہے کہ "ان لوگوں میں ایسا کوئی قاعدہ نہیں ہے کہ کوئی برہمن کسی کھتری کا چیلہ (سکھ) نہ بن سکے کیونکہ نانک خود کھتری تھا... انہوں نے اسی طرح کھتریوں کو جٹوں کی ماتحتی میں رکھا جو بیس (ویشیا) ذات کے سب سے نیچے درجہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ گرو کے بڑے 'مسند' (MASAND) سردار، کارپردازان، بیشتر جٹ ہیں[2]" گرو ارجن مل (متوفی 1606ء) نے پہلے پہل ایک متحد اور رضا بطلی پابند ضمانت کے قیام کی طرف پہلا قدم اٹھایا۔ اس نے ہر مقام پر اپنے گماشتے مقرر کیے۔ "حکم دیا جاتا ہے کہ اداسی یا تارک الدنیا ایک اچھا معتقد نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے گرو کے بعض سکھ (چیلے) زراعت کا، بعض تجارت اور ملازمت کا پیشہ اختیار کرتے ہیں اور ہر شخص اپنی حیثیت کے لحاظ سے 'مسند' کو سالانہ نذر پیش کرتا ہے" جو اسے گرو کی طرف سے قبول کرتا تھا[3] گرو گوبند سنگھ (1606 - 45ء) کے تحت سکھوں نے ایک فوجی طاقت کی حیثیت اختیار کی۔ اس نے اپنی ایک علیحدہ فوج منظم کی، لہٰذا اس کا مغلیہ طاقت سے تصادم ہوا[4] اس طور پر گرو مذکور نے ایک روایت کی بنا ڈالی جس کو سکھوں کے آخری گرو (1606 - 1708ء) نے بڑے استقلال کے ساتھ قایم رکھا یہاں تک کہ 1709ء میں باندا نے "چیونٹیوں اور ٹڈیوں کی طرح ہندوؤں کے نچلے طبقہ پر مشتمل ایک بے شمار فوج جو جان قربان کرنے کے لیے طیار تھی میدان میں اتاری[5]" یہ حقیقت کہ اٹھارویں صدی کے اوائل میں بھی سکھوں کے "بیشتر چوٹی کے سردار نچلی ذات کے افراد مثلاً بڑھئی، موچی اور جٹ تھے" اس امر کی شاہد ہے کہ سکھوں کی بغاوت کے روح رواں نچلے طبقہ ہی کے لوگ تھے[6]

---

[1] 'دبستان مذاہب' صـ 285 موازنہ بہ ابٹسن Punjab Castes صـ 105 لفظ 'جاٹ' کے کاشتکار کے عموماً میں استعمال کے لیے۔

[2] 'دبستان مذاہب' صـ 286، صـ 14، خافی خاں (2) صـ 651 "اس جنگی فرقہ کے گرو کے بیشتر پیرو پنجاب کے جاٹ اور کھتری اور رکافروں کی دیگر نچلی ذات کے لوگ تھے۔"

[3] دبستان مذاہب، صـ 286 - 7 موازنہ بہ نیز خافی خاں (2) صـ 651 - 2

[4] دبستان مذاہب، صـ 288

[5] خافی خاں (2) صـ 672

[6] سید غلام علی خاں، عماد السعادت، نولکشور ایڈیشن، لکھنؤ صـ 71۔ وملاحظہ ہو نیز (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

• شمالی ہند کی دیگر بغاوتیں

شمالی ہند میں کسانوں کی سرکشی کی فہرست کسی طور پر بھی ان تین بغاوتوں تک محدود نہیں ہے۔ ان میں سے بیشتر کا بیان ہمارے ماخذ میں ضمنی طور پر آیا ہے۔ مثلاً ہم سنتے ہیں کہ صوبیدار بھکر نے 1575 - 6ء میں مالگزاری فی بیگھہ کی یکساں شرح پر عاید کی اور "کسان مظالم کا شکار ہوئے" اس پر منگیچہ قبیلہ کے افراد نے علم بغاوت بلند کرکے محصلین مالگزاری کو تہہ تیغ کر ڈالا۔ بالآخر انہیں پسپا کرکے زمینوں سے بے دخل کیا گیا۔[1] جب 1662ء میں منوچی کا الہ آباد سے گذر ہوا تو اس نے وہاں کے صوبیدار کو "بعض گاؤں کے باشندوں کے خلاف مہم پر جنھوں نے کم از کم ایک بار مقابلہ کیے بغیر مالگزاری ادا کرنے سے اعتراض کیا تھا" وہاں سے غیر موجود پایا۔[2] ان سے بالکل مختلف نوعیت کی وہ شورشیں تھیں جو سرکش میواتیوں نے میوات میں برپا کیں۔ یہ مسلسل بغاوت کے عالم میں رہا کرتے[3] اور اپنے مواضعات سے جو پہاڑیوں کے قلب میں واقع تھے غارتگری کیا کرتے تھے۔ جے سنگھ نے 1649 - 50ء میں ان کے خلاف ایک خونخوار مہم کی سربراہی کی تھی[4] لیکن پھر بھی وہ بعد میں حکومت کے لیے درد سر بننے کے لیے بچ نکلے[5] اسی طرح لکھی جنگل کے کسان بھی بغاوت اور شر انگیزی کے لیے بدنام تھے۔ یہ وٹو، ڈوگرہ اور گوجر قوم کے لوگ تھے اور دریائے ستلج۔ بیاس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ایس چندر Parties & Politics: at the Mughal Court 1707 - 40ء، ص 50 - 1

وہ سترھویں صدی کے اوائل کے ایک مصنف وارد کا بیان قلم بند کرتا ہے کہ "ایک نیچی ذات کے مہتر یا دباغ کے لیے صرف اس قدر کافی تھا کہ وہ اپنا گھر چھوڑ کر گرد کی صحبت اختیار کرے پھر تھوڑے ہی عرصہ میں وہ اپنے ہاتھ میں (بحیثیت ایک افسر کے) تقرری کا پروانہ لیے ہوئے اپنے وطن واپس آجاتا تھا۔"

[1] معصوم، تاریخ سندھ، ص 245 - 6

[2] Manucei (2) ص 83

[3] Pelsaert ،15 Manucei (2) ص 458

[4] وارث (اے) اوراق 433 الف - ب، 435 ب (بی)، اوراق 64 الف - 67 الف، صالح (3) ص 110 - 12

[5] Manucei (2) ص 458،

سے نکلی ہوئی متعدد نہروں اور ان کے سیلابی پانی کے پیدا کردہ جنگلوں میں کچھ اس طور پر محفوظ تھے کہ ان کے خلاف بیشتر مہمیں بے اثر ثابت ہوئیں[1] عہد عالمگیری کے اواخر میں ان کا ایک بار پورے سرکار دیپال پور کا تاخت و تاراج کرنا بتایا جاتا ہے[2]

بندیلوں کی بغاوت جو 1635ء میں شاہجہاں کے اورچھہ پر قبضہ کر لینے کے بعد سے شروع ہو کر تھوڑے تھوڑے وقفہ پر زیر مطالعہ عہد کے بقیہ ایام میں جاری رہی لازمی طور پر بادشاہوں کے ایک سلسلہ کا قبضہ اور ایک شاہی خاندان کے حقوق کے لیے جنگ کا درجہ رکھتی تھی لیکن مغل سپہ سالار خان جہاں بارہہ کے دو خطوط کے مطابق، ان نزاعات میں بھی باغیوں نے ایک کامیاب معرکہ آرائی کے بعد "رعیتی اور مواس دونوں ہی علاقوں" کے "زمینداروں اور کسانوں" کو اپنی طرف ملا لیا تھا۔ اس کے علاوہ جب بھی کسی جگہ شورش شروع ہو جاتی تو وہاں کے کسان موقعے سے فائدہ اٹھا کر مالگزاری ادا کرنے سے انکار کر دیتے تھے[3]

۴ مرہٹے

اب ہم مرہٹوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو بلاشک و شبہ مغلوں کی تباہی کی ذمہ دار سب سے بڑی واحد طاقت تھی 1700ء میں بھیم سین اپنی سرگذشت لکھتے وقت ان "موذیوں اور مرہٹوں" کی کامیابی کے اسباب بیان کرتا ہے۔ وہ خود برہانپور کا باشندہ تھا اور دکن میں اپنی طویل ملازمت کے باعث، اس موضوع پر اس کی رائے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ اپنے بیان کا آغاز ایک خالص فوجی دلیل سے کرتا ہے۔ مغلیہ سپہ سالار آن اپنی فوجوں کو معیاری ضابطوں کے مطابق نہ رکھتے تھے جس سے "موذیوں" کے دل میں مغلیہ فوجدار کا ذرا بھی خوف نہ رہ گیا تھا۔ لہٰذا وہ "علاقے جو منصبداروں کو تنخواہ میں دیئے گئے تھے مالگزاری کی ادائیگی پر مجبور نہ کیے جا سکے

---

[1] سوجان رائے، 63؛ Manucci, (2) 457–8؛ ملاحظہ ہو نیز اخبارات $\frac{43}{53}$، "دوٹو بھٹی نسل" کے ہوتے ہیں (ابیٹس Punjab Castes: $\frac{6-145}{}$)

[2] احکام عالمگیری، ورق 215 الف۔

[3] عرضداشتہائے مظفر، اوراق 6 الف۔ 7 الف، 115 ب۔ پہلے خط میں چمپت اور رام سین کا دھونی اور چندیری کا لوٹنا بیان کیا گیا ہے

تھے" "زمینداران بھی طاقت حاصل کرنے کے بعد مرہٹوں سے مل گئے تھے۔"

اس کے بعد وہ دوسرے سبب کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور وہ یہاں مرہٹوں کی ترقی اور شاہی علاقوں میں کسانوں پر کیے جانے والے مظالم کے درمیان ایک تعلق محسوس کرتا ہے۔

"جاگیرداروں کے گماشتے بادشاہ کے دفتری عملہ (محرران حضور) کے بخیلانہ رویہ (شوم طبعی") سے جو کسی نہ کسی عذر پر (جاگیریں) تبدیل کردیتے ہیں، خایف اور سال آیندہ کے لیے جاگیر کی بحالی سے ناامید رہتے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے کسان کی حفاظت "رعیت پروری" اور ثابت قدمی (" استقلال") کے شیوہ کو ترک کردیا ہے۔ جاگیردار، محصل مالگذاری کو مامور کرتے وقت اپنی مجبوریوں کے تحت ان سے کچھ پیشگی (قبض) لے لیتا ہے۔ عامل کو جاگیر پر پہونچتے ہی یہ فکر دامنگیر ہوجاتی ہے کہ کہیں کوئی دوسرا زیادہ 'قبض' ادا کرکے پیچھے پیچھے نہ آرہا ہو، لہٰذا وہ ظالمانہ طریقے اختیار کرتے ہوئے ناجائز وصولیوں (تحصیل) میں سختی سے کام لیتا ہے۔ بعض کسان جایز مالگذاری (مال واجب) ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے، لیکن وہ اس جانگسل استحصال "(غنم الیم") سے عاجز ہیں۔ (دربار میں) اطلاع موصول ہوئی کہ مرہٹوں کو شاہی مملکت کے کسانوں کی حمایت حاصل ہے۔ لہٰذا حکم ہوا کہ مواضعات میں جس قدر گھوڑے اور اسلحے دستیاب ہوں سب ضبط کرلیے جائیں۔ ایسا ہونے پر بیشتر مواضعات کے کسان اپنے گھوڑوں اور اسلحوں کے ساتھ مرہٹوں سے جا ملے۔"

بھیم سین دوبارہ کسانوں پر مظالم کے موضوع پر رجوع کرتے ہوئے " فوجدار، دیش مکھ اور زمینداران کی پٹیوں میں مظالم" کو بیان کرتا ہے "جو مختلف بہانوں سے کسانوں سے رقمیں وصول کرتے ہیں علاوہ اس کے زمینداروں پر شاہی خراج "(پیش کش بادشاہی") بھی عاید کیا گیا تھا اور لوگ اس کی وصولی اور رسد کی فراہمی پر مقرر تھے۔ ان لوگوں کے مظالم بے پناہ ہیں۔ زمینداران اپنے پاس سے ایک دام یا درم بھی نہیں دیتے بلکہ اسے کسانوں سے وصول کرکے ادا کرتے ہیں اور جزیہ عاید کیا جاتا ہے اور محصل (اُمنا) جو مقرر کیے گئے ہیں، ان کے جور و جفا کا کوئی کیا حال لکھے۔ یہ بیان کے باہر ہیں۔"

ان مظالم پر مستزاد مرہٹوں کی غارتگری نے کسانوں کی زبوں حالی کو اور بھی ناقابل برداشت بنادیا تھا کیونکہ:

"ملک کی خالصہ اور تنخواہ کی جاگیروں میں تقسیم کی طرح مرہٹوں نے بھی اسی علاقہ کو

اپنے نقلی سرداروں ("ناسرداران") میں تقسیم کر دیا ہے[1] چنانچہ ایک ہی زمین پر دو جاگیر دار قابض ہیں۔ رباعی۔

دیہہ ویراں بجریب دو جریب — چونکہ پیمانہ بدست دو طبیب

.... الخ

(مرہٹہ) سرداروں کی فوجیں جو ملک کو لوٹنے کی غرض سے آتی ہیں اپنی مرضی کے مطابق ہر پرگنہ اور تمام جگہوں سے جبراً رقمیں وصول کرتی ہیں اور (ان کے گھوڑے) مزروعہ کھیتوں کو چرتے اور روندتے ہیں۔ امن غارت ہو چکا ہے اب حالات حد سے تجاوز کر چکے ہیں۔ زمین کی پیداوار غلہ کے کھلیان تک بالکل ہی نہیں پہونچ پاتی۔ وہ (کسان؟) بالکل تباہ ہیں۔"

اس صورتحال نے بظاہر کسانوں کو مرہٹوں کے اور بھی قریب کر دیا تھا۔ پس "جب سیوا کے بہت سے قلعے[2] اعلیٰ حضرت (اورنگذیب) کے قبضہ میں آگئے تو مرہٹوں کو اپنے کنبہ کے افراد کے لیے رہنے کی جگہ کی دقت محسوس ہونا شروع ہوئی۔ (لیکن) شاہی مملکت کے کسانوں سے اچھے مراسم ہونے کے باعث انہوں نے اپنے کنبہ کے لوگوں کو آباد جگہوں میں ان کی نگرانی میں چھوڑ دیا۔ یہ عبارت ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے، "کسانوں نے کاشتکاری ترک کر دی ہے اور جاگیردار کو ایک دام و درم تک وصول نہیں ہو پاتا۔ اپنی طاقت کی کمی سے مایوس اور پریشان ہو کر اس علاقہ کے بہت سے منصبداران[3] مرہٹوں سے مل گئے ہیں۔[4]"

مرہٹوں کی کامیابی کے اسباب کا ایک ہمعصر جائزہ ہونے کے اعتبار سے بھیم سین کے بیانات گرانقدر ہیں۔ ہمارے پاس موجود دیگر معلومات بھی اس کے دلائل کے اہم خطوط کی کافی تائید کرتے ہیں۔ شیوا جی کے عروج کے قبل ایک عرصہ سے مغلوں کے دکنی بادشاہتوں کے خلاف مسلسل جنگی دباؤ کے نتیجہ میں وہاں کے کسان مصائب جھیل رہے تھے۔ حملہ آور فوجیں خصوصاً

---

[1] "ناسرداران" مغلیہ تحریروں میں مرہٹہ سرداروں کے لیے بطور ایک سرکاری اصطلاح کے استعمال کیا گیا ہے

[2] مصنف کا مفہوم یقیناً شیوا جی کے جانشینوں یا صرف مرہٹوں سے ہے۔

[3] غالباً یہاں بھیم سین کے ذہن میں وہ منصبداران ہیں جو دکن میں جاگیریں رکھتے تھے یا وہ دکنی امراء تھیں جو پہلے بیجاپور اور گولکنڈہ کی حکومتوں کے ملازم تھے۔

[4] دلکشا، اوراق 138 ب۔ 140 الف۔

جب انہیں فوری فتح کے آثار دکھائی نہ دیتے تو وسیع علاقوں کو پامال کر ڈالتی تھیں۔ غلہ لوٹ لیا جاتا اور آبادی یا تو قتل کر دی جاتی یا غلام بنالی جاتی[1]۔ مغلیہ دکن میں فوجوں کی کثیر تعداد عرصے سے ڈیرے ڈالے ہوئے تھی اور یہاں کے صوبہ کی جاگیریں ان کی کفالت کی ذمہ دار تھیں۔ اس وجہ سے صلح کے ایام میں کسانوں پر ناقابل برداشت بوجھ رہا کرتا[2] اور ہمیں جیسا کہ ہمیں پہلے معلوم ہو چکا ہے، جس وقت اورنگزیب دوسری بار دکن کا نائب سلطنت مقرر ہوا یہ علاقہ بالکل ویران ہو چکا تھا اور کسان بھاگ رہے تھے۔

چنانچہ اس ابتدائی منزل میں بھی بعض کسانوں نے سیواجی کی مدد کرنا شروع کر دی تھی اورنگزیب نے تخت شاہی کے حصول کی غرض سے دہلی کی طرف مراجعت کرنے کے قبل اپنے افسروں سے تاکید کی کہ "علاقہ شاہی کے پرگنوں کے کسانوں، دیش مکھوں اور پٹیلوں کو جو دشمن (یعنی شیواجی اور اس کے ساتھی) سے ساز باز کر کے ان بدبختوں کی رہبری و اعانت میں کوشاں ہیں" سزائے موت دی جائے[3]۔

اس کے ساتھ یہ سوچنا ایک فاش غلطی ہوگی کہ شیواجی یا دیگر مرہٹہ سرداروں نے شعوری طور پر کسانوں کی بغاوت کی قیادت اختیار کی تھی۔ شیواجی خود نظام شاہی سلطنت (بعد میں عادل شاہی) کے ایک بڑے امیر کا لڑکا تھا اور اس کی ترقی کا آغاز کونکن کے ایک بڑے سردار کی حیثیت سے ہوا تھا۔ مرہٹوں کے مالی اور سیاسی طریقوں پر ان کے زمیندارانہ ابتدا کی گہری چھاپ پڑی ہوئی تھی۔ چنانچہ چوتھ جو مرہٹہ چھاپہ ماروں کا ایک عام محصول تھا، زمینداروں کے رواجی مطالبہ

---

[1] احمد نگر اور بیجاپور کے علاقوں میں اس طرح کی کارروائیوں کے لیے موازنہ بہ لاہوری (I) 316 - 17 و 416 - 17 اور اسی قسم کی کارروائی کے لیے جو مرہٹوں کے خلاف جنگوں میں اختیار کی گئی ملاحظہ Fryer (I) ص 310

[2] اورنگزیب کے دکن میں نائب سلطنت کی حیثیت سے لکھے ہوئے خطوط سے یہ بات بالکل واضح طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ جمع میں بے حد اضافہ کر کے اسے صحیح مالگزاری کے چار گنے سے بھی زیادہ کر دیا گیا تھا (ادب عالمگیری، ورق 40 ب، رقعات عالمگیر ص 121 - 2) اور منصبداران اپنی جاگیروں کی آمدنی سے فوج کی کفالت میں بے حد دشواری محسوس کرتے تھے (ادب عالمگیری، اوراق 38 الف - ب، 117 ب 118 الف، رقعات عالمگیر ص 116 - 7 و دیگر صفحات)

[3] ادب عالمگیری، ورق 75 الف - ب۔

یعنی زمین کی چوتھائی سے ماخوذ تھا اور ہمارے علم میں آیا ہے کہ ان دنوں گجرات میں بھی زمین کی مالگذاری کا یہی طریقہ رائج تھا۔[1] یہ غالباً ایک مثالی بات تھی کہ جب تارا بائی اورنگ زیب سے صلح کی خواہاں ہوئی تو اس نے "علاقہ دکن کی دیش مکھی" کی استدعا کی جو کسی بھی زمیندار کی آرزوؤں کا منتہا تھا۔[2] اٹھارہویں صدی کے وسط میں جب مرہٹوں نے اپنے لیے ایک مملکت قریب قریب قائم کرلی تو ان کے سرداروں کی یہ انتہائی تمنا تھی کہ وہ بذریعہ طاقت ہر جگہ کے زمیندارانہ حقوق پر قابض ہو جائیں۔ اس عہد کے ایک مصنف کے بیان کے مطابق "مرہٹوں میں عموماً اور دکن کے برہمنوں میں خصوصاً یہ عجیب وغریب خواہش پائی جاتی ہے کہ وہ دوسروں کو ذرائع معاش سے محروم کرکے ان پر خود متصرف ہو جائیں۔ وہ راجاؤں بلکہ معمولی لوگوں مثلاً مکھیاؤں اور گاؤں کے محاسبین تک کی زمینداریوں کو نہیں بخشتے۔ قدیم خاندان کے وارثوں کو جڑ سے اکھاڑنے کے بعد وہ اپنا قبضہ قایم کر لیتے ہیں اور ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کونکن کے برہمن تمام دنیا کے زمیندار دائم بن جائیں۔"[3]

اس کے علاوہ ہمارے پاس اس یقین کا کوئی سبب نہیں کہ خود مرہٹوں کی حکومت میں کسان مظالم سے محفوظ رہا کرتے۔ فرائیر جس نے 1675 - 6ء میں شیواجی کی مملکت کے متعدد

---

[1] ملاحظہ ہو باب 5 کی فصل ایک۔

[2] اخبارات 47/73 خافی خاں، (2) ص 267 آخر الذکر میں تارا بائی کے طلب کیے ہوئے حقوق کو "سر دیشمکھی" (یا صرف دیشمکھی) بتایا گیا ہے۔ اس حق کا مفہوم مالگذاری میں بقدر 9 (یا 10) فیصد حصہ تھا۔

انگریزی تحریروں میں 1675ء میں "مغلوں اور شیواجی کے درمیان صلح کی ایک بے حد طویل اور دلچسپ رپورٹ ملتی ہے" جس کی رو سے شیواجی کو "مغلوں کے ان تمام قلعوں اور علاقہ کو جن پر اس کا قبضہ تھا واپس کرنا تھا" اور اس کے عوض میں "وہ دکن کے پورے علاقہ کا شاہی 'دیسائی' رہے گا" (English Records of Shivaji) مطبوعہ شیوچرتر کاریالیہ پونا 1931ء ج 1، ص 57 دیشمکھ اور دیسائی کے عہدے ایک ہی ہوتے ہیں۔

[3] آزاد بلگرامی، خزانۂ عامرہ، کانپور 1871ء ص 47۔ یہ 1762 - 3ء کی تصنیف ہے۔ دکنی اور کونکنی برہمنوں کے حوالوں کا غالباً یہ سبب تھا کہ پیشواؤں کے عروج کے بعد اسی ذات کے برہمنوں میں مرہٹوں کے سیاسی نظام کی سربراہی پر قابض ہونے کا رجحان پایا جاتا تھا۔

علاقوں کا دورہ کیا تھا، مرہٹوں کے کسانوں کے ساتھ برتاؤ کو بیان کرتا ہے۔ ہماری اطلاع ہے کہ شیواجی پچھلی مالگذاری کی دو چند شرح پر مالگذاری طلب کیا کرتا تھا[1] اور "کاشتکاروں کے لیے محض اس قدر چھوڑ دیتا ہے جو انہیں زندہ رکھنے کے لیے کفایت کرے"[2] اور کنارا کے علاقہ میں "شیواجی کے مظالم کے باعث تین چوتھائی زمین بغیر کھاد کے (غیر مزروعہ) پڑی رہتی ہے"[3]۔

شیواجی کے لیے کسانوں کے مصرف کا ایک بالکل ہی دوسرا میدان تھا۔ یہی وہ "ننگے، فاقہ کش اشرار" تھے جن پر اس کی فوج مشتمل تھی[4] "صرف نیزوں اور دو انچ چوڑائی کی لمبی تلواروں[5] سے لیس یہ لوگ" ناگہانی حملوں اور غارتگری کے لیے موزوں" مگر" میدانی جنگ میں جم کر لڑنے" کے مصرف کے نہ تھے[6] ان کی زندگی کا دارومدار محض لوٹ مار پر تھا کیونکہ شیواجی کا مقولہ تھا کہ "لوٹ مار نہیں تو تنخواہ نہیں"[7]۔ یہ تھی نجات کی وہ صورت جو دکن کے کنگال کسانوں کو شیواجی اور اس کے جانشینوں نے فراہم کی۔ بھیم سین کی سرگذشت سے واضح ہوتا ہے کہ مرہٹوں کی فوجی کارروائیوں میں زراعت پیشہ کسانوں کے لیے راحت کا کوئی سامان نہ تھا۔ برخلاف اس کے، ان کی معرکہ آرائیاں ان کے لیے المناک اذیتوں کا سبب بنا کرتی تھیں۔ "قزاق حکومت"[8] کے دائرہ عمل میں توسیع کے ساتھ ان کے مظلومین کی تعداد میں اضافہ ہوا مگر بظاہر یہ اضافہ "ننگے فاقہ کش اشرار" کی تعداد میں مزید زیادتی کا سبب بنا اور انھوں نے بھی لوٹ مار کا کام شروع کر دیا، کیونکہ زندہ رہنے کے خاطر ان کے لیے بجز غارتگری کی صف میں شامل ہو جانے کے کوئی اور چارۂ کار نہ تھا[9] اور اس

---

1 Fryer (2) ص 5

2 ایضاً (1) ص 12-311 اور نیز ص 46

3 ایضاً (2) ص 86

4 ایضاً (2) ص 67

5 Manucci (3) ص 505

6 Fryer (2) ص 68/67 Manucci حوالہ سابقہ۔

7 Fryer (1) ص 341

8 یہ اصطلاح 'ڈی' اے' اسمتھ سے مستعار کی گئی ہے۔

9 اس طور پر مرہٹوں کے ہندوستان کے ایک بڑے حصہ کو فتح کر لینے کے بعد بھی (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

طور پر یہ لامتناہی سلسلہ چلتا رہا۔

اورنگزیب کا اپنے آخری دنوں میں اعتراف ہے کہ "کوئی بھی صوبہ یا ضلع ایسا نہیں جو کافروں کی فتنہ انگیزی سے محفوظ ہو اور چونکہ ان کی سرزنش نہیں کی جاتی، لہٰذا انہوں نے ہر جگہ اپنا تسلط قایم کر رکھا ہے۔ بیشتر ملک ویران ہو چکا ہے اور اگر کوئی جگہ آباد نظر آتی ہے تو وہاں کے کسانوں نے غالباً ڈاکوؤں (اشیاء، مرہٹوں) کے لیے مغلوں کا سرکاری نام) سے ساز باز کر لی ہے[1]..."

غرضیکہ اس طور پر مغلیہ سلطنت تباہ ہوئی۔ اس کے مدمقابل صف آرا قوتیں کوئی نیا نظم نہ قایم کر سکیں اور نہ ہی وہ اس کی اہل تھیں[2] اس کے بعد جو دور آیا وہ کوئی خوش کن منظر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ان کی فوج نچلے طبقوں ہی کے افراد پر مشتمل رہی۔ آزاد بلگرامی 1762 - 3ء میں لکھتے ہیں کہ "دشمن (مرہٹوں) کی فوج میں بیشتر رذیل طبقہ کے لوگ مثلاً کسان، گڈریے، بڑھئی اور موچی ہیں جبکہ مسلمان افواج بیشتر شرفاء اور اعلیٰ خاندان کے افراد پر مشتمل ہیں۔ دشمن کے غلبہ کا سبب یہ ہے کہ ان کی فوجیں محنت شاقہ برداشت کر سکنے کے باعث چھاپہ مار طرز پر جنگ (قزاقی) کرتی ہیں اور میدان جنگ میں اپنے دشمن کے غلّہ اور چارہ کی رسد کے سلسلہ کو منقطع کر دیتی ہیں جس سے یہ ناکارہ ہو جاتا ہے... (گو کہ) رذیلوں میں اشراف ایسی فطری شجاعت اور وقار کے جوہر کہاں" (خزانۂ عامرہ، ص 49)

پنڈاریوں کی مثال سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مرہٹوں کی لوٹ مار میں اضافہ کے ساتھ ان کے فوجیوں کی تعداد کیونکر بڑھتی گئی۔ "پنڈاریوں کے مظالم ہی ان کی قوت کا سرچشمہ ثابت ہوئے کیونکہ جیسے جیسے ان کی لوٹ مار کا دایرہ وسیع ہوا، مال و جایداد غیر محفوظ ہوتا گیا اور جو لوگ ان کے مظالم کا شکار ہوئے تھے وہ خود بعض میں غارتگری کو اپنا ذریعہ معاش بنانے پر مجبور ہوئے۔ وہ جس دھارے کی خود تاب نہ لا سکے تھے اسی میں شامل ہو گئے اور دوسروں کو لوٹ کر اپنے نقصانات کی تلافی میں مصروف

" A Memoir of Central India including Malva & C

ہوئے۔" دیجیے۔ میلکوم، جلد (1) لندن، 1832ء (طبع ثالث) ص 429) پنڈاری جنہوں نے بعد کے پیشواؤں کے تحت مرہٹوں کی امدادی فوج کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، مرہٹہ نظام کی قدرتی پیداوار بلکہ اس کا بجنسہ نمونہ تھے۔

[1] احکام عالمگیری، ورق 61 ب۔

[2] ہندوستان میں سترھویں صدی کی شورشیں اپنے مدمقابل طاقتوں کے (باقی حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

پیش نہیں کرتا بلکہ اس میں بے دریغ غارتگری، طوائف الملوکی اور غیر ملکی حکومت کے تسلط کے لیے راستے ہموار ہوتے رہے لیکن سلطنت مغلیہ نے اپنی قبر خود کھود لی تھی اور حسب ذیل اشعار جسے سعدی نے ایک دوسری عظیم الشان سلطنت کے لیے نظم کیے تھے، مملکت مغلیہ کے لوح مزار کے لیے بھی ایک موزوں کتبہ کا کام دے سکتے ہیں۔

خبرداری از خسروان عجم
که کردند بر زیر دستان ستم

نه آں شوکت و بادشائی بماند
نه آں ظلم بر رد ستائی بماند[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

کاموں سے کوئی بہتر کارنامہ انجام دینے میں ناکام رہیں۔ اس کا سبب جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے اس وقت کا تاریخی ماحول اور مختلف طبقوں کے درمیان ایک مخصوص نوعیت کے تعلق کا پایا جانا تھا۔ اس سلسلہ میں تاریخ چین کے اوراق کا حوالہ سبق آموز ہو سکتا ہے کیونکہ شاید وہ تنہا ایک ملک ہے جس کا باعتبار جسامت اور قدیم ماضی کے ہندوستان سے موازنہ کیا جاسکتا ہے چین میں کسانوں کی متعدد بغاوتوں یعنی تائے پنگوں تک کو شامل کر لینے کے بعد ماوزی تنگ کا یہ مشاہدہ درست ہے کہ "چینی تاریخ میں اس قسم کی کسانی شورشیں اور کسانی جنگیں اپنی کلانی کے اعتبار سے دنیا میں بے مثال ہیں" وہ بہرحال یہ بھی کہتا ہے کہ "ان ایام (دور قدیم و وسطی) میں چونکہ نئی تخلیقی قوتوں، نئے پیداواری رشتوں، کسی نئی طبقاتی توانائی اور ترقی یافتہ سیاسی جماعت کا وجود نہ پایا جاتا تھا... لہٰذا کسانوں کے لائے ہوئے انقلابات بنا بریں ناکام ہوئے اور ہر انقلاب کے بعد زمینداروں اور امراء نے کسانوں کو حکمران خاندان کی تبدیلی کے لیے بطور آلۂ کار استعمال کیا (ماؤزی تنگ، Selected works انگریزی ایڈیشن، جلد (3) لندن، 1954، صفحہ 73-6)

[1] "خبرداری از خسروان عجم" الخ، بوستان۔

ضمیمہ ۔ الف

زمین کے ناپ

فصل ۔ ۱ ـــــ گز سکندری

زمین کی پیمایش کے لیے مستند سرکاری اکائی جو اکبر کی حکومت کو اپنے پیشروؤں سے ورثہ میں ملی گز سکندری تھی۔ بقول آئین اکبری، یہ گز پہلے پہل سکندر لودی نے قایم کر کے اس کے طول کو اپنے 41 ½ سکندری سکوں (ٹکے تنکہ) کے مساوی قرار دیا تھا جسے بعد میں ہمایوں نے بڑھا کر 42 کر دیا۔ شیر شاہ اور اسلام شاہ کے تحت یہی گز استعمال ہوتا رہا اور کہا جاتا ہے کہ ان دونوں بادشاہوں نے پورے ہندوستان کو ضبط کے تحت لانے کے سلسلہ میں "اسی گز سے پیمایش کرائی تھی"[1] 31ویں یا 33ویں جلوس اکبری تک اسے سرکاری حیثیت حاصل رہی پھر اس کے بجائے گز الٰہی رائج ہوا[2]

---

[1] آئین اکبری (۱) 296 عہد شیر شاہی کے مدد معاش کے تین دستاویزوں میں یہ شرط درج ہے کہ معافی کے رقبوں کو گز شیر شاہی سے ناپا جائے (الہ آباد 318 اور دیگر دستاویزات کی اصل عبارت مع فوٹو Oriental College Magzine, V. IX. No. 3 (May 1973) pp. 121-2 p.25-8 میں طبع ہوئی ہے) غالباً شیر شاہ نے گز کی لمبائی میں تھوڑا ردّ و بدل کیا تھا جس کی وجہ سے اس نے گز سکندری کو خود اپنے نام سے منسوب کیا۔

[2] آئین اکبری (۱) 296 اکبر نامہ (3) 529 میں گز الٰہی کے استعمال کو ابتداءً تینتیسویں سال سے منسوب کیا گیا ہے نہ کہ اکتیسویں سال سے جیسا کہ آئین اکبری میں درج ہے۔

طامس بہ احتیاط پیمایش کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر سکندری سکوں کو ایک قطار میں رکھا جائے تو ہمارے ناپ کے تیسویں انچ کا آخری سرا بیالیسویں سکے کے ٹھیک مرکز پر پڑے گا[1] جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ 42 سکندری، 24 / 30 انچوں کے برابر ہیں، لیکن سکوں سے اس قسم کا تجربہ کرنے کی صورت میں جبکہ سکے مکمل طور پر نہیں بلکہ صرف تقریبًا گول ہوں غلطی کی بظاہر زیادہ گنجایش رہتی ہے۔ علاوہ اس کے خود طامس کو اعتراف تھا کہ اگر چار صدیوں کی مدت میں سکوں کے گھسنے کا لحاظ رکھا جائے تو گز کا اصل طول اس کے قایم کیے ہوئے مذکورہ ناپ سے حقیقتًا زایدہ ہوگا۔

ابوالفضل کا یہ بھی قول ہے کہ ہمایوں کا گز سکندری 32 انگشت (انگل) کا تھا[2] اور چونکہ گز الٰہی کا طول 41 انگل تھا، لہٰذا گز سکندری گز الٰہی کے ہ‍ ے قدر سے چھوٹا ہوگا۔ گو کہ دور حاضر کے بعض ماخذ اس تناسب سے متفق ہیں[3] لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ 32 کا عدد عدد ہو کتابت کی وجہ ہے کیونکہ اس سے جو تناسب قایم ہوتا ہے اس کی قطعی تردید خود ابوالفضل

---

[1] Prinsep, ' Useful Tables, ed. Thomas, PP. 123-24 n. سکندر لودی کے ان سکوں کی فہرست کو جن کی موجودگی کا اب تک علم ہوسکا ہے، ایچ، این، رایٹ نے اپنی تصنیف 'Coinage and Metrology of the Sultans of Delhi', PP. 250-4 میں درج کیا ہے۔ بقول ابوالفضل، سکندری "چاندی ملے ہوئے تانبے کے سکے تھے" اور یہ یقینًا سکندر لودی کے وہ زیادہ وزنی سکے رہے ہوں گے جو اس کے مروجہ سکوں میں بیشتر تعداد میں تھے۔ رایٹ کی فہرست میں منفرد سکوں کے ناپ علامت اعشاریہ کے بعد صرف قریب ترین ہندسہ اور بعض صورتوں میں دوسرے ہندسہ میں 5 تک، انچوں میں دکھائے گئے ہیں۔ لہٰذا ان ناپوں کی امداد سے طامس کے ناپوں کی صرف کچھ جانچ کی جاسکتی ہے۔ طامس نے جن سکوں کو ناپا تھا ان کے قطر کی اوسط لمبائی فی عدد 723 ر 0 انچ رہی ہوگی۔ گو کہ سکندر کے بعض ابتدائی سکوں کا قطر 65 ر 0 انچ اور ایک سکہ کا قطر 6 ر 0 انچ ہے لیکن رایٹ کی فہرست میں 900 ھ اور اس کے بعد کے سکوں کی پیمایش یکساں طور پر 7 ر 0 انچ اور صرف چند استثنائی صورتوں میں 75 ر 0 انچ دکھائی گئی ہے، لہٰذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طامس کے سکندری تقریبًا معیاری ناپ کے تھے۔

[2] آیئن اکبری (1) 296

[3] Prinsep, 'Useful Tables', ed. Thomas, P. 123 لیکن موازنہ بہ نیز طامس کا لوٹ Ibid, P. 12

کے بیان کیے ہوئے گز سکندری اور گز الٰہی کے ایک بیگھہ (60 گز کے ایک مربع) کے درمیانی فرق سے ہوتی ہے۔

سب سے اوّل تو وہ یہ کہتا ہے کہ عہد حکومت کے انیسویں برس، بانس کی جریب کے رائج ہونے کے قبل بیگھہ اپنی اصل جسامت سے 13 فیصدی چھوٹا تھا، کیونکہ سن کی رسی کی لمبائی 60 گز سے سمٹ کر 56 گز ہو جاتی تھی[1] دوسری تبدیلی، گز الٰہی کے رائج ہونے پر واقع ہوئی۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ابوالفضل نئے اور متروک الاستعمال بیگھوں کے فرق کو بمقدار اوّل الذکر شرحوں کے دکھاتا ہے تو آخر الذکر اکائی کے 100 بیگھے گز الٰہی کے 626 ر 90 بیگھوں کے برابر ہوں گے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ بلحاظ طول خطی 100 گز سکندری، 3 ر 95 گز الٰہی کے برابر ہے

---

[1] یہ بیان بادیٔ النظر میں غیر منطقی اور کسی اصول پر مبنی نہیں معلوم ہوتا۔ ہر رسی کا 60 گز میں 4 گز کی یکساں شرح پر سکڑنا لازمی نہیں ہو سکتا۔ ملاحظہ ہو خود ابوالفضل کا اس کے تھوڑے ہی قبل یہ بیان 'ایضاً (1) ص 296 مگر اس بیان کی توجیہہ 1757 ء کے ایک پروانہ سے ہوتی ہے جس کے ذریعہ پرگنہ بٹالہ میں ابتداً 1569 ء میں عطا کی ہوئی ایک معافی بحال کی گئی ہے اور جس میں اصل معافی کی عبارت ظہری کی نقل دی گئی ہے (53) (38 44) (I.O) عبارت ظہری سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی معافی 300 بیگھہ کی تھی مگر اس کے رقبہ میں تین بار یکے بعد دیگرے تخفیف کی گئی۔ پہلی تخفیف کو "تخفیف پر بنائے قصور طناب" کہا گیا ہے۔ تخفیف بقدر 39 بیگھہ 2 بسوہ یعنی اصل معافی کی ٹھیک 03 ر 13 فیصدی کی ہے۔ لہٰذا ایسا معلوم ہے کہ نئی طناب کو رائج کرتے وقت یہ پیش بندی کر لی گئی تھی کہ اب بیگھہ بڑا ہو جائے گا اور اس خیال سے کہ معافیداروں کو اضافہ سے فایدہ پہونچے معافیوں کے مجموعی رقبوں میں تخفیف کی ایک شرح معین کر دی گئی تھی تاکہ بیگھہ کے ناپ کا اضافہ صرف برابر ہی نہیں بلکہ نا ثبا برابر سے بھی کم ہو جائے۔ ابوالفضل نے ایک معمولی سی کسر کو جو یقیناً محض اس علاقہ کے لیے مخصوص رہی ہوگی حذف کر کے تخفیف کی اس شرح کو یہاں مستعار لیا ہے۔

[2] آئین اکبری (1) 297 میں پوری عبارت اس طور پر درج ہے۔ سن کی رسی (طناب سن) کا ایک بیگھہ بمقابلہ بانس کی جریب (طناب بانس) کے ایک بیگھہ کے بقدر دو بسوہ بارہ بسوانسی کم تھا اور ہر ایک سو بیگھہ پر یہ فرق 13 بیگھوں کے برابر ہو جاتا تھا۔ حالانکہ طناب سن بھی 60 گز لمبا ہوتا تھا لیکن رسی گھٹنے کے بعد یہ (صرف) 56 گز رہ جاتا اور گز الٰہی (کا بیگھہ) بمقابلہ گز سکندری (کے بیگھہ) کے بقدر ایک بسوہ سولہ بوانسے، تیرہ تثوانسے، اٹھ پٹوانسے اور چار انوانسے بڑا ہوتا تھا۔ دونوں تخفیفوں (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

گز الہٰی کے رائج ہونے پر بیگھہ کے رقبہ میں تبدیلی کے متعلق ابوالفضل کے بیانات کی تائید دستاویزات مدد معاش پر مندرج متعدد ظہری کی عبارتوں سے بھی ہوتی ہے۔ یہ عبارتیں معافیوں کے رقبہ میں مخصوص طور پر جدید ناپ کی بنا پر ابوالفضل کے قول کے مطابق ۱ر۱۰ فیصدی کے بجائے، اصل رقبوں میں 5 ر10 اور 6 ر10 کی تخفیف ظاہر کرتی ہیں[1] تخفیف میں تفاوت کا سبب غالباً یہ ہے کہ مختلف علاقوں میں تخفیف کی معینہ شرحیں معیار سے تھوڑی کم و بیش رہا کرتی تھیں۔ علاوہ بریں تفاوت اس قدر کم ہے کہ معافیوں کے رقبہ میں تخفیف کی بنیاد پر اگر گز الہٰی کا طول خطی بمقدار گز سکندری نکالا جائے تو یہ ابوالفضل کے اعداد کی بنیاد پر نکالے گئے طول سے بہت تھوڑا ہی زیادہ ہوتا ہے[2]

ان دونوں ناپوں کی لمبائیوں میں جو تناسب اس طور پر قائم ہوا وہ قریب قریب ٹھیک 41 : 39 کے ہے[3] چونکہ گز الہٰی 41 انگل کا ہوتا ہے، لہٰذا گز سکندری 39، انگل کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

سے ایک بیگھہ میں چودہ دکنڈا (4) میوے، بیس دکنڈا ! آٹھ۔ فارسی تحریر میں بشت (8) اور بست (20) اکثر غلط ملط ہو جاتے ہیں) بسوانسے، تیرہ تسوانسے، آٹھ بٹوانسے اور چار انوانسے کا فرق نکلتا ہے۔

[1] 5 ر10 کی تخفیف (جسے قصور تفاوت گز الہٰی کہا گیا ہے) انڈیا آفس میں زمرۂ بٹالہ کے دستاویزات I.O. 4438 نمبران 7، 25 و 55 کی عبارت ظہریوں میں ملتی ہے۔ 6 ر10 کی تخفیف بطور "تفاوت گز الہٰی پرگنہ بہرائچ کے دو دستاویزات یعنی الہ آباد 1177 کی ایک عبارت ظہری میں اور الہ آباد 289 کے متن میں دکھائی گئی ہے۔ الہ آباد 1177 کی ایک دوسری عبارت ظہری میں 5 ر11 فیصدی کی تخفیف درج کی گئی ہے لیکن اس پر یہ اندراج کہ یہ تخفیف "مظفر خاں کے ایک پروانچہ (حکم) کی تعمیل میں" کی گئی ہے ظاہر کرتی ہے کہ یہ ایک استثنائی صورت تھی سرکار لکھنؤ کے پرگنہ ادنام (اناؤ) کے دستاویز الہ آباد 154 میں طناب سن سے ناپے ہوئے بیگھہ میں بالمقابل گز الہٰی سے ناپے ہوئے بیگھہ کے 00 ر23 فیصدی کی مجموعی کمی کا حوالہ ملتا ہے۔

[2] بیگھہ کی جسامت میں 5 ر10 فیصدی کی تخفیف کا یہ مفہوم نکلتا ہے کہ 100 گز سکندری 605 ر94 گز الہٰی کے برابر تھے، مگر بقول ابوالفضل آخرالذکر عدد کو 3 ر95 ہونا چاہیے۔

[3] 42 : 39 (تصحیح مابعد) کے تناسب کا یہ مطلب ہوا کہ 122 ر95 گز الہٰی (ابوالفضل اور دستاویز مدد معاش کے 3 ر95 اور 6 ر94) 100 گز سکندری کے برابر تھے۔

ہوا۔ پس حقیقتاً ابوالفضل کی اس ناپ کی 32 انگل لمبائی غلط ہے۔ صحیح لمبائی 39ا انگل ہے۔

دونوں ناپوں کے اس تناسب کی بنیاد پر حساب لگا کر ہم سکندری کے طول سے گزالٰہی کا طول جیسا کہ طامس نے معلوم کیا ہے نکال سکتے ہیں۔ ایسا کرنے پر (گز الٰہی کا) طول 92 ر 31 انچ آتا ہے، مگر چونکہ طامس نے اپنے استعمال کیے ہوئے سکوں میں گھسنے کا لحاظ نہ رکھا تھا، لہٰذا ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ گز کا طول اس سے تھوڑا زیادہ رہا ہوگا۔[1] اگلی فصل میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ دیگر شواہد اس لمبائی کی تائید کرتے ہیں یا نہیں۔

فصل 2 گز الٰہی

گز الٰہی کی صحیح لمبائی کی بحث تقریباً 140 برس پرانی تاریخ رکھتی ہے۔ پچھلی صدی کی تیسری دہائی کے اوائل میں موجودہ اتر پردیش کے علاقہ کے 'سروے' کے سلسلہ میں جب مالگزاری مستثنیٰ معافیاں سامنے آئیں تو ان کے رقبوں کو معین کرنے کی غرض سے حکومت برطانیہ کو اس گز کی صحیح لمبائی معلوم کرنے کی اہمیت کا تھوڑا احساس ہوا۔ حکومت نے بالآخر 1825ء میں یہ اعلان کیا کہ وہ ایک گز الٰہی کو 33 انچ کے مساوی تصور کرتی ہے۔ یہ فیصلہ کسی اصول پر مبنی نہ تھا مگر کم از کم اس کا جزوی سبب وہ سہولیت تھی جو اس لمبائی کے گز پر مبنی بیگھوں کو ایکڑوں میں تحویل کرنے میں ہوتی تھی۔[2] انتظامی نکتۂ نگاہ سے اس کی اہمیت ختم ہو جانے کے بعد، بجز اس کے کہ اس پر کبھی کدھار مقالے یا تجاویز پیش کر دی جائیں، اس موضوع سے اصولی دلچسپی کا خاتمہ ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس موضوع پر ہمعصر شہادتوں کا کوئی باضابطہ معاملہ نہیں کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دور حاضر کے بعض مصنفین، گز الٰہی اور اس کے مماثل بعض دیگر پیمائشی اکائیوں کے درمیان صحیح فرق کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ آنے والے صفحات میں جو تفصیلات

---

[1] یاد رہے کہ واحد یورپی سیاح جو گز سکندری کا واضح حوالہ دیتا ہے Marshall, 420 ہے وہ اسے "سکندری گز موسومہ تالینی گز" کہتا ہے اور اس کی لمبائی $27\frac{7}{8}$ انچ اور گز الٰہی کی $31\frac{1}{8}$ انچ بتاتا ہے۔ لیکن چونکہ مارشل کی یہ تحریر اورنگ زیب کے زمانہ کی ہے، لہٰذا ان دونوں ناپوں کے متعلق اس کی سند زیادہ وقیع نہیں تصور کی جا سکتی۔

[2] موازنہ ہو Prinsep, 'Useful Tables', ed. Thomas, 125

پیش کی جارہی ہیں، انہیں غالباً اس کمی کو پورا کرنے کے جواز کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے، ورنہ جہاں تک اس موضوع کے دوسرے پہلوؤں کا تعلق ہے ان پر تو بظاہر کافی خامہ فرسائی کی جا چکی ہے۔

گز الٰہی کے متعلق، ابو الفضل کی صرف اس قدر اطلاع ہے کہ یہ 41 انگل یا انگلی کی چوڑائی کے برابر تھا[1] بدقسمتی سے ہندوستان میں انگل کا کوئی معین ناپ نہیں ہے[2] انگلیوں کی واقعۃً پیمائش کرنے کے بعد جو اوسط نکالا گیا ہے، اس سے آئین اکبری یا مغلیہ انتظامیہ کے انگل کا صرف ایک تخمینی اندازہ لگایا جا سکتا ہے[3]۔

بہرحال، اوائل سترھویں صدی کے دو واضح بیانات گز الٰہی کو یورپی پیمانوں کی اکائیوں

---

[1] آئین اکبری (ا)

[2] انگریزی طریقۂ حساب جس سے 41 انگل، 75 ر 30 انچ کے برابر ہوتا ہے یہاں بے محل ہے، حالانکہ Prisep (حوالہ سابقہ 124) نے اسے عارضی طور پر اختیار کیا ہے اور مورلینڈ نے بھی اس کی پیروی کی ہے Journal of the U.P. Historical Society' Vol. ii (1919) pt. 1, p-17)

[3] کرنل، اے، ہاجسن، سروے ار جنرل آف انڈیا نے گز الٰہی کے طول کے تعین کے سلسلہ میں "بمقام نگلڈہ مختلف طبقوں کے 76 اشخاص کے داہنے ہاتھ کی چار انگلیاں کی چوڑائی کی پیمائش کی" جس کا اوسط نتیجہ یہ نکلا کہ 41 انگلیوں کی چوڑائی درمیانی جوڑوں پر ناپنے سے 549 ر 31 انچ اور انگلیوں کی جڑوں پر ناپنے سے 18 ر 33 انچ آئی (.Hodgson, " Memoire on the Length of the Illahi Guz," JRAS, 1848, PP. 45-49) جو کے 6 خوشوں کو بھی عموماً ایک انگل کی چوڑائی تصور کیا گیا ہے۔" ہیلہڈ (Halhed) نے مراد آباد میں اس کا تجربہ کرکے 41 انگلیوں کی اوسط چوڑائی 843 ر 31 انچ معلوم کی (ایضاً 49 - 50) بقول آئین اکبری "بعض لوگ" ایک انگل کو "اوسط جسامت کے جو کے چھ خوشوں کی مجموعی چوڑائی" کے برابر تصور کرتے ہیں (ج ا 295، 597) اور "ہند کے داناؤں" کے نزدیک یہ "بھوسہ نکالے ہوئے جو کے آٹھ خوشوں کی چوڑائی" کے برابر ہوتی ہے (ج (ا) 598)

ہیلہڈ نے دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا ہے اس کی پیمائش "منصوری پیسوں" سے کرکے" اس قسم کے 42 پیسوں کو ایک گز کے برابر معلوم کیا۔" نتیجۃً ایک گز 205 ر 32 انچ کے برابر ہوا (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

یں جن کے ناپ اس وقت سے اب تک تبدیل نہیں ہوئے ہیں ظاہر کرتے ہیں۔ 20 16 ۔ 21 ء کی رابرٹ ہوگیس (Robert Hughes) کی پٹنہ سے تحریر ہے کہ "آگرہ کا الٰہی، جہانگیری کوڈ (Coved) کا جس کی لمبائی ایک جگہ 5 ر 40 انچ اور دوسری جگہ 40 انچ بیان کی گئی ہے $\frac{4}{5}$ ہے[1] لہٰذا اس طور پر گز الٰہی کو 32 یا 4 ر 32 انچ کا ہونا چاہیے مگر پھر ہوگیس ہی واضح طور پر اشارہ کرتا ہے کہ یہ در حقیقت $32 \frac{1}{8}$ یا 125 ر 32 انچ کا تھا۔[2] اس سے تقریباً کچھ کم چھ سال بعد پلسارٹ کا یہ بیان ملتا ہے کہ "100 اکبری گز ہمارے (ولندیزی) 120 ایلس کے برابر تھے"[3] جس کے یہ مطلب ہوئے کہ اس کی لمبائی 126 ر 32 انچ تھی۔ پس ان دونوں ماخذ میں بیحد مطابقت پائی جاتی ہے اور اس کی اہمیت اس لیے اور بھی ہے کہ ہمارے یورپی ماخذ میں صرف انہیں دو نے اس گز کا واضح طور پر ذکر کیا ہے[4] بلا نام کے 'کوڈیس' یا 'ایلس'، جو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

(JRAS, 1848, p. 50) لیکن یہ بظاہر ابوالفضل کے بیان کے متعلق جس میں 42 سکندری سکوں کو گز الٰہی کا نہیں بلکہ ہمایوں کے ترمیم شدہ گز سکندری کا طول بتایا گیا ہے غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتا ہے لہٰذا جو سکے تجربہ کے لیے استعمال میں لائے گئے تھے وہ بھی غلط تھے۔

[1] Factories 1618 - 21, pp. 192, 197, 236.

[2] ایضاً، 236 ہوگیس سورت کے تجارتی گماشتوں کو ان کے خط کے جواب میں لکھتا ہے کہ یہاں کا "جہانگیری کوڈ" جیسا کہ ان کے خط میں تحریر ہے $32 \frac{1}{8}$ انچ کا نہیں بلکہ 40 انچ کا ہے۔ چونکہ ہوگیس کو پہلے انہیں تجارتی گماشتوں کی اطلاع کے لیے گز الٰہی اور گز جہانگیری میں امتیاز قایم کرنا پڑا تھا۔ (ص 192) لہٰذا اس کا امکان پایا جاتا ہے کہ ان دونوں اکائیوں کو اب پھر خلط ملط کر دیا گیا ہو۔

[3] Pelsaert, p. 29. ولندیزی 'ایل' کی لمبائی کے لیے، ملاحظہ ہو، Moreland, "Relations of Golcanda, P. 88

[4] پوری سترھویں صدی کے دوران مارشل واحد سیاح تھا جس نے اس گز کے طول کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ وہ اکبر کے گز کو جو 'ٹیلرس گز' کہلاتا تھا $31 \frac{1}{8}$ انچ کا "بتاتا ہے (ص 420) مگر چونکہ یہ بیان بہت بعد کا ہے لہٰذا اسے اصل اکائی کی لمبائی کی سند کے طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا سب سے زیادہ یہ قرین قیاس ہے کہ اسے جو گز ملا تھا وہ اصل گز الٰہی نہیں بلکہ اس کی کوئی ترمیم شدہ یا تخفیف شدہ شکل تھی جو کسی مخصوص کاروبار میں استعمال کی گئی ہے۔

اس وقت رائج تھے، کے دوسرے جو حوالے ملتے ہیں، ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ لازمی طور پر گز الٰہی سے متعلق ہیں۔

چنانچہ کہا جاتا ہے کہ 1614ء میں مملکت مغلیہ میں عام طور پر کپڑے کے کاروبار میں دو 'کویڈاس' یا پیمانے، ایک 33 انچ کا اور دوسرا 27 انچ کا استعمال کیے جاتے تھے۔ 1616ء میں سالبنک (Salbank) اور فیٹی پلیس (Fettiplace) آگرہ اور اجمیر سے لکھتے ہوئے صرف ایک "کواڈ" کا ذکر کرتے ہیں جس سے ان کے کپڑے دربار اور عام بازاروں میں فروخت ہوا کرتے تھے اور جس کی طول انگریزی گز کا $\frac{7}{8}$ یا 5ر31 انچوں کے برابر تھا[1] اس کو تزک جہانگیری میں مندرج اس بیان کے ساتھ کہ عہد جہانگیری کے تیرھویں برس گز الٰہی 40 انگل کا تھا پڑھنا چاہیے[2] حالانکہ آئین اکبری کے دنوں کے مقابلہ میں گز الٰہی کے طول میں ایک انگل کی کمی کوئی ناممکن بات نہیں، لیکن زیادہ قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر نے بے احتیاطی سے اس گز کی وہ لمبائی تحریر کر دی ہے جو واقعۃً ایک جداگانہ مگر تقریباً برابر کی اکائی کی تھی[10] جلوس شاہجہانی میں آگرہ کی چند عمارتوں کی پیمائش قلم بند کرتے ہوئے لاہوری 40 انگل، گز الٰہی کی نہیں بلکہ اس گز کی لمبائی بیان کرتا ہے جسے وہ زراع بادشاہی یا شاہی گز[3] کے نام سے موسوم کرتا ہے غالباً اس زراع کو سالبنک اور فیٹی پلیس کا بلا نام کا کواڈ تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ 'کواڈ' اور ہوکنس اور پلسارٹ کے بتائے ہوئے گز الٰہی کے طول میں $\frac{1}{41}$ سے قدرے کم کا فرق ہے۔ لیکن یاد رہے کہ بظاہر یورپی پیمانوں میں ان کے مساوات ٹھیک ٹھیک نہیں بلکہ صرف تخمینی بتائے گئے ہیں، لہٰذا ہمیں کسر کے تھوڑے سے فرق پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔

لاہوری کی بیان کی ہوئی تاج محل کی تفصیلی پیمائش کی مدد سے ہم غالباً 'زراع پادشاہی' کی لمبائی زیادہ صحیح طور پر متعین کر سکتے ہیں (جس کی مدد سے پھر گز الٰہی کی لمبائی بھی اخذ کی جا سکے گی) حالانکہ تاج محل کی بنیاد عہد حکومت کے پانچویں برس کی ابتدا ہی میں رکھی جا چکی تھی لیکن اس نے ان پیمائشوں کو اپنے دلی نعمت کے عہد حکومت کے پندرھویں برس جب اس کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی

---

[1] Zeli. Recd. IV) p. 251 & 258

[2] تزکِ جہانگیری، 234

[3] لاہوری (1) (2) 237 ۔ زراع، درعا اور گز ایک دوسرے کے بجائے مستعمل اصطلاحیں تھیں۔

قلبند کیا تھا[1] یہ پیمایش ایک غیر واضح 'زراع' کی مقدار میں درج ہے لیکن یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ یہ 40 انگل کی وہی اکائی تھی جسے لاہوری نے عہد حکومت کے دسویں برس، آگرہ کی دوسری عمارتوں کی پیمایش کے سلسلہ میں استعمال کیا تھا۔ حالانکہ لاہوری کی پیمایش پندرھویں برس قلم بند کی گئی تھی، لیکن یہ بدیہی طور پر اصل نقشہ کے مطابق جو دس برس قبل طیار کیا گیا ہوگا یہ امر سنگ مرمر کی کرسی کی پیمایش یعنی 120 x 120 زراع یا ٹھیک چار بیگھوں سے واضح ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر مرتبین نقشہ کے ذہن میں پیمایش رہی ہوگی، کیونکہ ایسا ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ اصل پیمایش کوئی اور رہی ہو اور اسے کسی دوسری اکائی میں تحویل کرنے کے بعد یہ پیمایش حاصل ہوئی ہو۔

کرنل اے۔ ہاجسن (Col. A. Hodgson) اور ان کے عملہ نے 1825ء میں تاج محل کی تقابلی پیمایش کی۔ اسے معلوم ہوا کہ سنگ مرمر کی کرسی، پیمایش اور موازنہ دونوں ہی کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ اس کی پیمایش سے 'زراع' کا اوسط طول 156 ÷ 31 انچ اور نچلی سنگ سرخ کی کرسی کی پیمایش سے 464 ÷ 31 انچ معلوم ہوا[2] اگر ان اعداد کو

---

[1] لاہوری (2) 322 - 9

[2] اس کی پیمایشوں کی مکمل تفصیل اس کی تصنیف Memoire on the Length of the Illabi Cuz or Imperial Lamd Measure of Hindustan," TRAS, 1843, pp. 45-53 میں بظاہر 40 انگل کے زراع سے اپنی لاعلمی کے باعث اس کا خیال تھا کہ تاج محل میں جو زراع استعمال کیا گیا ہے وہ "گز الٰہی" ہے لیکن وہ بہرحال اس 42 انگل کی اکائی سے واقف تھا جسے لاہوری (2)، 534، 709 نے عہد حکومت کے انیسویں و بیسویں برس کے تحت بیان کیا ہے۔ مگر اس کے خیال کے مطابق انگلیوں کی تعداد میں اضافہ اس کی پوری لمبائی میں اضافہ کو نہیں بلکہ ہر انگل کی لمبائی میں تخفیف کی کو ظاہر کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پیمایش کے جو نتائج پہلے طبع ہو چکے تھے 'زراع' کی نسبتاً بہت زیادہ لمبائی کی نشاندہی کرتے تھے (موازنہ ہو۔ Prinsep, 'Useful Tables', ed. Thomas, p-125)۔ اس پر ڈبلو کراکروفٹ نے ایک مراسلہ ("On the Measurement of the Illaby Gue of the Emperor Akbar" TASB, 1834, pp. 360-61). تحریر کیا جس میں اس نے قلم بند کیا کہ تاج محل کی کرسی کے سنگ مرمر کے ٹکڑوں کی پیمایش سے اسے یقین ہو گیا کہ انہیں گز کی اکائیوں یا اس کے اضعاف کے ناپ کے ٹکڑوں کے مطابق تراشا گیا تھا اور اس طور پر گز کی جو اوسط لمبائی نکلی وہ 32 انچ سے کسر کم تھی۔

انگل کے 'زراع' بادشاہی کے بارے میں قیاس کیا جائے۔ تو چونکہ گز الہٰی 41 انگل کا تھا، لہٰذا اس کی لمبائی کو تقریباً 242 ر 32 انچ تصور کرنا چاہیے۔

انگریز تجارتی گماشتوں کے 1647۔ 8 ء کے خطوط میں، ہمیں دو بیانات اس مفہوم کے ملتے ہیں کہ 1647 ء شاہجہاں نے "آگرہ کے کووٹ (Covett) کی لمبائی میں کم از کم 2 $\frac{1}{2}$ فیصدی کی تخفیف کی جس کے نتیجہ میں یہ "لاہوری[1] کووٹ" کے مساوی ہوگیا اور یہ کہ اس کی لمبائی اب "ایک گز کے ٹھیک $\frac{8}{9}$ کے برابر یا 32 انچ ہوگئی"[2] مورلینڈ اس تبدیلی کا لاہوری کے عہد حکومت کے دسویں برس کے تحت 'زراع بادشاہی' کے حوالہ سے تعلق قائم کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ شاہجہاں نے ایک جدید اکائی جو گز الہٰی سے ایک انگل چھوٹی تھی رائج کر کے 1647 ء میں اسے آگرہ کی بازاروں میں نافذ کیا تھا۔ لہٰذا وہ اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ گز الہٰی "آگرہ" کے متروک الاستعمال "کووٹ" کے بالکل یکساں ہونے کے باعث 8 ر 32 انچ لمبا تھا[3]۔ بہرحال پہلے ذکر آچکا ہے کہ 40 انگل کا 'زراع'، کوئی شاہجہاں کی جدت نہ تھی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ جس وقت تک اس تبدیلی کا آگرہ میں نافذ کیا جانا بتایا جاتا ہے، اس وقت تک بظاہر 'زراع شاہی'، 42 انگل کا کر دیا گیا تھا[4]۔ یہ صحیح ہے کہ اس نئے پیمانہ کا ذکر صرف راستوں کے فاصلہ کے سلسلہ میں آتا ہے۔ لیکن چونکہ اس کا نام بھی وہی تھا جو 40 انگل کی سابقہ اکائی کا، لہٰذا بہت ممکن ہے کہ یہ سابقہ اکائی کے حلقۂ استعمال میں بھی رائج رہا ہو۔ اگر ایسا تھا تو اس کا استعمال آگرہ میں 1647 ء تک شروع ہوچکا رہا ہوگا اور اس برس جو تبدیلی عمل میں آئی اس کی بہترین تعبیر اس طور پر کی جا سکتی ہے کہ (انتظامی اکائی میں نہیں) بازاری اکائی میں 2 $\frac{1}{2}$ فیصدی یا 42 میں ایک انگل کی تخفیف عمل میں آئی یعنی اس کی اب وہی لمبائی ہوگئی جو گز الہٰی کی تھی۔ پھر ایسی صورت میں حقیقت حال بظاہر مورلینڈ کی قایم کردہ

---

[1] Factories, 1646-50, p. 122

[2] ایضاً 190۔

[3] W. H. Moreland, "The Moghul Unit of Measurement, JRAS, N. S. 1927 pp. 120-121

[4] لاہوری ( ) 534 / 709 (تیسویں دیسویں برسوں کے تحت)

تجویز کے بالکل برعکس رہی ہوگی اور تجارتی گماشتوں کے بیانات کی بنیاد پر گزِ الٰہی کی قایم کردہ لمبائی 8 ر 32 انچ نہیں بلکہ صرف 32 انچ آتی ہے[1]۔

ایلیٹ نے گزِ الٰہی کا طول معین کرنے کے لیے ایک دوسری صورت تجویز کی تھی۔ اس نے دہلی کے قریب سرکاری شاہراہ کے ہر کروہ پر مغلوں کے نصب کردہ پرانے کھمبوں یا میناروں کے درمیانی فاصلے اوسطاً 818 ر 32 انچ کے گز کے مطابق ہیں[2] لیکن یہ تصور کرنے میں کہ ان میناروں کا کروہ گزِ الٰہی سے ناپا گیا ہے، اس نے غالباً عجلت سے کام لیا۔ آئینِ اکبری کی بیشک یہ اطلاع ہے کہ اکبر کے زمانہ کا کروہ 5000 گز کا تھا[3] لیکن یہ یا تو ایک سہو ہے یا پھر اکبر نے آئینِ اکبری کی تدوین ہو جانے پر کروہ، کی پیمایش کے لیے ایک نیا گز رائج کیا کیونکہ جہانگیر اپنے

---

[1] وین ٹوسٹ کا تقریباً 1638ء میں بیان ہے کہ گجرات میں لوگ دو مختلف اقسام کے 'ایل' استعمال کرتے ہیں۔ ان میں کے بڑے 19 پورے 23 $\frac{1}{2}$ ولندیزی 'ایل' میں ایک انگوٹھے کی چوڑائی کا فرق ہوتا ہے۔ (tr. Moreland, JIH, vi, 78) چونکہ ولندیزی 'ایل' 77 ر 26 انچ کے ہوتے ہیں، لہٰذا بڑے 'ایل' 11 ر 33 انچ کے ہوئے۔ مار لینڈ کے خیال کے مطابق یہ اور گزِ الٰہی ایک ہی ہیں۔ (ایضاً صـ73 نوٹ) ایسا خیال کیا جاسکتا ہے کہ یہ اضافہ کردہ 'ذراع بادشاہی' ہے لیکن زیادہ گمان ہے کہ اعداد کے لکھنے میں غلطی ہوئی ہے اور اس سے واقعتہً گجرات کے بڑے گز (جو 5 ر 33 انچ کا تھا اور اسے ایک مقام پر 34 انچ کا بھی بتایا گیا ہے) کی مراد ہے۔ آخرالذکر اکائی کے لیے ملاحظہ ہو۔ Ish. Recd. 1, 84, 841 ، 214 ii (میں احمد آباد میں 34 انچ کے 'کووڈ' کا حوالہ ملتا ہے) Tryer. ii, 127 اور Toster Supp. cal. 47 iii,ii

[2] H.M. Elliot, Memoirs, & C. ii, 194 قدرتی طور پر کھمبوں کے درمیان کا سیدھا نہیں بلکہ سڑک کے 'فاصلہ' کا موازنہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ ایلیٹ نے سڑک کے فاصلہ ہی سے حساب لگایا ہے۔ اس کے بیان کیے ہوئے ضلع متھرا میں فاصلے چھوٹے گز کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جس کا اوسط 432 ر 32 انچ آتا ہے۔ لیکن اس کے بیان کردہ منجملہ 12 کے 8 فاصلے یکساں طور پہ محض 37 ر 32 انچ کی لمبائی ظاہر کرتے ہیں۔

'کروہ' سنسکرت لفظ 'کروش' کا فارسی مرادف ہیں اور ہندی لفظ 'کوس' اسی سے ماخوذ ہے۔

[3] آئینِ اکبری (1) 597

عہد کے پندرھویں برس کے تحت بیان کرتا ہے کہ اس کے عہد میں 'کروہ' اس کے باپ مقرر کردہ ضابطوں کے مطابق ناپا جاتا تھا جس کی رو سے اس میں 5.000 درع ہوتے جس کا سوا 24 انگل کے 'دو' درع' شرعی کے برابر تھا[1] اس کے یہ مطلب ہوئے کہ 'درع' جو کروہ ناپنے میں استعمال ہوا کرتا۔ تقریباً 38 انگل کا تھا۔ معتمد خاں بھی 1605ء میں اکبر کی سلطنت کا فاصلہ بتاتے ہوئے واضح کرتا ہے کہ 'کروہ' کے ناپنے کا ہر گز 38 انگل کا تھا[2] 1631ء میں منڈی بہت احتیاط کے ساتھ "قدیم راستوں" کو جسے "بادشاہ اور بڑے لوگ استعمال کرتے تھے" 5000 کوارڈس (Coards) کا جن میں سے ہر ایک $\frac{4}{5}$ گز یا 8 ر 28 انچ کا تھا لکھتا ہے[3] منڈی نے بدیہی طور پر گز کا ایک سہل لہٰذا تخمینی مساوات بتایا ہے۔ لیکن اس کے بیان سے یہ بات بلا کسی شک و شبہ کے واضح ہوتی ہے کہ اس کے زمانہ میں بھی کروہ کو ناپنے کے لیے 38 انگل کا گز یا بہر حال ایک ایسا گز جو گز الٰہی سے بہت چھوٹا تھا استعمال کیا جاتا تھا۔ لاہوری کے اس بیان سے کہ اس نے فاصلوں کو بمقدار 'کروہ' جو 5000 زراع بادشاہی کا اور ہر زراع 42 انگل کا ہے دکھایا ہے' اس بات کی بار اوّل نشاندہی ہوتی ہے کہ عہد شاہجہانی کے انیسویں اور بیسویں برس میں ایک نسبتاً لمبی اکائی رائج کی گئی ہے[4] یہ بڑھی ہوئی اکائی بظاہر اورنگزیب کے پورے عہد حکومت کے دوران استعمال ہوتی رہی کیونکہ 'مرۃ العالم' جو اس کے عہد کے دسویں سال کے بعد اور معلومات الآفاق جو اس کے مرنے کے فوراً بعد لکھی گئی ان دونوں تصانیف میں کروہ پادشاہی' کی پیمائش کے مصرف میں آنے والے زراع کو اسی بڑھی ہوئی اکائی کے مساوی بیان کیا گیا ہے[5] چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پوری سترھویں صدی کے دوران 'کروہ'

---

[1] تزک جہانگیری 298 حسب تحریر Beveridge (Tr. 11, 141 n.) مطبوعہ متن کی تردید جس میں کروہ کو ایک 'درع' کو درع درع' شرعی کے برابر بتایا گیا ہے ان مخطوطات سے ہوتی ہے جس میں کروہ کے ایک 'درع' کے بجائے $1\frac{1}{4}$ درع درج ہے۔

[2] اقبال نامہ (2) Or. 1834, f. 281 اس کا یہ قول ہے کہ ایک کروہ میں 200 جریب اور جریب' 60 گز کی اس طور پر ایک کروہ 000 ر 2 گز کا ہوا بالکل غلط ہے۔

[3] Mundy 66 67

[4] لاہوری (2) 534 اور 709

[5] مرآۃ العالم' علیگڑھ مخطوطہ ورق 214 الف۔ معلومات الآفاق (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ناپنے کے لیے صرف دو ذرع استعمال کیے جاتے تھے جو صدی کی ابتدائی دہائیوں میں 30 انگل کا اور بقیہ مدّت کے دوران 42 انگل کا تھا۔ اگر اس مصرف میں 'گزِ الٰہی' استعمال ہوا بھی تو صرف عہدِ اکبری کے تینتیسویں برس اور اس کے اختتام کے درمیان کی مختصر مدّت۔ لہٰذا اس کا بہت ہی کم امکان ہے کہ اس وقت کوس کے جو کھمبے موجود تھے ان کے درمیانی فاصلے گزِ الٰہی کے کردہ کے مطابق رہے ہوں۔ برخلاف اس کے بہت ممکن ہے کہ یہ فاصلے 'ذراع' جو اس مدّت کا آخری پیمانہ تھا اور اس کے بیشتر حصّہ میں استعمال ہوتا رہا یعنی 42 انگل کے ذراع بادشاہی کے مطابق ہوں۔ ایسی صورت میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایلیٹ کی تجویز کی ہوئی 818 ر 32 انچ کی لمبائی حقیقتاً آخر الذکر کی ہے اور پھر ایسی صورت میں 'گزِ الٰہی' کی تناسب اخذ کردہ لمبائی کو تقریباً 037 ر 32 انچ ہونا چاہیے۔

یاد ہوگا کہ ہم پہلے اس نتیجہ پر پہونچ چکے تھے کہ طامس کے گز سکندری کی پیمایش کی بنیاد پر گزِ الٰہی کا طول 92 ر 31 انچ سے کسرے زاید ہے۔ جو شہادتیں اس فصل میں جمع کی گئی ہیں، ان کی بنیاد پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس گز کی لمبائی 32 اور 25 ر 32 انچ کے درمیان تھی۔ اس سے زیادہ صحیح تعیین کی کوشش مناسب نہ ہوگی کیونکہ ایسا ایک آخذ کو دوسرے پر من مانی طور سے ترجیح دے کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ بیگھہ یا 60 گز کا مربع جو ایسے گزِ الٰہی پر معیّن کیا جائے جس کی لمبائی مذکورہ حدود کے اندر ہو ایک ایکڑ کے 5877 ر0 سے چھوٹا اور 5969 ر0 سے بڑا نہیں ہو سکتا۔ یہ دیکھا جائے گا کہ ایسی صورت میں بھی ان حدود کا درمیانی فرق قابلِ لحاظ نہیں رہتا اور حساب کتاب کی سہولتوں کے خاطر اگر گزِ الٰہی کے بیگھہ کو 95' ر0 ایکڑ کا اس شرط کے ساتھ تصوّر کر لیا جائے کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) Mansball - Qr. 1741 f. 88a 21-420' کے بیان کے مطابق دو واضح راستے تھے جن میں سے ہر ایک 8,000 'کوٹس' کا تھا۔ غالباً 5,000 کے بجائے 8,000 سہواً لکھ گیا ہے۔ اس کے بیان کیے ہوئے ترتیب وار راستوں کی لمبائیوں سے دونوں 'کوٹس' کی لمبائی 7 ر31 اور 7 ر 29 انچ نکلتی ہے۔ منڈی کی لمبائی کی طرح ممکن ہے اس کی لمبائی بھی صحیح نہ ہو۔ لیکن وہ یہاں غالباً گزوں کی جدید اور منسوخ شدہ لمبائیوں کو بیان کر رہا ہے جو کردہ کو ناپنے میں استعمال ہوتی تھیں۔ اسی طرح Mamooi, 11, p. 442 (اور مترجم کا نوٹ بھی) جو 10 یورپی بیگوں کو ہندوستان کے 12 کے برابر بتاتا ہے گز کی لمبائی 7 ر 31 انچ بیان کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اس کے ذہن میں ناسلز کا نیا پیمانہ رہا ہوگا۔

یہ غالباً اس سے ذرا بڑا ہوگا اور بہت ممکن ہے ۱۵۷۰ ایکڑ کا یعنی ٹھیک ایکڑ کا $\frac{3}{5}$ ہو تو یہ زیادہ غلط نہ ہوگا۔

فصل ۰ بیگھہ دفتری

گز الٰہی کے متعلق اکبر کی بلاشک یہ خواہش تھی کہ اس کی حیثیت تقریباً ہر قسم کی پیمائش کے لیے حکومت کی واحد معیاری اکائی کی رہے[1] یہ بات تحریروں میں وضاحت کے ساتھ ملتی ہے کہ اس گز نے زمین، عمارتوں اور کپڑوں کی تمام سابقہ پیمائش کی سرکاری اکائیوں کو بے دخل کر دیا تھا[2] اور اس زمانہ کی تحریریں، سابقہ مدد معاش کی جملہ معافیوں کے رقبوں کو اس نئی اکائی میں تبدیل کیے جانے کی تصدیق کرتی ہیں[3] لہٰذا یہ بھی امر یقینی تصور کرنا چاہیے کہ آئین اکبری کے تمام دستور (یعنی مالگذاری زمین کی قطعی شرحیں) اور آراضی (رقبہ) کے شماریات دونوں ہی اسی گز کے بیگھوں میں دکھائے گئے ہیں۔

پیمائش زمین کی سرکاری اکائی میں اس کے بعد دوسری تبدیلی بظاہر دور شاہجہانی میں عمل میں آئی جس کی اطلاع کا تقریباً تمامتر ذریعہ صادق خاں کی مرتبہ اس دور کی ہمعصر تاریخ سے ماخوذ ایک واحد عبارت ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ حالانکہ مدد معاش کی معافیوں میں رقبوں کی صراحت بمقدار بیگھہ الٰہی چلی آ رہی تھی، لیکن عام طور پر اب زمینوں کے تحریری اندراجات کے لیے پیمائش کی سرکاری معیاری اکائی در عہد شاہجہانی ہوگئی۔ اس نئی اکائی پر مبنی بیگھہ، بیگھہ دفتری یا کتابی بیگھہ کے نام سے موسوم کیا گیا جو بیگھہ الٰہی کے ٹھیک یا تقریباً دو تہائی کے برابر تھا۔ علاوہ اس کے یہ نواح دہلی اور آگرہ میں کسان کے زیر استعمال چھوٹے بیگھہ کا تین گنا ہوتا تھا۔ صادق خاں کا واضح بیان ہے کہ "صوبوں کے علاقوں اور مشمولات شاہجہان آباد کی زمین کی کاشتکاری (کذا)

---

[1] اکبرنامہ (3)۔

[2] آئین اکبری (1) جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے اس میں ایک استثنائی صورت راستوں کی پیمائش کی ممکن ہو سکتی ہے حالانکہ آئین اکبری (1) 597 میں صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ اس کام میں بھی گز الٰہی استعمال ہوتا تھا۔

[3] ان دستاویزوں کے حوالوں کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ ہذا کی فصل ایک کا فٹ نوٹ۔ ۵ مدد معاش کی معافیوں کے رقبوں میں گز الٰہی کے استعمال کے لیے ملاحظہ ہو باب 8

اور حساب کتاب میں کلیتہً بیگھہ دفتری استعمال کیا جاتا ہے۔" صوبجات دکن میں بھی شروع شروع میں تو مقامی اکائی " آوت " کا اندراج ضرور ملتا ہے لیکن " بالآخر" اسے بھی بیگھہ قیاسًا بیگھہ دفتری ہی میں تبدیل کر دیا جاتا تھا۔[1] بیگھہ دفتری اور بیگھہ الٰہی کی اضافی پیمایشوں سے[2] ایسا معلوم ہوتا ہے 'درعہ شاہجہانی' اور گز الٰہی کے طول خطی میں 40 اور 485 ر 73 کی نسبت تھی یا بالفاظ دیگر اول الذکر 5 ر 33 انگل کا تھا۔

صادق خاں کے بیانات اچھے خاصے واضح اور قطعی ہیں۔ علاوہ اس کے وہ عہد شاہجہانی کا ایک اعلیٰ عہدہ دار تھا اور یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ایک عام واقفیت کی بات اس کے علم میں نہ رہی ہوگی۔ یہ بے شک باعث تعجب ہے کہ کسی اور ماخذ سے اس کے بیانات کی صریحی تائید ہم نہیں پہونچتی' لیکن بہرحال ایسا بھی نہیں کہ یہ سرے سے بغیر تائیدی سند ہی کے ہوں۔ پلسارٹ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ نواح آگرہ کے نیل کے کاشتکاران ایک ایسا بیگھہ استعمال کرتے تھے جو بیگھہ دفتری کے مساوی تھا' لہٰذا بہت ممکن ہے کہ یہ اس کی ابتدائی شکل رہی ہو۔[3] 1690ء میں جو زمینیں بنگال میں ماورک

---

[1] Or. 1671, 1.91 a 'Or. 174 f. 186 b خافی خاں اپنی تصنیف کے ابتدائی نسخوں میں پوری عبارت کو لفظ بہ لفظ نقل کرتا ہے۔ یہ ببلیوتھیکا انڈیکا ایڈیشن (۱) 734 - 5 کے ایک فٹ نوٹ میں چھپی ہوئی ہے۔ موازنہ بہ نیز Add. 6578, f. 201

[2] کہا جاتا ہے کہ بیگھہ دفتری 3600 مربع درعہ شاہجہانی کے اور بیگھہ الٰہی 3400 سے "کسرے زائد" کے برابر تھا۔ اس قدر رقم مفروضہ کی کہ بیگھہ الٰہی میں ٹھیک 3600 مربع گز الٰہی ہوتے تھے تائید زمرۂ بٹالہ کے ایک دستاویز (I. O. 44 38 نمبر 59) میں مندرج ایک چک نامہ یا چوحدی کی ایک صراحت کرنے والی تحریر سے ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ چک نامہ خود عہد عالمگیری کے انچاسویں برس میں مرتب کیا گیا تھا' لیکن اس کا تعلق ایک ایسی معافی سے ہے جو ابتدائے 27 سنہ جلوس شاہجہانی میں عطا کی گئی تھی۔ اس میں بصراحت 40 گز کی ایک جریب سے پیمایش کا کیا جانا بتایا جاتا ہے۔

[3] Pelsaert p. 10 میں نیل کے " ایک بیگھہ یا 60 ولندیزی 'ایلس' میں 14 یا 15 پونڈ ال بی بیج کے حساب سے " تخم ریزی کرنے کا ذکر آتا ہے۔ چنانچہ ولندیزی 'ایل' اس گز کے بالکل برابر رہا ہوگا جس سے یہ بیگھہ ناپا جاتا تھا۔ پھر ایک دوسرے مقام پر بقول (P.29) Pelsaert 'ایل' گز الٰہی کے $\frac{100}{120}$ برابر تھا۔ پس ان دونوں میں 60 اور 72 کا تناسب ہوا جو درعہ شاہجہانی اور گز الٰہی کے تناسب کے تقریبًا برابر ہے۔

مقام پر انگریزوں نے اپنی تجارتی کوٹھیوں کے لیے حاصل کیں وہ سرکاری نگرانی میں ایک ایسے بیگھہ سے ناپی گئی تھی جو 'بیگھہ دفتری' کے تقریباً بالکل برابر تھا[1] اس کے بعد خافی خاں کے بیان کے مطابق یعنی اٹھارھویں صدی کے اوایل میں بیگھہ کی پیمایش 'درع شاہجہانی' سے کی جاتی تھی جس کے متعلق اس کا مفہوم ہے کہ وہ ٹوڈرمل کے زمانہ میں زیر استعمال اکائی سے مختلف تھا[2] اورنگزیب کی سلطنت کے مختلف صوبوں کے آراضیات پیمودہ کے شماریات میں استعمال شدہ بیگھہ غیر واضح ہے[3] لیکن اگر ان اعداد کو بمقدار بیگھہ الٰہی تصور کیا جائے تو یہ مہمل ہوں گی اور بمقدار 'بیگھہ دفتری' بالکل قابلِ قبول۔

ان معقول تائیدی سندوں کو اگر فیصلہ کن تصور نہ کیا جائے تو پھر انہیں مسترد کرنے والے کون سے دلائل ہیں، مثلاً جب حساب کتاب اور انتظامی ضوابط ناموں کی طرف جہاں اس موضوع پر کچھ قطعی اطلاعات ملنے کی توقع کی جاتی تھی رجوع کیا جاتا ہے تو ان میں زمین کی پیمایش میں استعمال ہونے والے درع کے نام اور اس کے طول کے بارے میں ہم انتہائی الجھن سے دوچار ہوتے ہیں۔ عہد شاہجہانی کے ایک ضوابط نامہ میں 'درع الٰہی' کو وہ اکائی بتایا گیا ہے جس سے بیگھہ کی پیمایش ہونی چاہیے[4] اورنگزیب کی تخت نشینی کے قریبی زمانہ میں لکھے گئے ایک دوسرے ضوابط نامہ میں گز یا 'درع' کا سرے

---

[1] Malda Diary & Consultations, JASB, NS, XIV, 1918, pp. 81-2-128-3 بیگھہ کے ناپ کو اس طور پر بیان کیا گیا ہے (ص 82) ہر بیگھہ چار ضلعوں کے جن میں سے ہر ایک 80 بڑے کویڈوں یعنی انگریزی گز کے 9 نیلوں (Nailes) کے برابر ہوتا ہے۔" لہٰذا ایک بیگھہ 2025 ربع گز یا 418ر0 ایکڑ کا ہوا۔ چونکہ 'بیگھہ دفتری'، 'بیگھہ الٰہی کا $\frac{2}{3}$ ہوتا تھا، لہٰذا یہ غالباً 400ر0 ایکڑ کے برابر ہوا

[2] خافی خاں (ر) 156 Add., 6578, F. 69b وہ ٹوڈرمل کو بیگھہ کا موجد قرار دیتا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل بے بنیاد بات ہے۔ یاد رہے کہ بب۔ انڈ ایڈیشن میں طباعت یا خواندگی کی دو سنگین غلطیاں ملتی ہیں پہلی بیگھہ کے بجائے 'ٹنک' اور دوسری پیمایش کے بجائے 'حاصل' لکھے جانے کی ہے۔

[3] اڑیسہ کے تحت دو دیگر بہت چھوٹے پیمانوں میں بھی رقبہ کے مساوی اعداد درج کیے گئے ہیں: Fraser 86, f.60 b. انتخاب دستورالعمل بادشاہی، اڈنبرا 224 ورق 11 الف؛

[4] دستورالعمل عالمگیری، ورق 171 الف۔ ب۔

سے تذکرہ ہی نہیں آیا ہے، بلکہ اس کے بجائے 24 انگل کے ہاتھ (دست) اور ایسے 100 ہاتھوں کے مرنع کا ذکر ہے۔[1] عہدِ عالمگیری کے وسط اور آخر کے زمانہ کے دو دوسرے ضوابط ناموں میں سے ایک میں (بغیر کسی نام کے) ایک درع کا طول 48[2] انگل درج ہے اور دوسرے میں بتایا گیا ہے کہ درعِ الٰہی "مزروعہ رقبوں کو ناپنے میں" کام آتا تھا اور یہ کہ اس کی لمبائی 36 انگل تھی۔[3]

دوسری طرف اٹھارھویں صدی کے اواخر تک بظاہر گزِ الٰہی کی حیثیت شمالی ہندوستان میں آراضی کے واحد سرکاری پیمانہ کے طور پر مستحکم ہو چکی تھی۔[4] حکومت برطانیہ کے سروے کے افسران بھی جنھوں نے اس کے بعد کی صدی کے اوایل مالگذاری کا بندوبست کیا تھا اسی نتیجہ پر پہونچے کہ تنہا گزِ الٰہی، ایک عام اور غیر مختص المقام زمین کی پیمایشی اکائی کی حیثیت سے اس وقت شمالی مغربی صوبوں کے اضلاع میں رائج تھا۔

مذکورہ ضوابط ناموں کے بیانات میں تناقص، خواہ گزِ الٰہی کا تنہا استعمال میں باقی رہنا ان میں سے کسی بھی امر کو صادق خاں کے بیانات کے قابل قبول ہونے میں مانع نہ ہونا چاہیے۔ اس کے بیگھۂ دفتری کا خاص مقصد جیسا کہ اس کے نام سے بھی بخوبی ظاہر ہوتا ہے کاغذی اندراجات میں یکسانیت پیدا کرنا تھا اور ایسا قیاس کرنا قرین عقل ہوگا کہ پیمایشی کام میں تو عموماً مقامی اکائیاں

---

[1] دستور العمل عالمگیری ورق 2 الف۔ب۔

[2] خلاصۃ السیاق ورق 75 الف۔ Or. 2026 f. 24 b.

[3] فرہنگ کاردانی، اوراق 12 الف۔13 الف، Edinburgh 83 ورق 7 الف میں درعِ شاہجہانی کا بھی ذکر آتا ہے جو بقول اس کے کپڑا، پتھر، لکڑی اور عمارتوں کی پیمایش کے کام آتا تھا۔ اس کی لمبائی 41 انگل بیان کی گئی ہے جو گزِ الٰہی کے بالکل برابر ہے۔ Marshall 420 کا یہ بیان کہ "شاہجہان کا گز، 'ململ گز' کے نام سے موسوم جس کی لمبائی $41\frac{1}{4}$ انگریزی انچ ہے" ظاہر کرتا ہے کہ شاہجہان نے کپڑے کے لیے ایک بڑا گز رائج کیا تھا۔

[4] صوبجات پنجاب، شاہجہان آباد، اودھ اور الہ آباد میں مروجہ مقامی اور سرکاری بیگھوں کے متعلق ایک مختصر یادداشت فارسی میں جو 1788ء کے قبل کسی وقت بنگال کے انگریز انتظامی افسروں کی واقفیت کے لیے مرتب کی گئی تھی ملاحظہ ہو Add. 6603, f. 51 b. موازنہ ہو Add. 6586, f. 164 a, b) جس میں درعِ الٰہی کو 40 انگل کا بیان کیا گیا ہے۔

ہی استعمال ہوتی رہیں، لیکن کاغذات میں یہ اکائیاں کسی نہ کسی منزل پر بیگھۂ دفتری میں تبدیل کردی جاتی تھیں سلطنت مغلیہ میں انتشار واقع ہوجانے پر اس بیگھہ کی علت غائی مفقود ہوکر، مقامی نظم ونسق کے سرکاری اندراجات میں بھی اس کا استعمال دھیرے دھیرے متروک ہوگیا ہوگا دوسری طرف بیگھۂ الٰہی کے حقیقتاً مدد معاش کی زمینوں کے حدود متعین کرنے کے طبقوں کو اپنی معافیوں کے اصل حدود کی برقراری کے خاطر اس بیگھہ کے بقا سے گہری دلچسپی تھی۔ پس صورت حال یہ ہوئی ہے کہ اسی بیگھۂ الٰہی نے بس تھوڑے سے فرق کے ساتھ اتر پردیش کے موجودہ پکے بیگھہ کی شکل اختیار کرلی۔

ضمیمہ - ب

اوزان

فصل 1 ــ معیاری من

ہماری اوزان کا روایتی ہندوستانی پیمانہ 40 سیر کا ایک من[1] تقریباً تنہا طور پر پورب وا تر پچھم اور دکن کے بعض علاقوں کو چھوڑ کر بقیہ پوری مملکت مغلیہ میں استعمال کیا جاتا تھا۔ ان استثنائی علاقوں میں یہ یا تو وزن کے دیگر پیمانوں کے ساتھ مخلوط ہو گیا تھا یا ان کے اور کم از کم دو صورتوں میں رقیق اشیاء کے پیمانوں کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

بقول ابو الفضل، ہندوستان میں پہلے سیر 18 یا 22 داموں کے وزن کا ہوا کرتا تھا بہرحال، عہد اکبری کے شروع سے مروّجہ معیاری سیر کا وزن 28 دام تھا۔ لیکن بادشاہ نے آئین اکبری کی تحریر کے قبل کسی وقت اسے بڑھا کر 30 دام کر دیا[2] دام کا وزن تولے کے پیمانے کی مقدار میں، اسی تصنیف میں

---

[1] انڈو، انگریزی ترکیب لفظی کا ایک اعجوبہ جو سترھویں صدی کے دوران بظاہر ہندوستانی نام (من) اور پرتگالی بگڑے ہوئے لفظ 'ماؤ' (Mao) (Hobson-Tobson, ed. Crooke, 563-4) کے اختلاط سے وجود میں آیا، اب غالباً ایک مستقل اصطلاح کی حیثیت حاصل کر چکا ہے کتاب ہذا میں اس کا اطلاق محض اس موجودہ معیاری اکائی پر کیا گیا ہے جو سرکاری طور پر اسی نام سے موسوم ہے۔ اس امتیاز سے اس امر پر بھی زور دینا مقصود ہے کہ ہندوستان کے سرکاری من (= $82\frac{2}{7}$ ال۔بی۔ اوور ڈوپوائز) کا زیر مطالعہ عہد کی مختلف اکائیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

[2] آئین اکبری (ج 2) ص 60، ایضاً (ج 21 ص 284 بھی۔

کسی دوسری جگہ بیان کیا گیا ہے[1] اور تولہ کا وزن بھی خاصہ صحیح طور پر سکوں کی اور دیگر شہادتوں کی بنیاد پر معین کیا جا چکا ہے[2] جس کے مطابق دام کا وزن 7 ر 322 گرین ہونا چاہیے۔ چنانچہ 28 دام کے سیر پر مبنی من تقریباً 63 ر 51، 11 بی اور ڈو پوائز کے اور 30 دام کے سیر کا من موسوم بہ 'اکبر شاہی'، یا 'اکبری' تقریباً 32 ر 55 کے برابر ہوا۔ یورپی ماخذ میں بھی آخر الذکر من کا وزن تقریباً اسی قدر ملتا ہے[3]

---

[1] ایضاً (1) ص 26 ایک دام = 1 تولہ 8 ماشہ 7 سرخ یا $1\frac{71}{96}$ تولہ

[2] Prof. S.H. Hodinwale, 'Historical Studies in Mughal Numismatics', PP 224 - 34 وہ اس موضوع پر تقریباً تمام متعلقہ شہادتوں کے جائزہ کے بعد تولہ کا وزن تقریباً 5 ر 185 گرین معین کرتے ہیں لیکن انہوں نے یورپی ماخذ میں مندرج منوں کے اوزان کی بنیاد پر تولہ کا وزن معین کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ بات یہاں صرف اس غرض سے درج کی جا رہی ہے کہ یہ شک نہ رہے کہ من کے اس دعوے کے متعلق جو تائیدی سندیں آگے چل کر پیش کی گئی ہیں، حقیقت میں وہ انہیں شہادتوں کا جن کی بنا پر ابتداً حساب لگایا گیا تھا ایک جزو ہیں۔ پرنسپ نے من اکبری کا وزن معین کرنے میں سونا۔ اور صراف کے اوزان کو خلط ملط کر دیا ہے لہٰذا اس کا قایم کیا ہوا وزن ناقابل یقین طور پر کم ہے ('Useful Tables, ed. Thomas III) ٹامس اس مغالطہ سے تو محفوظ ہے، لیکن اس نے مغلوں کے تولہ (0 ر 186 گرین) کے لیے پرنسپ کے قائم کیے ہوئے وزن کو استعمال کیا ہے جو خود بقول اس کے گلیڈون کی اصل عبارت کی غلط خواندگی پر مبنی ہے (ایضاً، 19 20 اور نوٹ 425 421 ,('Chronicles of the Pathan Kings' 30 429) لیکن ہوڈیوالا اور پرنسپ کے تولہ کے اوزان کا فرق اسی قدر کم ہے کہ مورلینڈ کے مختلف منوں کے پرنسپ کے وزن کی بنیاد پر قائم کیے ہوئے اوزان میں زیادہ غلطیوں کا امکان نہیں رہتا۔ ('India Sc. of Akbar', 53, Akbar to Aurangzeb', 334)

[3] 1614ء میں الطٹ نے لکھا کہ 30 پیسوں کے اکبری سیر کا 'مانڈ' 56 ال۔بی (اور ڈو پوائیز) کا تھا۔ Peliast 29 (Foster, Supplementary Calender, 48) کے بیان کے مطابق ایک اکبری سیر کا وزن 30 پیسے یا $1\frac{1}{4}$ ال۔بی ہے، یعنی ایک من اکبری = 50 ولندیزی ال۔بی یا 5 ر 54 اور ڈو پوائیز Hawkins (Early Travels 105) میں غالباً اسی من کے حوالے، ہر من کا وزن 55 پونڈ بیان کیا گیا ہے۔ موازنہ ہو Morland, India Sc. Akbar' pp 53 62 (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

جہانگیر نے اپنی تخت نشینی پر 36 داموں کے سیر کا ایک نیا من (من جہانگیری) رائج کیا۔ اس نے اسے اپنے عہد کے چودھویں برس یا اس کے تھوڑے ہی قبل ایک بار منسوخ کر کے بعد پھر اسی سال آخری بار بحال کر دیا[1] بمقدار اور ڈوڈ پوائیز اوزان کے یہ نیا من یقیناً تقریباً 38 ر 66 ال۔ بی کے برابر رہا ہوگا۔[2] اسی طور پر شاہجہاں نے ایک نیا اور زیادہ وزن کا من قائم کیا جس سے سیر کا وزن 40 داموں

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

'Akbar to Aurangzeb' 334 342 اس سے مختلف طور پر انگریزی تحریروں کے بعض حوالوں میں من کو 50 انگریزی ال۔ بی کا تصور کیا گیا ہے (L.H. Factories, 1630 33 328) ان میں سے پہلا اور تیسرا واضح طور پر نیل کے کاروبار کے متعلق ہے اور اس میں غالباً 9 فیصدی سوکھنے کی گنجائش کے لیے شامل کیا گیا ہے اور اس نسبت کا تخمینہ انہیں تحریروں میں ایک دوسرے مقام پر ملتا ہے۔ (Lett. Reed III, 60,87, Lett. Reed VI: 236)

[1] تزک جہانگیری، 96، 281۔ جہانگیر کے بیان کو بظاہر غلط سمجھا گیا ہے، مثلاً بقول مورلینڈ 1619ء میں اس نے جدروپ مادھو کی صلاح پر "بلا تاخیر" سیر کا وزن 36 دام کر دیا تھا۔ (Akbar to Aurangzeb', 335). جہانگیر چودھویں برس کے تحت کسی نئے وزن کے نافذ کرنے کا نہیں بلکہ اپنے سابقہ وزن ہی کو بحال کرنے کا واضح طور پر ذکر کرتا ہے۔ تخت نشین ہونے پر ایک نئے من کے اجراء کا ایک ضمنی مگر قطعی حوالہ چھٹے سال کے تحت ملتا ہے (تزک جہانگیری 96) 1614ء اور 1615ء کی انگریزی تحریروں میں ایسے ہی قطعی حوالے "شاہ سلیم کے 36 پیسے کے سیر والے من" کے متعلق بھی ملتے ہیں (Fostar, Supplementary Calendar, 43, 47, 48, Lett. Reed 111 P.iv)

[2] انفلٹ اس کا وزن 65 ال۔ بی اور ڈوڈ پوائیز بتاتا ہے Foster Supplementary Caleder 48 اور 11 Polmaeit میں 60 ولندیزی ال۔ بی یا 4 ر 65 ال۔ بی اور ڈوڈ پوائیز درج ہے۔ 335، 342 Moreland, ('Akbar to Aurangzeb' اور اس میں مندرج ماخذ بھی ملاحظہ ہوں۔ 237 Mundy "16 جہانگیری مانڈ کو وزن انگریزی تقریباً 1000 (ال۔ بی) کے مساوی قرار دیتا ہے جس کا یہ مفہوم ہوا کہ ایک من 62 ½ ال۔ بی اور ڈوڈ پوائیز کے برابر ہے۔ لیکن یہ اسی کے بتائے ہوئے (صفحہ 156) پیسہ یا دام کے وزن یعنی 22 پیسے = ایک ال۔ بی سے مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ اس وزن کے اعتبار سے من جہانگیری کو 36 ر 65 ال۔ بی ہونا چاہیے۔

کے برابر ہوگا[1] ہمارے مآخذ اس کے اجرا کی تاریخ بتانے سے قاصر ہیں، لیکن اس کا سب سے پہلا حوالہ
1634ء[2] اور 1635ء[3] ــــــــــــ کی ولندیزی اور انگریزی تجارتی تحریروں میں ملتا ہے۔
اس قیاس پر جسے ایک ہمعصر ضوابط نامہ کی قطعی سند سے تقویت پہونچتی ہے[4] کہ دام کے اوزان اس کی
من اکبری سے صحیح نسبت ظاہر کرتے ہیں، من شاہجہانی کو تقریباً 76 ر 73 اور ڈوپوائیز ال بی کے برابر
ہونا چاہیے۔[5]

---

[1] دستور العمل نویسندگی، ورق 179 ب، دستور العمل عالمگیری ورق 2 ب، Factories, 1634-36, P-136

[2] داغ رجسٹر، اکتوبر 122 1634ء جس کا Moreland, 'Akbar to Aurangzeb', 342 P-342 میں حوالہ آتا ہے۔

[3] Factories, 1634-36, PP 129, 133

[4] دستور العمل نویسندگی ورق 179 ب میں من شاہجہانی کی من اکبری میں تحویل اور اس کے برعکس عمل کا حسابی
اصول بیان کرتے ہوئے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اول الذکر آخر الذکر کے $1\frac{1}{3}$ کے برابر ہے۔ اواخر سترھویں صدی
کے ضوابط نامہ، ضوابط عالمگیری (دیکھیے 485 ورق 170 ب۔ Add. 6598, f-153a Or.
1641, f-50a) میں بھی اکبری من کا وزن بمقدار من شاہجہانی 30 سیر بیان کیا گیا ہے۔

[5] ایک ولندیزی تحریر (بظاہر وہی جس کا مذکورہ رجسٹر داغ میں حوالہ آیا ہے) میں اس من کو 67 ولندیزی
ال۔بی یعنی 03 73 ال۔بی اور ڈیوائیز کے مساوی بتایا گیا ہے (Moreland حوالہ سابقہ 335)
سے 1639 کے ایک Surat Consultation Factories, 1637-41, P-192 میں
74 ال۔بی لیکن اگلے سال $73\frac{1}{2}$ یا $73\frac{1}{3}$ ال۔بی کے مساوی (ایضاً 274) بتایا گیا ہے۔ Tavernier 32.
اور 25 Thevenst میں اگر اسی من کا ذکر ہے تو اگر ہم بال (Ball) کے بالمقابل مورلینڈ ہی کے
بیان کیے ہوئے اس وقت کے فرانسیسی 'لیورے' کے وزن کو صحیح تسلیم کر لیں، تب بھی اسے بڑھا کر بیان کیا گیا
ہے۔ (Moreland, opcit, 333) Ball's Appendix, Tavernier 1. 331-
Hodivalā Mughal Numismaties 230 - یہ دونوں سیاہ من کے وزن کو علی الترتیب 69 اور 70
لیورے بتاتے ہیں جو مورلینڈ کے حساب سے 21 ر 75 اور 30 ر 76 ال۔بی اور ڈیوائیز سے بہت زیادہ کم
نہ ہوگا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ٹیورنیئر کے بیان کردہ من اکبری کا وزن یعنی 53 لیورے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

یہ باور کرنے کے بظاہر معقول وجوہ پائے جاتے ہیں کہ اورنگزیب نے اپنا کوئی نیا من رائج نہ کیا جس کا مطلق وزن پہلے سے مختلف رہا ہو۔[1] مگر اس کے عہد حکومت کی پہلی ہی دہائی میں پرانے وزن کے داموں کو ختم کرکے ان کی جگہ ان سے ایک تہائی کم وزن کے داموں کے اجراء کی وجہ یقیناً ایک نئی دقت پیش آئی ہوگی۔[2] اگر وزن کو داموں کی سابقہ نسبتوں پر معین کرنے کا سلسلہ قائم رہتا تو صرف کے لیے اب پرانے ہی سکے دستیاب ہو سکتے تھے جن کا وزن امتداد زمانے سے گھس کر کم ہو جاتا تھا۔ بظاہر سیر کا وزن نئے داموں کے بمقدار از سر نو معین نہیں کیا گیا۔[3] لیکن آخر کار شاہجہانی سیر کی شرح پرانے داموں کے بمقدار بڑھا کر 42 کر دی گئی۔ غالباً یہ بھی امتداد زمانہ کے ساتھ متروک ہو کر نئی شرح پہلے 43 اور پھر بڑھ کر 44 دام ہو گئی اور وزن کی اکائیوں کو 'عالمگیری' کا نیا دام دیا گیا، حالانکہ بظاہر حقیقی وزن کو تبدیل کرنا مقصود نہ تھا۔[4]

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

(I.P.132. II, p.7) اگر مورلینڈ کی شرح پر ال۔بی اور ڈو پوائیز میں تحویل کیا جائے تو یہ اسی طرح اس کے صحیح وزن سے واضح طور پر زائد ہوگا۔

[1] ضوابط عالمگیری (حوالہ سابقہ) میں من عالمگیری کو وزن میں من شاہجہانی کے برابر بتایا گیا ہے۔ 1676ء میں فرائیر "آگرہ کے پکے من" کو سورت کے من کا "دوگنا" بتاتا ہے جبکہ سورت کا من "پیسہ" کے سیروں کا تھا۔ اس کے علم میں اس کے علاوہ آگرہ میں دوسرا "مانڈ صرف" "مانڈ اکبری" تھا (II, pp.126-7)

[2] موازنہ بہ S.H. Hodiwala, "The Weight of Aurangzeb's Dam's", JASB, N.S., XIII, 1917, ملاحظہ ہو نیز ضمیمہ 3۔

[3] اس موضوع پر واضح ترین ہمعصر بیان کے لیے ملاحظہ ہو۔ Marshall, 416

[4] اس عبارت میں جو دلیل پیش کی گئی ہے وہ ضوابط عالمگیری، حوالہ سابقہ میں مندرج بیشتر سرکاری اوزان کے جدولات پر مبنی ہے۔ اس میں ان کے اوزان بمقدار دام سابقہ (فلوس قدیم) کے ساتھ ساتھ بمقدار من شاہجہانی بھی درج کیے گئے ہیں۔ اول الذکر جدول میں 30 دام کا سیر اکبری، 36 کا جہانگیری، لیکن 42 کا شاہجہانی اور 43 کا عالمگیری بتایا گیا ہے، درانحالیکہ سطور بالا میں ہم نے دیکھا ہے کہ من اکبری کو 30 سیر شاہجہانی اور من جہانگیری کو 36 کے مساوی (مختلف مخطوطہ میں 31) اور من عالمگیری اور من شاہجہانی کو ایک ہی بتایا گیا ہے۔ 73-1668ء میں بنگال اور بہار میں اپنے مشاہدات کی بنیاد پر Marshall, 421 کا بیان ہے کہ "19 3/4 ماس (ماشہ) کا ایک شاہجہانی تانبے کا پیسہ ہوتا ہے اور ایسے 42 پیسے ایک بازاری سیر کے برابر ہوتے ہیں" (باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

فصل 2 من اور مختلف خطّوں میں مروّجہ دیگر اوزان

چونکہ اس موضوع پر موجودہ شہادتیں زیادہ تر ضمنی حوالوں تک محدود ہیں، لہٰذا ہم ان بازاروں اور مختلف قسم کی تجارتوں کے متعلق تفصیلی اطلاعات فراہم کرنے سے معذور ہیں جن میں مختلف اوقات میں معیاری اور مقامی اوزان استعمال ہوتے تھے۔ بہرحال، جو بھی شہادتیں ہمارے پاس ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری اوزان یکے بعد دیگرے وسیع علاقوں میں نافذ کیے جاتے رہے، مگر جب کوئی نیا وزن وجود میں آتا تو اسے فوراً ہی نہیں بلکہ دھیرے دھیرے مختلف بازاروں یا مخصوص کاروبار میں نافذ کیا جاتا تھا اور یہ کہ بہت سے خطّوں میں، بعض اوقات حکومت کے تسلیم کیے ہوتے یا تبدیل کیے ہوتے مقامی اوزان اور حجم کے پیمانے کبھی کبھی تنہا مگر عام طور پر سرکاری پیمانوں کے ساتھ ساتھ استعمال ہوا کرتے تھے۔ ان اطلاعات میں اس حقیقت کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ مختلف کاروباروں اور بازاروں کے روایتی تقاضوں کے تحت وزن کی اکائیوں اور پیمانوں میں بظاہر جو اختلاف پایا جاتا تھا وہ حقیقت میں کسی ایک فریق کے لیے تجارتی گنجائشوں یا کمیشن کی ضروریات کے تحت ہوتا تھا[1]

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

یہ وزن ہمارے ماخذ میں مندرج دام کے معیاری وزن سے قطعاً کم ہے (20 $\frac{7}{8}$ ماشے مندرج آئین اکبری اور غالباً اس سے کم قطعیت کے ساتھ 21 ماشے مندرج مرآۃ احمدی ۱ 267 385 ضوابط عالمگیری، ایتھے 415 ورق 170 ب (1641, f.49b, Add.6598, f.48L ۱) یہ فرض کرتے ہوئے کہ مارشل کے وزن میں پرانے داموں کے آخری اجراء کے بعد سے فرسودگی کا لحاظ رکھا گیا ہے، خود اسی کے بیان کیے ہوئے ایک سیر کے وزن میں 40 سے 42 داموں کا اضافہ سیر کے وزن کو تدریجی تخفیف سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری سمجھا گیا ہوگا۔ فرہنگ کاردانی Edinburgh 83 ورق ب میں سیر اکبری اور سیر جہانگیری کا بمقدار داموں کے وزن درج کرنے کے بعد 'سیر شاہجہانی' کا وزن 40 اور نیز 42 دام اور 'سیر اورنگ شاہی' کا وزن 44 اور 48 دام فی سیر دکھایا گیا ہے۔ 44 کے عدد کی تو پرانے داموں کے وزن میں مزید تخفیف سے توجیہہ کی جا سکتی ہے مگر 48 کے عدد کا کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا۔ مذکورہ ضوابط نامہ جو بنگال میں لکھا گیا تھا کے ورق 6 الف پر یہاں کی ٹکسالوں میں ڈھلے ہوئے داموں کو 18 ماشے کے وزن کا بتایا گیا ہے اور ممکن ہے 48 کے عدد سے یہی دام مراد رہا ہو مگر ایسی صورت میں 48 کے مقابلہ میں 47 زیادہ صحیح ہوتا۔

[1] احمد آباد میں نیل کی تجارت سے دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ انگریزی تجارتی گماشتوں کی (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ من اکبری نے مملکت کے وسطی علاقوں کی بازاروں میں تقریباً ایک واحد اور عمومی وزن کی اکائی کی حیثیت حاصل کرلی تھی۔ اس خیال کی کوئی سند نہیں ملتی بلکہ ایسا صرف اس لیے ہوتا جاتا ہے کہ ہمارے مآخذ میں کسی دوسرے وزن کا ذکر نہیں آتا، مثلاً مختلف اشیاء کی قیمتیں بیان کرتے ہوئے "ابوالفضل کو کسی ایک یا ان میں سے چند اشیاء کے سلسلے میں اگر کسی اور وزن کا وجود ہوتا تو اس کا ضرور ذکر ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح سترھویں صدی کے اوائل کی انگریزی تحریروں میں آگرہ اور اجمیر کی بازاروں کسی ایسے وزن کا تذکرہ نہیں ملتا جس کے متعلق یہ قیاس کیا جا سکے کہ اس کی ابتداء من اکبری کے پہلے کی تھی۔ "من جہانگیری" کے اجراء کے بعد "من اکبری" کی اجارہ داری تو ضرور ختم ہوگئی مگر پھر بھی یہ بالکل بے دخل نہ ہوا۔ اس کے بعد بھی کافی برسوں تک اس کے آگرہ کی بازاروں میں بطور ایک عموی زیر استعمال اکائی کے حوالے آتے رہے۔[1] آگرہ کے نیل کے کاروبار میں یہ دور زیر بحث کی پوری مدت کے دوران یا بہرحال، صدی کی آٹھویں دہائی تک تو ضرور قائم رہا۔[2] اسی طور پر اس کا استعمال ریشم اور دیگر پر تکلف اشیاء[3] خصوصاً پارہ، شنگرف[4] اور مشک[5] کے کاروبار میں بھی قائم رہا۔

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

دسمبر 1614ء کی رپورٹ ہے کہ "یہاں ہم سرکھیج کی اچھی نیل 11 روپیہ فی من کی شرح پر خریدتے ہیں اور نئی (یعنی کم خشک) نیل ایک من میں 42 سیر اور پرانی 41 سیر کے تول پر ملتی ہے۔ (L.H. Reed.11, 250) احمدآباد ہی سے اس کے تیس برس بعد 1647ء میں "شاہزادوں (اورنگ زیب) کے جاری کیے ہوئے (نیل کے) 40 سیر وزن خالص کی تول کے ضرر رساں طریقہ" کی شکایت کی گئی (Factories, 1646-50, p-143)

[1] (Lett. Reed 111, 87 Hawkins, Early Travels, 105 (اجمیر کا جب دربار شاہی وہاں تھا حوالہ دیتا ہے) اور ذیلی نوٹوں میں دیگر حوالے۔

[2] Lett. Recd., 111, 69; Pelsart 16-17, Factories, 1622-3, 284-5; 1630-33, 328; 1642-5. 1646-50, 202; Taremier 32; ii 7 Fryer, ii, 127

[3] حسب بیان Factories 127 اور Factories 1618-21, 194, 213 بھی۔

[4] Factories 1630 – 33, 213

[5] Factories 1618 – 21, 47

یہ بات واضح نہیں ہے کہ من جہانگیری کا استعمال واقعتہً کن کن کاروباروں میں تھا۔ آگرہ کی بازار میں اس کے ایک خصوصی واحد حوالہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تقریباً 1652ء تک قرمز کی تجارت میں استعمال ہوتا رہا اور اس کے بعد من شاہجہانی نے اس کی جگہ لے لی[1]

اس کاروبار کے علاوہ شاہجہانی من کو قانوناً خاص طور پر اجناس غلہ اور (بہ استثنائے نیل) دیگر زرعی پیداواروں کی تجارت میں نافذ کیا گیا تھا۔ 1639ء اور 1646ء میں اس کے آگرہ میں شکر اور لاکھ کے کاروبار میں استعمال کیے جانے کی اطلاعات ملتی ہیں[2] اور سترھویں صدی کے نصف آخر میں اسے بازار کے "تمام" من کی حیثیت حاصل ہو گئی[3]

اب مشرق میں، ہم دیکھتے ہیں کہ پٹنہ کا بازار حکومت کے معیاری وزنوں کے تغیرات سے اپنے مخصوص انحراف کے ساتھ ساتھ کافی حد تک متاثر ہوا کرتا تھا۔ 1620ء میں انگریزی گماشتے جو وہاں بھیجے گئے ان کی اطلاع کے مطابق وہاں پر ریشم کی تجارت میں 'اکبری من' نہیں بلکہ 34 ½ پیسوں[4] یا دام کے سیر کا من استعمال ہوتا تھا جسے انہوں نے خود ایک دوسری جگہ 33 ½ پیسہ یا دام[5] کا بیان کیا ہے لیکن بہرحال، اس سے ان کی بظاہر مراد جہانگیری من سے ہے[6] کم داموں کے وزن کے استعمال سے اس وقت کسی مخصوص کاروبار میں بیچنے والوں کے لیے گنجائش فراہم کرنا مقصود ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف منڈی کا جس نے 1632ء میں پٹنہ کا سفر کیا بیان ہے کہ وہاں بظاہر ہر کاروبار میں 37 داموں کے سیر کا من استعمال کیا جاتا تھا[7] جس سے خریدار کو فائدہ پہونچانا مقصود ہوگا[8] بالآخر پٹنہ میں 'جہانگیری من' کی جگہ

---

[1] Factories 1655-60, 18

[2] Factories 1637-41, 192 ; 1646-50, 62

[3] Tavernior 32 Thevevnot 25

[4] Factorios, 1618-21, 193-194

[5] ایضاً 205، 213

[6] چنانچہ وہ لوگ پٹنہ میں خریدے ہوئے مال کی روانگی کا حوالہ دیتے ہوئے، باربرداری کے محصول کی شرح کا حساب بمقدار جہانگیری من، کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مورلینڈ کو (Akbar to Aurangzeb, 335) ان کے بیانات کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ وہ ان میں سے ایک تجارتی کوٹھی کے گماشتے ہوگیس کا بیان نقل کرتا ہے کہ پٹنہ میں 'اکبری من' بھی رائج تھا۔

[7] Mundy, 156

[8] موازنہ ہو Moreland محولہ بالا۔

سرکاری من رائج ہو گیا کیونکہ بقول مارشل اس کے زمانہ (1668 - 72ء) میں وہاں 42 داموں کے سیر کا من جو 78 انگریزی۔ ال۔ بی کے مساوی تھا چلتا تھا" لیکن وہاں کے رواج کے مطابق ہر من میں 2 سیر کی گنجائش رکھی جاتی تھی۔[1]

بنگال میں اکبری من کے واقعی استعمال کی کوئی اطلاع نہیں ہے، البتہ جہانگیری من کے استعمال کے اکثر تذکرے ملتے ہیں۔ 1634ء میں انگریزوں نے وہاں اسی من سے سیسہ فروخت کیا تھا[2] اور 42ء میں ہم انہیں بالاسور سے غیر ملک کے لیے لاوے ہوئے کپڑے اور شکر پر علی الترتیب 64 اور 128 ال، بی اور ڈپوائیز کے من کے حساب سے باربرداری کا محصول وصول کرتا ہوا پاتے ہیں جو[3] بیّن طور پر جہانگیری من کے مساوی اور دو گنے ہیں۔ 1657ء کے ایک باضابطہ تصدیق نامہ میں ایک پرتگالی تاجر، بنگالہ کے مانڈ کو 64 اریٹ (Arate) یا 64 × 64 ال بی اور ڈپوائیز کے مساوی قرار دیتا ہے[4] جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم اس وقت تک صوبہ میں اس کی حیثیت برقرار تھی۔ لیکن 1659ء میں شاہجہانی من (75 ال، بی کا من) کا استعمال بالاسور میں سوت کی تجارت کے سلسلہ میں پایا جاتا ہے[5]

---

[1] Marshall, 419 کے بیانات میں کوئی ربط نہیں پایا جاتا۔ ایک من میں 2 سیر کی گنجائش کے تیئں من کا وزن تقریباً 182، ال۔ بی اور ڈپوائیز ہونا چاہیے لیکن وہ ایک دوسری جگہ (913 ، 149 ، 127) من کا وزن صرف 80 ال۔ بی بیان کرتا ہے۔ وہ ہر صورت میں شاہجہانی من کا وزن بہت زیادہ بتاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ 42 دام کے وزن کا سیر شاہجہانی من کے وزن میں جو ابتداءً 40 دام کے سیر پر قائم کیا گیا تھا اضافہ ظاہر کرتا ہو۔ لیکن یہ خیال خود مارشل کے بتائے ہوئے داموں کے وزن سے (ص 421) جس میں جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ امتداد زمانہ سے گھٹنے کی واضح گنجائش رکھی گئی تھی غلط ثابت ہوتا ہے۔

[2] Factories, 1634-36, 49

[3] Factories, 1642-45, 72 بقول مورلینڈ "ولندیزی تحریروں میں بمقام ہگلی 1636ء میں اور بمقام بالاسور 1642ء میں ایک من کو تقریباً 68 ال، بی اور ڈپوائیز کا بیان کیا گیا ہے، لیکن 1645ء میں پپلی کے بندر پر شاہجہانی من استعمال ہوتا تھا۔ (Akbar to Aurangzeb, 335) اس آخری بیان کو Factories کے اس صفحہ کے حوالے سے لکھا ہے جو اس فٹ نوٹ کے شروع میں درج ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے انگریزی اور ولندیزی آخذ کو خلط ملط کر دیا ہے

[4] Master, 11, 62 [5] Factories, 1655-60, 297

حالانکہ اواخر عہد عالمگیری کے ایک ضوابط نامہ میں (جو) اس کی تحریر کے وقت بنگال اور اڑیسہ میں سوت ہی کی تجارت میں 'جہانگیری من' کا استعمال بیان کیا گیا ہے[1] اس کے بعد سے حقیقتاً انگریزی تجارتی کاغذات میں بظاہر صوبہ کی مختلف بازاروں کا من صرف یا تو شاہجہانی من کے مساوی یا اس سے تھوڑا کم و بیش[2] ملتا ہے۔ یہ فرق غلہ کے کاروبار میں سب سے زیادہ نمایاں تھا جہاں 40 دام کے سیروں کے من کا استعمال جاری رہا۔ پس پرانے داموں کے امتداد زمانہ سے گھس کر ہلکا ہونے کے سبب سے اس من کا وزن مطلقاً خود اور دوسری جگہوں کے منوں کی نسبت سے بھی کم ہو گیا[3]

ہمیں، بہرحال حجم کے مقامی پیمانوں کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔ یہ پیمانے گَونی یا ٹوکرے، کے بمقدار ہوتے تھے اور ان کا صوبجات بنگال اور اڑیسہ کے غذائی اجناس کی تجارت میں استعمال بتایا جاتا ہے[4]

---

[1] فرہنگ کاروانی Edinburgh 83 ورق 6 ب۔ 7 الف۔ استعمال شدہ لفظ 'سوت' ہے۔

[2] بنگالی من کا وزن بقول Marshall, 419 73 ال۔بی اور ڈپوائیز، لیکن بقول Bowrey, 217 70 ال۔بی تھا۔ آخر الذکر تصنیف میں بالاسور میں من کا وزن 75 ال۔بی اور ڈپوائیز اور قاسم بازار میں 68 ال۔بی۔ بیان کیا گیا ہے جس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ یہ غلہ کے من کے مماثل تھا۔ مارشل نے وزن کی دو اکائیوں میں ایک دلچسپ امتیاز قائم کیا ہے۔ اول وہ من جو 'بازار کا وزن' کہا جاتا تھا جس کا سیر 42 پیسہ شاہجہان کا اور ہر پیسہ $19\frac{3}{4}$ ماشوں کا اور دوئم بنگال میں فیکٹری کے وزن کا من جو 40 پیسہ موجودہ سے یا $18\frac{1}{2}$ ماشوں کا ایک پرانے پیسہ کا ہوتا تھا (ص 421) اس خصوص، پیسے کے وزن کے مطابق آخر الذکر من کا وزن تقریباً 3 ر 62 لیکن فرہنگ کاروانی Edinburgh 83 ورق 6۔ الف میں مدو شاہی پیسہ کا وزن 16 ماشہ بیان کیا گیا ہے۔ غالباً مارشل کا مفہوم زمانی ڈھلائی کے) اورنگ شاہی پیسہ سے رہا ہوگا جس کا وزن اسی ضوابط نامہ میں 18 ماشہ بتایا گیا ہے۔

[3] فرہنگ کاروانی، اڈنبرا 83، اوراق 5 ب 6 الف۔ "بقالی و غلہ کے کاروبار میں مسلم وزن بمقدار مرادی (یا عام) شاہجہانی بوزن چالیس ہے" موازنہ Bowrey 217 "غلہ، مکھن، روغن یا کسی بھی رقیق شئے کی دنیائے بنگال کے تمام علاقہ میں 68 پونڈ کے من سے خرید و فروخت ہوتی ہے۔"

[4] فرہنگ کاروانی Edinburgh 83 اوراق 6 ب۔ 7 الف Or. 1840, f.187
ان دونوں مآخذ میں 'گَونی' کی جگہ 'گَودی' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس پیمانے کے لیے ملاحظہ ہو Wilson's Glossary, 170; Cuttack Distt. Gazetter 1906 p. 144) (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ہمیں لاہور کی بازار میں زیر استعمال اوزان کی بہت ہی تھوڑی اطلاع مل سکی وہاں 1639ء میں شکر اور نیل کی مروجہ قیمتوں کو ایک پیسے 'مائین' (Maen) (من) اور بڑے مائین' (من) کے بمقدار قلم بند کیا گیا ہے[1] اور اس وقت ان دونوں سے 'شاہجہانی من' مراد رہا ہوگا۔ ملتان میں ان ہی اشیاء کی قیمتوں کے سلسلہ میں بھی بڑے 'مائین' (من) ہی کا حوالہ آیا ہے[2] ضوابط عالمگیری میں مستند اوزان کے سلسلہ میں 'مانی یعنی (کذا) ٹوپا' لکڑی کے ایک پیمانہ" کا ذکر آیا ہے۔ لاہور میں اس کا وزن 6 اور ملتان میں 12 من (شاہجہانی) بتایا جاتا ہے[3] خاص پنجاب میں حجم کا یہ پیمانہ تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ اب تک چلا آرہا ہے اور خصوصی طور پر گاؤں کے کاروبار میں مستعمل ہے[4]

انگریز تجارتی گماشتوں نے 1635ء میں اپنے سندھ کے سفر میں سہوان کی نیل کی تجارت میں جہانگیری من ہی کو مگر ٹھٹھہ کی بازار میں 'شاہجہانی من' کو زیر استعمال پایا[5] اس کے بعد سندھ میں بہرحال نیل کے کاروبار میں صرف شاہجہانی من کا حوالہ ملتا ہے[6] اس صوبہ میں ہم بار اوّل

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

جس میں گوّنی کے وزن کو $\frac{3}{4}$ سیر سے لے کر اس کے موجودہ معیاری 7 سیر تک بتایا گیا ہے۔ یہ پیمانہ اب بظاہر صرف اڑیسہ میں استعمال ہوتا ہے۔

[1] Factories 1637-41, p 135 [2] Ibid, 136

[3] ضوابط عالمگیری۔ ایتھے 415 ورق 171 الف، Or 1641 ورق 50 الف، 6598 ورق 153 الف۔

[4] ڈسٹرکٹ گیزیٹروں میں مندرج مختلف مقامی پیمانوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'ٹوپا' کی جو بھی جسامت ہو لیکن ہر جگہ اس کے اور اس سے بڑی اکائی 'پائی' کا درمیانی تناسب یکساں ہوتا ہے یعنی 4 ٹوپے ایک پائی کے برابر ہوتے ہیں۔ ملتان میں 20 پائیوں اور منٹگمری اور ضلع لاہور کے علاقہ میں چالیس 50 پائیوں کا منی یا منی ہوتا ہے (ملاحظہ ہو Montgomery Distt. Gaz, 1893-4 PP 194-5 Multan Distt. Gaz. 1901-2 P 258 Lahore Distt. Gaz, 1898-9, PP 182-3

[5] Factories 1634-36, 133 مظہر شاہجہانی میں جو سہوان میں 1634ء میں تصنیف ہوئی تھی 'شاہجہانی من' کا سرے سے ذکر نہیں، لیکن جہانگیری من کے دو حوالے ملتے ہیں (ص 146 182)

[6] Factories 1637 41 PP 274, 276

ملک کے شمال۔مغرب کے علاقہ میں من کے سب سے بڑے حریف 'خروار' یعنی گدھے کے بوجھ کے پیمانہ کا استعمال پاتے ہیں[1] ہم اسے 1634ء میں سہوان کی تمام غذائی اجناس کے وزن میں استعمال ہوتا ہوا پاتے ہیں اور اسے اس وقت 9 یا 10 جہانگیری من یعنی 3 ر 597 یا 8 ر 663 اور ڈپوائیز ال۔بی کے مساوی تصور کیا جاتا تھا[2] 1635ء میں انگریز تجارتی گماشتے ٹھٹھہ میں 'کورواز' کو 8 شاہجہانی من کے یا بعض لوگ 590 ال۔بی اور ڈپوائیز کے مساوی تصور کرتے تھے[3]

خروار سندھ میں تو من کے ساتھ ساتھ مگر کشمیر میں تنہا استعمال ہوتا تھا[4] بقول ابوالفضل کشمیر کا ایک 'خروار' اکبرشاہی[5] وزن کے اعتبار سے 3 من اور 8 سیر یعنی 82 ر 177 ال۔بی۔ اور ڈوپوائیز کے مساوی تھا جو دورِ حاضر کے ایک ماخذ میں اس کے بیان کیے ہوئے وزن 74 ر 177 ال بی کے مماثل ہے[6]

---

[1] منظر شاہجہانی 82 + 5 ایک خروار میں 60 کاسے اور ایک کاسہ میں 4 توکیے ہوتے ہیں (ص 102/146 اور ص 172 بھی۔

[2] منظر شاہجہانی میں ایک مقام پر 5 'کاموں' کو 30 جہانگیری سیروں (ص 146) کے اور دوسری جگہ ایک کاسہ کا بوزن پتھر 6 5/8 جہانگیری سیروں اور 1 1/2 ذاموں کے وزن کے مساوی بتایا گیا ہے (ص 182)

[3] Factories 1634 – 6 p 133

[4] آئینِ اکبری (1) 570 میں کشمیر کے مروجہ پیمانوں کو اس طور پر بیان کیا گیا ہے' 2 داموں کا وزن = ایک پانی' 7 1/2 پال = ایک سیر' 4 سیر = ایک من' 4 من = ایک ترک' 16 ترک = اخروار۔ بلاکمین کے متن میں اس پیمانہ کے بیان کے سلسلہ میں ایک سنگین فروگذاشت ہوگئی ہے' جس کے نتیجہ میں ایک ٹرک 4 سیر کے برابر ہو جاتا ہے۔ (یہ فروگذاشت Jarretts 11 ed. Sarkar 36 میں بھی صحیح نہیں کی گئی) مخطوطات Add 7652 اور Add 6552 کی عبارت بالکل صاف ہے اور اس کی تائید تزک جہانگیری سے بھی ہوتی ہے یہی پیمانہ تاحال قائم ہے کیونکہ 30 پالوں کو ایک منوٹہ کے برابر تصور کیا جاتا ہے۔
W.R. Lawrence, 'The Valley of Kashmir' London 1895 P 242

[5] اکبرنامہ (3) 548، آئینِ اکبری (1) 570

[6] W.R. Lawrence حوالہ سابقہ۔ جہانگیر (تزک جہانگیری 297، 315) نے حالانکہ خود سرکاری وزن کے معیار کو تبدیل کیا تھا لیکن کشمیری 'کائیوں' کا من کے پیانوں کی تعداد میں مساوات دیتے وقت اس نے صرف ابوالفضل کو نقل کر دیا ہے

1627ء میں مغلیہ دکن کے شہر برہانپور میں جہانگیری من کا قطعًا استعمال تھا کیونکہ اس وقت انگریزوں نے وہاں اسی وزن سے سیسہ فروخت کیا تھا۔[1] لیکن یہاں بھی اس کے بجائے 'اکبری من' رائج ہو گیا کیونکہ قلعہ دولت آباد کے شاہی ذخیرہ یعنی خالصہ شریفہ کی 10ھ جلوس شاہجہانی کی ایک سرکاری فہرست میں متعدد اشیاء مثلاً توپ کے گولے، گندھک وغیرہ کے وزن واضح طور پر 'من اکبری' میں درج کیے گئے ہیں۔[2] البتہ اس فہرست کے اختتام پر بعض کھانے پینے کی چیزوں (یعنی ڈی، پوستہ، بھنگ اور بجری کے دانے) اور ایک دیگ کا وزن شاہجہانی من میں درج ہے۔[3] اور 1630ء کے لگ بھگ ایک دستاویزی گندھک، پتھر کے کوئلہ اور شورہ کے وزن کو بھی شاہجہانی من میں دکھایا گیا ہے۔[4] بھیم سین، عہد عالمگیری کے اوائل میں صوبجات دکن کی مروّجہ قیمتوں کی اپنی یادداشت میں شاہجہانی من کو استعمال کرتا ہے۔[5]

گجرات میں مروّجہ من غالبًا اصلاً وہیں کا تھا لیکن اسے کم از کم جزوی طور پر سرکاری احکام کے تحت مروّجہ شاہی معیار کے وزن کے ٹھیک نصف پر رکھا گیا تھا۔ 1611ء میں سورت میں 27 یا 5/27 ال بی کے ایک نسبتًا چھوٹے من یعنی اکبری من کے نصف کا ایک حوالہ ملتا ہے اور اس کا دوبارہ حوالہ 1614ء میں ملتا ہے۔ جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کا استعمال "ہاتھی دانت، سونے اور چاندی" کے لیے تھا۔[6]

---

[1] Factories 1622, 3 30۔ 36 پلیوں کے سیر کے من اور 42 سیروں کے من سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے فیصدی کی گنجائش تجارتی کمیشن کے لیے تھی۔

[2] Selected Documents of Shajahan's Reign 92 98 اور ایضًا 219 20 میں بغیر تاریخ کا ایک دستاویز بھی ملاحظہ ہو۔

[3] Selected Documents of Shahjahan's Reign p 98 میں شاہجہانی من کو من بوزن چہل دامی (40 داموں کے وزن کا من) بیان کیا گیا ہے۔

[4] ایضًا 223 یہاں اصطلاح 'من بوزن شاہجہانی' استعمال کی گئی ہے۔ دستاویز بلا تاریخ کا ہے لیکن چونکہ اس میں بگلانہ کی مہم کی طیاری کا حوالہ ملتا ہے، لہٰذا اس کی تخمینی تاریخ معین کی جا سکتی ہے۔

[5] دلکشا ورق 20 ب، ضوابط عالمگیری، ایتھے 415، ورق 71 الف a Or 1641 F 150 ,Add 6598 f 153 a سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپی تجارتی تحریروں کے وزن کی اکائی کینڈی جو جنوبی ہند میں کھنڈی کہی جاتی تھی، صوبجات دکن کے سرکاری پیمانہ میں اپنے 20 من کے عام وزن کے مساوات پر شامل تھی اور یہاں من کو شاہجہانی من بتایا گیا ہے

[6] Lett. Reed-1, 34; Fostor, 'Supplomentary Calender', 47

لیکن اس کے بعد اس کا کہیں ذکر نہیں آتا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بالکل متروک ہوگیا۔ اس کے بعد صرف نسبتاً بڑا من ملتا ہے جو 18 داموں کے وزن کے سیر کا یعنی جہانگیری من کے نصف کے برابر تھا۔ لہٰذا اس کا وزن 19 ر 33 ال بی اور ڈ پوائیز رہا ہوگا جس کی عمومی تائید انگریزی اور ولندیزی تحریر سے بھی ہوتی ہے[1] یہ من ہر چیز کے لیے استعمال ہوتا تھا یا بقول ایک آخذ کے "مسکھن، گوشت، شکر، نیل، شورہ، لکڑی، نمک وغیرہ اور ہر قابل وزن چیز کے لیے"[2] اور یہ صرف سورت اور احمد آباد ہی میں نہیں بلکہ "عملاً پورے گجرات میں" رائج تھا[3] 1634ء میں یا اس کے قبل شاہجہانی من کے آغاز پر گجرات کے من میں بھی متناسب تبدیلی عمل میں آئی اور اس کے کے وزن کو بڑھا کر 20 دام فی سیر کا کرکے بذریعہ فرمان شاہی 1635ء میں احمد آباد میں اور اگلے سال کے اوائل میں سورت میں نافذ کیا گیا[4] اس نئے من کے وزن کو 88 ر36 ال-بی کے مساوی ہونا چاہیے جس کی تصدیق یورپی تحریروں سے بھی ہوتی ہے[5]

---

[1] انگریزی تخمینے 32 سے 33 ال بی اور ڈ پوائیز تک کے ہیں (Lett. Reed-1, 34, 241;11, 214,238;111,11; Foster Supp. Calender 47 Factories 1619, 21 60, 76 Fryer 11 اور ایک تخمینہ iii, 241, 214,238 ii, 34 Lett Reed i) اس کا وزن 30 ال بی اور ڈ پوائیز کے آس پاس بتایا گیا ہے۔ Pelsaert, p.42 میں اس کا وزن 30 ولندیزی ال بی یا 7 32 ال بی اور ڈ پوائیز لیکن Brooke (JIH, xi, 10 اور JIHX vi, 72) Van Twist میں 30 $\frac{1}{2}$ ولندیزی یا 2 ر32 ال بی اور ڈ پوائیز بتایا گیا ہے۔

[2] Van Twist, JIH, XVI, 72

[3] Pelsaert 42 اس بات سے بھی کہ مثلاً بروچ یا بروده میں تجارتی گماشتے کسی دوسرے من کا ذکر نہیں کرتے، ہم اسی نتیجہ پر پہونچتے ہیں۔ اطلاع ہے کہ کھمبات (دیکھیے) میں افیون 45 سیروں کے من سے جس کا ہر سیر 17 پیسوں کا ہوا کرتا فروخت کی جاتی تھی جو بظاہر مخصوص تجارتی منہائیوں کی وجہ سے تھا۔ (Lett. Reed. 111, 41)

[4] Factories 1634-6, 143, 156

[5] Factories 1646-50, 206 اور Fryer 11 126 میں 37 ال بی اور ڈ پوائیز، Factories 1661-5, 113 میں 36 $\frac{8}{3}$ ال بی۔ بقول مورلینڈ، ولندیزی اسے 34 $\frac{1}{3}$ ولندیزی ال۔بی) خیال کرتے تھے (Akbar to Aurangzeb, 336 جس کے مطلب 6 ر37 (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

اس من نے سابقہ من کو بالکل بے دخل کر دیا۔ چنانچہ اس تبدیلی کے بعد اس کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ صرف یورپی تاجروں کے کاروبار کی اشیاء ہی نہیں بلکہ اب ہر اقسام کے غلے اور وزن کے دیگر سامان[1] نئے من سے فروخت ہونے لگے۔ بظاہر زیرِ مطالعہ عہد کی بقیہ مدت کے دوران یہ پھر تبدیل نہ ہوا[2]

فصل 3 یورپی ماخذ میں استعمال ہونے والے وزن

چونکہ ہمارے یورپی ماخذ میں یورپی اوزان کا اچھا خاصہ استعمال ہوا ہے، لہٰذا ہمیں ان کی قدروں کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ انگریز تجارتی گماشتے، ہمیشہ اور ڈپوائیز (انگریزی یا ہیبرڈی پوائیز وغیرہ) وزن اور ولندیزی تاجر ایمسٹرڈم کا پاؤنڈ جو 494ء کلوگرام یا عملاً 09ء1 انگریزی ال بی (اور ڈپوائیز) کے برابر تھا استعمال کرتے تھے[3] بقول مورلینڈ، اس دور کا فرانسیسی 'لیورے'، ولندیزی پاؤنڈ سے تھوڑا کم تھا[4] جس سے اندازہ ہوتا ہے اس کا وزن بال (Ball) کے قائم کیے ہوئے وزن سے بہت کم تھا[5] لیکن جیسا کہ ٹیورنیر اور تھیونو کے بتائے ہوئے شاہجہانی من کے وزن پر کسی پچھلے فٹ نوٹ میں بحث آ چکی ہے، ان دونوں فرانسیسی سیاحوں کے استعمال کیے ہوئے 'لیورے' کا جو پیمانہ مورلینڈ نے بیان کیا ہے وہ بھی بظاہر بہت زیادہ ہے[6] پرتگالی 130 ال۔بی اور ڈپوائیز کا کوانٹل

(باقی حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

ال۔بی اور ڈپوائیز ہوئے۔ (14۔ ii 7) Tevenier اس کا وزن 34 $\frac{1}{2}$ یا 34 فرانسیسی لیورے بتاتا ہے دیا آخر الذکر کے لیے مورلینڈ کی شرح پر علی الترتیب 6 37 یا 06ء37 ال بی اور ڈپوائیز سے قدرے کم۔ 25 ایک سورتی سیر کو 14 فرانسیسی اونس کے مساوی بتاتا ہے۔ اس طور پر من کا وزن 35 فرانسیسی ال۔بی یا 15ء38 انگریزی ال۔بی ہوتا ہے جو بہت زیادہ ہے۔ دوسری طرف Tavernier 133 ایک سیر کو 13 $\frac{1}{3}$ اونس اور ڈپوائیز یعنی ایک من کو 3ء33 ال بی کے برابر بتا کے میں قطعاً اس کے میار کو گھٹاتا ہے۔

[1] Fryer 11, 126

[2] موازنہ بہ ایضاً۔ کیا اس کا اونگٹن کا بتایا ہوا وزن (1690 - 093ء) یعنی 3ء33 ال بی اور ڈپوائیز یعنی 3ء33 ال بی اور ڈپوائیز پرانے داموں کے امتدادِ زمانہ سے وزن کے کم ہو جانے کو ظاہر کرتا ہے۔

[3] Akbar to Au.angzeb 337 [4] ایضاً

[5] Tavernier 331

[6] Akbar to Aurangzeb 334 Livre xx Habndepoizx x

یا کمبٹل اور 10ر 1 ال بی کا اراتل° استعمال کرتے تھے[1]

یوروپی تاجر اور تجارتی گماشتے، نیل اور شکر کے لیے اکثر ایک دوسرے زمرہ کی اصطلاحوں کو استعمال کیا کرتے تھے یعنی چرل°°، بیل+ اور فارڈل++۔ یہ تمام اصطلاحیں اندرون ملک کی بازاروں میں بوجھ ڈھونے والے جانوروں کے ذریعہ حمل و نقل کی سہولتوں کے لحاظ سے مناسب وزن اور جسامت کے گٹھر کو ظاہر کرتی ہے، لہٰذا یہ تخمیناً پورے یا نصف بیل یا بھینس یا اونٹ کے بوجھ کے برابر ہوتے تھے[2]۔ ایسی صورت میں یہ اصطلاحیں خود کوئی معین وزن ظاہر نہیں کرتیں بلکہ مختلف مقامات اور مختلف سامانوں کے لیے ان کے مروجہ وزن ہوا کرتے تھے جن کے متعلق قیاس ہے کہ یہ جانوروں کے مالکان اور گاڑی بانوں کے لیے قابل قبول ہوتے رہے ہوں گے اور انگریز اور ولندیزیوں کی یہ کوشش رہا کرتی تھی کہ وہ اپنی سہولیتوں کے خاطر ان کے کچھ معیار معین کرلیں، مثلاً آگرہ میں نیل 4 اکبری من سے قدرے زائد کے چرلوں یا فاردلوں میں باندھی جاتی تھی[3]۔ 1683ء میں بنگال کے قاسم بازار میں شکر کے

---

[1] Relations p 90 یہ 16 اونس کے نئے 'ارٹل' کا وزن بتایا گیا ہے۔ 14 اونس کا پرانا ارٹیل ہندوستان میں سولہویں صدی کے اواخر کے قبل بہ استثناء سیاہ مرچوں کی تجارت کے متروک ہوگیا تھا۔

[2] موازنہ ہو Mundy 95 Akbar to Aurangzeb, 340-341 کے بیان کے مطابق پٹنہ سے آگرہ کے سفر میں اس نے بیلوں کو 4 بڑے من، فی بیل کے حساب سے مال ڈھوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر اس سے جہانگیری من مراد ہے تو یہ بوجھ 5 ر 265 ال۔ بی اور ڈوپوائیز کے برابر ہوا۔ مسٹ 98 پر وہ بیل کے بوجھ کو $2\frac{1}{2}$ پنڈرویٹ یا 280 ال۔ بی' اور ڈوپوائیز بتاتا ہے۔ Taverrier 32 کے بیان کے بموجب ایک بیل 300 یا 350 لیورس یعنی 0ر 327 یا 5 ر381 ال بی اور ڈوپوائیز بوجھ لے جا سکتا تھا۔

[3] 1615ء میں سورت کے تجارتی گماشتے آگرہ سے آئی ہوئی نیل کا بمقدار فاردلس' ذکر کرتے ہیں جس میں سے ہر ایک تخمیناً 6 $\frac{4}{2}$ انڈر کا تھا۔ اگر اس انڈ کی سورت کا من فرض کیا جائے تو اس کا وزن 4 اکبری من سے قدرے کم ہوا (Lett. Reed 11, 194) 1671ء میں بنیوگس بمقام آگرہ" فاردل' اور بندھی ہوئی نیل کے وزن کے اعداد کو بتاتا ہے جس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ ایک ' فاردل' کا وزن گانٹھ کو باندھنے سے سامان کے علاوہ 1ر4 خالص من اکبری تھا (ایضاً 4' 236) 1621ء میں حکام مغلیہ کے خلاف ایک شکایت میں آگرہ کی نیل کے ایک 'چرل' کو $4\frac{1}{2}$ من اکبری کے برابر بتایا گیا ہے، لیکن بلحاظ موقع (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

++ Fardle + Bale °° Churloo ° Airatel

'بیل' (گانٹھ) کو بوزن فیکٹری' 2 من 6½ سیر کا بتایا جاتا ہے[1] جیسے باوری Bowry کے بتائے ہوئے قاسم بازاری من کے وزن[2] سے تقریباً 2 شاہجہانی من کے برابر ہونا چاہیے۔[3] انگریزوں نے 1619ء میں احمد آباد (گجرات) میں نیل کے ایک 'بیل' (Bale) کے وزن کو زیادہ سے زیادہ (18 داموں کے سیر سے) 4 سورتی من معین کیا تھا[4] لیکن مابعد کے حوالوں میں اس کا وزن قدرے زیادہ بتایا گیا ہے۔[5] گجراتی شکر کی ایک 'بیل' کی ولندیزی تحریروں میں 20 داموں کے سیر سے 8 من کے مساوی تصور کیا جاتا تھا۔[6]

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اس میں مبالغہ آرائی کا امکان پایا جاتا ہے (Factories, 1622-3, 284-5) 1633ء – 204 اور 1643ء میں بیانہ کی نیل کے ایک 'بیل' کو خالص 4 'انڈس' کا بتایا گیا ہے۔ (ایضاً 1634 – 36 وصلے 1642 – 5ء، ص 16–17) Pelsaert بھی آگرہ کی نیل کی ایک گانٹھ کو خالص من کے برابر شمار کرتا ہے۔ بقول مورلینڈ (Akbar to Aurangzeb', 340-41) ولندیزی تحریروں میں اس کے وزن کو 230 – 240 ال۔بی اور ڈپوائیز یعنی 25ر 4 اور 5 4 من اکبری کے درمیان جو نیل کی کاروباری اکائی تھی بتایا گیا ہے لیکن اس میں گانٹھ باندھنے کا سامان بھی شامل ہو سکتا ہے۔

[1] Hedges, 1, 16

[2] Bowray, 217

[3] یہ بنگال کے ریشم کی گانٹھ کے اس وزن (143 ال۔بی ا۔ ڈپوائیز) کے بہت قریب ہے جس کا مورلینڈ نے ولندیزی تحریروں میں اندراج پایا تھا۔

[4] Factories, 1618-21, P.76

[5] 1629ء میں 4 انڈس 7 سیر (Factories, 1624-9, p. 230) اور بقول مورلینڈ، ولندیزی تحریروں میں گانٹھ کا وزن 155 ر 145 ال بی اور ڈپوائیز درج ہے (Akbar to Aurangzeb,۔ 340, 342) 1956ء کے 'Old Correspondence' میں مندرج ایک بیجک کا بھی حوالہ دیتا ہے جس میں گجرات کی نیل کی ایک گانٹھ کا وزن خالص 148 ال۔بی یا بظاہر ٹھیک 20 دام کے سیروں سے من شمار کیا گیا ہے۔

[6] 21 مئی 1641ء کا 'داغ رجسٹر' جس کا مورلینڈ نے 'Akbar to Aurangzeb, 340' میں حوالہ دیا ہے۔

ضمیمہ۔ ج

نظام سکہ اور سونے اور تانبہ کی مقدار میں روپیہ کی قیمت

فصل۔۱۔ نظام سکہ

مغلوں کا اپنی پوری وسیع و عریض مملکت میں بہترین دھات کے ایک یکساں نظام زر کا قائم کرنا، اس وقت کا ایک نمایاں کارنامہ تھا۔ وہ سونے، چاندی اور تانبہ کے سکے ڈھالتے تھے۔ سونے کے سکے تقریباً سو فیصدی خالص اور چاندی میں کبھی کبھی ۴ فیصدی سے زائد آمیزش نہ ہوتی[1] علاوہ اس کے سکوں کا ایک "آزاد" نظام قائم تھا یعنی یہ کہ ہر شخص ٹکسال میں بیش قیمت دھاتوں کی سلاخیں لے جا کر ان کو سکوں میں تبدیل کرانے کے معاملہ میں آزاد تھا[2] چنانچہ نتیجۃً سکے بازار میں اپنے

---

[1] اس موضوع پر بہترین بحث کے لیے ملاحظہ ہو۔ S.H. Hodivala, 'Historical Studies in Mughal Numismatics' pp.235-44

[2] ایضاً آئین اکبری (۱)، ص 16 31 33 (ملاحظہ ہو Hodivala حوالہ سابقہ) اور انگریزی تحریروں میں متعدد مثالوں (یعنی 185 - 50 - 9 - Factories 1634-6,Pp 68 سے اور 'Avernier 20 8 - 7 1.P سے بھی ظاہر ہوتا ہے مغلوں کے نظام سکہ سازی کی حسب معمول اچھی کارکردگی میں استثنائی صورتوں اور فرو گذاشتوں کے لیے Moreland, 'Akbar to Aurangzeb' p.277 جس میں دلندیزی تحریروں اور Factories, NS,ii p.391 دونوں بنگال کے متعلق اور اورنگزیب کے ایک حکم کا (احکام عالمگیری، ورق 282 الف۔ب) جس میں برہانپور کے ٹکسال کی بدعنوانیوں کی مذمت کی گئی ہے حوالہ دیا گیا ہے۔

دھات کے وزن کے تقریباً مساوی قیمتوں پر چلا کرتے تھے اور مختلف دھاتوں کے سکوں کے درمیان شرح مبادلہ سرکاری احکام سے نہیں بلکہ بازار سے متعین ہوا کرتی تھی۔

انتظامی اور تجارتی حدود میں تمام نقدی ادائگیوں کے لیے سکے کی بنیادی اکائی چاندی کا سکہ یعنی روپیہ تھا جسے انگریزی میں 'روپی' کہتے تھے۔ سترھویں صدی کے چاندی کی کسری اکائی آنہ یا ANNA جو روپیہ کا سولہواں حصہ تھا بظاہر علومی استعمال میں آچکا تھا۔[1] طلائی مہر یا اشرفی عام کاروباری استعمال میں نہ تھی بلکہ اسے خاص طور پر امرا دولت جمع کرنے کے مصرف میں لاتے تھے۔[2] تانبہ کا خاص سکہ دام تھا۔ عہد اکبری میں اس نے بتدریج تانبہ کے ٹنکے کو جس کی قیمت کا یہ نصف تصور کیا جاتا تھا بے دخل کر دیا تھا۔[3] دام کو پیسہ بھی اور نصف دام کو ادھیلا کہتے تھے۔[4]

---

[1] روپیہ کی سب سے چھوٹی کسری اکائی حسب اندراج آئین اکبری (ا) ص 26 سوکی = $\frac{1}{20}$ اور کلا = $\frac{1}{16}$ روپیہ ہے۔ یہ غیر یقینی ہے کہ کلا بحیثیت بنیادی کسری اکائی 'آنہ' کے نام سے ایک سے جاری ہوا لیکن یہ بنگال میں تقریباً 1600ء میں چل رہا تھا (ہفت اقلیم ص 94، 90) یہ 1620ء ہی سے پٹنہ کے کاروباری استعمال میں تھا۔ (Factories, 1618-21, pp.94,204) اور عہد شاہجہانی کے سرکاری حساب کتاب میں قطعی طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ملاحظہ ہو Selected Documents of Shahjahan's Reign pp 93. 97 98 180 194 216 18 220

[2] Pelsart 29 Tavernier i. PP 15, 16

[3] تانبہ کے ٹنکہ کو بعض اوقات 'ٹنکہ دہلی' اور ٹنکہ مرادی اور ٹنکہ سیاہ بھی کہتے ہیں ملاحظہ ہو Hodivala, JASB, NS, xxviii, pp. 80-96 اس میں پیش کردہ ماخذ میں عارف قندھاری 177 اور معتمد خاں اقبال نامہ، b 232 | 1834 کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

[4] آئین اکبری (ا) ص 27 یاد رہے کہ اکبر نے دام کو نصف ٹنکہ کے مساوی قرار دے کر ہندوستان کے مندرجہ ذیل روایتی تانبہ کے نظام سکہ کو درہم برہم کر دیا تھا۔ 3 دام = ایک دمڑی 4 دمڑی = ایک ادھیلہ 2، ادھیلے = ایک پیسہ، دو پیسے = ایک ٹنکہ، لیکن ایک پیسہ = 25 دام اور ایک ٹنکہ = 50 دام۔ دستور العمل جہانگیری، اوراق 3 الف، 7 ب، 19 الف Marshall, 410 Or 1840 - 1349 فرہنگ کاردانی ورق 83، 6 الف، Tavernier (Elliot Memories, Sc. 11, p. 296 یورپی تحریروں میں جب دام کا بحیثیت حساب کتاب کی ایک اکائی کے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

سترھویں صدی میں ایک الجھن اس وقت پیدا ہوئی جب پرانے ٹنکوں کے متروک الاستعمال ہونے پر عام طور سے سرکاری دام کو ٹنکہ اور پرانے ادھیلے کو پیسہ کہا جانے لگا[1] علاوہ اس کے تانبہ کی بمقدار چاندی قیمت میں اضافہ کے باعث اکبر کی قائم کی ہوئی ۴۰ دام فی روپیہ کی معیاری نسبت بھی ادائیگوں میں برقرار نہ رہ سکی لیکن چونکہ حساب کتاب میں خصوصاً جمع کے اعداد اور تنخواہوں کے حسابات میں پرانی شرح ہی چلتی رہی لہٰذا ان حسابات کے داموں کی حیثیت ایک ایسے موہوم سکے کی رہ گئی جس کی روپیہ سے کسری نسبت محض کاغذی تھی[2]

زیر مطالعہ عہد کی پوری مدت میں مہر اور روپیہ کا وزن عملاً ایک سطح پر قائم رہا۔ صرف اورنگزیب نے اپنی تخت نشینی پر ان دونوں سکوں کے وزن میں بہت معمولی سا اضافہ کر دیا تھا، لیکن اس سے ان کے نسبتی وزنوں میں کوئی فرق واقع نہ ہوا[3] جہانگیر نے دو زیادہ وزنی قسم کے روپیے

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

نہیں بلکہ اس کے وزن کا حوالہ دینا مقصود ہوتا ہے تو اسے ہمیشہ پائیس (یا لفظاً پیسہ کے متعدد بگڑے ہوئے نام) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو اگلا نوٹ۔

[1] ایسا Pelsaert, 29,60 اور Van-Twist, JIH, xvi, pp. 72,73,74 میں بتایا گیا ہے۔ انگریزی حوالوں کی اسی طور پر تعبیر دیکھئے ملاحظہ ہو Hodivala, 'Mughal Numismatics, p-140 n اور Moreland, Akbar to Aurangzeb, p. 231 لیکن بعض ما بعد کے ماخذ مثلاً مرآۃ (۱) صفحہ 247 اور Marshall p-416 سابقہ اور غالباً سرکاری اصطلاح ہی استعمال کرتے چلے آتے ہیں

[2] یہ 'دام' 'دام تنخواہی' یعنی تنخواہوں کے دام کے نام سے مشہور ہوا (دستور العمل عالمگیری، ورق 3 الف) موازنہ ہو Manucci, ii pp. 374-5

[3] برٹش میوزیم اور ہندوستانی میوزیم دونوں کے ذخیروں میں، اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے سب سے زیادہ وزنی روپیوں کا وزن 178 گرین ٹرائے اور مہروں کا 169 گرین ہے۔ برخلاف اس کے اورنگزیب کے روپیوں اور مہروں کا وزن علی الترتیب 180 و 171 تک پہونچتا ہے (ملاحظہ ہو S. Lane Poole. 'The Coins of the Mughal Emperors of Hindustan in the British Museum, Calcutta, Vol. iii Mughal Emperor ۔ روپیہ کے وزن میں تبدیلی کی اطلاع سورت کے تجارتی گماشتوں کے احمد آباد کو اور کمپنی کو ستمبر 1659ء میں لکھے ہوئے خطوط سے ملتی ہے Factories 1655-60 صفحہ 211-12 و 211 نوٹ)

اور مہریں جاری کیں۔ لیکن یہ مختصر المیعاد ثابت ہوئیں۔ علاوہ اس کے چونکہ ان کے مخصوص نام معین کر دیئے گئے
تھے، لہٰذا ہمعصر حوالوں میں ان کے اور پہلے کی مہروں اور روپیوں کے درمیان معمولاً کوئی غلط فہمی نہ
ہو سکتی تھی[1]۔ دام کا وزن بھی سابقہ معیار پر اس وقت تک قائم رکھا گیا جب تک کہ اورنگزیب نے تانبہ
کی بڑھتی ہوئی کمیابی سے مجبور ہو کر سابقہ وزن سے ایک ثلث ہلکے دام جاری نہ کیے۔ یہ ساتویں دہائی
میں بعض ٹکسالوں سے جاری ہونا شروع ہوئے اور انہوں نے بظاہر دھیرے دھیرے پرانے داموں
کو بے دخل کر دیا[2]۔

چونکہ سکوں کی قیمتوں اور ان کے دھات کے وزنوں میں قریبی مماثلت پائی جاتی تھی اس لیے
سکوں کا وزن جب بھی کانٹ چھانٹ یا گھسنے کی وجہ سے کم ہو جاتا تو اسی تناسب سے ان کی قیمتیں بھی
کم ہو جایا کرتی تھیں۔ مغلیہ سکوں کی یہ ایک عجیب خصوصیت تھی کہ ان کی قیمت ان کی عمر کے ساتھ کم ہوتی
رہتی تھی۔ سکوں پر ڈھلائی کا سال، ٹکسال کا نام بادشاہ وقت کے القاب منقش رہتے تھے۔ نئے ڈھلے
ہوئے روپیے، 'سکّہ' یا 'ہنڈدی' کہے جاتے جو اسی عہد حکومت میں اس سے قبل کے ڈھلے ہوئے روپیوں سے
جو 'چلنی' یا 'پیٹھ' کہلاتے زیادہ قیمت رکھتے تھے اور 'چلنی' روپیوں کی قیمت سابقہ عہد حکومت میں جاری
شدہ سکوں سے جو 'خزانہ' کے نام سے موسوم ہوتے زیادہ ہوا کرتی تھی۔ معمولاً پرانے سکوں کو گھس جانے
کی بنا پر برائے نام منہائی دی جاتی تھی[3]۔ اشیاء کی قیمتوں پر غور کرتے وقت ہم عام طور سے ان منہائیوں
کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ حقیقت میں ہمارے ماخذ میں اکثر قیمتیں بغیر اس صراحت کے قلمبند کی گئی ہیں

---

[1] اس مسئلہ پر بہترین بحث Hodivala, 'Mughal Numismatics, pp. 132-146 میں
ملتی ہے۔ اس تصنیف میں جن ماخذ کے حوالے دیئے گئے ہیں، ان میں Pelsert, 29 کو جس کا اس موضوع پر
بیان غیر معمولی طور پر واضح ہے، اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

[2] نسبتاً ہلکے دام بار اول 1663 - 64ء میں حکومت کے مرکزی شہروں سے جاری ہوئے۔ یہ گجرات میں
1665 - 66ء سے ڈھلنا شروع ہوئے اور بہار میں ان کا استعمال 1671ء سے بڑھنے لگا تو عالمگیر کے تانبہ کے
سکوں کی ایک کثیر تعداد اسی قسم کی تھی۔ ملاحظہ ہو مرآۃ (۱) 265 ، 267 Marshall, 416-17)
ضوابط عالمگیری، ایتھے 415 ورق 170 ب۔ Add 6598 f 152, Or 1641, f. 49 b
اور فرہنگ کاردانی، اڈنبرا نمبر 83 ورق 6 الف۔ موازنہ ہو Hodivala, JASB, N.S. xxviii,
pp-62-67.

[3] منہائی کے زیادہ نہ ہونے کا اندازہ، مثلاً 1661ء میں اورنگ آباد میں بمقدار تانبہ مختلف اقسام (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

فصل ۲ روپیہ کی سونے کی مقدار میں قیمت

باب تین کے فصل تین میں زیر مطالعہ عہد کے دوران زرعی قیمتوں کے خصوصی رجحانات کے جائزہ کے سلسلہ میں ہم بمقدار قیمتی دھاتوں کے روپیہ کی قیمت کے مطالعہ کی اہمیت پر اس لیے زور دے چکے ہیں کہ اس سے ہمیں ایسا مواد فراہم ہوگا جس سے ہم روپیہ کی عام قوت خرید میں اہم تبدیلیوں کو اخذ کر سکتے ہیں۔ ہمارا یہ کام اس لیے بہت آسان ہو جاتا ہے کہ چونکہ مغلوں کا نظام زر اس قسم کا تھا جس میں تعداد کی کسی حد بندی کے بغیر انتہائی خالص دھات کے سکے چلا کرتے تھے۔ لہٰذا مہروں و داموں کی روپیہ کی مقدار میں قیمتیں، ان تینوں دھاتوں کی بازاری قیمتوں کے تقریباً مماثل ہوا کرتی تھیں[1] مہر اور روپیہ کی شرح مبادلہ کے معاصر اعداد پر غور کرتے وقت ہمیں مختلف علاقوں میں کسی خاص وقت میں ان کے درمیان فرق کے امکانات کو ذہن میں ضرور رکھنا چاہیے۔ لیکن راستوں کے کھلا رہنے کی صورت میں، چونکہ سونے اور چاندی کے حمل نقل میں نسبتاً کم صرف ہوتا تھا، لہٰذا اس فرق کو کم سے کم رکھنے کا رجحان پایا جاتا تھا۔

آئین اکبری کی تحریر کے زمانہ میں مہر ٹھیک نو روپیہ کی مساوی قیمت کی تصور کی جاتی تھی[2] اور اس کی یہ قیمت بظاہر ایک دہائی سے زیادہ مدت تک قائم رہی[3] (1608 - 12ء) اکبر کی ایک اشرفی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

حال کے برسوں میں قائم ہونا بتایا گیا تھا۔ (Factories-1638-1634-1,P.224) کے ایک قطعی بیان کے مطابق انگریزی حسابات کی $2\frac{1}{2}$ محمدی = ایک روپیہ کی کاغذی شرح گمراہ کن تھی کیونکہ واقعی شرح $2\frac{1}{2}$ تھی (ایضاً 1637 - 41 ص $\frac{91}{}$) لیکن بازاری شرح اور نیز انگریزی کاغذات کی شرح دونوں ہی زیر مطالعہ دور کی بقیہ مدت میں بظاہر تبدیل نہ ہوئیں۔ (ایضاً 1615 - 4 ص $\frac{58}{}$ (Fryer, 11, pp-125-6)

[1] یاد رہے کہ روپیہ اور مہریں دونوں کی قیمتیں ان کے خالص دھات کے وزن سے تھوڑا زیادہ تھیں آئین اکبری (ا)، ص $\frac{31}{}$ - 2 میں جہاں ٹکسالوں سے ایک معینہ تعداد میں ڈھلے ہوئے سکے حاصل کرنے کے لیے جس قدر دھات جمع کرنا ہوتا تھا درج ہے، وہاں پر حق شاہی کی مقدار کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔

[2] آئین اکبری (ا)، 25، 196

[3] ٹوڈرمل کے ضابطے ستائیسویں برس کے تحت $1\frac{1}{9}$ مہروں کے وزن کا طلائی سکہ لال جلالی = 400 داموں کے اور مربع روپیہ 40 اور گول 39 داموں کے برابر تصور کیا جاتا ہے۔ (اکبرنامہ (3) 383 ابتدائی متن Add 27247 ورق 332 ب پر)

کو دس روپیوں کے برابر خیال کرتا تھا[1] اور 1614ء میں اس کی یہی شرح قلم بند کی گئی ہے۔[2] بقول جہانگیر اس کے عہدِ حکومت کے دسویں برس مہر کی قیمت 7 ر 10 روپیہ تھی،[3] لیکن 1621ء میں گھٹ کر یہ دس روپیہ ہو گئی۔[4]

لیکن اگلے پانچ برسوں میں بمقدار چاندی، سونے کی قیمتیں بیحد بڑھی ہوں گی، کیونکہ 1626ء میں بتایا جاتا ہے کہ ایک مہر 14 روپیہ میں فروخت ہوا کرتی تھی۔[5] اس سال سورت میں غیر ملکی سونے کے سکوں کی قیمت فروخت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔[6] 1628ء میں جب احمد آباد میں سنیا یا مہر 13 روپیہ اور بعدہٗ صرف $12\frac{3}{4}$ روپیہ سے زائد فروخت نہ ہو سکیں تو اسے سونے کی غیر متوقع

---

[1] Early Travels, 101

[2] Foster, Supplementary Calender, p.48

[3] پروفیسر ہودی والا بادشاہ کے مذکورہ سن کے دو بیانات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کا مفہوم یہ ہے کہ ایک خاص نورجہانی مہر بوزن 500 تولچے کی قیمت 6400 روپیہ تھی۔ طلائی سکوں کے جہانگیری اوزان کے لحاظ سے ایک عام مہر کا وزن 10 ماشہ ہوتا تھا، لہٰذا صحیح مساوات جس کا اشارہ ملتا ہے یہ ہوا ہے کہ 600 مہریں = 6400 روپے یا ایک مہر = $10\frac{2}{3}$ روپے۔ پروفیسر ہودیوالا دیئے ہوئے وزن کو بمقدار وزن اکبری تصور کرتے ہیں، لیکن انہیں یہ تسلیم ہے کہ اس کے نتیجہ میں ایک مہر = 11 روپیہ 12 ر کا جو مساوات قائم ہوتا ہے وہ کچھ بے تکا معلوم ہوتا ہے۔
(Mughal Numismatics, 249)

[4] تزکِ جہانگیری 286 برہان پور میں امسال نصف مہر کی قیمت 5 روپیہ تھی (Factories,1618-21,320)

[5] Pelsert, 29 یہ صحیح ہے کہ اس کے بیانات کو تنقید سے بالاتر تصور نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مہر کا وزن، ایک تولہ یا 12 ماشہ بتاتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہوا کہ یہ مہر نورجہانی تھی۔ لیکن اس سکہ کی ڈھلائی تقریباً 15 برس پہلے بند ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ وہ 7 روپیہ کی قیمت کی، اکبری مہر کا بھی ذکر کرتا ہے (صفحات 7، 29) اور یہ عام مہر کا نصفی سکہ ہی ہو سکتا تھا۔

[6] ان میں سے ہنگری کے "ڈوکٹ" جو قیمت کے لحاظ سے سب سے زیادہ گراں تھے، بقیمت $13\frac{1}{4}$ محمودی (یا $12\frac{1}{2}$ اور 13 روپیہ کے درمیان) فی تولہ فروخت ہوتے تھے (Factories, 1626-9,00-155-6) اور ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ سکہ جو مثل دیگر سکوں کے اپنی دھات ہی کی وجہ سے خریدا جاتا تھا، بمقابلہ مہر کے بہت کم خالص تھا۔ 1628ء میں جب مہر کی قیمت 13 روپیہ تھی تو اس وقت احمد آباد میں ہنگری کا ڈوکٹ ٹھیک 13 روپیہ فی تولہ کی شرح پر فروخت ہوا کرتا تھا۔ (ایضاً، 235)

کردہ بمقدار نئے روپیہ کے ہیں یا پرانے کے جہاں تک مالگذاری زمین کا تعلق ہے، عہد اکبری کے ضابطوں میں "خالص دھات اور پورے وزن" رکھنے والے بادشاہ کے کسی بھی عہد کے سکوں پر منہائی کی ممانعت کا مفہوم یہ ہے کہ مالگذاری کی تشخیص بمقدار 'چلنی' روپیہ ہوتی تھی[1]

مغل اپنے معیاری سکوں کو اپنے پورے حدود مملکت میں نافذ رکھتے تھے اور ان کا یہ عمل تجارت کے نقطۂ نگاہ سے بے حد اہمیت کا حامل تھا[2] پھر بھی بعض علاقوں میں پچھلے وقتوں کے مقامی سکے

(باقی حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

روپیہ کی مندرجہ شرحوں سے کیا جا سکتا ہے۔ سکۂ (عالمگیری) روپیہ کا نرخ بازاری 15 دام۔ $14\frac{7}{8}$ دام، 'چلنی' کا $14\frac{57}{100}$ ـ $14\frac{7}{16}$ ـ $14\frac{5}{6}$ دام تھا۔ (دستاویز دکن 32 ـ 33 تانبہ کے سکوں کی تشریح کے لیے ضمیمہ ہذا کی فصل د کا نوٹ 24 ملاحظہ ہو)

مغلوں کے نظام سکہ کے ایک عمومی جائزہ کے لیے، اس موضوع پر کتاب ہذا کے مصنف کا ایک مقالہ مطبوعہ 'Medieval Indian Quarterly', Aligarh, iv, p. 1-21 ملاحظہ ہو۔

[1] ستائیسویں برس کے ٹوڈرمل کے ضابطوں میں ٹکساٹوں کو نئے سکوں کو پرانے سکوں سے تبدیل کرنے کی ہدایت تھی، لہٰذا کروڑی، فوتہ دار، اور صراف معینہ ضابطوں کے تحت پرانے اور نئے سکوں کو تبدیل کرتے تھے"۔ اس کے بعد منہائی کی جو شرحیں درج ہیں ان میں صرف وزن میں تخفیف کے لیے گنجائش رکھی گئی ہے "جاگیرداروں اور فوتہ داروں" کو ان ضابطوں کی سختی سے پابندی کرنے کی دوبارہ ہدایت دی گئی ہے (ضابطہ کی اصل عبارت اکبرنامہ Add 27247 ورق 332 ب میں ملتی ہے) ابوالفضل کے آخری مسودہ میں، جہاں اس نے ٹوڈرمل کے ضابطوں کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے، صاف طور پر یہ تاکید ملتی ہے کہ "مالگذاری کے محصلین اور صرافوں کو پرانے اور نئے سکوں کے امتیاز کی بنیاد پر منہائیاں نہیں عائد کرنی چاہیے (بب انڈ کے متن میں یہ ممانعت حذف کردی گئی ہے، لیکن Add 26207 ورق 162 الف میں موجود ہے) اکبرنامہ (3) ص $\frac{383}{}$ لیکن ابوالفضل خود ایک دوسرے مقام پر بیان کرتا ہے کہ انتالیسویں برس تک خالصہ اور جاگیرداروں کے محصلین مالگذاری روپیہ تبدیل کرنے والوں کے لیے متعین کیے ہوئے معیار کے مطابق (سکۂ خالص عیراتی) خالص سکے طلب کرتے تھے اور "مستند دھات اور پورے وزن" کے دیگر سکوں پر صرف یابٹہ وصول کرتے تھے۔ لیکن اب اس کی ممانعت کردی گئی تھی۔ (اکبرنامہ (3) ص $\frac{651}{}$ کے مطبوعہ متن میں کلیدی لفظ 'صرف' حذف کردیا گیا ہے، حالانکہ یہ Add 62207 ورق 275 ب اور ان مخطوطات میں سے بیشتر میں جن سے خود اس کے مرتب نے استفادہ کیا ہے موجود ہے۔

[2] سکہ کے موجودہ ذخیروں کی شہادت کے علاوہ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مغل بادشاہ (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

چلتے رہتے تھے، ہر چند کہ سرکاری ٹکسالوں میں ان کی ڈھلائی بند ہو چکی تھی۔ ان میں سب سے زیادہ اہم قدیمے وزنی ملاوٹ والے چاندی کے وہ سکے تھے جو گجرات اور مغربی ہند میں چل رہے تھے اور قیمت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ مالوہ میں تقریباً نصف روپیہ کی قیمت کی مظفریاں[1] اور برار میں 16 داموں یا روپیہ کی $\frac{2}{5}$ قیمت کے چاندی کے ٹنکے چلتے تھے[2]۔ غالباً خاندیش میں ٹنکے صرف حساب کتاب کی اکائیاں تھیں، کیونکہ اکبر نے ان کی قیمتوں کو من مانی طور پر روپیہ کے $\frac{2}{5}$ سے بڑھا کر $\frac{3}{5}$ کر دیا تھا[2]۔ گجرات میں محمودیوں کا سورت کے بڑے بندرگاہ پر استعمال چلتا رہا اور سترھویں صدی کے اوائل میں اس کی قیمتیں روپیہ کے تقریباً $\frac{2}{5}$ کے برابر تھیں، لیکن غالباً اس کی ڈھلائی بند ہو جانے کی وجہ سے اس کی قیمتوں میں روپیہ کے تقریباً $\frac{4}{9}$ تک بڑھ کر پہونچنے کا[3] رجحان پایا جاتا تھا۔

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

مفتوحہ صوبوں کے پرانے سکوں کو جاری نہیں کرتے تھے لاہوری (2) 562 ۔ 3 بھی ملاحظہ ہو جس میں بلخ اور بدخشاں پر 1646 ۔ 47 کے عارضی قبضہ کے دوران وہاں کے مروجہ سکوں کے ساتھ جو استثنائی معاملہ کیا گیا ہے وہاں کے لوگوں کے ساتھ ایک خصوصی رعایت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

[1] یہ اطلاع فرشتہ لکھنؤ ایڈیشن (2) صـ 287 (جس کا ہودی والا نے Mughal Numismatics 350 ـ 351 میں حوالہ دیا ہے) سے ماخوذ ہے۔

[2] آئین اکبری (1) صـ 478، ضوابط عالمگیری 'Ethe' 415 ورق 171 الف 1641 ورق 50 الف Add 6698 ورق 153 الف۔

[3] آئین اکبری (1) صـ 474 ضوابط عالمگیری حوالہ سابقہ میں بھی اسے 12 ٹنکوں یا 24 داموں کے برابر بتایا گیا ہے۔

[4] بگلانہ اور توانگر کے سرداران علی الترتیب 1638ء اور 1640ء تک محمودیاں ڈھالتے رہے۔ موازنہ ہو ہودی والا، حوالہ سابقہ۔

[5] ابو تراب ولی محمودی کو $\frac{5}{12}$ روپیہ کے برابر بتاتا ہے (تاریخ گجرات (تقریباً 1584ء) بب ایڈیشن صـ 27 جس کا حوالہ ہودی والا مذکورہ بالا صـ 125 ـ 6 میں آیا ہے) شروع شروع کے انگریز تجارتی گماشتے اسے $\frac{2}{5}$ روپیہ کے برابر خیال کرتے تھے (مثلاً (Lett. Reed 1, p.306) اور انگریزی حسابات کی منظور شدہ شرح بھی یہی تھی (Factories, 1633-4, p-209) اس کی ولندیزی شرح بظاہر ابو تراب ولی کی قائم کی ہوئی شرح کے مطابق تھی (موازنہ ہو (Pelsert, p-42)

اس کی $\frac{4}{9}$ روپیہ کی نئی شرح بار اول 1636ء میں منظر عام پر آئی۔ اس وقت اس کا (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

فصل 2 روپیہ کی سونے کی مقدار میں قیمت

باب تین کے فصل تین میں زیر مطالعہ عہد کے دوران زرعی قیمتوں کے خصوصی رجحانات کے جائزہ کے سلسلہ میں ہم بمقدار قیمتی دھاتوں کے روپیہ کی قیمت کے مطالعہ کی اہمیت پر اس لیے زور دے چکے ہیں کہ اس سے ہمیں ایسا مواد فراہم ہوگا جس سے ہم روپیہ کی عام قوت خرید میں اہم تبدیلیوں کو اخذ کر سکتے ہیں۔ ہمارا یہ کام اس لیے بہت آسان ہو جاتا ہے کہ چونکہ مغلوں کا نظام زر اس قسم کا تھا جس میں تعداد کی کسی حد بندی کے بغیر انتہائی خالص دھات کے سکے چلا کرتے تھے۔ لہٰذا مہروں وداموں کی روپیہ کی مقدار میں قیمتیں، ان تینوں دھاتوں کی بازاری قیمتوں کے تقریباً مماثل ہوا کرتی تھیں[1] مہر اور روپیہ کی شرح مبادلہ کے ہمعصر اعداد پر غور کرتے وقت ہمیں مختلف علاقوں میں کسی خاص وقت میں ان کے درمیان فرق کے امکانات کو ذہن میں ضرور رکھنا چاہیے۔ لیکن راستوں کے کھلا رہنے کی صورت میں، چونکہ سونے اور چاندی کے حمل نقل میں نسبتاً کم صرف ہوتا تھا، لہٰذا اس فرق کو کم سے کم رکھنے کا رجحان پایا جاتا تھا۔

آئین اکبری کی تحریر کے زمانہ میں مہر ٹھیک نو روپیہ کی مساوی قیمت کی تصور کی جاتی تھی[2] اور اس کی یہ قیمت بظاہر ایک دہائی سے زیادہ مدت تک قائم رہی[3] (1608 - 12 ء) اکبر کی ایک اشرفی

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

حال کے برسوں میں قائم ہوتا بتایا گیا تھا۔ (Factories-1638-1634-1, P.224) کے ایک قطعی بیان کے مطابق انگریزی حسابات کی $2\frac{1}{2}$ محمدی = ایک روپیہ کی کاغذی شرح گمراہ کن تھی، کیونکہ واقعی شرح $2\frac{1}{2}$ تھی (ایضاً 1637 - 41 ص $\frac{91}{}$) لیکن بازاری شرح اور نیز انگریزی کاغذات کی شرح دونوں ہی زیر مطالعہ دور کی بقیہ مدت میں بظاہر تبدیل نہ ہوئیں۔ (ایضاً 1615 - 4 ص $\frac{58}{}$) (Fryer, 11, pp-125-6)

[1] یاد رہے کہ روپیہ اور مہریں دونوں کی قیمتیں ان کے خالص دھات کے وزن سے تھوڑا زیادہ تھیں آئین اکبری (1)، ص $\frac{31}{2}$ میں جہاں ٹکسالوں سے ایک معینہ تعداد میں ڈھلے ہوئے سکے حاصل کرنے کے لیے جس قدر دھات جمع کرنا ہوتا تھا درج ہے، وہاں پر حق شاہی کی مقدار کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔

[2] آئین اکبری (1) 25، 196

[3] ٹوڈر مل کے ضابطے ستائیسویں برس کے تحت $\frac{1}{9}$ مہروں کے وزن کا طلائی سکہ لال جلالی = 400 دانوں کے اور مربع روپیہ 40 اور گول 39 داموں کے برابر تصور کیا جاتا ہے۔ (اکبرنامہ (3) 383 ابتدائی متن Add 27247 ورق 332 ب پر)

کو دس روپیوں کے برابر خیال کرتا تھا[1] اور 1614ء میں اس کی یہی شرح قلم بند کی گئی ہے[2] بقول جہانگیر اس کے عہدِ حکومت کے دسویں برس مہر کی قیمت 7 ر 10 روپیہ تھی[3] لیکن 1621ء میں گھٹ کر یہ دس روپیہ ہو گئی[4]

لیکن اگلے پانچ برسوں میں بمقدار چاندی، سونے کی قیمتیں بیحد بڑھی ہوں گی، کیونکہ 1626ء میں بتایا جاتا ہے کہ ایک مہر 14 روپیہ میں فروخت ہوا کرتی تھی[5] اس سال سورت میں غیر ملکی سونے کے سکوں کی قیمت فروخت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے[6] 1628ء میں جب احمد آباد میں سنیا یا مہر 13 روپیہ اور بعدہٗ صرف 12 3/4 روپیہ سے زائد فروخت نہ ہو سکیں تو اسے سونے کی غیر متوقع

---

1. Early Travels, 101
2. Foster, Supplementary Calender, p.48
3. پروفیسر ہودی والا بادشاہ کے مذکورہ سن کے دو بیانات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کا مفہوم یہ ہے کہ ایک خاص نور جہانی مہر بوزن 500 تولچے کی قیمت 6400 روپیہ تھی۔ طلائی سکوں کے جہانگیری اوزان کے لحاظ سے ایک عام مہر کا وزن 10 ماشہ ہوتا تھا، لہٰذا صحیح مساوات جس کا اشارہ ملتا ہے یہ ہوتا ہے کہ 600 مہریں = 6400 روپے یا ایک مہر = 10 2/3 روپے۔ پروفیسر ہودی والا دیئے ہوئے وزن کو بمقدار وزن اکبری تصور کرتے ہیں، لیکن انہیں یہ تسلیم ہے کہ اس کے نتیجہ میں ایک مہر = 11 روپیہ 12 رکا جو مساوات قائم ہوتا ہے وہ کچھ بے تکا معلوم ہوتا ہے۔ (Mughal Numismatics, 240)
4. تزک جہانگیری 286، برہان پور میں اس سال نصف مہر کی قیمت 5 روپیہ تھی (Factories, 1618-21, 320)
5. Pelsart, 29 یہ صحیح ہے کہ اس کے بیانات کو تنقید سے بالاتر تصور نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مہر کا وزن، ایک تولہ یا 12 ماشہ بتاتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہوا کہ یہ مہر نور جہانی تھی۔ لیکن اس سکہ کی ڈھلائی تقریباً 15 برس پہلے بند ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ وہ 7 روپیہ کی قیمت کی ’اکبری مہر‘ کا بھی ذکر کرتا ہے (صفحہ 7، 29) اور یہ عام مہر کا فصلی سکہ ہی ہو سکتا تھا۔
6. ان میں سے ہنگری کے ’ڈوکٹ‘ جو قیمت کے لحاظ سے سب سے زیادہ گراں تھے بقیمت 13 1/4 محمودی (یا 12 1/2 اور 13 روپیہ کے درمیان) فی تولہ فروخت ہوتے تھے (Factories, 1626-9, 00-155-6) اور ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ سکہ جو مثل دیگر سکوں کے اپنی دھات کی وجہ سے خریدا جاتا تھا بمقابلہ مہر کے بہت کم خالص تھا۔ 1628ء میں جب مہر کی قیمت 13 روپیہ تھی تو اس وقت احمد آباد میں ہنگری کا ڈوکٹ ٹھیک 13 روپیہ فی تولہ کی شرح پر فروخت ہوا کرتا تھا۔ (ایضاً، 233)

ارزانی تصور کی گئی[1] اس سال کی مابعد مدت میں بظاہر سونے کی تقریباً یہی قیمت قائم رہی۔ 1633ء میں جانوروں میں مہریں[2] $12\frac{1}{2}$ روپیہ میں اور 1640ء میں بنگال میں مندرجہ قیمتوں کو تقریباً روپے بتایا گیا ہے[3]

مہر کی قیمت 1641-2ء تک دوبارہ 14 روپیہ پر واپس آگئی[4] اور 1644-5ء[5] اور 1653ء[6] میں اسی شرح کے اندراجات ملتے ہیں۔ اس صدی کی چھٹی دہائی کے اوائل میں اس کی قیمتیں پھر بڑھنا شروع ہوئیں[7] اور ایک مصنف کی یادداشت کے مطابق اورنگ آباد میں 1658ء میں اس کی قیمت $16\frac{2}{5}$ روپیہ تھی[8] مئی 1667ء میں سرکاری طور پر اشرفی کا نرخ بازاری اورنگ آباد میں 14 روپیہ 10 آنہ تا 14 روپیہ 9 آنہ تھا[9] لیکن فروری 1662ء میں صوبہ بیدر میں بمقام رام گیر 15 روپیہ 8 آنہ تا 15 روپیہ بتایا گیا ہے[10] غالباً 1666ء میں اس کا عام نرخ 16 روپیہ تھا[11] اور سورت کے انگریز تجارتی گماشتوں کی شہادت کے بموجب مہر کی قیمت، 1676ء سے کچھ قبل

---

[1] ایضاً 235، 270۔

[2] Mundy, 290 لیکن وہ ایک جگہ (ص 310-11) ان کی قیمتیں بقدار برطانوی سکے بتاتا ہے جس سے ہم ایک مہر = 14 روپیہ کا مساوات نکال سکتے ہیں (موازنہ بہ ہودیوالا، حوالہ سابقہ ص 252)

[3] مینزیق (2)، ص 129،

[4] لاہوری (2) 259 جس کا ہودی والا نے 250 مذکور سابقہ پر حوالہ دیا ہے۔

[5] لاہوری (2) 396 جس کا ہودی والا نے 250 نوٹ مذکورہ سابقہ پر حوالہ دیا ہے۔

[6] Tavernier 246 اور 16-15 بھی۔

[7] دسمبر 1652ء میں سورت کے تجارتی گماشتوں کی سونے کے متعلق پیشن گوئی تھی کہ اس کے گرنے کے بجائے چڑھنے کا زیادہ امکان تھا۔" (Factories, 1651-4, 0-141)

[8] دلکشا، ورق 15 ب۔

[9] وقائع دکن، 32 اشرفی کی قیمتیں چار جوڑوں میں دی گئی ہو۔ ہر ایک کی زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم یعنی عالمگیری اور شاہجہانی اشرفیوں کی بمقدار عالمگیری اور شاہجہانی روپیہ۔ شرحوں کے چاروں جوڑوں میں فرق بہت کم ہے۔ میں نے شرحوں کو بمقدار عالمگیری روپیہ قلم بند کیا ہے

[10] دفتر دیوانی و مالی وغیرہ ص 173، وقائع دکن، 75۔

[11] معموری ورق 136 ب، خافی خاں (2)، 190؛ جس کا ہودی والا نے 250-51 مذکورہ سابقہ و باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر

معمولاً 15 روپیہ رہا کرتی تھی[1] جبکہ بنگال میں اس کی قیمت اس سے قطعاً زیادہ ہو گئی تھی[1الف] مگر 1678ء میں "پورے ہندوستان میں" سونے کے بھاؤ میں یکایک ایک غیر معمولی کمی واقع ہوئی اور مہر کی قیمت گھٹ کر 12 اور 11 روپیہ پر آ گئی۔ بازاری افواہوں کے مطابق قیمت کی اس تخفیف کو اورنگزیب کا اپنی موروثی خزانے کے ذخیرہ کو استعمال کرنا بتایا گیا[2] لیکن جلد ہی اس کی قیمتیں کچھ سنبھلیں کیونکہ اگلے برس، سورت کی شرح $13\frac{3}{4}$ روپیہ فی مہر بتائی جاتی ہے[3]۔ بنگال میں بمقام قاسم بازار 1678ء میں مہروں کی قیمت فروخت 13 روپیہ اور 1679ء میں $12\frac{14}{16}$ روپیہ تھی[4] بمقام سورت، 1679ء میں دوبارہ سونے کی قیمتیں بہت کمی پر آ گئی تھیں[5] اور ساتھ ساتھ بنگال میں مہروں کی شرح میں 2 روپیہ 5 کی کمی کا ہونا بتایا گیا ہے[6] 1680ء میں صوبۂ اجمیر میں اس کا نرخ بازاری 13 روپیہ بتایا گیا[7] جبکہ قاسم بازار میں یہ 13 روپیہ سے کم ہو کر $13\frac{1}{2}$ روپیہ تک آ گئی[8] سورت میں 1681ء میں بھی سونے کا بھاؤ کم رہی رہا[9] اور 1684ء میں

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) حوالہ دیا ہے۔ خافی خاں اس سے تھوڑے قبل کہتا ہے کہ اس وقت مہر 17 روپیہ کے برابر تھی۔ (2، 189) لیکن معموری اس کی تائید نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے تھیونو، 1666-67ء میں مہر اور روپیہ کی بمقدار فرانسیسی لیورے، جو قیمتیں بتاتا ہے ان سے ایک مہر کی قیمت 14 روپیہ ظاہر ہوتی ہے۔

[1] JRAS,1925, p-315

[1الف] Bowery (1669-79) بنگال اور اڑیسہ کے متعلق لکھتا ہے کہ ایک مہر کی مروجہ قیمت $15\frac{1}{4}$ اور $15\frac{1}{2}$ ہے" (ص 217)

[2] (W.Foster's Communication), Factories, NS, 1, 257-8

JRAS 1925, PP. 314-16

[3] Factories, N-S-1, 267

[4] Master, ii, 304 ایک نسخہ کی رو سے جسے متن میں تسلیم کیا گیا ہے، آخر الذکر عدد صرف 12 روپیہ ہو گی

[5] Factories, N.S.,iii,240

[6] ایضاً (4)، 219 غالباً یہ مبالغہ آرائی ہے یا اس سے $2\frac{5}{16}$ فیصدی تو مراد نہیں؟

[7] وقائع اجمیر، 678، 9

[8] Factories, N.S., iv, p-243

[9] ایضاً (3)، 270

بنگال میں مہر کی قیمت فروخت $12\frac{1}{2}$ روپیہ تھی اور اس کے اس سے بھی کم دام لگ رہے تھے[1] غالباً صدی کی اگلی دہائی میں، سونے کی قیمتیں کچھ بڑھیں)۔ آخری دہائی کے اوائل میں بمقام سورت مُہر کی نرخ جاریہ ۱۴ روپیہ تھی[2] اور 1695ء میں مہروں کی قیمت فروخت عام طور پر $13\frac{1}{4}$ روپیہ بتائی گئی[3] اور 1697ء میں سورت کے انگریز اپنے کاغذات میں 13 روپیہ 2 ر فی مہر کی شرح بہا پنے حسابات کرتے تھے[4]

فصل ۵ روپیہ کی بمقدار تانبہ قیمت

دام تانبہ کی قیمت کا ایسا ہی اشاریہ تھا جیسا کہ روپیہ چاندی کی قیمت کا۔ آئین اکبری کی تحریر کے وقت دام سے اس کے وزن کا 15 گنا تانبہ خریدا جا سکتا تھا[5] اور ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ تقریباً یہی نسبت زیر مطالعہ عہد کی باقی مدت تک قائم رہی۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بمقابلہ سونے و چاندی کے اس نسبتاً ادنیٰ دھات کی قیمتوں کے علاقائی فرق کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ حالانکہ وقت کے ساتھ ساتھ سمندری راستہ سے تانبہ کی درآمد کی اہمیت بڑھتی گئی[6] لیکن اس کا بیشتر ذخیرہ اندرون ملک کی خصوصاً اراولی پہاڑیوں کے اتری اور پوربی ڈھلانوں پر واقع کانوں سے فراہم ہوتا تھا[7] اور ملک کی مختلف بازاروں میں اس کی قیمتوں کے فرق کو معین کرنے میں ان

---

[1] ایضاً (4) 342، 353 ـ 4

[2] Orington, 131-2

[3] Careri 253

[4] سورت کے فارسی خطوط I.O. 150، ورق 63 ب

[5] آئین اکبری (1) 33

[6] موازنہ ہو 'Akbar to Aurangzeb', pp. 183-5

[7] صوبہ آگرہ کی سرکار نارنول میں متعدد کانیں تھیں جو سب کی سب اراولی پہاڑی کے پرلے اتری سرے پر گھاٹیوں کے درمیان یا دامن میں واقع تھیں (آئین اکبری (1) 454) وارث (اے) ورق 488 الف (بی) ورق 129 الف سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوٹ میں بھی کانیں تھیں جو (صوبہ آگرہ) کی سرکاری الور میں واقع تھا۔ صوبہ اجمیر میں جن پور میں اور منڈل کے مقابل (سرکار چتور) کے دیگر مقامات پر بھی تانبہ کی کانیں تھیں (آئین اکبری (1) 505 وقائع اجمیر 13)

کانوں سے قربت کو بڑا دخل رہا کرتا تھا[1]

عہد اکبری کے اوائل میں بظاہر تانبہ کی قیمت گر رہی تھی۔ پہلے ایک روپیہ کے[2] 35 دام تھے جو بعد میں 38[3] ہوگئے۔ ستائیسویں سن الٰہی تک 39 داموں کو گول یا عام روپیہ کے اور 40 کو مربع روپیہ کے مساوی تصور کیا جاتا تھا۔[4] لیکن دو برس بعد بغدادی روپیوں کو بھی 40 داموں کے برابر قرار دیا گیا[5] اور آئین اکبری کی تحریر کے وقت اس کی واقعی بازاری شرح میں تقریباً یہی چلتی رہیں[6] حقیقت میں کم از کم عہد جہانگیری کی پہلی دہائی کے خاتمہ تک تانبہ کی قیمتیں خاصی مستحکم رہیں اور انگریزی تجارتی تحریروں میں موجود اندراجات سے پتہ چلتا ہے کہ اسی عہد میں ملک کے وسطی علاقوں میں یا گجرات میں دام کے نرخ بازاری میں حکومت کے معیاری نرخ سے اگر انحراف ہوا بھی تو وہ بالکل برائے نام تھا[7]

---

[1] Tavernier, 1, 23 144ء میں راج محل سے پٹنہ کے سفر کے دوران Marshall جیسے جیسے پچھم کی طرف بڑھتا گیا، ویسے ویسے اس نے تانبہ کی قیمتوں کو کم ہوتا ہوا پایا (Marshall, 116, 121, 122, 125-6)

[2] آئین اکبری (۱) 176

[3] ایضاً 196 مرتب کی اس تجویز کی کہ اصل عبارت میں 38 کے بجائے 48 غلط درج ہے یہاں تقلید کی گئی ہے۔

[4] اکبرنامہ (3) 383 آئین اکبری (۱) 28

[5] آئین اکبری (۱) 28 اس طور پر عہد اکبری میں یکے بعد دیگرے بہ اعتبار روپیہ دام کی چار مروجہ شرحوں کی موجودگی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ٹامس 410 Chroniches اور رائٹ (Coinage, So of the Sultans of Delhi) 384 اس قیاس کے متعلق کہ عہد شیر شاہی میں تانبے اور چاندی کی باہمی نسبت آئین اکبری کی تحریر کے دنوں کے مطابق تھی کیونکہ ضرورت سے زیادہ اعتماد کے ساتھ اپنے مفروضات اور نظریات قائم کرتے ہیں۔

[6] آئین اکبری (۱) 26

[7] انگریز تجارتی گماشتے جب وزن کے بجائے روپیہ پیسہ کا ذکر کرتے ہیں تو پیسہ یا پائیس، وغیرہ سے ان کی مراد نصف دام کی ہوتی ہے۔ 1609ء میں بمقام سورت ایک محمودی کو "32 یا 31 پیسوں کے برابر بتایا گیا ہے جو تانبہ کی قیمت میں نشیب و فراز کے ساتھ تبدیل بھی ہوتا رہتا ہے" (Lett. Recd, 1-34) اور 1611ء میں اس کی قیمت 32 دام تھی (ایضاً (۱) 141) روپیہ کو $2\frac{1}{2}$ محمودی کے برابر تصور کرتے ہوئے، جب محمودی 32 داموں کے برابر تھی تو روپیہ کو ٹھیک 80 پائیس (40 دام) کے برابر ہونا چاہئے تھا لیکن روپیہ کے صرف (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

لیکن 1619ء میں گجرات میں تانبہ کی قیمتوں میں زیادہ مگر ایک غیر متعین اضافہ کا پتہ چلتا ہے[1] یہ اضافہ اس کی شرحوں میں ایک تیز رفتار اور اچھے خاصے چڑھاؤ کی تمہید تھی کیونکہ 1626ء تک آگرہ میں، داموں کے اعتبار سے روپیہ کی قیمت گھٹ کر 29 یا 30 تک آگئی تھی[2] شرح کے اس اضافہ کو اس سے بھی زیادہ واضح طور پر 1628ء اور 1633ء میں گجرات میں قیمتوں کے اندراجات میں دیکھا جا سکتا ہے جن میں روپیہ کی قیمتوں کا اگر زیادہ نہیں تو 35 داموں تک گرنا بتایا گیا ہے[3] 1634ء میں سیوان

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)

$2\frac{2}{5}$ محمودی کے برابر ہونے کی صورت میں، جیسا کہ غالباً بازار میں زیادہ اکثر ہوا کرتا تھا، اس کی قیمت صرف $38\frac{1}{4}$ دام ہوتی رہی ہوگی۔ 1614ء میں بمقام احمد آباد نرخ کو 5 ر 38 یا 7 ر 39 دام فی روپیہ فرض کیا گیا تھا' لیکن اس مراسلہ کے دس دن کے اندر اندر اس کے 42 دام ہونے کی اطلاع دی گئی (Lett. Reed, ii, 214, 249-50) اسی برس آگرہ میں عام روپیہ کی (جس کو وہ 'سوائی' اور 'جہانگیری' سے مختلف بتاتا ہے) 96 سے 102 پیسہ تک کی افلٹ کی بیان کی ہوئی قیمت ضرور غلط ہے (Foster, Supp. Calendar, 48) اس نے محمودی کی قیمت 33 سے 34 پائیس تک بتائی ہے (ایضاً ص 46 بھی) اگلے برس کے شروع میں سورت میں محمودی کی قیمت 34 'پائیس' یا 17 دام پر لگائی گئی (Lett. Reed, iii, p.ii) اور کھمبات میں روپیہ کی قیمت 38 دام تھی (ایضاً 41) انہیں دنوں احمد آباد میں سکّہ کے روپیہ کی قیمت 43 دام بتائی گئی تھی (ایضاً 87) انگریز تجارتی گماشتوں نے اپنے حسابات کے لیے مستقلاً یہ مساوات اختیار کر رکھا تھا۔ ایک محمودی = 32 پائیس، ایک روپیہ = 80 پائیس اس طور پر آخر الذکر مساوات دام کی سرکاری قیمت کے مطابق تھا
(Lett. Reed, iii, 87; Factories, 1633-4, 209; Foyer, ii, 126)

1615ء میں سٹفورڈ، اجمیر سے لکھتا ہے کہ آگرہ میں 'چلنی' روپیہ کی قیمت 83 'پیاز' (Pisas) یا $41\frac{1}{2}$ دام اور 'خزانہ' کی ٹھیک 80 'پیاز' تھی۔ (Lett. Reed, iii, 87)

[1] سورت کے تجارتی گماشتے اس برس تانبہ کو فارس برآمد کرنے کی فکر میں تھے لیکن اس کا نرخ اس قدر گراں تھا کہ انہوں نے 10 من وزن کے پیسوں کو گلانے کا فیصلہ کیا، لیکن سرکاری حکام نے انہیں ایسا نہ کرنے دیا اور انہیں بغیر گلائے ہوئے سکوں ہی کو برآمد کرنا پڑا۔ (Factories, 1618-21, 142, 244)

[2] Pelsaert, 29 60 وہ پہلے تو یہ بتاتا ہے کہ ایک روپیہ = پیسہ یا زائد' اس کے بعد یہ کہ 5 یا 6 ٹکے = 4 یا 5 اسٹایورس (Stivers) جبکہ 24 اسٹایورس کا ایک روپیہ ہوتا ہے۔

[3] 1628ء میں بمقام احمد آباد روپیہ کی قیمت صرف 51 پیسہ یا $25\frac{1}{2}$ دام تھی (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

(سندھ) میں ایک روپیہ کے صرف 24 دام ملتے تھے[1]

1636ء تک گجرات میں چاندی کی قیمتیں قدرے سنبھل گئی تھیں، کیونکہ وہاں روپیہ کے 26 یا 27 داموں کے مساوی بھاؤ کے اندراجات ملتے ہیں[2] آگرہ میں ولندیزی حساب کتاب میں روپیہ کی بمقدار دام شرحیں، جنوری 1637ء میں 25 دام سے مسلسل بڑھتی ہوئی، اکتوبر 1638ء میں 29 دام تک پہونچ گئیں[3] 1640ء میں بمقام راج محل روپیہ کی قیمت بظاہر 28 دام تھی حالانکہ بمقابلہ آگرہ کے وہاں "تانبہ ضرور گراں رہا ہوگا۔[4]

صدی کی اگلی دہائی کے متعلق اطلاعات کی کمی ہے[5] لیکن چھٹی دہائی کے دوران پھر اطلاعات ملنا شروع ہوتی ہے اور یہ مسلسل تانبہ کی قیمت میں حیرت انگیز اضافہ کی نشاندہی کرتی ہیں۔ یہ امر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ قیمتوں کے اس اضافہ کا کم از کم جزوی سبب ار آدلی کی بعض کانوں میں ذخیرہ کی کمی تھی بقول شاہی مورخ کے، بیرٹ اور سنگھانہ کی کانوں سے نکاسی اس قدر زیادہ گھٹ گئی تھی کہ 1655ء میں ان کے نظم و

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

(Factories, 1624-9, p. 235) اور 1633ء میں بمقام سورت "ایک محمودی ابھی کبھی زیادہ کبھی کم 20 "پائیس" (پیسہ) ہوتے تھے (Mundy, 311) اس کی تائید 1636ء میں سورت کے تجارتی گماشتوں کے ایک خط سے بھی ہوتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ گجرات کے قحط کے قبل محمودی 20، 21 اور 22 پائیس (پیسہ) سے زائد کی نہ ہوتی تھی (Factories, 1634-6, 206)

[1] منظر شاہجہانی، 1845 میں دام کو ٹنکہ مرادی تحریر کیا گیا ہے۔

[2] بقول Van Twist, JIH, xvi, 92-3 اس کا بیان ہے کہ ایک محمودی = 24 یا 25 پائیس = 12 یا 13 ٹنکے (یعنی دام)؛ اور ایک روپیہ = 53 یا 54 پائیس = 26 یا 27 ٹنکے۔ سورت کے تجارتی گماشتوں کے قول کے مطابق 1636ء تک محمودی کی قیمت بڑھ کر 25 اور $25\frac{1}{2}$ پائیس ہو گئی تھی (Factories, 1634-6, p. 206)

[3] مورلینڈ نے (Akbar to Aurangzeb, p.148n) میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ اصل میں اعداد حسب پائیس ہیں لیا

[4] Mansique, 11, 102, 136, 174 میں دیئے ہوئے مساوات سے ایسا ظاہر ہوتا ہے۔

[5] چاندی کے ڈلوں کی بمقدار پائیس (پیسہ) فی تولہ دی ہوئی قیمتوں 1646ء و 1647ء کے لیے نتائج اخذ کرنے کی ترغیب ہوتی ہے۔ (Factories, 1646-50, p. 187) لیکن یہ پائیس (پیسہ) جن کو 80 انگریزی تجارتی کوٹھیوں کے حسابات میں ایک روپیہ کے مساوی تصور کرتے تھے بالکل واضح طور پر حساب کتاب میں استعمال ہونے والے نصف دام ہیں۔ لہٰذا قیمتیں جو بیان کی گئی ہیں وہ چاندی کے ڈلوں کی قیمتیں بہ اعتبار چاندی کے سکوں کے ہیں۔

نسق کو تبدیل کرنا لازم ہوگیا[1] اگلے برس سندھ میں روپیہ کی قیمت کے 45 پائیس (پیسہ) یا $22\frac{1}{2}$ دام سے بھی کم کرنے کی اطلاع ہے[2] اور تقریباً 1659ء کے ایک ضوابط نامہ میں اس کی شرح کو 24 دام بتایا گیا ہے[3] 1660ء میں سورت کے تجارتی گماشتے واضح طور پر لکھتے ہیں کہ تانبہ "بے حد گراں تھا"[4] اور اگلے برس سورت کے ایک ولندیزی مراسلہ میں اندرون ملک کانوں میں بدنظمی اور باہری درآمدات کی کمی کو اس کی قلت کا سبب بتایا گیا ہے۔[5] 1661ء میں نئے عالمگیری روپیہ کی شرح بازاری، اورنگ آباد میں 15 - 14 $\frac{7}{5}$ دام اور دولت آباد میں 16 $\frac{3}{10}$ 16 $\frac{9}{50}$ دام[6] اور اگلے برس کے شروع میں صوبہ بدر میں بمقام رام گیر 14 $\frac{1}{2}$ 14 $\frac{1}{2}$ دام بتائی جاتی ہے[7] اسی برس آگے چل کر سورت میں اس کی شرح 16 داموں سے کسر سے زائد ہوگئی[8] اور 1663ء کے اوائل میں 'محمودی' جو پہلے 10 داموں کے برابر تھی 7 دام یا اس سے کم شرح پر آگئی[9] 1665 - 6ء میں "تانبہ اس قدر کمیاب ہوگیا کہ احمد آباد کے صرافوں نے لوہے کا ایک پیسہ جاری کرکے اس کو گراں قیمت پر فروخت کرنا شروع کر دیا" اور زنگ زیب

---

[1] وارث (اے)؛ ورق 488 الف (بی) ورق 129 الف۔ سنگھارہ سرکار نارنول کا ایک محال تھا۔

[2] (Factories, 1655-60, p.78)

[3] دستور العمل عالمگیری، ورق الف میں دام کے لیے بظاہر 'ٹنکہ' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

[4] Factories, 1655-60, p. 308

[5] Moreland, 'Akbar to Aurangzeb', p. 184 میں اس کا حوالہ ملتا ہے۔

[6] وقائع دکن، 32 ۔33، 59 مرتب تانبہ کی قیمتوں کو ٹنکوں اور داموں میں لکھتا ہے۔ چنانچہ قیمت کو ہم نے 14 $\frac{7}{8}$ دام تحریر کیا ہے اسے مطبوعہ نسخہ میں 14 ٹنکہ 43 $\frac{3}{4}$ دام لکھا گیا ہے۔ یاد رہے کہ ضمیمہ ہذا کی فصل ایک کا نوٹ 6 ملاحظہ ہو) تانبہ کے سکوں کے روایتی نظام میں ٹنکہ سب سے بڑی اور دام سب سے چھوٹی اکائی تھی اور ایک ٹنکہ 50 دام کا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں نہ صرف دام کے سکوں کو ٹنکہ کہا گیا ہے بلکہ دام کی اصطلاح کو بھی گرا کر اس کی پرانی حیثیت پر لایا گیا۔

[7] دفتر دیوانی ومال ملکی وغیرہ، 173 ۔ وقائع دکن 75 یہ قیمت از روئے قیاس پرانے داموں میں دی گئی ہے شرحوں کا ایک دوسرا سلسلہ یعنی $19\frac{1}{4}$ اور 19 دام بھی درج کیا گیا ہے۔ ممکن ہے یہ اورنگزیب کے جاری کیے ہوئے ہلکے دام رہے ہوں۔

[8] Factories, 1661-64 112 [9] ایضاً 121

کے ہلکے دام کے سکے ڈھال کر اس صورت حال کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی[1] تھیونو کا بیان ہے کہ وہ جنوری 1626ء میں جب سورت میں اترا تو روپیہ کا نرخ 33½ 'پیچاز' (Pochas) اور اس نے جب فروری 1662ء میں سورت چھوڑا تو یہ 63½ 'پیچاز' تھا۔ اس طور پر نرخ کچھ کم 17 سے گھٹ کر 16 دام سے قدرے زائد ہو گیا۔[2] اسی طور پر تانبہ کی قیمتوں کی جاریہ شرحیں اس دھات کی بے حد قلت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ 1635 میں انگریزوں نے سورت میں تانبہ کو 20 محمودی فی مروّجہ من کی شرح پر خریدا تھا جو اگر بعد کا من اس وقت وہاں رائج رہا ہوتا تو یہ شرح 22 ر 2 محمودی، ہوتی[3] مگر 1660ء میں جاریہ شرح فی 'مانڈ' 45 محمودیوں سے کم نہ تھی[4] 1662ء میں قیمتیں بڑھ کر 22¼ روپیہ ہوگئیں،[5] لیکن 1664ء میں یہ شرحیں 20 سے 22 روپیہ تک[6] اور 1665ء میں 20 روپیہ یا اس سے کم تھیں[7]۔ یہ پھر 1668ء میں جبکہ تانبہ کی مزید مانگ کی ابھی توقع کی جارہی تھی 21½ روپیہ فی من ہو گئی تھیں[8] بنگال میں بھی اضافہ ایسا ہی غیر معمولی رہا کیونکہ وہاں سے بالاسور کے تجارتی گماشتوں نے 1669ء میں مطلع کیا کہ تانبہ کی معمولاً قیمت 36 روپیہ سے 42 روپیہ فی پانڈ تھی (جو سورت کے من کا تقریباً دونا تھا) لیکن فی الوقت یہ 50 روپیہ کی شرح پر فروخت ہو رہا تھا۔"[9] 1671ء میں مارشل نے راج محل اور پٹنہ کے درمیان کے مختلف مقامات پر پائیں' (پیسہ) کی شرحیں بہ اعتبار روپیہ بتائی ہیں اور یہ

---

[1] مرآۃ (۱) ص 265

[2] Thevenst, 25 26 لیکن Tavernier (i) 22 3 کے بیان کے مطابق اس کے "پچھلے سفر کے موقع پر (1665 - 7ء) سورت میں روپیہ کا نرخ، 49 پیسے تھا، لیکن بعض اوقات یہ گھٹ کر 46 ہو جاتا ہے" غالباً اس سے سہو ہوئی ہے اور اس کا مطلب اس سے پہلے کے کسی سفر کا رہا ہوگا کیونکہ وہ ان اطراف میں 1640ء میں سفر کر رہا تھا

[3] Factories, 1634-6, p. 148

[4] Factories, 1655-60, p. 306

[5] Factories, 1661-4, 113

[6] ایضاً 21

[7] Factories, 1665-7, pp. 31, 77

[8] Factories 1668-9, p-24

[9] ایضاً 311 ، موازنہ بہ۔ Bowery, 232-3

ترتیب وار 28، 26، 828، $33\frac{1}{2}$ اور 33 ہیں جن سے ظاہر ہے کہ یہ جیسے جیسے مغرب کی طرف بڑھا شرحیں بھی بڑھتی گئیں [1] بقول اس کے پٹنہ میں روپیہ کا نرخ 30 پائیس تھا[2] اس کے بیانات ظاہر کرتے ہیں کہ اس کے ذہن میں جو 'پائیس' تھا وہ سابق کے پورے دام کے برابر تھا[3] لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعتہً ایسا ہی تھا کیونکہ اگر ایسا تسلیم کر لیا جائے تو اس کے یہ مفہوم ہوں گی کہ تقریباً ایک سال کی مدت میں باعتبار تانبہ روپیہ کی قیمت دوگنی ہو گئی اور اگر اس کا مفہوم نصف دام سے تھا تو پھر یہ سمجھا جائے گا کہ بظاہر تانبہ کی گرانی قائم رہی۔ بہرحال، اس کے فوراً بعد کے کسی آخذ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ نئے عالمگیری سکوں کے اجراء کے عبوری مدت میں ایک الجھن پیدا ہوئی جس سے کم از کم فرائیر بظاہر غلط فہمی کا شکار ہوا[4] اس کے بعد سے صدی کی آخری دہائی تک کوئی اور مواد نہیں ملتا۔ اب جو شرحیں ملتی ہیں وہ از روئے قیاس اور اورنگزیب کے ہلکے داموں کے بمقدار 1691-2ء میں پچھمی ساحلی علاقوں پر 3/21 فی روپیہ[5] اور بمقام سورت 1690-93ء میں 30 (= 1/) [6] اور 1695ء میں 27 ہیں[7] جو بمقدار پرانے داموں کے علی الترتیب 2/14، 20 (= 1) اور 18 ہوئیں۔ ان شرحوں سے یہ قطعی طور پر اشارہ ملتا ہے کہ صدی کی

---

[1] Marshall, 118, 121, 122, 125, 126

[2] ایضاً 416

[3] ایضاً 416 - 17

[4] "پائیس، تانبہ کے سکے کی ایک قسم جسے غریب لوگ استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سے کبھی کبھی 12، 13، 14، 15، 16، 19 سے 14 تک ایک محمودی کے برابر ہوتے ہیں" Fryer, 11, 126.

[5] صادق خاں کا بقیہ نولیس (مصوری)، ورق 183 ب - 184 الف، خافی خاں (2) 401 - 2) 1103ھ کے تحت لکھتا ہے کہ پچھمی سواحل کے پرتگیزی مقبوضات میں چلنے والے سکے یہ تھے: "ایک اشرفی" قیمتی 9 / اناس (Anas) اور ایک بزرک (Buzurk) قیمتی $\frac{1}{4}$ فلوس (دام)" "زرافن" (Zorophin) میں 48 "بوگروکس" (Bugerookes) (یا 24 پائیس) ہوتے تھے۔ (Fryer, 11, 131) [illegible] $\frac{9}{16}$ [illegible] 12 [illegible] ہوں گی۔

[6] Ovington, 132 "60 پائیس کبھی کبھی دو یا تین کم یا زیادہ"

[7] [illegible] 1-233 "[illegible] پیسز (Pecies) جن کے 54 ایک روپی (Roupie) کے برابر ہوتے ہیں"

ساتویں دہائی کے بعد تقریباً بہت ہی تھوڑی تبدیلی ہوئی اور غالباً ہمارا یہ قیاس حق بجانب ہوگا کہ صدی کے اختتام پر تانبہ کے اعتبار سے روپیہ کی قیمتیں بمقابلہ آئین اکبری کی تحریر کے وقت کے تقریباً نصف یا اس سے تھوڑی کم تھیں۔

فصل ۴ ہندوستان میں قیمتوں کا انقلاب

ایک طرف روپیہ کی اور دوسری طرف سونے وتانبہ کے سکوں کی قیمتوں کی درمیانی نسبتوں میں مذکورہ تبدیلیوں سے یہ امر بخوبی واضح ہوتا ہے کہ سترھویں صدی کے دوران چاندی کی قیمتیں سونے اور تانبہ دونوں کی نسبت سے بے حد کم ہوئیں۔ اس مدت میں ہم دیکھتے ہیں کہ چاندی کی قیمتیں دو بار غیر معمولی طور پر بہت کم ہوئیں۔ پہلی کمی صدی کی تیسری دہائی میں پیش آئی جب (آئین اکبری میں مندرج روپیہ کی بمقدار سونا اور تانبہ قیمتیں 100 کی بنیاد پر) سونا (26 16ء میں) بڑھ کر 156 پر اور تانبہ (28 16ء میں) 161 پر پہونچا۔ تھوڑا بہت سنبھلنے کے بعد پھر دوسری کمی صدی کی پانچویں دہائی سے شروع ہو کر ساتویں دہائی تک قائم رہی جبکہ سونا (1666ء میں) 178 پر اور تانبہ (1662ء میں) 276 پر پہونچا۔ آٹھویں دہائی کے اواخر سے چاندی کم از کم بہ اعتبار سونے کے تیزی سے سنبھلنا شروع ہوئی لیکن صدی کے خاتمہ تک دوبارہ سونا 150 پر اور تانبہ 200 سے اوپر پہونچ گیا۔

ہمعصر مآخذ میں چاندی کی قیمتوں کے اس قدر زیادہ گرنے کے اسباب پر کوئی بحث نہیں کی گئی ہے البتہ چھٹی دہائی کے اواخر اور ساتویں دہائی کے اوائل میں تانبہ کی قیمتوں میں اضافہ کا سبب جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے اندرون ملک کانوں میں ذخیرہ کی کمی کو بتایا گیا ہے۔ اسی طور پر 76 16ء میں چاندی کی قیمتوں کو بہ اعتبار سونے کے بحالی کو اورنگزیب کے اپنے مورثوں کے جمع کیے ہوئے سونے کو خرچ کرنے سے منسوب کیا گیا ہے۔ بہرحال اس قسم کی جو توجیہات سامنے آئی ہیں، ہم انہیں ان دھاتوں کی قیمتوں کے محض عارضی نشیب و فراز کے سبب کے طور پر تو تسلیم کر سکتے ہیں، لیکن جہاں تک قیمتوں میں عمومی اضافہ کے رجحان کا تعلق ہے اس کا اصل سبب چاندی کی قیمتوں کا گرنا تھا جس سے سونے اور تانبہ دونوں ہی کی قیمتیں بڑھیں۔ اس حقیقت کو صدی کی تیسری دہائی اور وسطی مدت کے دوران ان دونوں دھاتوں کی قیمتوں کے قریب قریب ہم وقت اضافہ سے بخوبی سمجھا جا تا ہے۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ بمقابلہ سونے کے تانبہ کی قیمتوں میں جو اضافہ ہوا وہ بہت زیادہ تھا۔

جدید مصنفین نے بظاہر اس بات کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا ہے کہ نئی دنیا سے چاندی اور

سونے کی یہ افراط درآمد کا جس نے سولہویں اور سترھویں صدیوں میں یورپ میں قیمتوں کا ایک انقلاب برپا کیا تھا، ہندوستان میں جلد یا بہ دیر ردّ عمل ظاہر ہونا امر لازم[1] تھا۔

حالانکہ امریکی چاندی اور سونے کی درآمد سولہویں صدی کے اوائل ہی سے ہسپانیوں کے آیز ٹیک (Aztecs) اور ان کا (Incens) خاندان کی سلطنتوں کی دولت کو لوٹنے کے بعد سے شروع ہو چکی تھی۔ لیکن یورپ میں قیمتوں کا انقلاب حقیقتاً 1550 کے لگ بھگ بولیویا (Bolivia) اور میکسیکو (mexico) کی "انتہائی زرخیز" چاندی کی کانوں کی دریافت اور ان کی کھدائی سے شروع ہوا[2]۔ امریکی چاندی کی پیداوار 1630ء تک مسلسل بڑھتی رہنے کے بعد زوال پذیر ہونا شروع ہوئی[3]۔ یورپ کو امریکی سونے کی فراہمی بمقابلہ چاندی کے بہت کم تھی[4] لہٰذا اس مدت میں سونے کی قیمتوں میں بمقدار چاندی کے اضافہ ہوا[5]

---

[1] مثلاً مورلینڈ اس پہلو کو بالکل نظر انداز کرتا ہے۔ وہ تانبہ کی قیمتوں میں اضافہ کا ضرور ذکر کرتا ہے، لیکن اس کا ماہر ہے کہ اس کا سبب چاندی سے نہیں بلکہ تانبہ سے متعلق ہے۔" لہٰذا وہ چاندی کی قیمتوں میں عام تخفیف سے انکار کرتا ہے (Akbar to Aurangzeb' 185) اس کا غالباً جزوی سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سونے اور چاندی کی باہمی نسبت کی تبدیلیوں کے متعلق اس کی تحقیقات بالکل سرسری تھیں (ایضاً 182)

قیمتوں کا انقلاب یورپ کی معاشی تاریخ کا ایک معروف واقعہ ہے۔ اسپین میں سولہویں صدی کے دوران (بمقدار چاندی کے) قیمتیں بقدر 400 فیصدی اور برطانیہ میں 1550ء اور 1650ء کی درمیانی مدت میں بقدر 300 فیصدی بڑھیں

'Studies in the Development of Capitalism', London, 1947, p-236n.)

[2] T.M. Parry-'The New Cambridge-Modern History, Cambridge 1958, v-11,p-582

[3] H.Heaton,Economic History of Europe, New York,1948, p-248.

[4] 1521ء اور 1660ء کے درمیان امریکہ سے اسپین میں سرکاری ذرائع سے تقریباً 18 000 ٹن چاندی اور سونا صرف 200 ٹن آیا (ایضاً 249)

[5] ملاحظہ ہو E. Lipson, 'The Economic History of England', London, 1947, vol.111, p.75.

یورپ نے مذکورہ امریکی چاندی اور سونے کے ذخیروں کو سترھویں صدی کے دوران مشرقی ممالک کو پہونچایا۔ کبھی یورپ میں ان بیش قیمت دھاتوں کی مشرقی ممالک کو مسلسل نکاسی نے جس کی جزان صدی کے اختتام تک دس کروڑ پاؤنڈ تک پہونچ گئی تھی ایک شدید نزاعی مسئلہ کی حیثیت اختیار[1] کرلی۔ اس خزانہ کے پانے والوں میں ہندوستان سب سے بڑا حصہ دار تھا۔ 1613ء میں ہاکنس کے بیان کے مطابق "ہندوستان اس وجہ سے چاندی کی افراط ہے کہ تمام دنیا کی قومیں یہاں سکے لے کر آتی ہیں اور اس کے بدلے سامان لے جاتی ہیں[2]"۔ عہد عالمگیری کے اوائل میں پروفیسر نے تجارت کے اس ڈھانچہ کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے جس کے تحت ایسا ممکن ہوا[3]۔ اس قدر تاخیر سے یعنی 1762-3ء میں ایک ہندوستانی مشاہد کے بیان کے مطابق غیر ممالک سے ہندوستان میں خام شکل میں بیش قیمت دھاتوں سے لدے ہوئے جہاز آیا کرتے تھے جو یہاں سے اس کے عوض ٹکسالی قیمتی دھاتیں نہیں، بلکہ صرف سامان لے جایا کرتے تھے[4]۔

بیش قیمت دھاتوں کی مذکورہ افراط آمد کی وجہ سے ہندوستان میں چاندی اور سونے کی قیمتوں کا گرنا لازم تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ 1670-79ء کے دوران ہندوستان میں چاندی کی قیمتوں کو استحکام حاصل ہوا، جیسا کہ 1630ء کے بعد سے امریکی چاندی کی پیداوار میں کمی کے بہ تاخیر نتیجہ کے طور پر توقع کی جاسکتی تھی۔ اسی طور پر سونے کی قیمتیں بہ اعتبار چاندی بڑھ کر اسی نسبتوں پر پہونچ گئیں جو یورپ میں اس سے تھوڑے ہی قبل قائم ہو چکی تھیں۔ چنانچہ جبکہ آئین اکبری کی تحریر کے زمانے کی سونے اور چاندی کی 1 : 5ر9 کی نسبت برطانیہ میں ایلیزبتھ کے عہد کے قانونی تناسب (1 : 12) سے کم تھی، سترھویں صدی کے خاتمہ پر جو نسبت ہندوستان میں قائم ہوئی (1 : 8ر13) وہ بھی برطانیہ میں 1660ء کے بعد کی نسبت (1 : 5ر14) سے پیچھے رہی[5]۔ اس کے

---

[1] تخمینہ اور نزاع کے لیے ملاحظہ ہو ایضاً (2) ص 277-82

[2] Hawkins, "Early Travels', 112

[3] Barrier, 202-4 ملاحظہ ہو Fryer,1, 282-3

[4] آزاد بلگرامی، خزانۂ عامرہ، ص 111۔

[5] اس موازنہ کے سلسلہ میں، اس ضمیمہ میں مندرج روپیہ اور مہر کی قیمتوں کی نسبت کو استعمال میں لایا گیا ہے۔ لیکن انہیں قیمتی دھاتوں کی نسبتوں میں تحویل کرتے وقت، ان دونوں (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

سونے کی بہ افراط درآمد کا جس نے سولہویں اور سترھویں صدیوں میں یورپ میں قیمتوں کا ایک انقلاب برپا کیا تھا، ہندوستان میں جلد یا بہ دیر ردّ عمل ظاہر ہونا امر لازم[1] تھا۔

حالانکہ امریکی چاندی اور سونے کی درآمد سولہویں صدی کے اوائل ہی سے ہسپانیوں کے آیز ٹیک (Aztecs) اور ان کا (Incens) خاندان کی سلطنتوں کی دولت کو لوٹنے کے بعد سے شروع ہو چکی تھی۔ لیکن یورپ میں قیمتوں کا انقلاب حقیقتاً 1550 کے لگ بھگ بولیویا (Bolivia) اور میکسیکو (mexico) کی "انتہائی زرخیز" چاندی کی کانوں کی دریافت اور ان کی کھدائی سے شروع ہوا[2]۔ امریکی چاندی کی پیداوار 1630ء تک مسلسل بڑھتی رہنے کے بعد زوال پذیر ہونا شروع ہوئی[3]۔ یورپ کو امریکی سونے کی فراہمی بمقابلہ چاندی کے بہت کم تھی[4] لہٰذا اس مدت میں سونے کی قیمتوں میں بمقدار چاندی کے اضافہ ہوا[5]

---

[1] مثلاً مورلینڈ اس پہلو کو بالکل نظر انداز کرتا ہے۔ وہ تانبہ کی قیمتوں میں اضافہ کا ضرور ذکر کرتا ہے، لیکن اس کا ماحصل ہے کہ اس کا سبب چاندی سے نہیں بلکہ تانبہ سے متعلق ہے" لہٰذا وہ چاندی کی قیمتوں میں عام تخفیف سے انکار کرتا ہے (Akbar to Aurangzeb' 186) اس کا غالباً جزوی سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سونے اور چاندی کی باہمی نسبت کی تبدیلیوں کے متعلق اس کی تحقیقات بالکل سرسری تھیں (ایضاً 182)

قیمتوں کا انقلاب یورپ کی معاشی تاریخ کا ایک معروف واقعہ ہے۔ اسپین میں سولہویں صدی کے دوران (بمقدار چاندی کے) قیمتیں بقدر 400 فیصدی اور برطانیہ میں 1550ء اور 1650ء کی درمیانی مدت میں بقدر 300 فیصدی بڑھیں 'Studies in the Development of Capitalism', London, 1947, p-236n.)

[2] T.M. Parry-'The New Cambridge-Modern History, Cambridge 1958, v-ii,p-582

[3] H.Heaton,Economic History of Europe, New York,1948, p-248.

[4] 1521ء اور 1660ء کے درمیان امریکہ سے اسپین میں سرکاری ذرائع سے تقریباً 18 000 ٹن چاندی اور سونا صرف 200 ٹن آیا (ایضاً 249)

[5] ملاحظہ ہو E. Lipson, 'The Economic History of England', London, 1947, vol.iii, p.75.

یورپ نے مذکورہ امریکی چاندی اور سونے کے ذخیروں کو سترھویں صدی کے دوران مشرقی ممالک کو پہونچایا۔ پچھمی یورپ میں ان بیش قیمت دھاتوں کی مشرقی ممالک کو مسلسل نکاسی نے جس کی میزان صدی کے اختتام تک دس کروڑ پاؤنڈ تک پہونچ گئی تھی ایک شدید نزاعی مسئلہ کی حیثیت اختیار[1] کرلی۔ اس خزانہ کے پانے والوں میں ہندوستان سب سے بڑا حصہ دار تھا۔ 1613ء میں ہاکنس میں بیان کے مطابق "ہندوستان اس وجہ سے چاندی کی افراط ہے کہ تمام دنیا کی قومیں یہاں سکے لے کر آتی ہیں اور اس کے بدلے سامان لے جاتی ہیں[2]۔" عہد عالمگیری کے اوائل میں پروفیسر نے تجارت کے اس ڈھانچہ کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے جس کے تحت ایسا ممکن ہوا[3]۔ اس قدر تاخیر سے یعنی 1762-3ء میں ایک ہندوستانی مشاہد کے بیان کے مطابق غیر ممالک سے ہندوستان میں خام شکل میں بیش قیمت دھاتوں سے لدے ہوئے جہاز آیا کرتے تھے جو یہاں سے اس کے عوض ٹکسالی قیمتی دھاتیں نہیں، بلکہ صرف سامان لے جایا کرتے تھے[4]۔

بیش قیمت دھاتوں کی مذکورہ افراط آمد کی وجہ سے ہندوستان میں چاندی اور سونے کی قیمتوں کا گرنا لازم تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ 1670-79ء کے دوران ہندوستان میں چاندی کی قیمتوں کو استحکام حاصل ہوا، جیسا کہ 1630ء کے بعد سے امریکی چاندی کی پیداوار میں کمی کے بہ تاخیر نتیجہ کے طور پر توقع کی جا سکتی تھی۔ اسی طور پر سونے کی قیمتیں بہ اعتبار چاندی بڑھ کر اسی نسبتوں پر پہونچ گئیں جو یورپ میں اس سے تھوڑے ہی قبل قائم ہو چکی تھیں۔ چنانچہ جبکہ آئین اکبری کی تحریر کے زمانے کی سونے اور چاندی کی 1 : 5ر9 کی نسبت برطانیہ میں ایلیزبتھ کے عہد کے قانونی تناسب (1 : 12) سے کم تھی، سترھویں صدی کے خاتمہ پر جو نسبت ہندوستان میں قائم ہوئی (1 : 8ر13) وہ بھی برطانیہ میں 1660ء کے بعد کی نسبت (1 : 5ر14) سے پیچھے رہی[5]۔ اس کے

---

[1] تجزیہ اور نزاع کے لیے ملاحظہ ہو ایضاً (2) صفحہ 277-82

[2] Hawkins, "Early Travels', 112

[3] Barrier, 202-4 ملاحظہ ہو Fryer, 1, 282-3

[4] آزاد بلگرامی، "خزانۂ عامرہ"، صفحہ 111۔

[5] اس موازنہ کے سلسلہ میں، اس ضمیمہ میں مندرج روپیہ اور مہر کی قیمتوں کی نسبت کو استعمال میں لایا گیا ہے۔ لیکن انہیں قیمتی دھاتوں کی نسبتوں میں تحویل کرتے وقت، ان دونوں (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

سونے کی بہ افراط درآمد کا جس نے سولہویں اور سترھویں صدیوں میں یورپ میں قیمتوں کا ایک انقلاب برپا کیا تھا، ہندوستان میں جلد یا بہ دیر ردّ عمل ظاہر ہونا امر لازم[1] تھا۔

حالانکہ امریکی چاندی اور سونے کی درآمد سولہویں صدی کے اوائل ہی سے ہسپانیوں کے آیز ٹیک (Aztecs) اور ان کا (Incens) خاندان کی سلطنتوں کی دولت کو لوٹنے کے بعد سے شروع ہو چکی تھی۔ لیکن یورپ میں قیمتوں کا انقلاب حقیقتاً 1550 کے لگ بھگ بولیویا (Bolivia) اور میکسیکو (mexico) کی "انتہائی زرخیز" چاندی کی کانوں کی دریافت اور ان کی کھدائی سے شروع ہوا[2]۔ امریکی چاندی کی پیداوار 1630ء تک مسلسل بڑھتی رہنے کے بعد زوال پذیر ہونا شروع ہوئی[3]۔ یورپ کو امریکی سونے کی فراہمی بمقابلہ چاندی کے بہت کم تھی[4]۔ لہٰذا اس مدت میں سونے کی قیمتوں میں بمقدار چاندی کے اضافہ ہوا[5]۔

---

[1] مثلاً مورلینڈ اس پہلو کو بالکل نظرانداز کرتا ہے۔ وہ تانبہ کی قیمتوں میں اضافہ کا ضرور ذکر کرتا ہے، لیکن اس کا اصرار ہے کہ اس کا سبب چاندی سے نہیں بلکہ تانبہ سے متعلق ہے" لہٰذا وہ چاندی کی قیمتوں میں عام تخفیف سے انکار کرتا ہے (Akbar to Aurangzeb' 185) اس کا غالباً جزدی سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سونے اور چاندی کی باہمی نسبت کی تبدیلیوں کے متعلق اس کی تحقیقات بالکل سرسری تھیں (ایضاً 182)

قیمتوں کا انقلاب یورپ کی معاشی تاریخ کا ایک معروف واقعہ ہے۔ اسپین میں سولہویں صدی کے دوران (بمقدار چاندی کے) قیمتیں بقدر 400 فیصدی اور برطانیہ میں 1550ء اور 1650ء کی درمیانی مدت میں بقدر 300 فیصدی بڑھیں 'Studies in the Development of Capitalism', London, 1947, p-236n.)

[2] T.H. Parry-'The New Cambridge-Modern History, Cambridge 1958, v-11,p-582

[3] H. Heaton, Economic History of Europe, New York, 1948, p-248.

[4] 1521ء اور 1660ء کے درمیان امریکہ سے اسپین میں سرکاری ذرائع سے تقریباً 18000 ٹن چاندی اور سونا صرف 200 ٹن آیا (ایضاً 249)

[5] ملاحظہ ہو E. Lipson, 'The Economic History of England', London, 1947, vol.iii, p.75.

یورپ نے مذکورہ امریکی چاندی اور سونے کے ذخیروں کو سترھویں صدی کے دوران مشرقی ممالک کو پہونچایا۔ پچھمی یورپ میں ان بیش قیمت دھاتوں کی مشرقی ممالک کو مسلسل نکاسی نے جس کی میزان صدی کے اختتام تک دس کروڑ پاؤنڈ تک پہونچ گئی تھی ایک شدید نزاعی مسئلہ کی حیثیت اختیار[1] کرلی۔ اس خزانہ کے پانے والوں میں ہندوستان سب سے بڑا حصہ دار تھا۔ 1613ء میں ہاکنس کے بیان کے مطابق "ہندوستان اس وجہ سے چاندی کی افراط ہے کہ تمام دنیا کی قومیں یہاں سکّے لے کر آتی ہیں اور اس کے بدلے سامان لے جاتی ہیں[2]۔" عہدِ عالمگیری کے اوائل میں پروفیسر نے تجارت کے اس ڈھانچہ کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے جس کے تحت ایسا ممکن ہوا[3]۔ اس قدر تاخیر سے یعنی 1762-3ء میں ایک ہندوستانی مشاہد کے بیان کے مطابق غیر ممالک سے ہندوستان میں خام شکل میں بیش قیمت دھاتوں سے لدے ہوئے جہاز آیا کرتے تھے جو یہاں سے اس کے عوض ٹکسالی قیمتی دھاتیں نہیں، بلکہ صرف سامان لے جایا کرتے تھے[4]۔

بیش قیمت دھاتوں کی مذکورہ افراط آمد کی وجہ سے ہندوستان میں چاندی اور سونے کی قیمتوں کا گرنا لازم تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ 1670-79ء کے دوران ہندوستان میں چاندی کی قیمتوں کو استحکام حاصل ہوا، جیسا کہ 1630ء کے بعد سے امریکی چاندی کی پیداوار میں کمی کے بہ تاخیر نتیجہ کے طور پر توقع کی جا سکتی تھی۔ اسی طور پر سونے کی قیمتیں بہ اعتبار چاندی بڑھ کر اسی نسبتوں پر پہونچ گئیں جو یورپ میں اس سے تھوڑے ہی قبل قائم ہو چکی تھیں۔ چنانچہ جبکہ آئینِ اکبری کی تحریر کے زمانے کی سونے اور چاندی کی 1: 9.5 کی نسبت برطانیہ میں ایلیزبتھ کے عہد کے قانونی تناسب (1: 12) سے کم تھی، سترھویں صدی کے خاتمہ پر جو نسبت ہندوستان میں قائم ہوئی (1: 13.8) وہ بھی برطانیہ میں 1660ء کے بعد کی نسبت (1: 14.5) سے پیچھے رہی[5]۔ اس کے

---

[1] تجزیہ اور نزاع کے لیے ملاحظہ ہو، ایضاً (2) ص 277-82

[2] Hawkins, "Early Travels', 112

[3] Barrier, 202-4 ملاحظہ ہو Fryer, i, 282-3

[4] آزاد بلگرامی، خزانۂ عامرہ، ص 111۔

[5] اس موازنہ کے سلسلہ میں، اس ضمیمہ میں مندرج روپیہ اور مہر کی قیمتوں کی نسبت کو استعمال میں لایا گیا ہے۔ لیکن انہیں قیمتی دھاتوں کی نسبتوں میں تحویل کرتے وقت، ان دونوں (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

ساتھ ساتھ یورپ سے سونے کی درآمد نے یہاں اس کی عام قیمتوں کو ضرور گرایا ہوگا[1] حالانکہ تخفیف بلاشبہ چاندی کی قیمتوں میں تخفیف کے بالمقابل بہت کم رہی ہوگی۔

اس طور پر واضح ہوتا ہے کہ ان تینوں قیمتی دھاتوں میں تانبہ کی قیمتوں کو سب سے زیادہ استحکام حاصل رہا۔ ہندوستان میں اس کی زیادہ مقدار میں درآمد تو درکنار، سترھویں صدی کے اوائل میں انگریزوں نے خود یہاں سے فارس کو تانبہ برآمد کیا[2] تانبہ کی قیمتوں کا استحکام، سترھویں صدی کے دوران عام قیمتوں کے رجحانات کا اندازہ لگانے کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ سونے کی نہیں بلکہ تانبہ کی قیمتیں روپیہ کی قوت خرید میں تبدیلیوں کی زیادہ صحیح طور پر عکاسی کرتی تھیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)
سکوں کے وزن میں فرق کے لحاظ سے تطبیق کرنی پڑی۔ برطانیہ میں قانونی تناسبوں کے سلسلے میں ملاحظہ ہو Lipson حوالہ سابقہ (3) ص 75

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندوستان کو سونے کی برآمدات کے سلسلے میں ملاحظہ ہو۔ Lipson حوالہ سابقہ (2) ص 278 چونکہ ملک کے اندر سونے کی پیداوار برائے نام تھی، لہٰذا اس کی اندرون ملک کی فراہمی میں تبدیلیاں اس کی قیمت پر اثر انداز نہ ہو سکتی تھیں (ملاحظہ ہو آئین اکبری (1) ص 32 Fryer, 1, 283 'Binnier, 205.

[2] Factories, 1618-21, pp. 114, 142, 144 'Factories' میں جاپان سے ہندوستان میں تانبہ کی درآمد کا بموجب اشاریہ پہلا حوالہ، 1622 - 23 ، ص 260 پر ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو Akbar to Aurangzeb 184 بھی۔

ضمیمہ - د

جمع و حاصل کے شماریات

فصل - ا - جمع

زیر مطالعہ عہد کے متعلق آئین اکبری ایسے تفصیلی اعداد و شمار کہیں اور نہیں ملتے۔ البتہ سترھویں صدی کی تصانیف میں مملکت کے مختلف صوبوں کے 'جمع دامی' کے بہ کثرت گوشوارے ضرور محفوظ ہیں، جو نہایت غیر متوقع مقامات پر یعنی بعض انتظامی ضوابط ناموں، تاریخی تصانیف، سیاحوں کے تذکروں اور صرف ایک واحد صورت میں تو امور خانہ داری کی ایک انتظامی تحریر میں بھی پائے جاتے ہیں۔

سب سے پہلے طامس نے ان گوشواروں کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا[1] اور اس کے بعد سرکار[2] اور مورلینڈ[3] ان کے نقش قدم پر چلے۔ حالانکہ ان کی فراہم کی ہوئی اطلاعیں کم نہیں ہیں،

---

[1] Edward Thomas, 'The Chronicle of the Pathan Kings of Delhi', London, 1871, pp. 431-431-50
'The Revenue Resources of the Mughal Empires in India,
London, 1871.

[2] 'The India of Aurangzeb', pp. xxix.

[3] 'Akbar to Aurangzeb', pp. 32[illegible]-[illegible]8

پھر بھی متعدد ماخذ ایسے ہیں جن سے انہوں نے رجوع نہیں کیا۔ چنانچہ ان سے معلومات کو اخذ کرکے ان میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ اس کے ان گوشواروں کی تاریخی ترتیب بھی نظرثانی کی محتاج معلوم ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض کی تاریخیں تو خود کم و بیش قطعی طور پر ان کے ماخذ میں ملتی ہیں[1]، لیکن بیشتر کی صحیح تاریخوں کے واضح اشارات نہیں ملتے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ جمع کے اعداد متعلقہ سنوات کی وصولی کو نہیں بلکہ معیاری تشخیص کو ظاہر کرتے ہیں۔ ٹامس اور مورلینڈ دونوں ان بلا تاریخ کے گوشواروں کو عموماً ان کتابوں کے زمانۂ تصنیف سے منسوب کرتے ہیں جن میں وہ درج ہیں۔ اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ وہ ہمارے ماخذ میں نقل کیے جانے کے وقت ہی خواہ وہ نیم سرکاری تحریروں سے حاصل کردہ ہوں، خواہ سابقہ تصانیف سے، متروک ہو رہے ہوں۔ ایسی صورت میں، ان تحریروں کی تاریخوں سے ہم صرف اس قدر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ گوشوارے کم از کم ان کی بعد کی مدت کے نہیں ہو سکتے۔

ان حالات میں ان گوشواروں کی تاریخیں معین کرنے کے سلسلہ میں صرف ان کی داخلی شہادتوں ہی پر اعتماد کیا جا سکتا ہے مثلاً ان میں بعض صوبوں کی شمولیت یا عدم شمولیت سے ہمیں معنی خیز اشارات بہم پہونچتے ہیں۔ چنانچہ جس گوشوارہ میں تلنگانہ کے اعداد موجود ہوں وہ 1656ء کے قبل ہی مرتب کیے گئے ہوں گے (مگر غالباً 1633ء کے قبل نہیں) کیونکہ یہ 1656ء میں ظفر آباد بیدر کے نئے صوبہ کی تشکیل کے بعد اس میں ضم کر دیا گیا تھا۔[2] اسی طور پر چونکہ بنگلانہ بحیثیت ایک علیحدہ صوبہ کے صرف 1658ء سے 1658ء تک کی دو دہائیوں کے دوران قائم رہا[3] لہٰذا جس گوشوارے میں اس کے

---

[1] آئین اکبری (1)، صفحہ 286 میں واضح کیا گیا ہے کہ 'آئین دہ سالہ' کے شماریات، سن الٰہی کے چالیسویں برس کے ہیں۔ اقبالنامہ (2) Or 1834 ورق 231 ب میں ان شماریات کے متعلق بتایا گیا ہے کہ یہ 1605ء میں جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد اس کے حضور میں پیش کیے گئے تھے اور اسی طور پر جگجیون داس (Add 53 262، ورق 51 الف) کے قول کے مطابق اس کے نقل کیے ہوئے اعداد و شمار مال تخت نشینی کی جنگ کے بعد یعنی 1709ء یا اس کے قریبی دنوں میں بہادر شاہ اول کے رو برو پیش کیے گئے تھے۔

[2] دستور العمل شاہنشاہی اوراق 79 الف۔ 89 الف۔ تلنگانہ، آئین اکبری میں صوبۂ برار کے ایک سرکار کی حیثیت سے اور بار اول محض عہد شاہجہانی میں بحیثیت ایک علیحدہ صوبہ کے دکھایا گیا ہے (موازنہ ہو لاہوری (1) (2) صفحہ 3-62، 205، (2) صفحہ 712)۔

[3] موازنہ ہو صادق خاں - Or 174 اوراق 60 ب۔ 60 الف، 87 ب۔ 88 الف۔ 1671، اوراق 34 الف۔ 48 الف۔

امداد پائے جاتے ہوں وہ اسی مدت میں درمیان کے ہوسکتے ہیں۔ بلخ اور بدخشاں پر 1646ء میں عارضی طور پر قبضہ ہوا تھا، لہٰذا کسی گوشوارہ کی تاریخ ان کی شمولیت کی بنا پر اور بھی زیادہ صحیح طور پر متعین کی جاسکے گی، لیکن قندھار کی شمولیت کو یہ قطعیت نہیں حاصل ہوسکتی، کیونکہ غالباً 1653ء کے آخری محاصرہ کے بعد بھی اسے مملکت کا ایک جزو تصور کیا جاتا رہا۔ آخر میں صوبجات بیجاپور اور حیدرآباد کے علی الترتیب 1686ء و 1687ء میں شامل کیے جانے سے گوشواروں کی تاریخ متعین کرنے میں مدد لے جاسکتی ہے۔ گوشواروں میں مندرج ہر صوبہ کے سرکاروں اور محالوں کی تعداد سے بھی کچھ مدد ملتی ہے۔ مثلاً خاندیش میں 1632ء تک صرف ایک سرکار تھی پھر اس میں گالنہ کا بحیثیت ایک علیحدہ سرکار کے اضافہ کیا گیا[1] اس کے بعد 1633ء کے اختتام تک اس میں مالوہ کی دو مسلّم سرکاریں اور تیسری کا ایک بڑا جزو شامل کرکے اس کے علاقہ کی مزید توسیع کی گئی[2] لہٰذا کوئی گوشوارہ جس میں خاندیش میں تین یا اس سے زائد سرکاریں دکھائی گئی ہوں 1633ء سے پہلے کا نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح، ہمارے علم میں ہے کہ 1659ء کے کچھ قبل آگرہ کی دو سرکاروں کو دہلی منتقل کیے جانے سے آگرہ کی سرکاروں کی تعداد 14 سے گھٹ کر 12 ہوگئی تھی[3] لہٰذا کوئی گوشوارہ جس میں آگرہ میں 5 سرکاریں دکھائی گئی ہوں عہد عالمگیری سے قبل ہی کا ہوسکتا ہے۔ ناموں کی تبدیلیوں سے بھی تاریخ کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔ 1629ء میں آگرہ کو اکبرآباد[4] کا اور 1648ء میں دہلی کو شاہجہان آباد[5] کا نیا نام دیا گیا تھا۔

---

[1] صادق خاں، Or. 174 ورق 60 الف۔ب، Or. 1671 اوراق 33 ب 34 الف اور دستور العمل شاہنشاہی ورق 28 الف بھی۔

[2] لاہوری (1) (2) ص 62-3 اور صادق خاں مذکورالصدر بھی۔

[3] جو سرکاریں منتقل کی گئیں وہ تجارہ اور نارنول کی تھیں۔ یہ آئین اکبری اور اقبالنامہ میں آگرہ کے تحت مگر دستور العمل عالمگیری ورق 109 ب میں دہلی کے تحت درج ہیں۔ آخرالذکر تصنیف 1659ء میں مرتب کی گئی تھی لیکن چونکہ اس کے اعداد وشمار میں تلنگانہ کو ایک علیحدہ صوبہ کے طور پر دکھایا گیا ہے لہٰذا یہ 1656ء میں یا اس سے تھوڑا قبل جمع کیے گئے ہوں گے۔ چہار گلشن، ورق ب۔ سرکار 125-6 میں ان دو سرکاروں کے دہلی کے تحت شامل کیے جانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی منتقلی مستقلاً تھی۔

[4] صادق خاں Or. 174 ورق 9 الف۔ Or. 1671 ورق 5 ب

[5] ایضاً Or. 174 اوراق 155 الف، 156 ب۔ 157 الف۔ Or. 1671 اوراق 79 الف 80 الف

1636ء میں احمدنگر کے پرانے صوبہ کا نام پہلے دولت آباد[1] اور بعد میں اورنگ آباد رکھا گیا۔ پہلے کی فہرست میں کاتب یا نقل کرنے والا بعد کا نام تو لکھ سکتا ہے لیکن بعد کی مدت کے کسی گوشوارہ میں قبل کے نام لکھے جانے کے امکانات نہیں پائے جاتے۔

جگہ کی کمی جمع کے ہر قابل حصول گوشوارہ کی تاریخ پر فرداً فرداً بحث کی متحمل نہیں ہو سکتی مگر مذکورہ بالا اشارات کی مدد سے ہم نے ان گوشواروں میں سے بیشتر کی معقول طور پر تنگ مدبندیاں کی ہیں جو ایک تاریخی ترتیب کے ساتھ فہرست ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

نمبر شمار	تاریخ	ماخذ
1	1595-6ء	آئین اکبری (1) ص 386 و ما بعد اوراق
2	1605ء	اقبال نامہ جہانگیر (2) Or. 1834 اوراق 231 ب 232 ب
3	قبل 1627ء	مجالس السلاطین، Or. 1903 ، اوراق 114 الف 115 ب
4	1635-1648ء	بیاض خوشبوئی ، I.O. 828 اوراق 180 الف 181 الف
5	1633-38ء	فرہنگ کاروانی، علیگڑھ مخطوطہ عبدالسلام فارسیہ 85/315 اوراق 19 الف 20 ب
6	1646-47ء	Add. 16863 ، اوراق 120 الف- 121 الف
7	ایضاً	لاہوری (2) ص 709-12
8	ایضاً	صادق خان، Or 174 ، ورق 151 الف۔ب 1671 ، ورق 77 الف۔ب
9	1638-56ء	Bernier 445-8
10	ایضاً	Thevenot میں مختلف مقامات پر۔
11	ایضاً	Or. 1840 ، اوراق 138 الف۔ 140 الف
12	ایضاً	دستورالعمل نویسندگی، اوراق 143 الف۔ 144 ب
13	ایضاً	Bodl. Ouseley 390 اوراق 9 الف۔ 30 الف
14	ایضاً	سوجان رائے میں مختلف مقامات پر

[1] لاہوری (2) ص 712 معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری طور پر صرف 'دکن' کے صوبہ کے نام سے موسوم تھا (موازنہ کیجئے Selected Documents, C.p.168, A.D. 1645

نمبر شمار	تاریخ	مآخذ
15	ایضاً	Mannica 2، 15 - 413
16	"	فرہنگ کاروانی وکاراموزی Edinburgh 83 اوراق 16 ب 17 الف
17	"	سیاق نامہ 104 - 102
18	1648 - 56ء	دستورالعمل نویسندگی، اوراق 166 ب۔ 167 ب
19	تقریباً 1656	دستورالعمل عالمگیری، اوراق 109 الف ۔ 120۔
20	تقریباً 1667	مراۃ العالم، Add 7657، اوراق 445 ب۔ 446 الف۔ علی گڑھ مخطوطہ اوراق 214 ب۔ 215 ب۔
21	1687 تقریباً 1691ء	ضوابط عالمگیری .Add 6598، اوراق 130 ب۔ 138 الف Or 1641، اوراق 4 الف۔ 6 ب
22	1687 تقریباً 1695ء	Fraser 86، اوراق 57 ب۔ 61 الف۔
23	1687	انتخاب دستورالعمل پادشاہی Edinburgh نمبر 224 اوراق 1 ب۔ 3 ب 3 الف 11 ب۔
24	تقریباً 1709	جگجیون داس، منتخب التواریخ، Add 26-353 اوراق 51 الف 54 الف

فہرست بالا کے بعض اندراجات خصوصی وضاحت کے محتاج ہیں۔ اندراجات نمبر شمار 2 و 3 اپنے بیان کردہ اعداد کو 'حاصل' یا 'حال حاصل' کا نام دیتے ہیں لیکن یہ اعداد روپیوں میں نہیں بلکہ داموں میں درج ہیں لہٰذا یہ غالباً واقعتہً جمع کے ہیں اور 'حاصل' کا لفظ یہاں غلط طور پر استعمال کیا گیا ہے نمبر شمار 6 کے اندراج کے ساتھ تو یہ صورت لازمی طور پر ہے کیونکہ اس میں جمع کے اعداد کو داموں میں قلمبند کرنے کے بعد، حاصل کے اعداد کو روپیوں میں دکھایا گیا ہے حالانکہ مؤخر الذکر اعداد اول الذکر کے بالکل مساوی ہیں۔

نمبر شمار 9، 10 اور 15 غیر ملکی سیاحوں کے تذکروں میں محفوظ ہیں ان اندراجات

کے بارے میں یہاں یہ قیاس کر لیا گیا ہے کہ یہ بالآخر کسی 'جمع رائی' کے گوشوارہ سے ماخوذ ہیں حالانکہ اس کا کوئی قطعی ثبوت بہم نہیں پہونچتا۔ نمبر 9 اور 15 کے اعداد روپیوں میں اور نمبر 10 کے 'لیورے' میں ہیں اور موازنہ کی سہولیتوں کے خاطر ان میں سے ہر ایک کو داموں میں تحویل کر لیا گیا۔[1]

اگلے صفحات میں مملکت اور مختلف صوبوں کے 'جمع' کے اعداد مذکورہ بالا شماریات سے قلم بند کیے گئے ہیں دیگر ماخذ سے ضمنی طور پر حاصل کردہ اطلاعات بھی ان میں شامل کر لی گئی ہیں۔[2] بہ استثنا آئین اکبری بقیہ دیگر ماخذ کے اعداد مملکت کو ان کے صوبہ کے اعداد کی میزان سے ملانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ صوبجات کابل، قندھار، بلخ اور بدخشاں کے شماریات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا فہرست کے ماخذ کا حوالہ ان کے نمبر شمار سے دیا گیا ہے۔

مملکت کی جمع

ماخذ	سنہ	رقم داموں میں
آئین اکبری (1) ص 386	1580ء	3629755246
طبقات اکبری (3) ص 546	1593ء[4]	4406000000

[1] 'لیورے' کو داموں میں تحویل کرتے وقت خود Thevenot کا مساوات ایک روپیہ = 5/1 1 لیورے (ص 25-26) کام میں لایا گیا ہے Mundy کے اعداد (نمبر شمار 15) بظاہر عہد شاہجہانی کے کہن گوشوارہ کی بیشتر نقل معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ان میں بنگالہ کی جداگانہ حیثیت قائم کی گئی ہے اور آگرہ میں 14 سرکاریں دکھائی گئی ہیں۔ لیکن خاتمہ پر بیجاپور اور حیدرآباد کا اعداد بھی شامل کر لیے گئے ہیں جو یقیناً بعد کے کسی ماخذ سے حاصل کیے گئے ہوں گے۔

[2] جہانگیر اپنی تزک میں متعدد مقامات پر بعض صوبوں کے جمع کو بیان کرتا ہے۔ چونکہ یہ جمع کے اعداد اس کے سن تحریر کے متعلق ہیں لہٰذا توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ مستند ترین ہوں گے لیکن اس نے بظاہر اس کے ہر اندراج کو آئین اکبری سے نقل کیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس نے آئین اکبری کے اعداد کو پورے اعداد میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو تزک جہانگیری۔ 101 (بنگال و اڑیسہ) 172 (مالوہ) 299 (کشمیر) لہٰذا اس کے اعداد کو اس ضمیمہ کے 'جمع' کے گوشواروں میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

[3] آئین اکبری میں اس تصنیف کے مکمل ہونے کے وقت مملکت کی جمع نہیں بلکہ جمع دہسالہ کی میزان بتایا گیا ہے۔ جمع دہسالہ 1580ء میں قائم کی گئی تھی۔

[4] ان اعداد کو انتہائی احتیاط کے ساتھ استعمال میں لانا چاہیئے اول تو یہ جید ر باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر

ماخذ	سنہ	رقم داموں میں
1	1595-6ء	5162512491
2	1605ء	5834690344
3	قبل 1627ء	6300000000
لاہوری (2) ص 711	1628	7000000000
4	1628-36ء	6577357625
6	1646-47ء	9150990776
7	″	8800000000
8	″	7652520000
9	1638-58ء	9037420000
11	″	7823049662
12	″	9707181000
13	″	7849947640
14	″	8682680573

(باقی حاشیہ صفحۂ گذشتہ) بے ترتیب طریقہ پر لکھی گئی ہے دوسرے اس کو جمع نہیں بلکہ حاصل بتایا گیا ہے۔ علاوہ اس کے اس رقم کو بمقدار ٹنکہ مراد یا دام کے دوچند میں ظاہر کیا گیا ہے۔ یہاں پر اس کا دام کی جگہ غلطی سے لکھا جانا قیاس کیا گیا ہے۔

[1] یہ عدد مختلف صوبوں کے اعداد آئین اکبری جو تصحیح ہذا میں درج ہیں اور سرکار کابل کے عدد کی میزان ہے۔ کابل کے لیے 83 069 673 دام کے بجائے جو گوشوارۂ شماریات (آئین اکبری (۱) ص 594) کے قبل کی عبارت میں دیئے ہوئے ہیں سرکار کے شماریات میں مندرج 65 074 805 کی رقم تسلیم کی گئی ہے۔ قندھار کے محاصل کے مختلف طرح کی رقم کی اکائیوں اور انواع و اقسام کی اشیا (آئین اکبری (۱) ص 588) میں ہونے کے باعث ان کو مملکت کے جمع کی اعداد کے خارج کر دیا گیا ہے۔

[2] اس عدد کو روپیہ کی رقموں سے تحویل کر کے لکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کو تحصیل یا واقعی وصولی بتایا گیا ہے لیکن صادق خاں کے صوبہ واری شماریات بالکل واضح طور پر جمع کے اعداد پر مشتمل ہیں جو داموں اور نہ اس کے مساوی روپیوں دونوں میں دکھائے گئے ہیں لہٰذا تحصیل کے لفظ کو غالباً اس کے محدود لفظی معنوں میں نہیں لینا چاہیے۔

ماخذ	سنہ	رقم داموں میں
15	ء	3687760000
16	ء	7820049662
18	1646 - 56ء	8900000000
19	تقریباً ء	9122445846
	تقریباً 1667ء	9241716082
21	1687 تقریباً 1691	13802356000
22	1687 تقریباً 1696	12071876841
23	1687	13219853961
24	تقریباً 1709ء	13339991841

بنگال اور اوڑیسہ (غیر منقسمہ)

ماخذ	سنہ	رقم داموں میں
1	1595 - 6ء	598459319
2	1605ء	419107870
3	قبل 1627ء	500000000

[1] پوری مملکت کے لیے منوچی کے اعداد و اقعۃً 327 194 000 روپیہ ہیں لیکن بیجا پور اور حیدر آباد کے اعداد کو ان میں سے کم کر دینا چاہیے۔ (کیونکہ وہ مملکت میں بعد میں شامل کیے گئے۔

[2] اس تصنیف میں مملکت کی جمع میں حیدر آباد اور بیجا پور کے اعداد شامل نہیں کیے گئے ان کے اعداد کو جوڑ دیا گیا ہے تاکہ ہمارے گوشوارہ کے اعداد آجائیں۔

ماخذ	سنہ	بنگال (دام)	اوڑیسہ (دام)
1	1595 - 6ء	427726681	170732638
316(2)منزلی	1632ء	360000000	
4	1628 - 36ء	402520000	200545000
5	1633 - 38ء	427191000	170204000
6	1646 - 47ء	447390000	280240000
7	〃	500000000	200000000
8	〃	500000000	300000000
11	1638 - 56ء	427191000	180240000
12	〃	(1)727191000	191000000
13	〃	427191000	180240000
14	〃	462900000	(1) 404105000
15	〃	402000000	231300000
16	〃	427100000	180200000
17	〃	440000000	391000000
18	1646 - 56ء		191000000
19	تقریباً 1656ء	457858000	126680000
20	تقریباً 1667ء	523739110	197100000
21	1687 تقریباً 1691	824636240	142821000

[1] یہ عدد (غیر منقسم) بنگال اور اڑیسہ کے اعداد جمع سے اوڑیسہ کے اعداد جو اس کے محاذی کالم میں درج ہیں۔ گھٹا دینے سے نکلتی ہے۔

[2] یہ اوڑیسہ کی سرکاروں کے علیٰحدہ علیٰحدہ اعداد کی میزان ہے۔

[3] روپیوں میں دکھائی ہوئی رقم 000 204 180 داموں کے برابر ہے۔

آخذ	سنہ	بنگال (دام)	اوڑیسہ (دام)
22	1687 تقریباً 1695	524636240	142821000
23	1687	524636240	142821000
24	تقریباً 1709ء	524636240	142811000
ایڈ 6586 اوراق 36ب-37الف	1720ء	564614760	
آخذ	**سنہ**	**بہار (دام)**	**الٰہ آباد (دام)**
1	1595-6ء	221919464	212427819
2	1605ء	262774167	304355746
3	قبل 1627ء	312700000	307000000
4	1628-36ء	303355744	202355744
5	1633-38ء	368830000	391390000
6	1646-47ء	375693299	3736043,58
7	//	400000000	400000000
8	//	400000000	400000000
9	1638-66ء	383200000	378800000
10	//	720900000	373800000

[1] یہ عدد آئین اکبری میں پورے صوبہ کی جمع کے طور پر دکھائی گئی ہے۔ صوبہ کے مختلف سرکاروں کے اعداد کی میزان بہرحال 301848096 دام آتی ہے۔

[2] آئین اکبری اور اس کے بعد کے تمام گوشواروں میں الہ آباد کی 'جمع' میں نقدی رقم کے علاوہ 1200000 پان کی مقدار کا بھی اندراج ملتا ہے۔

[3] یہ عدد روپیوں کو داموں میں تحویل کی ہوئی رقم کے برابر ہے۔ رقم داموں میں محض 16883000 دکھائی گئی ہے جو ایک کھلی ہوئی غلطی ہے۔ [4] تھیونیو نے غالباً بہار کو برار سے خلط ملط کر دیا ہے۔

ماخذ	سنہ	بہار (دام)	الہ آباد (دام)
11	//	368830000	361290000
12	//	383200000	378800000
13	//	368830000	469000000
14	//	380730000	376061000
15	//	486000000	309520000
16	//	368830000	
17	//	382200000	378800000
18	1681 _ 56ء	333200000	378800000
19	تقریباً 1656ء	545300335	527881196
20	تقریباً 1667ء	721797019	436688072
21	1687 تقریباً 1611	407181000	456543278
22	1687 تقریباً 1695	407181000	456543248
23	1687ء	407181000	456543248
24	تقریباً 1709ء	407181000	456543248

ماخذ	سنہ	اودھ (دام)	آگرہ (دام)
1	1595 _ 96ء	201758172	546250304
2	1605ء	229865014	770489055
3	قبل 1627ء	232200000	822500000
4	1628 _ 36ء	259758140	770489055
5	1633 _ 38ء	258210000	941160000

۱۔ علیگڑھ مخطوطہ میں مختلف عدد 701797110 درج ہے۔

آگرہ (دام)	اودھ (دام)	سنہ	ماخذ
969927705	263500565	1646 - 47ء	6
900000000	300000000	"	7
900000000	100000000	"	8
100900000	273200000	1638 - 56ء	9[1]
987900000	267000000	"	10
941100000	358210000	"	11
009000000	258210000	"	12
941160000	258210000	"	13
981865600	264540000	"	14
888150000	288000000	"	15
641160000	258210000	"	16
1908000000	273200000	"	17
1009000000	273200000	1646 - 56ء	18
1364602117	363982859	تقریباً 1656ء	19
1061709283	320072193	تقریباً 1667ء	20
1141700157	321317119	1687 تقریباً 1691	21
1141760157	321317819	1687 تقریباً 1696	22
1141700157	321317719	1687ء - ؟	23
1141760057	221317119	تقریباً 1709ء	24

[1] میرا قیاس ہے کہ منوچی نے ننڈ[x] نے جن کے سامنے یہ اعداد درج کیے گئے وہ[xx] اروائن کے تجویز کردہ 'ننڈیر[+]' کے بجائے 'اودے[=]' کے قسم کا کوئی نام ہے۔

[2] غالباً صحیح عدد 101 908 0000 ہے۔

x Nande xx Irvine + Nander = Avadi

آخذ	سنہ	دہلی (دام)	لاہور (دام)
1	1595 - 6ء	601615555	559458423
2	1605ء	626233956	646730311
3	قبل 1627ء	656100000	825000000
4	1628 - 36ء	626233753	647330611
5	1633 - 38ء	739310000	844290000
6	1646 - 47ء	339424481	892213399
7	〃	1000000000	900000000
8	1646 - 47ء	1000000000	900000000
9	1636 - 56ء	781000000	987800000
10	〃	1001250000	987900000
11	〃	789300000	844290000
12	〃	782000000	934800000
13	〃	739300000	877190000
14	〃	746335000	893370000
15	〃	502000000	932200000
16	〃	9300000	844190000
17	〃	773000000	934800000
18	1646 - 56ء	782800000	937800000
19	تقریباً 1656ء	1558839127	089759776
20	تقریباً 1667ء	1168398269	907016125
21	تقریباً	1222950177	898932170

[1] داموں کے اعداد اس کے نیچے مندرج روپیہ کی رقم کی مدد سے صحیح کیے گئے ہیں۔

ماخذ	سنہ	دہلی (دام)	لاہور (دام)
22	1687 تقریباً 1695	1222950137	898132170
23	1687ء — ؟	1222950137	898132170
24	تقریباً 1709ء	1222950658	898132107
ماخذ	**سنہ**	**ملتان اور ٹھٹھہ (دام) (غیر منقسم)**	
1	1595-6ء	267127811	
2	1605ء	253964173	
3	1627ء	400000000	
ماخذ	**سنہ**	**ملتان (دام)**	**ٹھٹھہ (دام)**
1	1595-6ء	216522226	50605585
4	1628-36ء	253997855	415170790
5	1633-38ء	124270000	93020000
6	1646-47ء	254604499	92340000
7	〃	280000000	80000000
8	1646-47ء	280000000	80000000

1. یہ صوبۂ ملتان کے تمام سرکاروں کی میزان ہے۔ آئین اکبری (۱) ص 550 میں صوبہ کی جمع صرف 151 403 619 دام دکھائی گئی ہے۔
2. یہ عدد سرکار ٹھٹھہ کو چھوڑ کر صوبۂ ملتان کے بقیہ تمام سرکاروں کی بشمول سیوستان کے ذیلی سرکار کی میزان ہے۔
3. یہ عدد آئین اکبری میں مندرج سرکار ٹھٹھہ کی عدد سے سیوستان کی عدد کی تفریق کا حاصل ہے۔
4. روپیوں میں مندرجہ رقم 244 70 000 داموں کے برابر ہے۔
5. روپیہ میں مندرجہ رقم 901 200 00 داموں کے برابر ہے۔

ماخذ	سنہ	ملتان (دام)	ٹھٹھہ (دام)
9	〃	477620.000	92800000
10	〃	467250000	90780000
11	〃	244700000	92000000
12	〃	225500000	92800000
13	〃	244700000	92000000
14	〃	244655000	94970000
15	〃	297000000	(1) 240480000
16	〃	244847000	92000000
17	〃	265600000	91800000
18	1648-56ء	265600000	92800000
19	تقریباً 1656ء	338421178	89230000
20	تقریباً 1667ء		74986900
21	1687 تقریباً 1691	214349896	68816810
22	1687 تقریباً 1695	114342896	68816810
23	تقریباً 1709ء	224349893	68816800
ماخذ	**سنہ**	**اجمیر (دام)**	**کشمیر (دام)**
آئین اکبری (۱) 570_71	1592-3ء	x	74670411
ایضاً	1594-5ء	x	76472165
1	1595-6ء	288401557	62113045

لہ ملتان اور بھکر کے علیحدہ علیحدہ اعداد کا مجموعہ۔

2ہ یہ دونوں آصف خاں کے نکالے ہوئے اعداد جمع ہیں جبکہ 1592-3ء کے سامنے (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

ماخذ	سنہ	اجمیر (دام)	کشمیر (دام)
2	1605	309917724	
3		420500000	
4	1628 - 36ء	309937734	
5	1633 - 38ء	540350000	119380000
6	1646 - 47ء	556621310	136412039
7		600000000	150000000
8	//	———	150000000
9	//	878800000	140000000
10	//	867750000	146850000
11	//	540050000	114380000
12	//	876800000	140200000
13	//	540050000	117180000
14	//	555360000	125285000

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) لکھی ہوئی عدد قاضی علی بغدادی کی معین کردہ ہے کشمیر کی 'جمع' چاول کے خروار (گدھے کے بوجھ) کے مقدار میں معین کی گئی تھی جس کو بعد میں داموں میں تبدیل کیا گیا۔ قاضی علی کی شرح تحویل پر آصف خاں کی نکالی ہوئی جمع 76372166 $\frac{3}{4}$ داموں کے برابر ہونی چاہیے۔ باج 'اور تمغا' (راستوں اور بازاروں کا محصول) کی چھوٹ سے 898400 داموں کی تخفیف ہوگئی۔ پھر غلہ کی شکل میں ادا کی ہوئی مالگذاری کے لیے ایک خروار کے مساوی داموں کی مقدار (ابھی تک 29 : 1) کو بقدر 5 کم کر دیا گیا تھا۔ اس سے اور محصولوں کی تخفیف سے جمع کم ہو کر 62202203 $\frac{1}{4}$ دام ہوگئی ہوگی۔ ابوالفضل کے اس قول کی بنیاد کر ان تخفیفوں کے بعد آصف خاں کی جمع بمقابلہ قاضی علی کی جمع کے صرف 860304 $\frac{1}{2}$ دام کم تھی سمجھ میں نہیں آتی۔

[1] رقم بمقدار روپیہ 14000000 داموں کے مساوی ہے۔

[2] اصل ماخذ میں مندرج رقم واقعتاً 14 00 00 00 دام کے برابر ہے۔

[3] اصل ماخذ میں مندرج رقم 146850 دام کے برابر ہے۔

آخذ	سنہ	اجمیر (دام)	کشمیر (دام)
16	〃	540000000	1145[illegible]0000
17	〃	876800000	1402[illegible]9000
18	1646 – 66ء	986800000	140200000
19	تقریباً 1656ء	648761685	1[illegible]4390000
20	تقریباً 1667ء	636894883	215074826
21	1687 تقریباً 1691ء	652645902	224911687
22	1687 تقریباً 1695ء	652345382	229911397
23	1687	655345702	229911397
24	تقریباً 1709ء	653345702	229911300

آخذ	سنہ	مالوہ (دام)	گجرات (دام)
1	1595 – 6ء	240695052	436822301
2	1605ء	257378201	469159424
3	قبل 1627ء	280000000	506400000
4	1628 – 36ء	257878361	469959421
5	1633 – 38ء	362510000	463280000
6	1646 – 47ء	398152749	533791486
7	〃	400000000	530000000
8	〃	400000000	530000000
9	1638 – 56ء	366500000	535800000

[1] مختلف مخطوطہ میں 852646703

[2] مختلف مخطوطہ میں 2799213097

آخذ	سنہ	مالوہ (دام)	گجرات (دام)
10	〃	373800000	547350000
11	〃	362510000	463280000
12	〃	398500000	530000000
13	〃	363510000	463260000
14	〃	369070000	583790000
15	〃	396250000	935800000
16	〃		463260000
17	〃	398500000	535800000
18	1646 ــ ء	398500000	535800000
19	تقریباً 1666ء	557317320	869288069
20	تقریباً 1667ء	425476670	448883096
21	1681 تقریباً 1691ء	403980658	454749135
22	1681 تقریباً 1695ء	403980653	454749135
23	1687ء ــ ؟	403980658	454744135
24	تقریباً 1709ء		799645213
مرآۃ (۱) صـ	تقریباً ء		

دکن

(ستارہ کا نشان اس بات کی علامت ہے کہ آخذ میں بجنسہٖ یہی عدد درج نہیں ہے بلکہ یہ انہیں مندرج دکن کے مختلف صوبوں کے اعداد کی میزان ہے۔

آخذ	سنہ	دام
1	1695 ــ 6ء	844956264 [1] *

[1] یہ عدد برار اور خاندیش کی جمع کی میزان ہے۔ دونوں کی جمع تنکہ براری میں درج ہے (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

ماخذ	سنہ	دام
2	1605ء	*1100816647
3	قبل 1627ء	*1156700000
4	36ء 1628	*1250805955
5	38ء 1638	*1730472000
لاہوری (۱) (2) ص 62-3	1636ء	*2120000000
ایضاً ص 122	1636ء	2000000000
6	47ء - 1946	2190087798
7		*1820000000
8		*1780000000
ادب عالمگیری ورق 40 ب		
رقعات عالمگیری 121-2	54ء 1653	1449000000
9	56 1638	*2361500000
10	〃	*2396325000
11	〃	*1577790000
12	〃	*2665500000
13	〃	*2136270000

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) درج ہے جو 16 دام کے برابر تھا (آئین اکبری (۱) ص 478) اس شرح پر تحویل کرنے سے خاندیش کی جمع 202352992 داموں کے برابر ہوتی ہے اور ہم نے میزان قائم کرنے میں یہ عدد استعمال کی ہے ابوالفضل اس اطلاع کا بھی اضافہ کرتا ہے کہ اسیر گڑھ کے فتح کے بعد اکبر نے مقامی ٹنکہ کی قیمت از سرِ نو 24 داموں کے برابر کر کے خاندیش کی جمع میں بقدر 50 فیصدی کا اضافہ کیا (آئین اکبری (۱) 474) چونکہ اسیر گڈھ پر 1601ء میں قبضہ ہوا تھا لہٰذا ابوالفضل نے اپنی تصنیف کو مکمل کر لینے کے بعد اس بیان کا اضافہ کیا ہوگا۔ اس کے علاوہ اس اضافہ کو 1595 - 6ء کی جمع کا حساب لگانے میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

آخذ	سنہ	دام
14	"	1587169000
15	"	2140090000
16	"	1525640000
17	"	2425100000
18	1646 56	2065500000
19	تقریباً 1658	1856448000
20	تقریباً 1667	2967000000
21	1681 تقریباً 1691	6002222140
22	1681 تقریباً 1695	5689994307
23	1687	5917236140
24	تقریباً 1709	6037374000

نمبر شمار 21-] 24 مذکورہ بالا میں بیجاپور اور حیدر آباد کے اعداد شامل ہیں۔ اگر موازنہ کی سہولیت کے خاطر ان اعداد کو کم کردیا جائے تو ان گوشواروں میں مغلیہ دکن کے خالص اعداد اس طور پر ہوں گے۔

	21	2654530000
	22	2566974307
	23	2570574000
	24	2570574000

فصل ۔ 2 ۔ حاصل

پچھلی فصل میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ بعض نسبتاً سابقہ تصانیف میں واقعتہً جمع کے اعداد و شمار کو

---

[1] اس میں بیجاپور اور حیدر آباد کے لیے منوچی کے اعداد شامل نہیں ہیں۔

'حاصل' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ زیر مطالعہ عہد کی آخری دہائیوں کے صرف تین آخذ میں 'جمع دامی' کے شماریات کے ساتھ جو 'حاصل' کے اعداد دیئے گئے ہیں وہ قابل اعتماد ہو سکتے ہیں ان اعداد کے ایک مجموعہ کو 'حاصل سنہ کامل'، یا صرف 'حاصل کامل'، یعنی 'بہترین سال کی وصولی بیان کیا گیا ہے۔ 'حاصل' کے دیگر اعداد مخصوص سنوات سے منسوب کیے گئے ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض میں تاریخ یا وقت کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ یہ سب روپیوں میں دی گئی ہیں۔

مذکورہ تین آخذ، 'ضوابط عالمگیری'، 'فریزر ۸۶' اور 'جگجیون داس' ہیں۔ ہم پچھلی فصل میں ان کے شماریات کو قلم بند اور ان کی تاریخوں کو بیان کر چکے ہیں۔ ان کو ذیل میں حروف ا۔ ب اور ج سے ترتیب وار ظاہر کیا گیا ہے۔

حاصل (سنہ) کامل

	ا	ب	ج
ممالک پشتنا، بیجاپور، حیدرآباد		175102029	175102039
دہلی	31012164	31012164	6849110
آگرہ	20697371	20071103	13097371
اجمیر	10697371	(1) 60097341	10696393
پنجاب	16706386	18704383	8704383
ملتان	6159699	5169299	5169369
ٹھٹھہ	9125551	(1) 1365397	9365397
کشمیر	2462593	2431339	2458384
الہ آباد	10598371	10597341	10597671
اودھ	9125611	9225591	9125651
بہار	9305431	9325551	9305431

۱؎ اصل آخذ میں اس کو صرف 'حاصل'، کہا گیا ہے

	ا	ب	ج
بنگال	8619247[1]	8619247[2]	8619267[3]
اوڑیسہ	1658116	1658856	1657826
مالوہ	472299	8472299	8472291
گجرات[4]	8349103	8962830	8965806
صوبجات دکن			
اورنگ آباد		10050000	10050000
برار		9616309	9016309
بیدر		3100000	
خاندیش		4080019	4086719

حاصل کے دیگر شماریات

ان سنوات کو جو قیاسًا اورنگزیب کے عہد حکومت کے ہیں اور جن سے بعض حاصل کے اعداد منسوب کیے جاتے ہیں، رومن اعداد میں دکھایا گیا ہے۔ حرف 'ج' کے تحت وہ اعداد دیئے گئے ہیں جن کو مسلسل 'حاصل آخر' کہا گیا ہے یعنی سب سے آخری وصولیاں لہٰذا ان کی مدت تقریبًا 1708 ـ 9ء معین کی جا سکتی ہے۔

1۔ اصل آخذ میں صرف حاصل ہے۔

2۔ اس کو (اورنگزیب کے عہد حکومت کے) نویں سال کا 'حاصل کامل' کہا گیا ہے

3۔ اصل آخذ میں اس 'حاصل آخر' کہا گیا ہے۔

4۔ مرآۃ (ا) صـ 26 میں گجرات کے 'حاصل سال اکمل' کو 12356000 اور 'سال کامل' کو 10000000 روپیہ بیان کیا گیا ہے۔ 'سنہ' اور 'سال' مترادف ہیں اور 'اکمل' غالبًا اس سال کو ظاہر کرتا ہے جو پچھلے بہترین سے بہتر ہو۔

	ا	ب	ج
مملکت	232413890	241401391	261772029
دہلی		(XVIII) 22256400	9404030
آگرہ		(〃) 18267000	6892697
اجمیر		(〃) 6892877	6892896
پنجاب		(〃) 13042327	3042327
ملتان		(〃) 2475349	2475649
ٹھٹھہ		(〃) 449675	3449667
کشمیر		(〃) 1711324	2408389
الہ آباد		(〃) 6882897	6892890
اودھ		(〃) 9885771	4786871
بہار		(〃) 4885871	5714873
بنگال و اوڑیسہ	———	———	———
مالوہ		(〃) 4813283	4813283
گجرات [1]		(〃) 7184686	7184685
صوبجات دکن [2]	83968648		112520223
اورنگ آباد	12836043	(〃) 9699000	9699005
برار	10946641	(〃) 7589220	7589220

1. موازنہ بہ، مراۃ (1) ص 26 جس میں بتایا گیا ہے کہ پچھلے برسوں "میں بعض اوقات مالگذاری کی وصولیاں 6000000 روپیہ ہوجاتی تھیں۔

2. بقول اورنگ زیب 27 جلوس شاہجہانی یعنی ر 1653-4ء میں دکن کے صوبوں کی وصولیاں جن میں اس وقت بیجاپور، حیدرآباد اور بیدر کا بیشتر حصہ شامل نہ تھا 10000000 روپیہ سے زائد نہ تھیں (ادب عالمگیری ورق 40 ب، رقعات عالمگیری، 22-121)

	ا	ب	ج
بیدر	9669811	(XVI) 3100000	4642732
		(XIX) 4242332	
خاندیش	4739662	(XVIII) 4119067	3119017
بیجاپور	33394771	45746000	58887500
حیدر آباد	20094478	20553362	24782500

کتابیات

حسبِ ذیل فہرست میں حوالہ کی سہولیت کے پیش نظر تصانیف کی ایک عددی ترتیب معین کی گئی ہے۔ جب اس ترتیبی عدد کے بعد قوسین میں ایک اور عدد ملے جس کے پہلے حروف 'س' درج ہو تو یہ تصور کرنا چاہیے کہ اس تصنیف کو اسی عدد کے تحت 'سی' اے' اسٹوری کی پرشین لٹریچر' اے بایو ببلیو گرفیکل سروے (C.A. Storey's Persian Literature - a bio-biblio graphical Survey) میں بیان کیا گیا ہے۔

مخطوطات کی صراحت عموماً ان کے کتب خانہ کے معینہ نشانات سے کی گئی ہے۔ کسی مخطوطے کے برٹش میوزیم کے اڈیشنل یا اورنٹیل مجموعہ کے علاوہ کسی اور مجموعہ سے متعلق ہونے کی صورت میں برٹش میوزیم کے لیے بر۔ ایم[1]، مجموعہ کے نام اور کتب خانہ کے نشان کے قبل لکھا گیا ہے لیکن ان تمام مخطوطات جنھیں محض 'ایڈ'[2] یا 'اور'[3] کے نام سے مخصوص کیا گیا ہے' برٹش میوزیم کے علی الترتیب اڈیشنل یا اورنٹیل مجموعوں سے متعلق تصور کرنا چاہیے۔ 'علی گڈھ' سے مولانا آزاد لائبریری (عربی و فارسی مخطوطات کا سکشن) علیگڈھ مسلم یونیورسٹی'، 'بوڈل'[4] سے اکسفورڈ کی بوڈین لائبریری، 'اڈنبرا'[5] سے اڈنبرا یونیورسٹی کی لائبریری کا مجموعۂ فارسیہ' آئی۔ او'[6] سے انڈیا آفس لائبریری لنڈن 'لنڈیزیانا'[7]

---

[1] Br.M. [2] (Add) [3] Or. [4] Bodh [5] Edinburgh [6] I.O.
[7] Lindesiana

سے مین چسٹر کی جان رائی لینڈس، لائبریری میں اسی نام کا مجموعہ اور آر، اے، ایس[1] سے لندن کی رائل ایشیاٹک کے سوسائٹی کی لائبریری مراد ہے۔ انڈیا آفس لائبریری اور بوڈلین کے چند مخطوطات کتب خانہ کے معینہ نشانات سے نہیں بلکہ مطبوعہ کیٹلاگ سوسائٹی کی لائبریری مراد ہے۔ انڈیا آفس لائبریری اور بوڈلین کے چند مخطوطات کتب خانہ کے معینہ نشانات سے نہیں بلکہ مطبوعہ کیٹلاگ میں اپنے مندرجہ نمبروں سے واضح کیے گئے ہیں۔ انڈیا آفس کے جن مخطوطات میں کیٹلاگ کے نمبر دیئے گئے ہیں ان کے قبل 'ایتھے[2]' کا نام درج کیا گیا ہے اور 'بوڈلین' کے مخطوطات میں کسی مجموعہ کا نام ظاہر کیے بغیر نمبروں کے قبل مخفف 'بوڈل' لکھا گیا ہے۔

کتابیات میں جب کسی تصنیف کے تحت ایک سے زائد مخطوطہ یا ایڈیشن درج ہے، لیکن کتاب ہذا کے فٹ نوٹ میں ان میں سے صرف ایک کا حوالہ آیا ہے تو ایسی صورت میں موخر الذکر کو کتابیات میں ستارہ کے نشان سے واضح کیا گیا ہے۔ جن اختصارات یا علامات سے وہ فٹ نوٹ میں ظاہر کیے گئے ہیں انہیں یہاں متعلقہ مخطوطات یا مطبوعات کے بعد قوسین میں رکھا گیا ہے۔ کسی ستارہ زدہ مخطوطہ یا ایڈیشن کے بعد کسی مخفف یا علامت کے نہ ظاہر کیے جانے کی صورت میں یہ تصور کرنا چاہیے کہ مخطوطہ یا ایڈیشن کے اوراق یا صفحات کو فٹ نوٹوں میں تصنیف کے نام (یا اس کے مخفف) کے فوراً بعد اس مخطوطہ یا ایڈیشن کے لیے بغیر کسی علیحدہ مخفف یا علامت کے دیا گیا ہے۔

ہمعصر مآخذ

الف: زراعت

۱۔ نسخہ در فن فلاحت۔ I.O 4702 Or 1741 اوراق 25 الف۔ 48 الف۔ علیگڈھ لٹن، فارسیہ علوم، 51 یہ بات (I.O اور Sr.M کے مخطوطات کے متن کے ابتدائی الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے کہ یہ کسی بڑی تصنیف کا اگارھواں باب ہے۔ مخطوطہ علیگڈھ کے خاتمہ پر جس کی نقل 1793ء میں اتاری گئی تھی (لیکن جو شروع و آخر دونوں سروں پر نامکمل ہے) یہ تحریر ہے کہ یہ وارا شکوہ کے 'گنج باداورد' کا ایک جزو ہے۔

1790۔ 91ء میں تحریر شدہ 'رسالہ نخلبندیہ' میں (Add. 662، 16، ورق 95 ب)

---

[1] R.A.S. [2] Eth

جو اس رسالہ کی تقریباً ایک نقل ہے، اس کی جدّی تصنیف کا یہی نام بتایا گیا، مگر اسے امان اللہ حسینی خانہ زاد خاں سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ انتساب غالباً درست ہے، کیونکہ جہانگیر کے مشہور امیر مہابت خاں کے لڑکے امان اللہ حسینی خانہ زاد خاں نے ایک مجموعہ موسومہ "گنج بادآورد" چھوڑا ہے۔ (Rieu's British Museum Catalogue) (2 / 509 ب)

اس کا مصنف ایک دوسری تصنیف جسے وہ کتاب شجرۃ النہال کے نام سے پکارتا ہے کا احسان کا معترف ہے جو Lindesiana 484 Add 25342 (جزو) اور Add 1771 میں محفوظ تصنیف کے تقریباً بالکل مماثل ہے۔ آخر الذکر تصنیف بظاہر فارس میں لکھی گئی تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ امان اللہ نے نظرثانی کے بعد ہندوستان کی پیداوار وں (پھلوں اور فصلوں) کا اس میں اضافہ کیا۔

ب۔ انتظامی تحریریں

عام تصانیف

2 (س۔ 2 : 702) ابوالفضل۔ آئین اکبری مطبوعہ بلاکمین۔ بب۔ انڈ، کلکتہ 1867 - 77 ء بلاکمین کا ایڈیشن، باوجودیکہ بیحد عرق ریزی سے مرتب کیا گیا ہے۔ اور قبل کے دونوں نسخوں سے بہت بہتر ہے (سید احمد کا ایڈیشن، دہلی 1855 ء اور نولکشور کا ایڈیشن، لکھنؤ 1869 ء نولکشور کا 1882 ء کا ایڈیشن بلاکمین کے ایڈیشن کی حرف بحرف نقل ہے) لیکن بدقسمتی سے یہ بہترین قابل حصول مخطوطات پر مبنی نہیں ہے۔ لہٰذا میں نے اس کے پورے نسخہ کو سترھویں صدی کے دو صحیح ترین مخطوطات Add. 26 52 اور Add. 6552 سے ملایا ہے۔ مخطوطہ I.O. 6 بھی میری نظر سے گزرا ہے۔ یہ بھی پہلے کا ہے اور Add. 6752 کی محض ایک نقل ہے۔ میں نے وقتاً فوقتاً Add. 6546 (1718ء) سے بھی رجوع کیا ہے۔ یاد رہے کہ R. A. S. فارسی 121 (Morley 161) حالانکہ 1656ء کا ہے مگر بے احتیاطی سے لکھا گیا ہے۔ لنڈی سیانا کے کیٹلاگ میں آئین اکبری کے مخطوطات کی مندرجہ تاریخ گمراہ کن ہے۔ Lindesiana 170 کی نقل 1626ء میں نہیں بلکہ 1680ء میں اتاری گئی تھی (اور یہ بہرحال ایک ناقص نقل ہے) اور نمبر 800 کو 1627 - 8ء سے منسوب کرنے کی کوئی بھی بنیاد نہیں ملتی۔ Lindesiam 223 سرے سے آئین اکبری کی نقل ہی نہیں ہے۔ براؤن سپلمنٹری ہینڈ لسٹ آف محمڈن ایم اس اس ان کیمبرج، (Brown's Supplementary

(Hand list of Muhammadan MSS. in Cambridge) ص 16 کا یہ بظاہر مفہوم ہے کہ
کنگس کالج کے ۲۰۰ مخطوطات نمبر 31 میں آئین اکبری کے ایک بہت قدیم نسخہ (1598 - 99ء) کی نقل
شامل ہے۔ لیکن اس مجموعہ کے پاسر کے کیٹلاگ (JRAS, 1867, p. 108) میں یہ خیال ظاہر
کیا گیا ہے کہ یہ اکبرنامہ کی نقل کا صرف ایک جزو ہے جسے تین جلدوں میں باندھ دیا گیا ہے۔

خاص طور پر آئین اکبری کے شماریات کے اعداد کو بہ کثرت استعمال کرتے وقت میں یہ واضح
کرنے سے قاصر رہا ہوں کہ میں نے کہاں اور کیوں بلاکمین کے متن سے انحراف کیا ہے میں نے عموماً اس
خواندگی کو ترجیح دی ہے جن میں .Add 6552 اور .Add 7652 دونوں بلاکمین سے متفق ہیں
جہاں جہاں ترجموں کے حوالوں کی ضرورت محسوس ہوئی وہاں میں نے بلاکمین کے ترجمہ سے جسے بعد
نظر ثانی فلوٹ (Phillot) نے جلد (۱) کلکتہ 1927ء اور 1939ء میں طبع کیا ہے اور
سرکار کے نظر ثانی کیے ہوئے جیرٹ (Jarrent) کے ترجمہ ج 2 و 3 کلکتہ 1949ء اور 1948ء
سے رجوع کیا ہے۔

3 یوسف میرک خلف ابوالقاسم نمکین۔ مظہر شاہجہانی 1634ء ج 2 کراچی 1961ء (؟) اس
تصنیف کی جلد دوئم اپنے سن تحریر تک کی مغلوں کے تحت سندھ کی انتظامی تاریخ کی ایک سرگذشت ہے
مصنف بھکر، ٹھٹھہ اور سہوان کے علاقوں کو احوال کو علیحدہ علیحدہ قلمبند کرتا ہے مگر اس نے
سہوان پر زیادہ توجہ دی۔ سندھ ثقافتی بورڈ کراچی کے پیر حسام الدین راشدی میرے دلی شکریہ
کے مستحق ہیں کہ موصوف نے مجھے اپنا ایک محشی پریس کا نسخہ استعمال کرنے کا موقع فراہم کیا۔

4 (س۔ 730) رائے چندر بھان برہمن۔ چار چمن برہمن تقریباً 1656ء .Add 18863 (الف)
Or. 1892 (ب)

انتظامی اور حساب کتاب کے ضوابط نامے اور شماریات کے گوشوارے وغیرہ:

اس نوعیت کی تحریروں پر غالباً ایک مختصر سا نوٹ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ تحریریں زیر مطالعہ
عہد میں ایسے لوگوں کی رہنمائی کے لیے جو حساب کتاب (سیاق) اور لکھنے پڑھنے کے کام (نویسندگی)
اور انتظامی امور کے تفصیلی ضابطوں (دستورالعمل) میں مہارت بہم پہونچانا چاہتے تھے کثیر تعداد
میں لکھی گئی تھیں۔ ان کی نوعیت انتظامیہ میں لکھنے پڑھنے کے عہدوں کو امیدواروں کے لیے
درسی کتابوں کی تھی اور ان میں سے بعض تو ارادۃً اس قدر مفصل لکھی گئی ہیں کہ مملکت کے ہر شعبہ کے
تقریباً تمام ہی عہدہ داروں کے ملازمین ان سے استفادہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ یہ بیشتر مختلف عہدہ

داروں کے فرائض، ان کی نگرانی میں طیار ہونے والے کاغذات اور ان کا طریقۂ طیاری، اصطلاحات مستعملہ کی تشریحات، منصبداروں کی تنخواہوں کی شرحیں، اور ان پر عائد کردہ ذمہ داریوں اور جرمانوں کی تفصیلات پر مشتمل ہیں۔ ان میں بعض اوقات متفرق نوعیت کی اطلاعات بھی مثلاً شماریات مال، شاہراہوں کے جدولات، امراء کے خطابات کی فہرست وغیرہ بھی ملتی ہیں۔ یاد رہے کہ ان کتابوں کے مصنفین اکثر سابق یا اس وقت کے سرکاری عہدہ داران ہی تھے۔ لیکن ان میں اکثر بخیال صراحت سرکاری تحریریں بھی تلمبند کر دی گئی ہیں اور بعض اوقات بظاہر روزمرہ کے طریقۂ کار کے متعلق تفصیلی سرکاری ضابطوں کی حرف بہ حرف نقل بھی ملتی ہے۔

انتظامی اور مالی تاریخ کے اہم مآخذ ہونے کے باوجود، یہ یقیناً افسوس کا مقام ہے کہ بہ استثنا نمبر 15 جس کی طباعت ابھی تقریباً 80 برس گذری ہوئی ہے، ان میں سے کوئی بھی آج تک طبع نہ ہو سکے۔

5 یاداشت مجمل جمع، وغیرہ، تقریباً 1646 47 ء / Add. ، 863 ر 16۔

6 دستورالعمل نویسندگی، اور عہد شاہجہانی، Add. 6641، اوراق 150 ـ 195

7 شماریات مال کے جدولات، وغیرہ، Ousley .Bodl 390 شماریات کی سرخیاں انہیں عہد عالمگیری سے منسوب کرتی ہیں، لیکن داخلی شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ 1638-56ء مدت سے متعلق ہیں۔

---

8 دستورالعمل عالمگیری، تقریباً 1659ء Add. 6598 اوراق 1 الف ـ 128 ب Add. 6599 اس کی سن تحریر کے متعلق کچھ اشکال پایا جاتا ہے۔ یہ خود اپنی عبارت کے بموجب "سنہ 3 جلوس عالمگیری میں مرتب کیا گیا تھا جس کا 1069 فصلی اور 1065 ھ کے مطابق ہونا بتایا جاتا ہے لیکن کاتب نے اس بے تکے الفاظ "سنہ جلوسی" کو یقیناً "سن جلوس" یعنی سنہ تخت نشینی کی جگہ سہواً لکھ دیا ہے۔ اس کے علاوہ 1069 فصلی اور 1065 ھ نہ تو سنہ 3 جلوس عالمگیری کے اور نہ ہی آپس میں ایک دوسرے کے مطابق ہیں۔ ان حالات میں یہ تصور کرنا ہوگا کہ 1069 کی فصلی اور 1065 کی ہجری باہم گڑبڑ ہو گئی ہے اور یہ تحریر واقعتہً سنہ 1 جلوس عالمگیری میں لکھی گئی ہے جو 1069 ھ اور 1065 ف دونوں سے مطابقت رکھتا ہے۔

9 دستورالعمل ممالک محروسہ ہندوستان، اورنگ زیب مابعد 1671 Add. 1840، اوراق 133 الف ـ 144 ب

10 دستورالعمل علم نویسندگی، اورنگزیب مابعد 1676ء Add. 1840 اوراق 133 ب ـ 185 ب۔

11 جگت رائے شجاع 'کاتبہ سکینہ' فرہنگ کاردانی 1679 ء علیگڑھ 'عبدالسلام' فارسیہ 85/315

12 'انتخاب دستورالعمل بادشاہی' اورنگ زیب 'مابعد 1686 ء Edinburgh 224

13 ضوابط عالمگیری' اورنگ زیب۔ مابعد 1691 ء Add. 6598 'Or. 1641 ' Ethe 432 Ethe 415 161 الف و اوراق ما بعد (جزو)

14 'دستورالعمل' اورنگ زیب۔ ابعد 1696 ء Bodl Fraser 86 ۔

15 منشی نندرام کایستھ شریواستو 'سیاق نامہ 1694 ۔ 6ء لیتھوگراف' نولکشور لکھنؤ 1879

16 اودے چند' فرہنگ کاروانی و کار آموزی' 1699 ء Edinburgh 83 یہ تصنیف جزا نمبر 11 پر مبنی ہے۔

17 خلاصۃ السیاق' 1703 ء Add. 6588 اوراق 64 الف 94 الف (قدرے ناقص) علیگڑھ سر شاہ سلیمان 410/143 (علیگڑھ مخطوطہ)

18 'دستورالعمل اورنگ زیب۔ ما بعد 1703 ء Or. 2026 نمبر 12 کی تقریباً ایک غیر تسلیم شدہ نقل۔

19 'دستورالعمل شاہجہانی وغیرہ' اواخر اورنگ زیب (؟) Ethe 415 اوراق 23 ب 109 ب Add. 6588 اوراق 18 الف 47 ب۔ علیگڑھ سر شاہ سلیمان 675/53

20 'شماریات ال مملکت مغلیہ معہ محال و ارشماریات صوبۂ اجمیر۔ اورنگ زیب (R.A.S. فارسی 173

21 صوبجات مملکت مغلیہ کے رقبوں، قسمتوں' اور شماریاتِ مال مبنی بہ آئین اکبری اور اورنگ زیب کے انتقال کے بعد جمع کیے ہوئے عہد عالمگیری کے مواضعات اور رقبوں کے شماریات ۔۔ Or. 1286 ' ب ۔ 343 الف۔

22 ہدایت اللہ بہاری 'ہدایت القواعد' 1714 ء I.O. 5993 الف۔ علیگڑھ عبدالسلام 339/149 (علیگڑھ مخطوطہ) ان دونوں مخطوطات کی عبارت میں زیادہ فرق ہے۔ علیگڑھ مخطوطہ کی عبارت زیادہ جامع ہے۔

23 جواہر ناتھ بیکس سہوانی' 'دستورالعمل' 1732 ء علیگڑھ سبحان اللہ 4 ۔ 154

24 رسالہ زراعت' تقریباً 1750 ء Edinburgh 144 دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بنگال میں غالباً انگریزوں کی فتح کے تھوڑے ہی قبل کی تصنیف ہے۔

25 برج رائے 'دستورالعمل شاہنشاہی' تقریباً 1727 ء اضافہ کردہ ٹھاکر لال 1776 ء Add.

انتظامی تحریریں بشمول مجموعۂ کاغذات اصل و نمونہ

ان تحریروں کی مکمل فہرست درج کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میری نظر سے جن تحریروں کی اصل عبارت نہیں، بلکہ صرف ان کا ترجمہ/تجزیہ یا بیان گذرا ہے، انہیں نظرانداز کر دیا گیا ہے۔

26 نوساری (گجرات) کے پارسی حکیموں کے ایک خاندان کے نام زمینوں اور نقدی گذاروں کے عطیات کے متعلق فارسی دستاویزات وغیرہ 1517 - 1671ء اور نوساری کے ایک دوسرے پارسی خاندان کی جائداد اور مالی کاروبار کے متعلق کاغذات بزبان گجراتی، سولھویں و سترھویں صدی یہ ایس۔ ایچ ہودی والا Studies in Parsi History بمبئی، 1920ء ص 253-149 میں مع ترجمہ اور ان کی اہمیت کے ایک جائزہ کے شایع ہوئے ہیں اور جلد کے اختتام پر متعدد تحریروں کے فوٹو بھی ہیں

27 پرگنہ بٹالہ (پنجاب) میں خاص طور سے مدد معاش کے متعلق فرامین، پروانے اور دیگر تحریریں 1758-1527ء I.O. 4438 (نمبر شمار 1-70) اس مجموعہ کے نمبر ایک کو جو سیورغال کے متعلق بابر کا ایک فرمان ہے، ڈاکٹر محی الدین مومن نے IHRC 1661ء ص 54-49 میں اصل کے فوٹو کے ساتھ شائع کیا ہے۔

28 بابر، شیر شاہ اور ہمایوں کے فرامین جنھیں مولوی محمد شفیع نے، اورنٹیل کالج میگزین، لاہور ج9 نمبر شمار 3، مئی 1933ء ص 28-115 پر شائع کیا ہے

29 سنٹرل رکارڈ آفس (یو۔ پی) الہ آباد میں دستاویزات جو دو سلسلوں میں ترتیب دیئے گئے ہیں (1) یو۔ پی، ریجنل رکارڈس سروے کمیٹی کے رجسٹر اندراجات (Accession Register) میں 31 مارچ 1958ء تک کے درج کیے ہوئے (2) کمیٹی کے رجسٹر میں یکم اپریل 1958ء سے درج کیے ہوئے۔

مذکورہ دونوں مجموعوں کی فارسی تحریریں، بیشتر فرامین و عطیات زمین کے و دیگر دستاویزات بیعنامے، قانونی محضرنامے فیصلے، کاغذات مال وغیرہ ہیں۔ یہ سولھویں صدی اور اس کے مابعد زمانہ کے ہیں۔ ان میں سے پہلا (سلسلہ نمبر ا کا نمبر 318) شیر شاہ کا فرمان ہے ان میں سے میں نے حسب ذیل دستاویزات کا مطالعہ کیا ہے

سلسلہ نمبر ایک: 1، 5، 8، 24، 36، 154، 179 — 80، 224، 279 — 80، 294-99، 299،

315، 317-18، 323، 329، 359، 362، 370، 375، 414، 421، 424، 435، 457، 464، 782، 786، 789، 810، 851، 869، 873-74، 879، 881، 884-94، 896-97، 1177، 1180، 1183، 1185-87، 1189-92، 1194-98، 1200-6، 1208، 1210-17، 1219-25، 1227-28، 1231-32، اور 1234،

سلسلہ نمبر دو 23، 53، 55، 56 اور 284۔

30 اکبر، فرمان عطیہ مدد معاش، 1558 - 69ء مع حکم توثیق، 1575ء، الہ آباد (2) 23 (اصل) 1757، اوراق 39 - 51 (نقل)

31 اکبر، فرمان، مدد معاش کا ئی زمین پر تبادلہ، 1567 - 68ء علیگڑھ، نمائش خانہ۔

32 اکبر، فرمان عطیۂ مدد معاش، 1576ء اصل مسٹر محمد اکبر علی، وکیل گورکھپور کے پاس موجود ہے میں نے اسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ جہاں یہ عاریتۂ منگایا گیا تھا دیکھا ہے۔ شعبہ میں اب اصل ہاتھ کی لکھی ہوئی نقل موجود ہے۔

33 شاہی فرامین (1677 - 1805ء) ٹکایت مہاراج کے مورثوں کے نام۔ اصل فرامین کے فوٹو اور ان کے انگریزی، ہندی اور گجراتی زبانوں میں ترجمے معہ کے۔ ایم، جھویری، بمبئی، 1928ء کی یاداشت کے۔

34 پروانچہ مالگذاری زمین کے عطیہ کے متعلق، 1580ء I.O. 4433

35 عہد اکبری کے فرامین و دیگر دستاویزات گجرات میں مدد معاش کے عطیات کے متعلق۔ متن و اصل کے عکسی فوٹو کو جیونجی جمشید مودی نے The Persis a at the Court of Akbar بمبئی (1903) 91 اور صفحات مابعد پر ترجمہ اور مبسوط شرح کے ساتھ شائع کیا ہے۔

36 حریم زمانی۔ حکم جس میں سرکاری عمال کو ایک مفسد زمیندار کی دست درازیوں سے ایک جاگیردار کے مفاد کو محفوظ رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ عہد جہانگیری۔ ظفر حسن نے اس کا فوٹو اور متن IHRC ج 8، 1925ء 98-188 پر طبع کیا ہے۔

37 جہانگیر، فرمان عطائے حقوق زمینداری و چودھرائی 1618ء ایم۔ ال رائے چودھری نے اسکا متن IHRC ج 18 1943ء صـ 188 - 96 پر طبع کیا ہے۔

38 ہرکرن، انشائے ہرکرن، عہد جہانگیری، مطبوعہ و مترجمہ فرانسس بالفور، کلکتہ، 1881ء طبع ثانی 1881ء، اس تصنیف کے مخطوطات کے متن، آخری حصوں میں ایک دوسرے سے بےحد مختلف ہیں۔

39 شاہجہاں، فرمان؛ ایک قاضی کی تقرری معہ عطائے مدد معاش 1629ء، Or 11697 (اصل)

40 Persian Sources of Indian History جمع کردہ، مطبوعہ و مترجمہ بزبان مرہٹی، ج۔ ایچ۔ کھرے، ج (2) پونہ 1937ء مغلوں کے دستاویزات ص 19-1 پر دیئے گئے ہیں۔ جلد مذکور و جلد 3 (پونہ، 1939ء) کے بیشتر دستاویزات عادل شاہیوں کے نظم و نسق سے متعلق ہیں۔ جلد اوّل میری نظر سے نہیں گذری۔

41 Selected Documents of Shah Jehan's Reign شائع کردہ دفتر دیوانی حیدرآباد 1950ء دستاویزات کو پوری احتیاط سے مطالعہ کرنے کے بعد طبع کیا گیا ہے چند عکسی فوٹو بھی ہیں۔

42 دفتر دیوانی و مال ملکی سرکار اعلیٰ، حیدرآباد، 1939ء اس میں اردو و فارسی دستاویزات کے متن و چربے ایک معکوس تاریخی ترتیب کے ساتھ بشمول دستاویزات عہد شاہجہانی (ص 81-653) و عالمگیری (ص 166-261) دیئے گئے ہیں۔

43 شاہجہاں۔ فرمان بعض صرافوں کے نام۔ ڈاکٹر عبدالحلیم نے اس کا متن و ترجمہ، دسمبر 1942ء ص 59-60 میں طبع کیا ہے۔

44 لشکرخاں، پروانہ ایک شقدار کی تقرری کے متعلق، 1658-59ء I.O. 4434

45 اخبارات دربار معلی۔ دربار شاہی کے اطلاع نامے۔ عہد عالمگیری۔ R.A.S. کے کیس میں 9 جلدیں۔ یاد رہے کہ ان میں عہد بہادر شاہی کے بھی بعض اخبارات شامل ہیں، حالانکہ R.A.S. کے کیٹلاگ کا مرتب، مارے بظاہر اس امر سے ناواقف تھا اور یہ جلد اوّل میں اوائل عہد عالمگیری کے اخبارات کے ساتھ مجلد کر دیئے گئے ہیں۔ اخبارات کا حوالہ ان کی تاریخوں اور آر۔ اے ایس لائبریری میں ان کے مندرجہ نمبروں سے دیا گیا ہے۔ ایک جلد میں شاہزادہ اعظم کے گجرات کے مستقر کی اطلاعات شامل ہیں جن کے حوالے، اخبارات 'الف' کے نام سے دیئے گئے ہیں۔

46 'Selected Documents of Aurangzeb's Reign' 1659-1706ء مطبوعہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، حیدرآباد، 1958ء یہ جملہ دستاویزات حیدرآباد کے محافظ کے ہیں۔ ان کے پورے متن اور بعض کے عکسی فوٹو بھی دیئے گئے ہیں۔

47 'Selected Waqai of the Deccan' (1660-1671ء) مطبوعہ وائی۔ ایچ خان، سنٹرل رکارڈس آفس، حیدرآباد، 1953ء، متن کو تمہید اور دستاویزات کے خلاصہ اور انگریزی

میں ایک یادداشت کے ساتھ طبع کیا گیا ہے۔

48 فرمان عالمگیری بنام راسکداس، سنہ 8 جلوس۔ جادو ناتھ سرکار نے اس کا متن، برلن کے اور نیز اپنے ذاتی مخطوطہ سے JASB, N.S. (2) (1906ء) صفحہ 223 - 55 پر شائع کیا ہے۔ میں نے اسے مذکورہ ذیل مخطوطات سے ملایا ہے۔ I.O. 1146 I.O. 1566، I.O. 4014، اوراق 8 الف - 11 ب۔ Add. 19503 اوراق 62 الف - 63 ب، نگار نامۂ منشی 1735، اوراق 162 ب - 164 ب، 129 الف 133 ب (مطبوعہ نولکشور، ص 123 - 4، 99 - 102) مختلف متن کے تفصیلی حوالوں سے احتراز کرتے ہوئے، صرف متعلقہ دفعات (یا دیباچہ) کا حوالہ دیا گیا ہے۔

49 فرمان عالمگیری بنام محمد ہاشم 1668 - 69ء میں نے JASB, N.S. (2) (1906) صفحہ 268 - 49 میں سرکار کے شائع کردہ متن کو درّ العلوم، اوراق 139 ب۔ 142 ب اور مرآۃ احمدی مطبوعہ نواب علی ج (1) صفحہ 268 - 72 (مخطوطات I.O. 222، اوراق 172 ب، 175 ب اور I.O. 3597 صفحہ، اوراق 156 الف۔ 159 الف) کے متن سے ملانے کے بعد استعمال کیا ہے۔ نمبر 48 کی طرح اس فرمان میں بھی نمبروار دفعات ہیں جنہیں حوالہ دیتے وقت قلم بند کیا گیا ہے۔

50 اورنگ زیب، فرمان بابتہ عطیہ معاش، 1677 - 78ء، I.O. 4436

51 اورنگ زیب، فرمان ایک قاضی کی تقرری و عطیۂ معاش کے متعلق، 1677 - 78ء I.O. 4370

52 Waqai of Ajmer & c 1، 1678 - 80ء کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد، فن تاریخ، 2242 (ریسرچ لائبریری، شعبۂ تاریخ، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں موجودہ ہاتھ کی نقل۔ نمبر شمار 15، 16 (دو جلدیں) شروع میں رنتھمبور سے بھیجی ہوئی چند اطلاعات ہیں۔ مصنف اس کے بعد اجمیر کا وقائع نویس مقرر ہوا اور بالآخر پادشاہ قلی خاں کی فوج کے ہمراہ راجپوتوں سے جنگ کے دوران اس عہدہ پر مامور رہا۔

53 ملک زادہ۔ نگار نامۂ منشی۔ انتظامی تحریروں، مکتوبات وغیرہ کا مجموعہ، 1684ء، 1725، Bodl. 2018، مخطوطہ فارسیہ، ای۔ ایک (Bodl.) لیتھوگراف، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ 1882ء (مطبوعہ)

54 درّ العلوم، منشی گوپال رائے سورودج کے کاغذات کا مجموعہ، مرتبہ صاحب رائے سورودج، 1688 - 89ء، Bodl. (Walker 104)

56 اورنگزیب، فرمان ایک قاضی کی تقرری مع عطیہ مدد معاش، 1692ء، Or 11,698

56 فرامین اور سرکاری خطوط کے نقول۔ کرناٹک کے معاملات کے متعلق سترھویں صدی، 2 جلدیں Br. M. Hoare 4092 اور 3582

57 معظم۔ نشان بابتہ عطیۂ مدد معاش، 1696–97ء مطبوعہ IHRC (18)1942ء
ص 45 - 236

58 انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام مجریہ فرامین، نشانات، اور پروانے کے نقول 1633 – 1712ء ADD. 24039

59 بہادر شاہ، فرمان بابتہ عطیہ القضا۔ 1710ء Or 2288

پ: مجموعہ مکتوبات

نمبر شمار 38، 53 اور 64 مذکورہ بالا کو بھی مکتوبات ہی کا مجموعہ شمار کیا جا سکتا ہے۔

60 (س۔ 9-7) ابو الفضل، انشائے ابو الفضل، مرتبہ عبد الصمد، لیتھوگراف ایڈیشن نولکشور کانپور 1872ء

61 خانہ زاد خاں، انشاء خانہ زاد خاں، عہد جہانگیری، Or 1410

62 خطوط تحریر کردہ منجانب سیف خاں، مرتبہ 1641ء علیگڑھ سبحان اللہ، فارسیہ $\frac{891/6628}{18}$

63 جہاں آرا۔ خطوط بنام بدہ پرکاش، راجہ سرمور، 13-21 جلوس شاہجہانی، مطبوعہ JASB, N.S. ( )1911ء ص 68 - 449

64 خان جہاں سید مظفر خاں بارہہ۔ عرضداشتہائے مظفر، شاہجہاں۔ قبل 1656ء Add. 59 88 اوراق 1 الف۔ 26 الف اور 109 ب۔ 122 ب۔ اس مجموعہ میں خان اعظم عزیز کوکہ کا جہانگیر کے نام ایک خط شامل ہے، اوراق 17 الف 19 ب۔

65 بالکرشن برہمن۔ جلال حصاری اور خود اس کے لکھے ہوئے خطوط۔ اواخر عہد شاہجہانی و اوائل عہد عالمگیری .Add 16859 اوراق 27 الف 109 ب اور 122 ب۔ 127 الف Rieu (2- 837) ان خطوط کا پتہ لگانے اور ان میں و نمبر شمار 64 میں فرق قائم کرنے سے میں قاصر رہا۔ جلال حصاری، خان جہاں بارہہ کا ملازم اور بالکرشن برہمن، جلال حصاری کا شاگرد تھا۔

66 اورنگزیب، ادب عالمگیری، اورنگزیب کی تخت نشینی کے قبل اس کی طرف سے ابو الفتح

قابل خاں کے لکھے ہوئے خطوط کا اور شاہزادہ اکبر کی طرف سے محمد صادق کے لکھے ہوئے خطوط کا مجموعہ تقریباً 1680ء بالآخر محمد صادق نے اس پورے مجموعہ کو 1703 ـ 4ء میں شائع کیا۔ Add. 177 Or. 847 و 16

67 اورنگزیب، رقعات عالمگیر، شاہجہاں، جہان آرا اور دیگر شاہزادوں کے ساتھ، اورنگزیب کی اپنے تخت نشینی کے قبل کی خط و کتابت جو بیشتر نمبر 66 مذکورہ بالا سے ماخوذ ہے۔ مطبوعہ سید نجیب اشرف ندوی۔ ج (ا) اعظم گڑھ، 1930ء دیگر مجوزہ جلدیں طبع نہیں ہوئیں۔

68 جے سنگھ۔ عرضداشتیں، دربار شاہی اور شاہزادوں کے نام 1655 ـ 58ء وغیرہ RAS فارسیہ کیٹلاگ، 173، اوراق 8 ـ 76 اس مجموعہ میں عہد عالمگیری کے دیگر امرا کی بھی چند عرضداشتیں ملتی ہیں۔

69 منشی بھاگچند، جامع الانشا، خطوط کا ایک مجموعہ جس میں بیشتر جے سنگھ کے تحریر کیے ہوئے خطوط اور مغلیہ اور ایرانی درباروں درمیان خط و کتابت درج ہے۔ عہد عالمگیری میں تدوین کردہ 1702۔

70 حدیقی، نمونہ کے خطوط کا مجموعہ 1661ء Br. M. Royal 16 ـ بی 33۔

71 (س ـ 738) محمد صالح کنبو لاہوری، "بہار سخن"، 1663 ـ 64ء Or. 5557، Or. 178،

72 'خلاصۃ الانشا' 1691 ـ 92ء Or. 1750، اوراق 107 ب 162 الف (اقتباسات)

73 ایزد بخش رسا، 'ریاض الوداد' 1673 ـ 95ء Or. 172F

74 بیاض جو ایزد بخش رسا سے منسوب کی جاتی ہے۔ I.O.، 4014

76 سورت میں انگریزوں کی تجارتی کوٹھی، Factory خط و کتابت فارسی۔ ان میں 1695 ـ 97ء I O. 150

76 چھتر مل ہندو، 'کارنامہ' لطف اللہ معتبر خاں کی طرف سے لکھے ہوئے خطوط کا مجموعہ تقریباً 1688ء 98 I.O. 2007 اخبارات 43/161 اور 46/154 میں معتبر خاں کو کلیان کا تھانہ دار بتایا گیا ہے۔

77 بھوپت رائے، 'انشائے روشن کلام'، فوجدار جیسواڑہ، 1698 ـ 1702ء، رعد انداز خاں اور اس کے لڑکے و نائب شیر انداز خاں کی طرف سے لکھے ہوئے خطوط، I.O. 4011 علیگڑھ عبد السلام۔

109/339 علیگڑھ سرشاہ سلیمان 394/82 خطوط بلا تاریخ کے ہیں، لیکن جس مدت سے وہ متعلق ہیں اسے ہمعصر واقعات کے حوالوں اور نیز اخبارات 46/232 اور 267 میں رعد انداز خاں کے حوالوں سے متعین کیا جاسکتا ہے۔

78 اورنگذیب، رقائم کرائم، خطوط بنام امیرخاں (وفات 1698ء) Bodl. Ouseley 168 Add. 330 26239

79 اورنگذیب، کلمات طیبات، عنایت اللہ خاں کے جمع کردہ خطوط اور احکام، 1719ء Bodl.

80 اورنگذیب، احکام عالمگیری، عنایت اللہ خاں (متوفی 1725ء) کے جمع کیے ہوئے خطوط و احکام، I.O. 3887 اسے اورنگذیب کی غیر مستند حکایات سے جن کو بھی "احکام عالمگیری" ہی کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور جو I.O. 4071 وغیرہ میں محفوظ ہے اور جسے مورخ سرکار نے حمید الدین خاں کے "نیچہ عالمگیری" سے منسوب کیا ہے، بالکل مختلف تصور کرنا چاہیے۔

سرکار نے آخر الذکر تصنیف کا ترجمہ کر کے 'Anecdotes of Aurangzeb' کلکتہ 1913 وغیرہ (ص۔ 754) کے نام سے شائع کیا ہے۔

81 اورنگذیب، رموز و اشارہ ہائے عالمگیری، سبد ل (؟) کے جمع کیے ہوئے خطوط و احکام، 1739 Add. 26240

82 اورنگذیب، رقعات عالمگیری 1743 ـ 44ء میں جمع کردہ خطوط و احکام۔ Add. 26237 Add. 18422

83 اورنگذیب، رقعات عالمگیر، خطوط و احکام۔ یہ ایک معروف مجموعہ ہے جس کا مواد مذکورہ بالا نمبر شمار 78 و 81 سے ماخوذ ہے۔

لیکن اس میں بعض ایسے خطوط بھی ہیں جو کہیں اور نہیں ملتے۔ Add. 18881 میں یہ مجموعہ ملتا ہے، حالانکہ شروع کے چند صفحات نمبر شمار 82 کے مطابق ہیں لیتھو گراف، کانپور، 1267ھ

84 محمد جعفری قادری، انشائے عجیب، خطوط جنہیں بیشتر خود مدون، اس کے بھائیوں اور دوسروں نے لکھا ہے۔ ان کا تعلق زیادہ تر نجی معاملات سے ہے 1706 -87ء لیتھو گراف ایڈیشن، نولکشور، 1912ء

85 لیکھراج منشی، منین الانشاء یا مفید الانشاء، کامگار خاں کی طرف سے لکھے ہوئے اور روا قعنہ تقریباً سب کے سب، علی قلی خاں کی طرف سے لکھے ہوئے خطوط، جسے چھیت رائے نے مادۂ تاریخ کی رو سے

1700 ـ 1ء میں جمع کیا ہے، لیکن اس میں اس کے بعد بھی خطوط شامل ہیں۔ .Bodl (لائبریری) کا ذخیرہ 679 علی قلی خاں کو پٹ بہار کا فوجدار تھا اور اخبارات 93/46 میں اس کا ذکر آیا ہے۔

86 عہد اکبری سے عہد عالمگیری تک کے متفرق خطوط کے مجموعے .I.O 2678 اوائل سترھویں صدی کے، ہردیئے رام۔ رام، منشی کے خطوط 77 الف و ما بعد اوراق۔ اوائل سترھویں کے خطوط بظاہر خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ افسوس کہ میں اس مجموعہ پر کما حقہ توجہ نہ دے سکا۔

87 عہد عالمگیری اور بہادر شاہی کے خطوط کے متفرق مجموعے موسیو اجی کے 5 عدد خطوط .RAS، Morelay 81 (فارسی کیٹلاگ، 71)

88 'فیاض القوانین'، عباد اللہ فیاض کے 1723 ـ 24ء میں جمع کیے ہوئے شاہنشاہان مغلیہ شاہزادوں، امرا و دیگر حکمرانوں کے خطوط، برٹ 9617 (2 جلدیں)

89 شاہ ولی اللہ۔ تقریباً 1761ء تک کے سیاسی خطوط کے۔ اے نظامی، علیگڑھ (1950ء) نے انہیں شاہ ولی اللہ کے 'سیاسی مکتوبات' کے نام سے مع اردو ترجمہ کے طبع کیا ہے۔

ت: تاریخی تصنیفات

90 (س۔ 698) بابر، 'بابر نامہ' متن ترکی زبان میں، حیدر آباد کے قلمی نسخہ کا عکسی چربہ مطبوعہ A.S. Beveridge, Leiden & London 1905ء فارسی ترجمہ۔ عبدالرحیم خانخاناں برٹ Or 3174 انگریزی ترجمہ اے۔ ایس بیورج، لندن، 1921ء ترکی متن کے مسز بیورج کے ترجمہ نے Leyden اور Erskine کے نسبتاً پرانے ترجموں کو بیدخل کر دیا ہے۔ بدقسمتی سے بعض مقامات پر مسز بیورج کا فارسی الفاظ و اصطلاحات کا ترجمہ اس قدر صحیح نہیں ہے جس قدر سابقہ ترجمے ترکی زبان سے نا واقفیت کی بنا پر، میں حیدر آباد کے قلمی نسخے سے براہ راست استفادہ نہ کر سکا صرف کہیں کہیں جہاں حوالوں میں بابر نے فارسی الفاظ استعمال کیے ہیں، مجھے اس سے رہنمائی حاصل ہو سکی۔ یوں میں نے بیشتر، عبدالرحیم کے لفظی ترجمہ پر بھروسہ کیا ہے جو برٹ Or 3714 میں محفوظ ہے۔ یہ ایک شاندار مخطوطہ ہے جس کی اکبر کے بعض بہترین نقاشوں نے تشریح کی ہے۔

91 (اس 698 : 1) شیخ زین رو فائے خوافی، 'طبقات بابری'، برٹ Or 1999

92 حسن علی خاں، 'تواریخ دولت شیر شاہی'، پروفیسر شیخ عبدالرشید نے متن کا ایک حصہ اور اصل کے ایک جزو کا جواب لاپتہ ہو گیا ہے، ڈاکٹر آر۔ پی۔ ترپاٹھی کا کیا ہوا ترجمہ

'Medieval India Quarterly' ج (۱) نمبر شمار ایک (1950ء) میں شائع کیا ہے۔ باقیماندہ جز کے شروع کے سادہ ورق کی تصدیق عبارتیں مابعد کی جعل سازی ہے، لیکن جہاں تک اصل تصنیف کا تعلق ہے اس کی سند ہر شبہ سے بالا ہے۔ اس کا مصنف شیر شاہ کا نوعمری کا ساتھی ہونے کا مدعی ہے

93 (س۔ 61) رزق اللہ مشتاق، تحفۂ اکبر شاہی'، Add. 11633 سنہ 1929 Or.

94 (س۔ 672) عباس خاں سروانی، تحفۂ اکبر شاہی، I.O. 218

95 (س 702) مہتر جوہر، تذکرۃ الواقعات'، Add. 16,711

96 (س 702) بایزید بیات، تذکرہ ہمایوں و اکبر' مطبوعہ ایم۔ ہدایت حسین۔ بب۔ انڈ، کلکتہ 1941ء۔

97 (س 707) عارف قندھاری، تاریخ اکبری، علیگڈھ مسلم یونیورسٹی، شعبۂ تاریخ میں موجود رضا لائبریری، رامپور کے مخطوط کی ہاتھ کی لکھی ہوئی نقل۔

98 (س 693) نظام الدین احمد، طبقات اکبری، مطبوعہ بی۔ ڈے (B. De) بب۔ انڈ تین جلدیں (ایم ہدایت حسین نے بعد نظر ثانی، جلد سوئم کے ایک جز کو طبع کیا ہے) کلکتہ' 1913ء۔ 1927ء 1931ء 1935ء

99 (س 614) عبد القادر بدایونی، منتخب التواریخ، مطبوعہ علی احمد اور لیز (Lees) بب انڈ، کلکتہ، 1864ء 69ء

100 (س 708 : ۱) ابو الفضل، اکبر نامہ، بب۔ انڈ۔ 3 جلدیں، کلکتہ 1783ء 87ء میں نے بب۔ انڈ کے متن کے بہت زیادہ حصہ کو پہلے کے ایک مخطوطہ Add. 26207 سے ملایا ہے۔ خوش قسمتی سے یہ مخطوطہ 1628 - 29ء میں شیدا شاعر کی خوش خط تحریر میں جگہ جگہ صحیح کیا ہوا ہے۔ بیورج نے اپنے ترجمہ بب۔ انڈ، کلکتہ 1897 - 1921ء کے لیے بعض مخطوطات کا باہمی موازنہ کیا تھا اور نسخے کے اختلافات کے سلسلہ میں اس کی یادداشتیں اکثر بیحد مفید ثابت ہوتی ہیں۔

Add. 27,247 میں غالباً اکبر نامہ کے اوّل مسودہ کا متن درج ہے۔ اس کی زبان، حالانکہ جا بجا اس کے آخری مسودہ کے مماثل مگر نسبتاً کم نستعلیق ہے اور اس میں بہت سی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ دوسری طرف، بعض مقامات پر یہ زیادہ تفصیلی ہے۔ اس میں ٹوڈر مل کی ستائیسویں برس کی نظام و مال کے متعلق تجاویز کا اصل متن اور اس پر خود اکبر کا حاشیہ ملتا ہے (اوراق 331 ب۔ 332 ب) علاوہ اس میں ایک اور دلچسپ تحریر جو کہیں اور نہیں ملتی، اکبر کے حکم کا وہ متن ہے جو اس نے

شاہزادہ مراد کے منصبداروں کی تقرری وغیرہ کے متعلق چند استفسارات کے جواب میں صادر کیا تھا۔ (ورق 401 ب) میں نے ٹوڈرمل کی تجاویز کے لیے عموماً .Add 27247 کا حوالہ دیا ہے لیکن دوسری صورت میں ایسا صرف اسی وقت کیا گیا جب اس میں اور آخری نسخہ میں کوئی خاص فرق پایا گیا۔

101 (ص 884) میر معصوم، 'تاریخ سندھ'، مطبوعہ یو۔ ایم، داؤد پوٹہ۔ پونا 1938 ء

102 (ص 710) الہ داد فیضی سرہندی 'سرگذشت'، .Or 169

103 (ص 712) اسد بیگ قزوینی 'سرگذشت'، .Or 1996

104 (ص 673) عبداللہ 'تاریخ داؤدی'، مطبوعہ پروفیسر شیخ عبدالرشید، علیگڈھ 1954 ء

105 (ص 674) احمد یادگار، 'تاریخ سلاطین افاغنہ'، مطبوعہ ایم۔ ہدایت حسین، بب۔ انڈ۔ کلکتہ 1939 ء

106 (ص 826) میر طاہر محمد نسیانی۔ تاریخ 'طاہری'۔ .Or 1686

107 (ص 711) عبدالباقی نہاوندی۔ "ماثر رحیمی"، مطبوعہ ایچ۔ حسین۔ بب۔ انڈ۔ 3 جلدیں کلکتہ 1910 - 31ء

108 (ص 616) نورالحق دہلوی 'زبدۃ التواریخ'، .Add 580 10 اس میں عہد اکبری کے 1601 ء کے قبل کے واقعات بیشتر نمبر 102 سے ماخوذ ہیں۔

109 (ص 715) 'جہانگیر نامہ' یا 'تزک جہانگیری' مطبوعہ سید احمد۔ غازی پور و علیگڈھ 1863 64ء

سید احمد کے اڈیشن کا بڑا وصف یہ ہے کہ اس میں 'تزک' کا مستند متن ملتا ہے۔ یوں اس میں دیگر غلطیاں بہت ہیں۔ ان میں سے بعض غلطیوں کی صحت (Rogers) اور بیورج کے ترجمہ کی دو جلدوں، لندن 1909 14 ء میں کی گئی ہے، لیکن پھر بھی یہ ترجمہ غلطیوں سے خصوصاً اعداد کی پاک نہیں ہے۔

110 (ص 955) علاؤالدین غیبی، اصفہانی مرزا ناتھن 'بہارستان غیبی'، ترجمہ بورہ، 2 جلدیں گوہاٹی 1936 ء افسوس کہ اس تصنیف کے نادر قلمی نسخے سے میں ببلیوتھیق نیشنل پیرس (Bibl iothique Nationale, Paris) میں استفادہ نہ کرسکا۔

111 (ص 417) معتمد خاں، 'اقبالنامہ جہانگیری'۔ میں نے (اکبر کی وفات تک کی) دو جلدوں کے لیے نولکشور کے لیتھو اڈیشن 1870 ء کا اور تیسری کے لیے عبدالحیّ اور احمد علی، کلکتہ، 1865 ء کا

ب. انڈ کا ایڈیشن استعمال کیا ہے۔ میں نے لکھنؤ کے مطبوعہ نسخہ کی جگہ جگہ 1768 اور 1834 سے ملا کر جانچ کی ہے۔ باوجودیکہ Or. 1834، غالباً اوائل انیسویں صدی کی ایک نقل ہے، مگر اس کی جلد دوم میں ایک بہت اہم ضمیمہ لگا ہوا ہے جو لکھنؤ کے مطبوعہ نسخہ یا ان دیگر مخطوطات میں جو میری نظر سے گذرے ہیں نہیں ملتا (Or. 1768، Ethe 312, Ethe 313) یعنی اکبر کی وفات کے وقت کے شماریات مال، منصبداروں کی تنخواہوں کی شرحیں وغیرہ۔

112 (س 619) محمد شریف نجفی: مجالس السلاطین۔ Or. 1903

113 (س 718) کامگار حسین: 'معاصر جہانگیری'، Or. 171

114 (س 720) مصنف لامعلوم: 'انتخاب جہانگیر شاہی'، Or. 1648، اوراق 181ب - 201ب (اقتباسات) اس تصنیف میں ہماری دلچسپی کی کچھ چیزیں ملتی ہیں، مثلاً عطیات مدد معاش کے سلسلہ میں جہانگیر کی فیاضی کے حوالے۔ لیکن باوجودیکہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک ہمعصر تصنیف ہے، لیکن یہ غالباً اٹھارہویں صدی کی ایک جعل سازی معلوم ہوتی ہے۔

115 (س 274) امین قزوینی: 'پادشاہ نامہ' Or. 173، Add. 20734 رضا لائبریری رامپور کے مخطوطہ کی ہاتھ کی لکھی ہوئی نقل جو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، شعبۂ تاریخ کی ریسرچ لائبریری میں موجود ہے (نمبر شمار 19 تا 21)

116 (س 732) عبدالحمید لاہوری: 'بادشاہ نامہ'، ب. انڈ، کلکتہ، 1866-72ء

117 (س 734) محمد وارث: یہ سلسلہ نمبر شمار 116. Add. 6556 (الف) 1675 (ب)

118 (س 736) محمد صادق خاں: 'شاہجہاں نامہ'، Or. 174، Or. 1671 مصنف نے خود کو ایک فرضی نام سے پوشیدہ رکھا ہے اور اپنی زندگی کے جو حالات لکھے ہیں وہ فرضی معلوم ہوتے ہیں تاہم، یہ ایک نہایت اہم تاریخی تصنیف ہے۔

119 (س 738: ا) صالح کنبوہ: 'عمل صالح'، مطبوعہ جی۔ یزدانی۔ 4 جلدیں (جلد 4 اشاریہ) ب۔ انڈ۔ کلکتہ 1912 - 46ء

120 (س 743) شہاب الدین طالش: 'فتحیہ عبریہ'، Bodl. 89 یہ مخطوطہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں 1666ء تک کے واقعات کا سلسلہ ملتا ہے۔ اس تصنیف کا اوّل جزو متعدد مخطوطات میں محفوظ ہے اور 'تاریخ ملک آشام' کے نام سے کلکتہ سے 1847ء میں طبع ہوا ہے۔

121 (س 745) محمد کاظم: 'عالمگیر نامہ'، مطبوعہ خادم حسین اور عبدالحی، ب. انڈ، کلکتہ، 1865-73ء

122 (ص 151: 2) شیخ محمد بقا، مرآۃ العالم، Add. 7657 علیگڑھ عبدالسلام، 84/314

123 (ص 748) مہتا ایسر داس، فتوحات عالمگیری، Add. 23,884

124 (ص 622) سوجان رائے بھنڈاری، خلاصۃ التواریخ، مطبوعہ ظفر حسن، دہلی 1918ء میں نے مخطوطات Add. 16680 (الف)، Add. 18407 (ب) اور Or. 1625 (ج) سے بھی استفادہ کیا ہے، مگر میں نے ان کا حوالہ مطبوعہ متن میں ابہام ہی کی صورت میں دیا ہے۔

125 (ص 753) ابوالفضل معموری۔ بہ سلسلہ نمبر شمار 118، Or. 1671۔

126 (ص 750) بھیم سین، "نسخہ دلکشا" 23۔

127 (ص 752) ساقی مستعد خاں، "مآثر عالمگیری"، ب۔ انڈ، مطبوعہ کلکتہ 1870ء میں نے مخطوطہ Add. 1949 سے بھی رجوع کیا ہے۔

128 (ص 423) جگجیون داس گجراتی، منتخب التواریخ، Add. 26,253

129 (ص 627) محمد ہاشم خافی خاں، منتخب اللباب، ج (2) اور احوال دکن کے اجزا مطبوعہ کبیر الدین احمد بیگ (Heig) ب۔ انڈ کلکتہ 1860 - 74ء 1909 - 25ء خافی خاں نے نمبر شمار 118 و 125 کا سلسلہ سرقہ کیا ہے۔ اس کی تصنیف کا غالباً پہلا نسخہ Add. 6573 و 6574 میں محفوظ ہے اور ان میں اس کا متن نمبر شمار 118 و 125 سے اور بھی زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

130 (ص 629) یحییٰ خان، تذکرۃ الملوک، I.O. 1147

131 (ص 934) [illegible] مرآۃ احمدی، مطبوعہ نواب علی۔ 2 جلدیں و ضمیمہ، بڑودہ 1927ء 1930ء [illegible] نواب [illegible] مخطوطہ پر جو اس کے منشی کے [illegible] ہوا ہے مبنی ہے، مگر یہ طباعت [illegible] محفوظ نہیں ہے۔ میں نے اس کے [illegible] مخطوطات I.O. 222 و I.O. 2897 [illegible] کی ہے۔

132 (ص 1471) شاہنواز خاں، مآثر الامرا، تصحیح کردہ عبدالحی، مطبوعہ عبدالرحیم و [illegible] علی، ب۔ انڈ، 3 جلدیں۔ کلکتہ 1888 - 91ء

133 (ص 1162) [illegible] غلام علی آزاد حسینی بلگرامی، خزانۂ عامرہ، نولکشور، کانپور [illegible] مملکت مغلیہ (اور نو دیوانی حکومت) کے قبل کی مدت کے لیے میں نے [illegible] تصانیف سے رجوع کیا ہے۔

134 (س 666) ضیاءالدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، مطبوعہ سید احمد خاں، ب انڈ۔ کلکتہ، 1862ء اس تصنیف کا ایک جدید نسخہ مرتبہ پروفیسر شیخ عبدالرشید، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی زیر طبع ہے۔

135 (س 669) شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، مطبوعہ ولایت حسین، ب۔ انڈ کلکتہ 1891ء

ث:۔ جغرافیائی تصانیف

136 (س 1649) امین احمد رازی، ہفت اقلیم، 204، Add. 16734، مطبوعہ راس ہارلی (Ross, Harely) اور حق (شیراز کے پرتوی تک اس کے اجزاء میں شائع ہو چکے ہیں) 1918-1927ء، 1939ء

137 عبداللطیف، سفر بنگالی، 1608ء تلخیص اور ایک جز کا ترجمہ از جے۔ سرکار اور Bengla Past and Present 35 حصہ 2 (1928ء اپریل۔ جون) ص 143-46

138 امین الدین خاں، معلومات آفاق، 1707 - 13ء علیگڑھ سبحان اللہ 362/124 یہ ایک نفیس مخطوطہ ہے جسے خود مصنف کے لیے 1713ء میں ہاتھ سے نقل کیا گیا تھا۔ کسی نے ان ایام میں فاؤنٹین سے اسے قدرے خراب کر دیا ہے۔

139 (س 780 : 9 : 2) آنند رام مخلص، سفر نامہ مخلص، مطبوعہ ایس، اظہر علی، رام پور 1946ء

140 (س 631) رائے چتر من سکسینہ، چہار گلشن، یا اخبار نوادر، Elliot Bodl. 366 ہے۔ سرکار نے اس کے ایک جزو کا India of Aurangzeb، کلکتہ 1909ء (سرکار) میں ترجمہ کیا ہے۔

ج:۔ لغات

141 جمال الدین انجو، فرہنگ جہانگیری، 1608 - 9ء مطبوعہ ثمر ہند پریس، لکھنؤ، 1876ء

142 عبدالرشید التتوی، فرہنگ رشیدی، 1653 - 54ء مطبوعہ ابوطاہر، ذوالفقار علی مرشد آبادی، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ، 1872ء

143 منشی ٹیک چند بہار، بہار عجم، 1739 - 40ء مطبوعہ نولکشور لیتھوگراف 1916ء غالباً قدیم فارسی لغات میں سب سے زیادہ جامع ہے۔

144 (س 780 : 2) آنند رام مخلص، مراۃ الاصطلاح، محاورات و اصطلاحات کی فرہنگ 1745ء Or. 1813

ح: دیگر تصانیف:

145 'بیاض خوشبوئی'، I.O. 828 یہ تصنیف امراء کی ذاتی اور نیز ان کے اہل خاندان کی جملہ ضروریات پر حاوی ہے اور اس میں کھانے کے نسخوں اور معالجاتی اصولوں سے لے کر اصطبل و باغات کے نقشے اور خوشبویات سے لے کر کاغذ و قلم تک کے متعلق جملہ ہدایات درج ہیں۔ اس میں مالیات کے شماریات کا ایک جدول بھی شامل ہے۔ اس مخطوطہ کی 1697 - 98ء میں ہاتھ سے نقل کی گئی تھی لیکن داخلی شہادتوں کی بنیاد پر اس کی تحریر کی مدت کو پورے یقین کے ساتھ عہد شاہجہانی کی پہلی دو دہائیوں سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔

146 'دبستان مذاہب'، ایک نامعلوم مصنف کی مذاہب عالم پر ایک مشہور تصنیف جو 1653 و 1656ء کی درمیانی مدت میں مکمل کی گئی۔ مطبوعہ نذر اشرف، کلکتہ 1809ء اسکاشی (Shea) اور ٹرویئر (Troyer) کا تین جلدوں میں کیا ہوا ترجمہ، لندن، 1843ء غیر مستند ہے

147 ستنامیوں کے مذہبی صحیفے، ستنام سہائے۔ مخطوطہ RAS ہندوستانی۔ ایک جس میں اس کا برج بھاشا کا متن ناگری اور فارسی دونوں رسم الخطوں میں ملتا ہے۔

خ: یورپی ماخذ

148 Ceaser Fraderick (Ceaser de Frederici) اس کے ہندوستان کے اٹھارہ سالہ مشاہدات کے اقتباسات" 1563 81ء 'Purches nis Pilgrims', pub. Meclahose,

149 Fr. A. Monserrate, 'Information de los X' Pianos de S. Thome' 1579ء اس کے اجزاء کا ترجمہ ہوسٹن (Hosten) نے JASB, N.S. (18) 1922ء ص 349 - 69 میں کیا ہے۔

150 Fr. A. Monserrate کی اس کے دربار اکبری کے سفر پر 'Commentary' ترجمہ
جے۔ ایس ہوائی لینڈ (J.S. Holyland) اور حاشیہ ایس۔ این۔ بنرجی، کٹک، 1922ء
151 اکبر کے دربار میں یسوعی مشنوں کا تذکرہ مصنفہ ڈو جیرک (Du Jarric) ترجمہ C.H.
Payne, 'Akbar and the Jesuits' لندن، 1926ء

152 J.H. Van Linschoten, 'The Voyage of John Huyghen Van
Linschbten to the East Indies جو 1598ء کے انگریزی ترجمہ مطبوعہ
A.C. Burnell (جلد 1) اور P.A. Tielle (جلد 2) Huklyut Society، جلدیں 70-71
لندن 1885ء سے ماخوذ ہے۔

153 'Ralph Fitch تذکرہ مطبوعہ J.H. Ryley, 'Ralph Fitch, England's
Pioneer to India and Burma' لندن، 1899ء نمبر شمار 154 میں بھی شامل ہے۔
154 (1583-1619) Early Travels in India جو Fitch (صفحات 47)
Mildenhall (صفحات 48-59) Hawkins (صفحات 60-121) اور Tirch (صفحات 122-87) With
ington (صفحات 188-233) Coryat (صفحات 234-87) اور Terry (صفحات 288-332) کے
تذکرے ہیں، مطبوعہ W. Foster لندن 1927ء۔

155 Fr. J. Xavier کے خطوط 1593-1617ء ترجمہ Hosten, JASB, N.S.
(23) 1927ء صفحات 100-30

156 'A Supplementary of Documents in the India Office relating to India or to the Home Affairs of the East India Company
1600-1640' از W. Foster لندن، 1928ء

157 'Letters Received by the East India Company from its
Servants in the East چھ جلدیں: جلد 1 مطبوعہ Danners جلدیں 2-6
مطبوعہ Foster لندن 1896-1902ء۔

158 Fernas Guerreiro Relations اس کے اجزا کا ترجمہ،
C.H. Payne, 'Jahangir & the Jesuits' لندن، 1930ء

159 'Relations of Golconda in the Early Seventeenth Century'

ہ Methwold کے (صـ 50) Schorer کے (صـ 61-65) اور ایک گمنام ولندیزی تجارتی
گماشتہ کے (صـ 67-95) 'relations' کا مجموعہ ہے، مطبوعہ و مترجمہ W.H. Moreland,
1931 Huklyt Society, London

160 John Jourdain Journal 1608-17، مطبوعہ Foster, Hukuyt
Society دوسری سیریز، نمبر 16 کیمبرج، 1609ء

161 Joseph Salbancke, 'Voyage, 1609, (Purchas his Pilgrimes'
Machehose iii ،

162 Manual Chronicles Eredica, Discourse on the Province
of Indostan' 1611ء ترجمہ وغیرہ Hosten, JASB, Letters, IV, 1938, pp.
533-66

163 - Peter Floris, His Voyage to the East Indies in the
'Globe', 1611-15. اس کے جرنل کا مختصر ترجمہ مطبوعہ Moreland, Huklyut
Society, 2nd Series, LXXIV, London, 1934

164 Thomas Roe, 'The Embassy of Sir Thomas Roe, 1615-19 جیسا کہ
اس کے جرنل اور مراسلات میں بیان کی گئی ہے، مطبوعہ W. Foster' لندن 1926ء

165 Richard Steel and John Crewther, 'Journell', 1615-16,
'Purchas his Pilgrimes', Machehose, IV pp. 266-80

166 Edward Terry, 'A Voyage to East India, &c. 1616-19 لندن
1665ء، اشاعت ثانی 1777ء 'Purchas his Pilgrimes' کے پہلے نسخہ کی عبارت نمبر شمار
میں شائع ہوئی ہے۔

167 W. Foster 'The English Factories in India' 1618-69 مطبوعہ
13 جلدیں، آکسفورڈ، 1906 - 27ء جلدوں کے نمبر نہیں ہیں، لہٰذا ان کے حوالے متعدد سنوں
کے اعتبار سے دیئے گئے ہیں، جو سرورق پر ان کے ناموں کے تحت درج ہیں۔

168 Pietro Delle Valle, 'The Travels of Pietro Della Valle
in India' مترجمہ 'Edward Gray, Huklyut Society جلدیں، لندن، 1892ء

JIH, مترجمہ Pieter Van Den Brocke, 'Surat Diary', 1620-29 169
Moreland

Moreland مترجمہ Francisco Pelsert, 'Remonstrantie', c. 1626 170
'Jahangir's India' (Goyl & کیمبرج 1925ء

Wellebrand Geloyenssen de Jongh, 'Vereloringe ende 171
Bevinding' اقتباسات مترجمہ مورلینڈ JIH (4) (1925 - 26ء) ص 63 - 69

Joannes, De Laet, 'De Imperio Magni Mogolio, & c.', 1631 172
مترجمہ J.S. Hoyland اور حاشیہ ایس۔این۔بنرجی 'The Empire of the Great
Mugal' 1928 اس تصنیف میں طبعزاد مواد لقدر قلیل ہے اور اس کے بیشتر ماخذ کی دریافت
اور اشاعت نے اس کے قدیم استناد کو ختم کر دیا ہے۔

173 'Peter Mundy, 'Travels' جلد (2) ایشیا کے سفر 1630 - 34ء مطبوعہ
Sir R.C. Temple, Haklyut Society سلسلہ دوئم (35)، لندن، 1914ء

C.E.Lucrd مترجمہ Fray Sebastian Maurique, 'Travels' 1629-43 174
بہ امداد Hasten دو جلدیں 'Haklyut Society 1629ء

تقریباً John Van Twist, 'A General Description of India' 175
1638ء اقتباسات مترجمہ Moreland (16) (1937ء) ص 63 - 67

مترجمہ 1640-67ء Jean-Baptiste Tavernier, 'Travels in India' 176
'V. Ball' طبع دوئم، نظر ثانی 'W. Crooke لندن 1925ء

1656 Francois Bernier, 'Travels in the Mughal Empire' 177
A. Constable کا ترجمہ مع یادداشت، نظر ثانی کے بعد Irving Brock کے نسخہ کی بنیاد پر 68
دوسری طباعت V.A. Smith لندن، 1916ء

1666-67ء Jean de Thevenot, 'Relation de Indostan, & c.' 178
ایس۔این۔سین نے 'The Indian Travels of Thevenot and Careri' نیو دلی
(1949ء) میں Lovell کے 1687ء کے ترجمہ کو مع تصحیحات، مختصر یادداشتیں و تعارف
کے دوبارہ طبع کیا۔

مطبوعہ John Marshall, 'Notes & Observations on East India' 179
'John Marshall in India- 'Notes & Observations in ایس۔اے۔خان
1927ء 'لندن' 72ء - 1668 Bengal'

Thomas Bowrey, 'A Geographical Account of Countries 180
کیمبرج R.C. Temple مطبوعہ 1671ء تا 1669 Round the Bay of Bengal'
1905ء

John Fryer, 'A New Account of East India and Persia 181
'Huklyut 3 جلدیں 'W. Crooke مطبوعہ 81ء- 1672 'Year's Travels
1915ء 1912ء اور 1909ء 'لندن' (39) و (20)(19) سلسلہ دوئم 'Society
Streynsham Master, 'The Divice of Streynsham Master, 182
مطبوعہ 1675-80 and 'Other Contemporary Papers relating thereto'
1917ء 'لندن' جلدیں 'انڈین رکارڈس سیریز' 'R.C. Temple
'Maulda Diary and Consultations Booki & 'Maulde and 183
JASB. NS. 'Walter K. Firminger ,82 - 1680 Englezaved, Diary'
241 ص (14) 1918ء

William Hedges, 'The Diary of William Hedges, Esq., 184
کے ہاتھ during his Agency R.Barlow-in Bengal, L.C.
کی تحریر کردہ معہ حاشیہ اور Col. Henry Yale کی غیر مطبوعہ تحریروں کے کثیر اقتباسات کی وضاحت
کے ساتھ، 3 جلدیں Haklyut Society نمبران 74، 75 و 78 لندن 1887ء - 89ء میں
نے صرف جلد ایک کا حوالہ دیا ہے جو Hedges کی ڈائری پر مشتمل ہے۔ جلد 2 و 3 بیشتر سوانح عمری
سے متعلق مواد ہے۔

H.G مطبوعہ J. Oringtor, 'A Voyage to Surat in the year 1689' 185
1929ء 'لندن' Robinson

Coreri - Giiciamni Francesco Gemelli Careri, 'Giro del 186
'The Indian Travels of ہندوستان کا سفر کیا تھا 1695ء میں نے Monds'

187 Thevenet and Carerin' مطبوعہ ایس۔ این۔ سین، نیو دہلی، 1949ء میں Careri
کی ہندوستان کے متعلق تصنیف کے اجزا کی ابتدائی انگریزی عبارت، دوبارہ طبع ہوئی

172 Nicolas Manucly, Storia do Mogor' 1656 مترجمہ W. Iroine
جلدیں۔ انڈین ٹکسٹس سیریز، گورنمنٹ آف انڈیا، لندن 1907 ۔ 8ء میں نے مصنف کے نام
کے اُس املا کا اتباع کیا ہے جو پانڈیچری میں محفوظ اس کی دستخطوں میں ہے (IHRC '1925ء
صفحہ 175) لیکن Iroine کے ترجمہ کا حوالہ دیتے وقت میں نے مترجم کی استعمال کیے ہوئے املا "منکی"
کو استعمال کیا ہے۔

تصنیفات حاضرہ

الف: زراعت، زراعتی پیداوار و شماریات

188 Watt. 'The Dictionary of Economic Products of India'
چھ جلدیں۔

189 'The Agricultural Statistics of India' جسے گورنمنٹ آف انڈیا کے
شعبۂ مال و زراعت نے 1884 ۔ 85ء سے شروع کر کے غیر معین وقفوں پر سلسلہ وار جاری کیا ہے

190 John Augustus Voelcker, 'Report on the Improvement of
Indian Agriculture' لندن 1893ء

191 این۔ جی۔ مکرجی 'Handbook of Indian Agriculture' کلکتہ 1915ء

192 W.H. Moreland, 'Notes on the Agricultural Conditions
Districts of the United Provinces' الہ آباد 1913ء اضلاع
کے متعلق یادداشتوں پر علیحدہ صفحات قائم کیے گئے ہیں۔

193 The Royal Commission on Agriculture in India, 'Report',
لندن، 1928ء

ب: نظام اراضی و نظم و نسق مالگزاری زمین

194 خواجہ یٰسین دہلوی، فارسی زبان میں مال اور انتظامی اصطلاحوں کی فرہنگ۔ Add. 3 66

اوراق 40 ـ 84 "تاریخ تالیف درج نہیں ہے' لیکن اس کی تدوین غالباً اٹھارہویں صدی کے اواخر میں عمل میں آئی۔ بقول مدون' وہ دہلی کے نظم ونسق مال کا تجربہ رکھتا تھا اور اس نے دہلی اور بنگال میں مستعملہ اصطلاحوں کی برطانوی افسروں کے افادہ کے لیے تشریح کی ہے ۔

198 زیر ہدایت گورنر جنرل معہ کونسل مورخہ 4 جنوری 1777ء برائے رایان اور قانون گوؤں کی طیاری کی ہوئی' انگریزوں کے ماقبل دور کے نظم ونسق بنگال کے متعلق رپورٹ (فارسی میں) .Add 6592 اوراق 76 ب ـ 114 ب اور .Add 6586' اوراق 53 الف ـ 72 ب ـ

196 'دستور العمل خالصہ شریفہ' اواخر اٹھارہویں صدی کی ایک تصنیف جس میں انتظامی اور مالی اصطلاحوں کی ایک فرہنگ شامل ہے۔ Edinburgh 230

197 199 اواخر اٹھارہویں صدی کے خاص طور پر بنگال کے نظام مال کے متعلق متفرق کاغذات بیشتر فارسی میں' .Add 6586 الف 19503 ـ 4 ـ

200 ایسٹ انڈیا کمپنی کے متعلق سلکٹ کمیٹی کی پانچویں رپورٹ معہ ضمیمہ' ج (1) احاطہ بنگال طبع ثانی' مدراس۔ 1883ء

201 H.M. Elliot, 'Memoirs on the---Races of North-Western Provinces of India' ابتدائی Supplementary Glossary کا اضافہ کردہ اڈیشن John Beames کا نظر ثانی کیا ہوا۔ 2 جلدیں' لندن' 1869ء

202 H.H. Wilson, 'A Glossary of Judicial & Revenue Terms &-C. of British India' لندن' 1875ء

203 Baden-Powell, 'Land Systems of British India' جلدیں' آکسفورڈ 1892ء

پ: زرعی معاشرہ

204 رس (688 'Tashre-al Aowam' 'James Skinner, 1825ء مخطوطہ' .Add 27 255 (مصنف کے زیر نگرانی نفیس وضاحتوں کے ساتھ

205 W. Crooke, 'The Tribes and Castes of the North Western

Provinces and Oudh' 4 جلدیں، کلکتہ' 1896ء

206 'Baden-Powell, 'The Indian Village Community' لندن 1896ء

207 'D. Hbetson, 'Punjab Castes' 'لاہور' 1916ء

208 سریندر۔ جے۔ پٹیل 'Agricultural Labourers in Modern India and Pakistan' بمبئی' 1952ء

ت: مقامی تاریخ

209 (س 926) مفتی غلام حضرت، 'کوائف ضلع گورکھپور' 1810ء O. P. 4540 علیگڑھ سبحان اللہ $\frac{954}{12}$ (علیگڑھ مخطوط) علیگڑھ مخطوطہ کی بعض عبارتیں O. P. 4540 میں نہیں ملتیں۔

210 (س 927) گردھاری، 'انتظام راج اعظم گڑھ' اوائل انیسویں صدی Edinburgh 237

211 Charles Elliot, 'Chronicles of Oomar', الہ آباد' 1862ء

212 W.C. Benett, 'A Report on the Family History of the Chief Clans of Roy-Bareilly, Districts' لکھنؤ 1870ء

213 (س 928) سید امیر علی رضوی، 'سرگذشت راجہ ہائے اعظم گڑھ' 1872ء 138 Edinburgh

214 کنور لچھمن سنگھ، 'Memoirs of Zila Bulandshahar' الہ آباد' 1874ء

215 مختلف اوقات میں صوبجاتی حکومتوں کے جاری کیے ہوئے ڈسٹرکٹ گیزیٹیرس ہیں نے خاص طور پر یو۔ پی اور پنجاب کے اضلاع کے گیزیٹیروں سے استفادہ کیا ہے۔

ث: مغلیہ ہندوستان

مآخذ کی شرحیں

216 نجف علی خاں، 'شرح آئین اکبری' 1851ء 1667

217 Elliot & Damson, 'History of India as told by its own

Historians' 8 جلدیں، لندن، 1867ء وغیرہ

218 S. Commissariat, Mandelslo's Travels in Western India' (1638 - 9ء)

معاشی تاریخ

219 Edward Thomas, "Revenue Resources of the Mughal Empire in India, from A.D. 1893 to 1707 لندن 1871ء

220 W.H. Moreland, 'India at the Death of Akbar' لندن 1920ء

221 W.H. Moreland, 'From Akbar to Aurangzeb' لندن 1923ء

222 ایس۔ ایچ ہودی والا، 'Historical Studies in Mughal Numismatics'

223 رادھا کمل مکرجی، 'The Economic History of India' 1600 - 1800ء جو جرنل آف دی یو۔پی ہسٹوریکل سوسائٹی (14) حصہ (1) 40 اور مابعد صفحات پر شائع ہوئی ہے

224 کے ایم اشرف، 'Life and Conditions of the People of Hindustan' (اکبر کے ماقبل سلاطین کے تحت) اشاعت ثانی، دہلی 1959ء

225 Sir Charles Fawcett, 'The English Factories in India' نیو سیریز، 4 جلدیں۔

226 ٹی۔ رے چودھری The Dutch in Coromondal ڈاکٹر رے۔ چودھری نے ازراہ کرم مجھے اپنے غیر مطبوعہ تحقیقاتی مقالہ کی ٹائپ شدہ نقل کو پڑھنے کا موقع فراہم کیا۔

انتظامی تاریخ

227 'W. Irvine, 'The Army of the Indian Mughals: Its Organisation & Administration' لندن 1903ء

228 جے۔ سرکار 'Mughal Administration' کلکتہ 1920ء

229 'W.H. Moreland, 'The Agrarian System of Muslim India' کیمبرج 1929ء، طبع ثانی، الہ آباد۔

230 آر۔ پی۔ ترپاٹھی، 'Some Aspects of Muslim Administration' الہ آباد 1936ء، طبع ثانی، الہ آباد 1956ء

231 ابن حسن، 'The Central Structure of the Mughal Empire & its practical working' upto the year, 1657.

232 پی سرن، The Provincial Government of the Mughals' (1526 - 1658)، الہ آباد، 1941ء

233 آئی۔ ایچ قریشی، The Administration of the Sulnate of Delhi طبع ثانی (بعد نظرِ ثانی) لاہور،

234 عبدالعزیز، The Mansabdari System and the Mughal Army

235 ایس۔ این سین، The Military System of Marathas بمبئی 1958ء

اٹھارہویں صدی

236 W. Franklin, The History of the Reign of Shah Aulum, the present emperor of Hindustan لندن 1798ء

237 (س (938)) سید غلام علی نقوی، عماد السعادت، 1808ء میں مکمل ہوئی۔ لیتھو گراف ایڈیشن، نولکشور لکھنؤ، ء

238 ایس۔ چندرا، Parties and Politics at the Mughal Court, 1707-40 علیگڑھ 1897ء

علاقائی تاریخ

239 (س 963) غلام حسین سلیم زید پوری، ریاض السلاطین، بنگال کی تاریخ 1786 - 88ء ببلیوتھیکا انڈیکا کلکتہ 1890ء

240 James Tedd, 'Annals and Antiquities of Rajasthan' پوپلر ایڈیشن، 2 جلدیں، لندن، 1914ء

241 Grant Duff, 'History of the Marathas' لندن 1826ء

242 Sir John, Malcom 'A Memoir of Central India including Malwa, &c 2 جلدیں، لندن 1832ء

243 کویدا اس شیام داس، ویر ونود، جلدیں۔ میواڑ کی یہ مشہور ہندی زبان کی تاریخ بیشتر اودے پور کے پرانے کاغذات پر مبنی ہے، لیکن اس میں ساتھ ساتھ دیگر فارسی اور راجستھانی ماخذ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس تصنیف کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ اس میں اودے پور کے محافظ خانہ کے دستاویزات کے مسلّم ترجمے اور بعض اوقات وہ متن بھی جو عام طور پر سہل الحصول نہیں ہے ملتے ہیں۔

244 ٹی۔ رے۔ چودھری Bengal Under Akbar and Jehangir کلکتہ، 1953ء

دیگر تصانیف

245 C.M. Villiers Stuart, Gardens of the Mughal' لندن 1913ء

246 پی۔ سرن، 'Studies in Medieval Indian History'

247 سری رام شرما، 'Studies in Medieval Indian History' شولاپور، 1956ء

ج: مشرق وسطیٰ کی زرعی تاریخ

248 F. Lokkegeard, 'Islamic Taxation in the Classic Period, openhagan, 1950

249 A.K.S. Lambton, Landlord and Peasant in Persia, London, 1953.

ح: مجلاتی مطبوعات

ذیل میں صرف چیدہ مقالات کی فہرست پیش کی گئی ہے۔ وہ مقالات جن میں فارسی دستاویزات کے متن یا یورپی ماخذ کے ترجمہ شامل ہیں پہلے دیئے جا چکے ہیں، لہٰذا انہیں یہاں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

250 Journal of the (Royal) Asiatic Society of Bengal, Calcutta. 42 (1873) ء) ص 280 ۔ 209، 43 (1874) ء) ص 280 309

306-275 ص (1875ء) 44

Blochmann, Contribution to the Geography and History of Bengal (Muhammaden Period)

John Beames, 82 -162 ص 1885ء) 54 اور 32- 215 (1884ء) 53
'On the Geography of India in the Reign of Akbar', 2 parts:
Awadh and Bihar.

'Notes on رسالے منوہن چکرورتی بیاادرا 56 29 ص N.S. 1916
the Geography or Orissa in the sixteenth century

C.U. Wills, 'The Territorial System 262-197 N.S. (1979)
of the Rajput Kingdoms of Chandigarh.

Journal of the Royal Asiatic Society, London. 251

J.A. Hodyson, 'Memories on the Length 53 - 42 ء 1843
of the Illahea. Guiz, or Imperial Land Measure of Hindustan.

John Beames, 'Notes on Akbar's 65 743-136 - 83 ص 1896
Subahs with reference to the Ain-i-Akbari' Bengal and Orissa.

H. Beneridge, 'Aurangzeb's Revenues' 53 - 342 ص ء 1906

W.H. Moreland, 'Prices and Wages Under Akbar' 25 - 816 1917

Moreland and A. Yusuf Ali, 'Akbar's Land 42 - 1 ص 1918
Revenue System as described by the Ain-i-Akbari

Moreland, 'Value of Money at the Court 85 - 375 ص ء 1918
of Akbar's

Moreland, 'The Development of the Land 35 - 19 ص ء 1922
Revenue System of the Mughal Empire

Moreland, 'Akbar's Land Revenue Arrange 56 - 43 ص - 1926
ments in Bengal

Moreland, Shershah's Revenue System'. 59 -447 ص ، 1926

Moreland, 'Rank (Mansab) in the Moghal 65 - 641 ، 1936
State Service

Moreland, 'The Pargana Headman (Clandhri) 21 -511 ص 1938
of the Moghal Empire.

Indian Journal of Economics, Allahabad. 252

Moreland, 'The Ain-iAkbari- A Possible 53 44 ص ، 1916 (1)
Base line for the Economic History of Modern India.

Journal of Indian History, Allahabad, Madras, Trivandrum 253

Moreland, 'Feudalism (?) in the Moslem 8 -1 ص (8)
Kingdom of Delhi

Journal of the U.P. Historical Society, Lucknow. 254

Moreland, 'The Agricultural Statistics 39-1 ص (1) (2)
of Akbar's Empire';

Proceedings of the Indian Historical Records Commission. 255

Y.K. Desh Pande, 'Revenue Administration 87 - 81 ص ، 1929
of Berar in the Reign of Aurangzeb

S. Hasan Askari, 'Documents relating to 7 -1 ص (2) (26)
an old family of Sufi Saints of Bihar'.

I.H. Askari, 'Gleanings from misce 7-1 ص (2) ، (1951)(28)
llaneous collection of village Amathuc in Gaya'

Qayamuddin Ahmad 'Public Opinion 47 - 142 ص (2) (1955)(31)
as a Factor in the Government Appointments in the Mughal State.

B.R. Grover, 'Qasba-bandi Documents of 60 - 55 ص ، 1961
Akbar's Reign'

Muslim University Journal, Aligarh 256

ص93-118 2 ص156-88 3 ص 435 4 ص563-95

Ibadur Rahman Khan, 'Historical Geography of the Panjab and Sind

Islamic Culture, Hyderabad. 257

M. Sadiq Khan, 'A Study in Mughal Land Revenue System'. 1938 ص61-75

W.C. Smith, 'The Mughal Empire and the Middle Classes 1944 ص349-63

W.C. Smith, 'Lower Class Uprisings in the Mughal Empire 1946 ص21-40

دیگر مجلات جن کے مقالوں کے حوالے اس کتاب میں آئے ہیں:

Bengal Past & Present, 'Calcutta

Journal of the Pakistan Historical Society', Karachi.

Journal of the Sind Historical Society, Karachi

معارف، اعظم گڑھ۔

Medieval India Quarterly, Aligarh

'Proceedings of the Indian History Congress', Annual Sessions

'The Oriental College, Magazine, Lahore.

مخففات

ذیل میں مخففات کے سامنے جو اعداد درج ہیں وہ وہی ہیں جو کتابیات میں متعلقہ تصنیف کے لیے معین کیے گئے ہیں۔ چنانچہ کتابیات میں کسی تصنیف کو محض اس کے مخفف کے سامنے مندرجہ ذیل عدد سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہی تصنیف کے مخصوص مخطوطات یا اشاعتوں کے مخففات کو اس کتاب میں ان کے ایک سے زائد حوالے آنے کی صورت میں ذیل کی فہرست میں نہیں بلکہ کتابیات میں متعلقہ تصنیف کے تحت قوسین میں دکھایا گیا ہے۔

ادب عالمگیری	66	اکبر ٹو اورنگذیب	221
ایڈ	197	اکبرنامہ	100
ایڈ	194	اخبارات	46
ایڈ	64	اسٹیل دکراد ستر۔ پرچاز	165
ایڈ	199	الہ آباد	29
انگیز یئرین سسٹم	229	اسد بیگ	103
احکام عالمگیری	80	آرمی ٹریولس	154
احمد یادگار	106	اڈنبرا	16
آئین اکبری	2	ایلیٹ۔ میمائیرس وغیرہ	201
اکبر اینڈ دی جیویٹ	151	انڈین ہسٹوریکل رکارڈس کمیشن	255

مخففات

کلات طیبات	79	منظر شاہجہانی	3
کارنامہ	76	مرآۃ	131
کوائف ضلع گورکھپور	209	مراۃ العالم	182
کریری	186	مرآۃ الاصطلاح	144
کرانکلس آف اناؤ	211	مون سریٹ	160
کیسرٹ۔مینڈسلو	218	منڈی	173
لاہوری	116	مشتاقی	93
ریسوڈ	167	نگارنامہ منشی	55
نشاتن	158	وائکر رپورٹ	190
مآثرالامراء	132	وقائع دکن	47
مآثرعالمگیری	127	وقائع اجمیر	52
مآثررحیمی	107	وارث	117
مجالس السلاطین	112	واٹ	188
معلومات الآفاق	138	ولسن۔گلوسری }	202
معموری	125	ولنسن گلوسری }	
مینرلق		ہفت اقلیم	136
منتخب	187	ہرکرن	38
ارشل	179	ہدایت القواعد	22
اسٹر	182	ہجز	184
متین الانشاء	35	یلسین فرہنگ	194

نوٹ مترجم: چونکہ اصل کتاب میں بعض مقامات پر اکبر نامہ کے لیے انگریزی حروف اے۔ این، دستور العمل عالمگیری کے لیے ڈی۔ عالمگیری اور دستور العمل نویسندگی کے لیے ڈلی۔ نویسندگی کے مخففات استعمال کیے گئے ہیں لہٰذا اصل کتاب میں فہرست مخففات میں ان تصانیف کے پورے نام کے علاوہ یہ مخففات بھی شامل ہیں، حالانکہ ان میں سے ہر ایک کے پورے نام اور اس کے مخفف کے لیے جو اعداد مخصوص کیے گئے ہیں وہ ایک ہی ہیں۔ لیکن چونکہ ترجمہ میں ان مخففات کو نہیں بلکہ اس تصانیف کے پورے ناموں کو استعمال میں لایا گیا ہے، لہٰذا اول الذکر کو فہرست بالا سے خارج کر دیا گیا۔

مملکت مغلیہ: ۱۶۰۵ء
صوبوں کے حدود
خلیج بنگال
Traced by —
Dodhpur,
Aligarh.

ازبکستان
بحر عرب